تفسیر فاروقی

جلد اول

سورہ فاتحہ آیت نمبر ۱ سے سورہ آل عمران آیت نمبر ۷ ۳ تک یعنی پارہ ۱ سے پارہ ۳ تک

اس تفسیر میں آیات قرآنی کو دس، دس آیات پر مشتمل اسباق کی صورت میں ترتیب دیا گیا ہے۔ ہر سبق کی ابتدا میں قرآنی آیات کا ترجمہ پیش کیا گیا ہے، اس کے بعد ہر آیت کی تفسیر نہایت جامع اور واضح انداز میں بیان کی گئی ہے، جس میں نہ صرف شانِ نزول اور اس سے متعلقہ احکام و مسائل شامل ہیں بلکہ ان آیات کے فضائل اور غیر مسلموں کے اعتراضات کے مدلل جوابات بھی درج ہیں۔ یہ مجموعہ اس طرح مرتب کیا گیا ہے کہ اسے روزانہ مساجد میں درسِ قرآن کے لئے نیز گھروں میں اہلِ خانہ کے درمیان قرآن فہمی اور دینی تعلیم و تربیت کی غرض سے بآسانی استفادہ کیا جا سکتا ہے

مفتی محمد سرور فاروقی ندوی

(سابق استاذ: دار العلوم ندوۃ العلماء و صدر جمعیت پیام امن، لکھنؤ، الہند)

جمعیت پیام امن

ندوہ روڈ، ڈالی گنج، لکھنؤ، یوپی، الہند ۲۰

© جملہ حقوق محفوظ

سلسلہ U-4

نام : تفسیر فاروقی

مترجم : مفتی محمد سرور فاروقی ندوی

ناشر : مکتبہ پیامِ امن، ندوہ روڈ، ڈالی گنج لکھنؤ، یوپی الہند-۲۰

اردو ایڈیشن : اشاعت اول

تعداد کتب : ۱۱۰۰

سنہ طباعت : ۲۰۲۵ء

ہدیہ : ۶۰۰

Translator : Mufti Mohd Sarwar Farooqui Nadwi

Publisher : Maktaba Payam-e-Amn, Nadwa Road,
Daliganj,Lucknow-226020 U.P. India

Website : www.islamicjpamn.org

E-mail : ataullah2012@gmail.com

Phone No. 0091-9984490150, 9919042879

ملنے کے پتے

۱۔ مجلس تحقیقات ونشریات، ندوۃ العلماء، پوسٹ بکس نمبر ۱۱۹ (لکھنؤ) 05222741539

۲۔ نیو سلور بک ایجنسی، 14، محمد علی روڈ، بھنڈی بازار، ممبئی 0522-2741539

۳۔ الفرقان بکڈپو، نظیر آباد ۳ (لکھنؤ) 9936635816

۴۔ سبحانیہ بک ڈپو، نیا محلہ، جبل پور، مدھیہ پردیش 9424708020

۵۔ ستیہ فاؤنڈیشن 182-A 5 گرین لینڈ کیمپس، پوکھرپور، کانپور 9935044343

۶۔ مکتبہ شباب جدید، ندوہ روڈ لکھنؤ 9198621671

۷۔ مکتبہ شاہ ولی اللہ جامع مسجد، دیوبند 8439650526

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عرض ناشر

الحمد للہ رب العالمین و الصلوٰۃ و السلام علی رسولہ الکریم، اما بعد

عصرِ حاضر میں فہمِ قرآن کے لیے مختلف انداز میں تراجم وتفاسیر پیش کرنے کی سعی کی گئی ہے۔ انہی گراں قدر کاوشوں میں داعی اسلام حضرت مولانا قاری ومفتی محمد سرور فاروقی ندوی دامت برکاتہم کی خدمات نمایاں ہیں۔ سنہ 2002ء میں آپ کا ہندی ترجمہ ''قرآن کا پیغام'' شائع ہوا، جسے اندرون وبیرونِ ملک بالخصوص ترکی میں غیر معمولی پذیرائی حاصل ہوئی۔ اس کے بعد ہندی میں سات جلدوں پر مشتمل آپ کی تفسیر ''تفسیر فاروقی'' منظر عام پر آئی، پھر اس کا انگریزی ترجمہ بھی شائع ہوا۔ اس کے علاوہ آپ کی دوسو چالیس سے زائد دعوتی موضوعات پر تصانیف اردو، ہندی، انگریزی، عربی، تمل، بنگالی، گجراتی اور مراٹھی زبانوں میں ''مکتبہ پیامِ امن'' لکھنؤ اور دیگر ملکی وغیر ملکی مکتبوں سے شائع ہو چکی ہیں۔

اسی سلسلے کی ایک اہم کڑی ''معانی القرآن الکریم'' ہے جو اردو میں نہایت رواں لفظی ترجمہ پر مشتمل ہے۔ اسی طرح ''مختصر تشریح معانی القرآن الکریم'' اور ''ترجمہ وتشریح لغات القرآن'' تین جلدوں میں نحوی، صرفی اور لغوی وضاحت کے ساتھ شائع ہو چکی ہیں۔ یہ شرف بھی ''مکتبہ پیامِ امن'' کو حاصل ہے۔ اب ہندی ''تفسیر فاروقی'' کا اردو ترجمہ بھی ''تفسیر فاروقی'' کے عنوان سے شائع کیا جا رہا ہے۔

خصوصیات: (۱) اس تفسیر کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ کلماتِ قرآنی کی تشریح میں اتباعِ سلف کا بھرپور اہتمام کیا گیا ہے، جو قرآن فہمی کی اصل روح ہے۔ (۲) اس تفسیر کی ترتیب روزانہ درس کی شکل میں کی گئی ہے۔ ہر درس میں تقریباً دس آیات درج کی گئی ہیں، پھر ان کا ترجمہ پیش کیا گیا ہے، اس کے بعد ہر آیت کی تشریح کی گئی ہے۔ تشریح میں سب سے پہلے آیت کا شانِ نزول، پھر اس سے متعلق احادیث، معتبر علماء کے اقوال، مسائل، جدید سائنسی تحقیقات، نیز غیر مسلموں کی طرف سے کئے گئے اعتراضات کے مدلل جوابات درج کیے گئے ہیں۔ آخر میں ہر آیت سے متعلق فضائل بھی ذکر کیے گئے ہیں۔

(۳) اس تفسیر کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ کلمات کی وضاحت میں اتباعِ سلف کو بنیاد بنایا گیا ہے، جو اس تفسیر کی اصل روح ہے۔

(۴) الفاظ کی توضیح وتشریح کے مصادر میں عربی تفاسیر جیسے: تفسیر بیضاوی، تفسیر جلالین، تفسیر مظہری، تفسیر قرطبی سے اور معتبر اردو تفاسیر سے بھی استفادہ کیا گیا ہے۔ اسی طرح لغات وترکیبِ نحوی کے سلسلے میں اعراب القرآن (شیخ محی الدین درویش)، کلمات القرآن (مفتی شیخ حسنین محمد مخلوف)، قرآن مجید کا عربی اردو لغت، مکمل لغات القرآن، آسان لغات القرآن، مترادفات القرآن، مصباح اللغات وغیرہ سے بھی مدد لی گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ اس تفسیر کو پوری انسانیت کے لیے ہدایت کا ذریعہ بنا کر شرف قبولیت سے نوازے۔ آمین۔

طالب دعا

عطاء اللہ صدیقی

سکریٹری (جمعیت پیام امن، لکھنؤ)

۱۷ ربیع الآخر ۱۴۴۷ھ مطابق ۱۰/ اکتوبر ۲۰۲۵ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دعائیہ کلمات

عالم اسلام کی عظیم شخصیت مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ کے قلم سے

(سابق ناظم: دارالعلوم ندوۃ العلماء وسابق صدر: مسلم پرسنل لا بورڈ، انڈیا)

نحمدہ ونصلی علیٰ رسولہ الکریم اما بعد!

عزیز گرامی قدر مولوی محمد سرور فاروقی ندوی لائق مبارکباد ہیں کہ آسان ہندی زبان میں انسانوں کو انسانیت کا پیغام پہنچا رہے ہیں اور کچھ عرصہ سے انہوں نے قرآن مجید کی سورتوں کے ترجمے اور ان سورتوں کے مضامین ومفاھیم اور روح و پیغام کو بہت آسان زبان میں منتقل کرنے کا کام شروع کر رکھا ہے اللہ پاک پورے قرآن کے تکمیل کی توفیق عطا فرمائے، مقصد یہ ہے کہ ہمارے جو بھائی ہندی زبان جانتے ہیں چاہے وہ مسلمان ہوں یا ہندو بھائی ان سب تک انسانیت کا پیغام پہونچے۔

قرآن سارے انسانوں کی ہدایت کے لئے حضرت محمد ﷺ پر نازل کیا گیا تھا، اس کے نزول کو چودہ سو سال ہو رہے ہیں اس کی بتائی ہوئی راہ پر چل کر کروڑوں انسانوں کو امن وسکون حاصل ہوا۔ اس لئے کہ یہ کتاب انسانوں اور پوری کائنات کے خالق و مالک کی کتاب ہے، ایسے خالق و مالک کی کتاب ہے جس کا علم یقینی اور مکمل ہے، اس لئے قرآن مجید میں جو علم ہے اس میں کوئی شبہ نہیں اور نہ کوئی اختلاف ہے، یکساں اور آخری علم ہے اور ہر چیز کو اپنے اندر لئے ہوئے ہے۔

اس کتاب میں انسانوں کی زندگی کے لئے جو قانون دیا گیا ہے وہ لافانی ہے، وہ ہر زمانہ اور ہر ملک میں رہنے والے انسانوں کے لئے یکساں مفید ہے، اس میں کبھی کوئی تبدیلی نہیں ہوسکتی اس لئے کہ قرآن ایک کلی مکمل اور اصول دستور العمل ہے، اس کو کسی سیاسی ضمیمہ کی ضرورت نہیں یہ حق و باطل، سچ، جھوٹ، ایمان، کفر، اسلام اور جاہلیت اور توحید وشرک کے درمیان فرق بتاتا ہے سلامتی کے راستوں کی ہدایت کرتا ہے اور تاریکیوں سے روشنی کی طرف لاتا ہے۔

غرض کہ قرآن مجید ایک ایسا آئینہ ہے جس میں مختلف عقائد وخیالات اور اخلاق واعمال کے لوگ اپنا چہرہ دیکھ سکتے ہیں، اس نے کہیں صراحت کے ساتھ اور کہیں اشاروں میں ان گذشتہ قوموں اور اشخاص کا ذکر کیا ہے جو اپنے مخصوص اعمال واخلاق کی وجہ سے غیر فانی ہیں اس میں بھی ان جرائم کا تذکرہ کیا گیا ہے جو کثیر الوقوع ہیں اور عام طور پر پیش آتے ہیں۔

ان حقائق کی روشنی میں قرآن مجید ایک ایسی زندہ جاوید کتاب ہے، جس میں حال، ماضی، قدیم وجدید کی کوئی تقسیم نہیں، اس کا خطاب ہر تمدن اور ہر دور کے لئے ہے۔ اس کی دعوت ہر دم تازہ اور حسب حال ہے، یہ انسانوں کا متکلم مرقع اور انسانی فطرت کا ایک صاف شفاف آئینہ ہے۔ قرآن مجید کی مخاطب پوری نوع انسانی ہے، لیکن جس طرح زمین مختلف ہے اپنی صلاحیت، زرخیزی کے

اعتبار سے یا اس سے فائدہ اٹھانے میں ،اسی طرح قرآن مجید کوقبول کرنے اوراس سے مفید ہونے کی صلاحیت سب کی یکساں نہیں ہوتی اس سے وہی لوگ فائدہ اٹھاسکتے ہیں جن کے اندرمندرجہ ذیل صفات اورخصوصیات ہوں۔

قرآن مجید سے استفادہ کی پہلی بنیادی شرط یہ ہے کہ قرآن سے فائدہ اٹھانے کی طلب اورجستجو ہو،موجودہ حالت پر بےاطمنانی ،اصلاح حال کی کوشش اور راستہ کی تلاش کا جذبہ ہو۔دوسری بنیادی شرط یہ ہے کہ جوشخص قرآن مجید سے فائدہ اٹھانا چاہتاہےاس کے اندرخدا کا خوف ہو،یعنی خدا کا نام لینے سے ان کے دلوں پر اثر ہوتا ہو،اس لئے کہ قرآن کی بنیاد خدا کے خیال اوراس کے خوف پر ہے۔

تیسری بنیادی شرط یہ ہے کہ قرآن کے بتائے ہوئے حقائق پر چاہے وہ عقل میں آئیں یانہ آئیں مکمل طور سے ایمان لائے یعنی اللہ تعالیٰ کی صفات ،وحی،فرشتے،آخرت،جنت اوردوزخ کے وجودکوتسلیم کرے اوراس سلسلہ میں انبیاء کی بتائی ہوئی باتوں پر اعتماد کرے۔

چوتھی بنیادی شرط یہ ہے کہ قرآن مجید کوسوچ کرغوروفکر سے پڑھے۔پانچویں بنیادی شرط یہ ہے کہ قرآن کےفہم وتدبراوراس پرعمل کرنے میں مشقت اورمجاہدہ کرنا پڑےتواسکو برداشت کرےاوراس کے لئے اپنے اخلاق کو پاکیزہ رکھنے کی کوشش کرے، قربانی دینے کی ضرورت پیش آئےتواس سے دریغ نہ کرےاورقرآن کی ہدایات پرعمل کرے۔

آخری بات یہ ہے کہ اس قرآن مجید کی پوری عظمت دل میں ہو،اوراحترام وشوق اورمحبت کے ساتھ اس کو پڑھے جیسے کسی محبوب بادشاہ کا کلام شوق ومحبت کے ساتھ پڑھا جاتا ہے۔اگرہم قرآن مجید کا مطالعہ ان خصوصیات وصفات وشرائط کے ساتھ کریں گےتوہمیں فائدہ ہوگا۔دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کوشش کوقبول فرمائے اورقبول حق کے لئے قرآن مجید پڑھنے والوں کے سینوں کوکھول دے۔آمین

ابوالحسن علی ندوی

ابوالحسن علی ندوی
ناظم:ندوۃ العلماء،لکھنؤ
۲۰/جمادی الاخریٰ ۱۴۱۹ھ

نوٹ: مفکراسلام حضرت مولانا سیدابوالحسن علی حسنی ندویؒ کی حیات میں ہی تیسواں پارہ شائع ہوگیا تھا جس پرحضرت مولانا نے درج بالا مقدمہ تحریرفرماکردعائیہ کلمات سے ہمت افزائی فرمائی تھی جسے استفادہ کی غرض سے اس میں شامل کرلیا گیا ہے۔

عالم اسلام کے معروف علماء دین کی تصدیقات کے منتخب جملے

تمام تعریفیں اللہ ہی کے لئے ہیں اور درود وسلام ہو محسنِ اعظم سیدنا محمد رسول اللہ ﷺ پر، جنہوں نے امت کو قرآن مجید کی تعلیم دی اور اللہ تعالیٰ کی رحمتیں نازل ہوں تمام صحابۂ کرام وحفاظ اکرام، مفسرین اور ہم تک قرآن مجید کے پہنچانے والوں پر جنہوں نے قرآن کریم کی تعلیم کو عالم کے قریہ قریہ تک پہنچایا۔

الحمدللہ ۱۹۹۶ء میں ہی قرآن مجید کے ترجمہ وتفسیر کا کام شروع کر دیا تھا تب سے آج تک الحمدللہ اس کام میں مسلسل مشغول ہوں جس میں سب سے پہلے سورہ فاتحہ کی تفسیر شائع ہوئی، پھر پورے قرآن مجید کا ہندی ترجمہ ''قرآن کا پیغام'' کے عنوان سے شائع ہوا، اس کے بعد جیسے جیسے تفسیر کا کام ہوتا رہا، ایک ایک جلد ''تفسیر فاروقی'' کے عنوان سے سات جلدوں میں شائع ہوئی پھر قرآن مجید کا اردو ترجمہ اور مختصر تفسیر بھی شائع ہوئی پھر 'ترجمہ وتشریح لغات القرآن الکریم' کے عنوان سے تین جلدوں میں نحوی، صرفی، لغوی تشریح کے ساتھ ترجمہ شائع ہوا، ان تمام قرآن مجید کے تراجم سے متعلق معروف قرآنی علوم کے ماہرین سے مفید مشورے لئے جاتے رہے اور ناچیز کی درخواست پر وہ اپنے دعائیہ کلمات سے ہمت افزائی بھی فرماتے رہے۔ اس لئے اپنے اساتذہ ومحسنین کے پیغامات کو جو تفسیر فاروقی یا اردو ہندی کے ترجمے وتفسیر پر الگ الگ تاریخوں میں لکھے گئے تھے اسے بھی شامل کر لیا گیا ہے، جس سے مطالعہ کرنے والوں کو رہنمائی ہوگی اور ہمارے سبھی محسنوں کو اس کا اجر بھی ملے گا۔

چونکہ پیغامات کی فہرست لمبی ہے اس لئے ان حضرات کے دعائیہ کلمات کے اقتباسات سے کچھ سطریں اخذ کر کے یہاں بطور نمونہ درج کی جارہی ہیں تاکہ انشراح قلب کے ساتھ استفادہ کیا جاسکے جو درج ذیل ہیں:

(۱) عالم اسلام کی ایک عظیم شخصیت مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ کے قلم سے

(سابق ناظم: دارالعلوم ندوۃ العلماء وسابق صدر: مسلم پرسنل لا بورڈ، انڈیا)

نحمدہ ونصلی علیٰ رسولہ الکریم اما بعد!

عزیز گرامی قدر مولوی محمد سرور فاروقی ندوی لائق مبارکباد ہیں کہ آسان ہندی زبان میں انسانوں کو انسانیت کا پیغام پہنچا رہے ہیں اور کچھ عرصہ سے انہوں نے قرآن مجید کی سورتوں کے ترجمے اور ان سورتوں کے مضامین ومفاہیم اور روح وپیغام کو بہت آسان زبان میں منتقل کرنے کا کام شروع کر رکھا ہے اللہ پاک پورے قرآن کے تکمیل کی توفیق عطا فرمائے۔

آخری بات یہ ہے کہ اس قرآن مجید کی پوری عظمت دل میں ہو، اور احترام وشوق اور محبت کے ساتھ اس کو پڑھے جیسے کسی محبوب بادشاہ کا کلام شوق ومحبت کے ساتھ پڑھا جاتا ہے۔ اگر ہم قرآن مجید کا مطالعہ ان خصوصیات وصفات وشرائط کے ساتھ کریں گے تو ہمیں فائدہ ہوگا۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کوشش کو قبول فرمائے اور قبول حق کے لئے قرآن مجید پڑھنے والوں کے سینوں کو کھول دے۔ آمین۔

(۲)عالم اسلام کی معروف شخصیت مرشد امت حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ کے قلم سے

(سابق ناظم: دارالعلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ وصدر مسلم پرسنل لا بورڈ، انڈیا)

ہندی ترجمہ وتفسیر پر حضرت تحریر فرماتے ہیں ''ہمارے عزیز 'مولوی محمد سرور فاروقی ندوی صاحب' جو ایک فاضل شخص اور عربی وہندی دونوں سے اچھی واقفیت رکھنے والے ہیں، میرے سامنے اس وقت انہیں کا ہندی ترجمہ وتفسیر قرآن ہے جس کو انہوں نے بڑی محنت وقابلیت سے تیار کیا ہے۔ امید ہے کہ سارے مسلم اور غیر مسلم بھائی جو ہندی زبان ہی کے ذریعہ زیادہ بہتر سمجھ سکتے ہیں اس ترجمہ وتفسیر سے صحیح فائدہ اٹھائیں گے، مسلمان حضرات تو عمل کرنے کے لئے اور اس کی رہنمائی میں اپنی زندگی سنوارنے کے لئے اور غیر مسلم بھائی اسلام اور قرآن کی صحیح حقیقت اور تعلیمات سے واقفیت حاصل کرنے کے لئے۔ میری دعا ہے کہ یہ تفسیر مفید اور کامیاب ثابت ہو۔

اسی طرح اردو ترجمہ پر تحریر فرماتے ہیں: ''ان کے ترجمے کے بعض نمونے دیکھے تو اندازہ ہوا کہ بہتر سے بہتر جو بات ان کو سمجھ میں آئی وہ اختیار کی ہے بلکہ دوسرے بڑی صلاحیتوں کے حامل لوگوں نے جو ترجمے کئے ہیں ان پر بھی نظر ڈالی ہے اور ان سے فائدہ اٹھایا ہے، تاکہ جس قدر وہ راہ مستقیم پر چل سکیں چلیں اور اس میں وہ ایک حد تک کامیاب ہیں ہم اس پر اپنی قدردانی کا اظہار کرتے ہیں اور ان کے اس ترجمہ کی جو افادیت ہے اس کے اثرات کی اچھی توقع رکھتے ہیں اور اللہ تعالیٰ سے قبولیت کی دعا کرتے ہیں''۔

(۳)عالم اسلام کے معروف عالم دین حضرت مولانا مفتی ابوالقاسم نعمانی مدظلہ العالی کے قلم سے

(مہتمم: دارالعلوم دیوبند)

''مفتی محمد سرور فاروقی ندوی کے ہندی ترجمے پر ملک کے متعدد اکابر اہل علم نے گہری نظر سے ترجمہ کو دیکھ کر اپنی پسندیدگی کا اظہار کیا ہے اس لئے امید ہے کہ یہ ترجمہ نہ صرف ہندی داں مسلمانوں کے لئے، بلکہ ان برادران وطن کے لئے بھی ''قرآن کا پیغام'' کو سمجھنے میں مدد دیگا، جو سنجیدہ اور انصاف پسند ہیں اور قرآن پاک کے پیغام کو سمجھنا چاہتے ہیں اللہ تعالیٰ ان کی خدمت کو قبول فرمائے اور مزید دینی خدمت کی توفیق بخشے''۔

اسی طرح اردو ترجمہ پر تحریر فرماتے ہیں ''جناب مولانا مفتی محمد سرور فاروقی ندوی صاحب نے اس سے قبل ہندی زبان میں قرآن پاک کی ترجمانی کی خدمت انجام دی ہے جسے اہل علم نے سراہا ہے اور اب ان کے اردو ترجمہ کا نمونہ سامنے آیا ہے جس میں حتی الامکان لفظی ترجمہ کی کوشش کی گئی ہے اللہ تعالیٰ اس خدمت کو قبول فرمائے''۔

(۴)عالم اسلام کے معروف عالم دین حضرت مولانا محمد سالم قاسمیؒ کے قلم سے

(سابق مہتمم: دارالعلوم وقف دیوبند وسابق نائب صدر مسلم پرسنل لا بورڈ، انڈیا)

''پیش نظر تفسیر ''قرآن کا پیغام'' تفسیر فاروقی'' بزبان ہندی اور اس تفسیر کے ذریعہ مفتی محمد سرور فاروقی ندوی نے علمی ذوق سلیم وقیع دینی صلاحیت، وسیع مطالعہ اور علوم قرآنی سے استفادہ کی راہ عوام وخواص کے لئے کھول دی ہے۔ امید ہے کہ یہ تفسیر مؤلفین، مصنفین، محققین، مقررین اور مدرسین کے لئے ایک قیمتی علمی تحفہ ثابت ہوگی''۔

اسی طرح اردو ترجمہ پر تحریر فرماتے ہیں: ''مفتی مولانا محمد سرور فاروقی ندوی نے قرآن کریم کا لفظی ترتیب کے اعتبار سے رواں اردو ترجمہ ولغوی تشریح کر کے ایک نمایاں کام انجام دیا ہے جس سے عوام الناس کو استفادے میں آسانی ہوجائے گی حق تعالیٰ ان کی اس خدمت کو قبول فرمائے''۔

(۵) عالم اسلام کے معروف عالم دین حضرت مولانا سید ارشد مدنی مدظلہ العالی کے قلم سے

(استاذ حدیث: دارالعلوم، دیوبند وصدر: جمعیت علماء ہند، انڈیا)

''اب جبکہ ہندی زبان ہمارے ملک کی سرکاری زبان ہے اور امت کا ایک بہت بڑا طبقہ اردو سے دور ہے اس بات کی سخت ضرورت ہے کہ اسلامی علوم کو ہندی زبان میں کیا جائے۔ یہ بات قابل قدر ہے کہ ''مولانا مفتی محمد سرور فاروقی ندوی صاحب'' نے اس ضرورت کو محسوس کیا اور حضرت تھانویؒ کے ترجمے کو سامنے رکھتے ہوئے مختلف تراجم سے استفادہ کرتے ہوئے ہندی زبان میں قرآن شریف کا ترجمہ و تفسیر کیا ہے، اگر چہ یہ فقیر اپنی مصروفیت کی وجہ سے اس کو ایک ایک لفظ نہیں دیکھ سکا، لیکن حضرت تھانویؒ کے ترجمے کو سامنے رکھنا اس ترجمہ و تفسیر کے ثبوت کے لئے کافی ہے''۔

اسی طرح اردو ترجمہ پر تحریر فرماتے ہیں: ''یہ بات قابل قدر ہے کہ مولانا مفتی محمد سرور فاروقی ندوی نے مذکورہ ضرورت کو ملحوظ رکھ کر حضرت تھانویؒ کے ترجمہ کو سامنے رکھتے ہوئے مادری زبان میں قرآن شریف کا ترجمہ کیا ہے اور اب ہندی ترجمہ وتفسیر کے بعد اردو زبان میں لفظی ترتیب کا خیال رکھتے ہوئے رواں ترجمہ ومختصر تشریح کیا ہے جو عوام کے لئے بہت مفید ثابت ہوگا''۔

(۶) عالم اسلام کے معروف عالم دین اور ادیب حضرت مولانا سعید الرحمٰن اعظمی ندوی مدظلہ العالی کے قلم سے

(مہتمم: دارالعلوم ندوۃ العلماء وچیف ایڈیٹر: البعث الاسلامی، لکھنؤ)

''ہمارے اس ملک میں ہندی زبان میں قرآن کریم کے ترجمے مختلف اداروں اور شخصیات کی طرف سے شائع ہوکر مقبول ہو چکے ہیں، لیکن ابھی تک کسی ایسے عالم دین کی طرف سے جس کو ہندی زبان پر پوری طرح عبور حاصل ہو اور وہ عربی زبان کی روح کو سمجھ کر ہندی زبان میں منتقل کرنے کی بھرپور صلاحیت رکھتا ہو، کوئی کام نہ ہوسکا تھا۔

ہمیں اس بات کا اعتراف کرنے میں نہایت خوشی ہورہی ہے کہ ہمارے حلقہ ندوۃ العلماء کی طرف سے یہاں کے عالم دین مفتی محمد سرور فاروقی ندوی جو عربی، اردو، ہندی کے ماہر مایا ناز ادیب عالم اور صحافی قرآن کریم کا ہندی زبان میں ایک نہایت ہی قابل اسوک اور عربی زبان کی روح سے قریب تر ہندی ترجمہ وتفسیر پیش کررہے ہیں''۔

اسی طرح اردو ترجمہ وتفسیر پر تحریر فرماتے ہیں: ''ہمارے فاضل دوست جناب مولانا مفتی محمد سرور فاروقی ندوی (صدر جمعیت پیام امن، لکھنؤ) نے قرآن کریم کی لفظی ترتیب کے اعتبار سے رواں اردو زبان میں قرآن کریم کا ترجمہ ومختصر تفسیر کیا ہے اور بامحاورہ اور لفظی ترجمے کے درمیان اعتدال کی راہ اختیار کی ہے۔ اسی طرح قواعد نحوی کا بھی لحاظ کیا ہے مثلاً مضاف، مضاف الیہ، موصوف صفت، جار مجرور اور لغوی تشریح وترکیب وغیرہ، میں سمجھتا ہوں کہ جو طریقہ مفتی محمد سرور فاروقی ندوی صاحب نے اختیار کیا ہے وہ

ہر اعتبار سے تلاوت قرآن کرنے والے شخص کے لئے مفید تر ہے اور اس سے جو تاثیر اور نتیجہ ظاہر ہونا چاہئے اس میں مترجم محترم پوری طرح کامیاب ہیں''۔

(۷) عالم اسلام کے معروف عالم دین حضرت مولانا محمد سعید مظاہری رحمۃ اللہ علیہ کے قلم سے

(ناظم ومتولی: مدرسہ مظاہر العلوم وقف سہارنپور، یوپی، انڈیا)

''مجھے یہ معلوم ہو کر خوشی ہوئی کہ دار العلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ کے ایک عالم دین جناب مولانا مفتی محمد سرور فاروقی ندوی غیر مسلموں میں دعوت وتبلیغ کے لئے کوشاں اور فکر مند ہیں، اس سلسلے میں انہوں نے مختلف کتابیں اور کتابچے بھی مرتب وشائع کئے ہیں، اسی طرح انہوں نے قرآن کریم کے دعوتی اسلوب کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ہندی زبان میں تفسیر فاروقی کے نام سے بابرکت سلسلہ شروع کیا ہے جس کا ایک حصہ میرے پاس بغرض تقریظ پہنچا ہے اللہ تعالیٰ مولانا محترم کی اس کوشش وکاوش کو شرف قبول اور مقام قبولیت عطا فرمائے''۔

(۸) فقیہ عصر حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی مدظلہ العالی کے قلم سے

(صدر: آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ وناظم: المعہد العالی اسلامی حیدرآباد وجنرل سیکریٹری اسلامی فقہ اکیڈمی)

''قرآن کو ایک پیغام کی شکل میں دعوتی اسلوب اور آسان انداز میں پیش کرنے کی ضرورت تھی، چنانچہ محب فی اللہ جناب مفتی محمد سرور فاروقی ندوی (صدر: جمعیت پیام امن، لکھنؤ) نے اسی انداز میں قرآن پاک کے ترجمے وتشریح کی کامیاب کوشش کی ہے۔

اس تفسیر میں سب سے پہلے سورہ کا تعارف، کے عنوان سے ہر رکوع کا خلاصہ پیش کیا ہے پھر آیتوں کے ترجمے اور ہر آیت کے متعلق تفسیر، اسباب نزول، فضیلت، ضروری مسائل اور آیات کے پیغام کو بیان کیا ہے۔ تفسیر کے دوران حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ کی معارف القرآن کے علاوہ اسلاف کی متعدد تفسیر سے استفادہ کیا ہے ایک خاص بات اس تفسیر کی یہ ہے کہ ہر آیتوں کے الگ الگ نمبر ڈال کر آیتوں کی تشریح کی گئی ہے تاکہ لوگ تھوڑا تھوڑا وقت نکال کر آسانی کے ساتھ فائدہ اٹھا سکیں اور طلبہ وطالبات بھی الگ الگ سبق کے طور پر اسے پڑھ سکیں''۔

(۹) عالمی شہرت یافتہ ادیب حضرت مولانا سید واضح رشید حسنی ندویؒ کے قلم سے

(سابق معتمد تعلیم ونائب ناظم: دار العلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ)

''مولانا مفتی محمد سرور فاروقی صاحب جو عالم دین ہونے کے ساتھ ساتھ ہندی کے بھی سند یافتہ عالم ہیں مولانا محمد سرور صاحب بہت سی ہندی کتابوں کے مصنف ہیں اور اس سے پہلے بہت سی کتابوں کے ترجمے بھی کر چکے ہیں اور اب تفسیر کا کام بھی پورا کر چکے ہیں اللہ تعالیٰ اس کوشش کو قبول فرمائے اور اس کو قرآن فہمی کا ذریعہ بنائے اور ہدایت کے ملنے کا عنوان بنائے''۔

(۱۰) حضرت مولانا عبد القادر صاحب ندوی مظاہری گجراتی کے قلم سے

(نائب مہتمم: دار العلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ)

''ہمارے عزیز گرامی مفتی محمد سرور فاروقی ندوی صاحب نے جو ندوہ سے سند یافتہ ہونے کے ساتھ ہندی سے بھی واقف ہیں

،واقف ہی نہیں بلکہ مسلسل اس طرح کے کاموں میں لگے رہنے کی وجہ سے عوام میں سمجھی جانے والی ہندی جو ہندوستانی زبان ہے اس سے بھی واقف ہیں انہوں نے اس کام کو اپنے ذمہ لیا ہے اور ایک حد تک اس کو پائے تکمیل تک پہنچا چکے ہیں اب پورے قرآن کی تفسیر شائع کرنے جارہے ہیں جس پر وہ مبارک باد کے مستحق ہیں''۔

(۱۱) مفسر قرآن حضرت مولانا مفتی فضیل الرحمٰن ھلالی عثمانیؒ کے قلم سے

(سابق رکن تاسیسی: آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ وصدر: دارالسلام اسلامی مرکز، ملیر کوٹلہ پنجاب، الھند)

''یہ ناچیز محترم مفتی محمد سرور فاروقی ندوی صاحب کو اس عظیم خدمت پر دلی مبارکباد پیش کرتے ہوئے امید کرتا ہے کہ انشاء اللہ ان کی اس خدمت سے ہندی جاننے والے طبقے کو زیادہ سے زیادہ فائدہ پہنچے گا۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ مولانا کی یہ خدمت شرف قبولیت حاصل کرے''۔

(۱۲) مشفق ومربی حضرت مولانا سید عبداللہ حسنی ندویؒ کے قلم سے

(سابق ایڈیٹر: الرائد واستاذ حدیث: دارالعلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ)

''ہندی میں ترجمے کی بہت کمی تھی اگر ترجمے کچھ ہوئے بھی تو ان میں قرآنی ترجمے کے آداب کا پورا لحاظ اکثر ترجمے کرنے والوں نے نہیں رکھا، ضرورت تھی کہ کوئی اچھا ہندی داں جو عربی سے بھی واقف ہو اس کام کو انجام دیتا۔

بڑی خوشی کی بات ہے کہ دارالعلوم ندوۃ العلماء کے فاضل مفتی محمد سرور فاروقی صاحب ندوی نے مولانا فتح محمد خاں صاحب جالندھری کے ترجمے کو سامنے رکھتے ہوئے ہندی میں ترجمانی کی کوشش کی ہے اللہ تعالیٰ اس ترجمانی وتفسیر کو مقبول فرمائے اور تمام گمراہ لوگوں کے لئے اس کو ہدایت کا ذریعہ بنائے''۔

(۱۳) حضرت مولانا مفتی محب اللہ قاسمی مدظلہ العالی کے قلم سے

(مبلغ: مدرسہ رحمانیہ، دربھنگا، بہار)

''ہمیں اس بات کا اعتراف کرنے میں خوشی ہورہی ہے کہ مفتی محمد سرور فاروقی ندوی صاحب ایک عالمی ادارہ دارالعلوم ندوۃ العلماء سے فارغ ہونے کے ساتھ ہندی زبان سے واقف ہیں جو برابر تمام انسانوں کو جہنم سے نکال کر جنت میں لے جانے کا کام کرتے ہیں جس کے لئے انہوں نے بڑی تعداد میں اسلامی لٹریچر تیار کیا ہے، آپ جمعیت پیام امن کے صدر ہیں۔ جناب مولانا مفتی سرور فاروقی ندوی نے خاص طور سے اس ملک کے ہندی داں طبقے کی طرف سے شکریہ کے مستحق ہیں جنہوں نے انسانی ہدایت کا ایک بڑا تحفہ تیار کیا ہے''۔

(۱۴) حضرت مولانا زکریا ندوی مدظلہ العالی کے قلم سے

(استاذ حدیث وعمید کلیۃ شریعہ: دارالعلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ)

''اللہ نے محترم مفتی محمد سرور فاروقی کو ہندی سے واقفیت کو ان کے لئے اتنا مفید بنا دیا ہے جس کا اندازہ کرنا ان کی

کتابوں اور ہندی ترجمہ قرآن پاک اور ہندی تفسیر فاروقی کو پڑھے بغیر مشکل ہے قرآن مجید کی تفسیر وترجمہ کا کام خاص طور سے ہندی میں بہت مشکل ہے۔

ہندی پڑھنے والوں کے مذہب ذوق ومزاج کو سامنے رکھتے ہوئے یہ کام کرنا جتنا ضروری ہے اتنا ہی مشکل ہے لیکن بس توفیق کی بات ہے جس نے مولانا سے اتنا بڑا کام لے لیا ہے، اس کے بہت اچھے نتیجے سننے میں آئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ مفتی صاحب کی عمر اور کام میں برکت عطا فرمائے اور ان کی محنت اور کوششوں کو مزید بارآور کرے''۔

(۱۵) حضرت مولانا مفتی عتیق احمد قاسمی مدظلہ العالی کے قلم سے

(استاذ فقہ: دارالعلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ، وناظم: معہد الشریعہ، لکھنؤ)

''ہندی زبان میں اسلامیات پر کام کرنے والوں میں ایک معتبر نام جناب مولانا محمد سرور فاروقی ندوی کا ہے جو دارالعلوم ندوۃ العلماء کے ہونہار فاضل اور ہندی زبان میں بہت سی کتابوں کے مصنف ہیں، متوازع، ملنسار اور دھن کے پکے ہیں، انہوں نے قرآن کریم کا ہندی ترجمہ کیا ہے جس کے متعدد ایڈیشن شائع کر چکے ہیں۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ مولانا موصوف کی تمام دینی خدمات اللہ کی بارگاہ میں قبولیت حاصل کرے اور بندگان خدا کو ان سے زیادہ سے زیادہ نفع پہنچے''۔

(۱۶) حضرت مولانا محمد خالد ندوی غازیپوری مدظلہ العالی کے قلم سے

(عمید کلیہ الدعوۃ واستاذ حدیث: دارالعلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ وصدر: جمعیت معارف، لکھنؤ)

''اللہ کا لاکھ لاکھ احسان وکرم ہے کہ اس اہم ضرورت کو پورا کرنے کے لئے ہمارے فاضل مفتی محمد سرور فاروقی ندوی نے ایک مکمل تفسیر بزبان ہندی میں بڑی محنت ولگن سے تیار کیا ہے اور ہندوستانی ماحول کو اور سلف صالحین کے طریقے کو پیش نظر رکھتے ہوئے ہندوستانی لوگوں کی خدمت میں ایک نادر ونایاب قرآنی تحفہ پیش کیا ہے''۔

(۱۷) حضرت مولانا مفتی نیاز احمد صاحب ندوی مدظلہ العالی کے قلم سے

(استاذ حدیث وفقہ، ووکیل کلیۃ الشریعہ یعنی صدر مفتی دارالعلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ)

''مولانا مفتی محمد سرور فاروقی ندوی صاحب جو علوم شریعہ میں ماہر، ندوے کے ہونہار فاضل جن کی قرآنی علوم پر اچھی نگاہ ہے یہ ہندو مذہبی کتابوں سے بھی واقفیت رکھتے ہیں اور ہندو بھائیوں کے درمیان خاص طور سے ہندی زبان کو ذریعہ بنا کر دعوت کا کام کر رہے ہیں اس سے پہلے ان کا ہندی ترجمہ قرآن کا پیغام نام سے کئی ایڈیشن چھپ چکے ہیں جو ان کے مقبولیت کی دلیل ہے۔

چونکہ میں انہیں تقریباً پندرہ بیس سال سے دعوت کے کاموں میں مشغول دیکھ رہا ہوں جو ایک اچھی فکر کے حامل ہیں اور اللہ تعالیٰ ان کے اسی جزبہ کی وجہ سے ان سے بہت سے کام لے رہا ہے جس میں مدارس، مکاتب، اور نوجوانوں کی تربیت بھی شامل ہے۔ امید ہے کہ ہندی جاننے والوں کے لئے یہ ترجمہ وتفسیر مراجع کی حیثیت رکھے گی اللہ تعالیٰ امت کو استفادے کی توفیق عطا فرمائے''۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عرض مترجم

الحمد للّٰہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علی اشرف المرسلین وعلٰی آلہ وصحبہ ومن تبعھم إلی یوم الدین۔

قرآن مجید اللہ تعالیٰ کا کلام ہے۔اس سے پہلے جتنی بھی آسمانی کتابیں نازل ہوئیں، سب میں تحریف واقع ہوئی، مگر آج کی انسانیت کے پاس قرآن مجید کے سوا کوئی ایسی کتاب موجود نہیں جسے پورے یقین کے ساتھ الہامی کہا جاسکے۔یہی وجہ ہے کہ اس کے اعجاز وکمالات کا احاطہ کرنا اتنا ہی دشوار ہے جتنا کہ ذاتِ باری تعالیٰ کے جمال وکمال کو بیان کرنا۔نزولِ قرآن کے بعد سے لے کر آج تک دنیا کی مختلف زبانوں میں اس کے تراجم، تفاسیر اور لغات کے ساتھ ساتھ الفاظ ومعانی پر مبنی کتب کا تسلسل کے ساتھ منظر عام پر آنا اس بات کی واضح دلیل ہے کہ کلامِ الٰہی کی تشریح اور فہم کے لیے انسان ہر دور میں کوشاں رہا ہے۔لیکن حقیقت یہ ہے کہ جس طرح بندہ اپنے رب کے حضور عاجزی وبے بسی محسوس کرتا ہے، اسی طرح کلامِ الٰہی کے سامنے بھی انسان اپنی ناتوانی اور کم مائیگی کا شدید احساس کرتا ہے۔

قرآن کے الفاظ وآیات اپنی جامعیت اور وسعتِ معانی میں اس قدر گہرے ہیں کہ کسی بھی زبان میں ان کے ترجمے کا پورا حق ادا کرنا ممکن نہیں۔اس کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ دنیا کے تمام انسان ذہنی صلاحیت اور فکری استعداد کے اعتبار سے یکساں نہیں ہوتے۔ہر شخص کی ذہنی سطح کے مطابق وضاحت وتشریح کی ضرورت پڑتی ہے، اور یہی عمل اکثر نہایت مشکل بن جاتا ہے۔اسی بنا پر اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ذمہ داری عطا کی کہ وہ اس کے کلام کو لوگوں تک پہنچائیں، سنائیں، سکھائیں اور اس کو سمجھائیں بھی۔حقیقت یہ ہے کہ قرآن مقدس میں متقدمین اور متاخرین دونوں کے علوم کے خزانے پوشیدہ ہیں۔

قرآن کے علوم کا احاطہ انسانی بس سے باہر ہے۔البتہ بنیادی علومِ قرآن کے بارے میں علماء کے درمیان مختلف آرا پائی جاتی ہیں۔چنانچہ قاضی ابوبکر ابن العربیؒ کے نزدیک قرآن کے بنیادی علوم تین ہیں، جب کہ علی بن عیسیٰ الرمانیؒ نے ان کی تعداد تیس بتائی ہے۔علامہ جلال الدین سیوطیؒ نے اپنی مشہور کتاب ''الاتقان فی علوم القرآن'' میں ان آرا کو صراحت کے ساتھ نقل کیا ہے۔بہرحال، یہ حقیقت اپنی جگہ مسلم ہے کہ قرآن پاک میں غور وفکر اور تدبر کے بعد مرادِ الٰہی تک پہنچنے کے لیے بے شمار علوم کی ضرورت پیش آتی ہے، جن میں سب سے پہلا اور بنیادی درجہ لغاتِ قرآن کا ہے۔کیونکہ الفاظ کے صحیح معانی متعین کیے بغیر ان کی تہ تک رسائی ممکن نہیں اس لئے کہ ایک لفظ کئی کئی معانی کے لیے استعمال ہوتے ہیں مثلاً تقویٰ لفظ ہے۔جو کئی معنوں میں استعمال ہوا ہے جیسے:

● ''تقویٰ'' کا لفظ ایمان کے معنٰی میں اس طرح استعمال ہوا ہے: وَاَلْزَمَهُمْ كَلِمَةَ التَّقْوٰى (سورہ فتح آیت:۲۶) ''اور اللہ تعالیٰ نے انہیں تقوی کی بات (ایمان) پر جمائے رکھا''۔

● اور ایک معنٰی تقویٰ کا لفظ توبہ کے لئے بھی استعمال ہوا ہے جیسے: وَلَوْ اَنَّ اَهْلَ الْقُرٰٓى اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا (سورہ اعراف آیت: ۹۶) اور اگر بستیوں والے ایمان لے آئے ہوتے اور پرہیزگاری اختیار کی ہوتی (یعنی توبہ کر لیتے)۔

● اور ایک معنٰی لفظ تقویٰ کا ڈرنے کے معنٰی میں بھی استعمال ہوا ہے جیسے: اَنْ اَنْذِرُوْٓا اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاتَّقُوْنِ ۝ (سورہ نحل

:آیت ۲) ترجمہ: ''کہ تم لوگوں کو خبردار کرو کہ میرے سوا کوئی معبود نہیں ہے، لہٰذا مجھ سے ڈرتے رہو'' (میری ہی اطاعت کرتے رہو)۔

● اور ایک معنیٰ تقویٰ کا: ترکِ گناہ کے لئے بھی استعمال ہوا ہے جیسے: وَأْتُوا الْبُيُوتَ مِنْ أَبْوَابِهَا ۖ وَاتَّقُوا اللَّهَ (سورہ بقرہ آیت:۱۸۹) ''اور گھروں میں ان کے دروازے سے آؤ اور اللہ تعالیٰ سے تقویٰ اختیار کیے رہو'' (یعنی گناہوں سے بچتے رہو) وغیرہ وغیرہ۔

● اسی طرح لفظ أُمَّةً کے معنیٰ گروہ یا قوم کے ہیں جیسے: وَوَجَدَ عَلَيْهِ أُمَّةً مِّنَ النَّاسِ يَسْقُونَ (سورہ القصص: ۲۳) ''وہاں ایک گروہ کو پایا جو پانی پلا رہا تھا''۔ اور لفظ أُمَّةً کے دوسرے معنیٰ پیشوا کے بھی ہیں جیسے: إِنَّ إِبْرَاهِيمَ كَانَ أُمَّةً (سورہ النحل: ۱۲۰) ''بیشک ابراہیم خود ایک امت (پیشوا، کامل رہبر) تھے''۔

● اسی طرح لفظ الصَّلٰوۃ کے ایک معنیٰ نماز (عبادت) کے ہیں جیسے: أَقِيمُوا الصَّلٰوةَ (سورہ البقرہ: ۴۳) ''نماز قائم کرو''۔ اور لفظ الصَّلٰوۃ کے دوسرے معنیٰ دعا کے ہیں جیسے: خُذْ مِنْ أَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً... وَصَلِّ عَلَيْهِمْ (سورہ التوبہ: ۱۰۳) ''ان کے مال سے صدقہ لو اور ان کے لیے دعا کرو''۔

● اسی طرح لفظ روح کے ایک معنیٰ جان یا زندگی کی قوت کے ہیں جیسے: فَنَفَخْنَا فِيهِ مِن رُّوحِنَا (سورہ التحریم: ۱۲) ''تو ہم نے اس میں اپنی طرف سے روح پھونک دی''۔ اور لفظ روح کے دوسرے معنیٰ جبرئیل علیہ السلام کے بھی ہیں جیسے: نَزَلَ بِهِ الرُّوحُ الْأَمِينُ (سورہ الشعراء: ۱۹۳) ''اسے روح الامین لے کر نازل ہوئے''۔ اسی طرح اس کے ایک معنیٰ وحی کے بھی ہیں جیسے: وَكَذٰلِكَ أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ رُوحًا مِّنْ أَمْرِنَا (سورہ الشوریٰ: ۵۲) ''اور اسی طرح ہم نے آپ کی طرف اپنے حکم سے روح (وحی) بھیجی''۔

● اسی طرح لفظ نور کے ایک معنیٰ روشنی کے ہیں جیسے: جَعَلَ الشَّمْسَ ضِيَاءً وَالْقَمَرَ نُورًا (سورہ یونس: ۵) ''اللہ نے سورج کو روشن اور چاند کو نور بنایا''۔ اور لفظ نور کے دوسرے معنیٰ ہدایت یا ایمان کے بھی ہیں جیسے: قَدْ جَاءَكُم مِّنَ اللَّهِ نُورٌ وَكِتٰبٌ مُّبِينٌ (سورہ المائدہ: ۱۵) ''تمہارے پاس اللہ کی طرف سے نور اور واضح کتاب آچکی ہے''۔

● اسی طرح لفظ ولی کے ایک معنیٰ دوست یا مددگار کے ہیں جیسے: وَاللَّهُ وَلِيُّ الْمُؤْمِنِينَ (سورہ آل عمران: ۶۸) ''اللہ مومنوں کا دوست ہے''۔ اور لفظ ولی کے دوسرے معنیٰ حاکم یا اختیار رکھنے والا کے بھی ہیں جیسے: اَلنَّبِيُّ أَوْلٰى بِالْمُؤْمِنِينَ مِنْ أَنفُسِهِمْ (سورہ الاحزاب: ۶) ''نبی مومنوں پر ان کی جانوں سے بھی زیادہ حق رکھتے ہیں''۔

● اسی طرح لفظ کتاب کے ایک معنیٰ لکھی ہوئی چیز (آسمانی کتاب) کے ہیں جیسے: ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيهِ (سورہ البقرہ: ۲) ''یہ وہ کتاب ہے جس میں کوئی شک نہیں''۔ اور لفظ کتاب کے دوسرے معنیٰ حکم یا فیصلہ کے بھی ہیں جیسے: كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ (سورہ البقرہ: ۱۸۳) ''تم پر روزے فرض (لکھ دیے گئے) کیے گئے ہیں''۔

یہ حقیقت ہے کہ الفاظِ قرآنی کی مراد متعین کرنے کے لیے صرف کتبِ لغت کی جستجو کافی نہیں۔ صحیح مفہوم تک پہنچنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم عہدِ نبوی کی طرف رجوع کریں اور نبی اکرم ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے بیان کردہ معانی کو پیشِ نظر رکھیں۔

درحقیقت قرآن حکیم اپنے الفاظ، تراکیب، کلمات اور مضامین ہر پہلو سے سراپا اعجاز ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کی حقیقی تشریح کا حق ہر شخص کو نہیں پہنچتا بلکہ صرف انہیں جنہوں نے زبانِ رسالت سے نکلے ہوئے گوہر پاروں کو براہِ راست سنا یا ان شخصیتوں کو جو صحابہ کرامؓ کے زریں اقوال کی روشنی میں قرآن کی تفسیر و ترجمانی کو سینے سے لگائے رہے۔

یوں یہ سلسلہ خیر القرون سے آج تک تسلسل کے ساتھ جاری ہے اور ان شاء اللہ قیامت تک جاری رہے گا۔ قرآن پاک اور مرادِ الٰہی کی

صحیح تشریح ہمیشہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث اور علومِ نبوت کے حاملین کی روشنی میں سامنے آتی رہی ہے، اور ان اہلِ علم نے اس باب میں قیمتی علمی سرمایہ امت کے لیے چھوڑا ہے۔

البتہ قرآن کے عجائب واسرار لامحدود ہیں، جنہیں علماء ہر دور میں نئے انداز سے امت کے سامنے پیش کرتے رہے ہیں۔ اسی زرّیں سلسلے کی ایک کڑی یہ بھی ہے کہ قاری کی سہولت کے پیش نظر ہر صفحے پر اسی صفحے کے الفاظ کے معانی درج کر دیے گئے ہیں تاکہ مطالعہ آسان اور مفہوم واضح تر ہو جائے۔

ترجمہ کی دشواریاں:

کسی بھی زبان کے جملوں کو دوسری زبان میں بعینہٖ منتقل کرنا انسان کے بس کی بات نہیں۔ ایک کامیاب ترین مترجم بھی صرف قریب ترین مفہوم ہی ادا کرسکتا ہے۔ یہ تو عام عبارات کا حال ہے، پھر قرآنِ کریم جو سراپا معجزہ ہے اس کا مکمل ترجمہ کیسے ممکن ہوسکتا ہے؟ اسی لیے بعض علماء نے اسے ''ترجمۂ معانی القرآن'' کہا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ترجمے پر اکتفا کرنے والا وہ ذوق، وہ روحانی فیوض اور وہ حلاوت محسوس نہیں کرسکتا جو براہِ راست عربی عبارت سمجھنے والا پاتا ہے۔

عام طور پر ترجمے میں یہ بات اہم سمجھی جاتی ہے کہ وہ لفظی ہے یا بامحاورہ۔ لفظی ترجمہ اکثر مشکل اور الجھا ہوا ہو جاتا ہے کیونکہ عربی اور اردو کی نحوی ترتیب یکساں نہیں۔ دوسری طرف بامحاورہ ترجمہ بعض اوقات اصل عبارت سے کافی مختلف ہو جاتا ہے۔ بہتر یہی ہے کہ دونوں کے درمیان ایک معتدل راہ اختیار کی جائے: ترجمے کو بامعنیٰ اور قابلِ فہم رکھا جائے اور جہاں تک ممکن ہو لفظی معنوں اور قرآنی ترتیب کو بھی قائم رکھا جائے۔

عربی قواعد کے مطابق کچھ حروف ''مبانی'' کہلاتے ہیں اور کچھ ''معانی''۔ یہ بظاہر مختصر حروف ہوتے ہیں لیکن ان کے مفہوم سیاق و سباق کے لحاظ سے بدل جاتے ہیں، جیسے: ب، ف، علیٰ، اِلیٰ وغیرہ۔ مثال کے طور پر ''ف'' کا ترجمہ مختلف موقعوں پر ''پس، پھر، اس لیے، چنانچہ، لہٰذا'' ہوسکتا ہے۔ اسی طرح ''ل'' کبھی ''واسطے'' کے لیے آتا ہے اور کبھی ''چونکہ یا کیوں کہ'' کے لیے۔ ترجمے میں ان سب کی رعایت کرنا ضروری ہے تاکہ اصل مراد واضح ہو سکے۔

اسی طرح بعض الفاظ کئی معنوں کے حامل ہوتے ہیں جیسا کہ اوپر ذکر ہوا۔ مثلاً ''تقویٰ'' کے معنی ''ڈرنا'' بھی ہیں، ''ڈرائے رہنا'' بھی، اور ''بچنا یا پرہیز کرنا'' بھی۔ اسی طرح عربی زبان میں فعلِ مضارع حال اور مستقبل دونوں کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ بعض اوقات آخرت کے واقعات بیان کرنے میں ماضی کے صیغے لائے جاتے ہیں، حالانکہ مراد مستقبل ہوتی ہے۔ ''الف لام'' بھی کبھی استغراق کے لیے آتا ہے، کبھی جنس کے لیے اور کبھی عہد کے لیے۔ ان سب نکات کا خیال ترجمے میں رکھنا لازم ہے۔

تنوین (یعنی دو زبر، دو زیر، دو پیش) بھی معنی بدل دیتی ہے۔ کبھی یہ تعظیم کے لیے آتی ہے جیسے ''ظلم'' کا ترجمہ ''بڑا ظلم'' بن جائے گا، اور کبھی تحقیر کے لیے، جیسے ''شئ'' کا ترجمہ ''حقیر چیز'' یا ''معمولی چیز'' ہوگا۔ اس طرح کے اضافے الفاظِ قرآن سے باہر نہیں بلکہ انہی کے اندر پوشیدہ ہیں۔

بعض مواقع پر اسم فاعل کا ترجمہ مستقبل کے فعل میں کیا جاتا ہے، یا مشتق اسماء کو فعل سے ادا کیا جاتا ہے۔ مثلاً ''غفور'' کا ترجمہ ہوگا ''بہت معاف فرمانے والا ہے'' اور ''علیم'' کا ترجمہ ہوگا ''خوب جاننے والا ہے''۔

علمائے صرف نے مختلف ابواب اور افعال کے جو امتیازات بیان کیے ہیں وہ بھی ترجمے میں مدد دیتے ہیں۔ مثلاً ''تفعّل'' کے وزن میں محنت کے مفہوم ہوتے ہیں اور فعلِ ماضی میں ثبوت اور دوام کا پہلو پایا جاتا ہے۔

قرآنِ مجید کے بعض الفاظ مختلف مواقع پر مختلف معنوں میں آتے ہیں۔ مثلاً ''آیات'' کبھی نشانیوں کے لیے، کبھی آیاتِ قرآنی کے لیے اور

کبھی احکام کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ یا جیسا اوپر گزرا کہ ''تقویٰ'' کے معنیٰ کبھی ''ڈرنے'' کے ہیں اور کبھی ''بچنے'' کے۔ ان صورتوں میں مترجمین کے درمیان اختلاف ضرور ہوتا ہے مگر یہ اختلاف اساسی نہیں بلکہ محض طرزِ تعبیر کا فرق ہوتا ہے۔ اصل فیصلہ کلام کے سلسلے اور سیاق وسباق سے ہوتا ہے۔

افعال وضمائر میں جمع کے صیغہ کا استعمال

اکثر اُردو مترجمین نے اللہ تعالیٰ سے منسوب افعال اور ضمائر کے ترجمے میں واحد کا صیغہ اختیار کیا ہے، جیسے: اللہ معاف کرتا ہے، اے میرے رب! تو قبول فرما وغیرہ۔ غالباً اس طرزِ بیان کو اللہ کی بنیادی صفت توحید کے پیشِ نظر اختیار کیا گیا ہے۔ لیکن جب خود قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے اپنے لئے جمع متکلم کا صیغہ استعمال فرمایا ہے تو اس اسلوب کو ترجمے میں برتنا بالکل درست ہے اور اس میں کوئی قباحت نہیں۔

جمع کا صیغہ دراصل عظمت اور احترام کے اظہار کے لئے آتا ہے۔ عربی زبان میں واحد کے صیغے کو بے ادبی نہیں سمجھا جاتا، لیکن اُردو میں ''تو'' یا ''تم'' کی ضمیر عام طور پر خلافِ ادب شمار کی جاتی ہے۔ مثال کے طور پر: ''میرے دادا آئے'' یا ''ڈاکٹر صاحب! آپ نے مریض کو دیکھا'' کہنا فصیح اور مؤدبانہ ہے، لیکن اگر کہا جائے ''میرا دادا آیا'' یا ''تو نے مریض کو دیکھا'' تو اُردو محاورہ میں یہ اسلوب بے تکلفی بلکہ بعض مواقع پر گستاخی سمجھا جاتا ہے۔

اسی بنا پر اس ترجمے میں اللہ تعالیٰ سے منسوب افعال اور ضمائر کے لئے جمع کا صیغہ اختیار کیا گیا ہے اور مخاطب کے لئے ''تو'' یا ''تم'' کے بجائے ''آپ'' کا استعمال کیا گیا ہے۔ اسی طرح جہاں اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول ﷺ سے خطاب فرمایا ہے، وہاں بھی ''آپ'' کی تعبیر اختیار کی گئی ہے۔ مثلاً ''قُل'' کا ترجمہ ''کہہ دیجئے'' کے بجائے ''آپ کہہ دیجئے'' کیا گیا ہے تاکہ اسلوب زیادہ شائستہ، بلیغ اور ادب آشنا رہے۔

عرض حال

اللہ کے فضل اور اس کی توفیق سے، احقر نے ہندی داں طبقے کی خصوصی ضرورت کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے سب سے پہلے قرآن مجید کا ترجمہ ''قرآن کا پیغام'' (آسان ہندی ترجمہ) کے نام سے شائع کیا۔ اس کے بعد سات جلدوں پر مشتمل ''تفسیر فاروقی'' ہندی زبان میں منظرِ عام پر آئی۔ پھر ارادہ کیا کہ اردو میں ایسا لفظی ترجمہ پیش کیا جائے جو نہ صرف بامحاورہ اور رواں ہو بلکہ قاری کے اندر قرآن کی زبان سیکھنے کا شوق بھی پیدا کرے۔ اللہ کے فضل سے یہ خدمت ''لفظی رواں ترجمہ اور مختصر تفسیر'' کے عنوان سے شائع کرنے کی سعادت نصیب ہوئی۔ اس کے بعد ''لغات القرآن'' کے نام سے تین جلدوں پر مشتمل ایک مستقل کتاب کی اشاعت کی توفیق بھی ملی۔

الحمدللہ! یہ تفسیر پہلے ہی سات جلدوں میں ''تفسیر فاروقی'' کے نام سے شائع ہو چکی ہے۔ اب اسی کا اردو ترجمہ اردو داں طبقے کے لئے پیش کیا جا رہا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اس موقع پر شکرِ الٰہی کے اظہار کے لئے زبان وقلم قاصر ہیں کہ اس نے اپنی کتاب کی خدمت کے لئے اس گنہگار کو توفیق عطا فرمائی۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کوشش کو اپنی بارگاہ میں شرفِ قبولیت سے نوازے۔

خصوصیات وماٰخذ

(۱) اس تفسیر کی ترتیب روزانہ درس کی شکل میں کی گئی ہے۔ ہر درس میں تقریباً دس آیات درج کی گئی ہیں، پھر ان کا ترجمہ پیش کیا گیا ہے، اس کے بعد ہر آیت کی تشریح کی گئی ہے۔ تشریح میں سب سے پہلے آیت کا شانِ نزول، پھر اس سے متعلق احادیث، معتبر علماء کے اقوال، مسائل، جدید سائنسی تحقیقات، نیز غیر مسلموں کی طرف سے اٹھائے گئے اعتراضات کے مدلل جوابات درج کیے گئے ہیں۔ آخر میں ہر آیت سے متعلق فضائل بھی ذکر کیے گئے ہیں۔

(۲)اس تفسیر کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ کلمات کی وضاحت میں اتباعِ سلف کو بنیاد بنایا گیا ہے، جو اس تفسیر کی اصل روح ہے۔

(۳)الفاظ کی توضیح وتشریح کے مصادر میں عربی تفاسیر جیسے: تفسیر بیضاوی، تفسیر جلالین، تفسیر مظہری، تفسیر قرطبی اور معتبر اردو تفاسیر سے بھی استفادہ کیا گیا ہے۔ اسی طرح لغات وترکیبِ نحوی کے سلسلے میں اعراب القرآن (شیخ محی الدین درویش)، کلمات القرآن (مفتی شیخ حسنین محمد مخلوف)، قرآن مجید کا عربی اردو لغت، مکمل لغات القرآن، آسان لغات القرآن، مترادفات القرآن، مصباح اللغات وغیرہ سے بھی مدد لی گئی ہے۔

(۴) کئی مقامات پر وہ الفاظ جن کی مختصر وضاحت پہلے درج کی جا چکی ہے، انہیں دوبارہ لاتے ہوئے مزید تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔

آخر میں ہم ان تمام معاونین کے تہہ دل سے شکر گزار ہیں جنہوں نے اس عظیم کام کی تکمیل میں بھرپور تعاون کیا۔ خصوصاً والدہ محترمہ کی دعائیں، مشفق ومربی استاذ حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ کی سرپرستی اور رہنمائی، اور حضرت مولانا سعید الرحمٰن اعظمی ندوی دامت برکاتہم کی حوصلہ افزائی، جنہوں نے ایک موقع پر فرمایا کہ ''جس طرح اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤدؑ کے لئے لوہا مسخر کر دیا تھا، اسی طرح اللہ تعالیٰ نے آپ کے لئے قلم کو مسخر کر دیا ہے''۔ ایک اور موقع پر خاکسار نے تصحیح کی درخواست کی تو فرمایا کہ ''اللہ تعالیٰ نے جو بات آپ کے دل میں القاء کیا، آپ نے اسے تفسیر میں درج کر دیا میں اس میں ترمیم نہیں کرسکتا، یہ تو آپ کے لئے اللہ کی بہت بڑی نعمت ہے''۔ اسی طرح حضرت مولانا سید واضح رشید ندویؒ اکثر فرمایا کرتے تھے: ''آپ کو اتنا لکھنے کا وقت کیسے مل جاتا ہے؟'' اسی طرح جناب محمد اسمٰعیل صاحب ان کے عزیز جناب ابوبکر اسحاقؒ وزکریا اسحاقؒ واعظم اسحاقؒ وعائشہ ابوبکرؒ وحلیمہ آدمؒ وزبیدہ زکریاؒ جیسے حضرات کے ممنون ومشکور ہیں اور اللہ تعالیٰ سے دعا گو ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان سبھی حضرات کو نعم البدل عطا فرمائے۔

اسی طرح جناب عطاء اللہ صدیقی صاحب کے بھی شکر گزار ہیں جنہوں نے پوری دلچسپی سے اس کی کمپوزنگ اور طباعت کے مراحل میں تعاون کیا۔ اسی طرح تسنیم احمد صاحب، مولانا عبدالعظیم ندوی صاحب، اور خاکسار کے اہل خانہ (صادقہ، آفرین، محسنہ، آمنہ، عائشہ، ام ہانی، ذکریٰ، محمد ارقم، عبداللہ، سعد، حذیفہ، حنظلہ اور حمزہ سلمہ وغیرہ) نے قرآن مجید کے متن پر اعراب لگانے اور پروف کی تصحیح میں مسلسل محنت کی۔ اللہ تعالیٰ اپنے فضل وکرم سے ان سب کو بہترین اجر عطا فرمائے۔

اس تفسیر کے لئے جن بزرگوں نے اپنے تائیدی کلمات کے ذریعے ہمت افزائی فرمائی تھی، ان کے چند اقوال ابتداء میں اور مکمل کلمات آخر کی جلد میں شامل کر دیے گئے ہیں تاکہ قارئین ان سے بھی استفادہ کرسکیں۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ اس کوشش کو محض اپنے فضل سے اس گنہگار کے لئے حسنِ خاتمہ، آخرت کی نجات اور تمام انسانیت کے لئے ہدایت کا ذریعہ بنائے۔ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا إِنَّكَ أَنتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ۔

طالب دعا

محمد سرور فاروقی ندوی
(دارالعلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ)
۱۶ جنوری ۲۰۲۱ء/ مطابق ۳ر جمادی الاخریٰ ۱۴۴۲ھ

تفسیر فاروقی

جلد-اول

سورہ فاتحہ سے سورہ آل عمران آیت نمبر ۷ ۳ تک

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اَلْاِسْتِعَاذَۃُ

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ۝ **ترجمہ:** ''میں اللہ کی پناہ مانگتا ہوں شیطان مردود سے۔''

الإسْتِعَاذَہ کی تفسیر

قرآن مجید وہ عظیم کتاب ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر لفظ و معنیٰ کے ساتھ نازل ہوئی۔ اس کے تلاوت کرنے، چھونے اور سننے کے لیے بھی اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو آداب سکھائے ہیں۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

جیسا کہ ارشاد ہے:

فَاِذَا قَرَاْتَ الْقُرْاٰنَ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ۝۹۸

ترجمہ: ''جب آپ قرآن پڑھنے لگیں تو شیطان مَردود کے شر (برائی) سے اللہ کی پناہ مانگ لیا کریں''۔ **(سورہ نحل۔۹۸)**

وَاِمَّا یَنْزَغَنَّكَ مِنَ الشَّیْطٰنِ نَزْغٌ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰہِ ؕ اِنَّہٗ سَمِیْعٌ عَلِیْمٌ ۝۲۰۰

ترجمہ: ''اور اگر شیطان کی طرف سے تمہارے دل میں کسی طرح کا کوئی وسوسہ (برا خیال) پیدا ہو تو اللہ کی پناہ مانگو، بیشک وہ سب کچھ سننے والا اور جاننے والا ہے''۔ **(سورۃ اعراف۔۲۰۰)**

اسی طرح سورۃ مؤمنون میں فرمایا:

وَقُلْ رَّبِّ اَعُوْذُ بِكَ مِنْ ہَمَزٰتِ الشَّیٰطِیْنِ ۝۹۷ وَاَعُوْذُ بِكَ رَبِّ اَنْ یَّحْضُرُوْنِ ۝۹۸

ترجمہ: ''اور کہہ دیجئے! اے میرے رب! میں تجھ سے پناہ مانگتا ہوں شیطان کے وسوسوں سے اور اے میرے رب! میں تجھ سے پناہ مانگتا ہوں، اس سے کہ وہ (شیطان) میرے پاس آئے''۔

(سورہ مومنون۔۹۷،۹۸)

اسی طرح سورۃ فصّلت میں فرمایا:

وَاِمَّا یَنْزَغَنَّكَ مِنَ الشَّیْطٰنِ نَزْغٌ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ ؕ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ﴿۳۶﴾

ترجمہ: ”اور اگر شیطان کی طرف سے کوئی وسوسہ معلوم ہو، تو اللہ کی پناہ مانگو، بیشک وہ سب کچھ سننے والا، جاننے والا ہے“۔ (سورۃ فصلت۔۳۶)

● حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ فرماتے تھے:

اَللّٰهُمَّ اِنِّی أَعُوْذُ بِکَ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ، وَهَمْزِهٖ، وَنَفْخِهٖ، وَنَفْثِهٖ۔ (ابن ماجہ:۸۰۸)

● حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ دو آدمیوں نے رسول اللہ ﷺ کے پاس آپس میں گالی گلوج کیا۔ ان میں کا ایک آدمی اتنا غصہ ہوا کہ ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ اس کی ناک غصہ سے پھٹ جائیگی۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ میں ایک ایسا کلمہ جانتا ہوں جسے اگر یہ کہہ لے تو اس کا غصہ ختم ہو جائے۔ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نے پوچھا کہ اے اللہ کے رسول ﷺ وہ کون سا کلمہ ہے تو آپ ﷺ نے فرمایا:

”اَللّٰهُمَّ اِنِّی أَعُوْذُ بِکَ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ“ (ابوداؤد:۴۷۸۰)

اِستعاذہ یا تعوذ

لغوی طور پر ”استعاذہ“ کے معنی ہیں: پناہ مانگنا، کسی کی حفاظت میں آنا۔ قرآنی اصطلاح میں استعاذہ سے مراد ہے یہ کلمات ”اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ“ پڑھنے کو کہتے ہیں۔ اسی کو تعوذ بھی کہتے ہیں۔

اِستعاذہ یا تعوذ پڑھنے کا فائدہ

قرآن مجید کی تلاوت سے قبل اللہ تعالیٰ نے استعاذہ پڑھنے کا حکم دیا ہے، جس میں بے شمار حکمتیں پوشیدہ ہیں۔ ان میں سے ایک بڑی حکمت یہ ہے کہ شیطان ہمیشہ انسان کو نیکی سے دور کرنے کی سعی کرتا ہے، اسے گناہ اور برائی کی طرف مائل کرتا ہے۔ جبکہ تلاوتِ قرآن تمام نیکیوں کا سرچشمہ اور سب سے بڑی عبادت ہے جو بندے کو اللہ تعالیٰ کے قرب سے ہمکنار کرتی ہے۔ اسی لئے جب بندہ تلاوت شروع کرنے سے پہلے ”أعوذ باللّٰہ“ کہتا ہے تو گویا اپنے رب کے حضور عرض کرتا ہے: ”اے پروردگار! مجھ میں اتنی طاقت نہیں کہ میں اپنی قوت سے شیطان کا مقابلہ کر سکوں، اس کے شر پر غالب آسکوں۔ تیری مدد ہی میرا سہارا ہے، تیری حفاظت ہی میری ڈھال ہے۔ اگر تیرا فضل اور تیری رحمت شامل حال نہ ہو تو میں تلاوتِ قرآن جیسی عظیم عبادت انجام نہیں دے سکتا“۔

اسی طرح یہ بھی حقیقت آشکار ہوتی ہے کہ نہ صرف تلاوتِ قرآن بلکہ ہر نیکی کے آغاز میں شیطان کے وسوسوں

سے بچنے کے لیے استعاذہ پڑھ لینا نہایت مفید ہے۔اسی بنا پر اللہ کے رسول ﷺ کو بار ہا استعاذہ کی تلقین فرمائی گئی۔

وَقُلْ رَّبِّ اَعُوْذُبِكَ مِنْ هَمَزٰتِ الشَّيٰطِيْنِ ﴿۹۷﴾ وَاَعُوْذُبِكَ رَبِّ اَنْ يَّحْضُرُوْنِ ﴿۹۸﴾

(سورہ مومنون ۹۷،۹۸)

ترجمہ:''اے نبی ﷺ آپ کہہ دیجئے کہ اے پروردگار! میں تجھ سے پناہ مانگتا ہوں، شیاطین کے وسوسوں سے اور اے پروردگار! میں تجھ سے پناہ مانگتا ہوں اس سے کہ وہ شیطان میرے پاس آئے''۔پھر رسول اللہ ﷺ کو ''اِستعاذہ'' کا حکم ہوا اور ''قُلْ اَعُوْذُبِرَبِّ الْفَلَقِ اور قُلْ اَعُوْذُبِرَبِّ النَّاسِ'' میں شیطان، جن اور انس دونوں کا ذکر کیا گیا جیسا کہ اس آیت سے پتہ چلتا ہے۔

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا شَيٰطِيْنَ الْاِنْسِ وَالْجِنِّ يُوْحِيْ بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ زُخْرُفَ الْقَوْلِ غُرُوْرًا ؕ

ترجمہ:''اور ہم نے ہر نبی کے دشمن بہت سے پیدا کئے، کچھ انسان اور کچھ جنات، جن میں سے کچھ بعض بعض کو چکنی چپڑی باتوں کا وسوسہ ڈالتے رہتے تھے تاکہ دھوکے میں ڈال دیں''۔(سورۃ انعام ۱۱۲)

ابلیس کا تخت

حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:''ابلیس کا تخت سمندر پر ہے۔ وہ روزانہ اپنے لشکروں کو روانہ کرتا ہے تاکہ لوگوں کو فتنوں میں مبتلا کریں۔ جو ان میں سب سے زیادہ فساد پھیلانے والا ہوتا ہے، وہی ابلیس کے نزدیک سب سے زیادہ مرتبہ پاتا ہے۔''(صحیح مسلم:۷۱۰۵)

شیطان سے مراد یہی ابلیس ہے۔البتہ عربی زبان میں شیطان کے معانی ''باطل''، ''گمراہی'' اور ''ہلاکت'' کے ہیں۔اسی لئے ہر بُرائی، خواہ وہ جنات میں سے ہو، انسانوں میں سے یا حیوانوں میں سے، شیطان کہلاتی ہے۔

جنات

اللہ تعالیٰ نے ایک اور مخلوق پیدا کی جسے ''جن'' کہا گیا۔قرآن میں ان کا ذکر کثرت سے ملتا ہے۔ یہ بھی شریعت کے پابند ہیں، ان میں بھی موت وحیات ہوتی ہے اور ان میں بھی نیک وبد، مومن وکافر پائے جاتے ہیں۔

ابلیس کا انکار

جب اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو مٹی سے تخلیق فرما کر ان میں روح پھونکی تو فرشتوں کو حکم دیا کہ وہ

انہیں سجدہ کریں۔سب نے سجدہ کیا مگر ابلیس، جو اپنی عبادت وعلم کے باعث فرشتوں میں شامل تھا،تکبر میں آ کر انکار کر بیٹھا۔نتیجتاً اللہ نے اسے مردود قرار دے کر جلاوطن کر دیا۔اس نے مہلت کی درخواست کی کہ قیامت تک اسے زندگی دی جائے۔جب اس کی درخواست قبول ہوئی تو اس نے اعلان کیا کہ وہ آدم کی اولاد کو گمراہ کرے گا اور سیدھے راستے سے روکے گا۔اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ جو لوگ تیری پیروی کریں گے، وہ تیرے ساتھ جہنم میں جھونک دیے جائیں گے۔

● اسی لیے قرآن کی تلاوت سے پہلے یہ دعا کرنا چاہئے: ''اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطَانِ الرَّجِیْمِ ''یعنی ''میں اللہ کی پناہ لیتا ہوں مردود شیطان سے'' کیونکہ اس کے شر سے نجات صرف اللہ ہی کے سہارے ممکن ہے۔

مسائل

تعوذ پڑھنا تلاوتِ قرآن کے ساتھ خاص ہے۔دیگر کاموں کے آغاز میں صرف 'بِسْمِ اللّٰہ' پڑھنا کافی ہے،تعوذ سنت نہیں۔(فتاویٰ عالمگیری، باب رابع)

● امام ابوحنیفہؒ اور امام شافعیؒ کے نزدیک '' اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطَانِ الرَّجِیْمِ '' پڑھنا کافی ہے۔

● امام اوزاعیؒ اور حضرت سفیان ثوریؒ کے نزدیک یہ پڑھنا افضل ہے: اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطَانِ الرَّجِیْمِ اِنَّ اللّٰہَ ھُوَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْم

● بعض علماء کے نزدیک تلاوت کے بعد بھی '' اَعُوْذُ بِاللّٰہ '' پڑھ لینا بہتر ہے۔

● جمہور کے نزدیک نماز میں تعوذ اور بسم اللہ دونوں پڑھنا سنت ہے۔

● تلاوت شروع کرتے وقت پہلے ''اَعُوْذُ بِاللّٰہ '' اور پھر '' بِسْمِ اللّٰہ '' پڑھنا سنت ہے۔ہر سورت کے آغاز میں 'بِسْمِ اللّٰہ' پڑھنا بھی سنت ہے،سوائے سورہ براءت کے۔

❁❁❁

بسم اللہ الرحمن الرحیم

بَسْمَلَه کا مختصر تعارف

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝

ترجمہ: ''اللہ تعالیٰ کے نام سے (شروع کرتا ہوں) جو بڑا مہربان، نہایت رحم کرنے والا ہے۔''

'بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝' کے پڑھنے کو 'بَسْمَلَه' کہتے ہیں۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے عہد میں مشرکین اپنے کاموں کا آغاز بتوں یا دوسرے معبودانِ باطل کے نام سے کرتے تھے۔ اس غلط عقیدے کو مٹانے اور توحید کا شعور اجاگر کرنے کے لیے قرآن نے سب سے پہلے یہی آیت نازل فرمائی۔ یہ آیت سورۂ نمل کا حصہ بھی ہے اور سورۃ توبہ کے علاوہ ہر سورت کے آغاز میں درج ہے۔ اسی وجہ سے مفسرین کے درمیان اختلاف پایا جاتا ہے کہ آیا یہ تمام سورتوں کا جزو ہے یا ایک مستقل آیت۔ امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک یہ ایک مستقل آیت ہے جو سورتوں کے مابین امتیاز ظاہر کرنے کے لیے رکھی گئی ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہر کام کی ابتداء بسم اللہ سے فرمایا کرتے تھے، کیونکہ اس سے بڑھ کر سکون و اطمینان عطا کرنے والی اور کون سی چیز ہوسکتی ہے کہ بندہ اعلان کرے: ''میں اس اللہ کے نام سے آغاز کرتا ہوں جو بے حد مہربان اور نہایت رحم فرمانے والا ہے''۔

بسم اللہ کس سورت کا حصہ ہے؟

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے عہد میں تیار کیے گئے مصحفِ عثمانی میں سورۂ براءۃ کے سوا باقی تمام سورتوں کے آغاز میں بسم اللہ لکھی گئی۔ اس مصحف میں غیر قرآنی کسی چیز کا اندراج نہ تھا، حتیٰ کہ سورتوں کے نام، آیات کی گنتی اور ''آمین'' بھی نہیں لکھی گئی تھی تاکہ کوئی غیر قرآنی چیز قرآن کا حصہ نہ سمجھی جائے۔ ان تمام احتیاطوں کے باوجود ۱۱۳ سورتوں کے آغاز میں ''بسم اللہ'' درج کی گئی، جو اس بات کی دلیل ہے کہ یہ سورۂ نمل کی ایک آیت ہونے کے ساتھ ساتھ ایک مستقل آیت بھی ہے، جو ہر سورت کے آغاز میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل ہوتی تھی۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اس وقت تک یہ علم نہ ہوتا تھا کہ ایک سورت مکمل ہوگئی اور نئی سورت شروع ہونے والی ہے جب تک کہ ''بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝'' نازل نہ ہوجاتی۔ (ابوداؤد:۷۸۸)

اس سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ ''بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝'' قرآن مجید کی ایک آیت ہے۔ بعض علماء کے نزدیک سورہ براءت کے علاوہ یہ ہر سورت کی آیت ہے، لیکن امام مالکؒ اور امام ابوحنیفہؒ کی رائے یہ ہے کہ یہ نہ سورہ فاتحہ کی آیت ہے اور نہ ہی کسی دوسری سورت کی۔

اسی اختلاف کی بنیاد پر جہری نمازوں (جہاں قراءت بلند آواز سے کی جاتی ہے) میں سورہ فاتحہ سے پہلے ''بِسْمِ اللّٰه'' بلند آواز سے پڑھنے یا نہ پڑھنے کے بارے میں اہلِ علم کے درمیان اختلاف پایا جاتا ہے۔ جو حضرات اسے سورہ فاتحہ کی آیات میں شامل نہیں مانتے، وہ اسے بلند آواز سے پڑھنے کے قائل نہیں۔ جبکہ جو اسے ایک مستقل آیت قرار دیتے ہیں، ان کے نزدیک جہری نمازوں میں ''بِسْمِ اللّٰه'' آہستہ پڑھنا بہتر ہے۔ امام شافعیؒ اس کے برعکس جہری نمازوں میں سورہ فاتحہ اور ہر سورت سے پہلے اسے بلند آواز سے پڑھنے کے قائل ہیں، البتہ خلفائے راشدین، امام احمد بن حنبلؒ اور سفیان ثوریؒ وغیرہ کی رائے ہے کہ نماز میں ''بسم اللہ'' کو بلند آواز سے نہیں پڑھا جائے گا۔

ان علماء نے امام مسلم کی وہ روایت دلیل کے طور پر پیش کی ہے جس میں حضرت عائشہؓ بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نماز میں قراءت ''اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ'' سے آغاز فرماتے تھے۔ اسی طرح بخاری و مسلم کی روایت میں حضرت انسؓ سے بھی یہی منقول ہے کہ آپ ﷺ سورہ فاتحہ کا آغاز براہِ راست ''اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ'' سے کرتے تھے۔ (بخاری:۷۴۳)

۱۔ چونکہ ''بِسْمِ اللّٰه'' سورہ نمل کی آیت ہے اور سورتوں کے درمیان فرق ظاہر کرنے کے لیے الگ آیت کی صورت میں نازل ہوئی ہے، اس لیے اسے قرآن کی دیگر آیات کی طرح نہ تو بے وضو چھونا جائز ہے اور نہ ہی حالتِ ناپاکی میں پڑھنا۔

۲۔ نماز کی پہلی رکعت میں تعوذ (أَعُوْذُ بِاللّٰهِ) کے بعد ''بسم اللہ'' پڑھنا سنت ہے، البتہ اس بات میں اختلاف ہے کہ اسے بلند آواز سے پڑھا جائے یا آہستہ۔ امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک آہستہ پڑھنا افضل ہے۔ دوسری رکعتوں میں ''بسم اللہ'' پڑھنے پر سب کا اتفاق ہے، بلکہ بعض روایات میں تو ہر رکعت کے آغاز میں ''بسم اللہ'' پڑھنا واجب قرار دیا گیا ہے۔

جہاں تک سورہ فاتحہ کے بعد دوسری سورت کی ابتدا میں ''بسم اللہ'' پڑھنے کا تعلق ہے، تو یہ عمل نہ رسول اللہ ﷺ سے اور نہ ہی خلفائے راشدین سے ثابت ہے۔ یہی شیخین (ابوبکرؓ و عمرؓ) کا موقف تھا۔ تاہم امام محمدؒ سرّی نمازوں (جہاں قراءت آہستہ کی جاتی ہے) میں سورہ کے آغاز پر ''بسم اللہ'' پڑھنے کو بہتر قرار دیتے ہیں اور بعض روایات میں امام ابوحنیفہؒ کی طرف بھی اسی قول کی نسبت ملتی ہے کہ یہ افضل ہے۔ البتہ اس پر سب کا اتفاق ہے کہ اسے

پڑھنا کسی کے نزدیک مکروہ نہیں۔

بَسْمَلَه کی فضیلت

یہ حقیقت قرآن مجید کی متعدد آیات اور صحیح احادیث سے واضح ہوتی ہے کہ ایک مسلمان کی زندگی میں ''بِسْمِ اللّٰہ'' کی نہایت اہمیت ہے۔کوئی بھی عمل شروع کرنے سے پہلے ''بِسْمِ اللّٰہ'' کہنا خیر و برکت، اللہ کی مدد اور اس کی حفاظت کا ذریعہ ہے۔

● مسند احمد کی روایت ہے کہ ''بِسْمِ اللّٰہ'' کہنے سے شیطان ذلیل وخوار ہو جاتا ہے، یہاں تک کہ مکھی کی طرح حقیر بن جاتا ہے۔(ابوداؤد:۴۹۸۲)

● اسی وجہ سے کھانے، پینے، وضو کرنے، جانور ذبح کرنے اور دیگر تمام کاموں سے پہلے ''بِسْمِ اللّٰہ'' پڑھنا مستحب قرار دیا گیا ہے۔رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: جس کھانے پر ''بِسْمِ اللّٰہ'' نہ پڑھی جائے، اس میں شیطان کا حصہ ہوتا ہے۔(مسلم:۲۰۱۷)

● حضرت علیؓ سے روایت ہے کہ بیت الخلاء میں داخل ہوتے وقت ''بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْم'' پڑھنے سے جن وشیطان کی نگاہ انسان کے ستر تک نہیں پہنچتی۔(ترمذی:۶۰۶)

● ابوداؤد کی روایت ہے کہ ایک صحابی نے کھانے کی مجلس میں ''بِسْمِ اللّٰہ'' پڑھے بغیر کھانا شروع کیا۔جب آخر میں یاد آیا تو انہوں نے کہا: بِسْمِ اللّٰہِ اَوَّلُہٗ وَآخِرُہٗ۔ یہ دیکھ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مسکرا دیے اور فرمایا کہ شیطان نے جتنا کھایا تھا، ان کے ''بِسْمِ اللّٰہ'' پڑھتے ہی کھڑے ہو کر قے کر دیا۔(ابوداؤد:۳۷۶۸)

● حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: جب تم میں سے کوئی اپنی بیوی کے پاس جائے تو یہ دعا پڑھ لے:

بِسْمِ اللّٰہِ اَللّٰھُمَّ جَنِّبْنَا الشَّیْطَانَ وَجَنِّبِ الشَّیْطَانَ مَا رَزَقْتَنَا۔ (بخاری:۶۳۸۸)

● اسی طرح مسند احمد میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اونٹنی ایک مرتبہ پھسلی تو پیچھے بیٹھے صحابی نے کہا: ''شیطان کا برا ہو۔'' آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''یہ نہ کہو، اس سے شیطان خوش ہوتا ہے اور سمجھتا ہے کہ اس نے اپنی طاقت سے گرایا ہے۔تم صرف ''بِسْمِ اللّٰہ'' کہو، اس سے وہ مکھی کی طرح ذلیل و پست ہو جاتا ہے''۔(ابوداؤد:۴۹۸۲)

امام فخر الدین رازی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ قرآن مجید تمام پچھلی آسمانی کتابوں کا نچوڑ ہے، اور پورے قرآن کا خلاصہ سورۃ الفاتحہ میں ہے، جبکہ سورۃ الفاتحہ کا لب لباب ''بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْم'' میں مضمر ہے۔اس

سے بھی بڑھ کر یہ حقیقت ہے کہ ''بِسۡمِ اللہ'' کا خلاصہ اس کے پہلے حرف ''ب'' میں پوشیدہ ہے، جس کے معنیٰ ہیں: ''ملانا'' یا ''قریب کرنا''۔ اس طرح دیکھا جائے تو پورے قرآن کا مقصد انسان کو اللہ کے قریب لانا اور بھٹکے ہوئے دلوں کو اس سے جوڑ دینا ہے۔

❁❁❁

تفسیر: بسم اللہ الرحمٰن الرحیم یعنی بسملہ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

''اللہ کے نام سے (شروع کرتا ہوں) جو بڑا مہربان، نہایت رحم کرنے والا ہے''

بِسْمِ اللّٰهِ میں تین حروف ہیں (۱)ب (۲) اسم (۳) اللہ۔

حرف ''ب'' کے متعدد معنیٰ ہیں، مگر یہاں تین پہلو زیادہ موزوں معلوم ہوتے ہیں:

۱۔مصاحبت کے، یعنی اللہ کے نام کے ساتھ۔

۲۔استعانت کے، یعنی اللہ کے نام کی مدد سے۔

۳۔تبرک کے، یعنی اللہ کے نام کی برکت سے، جو سب سے بڑا نام ہے اور جس میں تمام صفات جمع ہیں۔

بعض لوگوں نے ہندی، انگلش یا دیگر زبانوں میں ''اللہ'' کا ترجمہ مختلف ناموں سے کرنے کی کوشش کی ہے، مگر حقیقت یہ ہے کہ ''اللہ'' کا کوئی ترجمہ ممکن ہی نہیں۔

یہاں بہتر یہی ہے کہ ''ب'' کا تعلق ایک مقدر فعل (Verb) سے مانا جائے، یعنی یہ تصور کیا جائے کہ ہر کام کی ابتدا اللہ کے نام سے ہو۔اس طرح حرف ''اللہ'' جملے کے آغاز میں رہے گا اور ''ب'' اصولِ رسم الخط کے مطابق ''الف'' کے ساتھ ملا کر لکھا جانا چاہیے تھا: بِاسْمِ اللّٰهِ۔تاہم ''مصحفِ عثمانی'' میں اس کی رعایت کی گئی ہے کہ ''ہمزہ'' کو حذف کر دیا گیا اور ''ب'' کو براہِ راست ''س'' کے ساتھ ملا دیا گیا تا کہ لفظ ''اسم اللہ'' سے ابتداء زیادہ قریب ہو سکے۔

اس کے برعکس سورہ علق کی آیت ''اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ'' میں ''ب'' کو ''س'' کے ساتھ نہیں ملایا گیا بلکہ ''الف'' کے ساتھ لکھا گیا ہے۔حافظ ابن کثیر لکھتے ہیں کہ جب کوئی شخص کسی کام کا آغاز کرے تو اس کی نیت یہ ہونی چاہیے کہ میں اس کام کی شروعات اللہ کے نام سے کر رہا ہوں۔

اسی طرح ''بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ'' میں اللہ تعالیٰ کے تین خاص نام آئے ہیں: (۱) اللہ۔(۲) رحمٰن۔(۳) رحیم۔یہ تینوں نام ایک خاص ترتیب اور معنیٰ خیزی کے ساتھ بیان کیے گئے ہیں۔

لفظ 'اَللّٰه' کی تفسیر

لفظ ''اللہ'' اسمِ ذات (Proper Noun) ہے، یعنی اس کائنات کے پیدا کرنے اور چلانے والے ربّ کا

خاص نام ہے۔اس کے علاوہ باقی تمام نام جیسے رحمٰن، رحیم، کریم، ستّار وغیرہ دراصل اس کی صفات ہیں، اس لئے یہ اسمِ صفت (Proper Adjective) کہلاتے ہیں۔

لفظ ''اللہ'' اصل میں ''اِلٰہ'' سے ماخوذ ہے، جس کے لفظی معنی ہیں ''معبود''۔ یہ لفظ ''الف، لام اور ہ'' کے حروف سے مرکب ہے۔کلدانی زبان اور سریانی زبان کا ''الٰہیہ''، عبرانی زبان (Hebrew) کا ''الوہ'' اور عربی کا ''اللہ'' سب اسی اصل سے نکلے ہیں۔ جب ''اِلٰہ'' پر ''الف'' اور ''لام'' کا اضافہ کیا گیا تا کہ عام کو خاص بنایا جائے تو وہ ''اللہ'' بن گیا۔اس کے استعمال نے اس نام کو صرف اور صرف اس ہستی کے لئے مخصوص کر دیا جو تمام جہانوں کا خالق ہے۔

اگرچہ مفسرین کے مابین اس کے لسانی پہلو پر اختلاف موجود ہے، لیکن خلاصہ یہ ہے کہ ''اللہ'' وہ واحد اور یکتا معبود ہے جس کے اندر ایسے کمالات اور صفات پائے جاتے ہیں جو کسی اور میں ممکن ہی نہیں۔اس نام کا نہ تثنیہ آتا ہے نہ مؤنث، نہ یہ کسی اور لفظ سے مرکب ہے اور نہ ہی اس کا ترجمہ کسی دوسری زبان میں ہوسکتا ہے۔اس لئے ''اللہ'' اپنے اندر بے شمار معانی سموئے ہوئے ہے۔ وہی انسان کو سکون اور پناہ دینے والا ہے، تمام صفاتِ کمال کا مالک، قادرِ مطلق، ازل سے موجود اور ابد تک باقی رہنے والا ہے۔ وہی اس کائنات کا خالق و مالک ہے اور اس کے سوا کوئی بھی عبادت کے لائق نہیں۔انسان جتنا بھی غور کرے، اللہ کی حقیقت کو پوری طرح سمجھ نہیں سکتا۔اس کی معرفت میں جتنا غوطہ لگایا جائے، عقل اُسی قدر مزید وسعت پاتی ہے۔

لفظ الرَّحْمٰن کی تفسیر

اسی طرح لفظ ''الرَّحْمٰن'' کا ترجمہ بھی محض ''رحمٰن'' کہہ دینے سے پورا ادا نہیں ہوتا۔ یہ اسمِ ذات کی طرح ایک خاص نام ہے جو صرف اللہ کے لئے استعمال ہوتا ہے اور اس کی رحمت و محبت کی بے پایاں وسعت کو ظاہر کرتا ہے۔ عربی زبان میں ''فُعْلَانٌ'' اور ''فَعِیْل'' دونوں اوزان مبالغہ کے لئے آتے ہیں۔ اس لئے ''الرَّحْمٰن'' اور ''الرَّحِیمِ'' دونوں میں رحمت کی صفت کو انتہائی تاکید اور شدت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔فرق یہ ہے کہ ''رحمٰن'' میں رحمت کا عموم پایا جاتا ہے، یعنی دنیا و آخرت میں سب مخلوقات کے لئے، جبکہ ''رحیم'' کی صفت زیادہ تر مومنین کے لئے خاص ہے۔یہی وجہ ہے کہ قرآن میں فرمایا گیا: وَكَانَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَحِيْمًا۔ (سورہ احزاب آیت ۴۳)

اس طرح ''رحمٰن'' رحمت کے عموم اور وسعت کو بیان کرتا ہے، جبکہ ''رحیم'' رحمت کے کمال اور اس کے خاص مظاہر کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

بعض علمائے تفسیر کے نزدیک ''اَلرَّحْمٰن'' احسانِ عام کے مفہوم میں ہے۔یعنی اللہ کی رحمت ہر مخلوق پر

یکساں طور پر محیط ہے،خواہ مومن ہو یا کافر۔تاہم وہ ''اَلرَّحِیْمِ'' کو محض مومنوں کے ساتھ خاص نہیں مانتے۔ان کے نزدیک لفظ ''رَحْمٰن'' اس ذات کے لئے ہے جس کی نعمتوں کا فیض عام ہو،مگر یہ فیض وقتی بھی ہوسکتا ہے، کیونکہ عربی زبان میں اس وزن پر آنے والی صفات زیادہ تر فعل کے وقت پر دلالت کرتی ہیں۔لیکن ''اَلرَّحِیْمِ'' ہمیشہ اور مستقل رحمت پر دلالت کرتا ہے۔چنانچہ جب کوئی عربی داں اللہ کی صفت ''اَلرَّحْمٰن'' سنتا ہے تو وہ سمجھتا ہے کہ اللہ کی نعمتیں سب کے لئے عام ہیں،مگر اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ یہ رحمت ہمیشہ باقی رہے۔لیکن جب وہ ''اَلرَّحِیْمِ'' سنتا ہے تو اسے یقین ہوجاتا ہے کہ اللہ کی رحمت ابدی اور دائمی ہے، جو کبھی اس سے جدا نہیں ہوگی۔

اسی بنا پر ''اَلرَّحْمٰن'' ایک ایسی صفت ہے جو صرف اللہ کے ساتھ خاص ہے اور غیر اللہ کے لئے اس کا استعمال جائز نہیں۔جیسا کہ قرآن میں ہے:قُلِ ادْعُوا اللّٰهَ اَوِ ادْعُوا الرَّحْمٰنَ ؕ (سورہ بنی اسرائیل:۱۱۰)

● '' اَلرَّحِیْمِ '' ایسی صفت ہے جسے غیر اللہ کے لئے بھی بولا جاسکتا ہے۔چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول ﷺ کے بارے میں فرمایا:بِالْمُؤْمِنِیْنَ رَءُوْفٌ رَّحِیْمٌ۔(سورہ توبہ:۱۲۸) ''یعنی وہ مؤمنین کے ساتھ مہربانی اور رحم کرنے والے ہیں''۔

انسانوں میں بھی یہ صفت تب ظاہر ہوتی ہے جب کوئی شخص کسی مجبور پر ترس کھا کر اس کی حاجت پوری کر دے، وہ بھی بغیر کسی بدلے یا غرض کے۔مثلاً، اگر کوئی بھوکا ہو اور دوسرا شخص محض ہمدردی کے تحت اسے کھانا فراہم کرے تو یہ رحمت ہے۔

اس طرح کہا جاسکتا ہے کہ ''رَحْمٰن'' کی شان عام ہے،خواہ مومن ہو یا کافر،سب پر اس کی رحمت برس رہی ہے۔مگر ''رَحِیْمِ'' کا ظہور بالخصوص ایمان والوں کے لئے ہے،اور اس کی حقیقت آخرت میں زیادہ واضح ہوگی۔

قرآن مجید میں '' اَلرَّحْمٰن '' کو اسمِ علم (Noun) کے طور پر بھی استعمال کیا گیا ہے اور یہ کئی مقامات پر اسی شان کے ساتھ آیا ہے۔

(۱) اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى (سورہ طٰہٰ:۵)

(۲) وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ (سورہ فرقان:۶۳)

(۳) اَلرَّحْمٰنُ عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ (سورہ رحمٰن:۲۱)

(۴) قُلِ ادْعُوا اللّٰهَ اَوِ ادْعُوا الرَّحْمٰنَ (سورہ:بنی اسرائیل:۱۱۰)

ان آیات میں ''اَلرَّحْمٰنِ'' اللہ کی صفت کے طور پر نہیں۔اسم علم (Noun) کے طور پر استعمال ہوا ہے۔

(تفسیر سورہ بنی اسرائیل)

لفظ اَلرَّحِیْمِ

لفظ ''اَلرَّحِیْمِ'' عربی قواعد کے مطابق 'فَعِیْل' کے وزن پر ہے، یہ اُن صفات کے لیے استعمال ہوتا ہے جو ہمیشہ سے ہوں اور ہمیشہ باقی رہیں۔ اس اعتبار سے ''اَلرَّحِیْمِ'' کے معنٰی ہیں: وہ ذات جو ازل سے ابد تک ہمیشہ مہربانی کرنے والی ہے اور جس کی رحمت کبھی منقطع نہیں ہوتی۔

اسی حقیقت کے پیشِ نظر رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنت تھی کہ آپ ہر کام کی ابتدا ''بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ؕ'' سے فرمایا کرتے۔ گویا آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے ہر عمل کو اللہ کی مدد، اس کی دائمی رحمت اور اسی کی قدرت پر بھروسہ کرتے ہوئے شروع کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ نے امت کو بھی تعلیم دی کہ قرآن کی ہر سورت کی تلاوت اسی نامِ اقدس سے آغاز کرو۔

اللہ کے ناموں پر ایمان

اہلِ حق علماء کا اجماعی موقف ہے کہ اللہ تعالیٰ کے وہ تمام نام اور صفات، جو قرآن و حدیث میں وارد ہوئے ہیں، ان پر ویسے ہی ایمان لانا واجب ہے جیسے وہ بیان ہوئے ہیں، نہ ان کی کیفیت بیان کی جائے گی اور نہ ہی ان کی تاویل کی جائے گی۔ چنانچہ جب امام مالکؒ سے ''اِسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ'' کے بارے میں سوال ہوا تو آپ نے فرمایا: ''اِسْتَوٰی معلوم ہے، اس کی کیفیت نامعلوم ہے، اس پر ایمان لانا واجب ہے اور اس پر بحث کرنا بدعت ہے''۔

ہر عمل کی شروعات اللہ کے نام سے

قرآن کا کوئی رکوع اللہ کے ذکر سے خالی نہیں، اور یہی اس کے کلامِ الٰہی ہونے کی سب سے بڑی دلیل ہے۔ اس لیے ہدایت دی گئی کہ ہر اہم کام 'بِسْمِ اللّٰہِ' کہہ کر شروع کیا جائے۔ جب کام مکمل ہو تو 'اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ' کہا جائے، تعجب پر 'سُبْحَانَ اللّٰہِ'، آئندہ کے ارادے پر 'اِنْشَاءَ اللّٰہِ'، خطا پر 'اَسْتَغْفِرُ اللّٰہِ'، وسوسے پر 'لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّۃَ اِلَّا بِاللّٰہِ' اور مصیبت پر 'اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ'' پڑھنا سکھایا گیا ہے۔ اس مختصر مگر جامع تعلیم کے ذریعے انسان اپنی زندگی کے تمام معاملات کو براہِ راست اپنے رب سے جوڑ لیتا ہے اور ہمیشہ اس کی قربت میں رہتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے تمام دعوتی خطوط، جو مختلف بادشاہوں اور حکمرانوں کو بھیجے تھے، ان کی ابتدا بھی ''بِسْمِ اللّٰہِ'' ہی سے فرمائی۔

اسلام چونکہ امن و سکون کا دین ہے، اسی لیے اس کی ابتدا ''حمد'' سے کی گئی ہے اور ہر عمل اللہ کے نام سے شروع کرنے کی تعلیم دی گئی ہے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ انسان ہر لمحہ اس حقیقت کو یاد رکھے کہ اس کا وجود اور اس کا کوئی

بھی کام اللہ کی مشیت اور اس کی مدد کے بغیر ممکن نہیں۔ یوں انسان کی پوری زندگی عبادت کا پیکر بن جاتی ہے۔

کھانا ہی کو لیجیے؛ ایک کافر بھی کھاتا ہے اور ایک مسلمان بھی۔ مگر فرق یہ ہے کہ مسلمان لقمہ اٹھانے سے پہلے ''بِسْمِ اللّٰہِ'' کہہ کر اس حقیقت کا اعتراف کرتا ہے کہ یہ رزق محض اس کی کوشش کا نتیجہ نہیں۔ یہ لقمہ زمین سے اگنے سے لے کر تیار ہونے تک سورج و چاند کی گردش، بارش کے نزول، زمین و آسمان کی قوتوں اور بے شمار انسانوں کی محنت کا محتاج رہا ہے۔ ان تمام اسباب کو حرکت میں لانے والی ذات صرف اللہ ہے۔ یہی احساس کھانے کو ایک عام ضرورت سے بڑھا کر ذکرِ الٰہی اور عبادت بنا دیتا ہے اور اس جسم سے صادر ہونے والا ہر عمل بھی اللہ کی یاد سے جُڑ جاتا ہے۔

مسائل

● پہلی رکعت کے آغاز میں ''اَعُوْذُ بِاللّٰہِ'' کے بعد ''بِسْمِ اللّٰہِ'' پڑھنا تمام ائمہ کے نزدیک واجب ہے۔ اختلاف صرف اس بات میں ہے کہ اسے بلند آواز سے پڑھا جائے یا آہستہ۔ امام ابوحنیفہؒ نے آہستہ پڑھنے کو راجح قرار دیا ہے۔

❁❁❁

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

قرآن مجید اور نزول وحی کے سلسلے میں مستشرقین کے اعتراضات

بعض مستشرقین نے قرآنِ مجید کے کلام الٰہی ہونے پر اعتراضات کیے ہیں اور ان کا کہنا ہے کہ ''قرآن دراصل انسانی ذہنی تجربات اور اُس وقت کے تاریخی ومعاشرتی ماحول کی عکاسی ہے، یہ وحیِ الٰہی نہیں۔'' ان کے نزدیک قرآن کی تعلیمات محض انسانی فکر وشعور کا نتیجہ ہیں جو عرب معاشرت کے رسم ورواج اور اُس دور کے حالات سے متأثر ہوکر سامنے آئیں۔

اس کے علاوہ بھی انہوں نے بے شمار اعتراضات کیے ہیں؛ کبھی وہ اسے سابقہ ادیان سے مأخوذ قرار دیتے ہیں، کبھی اس کے اسلوب کو انسانی کلام ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور کبھی اس کی تاریخی روایت پر اعتراض جتاتے ہیں۔ تاہم ان تمام اعتراضات کا احاطہ یہاں ممکن نہیں۔ اس موضوع پر تفصیلی مطالعہ کے خاکسار کی دوسری کتاب ''غیر مسلم بھائیوں کے اعتراضات کے جوابات'' سے رجوع کر سکتے ہیں، جہاں ان اعتراضات کو دلائل وبراہین کی روشنی میں تفصیل کے ساتھ درج کیا گیا ہے۔

یہاں صرف چند اعتراضات بطورِ نمونہ پیش کیے گئے ہیں تاکہ قاری کو اندازہ ہو سکے کہ قرآن پر کیے گئے اعتراضات درحقیقت علمی حیثیت نہیں رکھتے بلکہ اکثر تعصب یا ناقص مطالعہ کا نتیجہ ہوتے ہیں۔

چند اعتراضات کی فہرست

(۱) یہ کہ قرآن مجید وحی الٰہی نہیں ہے بلکہ قرآن محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تصنیف ہے جسے محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہود ونصاریٰ یا دیگر اہل کتاب سے سیکھ کر قرآن بنایا ہے۔ (۲) اسی طرح یہ کہ قرآن میں یہودی وعیسائی روایات سے مأخوذ قصے کہانیاں ہیں جیسے: اصحاب کہف، ذوالقرنین وغیرہ۔ (۳) یہ کہ قرآن میں بعض الفاظ غیر عربی (عجمی) ہیں، اس لیے یہ ''خالص عربی'' نہیں اور اس کا اسلوب غیر مرتب اور غیر منظم ہے (موضوع ایک دم بدل جاتا ہے)۔ (۴) یہ کہ تکرار بہت زیادہ ہے (مثلاً تقویٰ، جنت وجہنم، قصص انبیاء کے بارے میں اور قرآن کی بعض آیات سائنسی حقائق کے خلاف ہیں (مثلاً آسمان کو چھت کہنا، سورج کا غروب ہونا، زمین کو بچھونا کہنا)۔ (۵) یہ کہ جنات، فرشتے اور معجزات کا تصور عقل وسائنس کے خلاف ہے۔ (۶) اس قرآن میں جہاد کی آیات میں تشدد اور غیر مسلموں کے قتل کا حکم موجود ہے اور یہ کہ خواتین کے حقوق سے متعلق آیات کو غیر مساوی قرار دیتا ہے جیسے: وراثت، تعددِ ازدواج وغیرہ۔ (۷) یہ کہ غیر

مسلموں پر بعض پابندیاں تھیں جو غیر عادلانہ ہیں۔(۸) یہ کہ قرآن کا آج کا نسخہ اصل سے مختلف ہے اس لئے کہ حضرت عثمانؓ نے اصل قرآن کو جلا کر ایک نیا مصحف مرتب کیا اور اس میں مختلف قراءات (قراءتیں) اس بات کا ثبوت ہیں کہ قرآن میں یکسانیت نہیں۔(۹) یہ کہ توحید کے باوجود قرآن میں صفاتِ خدا کثرت سے آتی ہیں، جو مشرکانہ جھلک دیتی ہیں۔(۱۰) یہ کہ آخرت، جنت، دوزخ کے بیانات غیر منطقی یا اساطیری ہیں اور یہ کہ تقدیر اور آزادیِ ارادہ کا تضاد ہے۔(۱۱) یہ کہ قرآن میں بعض جگہ تضادات پائے جاتے ہیں۔(۱۲) یہ کہ قرآن نے عربی تہذیب و ماحول کو فوقیت دی گئی ہے، اس لیے یہ ''عالمگیر کتاب'' نہیں اور یہ کہ قرآن میں تاریخی و جغرافیائی غلطیاں ہیں (ان کے دعوے کے مطابق) وغیرہ۔

قرآن مجید اور نزول وحی پر اعتراض کی حقیقت

اعتراض نمبر ۱: وحی اور نزولِ قرآن کے متعلق بعض مستشرقین کا اعتراض ہے کہ قرآنِ مجید وحیِ الٰہی نہیں، بلکہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تصنیف ہے، اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کے مضامین اور قصص یہودی و عیسائی علماء اور ان کی مذہبی روایات سے اُخذ کر کے مرتب کیے ہیں۔

جواب نمبرا: یہ اعتراض نیا نہیں ہے؛ عہدِ نبوی میں بھی مخالفینِ اسلام کی طرف سے اس نوعیت کے الزامات عائد کیے گئے تھے۔اس اعتراض کے جواب میں چند بنیادی نکات قابلِ غور ہیں:

۱۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا اُمّی ہونا

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نبوت سے پہلے کسی معروف درس گاہ میں باقاعدہ تعلیم حاصل نہیں کی، نہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کسی یہودی یا عیسائی عالم کے مستقل شاگرد رہے اور نہ ہی سابقہ مذہبی کتابوں کے باقاعدہ مطالعے اور تصنیف کا کوئی معتبر تاریخی ثبوت ملتا ہے۔قرآن بھی اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس سے پہلے کتابیں پڑھنے اور لکھنے میں مشغول نہ تھے۔(سورۃ العنکبوت:۴۸)

ایسی صورت میں یہ دعویٰ کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تورات، انجیل اور دیگر مذہبی روایات کا منظم مطالعہ کر کے قرآن تیار کیا، اس کا کوئی تاریخی ثبوت موجود نہیں ہے۔

۲۔ کسی یہودی یا عیسائی استاذ کا عدمِ ثبوت

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی کے ابتدائی چالیس سال اہلِ مکہ کے سامنے گزرے۔آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مخالفین

آپ کی زندگی اور معاملات سے واقف تھے،لیکن کسی ایسے یہودی یا عیسائی عالم کا مستند تاریخی ثبوت پیش نہیں کیا جاسکا جس سے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مسلسل تعلیم حاصل کی ہواور پھر اسی تعلیم کی بنیاد پر قرآن مرتب کیا ہو۔اگر قرآن کسی انسانی استاد سے حاصل کردہ تعلیم کا نتیجہ ہوتا تو اس استاد، تعلیمی مدت، مقام اور طریقۂ تعلیم کا کوئی واضح تاریخی ریکارڈ ہونا چاہیے تھا،خصوصاً اس لیے کہ مخالفینِ اسلام آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خلاف دلائل تلاش کرنے میں سرگرم تھے۔

۳۔قرآن کا تدریجی نزول

قرآنِ مجید کسی مصنف کی طرح ایک وقت میں بیٹھ کر لکھی جانے والی کتاب نہیں تھی، بلکہ تقریباً تیئیس سال کے عرصے میں مختلف حالات اور واقعات کے موقع پر اس کے حصے سامنے آتے رہے۔کبھی کسی سوال کا جواب دیا گیا، کبھی کسی نئے واقعے کے متعلق ہدایات آئیں اور کبھی اجتماعی، اخلاقی اور قانونی مسائل پر رہنمائی دی گئی۔اس تدریجی اور حالات سے مربوط ظہور کو محض پہلے سے تیار کردہ انسانی تصنیف قرار دینے کے لیے مضبوط تاریخی شواہد درکار ہیں۔

۴۔قرآن اور سابقہ مذہبی روایات میں فرق

یہ درست ہے کہ قرآن میں حضرت آدمؑ،نوحؑ، ابراہیمؑ،موسیٰؑ، داؤدؑ اور عیسیٰؑ جیسے انبیاء کا ذکر موجود ہے اور ان میں سے بہت سے واقعات یہودی وعیسائی مذہبی روایات میں بھی ملتے ہیں۔لیکن مشترک موضوعات کا پایا جانا بذاتِ خود نقل یا سرقے کی دلیل نہیں ہوتا۔مزید یہ کہ قرآن سابقہ روایات کو ہمیشہ بعینہٖ نقل نہیں کرتا، بلکہ متعدد مقامات پر اس کا بیان،مقصد،ترتیب اور مذہبی مفہوم مختلف ہوتا ہے۔اسلامی نقطۂ نظر سے اس اشتراک کی وجہ یہ ہے کہ تمام انبیاء کی اصل دعوت کا سرچشمہ ایک ہی اللہ تعالیٰ کی طرف سے تھا۔

۵۔رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دعوت اور ذاتی مفاد کا فقدان

اگر قرآن آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذاتی تصنیف ہوتا تو یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس تصنیف سے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا مقصد کیا تھا؟ابتدائی دورِ دعوت میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دولت،اقتدار اور آرام حاصل ہونے کے بجائے مخالفت،معاشرتی مقاطعہ،ظلم وستم، ہجرت اور جنگوں جیسے شدید حالات کا سامنا کرنا پڑا۔مزید یہ کہ قرآن میں بعض مقامات پر خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو تنبیہ اور اصلاحی ہدایات بھی دی گئی ہیں۔کسی شخص کی اپنی تصنیف ہونے کے مفروضے میں ایسے مقامات خصوصی توجہ کے مستحق ہیں۔

۶۔قرآن کا منفرد اسلوب

قرآن کا اسلوب نہ عام عربی نثر کے قالب میں مکمل طور پر آتا ہے اور نہ عربی شاعری کے معروف اوزان

میں۔نزول کے زمانے کے عرب اپنی زبان، شاعری اور خطابت میں غیر معمولی مہارت رکھتے تھے، لیکن قرآن نے اپنی ادبی و بیانی ساخت کے اعتبار سے ایک مستقل اور نمایاں اسلوب پیش کیا۔اسی بنیاد پر مسلم علماء نے قرآن کی فصاحت، بلاغت، نظم، معنوی ساخت اور تاثیر کو اعجازِ قرآن کے مباحث میں بنیادی اہمیت دی ہے۔

۷۔داخلی ربط اور فکری یکسانی

قرآن تقریباً تیئیس سال کے طویل عرصے میں مختلف حالات میں سامنے آیا، لیکن اس کی بنیادی تعلیمات توحید، رسالت، آخرت، عبادات، اخلاق اور انسانی ذمہ داری ایک مربوط فکری نظام تشکیل دیتی ہیں۔قرآن خود بھی اپنی داخلی ہم آہنگی کی طرف توجہ دلاتا ہے، جیسا کہ سورہ النساء آیت نمبر ۸۲ میں دیا گیا ہے۔

۸۔پیشین گوئیاں

غُلِبَتِ الرُّوْمُ ۙ﴿۲﴾ فِيْٓ اَدْنَى الْاَرْضِ وَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ غَلَبِهِمْ سَيَغْلِبُوْنَ ۙ﴿۳﴾

ترجمہ: ''روم مغلوب ہو گئے ہیں، قریب کی زمین میں۔مگر اپنی شکست کے بعد چند برسوں میں وہ غالب آجائیں گے''۔(سورہ الروم:۲،۳)

یہ آیات تقریباً ۶۱۵ء میں نازل ہوئیں، جب رومی (بازنطینی) سلطنت کو فارس (ساسانیوں) کے ہاتھوں سخت شکست کا سامنا کرنا پڑا۔اس موقع پر اہلِ مکہ نے خوشی منائی کیونکہ وہ فارس کی آتش پرست قوم کو اپنے شرک کے قریب سمجھتے تھے، جبکہ اہلِ ایمان رومی عیسائیوں کو اہلِ کتاب ہونے کی وجہ سے اپنے قریب تر جانتے تھے۔

ایسے حالات میں قرآن نے اعلان کیا کہ چند برسوں میں رومی اپنی شکست کے بعد دوبارہ غالب آجائیں گے۔تاریخ نے اس پیشین گوئی کی سچائی ثابت کی۔

۶۲۲ء میں ہرقل (Heraclius) نے رومی سلطنت کو ازسرِ نو منظم کیا۔۶۲۴ء میں (ہجرت کے دوسرے سال اور غزوۂ بدر کے موقع پر) رومیوں نے فارس کے خلاف فیصلہ کن کامیابیاں حاصل کرنا شروع کر دیں، اور آخرکار ۶۲۷ء-۶۲۸ء میں معرکۂ نینوی (Battle of Nineveh) میں ساسانی سلطنت کو زبردست شکست دے کر رومی سلطنت کو عظیم الشان غلبہ حاصل ہوا۔

لَقَدْ صَدَقَ اللّٰهُ رَسُوْلَهُ الرُّءْيَا بِالْحَقِّ ۚ لَتَدْخُلُنَّ الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ اٰمِنِيْنَ ۙ مُحَلِّقِيْنَ رُءُوْسَكُمْ وَمُقَصِّرِيْنَ ۙ لَا تَخَافُوْنَ ۚ فَعَلِمَ مَا لَمْ تَعْلَمُوْا فَجَعَلَ مِنْ دُوْنِ ذٰلِكَ فَتْحًا قَرِيْبًا ﴿۲۷﴾

ترجمہ: ''یقیناً اللہ نے اپنے رسول کے خواب کو سچ کر دکھایا، کہ ان شاء اللہ تم امن وامان کے ساتھ مسجدِ حرام میں داخل ہوگے، سر منڈواتے ہوئے یا بال کٹواتے ہوئے، اور تمہیں کوئی خوف نہ ہوگا.....'' **(سورہ الفتح:۲۷)**

تَبَّتْ يَدَآ اَبِيْ لَهَبٍ وَّتَبَّ ۝١ مَآ اَغْنٰى عَنْهُ مَالُهٗ وَمَا كَسَبَ ۝٢ سَيَصْلٰى نَارًا ذَاتَ لَهَبٍ ۝٣

ترجمہ: ''ٹوٹ گئیں ابولہب کے دونوں ہاتھ اور وہ ہلاک ہوگیا۔ اس کا مال اور اس کی کمائی اس کے کچھ کام نہ آئیں گے۔ وہ ضرور بھڑکتی آگ میں جلے گا.....'' **(سورہ لہب:۱ تا ۳)**

نتیجہ: قرآن کی نصّی شہادتیں، سیرت وتاریخ کا ریکارڈ، اسلوبی اعجاز، عقلی/لسانی دلائل اور پوری ہونے والی قریبی پیشین گوئیاں، سب ایک ہی سمت اشارہ کرتے ہیں کہ قرآن محمد ﷺ کی تصنیف نہیں، بلکہ وحیِ الٰہی ہے۔ ''انسانی استاذ'' کا مفروضہ قرآنی، تاریخی اور عقلی تینوں پیمانوں پر ساقط ہے۔ جو شخص مخلص ہوکر پرکھنا چاہے، قرآن کا کھلا چیلنج آج بھی قائم ہے قرآن کہتا ہے: ''اس جیسی ایک سورت بنا کر لے آؤ''۔ **(سورہ یونس:۳۸)**

۷۔ حفاظتِ متن کا وعدہ

ایک چیلنج قرآن کا یہ ہے کہ اس کے متن کو محفوظ رکھا گیا ہے جیسا کہ ارشاد:

اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ۝٩

ترجمہ: ''یقیناً ہم ہی نے یہ ذکر (قرآن) اتارا ہے اور ہم ہی اس کے محافظ ہیں''۔ **(سورہ الحجر:۹)**

۸۔ ورقہ بن نوفل کی گواہی

صحیح بخاری حدیث نمبر:۳ میں وحیِ اوّل کی تفصیل میں ہے: (۱) جبریل کی آمد اور ''اقرأ'' کا واقعہ۔ (۲) ورقہ بن نوفل (مسیحی عالم) نے فرمایا: ''یہ وہ ناموس (جبرئیل) ہے جو موسیٰؑ پر نازل کیا جاتا تھا''۔ یہ گواہی ''تعلیم عندالبشر'' کے برعکس وحی کی پہچان ہے۔

۹۔ ہرقلِ روم کا مکالمہ

صحیح بخاری حدیث نمبر ۷ میں ابوسفیان اور ہرقل کا مکالمہ ذکر ہے کہ: ہرقل نے نبوی علامات پوچھیں اور آخر میں کہا کہ اگر جو تم کہہ رہے ہو حق ہے تو وہ (محمد) ضرور غالب ہوں گے (یعنی معاصر غیر مسلم کی شہادت)۔

۱۰۔ کاتبینِ وحی اور ضبطِ متن

نبی کریم ﷺ کے متعدد کاتبِ وحی تھے، بالخصوص زید بن ثابتؓ اور اُبی بن کعبؓ جیسے حضرات کو آیات اترتے ہی لکھوا دی جاتیں اور آیات کی تعیین خود رسول اللہ ﷺ فرماتے۔ جنگِ یمامہ کے بعد حضرت ابوبکرؓ کے دور میں زیدؓ کی سربراہی میں متونِ مکتوب شہادتِ حفاظ کے ساتھ پہلا مصحف مرتب ہوا؛ پھر حضرت عثمانؓ کے عہد میں متواتر قراءت پر معیاری مصاحف کی اشاعت ہوئی (صحیح بخاری، کتاب فضائل القرآن/جمع القرآن رقم: ۴۹۸۶، ۴۹۸۷)۔ یہ تمام عمل ''ارتجالی انسانی تصنیف'' کے دعوے کے خلاف تاریخی ثبوت ہے۔

۱۱۔ امی معاشرہ اور محدود بیرونی روابط

مکّہ میں خواندگی بہت کم تھی، نبی کریم ﷺ کے ہجرت سے پہلے کے بیرونی سفر محدود تجارتی نوعیت کے تھے؛ نہ کوئی باقاعدہ مکتب، نہ کسی رَبّی/ پادری کے زیرِ تلمذ رہنے کی تاریخ۔ ورقہؓ اوّلین ایّام ہی میں وفات پا گئے؛ ان سے "نظامِ تعلیم" لینا ممکن ہی نہ تھا۔

۱۲۔ وفد کا حبشہ کے دربار میں اثر

نجاشی کے دربار میں سورۃ مریم کی تلاوت پر درباری راہب رو دیے (سیرت ابن ہشام) قرآن خود واقعہ کا عمومی اصول بیان کرتا ہے: ''جب (وہ اہلِ کتاب میں سے) وہ کلام سنتے ہیں جو رسول پر نازل ہوا تو ان کی آنکھیں آنسوؤں سے بہنے لگتی ہیں'' (سورہ المائدہ آیت نمبر: ۸۳) یہ اثر ''ادب'' یا ''نقل'' نہیں، وحی کی تاثیر کی دلیل ہے۔

۱۳۔ یہود یا نصاریٰ سے استفادہ کے دعوے پر عقلی نقد

۱۔ لسانی حقیقت: جس ''استاذ'' کی طرف نسبت کی جاتی ہے وہ عجمی بتایا جاتا تھا؛ قرآن اس کا ابطال کرتا ہے کہ وحی ''عربیِ مبین'' میں ہے (سورہ النحل: ۱۰۳) اور اپنی نحوی/ بلاغی ساخت میں عرب کے فُصحاء کو عاجز کر دیتی ہے یہ تحدّی آیت ہے۔

۲۔ عقائدی تضاد: اگر مقصد ''نقل'' ہوتا تو قرآن تثلیث، الوہیتِ مسیح، تصلیب جیسے مرکزی مسیحی/ یہودی بیانیوں سے کیوں ٹکراتا؟ **(سورہ النساء: ۱۵۷، سورہ المائدہ: ۷۲، ۷۳، اور سورہ اخلاص)**

۳۔ نفسیاتی/ سیاسی مفاد کی نفی: انسانی مصنف عام طور پر خود تنقید اور شدید شخصی قربانیوں کو اختیار نہیں کرتا جبکہ نبی ﷺ نے چالیس برس کی ''الصادق الأمین'' شہرت کے بعد صرف اللہ کی وحی پیش کی اور بدلے میں

مال/حکومت کی پیشکشیں ردّ کیں۔

۴۔تاریخی تسلسل: ۲۳ برس میں حالات وواقعات بدلتے رہے مگر پیغام کا داخلی نظم اور عقائدی یکسانی قائم رہی (النساء:۸۲)؛ انسانی ''کلاسیکی'' تصنیف عموماً اتنے طویل تدریجی دور میں اس درجے کی ساختی وحدت برقرار نہیں رکھتی۔

۵۔تحریری وزبانی حفاظت: نزول کے ساتھ ساتھ کتابتِ وحی اور ہزاروں حفاظ کے سینہ متن کو محفوظ رکھا، بعد کے عہد میں ''مصاحفِ عثمانیہ'' کا ابلاغ مختلف ملکوں تک ہوا، یہ مأخذی خلط ملط یا شخصی تصرّف کو عملی طور پر ناممکن بناتا ہے۔

۱۴۔ادبی امتیازات

قرآن کا اسلوب عام کتابوں کی طرح باب در باب یا موضوع وار (Chapter-Wise) نہیں، بلکہ اس کا انداز خطابی (Oratory) اور حلقی/موضوعاتی (Ring Composition) انداز ہے، جو انسانی تصنیف سے بالکل مختلف ہے۔اسی طرح بائبل کے اسفار کی طویل کرونولوجی/اناجیل کی نثری روایات سے اس کا ڈھانچہ بنیادی طور پر مختلف ہے۔

۱۵۔لغت وبلاغت

یہ نہ شعر ہے نہ کہانت مگر فصاحت ایسی کہ عرب کے خطیب وشاعر عاجز آ گئے۔

تصحیح وتحکیم: ''وَمُهَيْمِنًا عَلَيْهِ'' (المائدۃ:۴۸) قرآن پچھلی الہامی روایتوں کی تصدیق بھی کرتا ہے اور ان پر حَکم بھی ہے؛ یہ طرزِ تعامل ''نقل مادّہ'' نہیں بلکہ ''وحیِ مُصَدِّق و مُهَيْمِن'' کی علامت ہے۔

۱۶۔عقلی ومنطقی دلائل

انسانی کلام میں تغیّر: انسان کا علم وسوچ وقت کے ساتھ بدلتا ہے۔اگر قرآن انسانی تصنیف ہوتا تو ۲۳ برس کی مدت میں اس کے انداز ونظریات بدلتے، مگر قرآن پورے دور میں عقیدے اور اصول میں یکساں ہے۔قرآن خود کہتا ہے: ''اگر یہ اللہ کے سوا کسی اور کی طرف سے ہوتا تو اس میں بہت تضاد پاتے''۔(النساء:۸۲)

۱۷۔تنقیدی پہلو

انسان عموماً اپنی تصنیف میں خود اپنی لغزشوں پر اس انداز سے تنبیہ وعتاب نہیں کرتا، جبکہ قرآن مجید میں بعض مواقع پر نبی کریم ﷺ کو براہِ راست تنبیہ فرمائی گئی ہے۔مثلاً فرمایا: عَبَسَ وَتَوَلّٰٓى اَنْ جَآءَهُ الْاَعْمٰى۔

ترجمہ: ''انہوں نے تیوری چڑھائی اور رخ پھیر لیا، اس وجہ سے کہ ان کے پاس ایک نابینا شخص آیا۔'' (سورۃ عبس:۱۲)

اسی طرح فرمایا: عَفَا اللّٰهُ عَنْكَ ۚ لِمَ اَذِنْتَ لَهُمْ

ترجمہ: ''اللہ نے آپ کو معاف فرمایا، آپ نے انہیں اجازت کیوں دے دی؟'' (سورۃ التوبہ: ۴۳)

قرآن مجید میں نبی کریم ﷺ سے متعلق اس نوع کی تنبیہات کا موجود ہونا اس دعوے کے خلاف ایک اہم استدلال ہے کہ قرآن آپ ﷺ کی ذاتی تصنیف ہے؛ کیونکہ اگر یہ آپ ﷺ کی اپنی تصنیف ہوتا تو اپنے متعلق ایسے عتاب آمیز مقامات کو شامل کرنا بظاہر غیر متوقع ہوتا۔

۱۸۔ مفادات سے خالی

مصنف عموماً اپنی شہرت، مال، یا حکومت چاہتا ہے۔ قرآن نبی ﷺ کو بار بار کہتا ہے کہ آپ کہیں: ''میں اس پر کوئی اجر نہیں مانگتا'' (یونس: ۷۲۔ الفرقان: ۵۷) اسی طرح نبی ﷺ نے مال و اقتدار کی پیشکشیں ٹھکرا دیں۔ ایک انسانی مؤلف کبھی ایسا نہیں کرتا۔

۱۹۔ مذہبی مآخذ سے تضاد

اگر قرآن یہود یا نصاریٰ کی تعلیم کا نتیجہ ہوتا تو ان کے مرکزی عقائد (تثلیث، صلیب، اسرائیلی فوقیت) کی تردید نہ کرتا۔ یہ تضاد بتاتا ہے کہ قرآن ''نقل'' نہیں بلکہ ''اصلاح'' اور ''میزان'' ہے۔ (المائدہ: ۴۸)

خلاصہ

نبی اکرم ﷺ ''اُمّی'' تھے، نزولِ وحی سے پہلے نہ پڑھتے تھے نہ لکھتے تھے، یہی حقیقت قرآنی دلیل کے طور پر شک کی جڑ کاٹ دیتی ہے۔ قرآن خود اپنے ماخذ کا اعلان کرتا ہے کہ یہ ''ربّ العالمین کی طرف سے نازل ہوا ہے عربیِ مبین میں''، جو انسانی استاد کے دعوے کی صریح تردید ہے۔

مخالفین نے اُس دور میں بھی الزام لگایا کہ ''یہ کسی انسان سے سیکھا ہوا ہے'' تو قرآن نے فوراً جواب دیا کہ جس کی طرف نسبت کرتے ہو وہ عجمی ہے اور یہ کتاب خالص عربی ہے۔ قرآن کا چیلنج، اس کا اسلوب، موضوعاتی وحدت اور ۲۳ برس کے تدریجی نزول کے باوجود اندرونی عدمِ تضاد، سب اس کے غیر انسانی مأخذ کی قوی شہادت ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ قریب کی پیشین گوئیاں، جیسے رُوم کی فتح اور سورہ لہب کی منفی پیشین گوئی، عین مخالفین کی زندگی میں پوری ہوئیں۔

❁❁❁

بسم اللہ سے متعلق غیر مسلم بھائیوں کے اعتراضات کے جوابات

غیر مسلم اہلِ علم اور ناقدین کی جانب سے قرآنِ مجید اور اسلام پر مختلف نوعیت کے اعتراضات کیے گئے ہیں۔ ان میں بالخصوص ''بسم اللہ الرحمن الرحیم'' سے متعلق بعض اعتراضات بھی شامل ہیں۔ ذیل میں ان اہم اعتراضات کو ان کے جوابات کے ساتھ مختصراً پیش کیا جارہا ہے:

اعتراض نمبر ۱ : بعض غیر مسلموں نے قرآن مجید کے آغاز ''بسم اللہ الرحمن الرحیم'' پر اعتراض کیا ہے۔ ان کے اعتراض کا خلاصہ یہ ہے کہ مسلمان قرآن کو اللہ کا کلام کہتے ہیں، لیکن اگر یہ واقعی اللہ کا کلام ہوتا تو اللہ یہ نہ کہتا کہ ''میں اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں''؛ بلکہ اسے انسانوں کو مخاطب کر کے کہنا چاہیے تھا کہ تم اللہ کے نام سے شروع کرو۔ لہٰذا ان کے نزدیک اس طرزِ بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کا مصنف اللہ کے سوا کوئی اور ہے۔

جواب نمبر ۱ : یہ اعتراض بظاہر قابلِ توجہ معلوم ہوتا ہے، لیکن عربی زبان، اصولِ کلام، اسلوبِ تعلیم اور خود ہندوستانی مذہبی وفلسفیانہ لٹریچر کے مسلمہ طریقۂ بیان کو سامنے رکھا جائے تو اس کی بنیاد قائم نہیں رہتی۔

۱۔ ''میں اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں''

اس اعتراض کی پہلی کمزوری یہ ہے کہ ''بسم اللہ الرحمن الرحیم'' میں عربی زبان کے اعتبار سے ''میں شروع کرتا ہوں'' کے الفاظ موجود ہی نہیں۔ اصل عبارت صرف یہ ہے:

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ یعنی: ''اللہ کے نام سے، جو نہایت مہربان، بہت رحم فرمانے والا ہے۔''

اس میں ''أبدأُ'' (میں شروع کرتا ہوں) کا لفظ موجود نہیں ہے۔ اردو یا دوسری زبانوں میں مفہوم واضح کرنے کے لیے مترجم ''شروع کرتا ہوں'' کا اضافہ کرتا ہے۔ عربی نحو کے مطابق یہاں متعلقِ جار ومجرور یا فعل سیاق کے مطابق مقدر سمجھا جاتا ہے۔ قاری قرآن پڑھ رہا ہو تو مفہوم ہوگا: ''اللہ کے نام سے پڑھتا ہوں''؛ کوئی کام شروع کر رہا ہو تو مفہوم ہوگا: ''اللہ کے نام سے یہ کام شروع کرتا ہوں''۔

لہٰذا ''اللہ خود کہہ رہا ہے کہ میں اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں'' کہنا اصل عربی عبارت نہیں بلکہ پہلے ایک مخصوص تقدیر قائم کرنا اور پھر اسی تقدیر پر اعتراض کرنا ہے۔

۲۔مصدر کلام اور متکلم منقول

دوسری بنیادی غلطی ''مصدرِ کلام'' اور ''متکلمِ منقول'' کو ایک سمجھ لینا ہے۔کسی کتاب کا اللہ کی طرف سے ہونا اس بات کو لازم نہیں کرتا کہ اس کتاب کے ہر جملے میں ضمیرِ متکلم خود اللہ ہی کی ذات کی طرف لوٹے۔خدا اپنے کلام میں کسی انسان کا قول نقل کرسکتا ہے، کسی نبی کی دعا بیان کرسکتا ہے اور بندوں کو وہ الفاظ بھی سکھا سکتا ہے جو انہیں خدا کے حضور کہنے چاہییں۔

۳۔ہر مقام پر ''اے بندو! کہو'' لکھنا

اعتراض میں کہا گیا کہ اللہ کو یوں کہنا چاہیے تھا: ''اے بندو! تم اللہ کے نام سے شروع کرو۔''

لیکن سوال یہ ہے کہ عقلاً یہ پابندی اللہ پر کس دلیل سے لازم کی گئی؟ تعلیم کے کم از کم دو طریقے ہوسکتے ہیں:

پہلا طریقہ: استاد کہے: ''جب دعا کرو تو یہ الفاظ کہنا جیسے: اے اللہ! مجھے علم عطا فرما۔''

دوسرا طریقہ: استاد براہِ راست دعا کے الفاظ سکھا دے جیسے: ''اے اللہ! مجھے علم عطا فرما۔''

ان دونوں طریقوں میں تعلیم موجود ہے مگر دوسرے طریقے کو صرف اس وجہ سے غلط قرار نہیں دیا جاسکتا کہ اس سے پہلے ''تم کہو'' کے الفاظ نہیں آئے۔لہٰذا یہ کہنا کہ خدا صرف پہلے اسلوب میں کلام کرسکتا ہے، عقلی دلیل نہیں بلکہ خدا کے طریقۂ کلام پر ایک بلا دلیل انسانی پابندی عائد کرنا ہے۔

۴۔قرآن کے دونوں اسلوب

قرآن مجید صرف ایک اسلوب پر قائم نہیں۔جہاں ضرورت ہوتی ہے وہاں صاف طور پر ''قُلْ'' (کہہ دیجیے) بھی فرمایا گیا ہے:

قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ''کہہ دیجیے: وہ اللہ ایک ہے۔'' (سورہ اِخلاص:۱)

● اسی طرح دوسری جگہ ارشاد ہے:

وَقُلْ رَّبِّ زِدْنِيْ عِلْمًا ''اور کہیے: اے میرے رب! میرے علم میں اضافہ فرما۔'' (طٰہٰ:۱۱۴)

اور بعض مقامات پر دعا کے الفاظ براہِ راست تعلیم کیے گئے ہیں، جیسے: اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ''ہمیں سیدھا راستہ دکھا۔''

پس قرآن میں صریح حکم بھی ہے اور تعلیم بالمثال بھی۔اسلوب کا یہ تنوع فصاحت اور تعلیم کا حصہ ہے، کلامِ الٰہی کی نفی کی دلیل نہیں۔

۵۔ ہندوستانی مذہبی لٹریچر

ایک اہم نکتہ یہ ہے کہ سنسکرت اور ہندوستانی مذہبی وفلسفیانہ لٹریچر میں بھی کسی کتاب کے آغاز کے لیے ایسے مختصر الفاظ استعمال ہوتے ہیں جن میں پورا فعل صراحتاً مذکور نہیں ہوتا بلکہ سیاق سے سمجھا جاتا ہے۔مثلاً پتنجلی کے مشہور یوگ سوتر (Yoga Sūtra) کا آغاز ہے:

अथ योगानुशासनम् یعنی: ''اب یوگ کی تعلیم/تشریح-شروع ہوتی ہے۔''

اصل سنسکرت عبارت میں بھی مکمل جملہ ''میں اب یوگ کی تعلیم شروع کرتا ہوں'' موجود نہیں، بلکہ شارحین अथ کو آغازِ موضوع پر دلالت کرنے والا قرار دیتے ہیں اور مفہوم سیاق سے مکمل کیا جاتا ہے۔

IIT Kanpur کے Gita Supersite پر موجود ویاس بھاشیہ بھی پہلے سوتر میں (अथ) کو آغازِ موضوع کے معنی میں بیان کرتا ہے۔

● اسی طرح روایتی تشریحات میں (अथ) کو صرف ''اب'' ہی نہیں بلکہ کسی نئے علمی یا مقدس کام کے آغاز اور منگل (auspicious commencement) سے بھی متعلق کیا گیا ہے۔

لہٰذا جب سنسکرت شاستری روایت میں حذف، اختصار اور سیاق سے مفہوم مکمل کرنا درست اصول ہے تو عربی زبان میں ''بسم اللہ'' کے محذوف متعلق کو بنیاد بنا کر قرآن کے الٰہی ہونے کا انکار کرنا علمی طور پر درست نہیں۔

۶۔ برہما سوتر کی ابتدا

اسی طرح برہما سوتر (Brahma Sūtra) کی پہلی عبارت ہے:

अथातो ब्रह्मजिज्ञासा

یعنی تقریباً: ''اب، لہٰذا، برہمن کی تحقیق یا جستجو۔''

اس مختصر عبارت کا پورا مفہوم شارحین کھول کر بیان کرتے ہیں۔شنکر بھاشیہ میں ''اتھ'' (अथ) کے مفہوم اور اس سے سابقہ تیاری کے بعد برہمن کی تحقیق شروع ہونے کی مفصل توضیح موجود ہے۔

مقصد برہما سوتر کو قرآن کے مساوی قرار دینا نہیں، بلکہ صرف لسانی اصول واضح کرنا ہے: مذہبی اور فلسفیانہ متون میں مختصر افتتاحی تعبیر کا مفہوم سیاق اور مقدر الفاظ سے مکمل کرنا کوئی غیر معمولی بات نہیں۔

پس ''بسم اللہ'' میں مقدر فعل ہونے کو قرآن کے انسانی تصنیف ہونے کی دلیل بنانا اسی لسانی اصول کو نظر انداز کرنا ہے جسے سنسکرت شاستری روایت میں بھی تسلیم کیا جاتا ہے۔

۷۔معترض صاحب کی نقل

دلچسپ بات یہ ہے کہ معترض صاحب نے خود اس ممکنہ مسلم جواب کا ذکر کرتے ہیں کہ اللہ نے اس انداز میں آغاز اس لیے فرمایا تا کہ انسانوں کو سکھایا جائے کہ وہ اپنے کام اللہ کے نام سے شروع کریں۔ البتہ وہ آگے یہ اعتراض کرتے ہیں کہ پھر کوئی شخص برے کام کو بھی خدا کے نام سے شروع کر سکتا ہے۔

لیکن یہ دوسرا اعتراض پہلے اعتراض کو ثابت نہیں کرتا۔ کسی اچھی تعلیم کا غلط استعمال ممکن ہونا اس تعلیم کو غلط نہیں بناتا۔ مثلاً اگر مذہب انسان کو سچ بولنے کی تعلیم دے اور کوئی شخص سچائی کے نام پر کسی بے گناہ کو نقصان پہنچانے لگے تو اس سے ''سچ بولنے'' کا اصول غلط نہیں ہو جاتا؛ غلطی اس شخص کے استعمال میں ہوگی۔

اسلامی تعلیم میں ''بسم اللہ'' گناہ کو جائز بنانے کا نسخہ نہیں بلکہ جائز اور نیک کاموں کو اللہ کی یاد کے ساتھ انجام دینے کی تعلیم ہے۔ حرام کام اللہ کا نام لینے سے حلال نہیں ہو جاتا۔

۸۔اصل منطقی مغالطہ

معترض کا اعتراض کہ: ''اگر قرآن خدا کا کلام ہوتا تو خدا کو فلاں مخصوص انداز میں کہنا چاہیے تھا؛ قرآن میں وہ مخصوص انداز نہیں؛ لہٰذا قرآن خدا کا کلام نہیں۔''

یہ استدلال تبھی درست ہو سکتا ہے جب پہلے یہ ثابت کر دیا جائے کہ خدا کے لیے صرف وہی مخصوص طرزِ بیان ممکن یا لازم ہے جسے معترض نے تجویز کیا ہے۔ لیکن ایسی کوئی عقلی ضرورت موجود نہیں۔

خدا اگر بندوں کو یہ سکھانا چاہے کہ: ''اپنے ہر جائز کام کا آغاز میرے نام سے کرو''

تو وہ یہ بھی کہہ سکتا ہے: ''اللہ کے نام سے آغاز کرو''

اور بطور عملی تعلیم یہ الفاظ بھی دے سکتا ہے: ''بسم اللہ الرحمن الرحیم''۔

دونوں طریقے عقلاً ممکن ہیں۔ لہٰذا ان میں سے دوسرے طریقے کے اختیار کیے جانے سے کلام کے الٰہی نہ ہونے کا نتیجہ نکالنا لازم نہیں آتا۔

تقابل

بعض لوگ ''اوم'' (ॐ) کو خدا کا مقدس نام قرار دیتے ہیں اور ویدو اُپنشد متون میں اسے خاص مذہبی اہمیت حاصل ہے؛ لہٰذا خدا کے نام سے کسی مقدس عمل کے آغاز کا اصول خود ان کے لیے بھی اجنبی نہیں۔ اسی طرح مختلف مذہبی صحائف کے اسالیب بھی مختلف ہیں؛ تورات کا آغاز تخلیقِ کائنات کے بیان (پیدائش 1:1) اور انجیلِ یوحنا کا آغاز

''ابتدا میں کلمہ تھا'' (یوحنا1:1) سے ہوتا ہے۔

جبکہ قرآن ''بسم اللہ الرحمن الرحیم'' کے ذریعے بندے کو عملی طور پر خدا کے نام سے آغاز کی تعلیم دیتا ہے۔ مزید یہ کہ قرآن حضرت سلیمانؑ کے خط کا آغاز بھی ''بسم اللہ الرحمن الرحیم'' سے نقل کرتا ہے۔ (النمل:30)

اور نبی کریم ﷺ کے ہرقل کے نام خط میں بھی یہی الفاظ مذکور ہیں (صحیح بخاری، حدیث:7)۔ پس محض ''بسم اللہ'' سے آغاز کو قرآن کے غیر الٰہی ہونے کی دلیل بنانا درست نہیں، بلکہ یہ خدا کی یاد، نسبت اور استعانت کے ساتھ عمل شروع کرنے کی ایک بلیغ اور تربیتی تعلیم ہے۔

نتیجہ

پس ''بسم اللہ الرحمن الرحیم'' پر مذکورہ اعتراض لغوی، عقلی اور اصولی تینوں اعتبار سے کمزور ہے۔ لغوی اعتبار سے ''میں شروع کرتا ہوں'' قرآن کے اصل الفاظ نہیں بلکہ مفہوم واضح کرنے کے لیے مقدر فعل کا ترجمہ ہے۔ عقلی اعتبار سے خدا پر یہ لازم نہیں کہ بندوں کو ہر بات صرف ''اے بندو! تم کہو'' کے اسلوب میں سکھائے۔ وہ براہِ راست دعا اور ذکر کے الفاظ بھی تعلیم کر سکتا ہے۔

قرآن میں دونوں اسالیب موجود ہیں۔ مزید یہ کہ سنسکرت کی معروف شاستری روایت، مثلاً ''अथ योगानुशासनम्'' اور ''अथातो ब्रह्मजिज्ञासा'' میں بھی مختصر افتتاحی اسلوب اور سیاق سے مفہوم مکمل کرنے کا اصول تسلیم شدہ ہے۔

لہٰذا ''بسم اللہ'' قرآن کے غیر الٰہی ہونے کی دلیل نہیں، بلکہ بندے کو یہ عملی تعلیم دینے کا بلیغ انداز ہے کہ علم، عبادت اور ہر جائز کام کا آغاز اپنے خالق کی یاد، استعانت اور نسبت کے ساتھ کیا جائے۔

اعتراض نمبر ۲: بعض غیر مسلم بھائیوں کا اعتراض ہے کہ ''اللہ'' ایک نیا نام ہے، خدا کا اصل نام ''اوم'' ہے۔

جواب نمبر ۲: ''اللہ'' لفظ اسلام کی ایجاد نہیں بلکہ ایک قدیم سامی (Semitic) الٰہیاتی لفظ ہے۔ سامی زبانوں (عبرانی، سریانی، آرامی) میں خدا کے لئے جو الفاظ استعمال ہوتے ہیں وہ ''اللہ'' سے قریب تر ہیں: عبرانی: Eloah اور جمع کی صورت Elohim۔ آرامی/سریانی: Elah یا Alaha۔ عربی: Allah (اللہ)۔ یہ سب الفاظ ایک ہی قدیم سامی جڑ (Root:-L-H) سے نکلے ہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ''اللہ'' کوئی نیا یا اجنبی نام نہیں بلکہ تمام سامی مذاہب میں مشترک تصور ہے۔

بائبل کا عبرانی متن: B'reshit bara Elohim = ''ابتداء میں اِلوہیم نے آسمان اور زمین کو پیدا کیا''۔ (پیدائش 1:1)

یہاں ''Elohim'' وہی مادہ ہے جو عربی کے ''اللہ'' سے قریب ہے۔

● عہد نامہ قدیم (دانیال 18:2، آرامی متن): ''آسمان کے خدا (Elah) سے دعا کی''۔ یہ ''Elah'' عربی ''الٰہ'' اور ''اللہ'' کا ہم آواز ہے۔

● رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پہلے ''اللہ'' لفظ کا استعمال: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پہلے عرب مشرکین بھی اپنے سب سے بڑے خالق کو ''اللہ'' کہتے تھے (تفسیر ابن کثیر، سورہ یونس:31)

عرب عیسائی اور یہودی اسلام سے پہلے بھی ''اللہ'' کا لفظ استعمال کرتے تھے اور آج بھی کرتے ہیں۔ آج عربی بائبل میں ہر جگہ ''God'' کا ترجمہ ''اللہ'' کیا گیا ہے۔

''اُوم'' کا مفہوم اور دائرہ

''اُوم'' یا ''اُوئم'' ہندو دھرم میں ایک متبرک منتر (Sacred Mantra) مانا جاتا ہے۔ سنسکرت میں اسے ''پرنَو'' (Pranava) بھی کہا گیا ہے، جس کا مطلب ہے: ''وہ آواز جس سے سب آوازیں نکلتی ہیں''۔ یہ کوئی ذاتی نام (Personal Name) نہیں بلکہ ایک علامتی صوت (Symbolic Sound) ہے۔

وید کا منتر

رگ وید اور سام وید میں ''اُوم'' کو ایک منتر کی حیثیت سے ذکر کیا گیا ہے اور رگ وید (Rig Veda-1:164:46) میں ہے کہ ''حقیقت ایک ہی ہے، دانا لوگ اسے مختلف ناموں سے پکارتے ہیں''۔ بعد کی ویدانتی تفاسیر میں مختلف علماء کے اختلاف کے باوجود جسے بہت سے اہل علم مستند نہیں مانتے اس، میں ''اوم'' کو کائنات کی ابتدا کی صوتی علامت کہا گیا جیسا کہ:

(الف) منڈک اپنشد (جو سب سے چھوٹی اپنشد ہے مگر فلسفے میں بڑی اہمیت رکھتی ہے) کا آغاز ہی ''اُوم'' کی تعریف سے ہوتا ہے: جیسے منڈک اپنشد (1:1:1) میں ہے: ترجمہ: یہ ''اُوم'' ہی سب کچھ ہے۔ ماضی، حال اور مستقبل یہ سب ''اُوم'' میں شامل ہیں۔ اور جو کچھ تینوں زمانوں سے ماورا ہے، وہ بھی ''اُوم'' ہی ہے۔

یہاں واضح ہے کہ ''اُوم'' کو کائنات کی آفاقی آواز کہا گیا ہے، مگر اسے ذاتی خدا کے نام کے طور پر استعمال نہیں کیا گیا۔

(ب) چھاندوگیہ اپنشد (1:1:1) میں ''اُوم'' کو ایک مخصوص پوجا منتر کے طور پر بیان کیا گیا ہے، نہ کہ خدا کے ذاتی نام کے طور پر۔

''اُوم'' کی محدودیت

''اُوم'' بنیادی طور پر ہندو دھرم اور ویدانت فلسفے کی اصطلاح ہے۔ بدھ مت اور جین مت میں بھی اسے مخصوص منتر کے طور پر لیا گیا ہے مگر وہاں بھی یہ آواز یا مراقبے کا ذریعہ ہے، خدا کا ذاتی نام نہیں۔ اسی طرح دنیا کے دیگر مذاہب (یہودیت، عیسائیت، اسلام، زرتشتی مذہب) میں اس کا کوئی وجود نہیں۔

تقابلی جائزہ

''اُوم'' ایک علامتی اور صوتی اصطلاح ہے جسے ویدانت میں کائنات کی ابتدا کی نمائندگی کے طور پر لیا گیا ہے۔

''اللہ'' ایک ذاتی اور حقیقی نام، جو سامی مذاہب (یہودیت، عیسائیت، اسلام) میں مشترک رہا اور ہمیشہ ''خالقِ کائنات'' کے لئے استعمال ہوا ہے۔

''اُوم'' ویدک اور اپنشد فلسفے میں ایک پوتر آواز (Sacred Sound) ہے، جو کائنات کی ابتدا اور الوہیت کی علامت سمجھی جاتی ہے۔ لیکن یہ صرف ہندو دھرم تک محدود ہے، عالمی سطح پر اسے خدا کے ذاتی نام کے طور پر کبھی نہیں اپنایا گیا۔ اس کے برعکس ''اللہ'' کوئی نئی اصطلاح نہیں، بلکہ ایک قدیم سامی الٰہیاتی نام ہے جو مختلف مذاہب میں تسلسل کے ساتھ خالقِ کائنات کے لئے استعمال ہوتا رہا ہے۔

خلاصہ

''اُوم'' ایک مخصوص مذہبی اصطلاح ہے جو صرف ہندو فلسفے میں معتبر ہے جبکہ ''اللہ'' ایک قدیم اور عالمی تصور ہے، جو سامی مذاہب (یہودیت، عیسائیت، اسلام) میں یکساں موجود رہا۔ یہی وجہ ہے کہ ''اللہ'' کا لفظ ہر ترجمے میں محفوظ رہتا ہے، جبکہ ''اوم'' صرف اپنی اصل سنسکرت کے ساتھ جڑا ہوا ہے۔

اس طرح یہ اعتراض درست نہیں کہ ''اللہ'' نیا نام ہے۔ تاریخی اور لسانی شہادتیں بتاتی ہیں کہ ''اللہ'' سامی مذاہب میں ہمیشہ سے موجود ہے: Eloah (عبرانی)، Elah (آرامی)، Alaha (سریانی) ''اللہ'' (عربی) اور ''اوم'' ویدک اصطلاح ہے جو صرف ہندوستانی مذہبی فلسفے تک محدود ہے۔ اس لئے ''اللہ'' کا تصور ہمہ گیر، عالمی اور آفاقی ہے جبکہ ''اُوم'' ایک مخصوص مذہبی نعرہ ہے۔

اعتراض نمبر ۳: بعض غیر مسلم بھائیوں کا اعتراض ہے کہ ''رحمٰن'' اور ''رحیم'' میں تکرار ہے۔

جواب نمبر ۳: یہ اعتراض کہ ''رحمٰن'' اور ''رحیم'' میں تکرار ہے، دراصل عربی زبان کے فہم کی کمی کی وجہ سے ہے۔ ''رحمٰن'' اور ''رحیم'' دونوں کا مادہ (Root) ''ر-ح-م'' ہے، لیکن دونوں کے صیغے اور مفہوم میں فرق ہے۔

''رحمٰن'' وزن 'فعلان' پر ہے، جو 'کمال اور کثرت' کے لئے آتا ہے۔یعنی اللہ کی رحمت وسیع اور سب پر عام ہے،خواہ مومن ہو یا کافر۔''رحیم'' وزن 'فعیل' پر ہے، جو 'ثبات ودوام' کے لئے آتا ہے۔یعنی اللہ کی رحمت مومنوں کے ساتھ خاص طور پر ہمیشہ اور آخرت تک باقی رہے گی۔

الرَّحْمٰنُ هُوَ ذُو الرَّحْمَةِ العَامَّةِ، وَالرَّحِيمُ هُوَ ذُو الرَّحْمَةِ الخَاصَّةِ بِالمُؤْمِنِينَ

ترجمہ:''رحمٰن وہ ہے جس کی رحمت عام ہے،اور رحیم وہ ہے جس کی رحمت خاص مومنوں کے ساتھ ہے''۔

(المفردات في غريب القرآن، مادہ:رحم)

رحمٰن کا استعمال عام رحمت کے لئے ہوا ہے جیسے:الرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوَى ۔(طہ:۵)''رحمٰن عرش پر بلند ہے''یعنی اس کی ربوبیت اور رحمت سب پر عام ہے اور رحیم کا استعمال خاص رحمت کے لئے ہوا ہے جیسے:

وَكَانَ بِالْمُؤْمِنِينَ رَحِيمًا ۔(احزاب:۴۳)''اور وہ ایمان والوں پر خاص طور پر مہربان ہے''۔یہ فرق واضح کرتا ہے کہ یہ تکرار نہیں بلکہ تکمیل ہے۔

الرَّحْمٰنُ يَدُلُّ عَلَى عُمُومِ الرَّحْمَةِ فِي الدُّنْيَا لِلْمُؤْمِنِ وَالْكَافِرِ، وَالرَّحِيمُ يَدُلُّ عَلَى خُصُوصِهَا بِالمُؤْمِنِينَ فِي الآخِرَةِ

ترجمہ:''رحمٰن دنیا میں مومن وکافر سب پر عام رحمت کو ظاہر کرتا ہے،اور رحیم آخرت میں مومنوں کے لئے خاص رحمت کو ظاہر کرتا ہے''۔**(مفاتیح الغیب،سورہ فاتحہ)**

الرَّحْمٰنُ أَعَمُّ وَالرَّحِيمُ أَخَصُّ ۔ ترجمہ:''رحمٰن عام ہے اور رحیم خاص ہے''۔**(تفسیر قرطبی،الفاتحہ)**

الرَّحْمٰنُ مُبالَغَةٌ مِنَ الرَّحْمَةِ، وَهُوَ خَاصٌّ بِاللهِ، وَالرَّحِيمُ يُوصَفُ بِهِ اللهُ وَغَيْرُهُ۔

ترجمہ:''رحمٰن رحمت میں مبالغہ ہے اور یہ صرف اللہ کے لئے خاص ہے، جب کہ رحیم کا اطلاق اللہ اور غیر اللہ دونوں پر ہوسکتا ہے''۔**(لسان العرب،مادہ:رحم)**

علماء کلام کے نزدیک:''رحمٰن'' اللہ کی صفتِ ذاتی ہے (یعنی اس کی ذات کے ساتھ قائم، کبھی جدا نہیں)۔''رحیم'' اللہ کی صفتِ فعلی ہے (یعنی بندوں پر ظاہر ہوتی ہے،مثلاً مغفرت دینا)۔اس طرح دونوں مختلف پہلو بیان کرتے ہیں:ایک اللہ کی ذات کا،اور دوسرا اللہ کے فعل کا۔

تاریخی شواہد: ''رحمٰن'' کا لفظ رسول اللہ سے پہلے جنوبی عرب (یمن) کے سبائی کتبوں میں بھی ملتا ہے، جیسے کہ حمیری بادشاہوں کے کتبے (4th-5th century CE) پر:''بسمك اللهم و برحمن''''تیرے نام سے اے اللہ اور اے رحمٰن''اس طرح یہ بتاتا ہے کہ عرب ''رحمٰن'' کو صرف اللہ کے لئے استعمال کرتے تھے،دوسروں کے لئے نہیں۔

''رحیم'' کا لفظ عام صفت کے طور پر بھی بولا جاتا تھا مگر قرآن نے دونوں کو اکٹھا کر کے اللہ کی صفات کو جامع انداز میں بیان کیا گیا ہے۔

بلاغت کا پہلو:

قرآن میں صفاتِ الٰہی اکٹھا آتی ہیں تا کہ ایک دوسرے کو مکمل کریں۔ ''رحمٰن'' اور ''رحیم'' کا اکٹھا آنا مترادف (Synonymy) نہیں بلکہ تکمیل (Complementarity) ہے۔ یہی اسلوب عربی شاعری میں بھی ملتا ہے جہاں دو قریب المعنی الفاظ آ کر معنی کو وسعت دیتے ہیں۔

خلاصہ

''رحمٰن'' اور ''رحیم'' میں کوئی تکرار نہیں، بلکہ یہ دو الگ پہلوؤں کو واضح کرتے ہیں: رحمٰن = اللہ کی عام رحمت، جو دنیا میں سب پر ہے۔ رحیم = اللہ کی خاص اور دائمی رحمت، جو آخرت میں اہل ایمان پر ہوگی۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے دونوں کو ساتھ ذکر کیا تا کہ اللہ کی رحمت کی جامعیت اور اختصاص دونوں پہلو سامنے آ جائیں۔

اعتراض نمبر ۵: صفات (رحمٰن، رحیم) جوڑنے سے توحید محدود ہو جاتی ہے۔

جواب نمبر ۵: یہ اعتراض توحید اور صفاتِ الٰہی میں فرق نہ کرنے سے پیدا ہوتا ہے۔ اسلام میں اللہ تعالیٰ اپنی ذات والوہیت میں واحد، یکتا اور لاشریک ہے:

قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ (الاخلاص:1)۔ ''الرحمن'' اور ''الرحیم'' الگ معبود نہیں بلکہ اسی ایک اللہ کی صفاتِ کمال ہیں۔ قرآن خود فرماتا ہے:

قُلِ ادْعُوا اللّٰهَ اَوِ ادْعُوا الرَّحْمٰنَ... فَلَهُ الْاَسْمَاءُ الْحُسْنٰى (بنی اسرائیل:110)، یعنی نام متعدد ہو سکتے ہیں مگر ذات ایک ہی ہے۔

''الرحمن'' رحمت کی وسعت اور ''الرحیم'' اس کے دوام و استمرار کو ظاہر کرتا ہے، اس لیے ان صفات کا اجتماع توحید کے خلاف نہیں بلکہ اللہ کے کمالِ رحمت کا بیان ہے۔ عقلی طور پر بھی ایک شخص کو استاد، مصنف اور والد کہنے سے وہ تین اشخاص نہیں ہو جاتا۔ اسی طرح آریہ سماجی تعبیر میں بھی ایک خدا کے لیے اوم اور متعدد ویدی اسماء و اوصاف استعمال ہوتے ہیں، اور رِگ وید (1:164:46) میں ایک حقیقت کو مختلف ناموں سے پکارنے کا تصور ملتا ہے۔ لہٰذا ''اللہ، الرحمن، الرحیم'' سے تعددِ الٰہ لازم قرار دینا درست نہیں؛ اسماء و صفات متعدد، مگر ذاتِ الٰہی ایک اور لاشریک ہے۔

❁❁❁

بسم اللہ الرحمن الرحیم

سورہ فاتحہ کا تعارف

یہ سورہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نبوت ملنے کے بعد مکہ مکرمہ میں نازل ہوئی۔ تاہم بعض مفسرین، جیسے حضرت مجاہدؒ، اسے مدنی سورہ قرار دیتے ہیں، اور بعض حضرات کی رائے یہ ہے کہ یہ سورہ مکہ اور مدینہ دونوں میں نازل ہوئی۔ لیکن دوبار نزول کے باوجود اسے دو الگ سورتیں شمار نہیں کیا گیا، بلکہ اس کی عظمت و رفعت کو اجاگر کرنے کے لئے ایسا ہوا۔ یاد رہے کہ جس سورہ کا نزول ہجرت سے پہلے ہوا، اسے ''مکی سورہ'' کہا جاتا ہے اور جو ہجرت کے بعد نازل ہوئی، اسے ''مدنی سورہ'' کہا جاتا ہے۔

اس سورہ میں سات آیات ہیں۔ اس پر تمام علماء کا اجماع ہے، البتہ ساتویں آیت کے تعین میں اختلاف ہے۔ امام شافعیؒ کے نزدیک اگر ''بِسْمِ اللّٰہ'' کو سورۂ فاتحہ کا حصہ مانا جائے تو ساتویں آیت ''صِرَاطَ الَّذِیْنَ'' سے شروع ہو کر آخر تک شمار ہوگی۔ لیکن امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک ساتویں آیت ''غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ'' پر ختم ہوگی۔

حقیقت میں یہ سورہ پورے قرآن کا دیباچہ اور مقدمہ ہے۔ جس طرح کسی کتاب یا کلام کی ابتدا کسی پیش لفظ یا تمہید سے ہوتی ہے، اسی طرح قرآن کی ابتداء اس سورہ سے کی گئی ہے۔ ''فاتحہ'' اور ''افتتاح'' دونوں کے معنی آغاز یا ابتدا کے ہیں۔

سورۂ فاتحہ کے نام

یہ سورہ قرآن کی نہایت عظیم آیات پر مشتمل ہے اور چونکہ قرآن کی ابتدا اسی سے ہوتی ہے، اس لئے اس کا مشہور نام ''سورۂ فاتحہ'' ہے۔ ''فاتحہ'' کے معنیٰ ہیں ''آغاز کرنے والی''۔ چونکہ قرآن کی شروعات اسی سورہ سے ہوتی ہے، لہٰذا اُسے ''الفاتحہ'' کہا جاتا ہے۔

اس ایک مشہور نام کے علاوہ مفسرین نے اس کے اور بھی کئی نام بیان کیے ہیں۔ علامہ جلال الدین سیوطیؒ نے اپنی شہرہ آفاق کتاب ''الاتقان'' میں اس کے پچیس نام ذکر کیے ہیں، جبکہ امام قرطبیؒ نے بارہ نام نقل کیے ہیں۔ ان سب ناموں سے اس سورہ کی عظمت و اہمیت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

(۱) اَلْحَمْدُ (۲) فَاتِحَةُ الْكِتَابِ (۳) اُمُّ الْقُرْآنِ (۴) اَلصَّلٰوةُ (۵) اَلْكَافِيَةُ (۶) اُمُّ الْكِتَابِ (۷) اَلسَّبْعُ الْمَثَانِيْ (۸) اَلْقُرْآنُ الْعَظِيْمُ (۹) اَلشِّفَاءُ (۱۰) اَلرُّقْيَةُ (۱۱) اَلْأَسَاسُ (۱۲) اَلْوَافِيَةُ۔

سورۂ فاتحہ کی فضیلت

● حضرت ابو ہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت اُبیؓ سے فرمایا: ''کیا میں تمہیں ایسی سورت نہ بتاؤں جو نہ تورات میں نازل ہوئی، نہ انجیل میں اور نہ ہی قرآن میں اس کی کوئی مثال موجود ہے؟'' حضرت اُبیؓ نے عرض کیا: ''ضرور یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم''۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''وہ سورۂ فاتحہ ہے، یہی سبع مثانی اور قرآن عظیم ہے جو مجھے عطا کیا گیا''۔ **(ترمذی:۲۸۷۵)**

● اسی طرح حضرت ابوسعید مولیٰ عامر بن گریزؒ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت اُبی بن کعبؓ سے فرمایا: ''میں تمہیں مسجد سے نکلنے سے پہلے ایسی سورۃ بتاؤں گا، جس کی نظیر نہ توریت میں اتری، نہ انجیل میں اور نہ ہی قرآن میں کوئی دوسری سورت اس کے مثل ہے''۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پوچھا: ''نماز کی ابتدا میں کیا پڑھتے ہو؟''، حضرت اُبیؓ نے جواب دیا: اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''یہی وہ سورت ہے''۔ **(موطاامام مالک:۱۸۴)**

● حضرت عبداللہ بن جابرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''قرآن مجید کی سب سے بہترین سورت، سورۂ فاتحہ ہے''۔ **(مسند احمد)**

● اسی طرح حضرت ابوسعید بن مُعَلّیٰؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''میں تمہیں ایسی سورت بتاؤں گا جو قرآن کی تمام سورتوں سے بڑھ کر عظمت رکھتی ہے اور وہ ہے ''اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ''، یعنی سورۂ فاتحہ، جس میں سات آیات ہیں جو بار بار دہرائی جاتی ہیں''۔ **(صحیح بخاری:۵۰۰۶)**

سورۂ فاتحہ کے ذریعے دم (رُقیہ)

حضرت ابوسعید خدریؓ بیان کرتے ہیں کہ ہم ایک سفر میں کسی جگہ رکے ہوئے تھے کہ قبیلے کی ایک لڑکی آئی اور کہا: ''ہمارے سردار کو سانپ نے کاٹ لیا ہے، اور قبیلے کے لوگ باہر گئے ہوئے ہیں، کیا آپ میں سے کوئی دم کرنے والا ہے؟'' ہمارے ایک ساتھی اٹھے، حالانکہ ہمیں علم نہ تھا کہ وہ دم کرنا جانتے ہیں۔ انہوں نے سورۂ فاتحہ پڑھ کر دم کیا تو فوراً زہر اُتر گیا۔ اس پر سردار نے خوش ہو کر تیس بکریاں بطور انعام دیں اور دودھ بھی پلایا۔

جب وہ ساتھی واپس آئے تو ہم نے پوچھا: ''کیا تمہیں دم کرنا آتا تھا؟'' انہوں نے کہا: ''میں نے تو صرف سورۂ فاتحہ پڑھی تھی''۔ ہم نے کہا: ''بکریوں کا معاملہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے دریافت کرتے ہیں''۔ جب ہم مدینہ واپس پہنچے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو واقعہ سنایا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''انہیں کیسے معلوم ہوا کہ سورۂ فاتحہ دم کرنے کی چیز ہے؟ تم لوگ ان بکریوں کو تقسیم کرو اور میرا بھی ایک حصہ رکھو''۔ **(صحیح بخاری:۵۷۴۹)**

اس روایت کو امام مسلم اور امام ابوداودؒ نے بھی نقل کیا ہے۔اس سے ثابت ہوتا ہے کہ سورۂ فاتحہ کے ذریعے دم کرنے سے اللہ کے حکم سے سانپ کے ڈسنے کا زہر زائل ہوجاتا ہے۔

سورۂ فاتحہ اور سورۂ بقرہ کی آخری آیات کی فضیلت

● حضرت عبداللہ بن عباسؓ روایت کرتے ہیں کہ ایک دن رسول اللہ ﷺ ہمارے درمیان موجود تھے اور حضرت جبرائیلؑ بھی آپ کے پاس بیٹھے تھے۔اچانک اوپر سے ایک آواز سنائی دی۔جبرائیلؑ نے آسمان کی طرف نگاہ اٹھائی اور فرمایا:''یہ آسمان کا دروازہ ہے جو آج سے پہلے کبھی نہیں کھلا''۔اسی وقت اس دروازے سے ایک فرشتہ نازل ہوا اور نبی کریم ﷺ کے پاس آکر عرض کیا:''آپ کو دو ایسے نور کی بشارت دی جاتی ہے جو آپ سے پہلے کسی نبی کو عطا نہیں کیے گئے؛ایک سورۂ فاتحہ اور دوسرے سورۂ بقرہ کی آخری آیات۔ان کا جو بھی حرف آپ تلاوت کریں گے،اس کا اجر وثواب آپ کو ضرور عطا کیا جائے گا''۔(مسلم:۸۰۶)

● حضرت ابوسعیدؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:''میں تمہیں مسجد سے نکلنے سے پہلے قرآن کریم کی سب سے عظیم سورت سکھاؤں گا''۔پھر آپ ﷺ نے انہیں سورۂ فاتحہ کی تعلیم دی۔(بخاری:۵۰۰۶)

صحیح احادیث میں آیا ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے سورۂ فاتحہ کو''اعظم سورۃ فی القرآن'' قرار دیا ہے،یعنی یہ قرآن کی سب سے عظیم سورت ہے۔(بخاری:۵۰۰۶)

● سنن ترمذی میں رسول اللہ ﷺ کا فرمان منقول ہے:''قسم ہے اُس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے،سورۂ فاتحہ جیسی سورت نہ تورات میں نازل کی گئی،نہ انجیل میں،نہ زبور میں اور نہ قرآن میں اس کی مثال موجود ہے''۔(ترمذی:۲۸۷۵)

● امام حاکم نے''مستدرک''میں روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے سورۂ فاتحہ کو''افضل القرآن''یعنی قرآن کی سب سے افضل سورت بتایا۔(درمنثور)

● بعض روایات میں یہ بھی مذکور ہے کہ سورۂ فاتحہ کو قرآن کے دو تہائی کے برابر قرار دیا گیا ہے۔(درمنثور،جلد اوّل)

● صحیح مسلم کی ایک حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:''اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ میں نے نماز کو اپنے بندے اور اپنے درمیان برابر تقسیم کردیا ہے،اور بندے کو وہی ملتا ہے جو وہ مانگتا ہے''۔

چنانچہ جب بندہ نماز میں کہتا ہے:اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:''میرے بندے نے میری حمد بیان کی''۔جب وہ کہتا ہے:الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:''میرے بندے نے میری بڑائی

بیان کی''۔جب وہ کہتا ہے: مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ''میرے بندے نے میری عظمت بیان کی''۔اور جب وہ کہتا ہے: اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ''یہ میرے اور میرے بندے کے درمیان ہے،اور میرا بندہ جو مانگے گا وہ اسے ضرور دیا جائے گا''، پھر جب بندہ کہتا ہے:

اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ۙ﴿۵﴾ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ ۙ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ ﴿۶﴾

تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ''یہ میرے بندے کے لئے ہے اور میرا بندہ جو مانگے گا، وہی اسے دیا جائے گا''۔
(مسلم:۳۹۵)

حضرت عبدالملک بن عامرؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''فاتحۃ الکتاب (سورۂ فاتحہ) ہر مرض کے لئے شفاء ہے''۔

اسی طرح حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''اگر کوئی فاتحۃ الکتاب (سورۂ فاتحہ) اور قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ پڑھ لے تو اُسے موت کے سوا ہر چیز سے امان مل جاتی ہے''۔(درمنثور)

نوٹ: سورۂ فاتحہ دراصل بندے کی عرضداشت اور دعا ہے جو وہ بارگاہِ الٰہی میں پیش کرتا ہے (جس کی مزید وضاحت آگے آئے گی)۔

یہ حقیقت بھی ذہن نشین رہے کہ قرآن مجید کے نزول کی ترتیب اور اس کی تلاوت کی ترتیب الگ ہے۔قرآن کریم کا نزول ۲۳ سال کے عرصے میں حالات، وقت اور حکمت کے تقاضوں کے مطابق ہوا،لیکن تلاوت اور قرأت کی وہی ترتیب معتبر ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے امت کو سکھائی۔

اگرچہ یہ سورہ مختصر ہے،مگر اپنے اندر پورے قرآن کا خلاصہ سمیٹے ہوئے ہے،اسی لئے اسے ''اُمّ القرآن'' کہا گیا ہے۔اس میں توحید، رسالت اور آخرت کا بیان نہایت جامع انداز میں دعا کی صورت میں موجود ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اس سورہ کے ذریعے اپنے بندوں کو یہ تعلیم دی ہے کہ وہ انہی الفاظ کے ذریعے دعا کریں۔یوں بندہ پروردگار سے عرض کرتا ہے: ''پروردگار! مجھے سیدھی اور آسان راہ پر چلا''۔اس درخواست کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو مکمل قرآن عطا فرمایا۔

❁❁❁

ترجمہ-سورہ فاتحہ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ ۙ﴿۱﴾ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ۙ﴿۲﴾ مٰلِکِ یَوۡمِ الدِّیۡنِ ؕ﴿۳﴾ اِیَّاکَ نَعۡبُدُ وَ اِیَّاکَ نَسۡتَعِیۡنُ ؕ﴿۴﴾ اِہۡدِنَا الصِّرَاطَ الۡمُسۡتَقِیۡمَ ۙ﴿۵﴾ صِرَاطَ الَّذِیۡنَ اَنۡعَمۡتَ عَلَیۡہِمۡ ۬ۙ غَیۡرِ الۡمَغۡضُوۡبِ عَلَیۡہِمۡ وَ لَا الضَّآلِّیۡنَ ﴿۷﴾

ترجمہ:

(۱)۔سب تعریفیں اللہ ہی کے لیے ہیں، جو رب ہے سب جہانوں کا۔(۲)۔جو بہت مہربان، نہایت رحم والا ہے۔(۳)۔(وہی ہے) مالک روزِ جزا (یعنی قیامت کے دن) کا۔(۴)۔تیری ہی ہم عبادت کرتے ہیں، اور تجھ ہی سے ہم مدد مانگتے ہیں۔(۵)۔ہدایت دے ہمیں سیدھے راستے کی (یعنی حق پر چلنے کی)۔(۶)۔راستہ اُن لوگوں کا، جن پر تو نے انعام فرمایا۔(۷)۔(نہ اُن کا راستہ) جن پر غضب کیا گیا، اور نہ (ان کا) جو بھٹک گئے۔

تفسیر-آیت نمبر ۱ سے ۷ تک

آیت نمبر (۱) اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ

ترجمہ: سب طرح کی تعریفیں اللہ ہی کے لئے ہیں جو رب ہے سب جہانوں کا)۔

تفسیر الحمدللہ میں 'حمد' کے معنیٰ محض مدح یا شکر تک محدود نہیں بلکہ ان دونوں سے کہیں بلند ہیں۔اس میں ہر طرح کی تعریف اور سب سے اعلیٰ درجے کی بڑائی شامل ہے، خواہ وہ تعریف دنیا میں کبھی کی گئی ہو یا قیامت تک کی جاتی رہے گی، وہ سب دراصل اللہ ہی کے لئے ہے۔یعنی کسی کی مدح یا تعریف بظاہر کسی اور کے نام سے کی جائے، لیکن حقیقت میں وہ صرف اور صرف اللہ تعالیٰ ہی کی حمد ہے۔

الالف و اللام فی الحمد لاستغراق جمیع اجناس الحمد للہ تعالی (ابن کثیر)

درحقیقت سورۂ فاتحہ ایک دعا ہے۔دعا کا ادب یہ ہے کہ جس سے مانگی جارہی ہے، پہلے اس کی بزرگی، خوبیوں اور احسانات کا اعتراف کیا جائے، اس کے مقام و مرتبے کو تسلیم کیا جائے، پھر حاجت پیش کی جائے تاکہ دل میں خشوع

اور طلب میں اثر پیدا ہو۔ یہی اصل تعریف اور نعمت کے اقرار کا حقیقی طریقہ ہے۔

چونکہ ہر نعمت کا حقیقی عطا کرنے والا اللہ ہی ہے، اس لئے ابتدا سے انتہا تک تمام تعریفیں اسی کے لئے ہیں۔ جو حسن، خوبی یا کمال کسی مخلوق میں نظر آتا ہے، وہ اس کا ذاتی نہیں بلکہ اللہ کا دیا ہوا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کا پہلا ہی لفظ مخلوق پرستی کی جڑ کاٹ دیتا ہے اور توحید کو دل و دماغ میں راسخ کر دیتا ہے۔

حدیث میں آتا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ بندے کو کوئی نعمت عطا فرمائے اور وہ اس پر ''اَلْحَمْدُ لِلّٰہ'' کہے تو گویا اس نے اُس نعمت سے بھی بڑھ کر عمل کیا جو اسے دی گئی تھی۔ ایک دوسری روایت میں ہے کہ اگر دنیا کی ساری نعمتیں کسی شخص کو دے دی جائیں اور وہ صرف ''اَلْحَمْدُ لِلّٰہ'' کہہ دے تو یہ کلمہ ان تمام نعمتوں سے افضل ہے۔ **(قرطبی)**

امام ابن جریرؒ لکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی تعریف خود بیان کر کے بندوں کو سکھایا کہ وہ بھی اسی کی حمد کریں۔

امام ابن قیمؒ کے بقول، جتنی اعلیٰ صفات، اچھے نام اور عمدہ تعریفیں ممکن ہیں، وہ سب اللہ ہی کے لئے ہیں۔ انسان جتنی صفاتِ کمال اللہ کے لئے بیان کرتا ہے، یا جتنے ناموں سے اسے پکارتا ہے، وہ سب دراصل اللہ کی حمد ہی ہے۔

''الحمدللہ'' کا مطلب یہ ہے کہ انسان کو جو بے شمار نعمتیں ملی ہیں، کھانے پینے سے لے کر سونے جاگنے تک، اور جسم کے تمام اعضاء تک، وہ سب اللہ ہی کی دی ہوئی ہیں، لہٰذا شکر بھی صرف اسی کا ادا کرنا چاہیے۔

- امام ابن جریر طبریؒ فرماتے ہیں: ''الحمدللہ'' کے معنی ہیں، خالص شکر اللہ ہی کے لئے۔ **(تفسیر طبری، جلد ۱)**
- امام رازیؒ کے نزدیک ''حمد'' نعمتوں پر کی جاتی ہے۔ **(تفسیر کبیر، جلد ۱)**
- سید قطبؒ لکھتے ہیں کہ ''الحمدللہ'' سے دل میں اللہ کی نعمتوں کا شکر پیدا ہوتا ہے اور یہی جذبہ انسان کو اس کی بندگی پر آمادہ کرتا ہے۔ **(فضائل القرآن)**

اسی لئے آغاز سے انجام تک اللہ تعالیٰ کی حمد کرنا اسلامی فکر کے بنیادی اصولوں میں سے ایک عظیم اصول ہے۔

وَهُوَ اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ط لَهُ الْحَمْدُ فِي الْاُوْلٰى وَ الْاٰخِرَةِ ز وَلَهُ الْحُكْمُ وَاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ۔

(سورۃ قصص:۷۰)

حضرت ابن عمرؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ سے ایک بندے نے دعا میں کہا: 'اے رب! ساری حمد تیرے ہی لئے ہے، جیسی کہ تیری عظمت اور جلالت کے شایانِ شان ہے'۔ یہ سن کر فرشتے حیران رہ گئے کہ اسے کس طرح لکھیں۔ وہ اللہ کے حضور حاضر ہوئے اور عرض کیا: ''اے رب! تیرے ایک بندے نے ایسی بات کہی ہے جسے ہم سمجھ نہیں پا رہے کہ کس طرح قلم بند کریں''۔ اللہ تعالیٰ نے پوچھا: ''میرے بندے نے کیا کہا؟'' حالانکہ وہ خوب جانتا تھا کہ بندے نے کیا کہا ہے۔ فرشتوں نے عرض کیا: ''اے رب! اس نے کہا ہے کہ تیرے

ہی لئے حمد ہے، جیسی کہ تیری عظیم ذات اور بلند اقتدار کے لائق ہے''۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''میرے بندے نے جیسا کہا ہے ویسا ہی لکھ لو، یہاں تک کہ جب وہ میرے پاس آئے گا تو میں خود اس کا اجر عطا کروں گا''۔ **(سنن ابن ماجہ:۳۸۰۱)**

دنیا میں بے شمار چیزیں ایسی ہیں جو ہر وقت انسان کو اپنی طرف متوجہ کرتی ہیں۔ کوئی شخص کسی حسین منظر، دلکش تصویر یا کسی کی خوبی دیکھ کر تعریف کرنے لگتا ہے، مگر درحقیقت وہ تعریف اس کے خالق ہی کی ہوتی ہے۔ اگر کوئی بادشاہ یا حاکم عدل وانصاف والا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ انصاف کا مادہ اللہ نے ہی اس کے دل میں رکھا ہے۔ اسی طرح اگر کوئی شخص خوبصورت ہے یا غیر معمولی علم رکھتا ہے تو یہ سب کچھ اللہ ہی کی عطا ہے۔

لہٰذا جس کی بھی مدح یا تعریف کی جائے، آخر کار وہ اللہ تعالیٰ ہی کی حمد قرار پاتی ہے۔ اسی لئے مدح، ثنا اور تعریف صرف اور صرف اسی کی ذات کے لئے خاص ہیں۔

لِلّٰہِ۔ یعنی ''اللہ'' کی تفسیر

''اللہ'' ایک خاص نام (Proper Noun) ہے، جو کسی اور کے لئے استعمال نہیں ہوتا۔ اس کے بے شمار صفاتی نام ہیں، جو قرآنِ مجید میں نہایت ادب و بلاغت کے ساتھ بیان ہوئے ہیں۔ عربی زبان کا لفظ ''اِلٰہ'' اپنی معنوی وسعت کے اعتبار سے ایسا ہے کہ اس کا ترجمہ کسی دوسری زبان میں پوری طرح ادا نہیں ہوسکتا۔ بعض مترجمین نے اس کا ترجمہ ''معبود'' کیا ہے، مگر یہ اس کے حقیقی مفہوم کا صرف ایک پہلو ہے۔

یہی ''اِلٰہ'' جب عربی کے حروف ''الف'' اور ''لام'' کے ساتھ مخصوص کیا گیا تو ''اللہ'' بن گیا، جو اس ذاتِ واحد کا یکتا اور مخصوص نام ہے۔

لفظ ''اللہ'' کا ترجمہ کسی دوسری زبان میں پوری طرح ممکن نہیں۔ اردو میں ''خدا'' اور انگریزی میں ''God'' عام طور پر خالقِ کائنات کے لئے استعمال کیے جاتے ہیں، لیکن یہ دونوں الفاظ اپنی معنوی حدود میں قاصر ہیں۔ لفظ ''خدا'' کا جمع ''خداؤں'' یا ''خداوندان'' بنایا جاسکتا ہے، جب کہ ''God'' کا اطلاق انگریزی میں دیوی دیوتاؤں پر بھی ہوتا ہے۔ اس کے مؤنث کی صورت ''Goddess'' رائج ہے، جس کا مطلب ''دیوی'' ہے۔ اسی بنا پر سیارۂ زہرہ کو ''Goddess Venus'' کہا جاتا ہے۔

عیسائیوں کے عقیدۂ تثلیث میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو ''the Son,God'' کا لقب دیا گیا ہے (The Oxford English Dictionary, Vol, IV, PP. 268-271)۔ اس طرح واضح ہوتا ہے کہ لفظ ''اللہ'' اپنی حقیقت اور مفہوم کے اعتبار سے کسی بھی دوسری زبان کے لفظ سے مماثل نہیں، بلکہ وہ خالقِ کائنات کا یکتا اور بے مثال نام ہے۔

لفظ ایشور

مراٹھی اور ہندی میں ''ایشور'' اور ''پرمیشور'' کے الفاظ بظاہر ''اللہ'' (Supreme Being) کے معنوں میں استعمال ہوتے ہیں، لیکن یہ الفاظ ''شیو'' اور ''وشنو'' جیسے دیوتاؤں کے لیے بھی رائج ہیں۔ لفظ ''ایشور'' دراصل ''ایش'' اور ''ور'' سے مرکب ہے۔ ''ایش'' کے معنی ہیں مالک اور حاکم، جب کہ ''ور'' کے معنی ہیں برتر اور اعلیٰ۔ اس طرح ''ایشور'' کا مفہوم ہوا ''خدائے برتر''۔ تاہم اس کا مؤنث ''ایشوری'' بھی بولا جاتا ہے، جو کسی دیوی کے لیے مخصوص ہے۔ (دیکھیے: Molesworth's Marathi-English Dictionary ص ۸۴)

اسی طرح ''پرمیشور'' دراصل ''پرم'' اور ''ایشور'' کا مرکب ہے۔ ''پرم'' کے معنی ہیں سب سے اعلیٰ اور برتر، اور یوں ''پرمیشور'' کے معنی ہوئے ''عظیم الشان معبود''۔ لیکن غور کرنے سے واضح ہوتا ہے کہ ''ایشور'' اور ''پرمیشور'' دونوں الفاظ خالقِ کائنات کے لیے استعمال تو ہوتے ہیں، مگر ان کا دائرہ صرف اسی کے لیے مخصوص نہیں ہے، بلکہ یہ الفاظ مختلف دیوی دیوتاؤں کے لیے بھی رائج ہیں۔ مثلاً ''وشنو'' کے لیے بھی ''پرمیشور'' کا لقب استعمال کیا جاتا ہے۔

لفظ بھگوان

اسی طرح ''بھگوان'' کا لفظ بھی خالقِ کائنات کے لیے مخصوص نہیں ہے۔ یہ دراصل ''بھگ'' یا ''بھگون'' سے ماخوذ ہے، جن کے متعدد معانی بیان کیے جاتے ہیں، لیکن بالعموم یہ لفظ دیوتاؤں کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ اسی بنا پر ''بھگوان شیو'' اور ''بھگوان وشنو'' جیسے القاب عام رائج ہیں۔

لہٰذا یہ تمام الفاظ قرآن کے لفظ ''اللہ'' کا متبادل نہیں بن سکتے، کیونکہ ''اللہ'' صرف اور صرف خالقِ کائنات کے لیے خاص ہے۔ ''اللہ'' ایک واحد اور یکتا نام ہے، اس کا کوئی جمع نہیں۔ قرآن مجید میں ''اللہ'' کا لفظ بارہا آیا ہے، جس سے اس کی وحدانیت اور یکتائی پوری طرح نمایاں ہوتی ہے۔

یعنی وہی ایک ذات ہے جو تنہا عبادت اور بندگی کے لائق ہے، اس کا کوئی شریک نہیں، اور وہی اس کائنات کا خالق و مالک ہے۔ اس کا نام ''اللہ'' ہے۔ اسے ہماری نگاہیں دیکھ نہیں سکتیں اور نہ ہی ہمارے حواسِ خمسہ اس کی حقیقت کو پا سکتے ہیں، کیونکہ وہ ہماری آنکھوں سے اوجھل ہے۔ مگر عقلِ سلیم کائنات کے نظام اور اس کی ہم آہنگی سے اس بات کو بخوبی سمجھ لیتی ہے کہ یہ سب کسی ایک وحدہٗ لاشریک کی تخلیق ہے۔

وہ ازل سے ہے اور ابد تک رہے گا۔ وہی تنہا تمام جہانوں کا خالق و پروردگار ہے، خواہ وہ فرشتوں کی دنیا ہو یا زمین و آسمان، چاند و سورج اور کہکشاؤں میں جھلملاتے ستارے، سب کا وہی واحد خالق اور مدبّر ہے۔

رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ''رب ہے تمام عالموں کا''

''رب'' کے معنی عربی زبان میں تربیت کرنے، نگرانی و کفالت کرنے اور مخلوق کو ایک درجہ سے دوسرے درجہ تک پہنچاتے ہوئے اس کی نشوونما اور تکمیل کرنے کے ہیں، یہاں تک کہ وہ اپنی کمال کی حد کو پہنچ جائے۔ عربی میں ''رب'' کا لفظ تین بنیادی معانی میں استعمال ہوتا ہے:

۱۔ مالک اور آقا۔ ۲۔ پالنے اور پرورش کرنے والا۔ ۳۔ مدبّر اور منتظم۔ یعنی اس کا مفہوم یہ ہے کہ وہی اس کائنات کا حقیقی رب ہے، جو اس کا مالک بھی ہے، پرورش کرنے والا بھی، اور اس کے نظام کو سنبھالنے والا مدبّر و منتظم بھی۔

عٰلَمِیْنَ (سب جہانوں کا Universe)

''عٰلَمین'' دراصل ''عالم'' کی جمع ہے۔ عربی رسم الخط میں اس کے مفہوم کے دائرے میں آسمان، چاند، سورج، ستارے، ہوائیں، فرشتے اور جنات کے علاوہ وہ تمام جہان بھی شامل ہیں جو ہماری موجودہ معلومات میں آئیں یا مستقبل میں جن کا انکشاف اور تحقیق ہوتی جائے۔ گویا جتنے بھی نئے عالم دریافت ہوں گے، سب اسی ایک جامع لفظ ''عٰلَمین'' کے احاطے میں آجائیں گے۔

یہ حقیقت بھی قابلِ غور ہے کہ صرف ہمارا نظامِ شمسی ہی نہیں بلکہ اس جیسے ہزاروں نہیں بلکہ لاکھوں دوسرے نظام بھی کائنات کی وسعتوں میں موجود ہیں۔ مثال کے طور پر چاند کی روشنی چند ہی لمحوں میں زمین تک پہنچتی ہے، لیکن ایسے سیاروی اجسام بھی موجود ہیں جو چاند سے لاکھوں گنا بڑے ہیں۔ ان کی روشنی نے خلاء کی بے پناہ وسعتیں طے کرنے کے بعد پہلی بار ۱۹۵۰ء میں زمین تک رسائی حاصل کی۔ اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ''جہانوں'' کی وسعت کس قدر بے کنار اور لامحدود ہے۔

مختلف عالم

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ مشرق سے لے کر مغرب تک کی سرزمین کو ''عالمِ دنیا'' کہا جاتا ہے، اور اس کے علاوہ بھی چالیس ہزار عالم موجود ہیں۔ امام تفسیر حضرت مقاتل رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہی وہ عالم ہیں جن کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ امام رازی رحمہ اللہ ''تفسیر کبیر'' میں لکھتے ہیں کہ اس عالم سے باہر ایک بے پایاں خلاء کا وجود عقلی دلائل سے ثابت ہے، لہٰذا یہ بعید نہیں کہ ہمارے اس عالم کی طرح اللہ تعالیٰ نے ہزاروں لاکھوں اور جہان بھی تخلیق کیے ہوں۔ ان جہانوں کے باسیوں کی ساخت اور فطرت ضروری نہیں کہ ہماری طرح ہو، بلکہ ان کی خصوصیات اسی ماحول کے مطابق ہوں گی جس میں وہ آباد ہیں۔

جدید سائنس بھی اس حقیقت کی تائید کرتی ہے۔ جب امریکی خلانورد جان گلین' اپنے خلائی سفر سے واپس آیا تو اس نے اپنے مقالے میں یہ اعتراف کیا کہ یہ بات قطعی طور پر نہیں کہی جاسکتی کہ خلاء کی وسعت کہاں تک پھیلی ہوئی ہے اور اس کا انجام کہاں ہے۔

یقیناً اللہ تعالیٰ ہی ان سب جہانوں کا پروردگار ہے۔ البتہ قرآن مجید میں بعض مقامات پر لفظ ''العٰلمین'' انسانوں یا اہلِ جہاں کے مفہوم میں بھی استعمال ہوا ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۰۷﴾ (سورہ انبیاء:۱۰۷)

ترجمہ: ''اور ہم' نے آپ کو ساری دنیا کے لئے رحمت بنا کر بھیجا ہے''۔

وقال تعالیٰ: اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِيْنَ ﴿۲۷﴾ (سورہ تکویر:۲۷)

ترجمہ: ''اسی طرح یہ (قرآن) تو سارے جہان والوں کے لئے نصیحت ہے؛''

وَاَنِّيْ فَضَّلْتُكُمْ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ﴿۴۷﴾ (سورہ بقرہ:۴۷)

ترجمہ: ''میں نے تمہیں سارے جہان پر فضیلت دی تھی''۔

حضرت عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ، جو اسلام قبول کرنے سے پہلے عیسائی تھے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا: یارسول اللہ! ہم نے کب اپنے علماء ومشائخ کو رب بنایا اور ان کی عبادت کی؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: کیا یہ حقیقت نہیں کہ جب وہ کسی چیز کو حلال قرار دیتے تو تم بھی اسے حلال مان لیتے اور جب کسی چیز کو حرام کہتے تو تم بھی اسے حرام سمجھ لیتے؟ عدی رضی اللہ عنہ نے کہا: ''جی ہاں''۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: یہی ان کی عبادت ہے۔

گویا حقیقت یہی ہے کہ رب صرف اللہ ہے۔ اس کے سوا کسی کے حکم کو اس کے حکم کے مقابلے میں تسلیم نہیں کیا جاسکتا۔ وہ کسی مخصوص نسل، قوم یا قبیلے کا پروردگار نہیں بلکہ تنہا کائنات کے ہر ذرے کا خالق ومدبّر ہے۔ اسی لیے ہر طرح کی تعریفیں صرف اسی ذات کے لیے زیبا ہیں جو سارے جہانوں اور ہر مخلوق کا پالنے والا ہے۔

یہ آیت ان گمراہ تصورات کی بھی جڑ کاٹ دیتی ہے جو اللہ کو کسی راجہ کی مانند سمجھتے ہیں، جس کے گرد وزیروں اور مشیروں کا ایک دربار ہوتا ہے، اور جب تک وہ خوش نہ ہوں راجہ بھی راضی نہیں ہوتا۔ ایسے لوگ سمجھتے ہیں کہ دیوی دیوتاؤں کو خوش کیے بغیر بڑا بھگوان یا ایشور خوش نہیں ہوگا۔ حالانکہ ''ربّ العالمین'' کا اعلان ان تمام باطل عقائد کو رد کر دیتا ہے۔ انسان جنہیں دیوتا سمجھ کر پوجتا ہے وہ خود کسی کے بندے ہیں، خدا نہیں۔ ان کے اختیار میں نہ زندگی دینا ہے، نہ موت دینا۔ وہ خود محتاج اور بے بس ہیں، دوسروں کو کیا عطا کر سکتے ہیں! پس یہ آیت واضح کرتی ہے کہ صرف ایک اللہ ہے جو تمام جہانوں کا ربّ اور پالنہار ہے۔

آیت نمبر(۲) الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

ترجمہ: ''بہت مہربان نہایت رحم والا''۔

تفسیر ''رحمٰن''میں اللہ کی وہ رحمت جلوہ گر ہے جو بلاتفریق سب پر محیط ہے،خواہ مومن ہو یا کافر،سب اس کی رحمت کے سایے میں جی رہے ہیں۔لیکن ''رحیم''میں اس کی خاص عنایت اور بخشش صرف اہلِ ایمان کے لیے مخصوص ہے۔

جس ذات کو''رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ'' کہہ کر پکارا گیا ہے،وہی تمام جہانوں کی پرورش اور تربیت کی ذمہ دار ہے۔یہ ذمہ داری کسی حاجت،دباؤ یا مجبوری کے سبب نہیں بلکہ اس کی بے پایاں صفتِ رحمت کا فیضان ہے۔وہی ذات ہے جو دنیا میں ہر مخلوق کو رزق وراحت عطا کرتی ہے،اسی لیے وہ حقیقی معنوں میں بڑا مہربان اور نہایت رحم فرمانے والا ہے۔اور آخرت میں وہ مومنوں کو ان کے اعمال کے مطابق جزا وانعام سے نوازے گا۔(تفصیل کے لیے''بسم اللہ الرحمن الرحیم'' کی تفسیر دیکھئے)

آیت نمبر(۳) مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ

ترجمہ: ''وہی ہے)مالک اور جزا(قیامت کے دن)کا''۔

تفسیر ''مالک''،لفظ''مُلک'' سے ماخوذ ہے،جس کے معنٰی ہیں کسی شے پر ایسا کامل قبضہ اور تسلط،جس پر پورے اختیار کے ساتھ قدرت حاصل ہو۔دنیا کے بادشاہ،وزیرِ اعظم یا قاضی خواہ کتنے ہی صاحبِ اختیار کیوں نہ ہوں، بہرکیف ان کے اختیارات محدود ہوتے ہیں۔وہ مجرموں کو اپنی مرضی سے نہیں بلکہ قانون کی حدود میں رہ کر سزا دینے پر مجبور ہوتے ہیں۔گویا اصل میں قانون ہی ان پر حاکم ہوتا ہے۔لیکن''مالک''وہ ہے جسے حقیقی طور پر مطلق اختیارات حاصل ہوں؛وہ چاہے تو مجرم کو سزا دے اور چاہے تو معاف کردے،اور کوئی بھی اس سے باز پُرس کرنے والا نہ ہو۔

دین کا مطلب

''دین'' کے لغوی معنٰی ہیں جزا دینا یا بدلہ چکانا۔قیامت کے دن کو''یوم الدین''اس لیے کہا گیا ہے کہ وہ پورے حساب وکتاب اور ہر عمل کے بدلے کا دن ہوگا۔(کشاف)

اصل مالک کون؟:

یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا اللہ آج مالک نہیں ہے،تو پھر صرف قیامت کے دن کو''یوم الدین کا مالک'' کیوں کہا گیا؟ حقیقت یہ ہے کہ اللہ آج بھی ہر شے کا مالک ہے،مگر ہماری نگاہوں پر پردے پڑے ہوئے ہیں۔دنیا میں انسان بظاہر کہتا ہے کہ یہ دکان میری ہے یا یہ مکان میرا ہے،لیکن حقیقت میں کوئی چیز اس کی ملکیت نہیں۔اللہ نے محض

آزمائش کے لیے بندوں کو عارضی حق تصرف عطا کیا ہے تا کہ دیکھا جائے وہ اسے کس طرح استعمال کرتے ہیں۔ انسان مرتا ہے تو اس کی ملکیت دوسروں کو منتقل ہو جاتی ہے۔ کبھی بیٹے کو، کبھی خریدار کو۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ حقیقی اور دائمی مالک صرف اللہ ہے، جو ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ یہ حقیقت اگر دنیا میں سمجھ میں نہ بھی آئے تو قیامت کے دن سب پر ظاہر ہو جائے گی، جب انسان اپنی آنکھوں سے دیکھے گا کہ اس دن نہ کسی بادشاہ کی سلطنت باقی ہوگی نہ کسی حاکم کی حکومت۔ اس دن سزا اور جزا کا اختیار صرف اللہ ہی کو ہوگا اور سب اس کے حضور بے بس اور عاجز کھڑے ہوں گے۔

قیامت کا دن

اس کائنات کا موجودہ نظام ایک مقررہ وقت پر ختم ہو جائے گا۔ پھر وہی قادرِ مطلق جس نے اس دنیا کو عدم سے وجود بخشا تھا، ایک نئی دنیا پیدا کرے گا۔ وہ آغازِ آفرینش سے لے کر قیامت تک کے تمام انسانوں کو دوبارہ زندہ کرے گا اور ان سے ان کی زندگی کا پورا حساب لے گا۔ جو لوگ اس کے احکام کے مطابق زندگی گزاریں گے، انہیں وہ ابدی نعمتوں والی جنت عطا کرے گا، جو اس عالم سے بھی زیادہ وسیع اور بے پایاں ہوگی۔ اس دن انسانوں کو چاہے وہ جس حالت میں مرے ہوں اور ان کی لاشوں کے ساتھ جو بھی سلوک کیا گیا ہو، دوبارہ زندہ کیا جائے گا۔ اسی دن کو ''یوم العدل''، یعنی انصاف کا دن کہا جاتا ہے، جب کوئی عمل بے حساب نہ رہ جائے گا۔

قرآن کا جواب

بہت سے لوگ تعجب اور انکار کے انداز میں یہ سوال کرتے ہیں کہ جب انسان مر کر خاک میں مل جاتا ہے، ہڈیوں کا ڈھانچہ بوسیدہ ہو کر مٹی میں بکھر جاتا ہے، تو آخر وہ دوبارہ کیسے زندہ کیا جا سکتا ہے؟ اس کے جواب میں قرآن نے نہایت بلیغ اور دوٹوک انداز اختیار کیا ہے کہ جس خدا نے پہلی مرتبہ عدم سے وجود بخشا، وہ دوبارہ زندہ کرنے پر بھی پوری طرح قادر ہے۔ جس نے نطفے کی ایک بے حقیقت بوند سے انسان کو پیدا کیا، اس کے لیے یہ کیا مشکل ہے کہ وہ مٹی کے ذروں کو جمع کر کے پھر سے کامل انسان کی صورت عطا کرے۔

اَوَلَمْ یَرَ الْاِنْسَانُ اَنَّا خَلَقْنٰهُ مِنْ نُّطْفَةٍ فَاِذَا هُوَ خَصِیْمٌ مُّبِیْنٌ ﴿۷۷﴾ وَضَرَبَ لَنَا مَثَلًا وَّنَسِیَ خَلْقَهٗ ؕ قَالَ مَنْ یُّحْیِ الْعِظَامَ وَهِیَ رَمِیْمٌ ﴿۷۸﴾ قُلْ یُحْیِیْهَا الَّذِیْۤ اَنْشَاَهَاۤ اَوَّلَ مَرَّةٍ ؕ وَهُوَ بِكُلِّ خَلْقٍ عَلِیْمُ ﴿۷۹﴾

ترجمہ: ''کیا انسان غور نہیں کرتا کہ ہم نے اس کو اس نطفہ (Sperm) سے پیدا کیا پھر وہ بہترین صورت میں انسان بن گیا اور وہ ہمارے بارے میں افسانے کہتا ہے اور اپنی تخلیق کو بھول گیا اور

کہتا ہے ہڈیوں کو کون زندہ کرے گا جس نے اسے پہلی بار پیدا کیا وہ ہر طرح سے پیدا کرنا جانتا ہے۔''

(سورہ یٰسین، آیت نمبر: ۷۷۔۷۹)

ایک دوسرے موقع پر ارشاد فرمایا:

اَیَحْسَبُ الْاِنْسَانُ اَلَّنْ نَّجْمَعَ عِظَامَهٗ ۝ بَلٰی قٰدِرِیْنَ عَلٰٓی اَنْ نُّسَوِّیَ بَنَانَهٗ ۝

ترجمہ: ''کیا انسان نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ ہم اس کی (بکھری) ہڈیوں کو جمع نہ کر سکیں گے؟ کیوں نہیں، ہم اس پر قادر ہیں کہ اس کے ذرے ذرے کو درست کر دیں۔''

(سورۃ قیامۃ، آیت نمبر ۳۔۴)

سڑ گل کر مٹی میں مل جانا

جب انسان سڑ کر مٹی میں ملتا ہے تو دراصل وہ ذرات میں تحلیل ہو جاتا ہے۔ سائنس دانوں نے بھی اس حقیقت کو واضح کیا ہے کہ انسان انہی ذرات سے تخلیق کیا گیا ہے۔ لہٰذا جب اللہ نے پہلی مرتبہ بے جان ذروں کو جوڑ کر انسان کی صورت عطا کر دی، تو یہ بات سمجھنا آسان ہے کہ پہلے سے بنی ہوئی چیز کو دوبارہ اپنی پہلی حالت میں لوٹانا اور بھی زیادہ سہل ہے۔ پس اللہ کے لیے انسان کو دوبارہ زندہ کرنا ہرگز دشوار نہیں۔

اعمال کا نتیجہ

دنیا میں بھی یہ اصول پایا جاتا ہے کہ کسی شے کو پہلی بار وجود بخشنا مشکل ہوتا ہے، لیکن اس کا اعادہ کہیں زیادہ آسان۔ اسی طرح اللہ کے لیے دوبارہ انسان کو اٹھا کر اس کے اعمال کا حساب لینا کوئی مشکل کام نہیں۔ بعض لوگ یہ گمان کرتے ہیں کہ انسان دنیا میں محض اپنے سابقہ اعمال کی سزا بھگتنے کے لیے آتا ہے۔ لیکن یہ خیال حقیقت سے بہت بعید ہے، کیونکہ اگر یہ درست ہوتا تو دوبارہ انسانی شکل ملنے کے بعد انسان کو کسی قسم کی مصیبت نہ آنی چاہیے تھی۔

پھر یہ سوال بھی پیدا ہوتا ہے کہ جو بچے بچپن ہی میں وفات پا جاتے ہیں، ان کے اعمال کا بدلہ تو شروع ہی نہیں ہوا، تو پھر ان پر موت کیوں آئی اور انہیں کون سی ''یونی'' یعنی دوبارہ جنم ملے گا؟

اسی طرح اگر یہ مان لیا جائے کہ کسی کو اس کے گناہ کے سبب دکھ دیا گیا ہے تو پھر اس کی مدد کرنا یا بھوکے کو کھانا کھلانا گویا خدا کے فیصلے کے خلاف جانا ہوگا، حالانکہ دنیا کے ہر مذہب میں ہمدردی، سخاوت اور خدمتِ خلق کی تعلیم دی گئی ہے۔

پس یہ عقیدہ اس قدر بے بنیاد اور غیر معقول ہے کہ ایک عام فہم انسان بھی غور کرے تو حقیقت اس پر آشکار ہو جائے گی کہ جس نے پہلی بار پیدا کیا ہے، وہی دوبارہ اٹھائے گا اور اپنے بندے سے حساب لے گا۔ یہ دوبارہ اسی دنیا

میں لوٹایا جانا نہیں بلکہ آخرت میں اٹھایا جانا ہے، اور اسی کا نام ہے ''مالکِ یومِ الدین''۔

آیت نمبر (۴) اِیَّاكَ نَعْبُدُ وَاِیَّاكَ نَسْتَعِیْنُ ﴿۴﴾

ترجمہ: ''ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھ ہی سے مدد مانگتے ہیں''

تفسیر اس آیتِ مبارکہ میں دو عظیم الفاظ آئے ہیں۔ پہلا لفظ ہے: ''اِیَّاكَ نَعْبُدُ'' جس میں بندگی اور عبادت کو خالص اللہ کے لیے خاص کیا گیا ہے۔ گویا اللہ کے بندے اس کے حضور عرض کرتے ہیں کہ اے پروردگار! ہم صرف تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تیرے سوا کسی اور کے سامنے نہ جھکتے ہیں نہ ہی اس کو معبود مانتے ہیں۔

عبادت کا مفہوم

عبادت دراصل نام اس کا ہے کہ انسان دل وجان سے، کامل عاجزی وانکساری کے ساتھ، کسی کی عظمت وبرتری کو تسلیم کرتے ہوئے اس کے حضور سراپا اطاعت بن جائے۔ عبادت کی حقیقت یہ ہے کہ ہر زمانے میں اللہ کے بھیجے ہوئے نبی کی شریعت کے مطابق زندگی بسر کی جائے اور ان کی ہدایت کی فرمانبرداری کی جائے۔ اگر کوئی عمل شریعت کے حکم کے خلاف ہو، خواہ وہ بظاہر عبادت کی شکل ہی کیوں نہ رکھتا ہو، تو وہ عبادت نہیں بلکہ گناہ شمار ہوگا۔ مثلاً نماز سب سے افضل عبادت ہے، لیکن مکروہ وقت میں یا غصب کی ہوئی زمین پر اس کا پڑھنا عبادت نہیں، بلکہ معصیت ہے۔ اسی طرح روزہ بلاشبہ ایک عظیم عبادت ہے، لیکن اگر کوئی شخص عید یا قربانی کے دن روزہ رکھے تو یہ عبادت نہیں بلکہ شریعت کی نافرمانی ہے۔ اس طرح عبادت کی اصل حقیقت محض ظاہری اعمال نہیں بلکہ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی فرمانبرداری ہے۔

عبادت کی اقسام

امام غزالیؒ نے اپنی مشہور کتاب ''الاربعین'' میں عبادت کی دس بڑی صورتوں کو ذکر کیا ہے:

(۱) نماز (۲) زکوٰۃ (۳) روزہ (۴) حج (۵) تلاوتِ قرآن (۶) ہر حال میں ذکرِ الٰہی (۷) حلال روزی کے لیے محنت وجدوجہد (۸) پڑوسیوں اور ساتھیوں کے حقوق کی ادائیگی، خواہ وہ مسلمان ہوں یا غیر مسلم (۹) نیکی کا حکم دینا اور برائی سے روکنا (۱۰) رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنت پر عمل پیرا ہونا

عبادت میں اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ ماننے کا مطلب یہ ہے کہ محبت صرف اسی سے ہو، خوف اسی کے لیے ہو، اُمیدیں اسی سے وابستہ ہوں اور بھروسہ اسی پر کیا جائے۔ کوئی کام اللہ کی عبادت سے زیادہ اہم نہ سمجھا جائے، نہ اس کے سوا کسی کے لیے نذر ونیاز مانی جائے، نہ اس کے علاوہ کسی کی قسم کھائی جائے، اور نہ ہی کسی اور کے آگے جھک

کر سجدہ کیا جائے۔

ذرا غور کیجیے! کیا کوئی باعزت باپ یہ گوارا کرسکتا ہے کہ وہ اپنے بیٹوں پر بے پناہ شفقت کرے، ان کی ہر ضرورت پوری کرے، لیکن اس کے بیٹے دوسروں کے سامنے ہاتھ پھیلائیں اور سر جھکائیں، حالانکہ وہ دوسرے خود اسی باپ کے اختیار و قبضے میں ہوں؟ کیا یہ طرزِ عمل باپ کی صریح مخالفت نہ ہوگا؟

اسی طرح کوئی بادشاہ اپنی رعایا سے یہ کیسے برداشت کرسکتا ہے کہ وہ ایسے شخص کو حاکم مان لیں جو حقیقت میں خود اس کا محکوم ہو، اپنی امیدیں اس سے وابستہ کریں، اس کے حکم کو مانیں، اور اصل حاکم کی نصیحت کے باوجود نہ سنیں؟ کیا ایسی رعایا بغاوت کی روش پر نہیں ہوگی؟ حافظ ابن قیمؒ فرماتے ہیں کہ بندوں کو اس لیے ہر نماز میں یہ کلمات کہنے کا حکم دیا گیا ہے: ''اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَاِیَّاکَ نَسْتَعِین''

کیونکہ شیطان انسان کو ہمیشہ شرک کی طرف بلاتا ہے اور نفس بھی غیر اللہ کے سامنے جھکنے کا میلان رکھتا ہے۔ اسی لیے بندہ ہمیشہ اس کا محتاج ہے کہ اپنے عقیدۂ توحید کو شرک کی آلودگی سے پاک رکھے۔

وَاِیَّاکَ نَسْتَعِینُ ''تجھ ہی سے ہم مدد مانگتے ہیں''

یہاں اشارہ بھی صرف اللہ ہی کی ذات کی طرف ہے۔ یعنی ہم صرف تجھ ہی سے مدد مانگتے ہیں، تیرے سوا کسی اور سے مدد نہیں چاہتے۔ بندہ یوں عرض کرتا ہے کہ میں ایک عاجز اور دردمند غلام ہوں، جس کا سب کچھ اپنے آقا ہی کے لیے ہے، جس کا سر ہر وقت اطاعت و فرمانبرداری میں اپنے آقا کے سامنے جھکا رہتا ہے۔ اس لیے ہمارا جسم، جان اور مال جس قدر بھی عبادت کرسکتے ہیں، وہ سب تیرے ہی لیے ہیں۔ ہم صرف تجھ ہی کو سجدہ کرتے ہیں، تیرے ہی احکام کی تعمیل کرتے ہیں اور یہ سب کچھ بھی تیری ہی مدد اور توفیق سے بجالاتے ہیں۔

مدد کے لیے پکارنا

اللہ تعالیٰ کے سوا کسی سے استعانت (مدد طلب کرنا) جائز نہیں، چاہے کسی بھی شکل میں ہو۔ البتہ اسباب کے درجے میں ایک دوسرے سے مدد لینا اور دینا شرک نہیں ہے، کیونکہ یہ اللہ تعالیٰ کا بنایا ہوا نظام ہے جس میں تمام کام ظاہری اسباب کے ذریعے ہی انجام پاتے ہیں۔ یہاں تک کہ انبیاء کرام علیہم السلام بھی انسانوں کی مدد حاصل کرتے تھے۔ جیسا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا:

مَنْ اَنْصَارِیْ اِلَی اللّٰہ (الصف) ترجمہ: ''اللہ کے دین کے لئے کون میرا مددگار ہے؟''

اسی طرح اللہ تعالیٰ نے ایمان والوں سے فرمایا: وَتَعَاوَنُوْا عَلَی الْبِرِّ وَالتَّقْوٰی ۪ (سورۃ المائدہ:۲)

ترجمہ:''نیکی اور تقویٰ کے کاموں میں ایک دوسرے کی مدد کرو۔''

مدد اور شرک کی حقیقت

ایسی مدد جو ظاہری اسباب کے دائرے میں ہو، نہ ممنوع ہے اور نہ شرک۔ البتہ شرک یہ ہے کہ انسان ایسے شخص سے مدد طلب کرے جو اسباب کے لحاظ سے کسی کی مدد پر قادر ہی نہ ہو۔ جیسے کسی مردے کو پکارنا، اسے مشکل کُشا یا حاجت روا سمجھنا، یہ عقیدہ رکھنا کہ وہ نفع ونقصان پہنچا سکتا ہے یا دور ونزدیک سے فریاد سن سکتا ہے۔ اسباب سے ہٹ کر اس طرح مدد طلب کرنا دراصل اللہ کی صفات میں کسی کو شریک کرنے کے مترادف ہے، اور یہی شرک ہے۔

توحید کی تین بنیادی اقسام

ا۔توحیدِ ربوبیت

یعنی یہ عقیدہ کہ کائنات کا خالق، مالک، رازق اور تدبیر کرنے والا صرف اللہ تعالیٰ ہے۔ اس حقیقت کو کمیونسٹوں کے سوا تقریباً سب مانتے ہیں۔ حتیٰ کہ مشرکینِ مکہ بھی اس کے معترف تھے۔ قرآن کریم میں ان کا یہ اعتراف اس طرح نقل کیا گیا ہے:''اے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! ان سے پوچھو، تمہیں آسمان وزمین سے رزق کون دیتا ہے؟ کانوں اور آنکھوں کا مالک کون ہے؟ بے جان سے جاندار اور جاندار سے بے جان کون پیدا کرتا ہے؟ اور کائنات کے نظام کو کون چلا رہا ہے؟'' وہ فوراً جواب دیں گے:''اللہ''۔(یونس:۳۱)

● ایک اور مقام پر فرمایا:''اگر آپ ان سے پوچھیں کہ آسمان وزمین کا خالق کون ہے؟ تو وہ ضرور کہیں گے: اللہ۔''(الزمر:۳۸)

ایک اور جگہ ارشاد ہے:''اگر آپ ان سے پوچھیں کہ زمین اور جو کچھ اس میں ہے سب کس کا ہے؟ ساتوں آسمانوں اور عرشِ عظیم کا مالک کون ہے؟ اور کس کے ہاتھ میں ہر چیز کی بادشاہی ہے؟ کون سب کو پناہ دیتا ہے اور خود کسی سے پناہ نہیں مانگتا؟'' تو وہ یہی کہیں گے:''اللہ''۔(المؤمنون:۸۴-۸۹)

(۲)توحیدِ الوہیت

'توحید الوہیت' سے مراد یہ ہے کہ عبادت کی ہر قسم صرف اور صرف اللہ تعالیٰ ہی کا حق ہے۔ عبادت صرف نماز، روزہ، حج اور زکوٰۃ تک محدود نہیں، بلکہ ہر وہ عمل عبادت کہلاتا ہے جو کسی ہستی کو راضی کرنے کے لیے یا اس کے غضب سے بچنے کے خوف سے کیا جائے۔

چنانچہ دعا والتجا، نذر و نیاز پیش کرنا، عاجزی کے ساتھ جھکنا، طواف کرنا، امید وخوف کا تعلق رکھنا، یہ سب بھی عبادت کی صورتیں ہیں۔ اس لیے توحید الوہیت کا تقاضا یہ ہے کہ یہ تمام اعمال خالصتاً اللہ ہی کے لیے بجالائے جائیں۔ لیکن افسوس کہ قبر پرستی کرنے والے اس توحید میں شرک کے مرتکب ہوتے ہیں اور عبادت کی متعدد شکلیں قبروں میں مدفون بزرگوں کے ساتھ انجام دیتے ہیں، جس سے بچنا لازم ہے۔

(۳) توحیدِ صفات

'توحید صفات' کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی وہ تمام صفات، جو قرآن وحدیث میں بیان ہوئی ہیں، انہیں بغیر کسی تحریف اور تاویل کے مانا جائے اور ان صفات کو کسی اور کے اندر تسلیم نہ کیا جائے۔

مثلاً اللہ کی ایک صفت عالم الغیب ہونا ہے، اسی طرح وہ سمیع وبصیر ہے یعنی قریب وبعید ہر ایک کی دعا وفریاد سننے اور دیکھنے پر قادر ہے۔ وہ قادرِ مطلق ہے، کائنات میں ہر طرح کے تصرف کا اختیار اسی کو حاصل ہے۔ لہٰذا ایسی کسی صفت کو کسی نبی، ولی یا بزرگ کے لیے مان لینا، اللہ کے سوا کسی کو ان اوصاف کا حامل سمجھنا، دراصل شرک ہے۔

جب حضرت امام مالکؒ سے اللہ تعالیٰ کے عرش پر مستوی ہونے کے بارے میں دریافت کیا گیا تو انہوں نے نہایت حکیمانہ اور جامع جواب دیا۔ فرمایا: ''استواء کا مفہوم سب کو معلوم ہے، مگر اس کی کیفیت نا قابلِ فہم ہے۔ اس کے بارے میں سوال کرنا بدعت ہے، اور اس پر ایمان لانا لازم اور واجب ہے''۔

آیت نمبر (۵) اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ۔ '**ترجمہ:** ''ہدایت دے ہم کو راہ سیدھی''

تفسیر ''ہمیں سیدھی راہ دکھا'' یعنی اے پروردگار! اپنی رحمت ومحبت کے سہارے ہمیں وہ راستہ عطا فرما جو دنیا اور آخرت دونوں میں کامیابی کا ضامن ہو۔ ایسے حالات پیدا کر دے کہ قرآن وسنت کے مطابق چلنا آسان ہو جائے اور ہم تیری رضا کے راستے پر قائم رہیں۔

فائدہ: اس دعا کی ابتداء 'اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ'' سے ہوئی تھی اور اس ساری تمہید کا مقصود اصل میں یہ درخواست ہے جو ''اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ'' میں بیان ہوئی۔ یعنی اے اللہ! ہمیں صراطِ مستقیم کی ہدایت دے۔ ہدایت کا مطلب ہے: کسی کو شفقت وخیر خواہی کے ساتھ اُس کی منزلِ مقصود تک پہنچانے کے لئے رہنمائی کرنا۔

ہدایت کے معنیٰ

ہدایت کا مطلب رہنمائی اور توفیقِ الٰہی (Divine Guidance) ہے۔ اور ''صراطِ مستقیم'' سے مراد وہ سیدھا اور روشن راستہ ہے جس میں کجی اور ٹیڑھا پن نہ ہو، جو براہِ راست اللہ اور اُس کی جنت تک لے جانے والا ہو۔ یہی

قرآن وسنت کا راستہ ہے۔مجاہدؒ نے فرمایا: اس سے مراد حق کا راستہ ہے۔ چنانچہ جس نے نبی اکرم ﷺ کی پیروی کی اور بعد میں صحابہ کرامؓ کے نقشِ قدم پر چلا، اس نے حق کی اتباع کی۔اور جو حق کی پیروی کرتا ہے وہ اسلام کی پیروی کرتا ہے۔ جو اسلام کی پیروی کرتا ہے وہ دراصل قرآن کی پیروی کرتا ہے، اور جو قرآن کے راستے پر چلتا ہے وہ اللہ کی مضبوط رسی کو تھام لیتا ہے، یہی ہے صراطِ مستقیم۔

حضرت نواس بن سمعانؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے صراطِ مستقیم کی ایک نہایت دل نشین مثال بیان فرمائی۔فرمایا: ''ایک سیدھی راہ ہے جس کے دونوں طرف دیواریں کھڑی ہیں۔ان دیواروں میں کئی دروازے ہیں جن پر پردے لٹکے ہوئے ہیں۔راہ کے آغاز میں ایک پکارنے والا آواز دیتا ہے: لوگو! سب اسی سیدھی راہ پر چلو اور اِدھر اُدھر مت بھٹکو۔اور ایک اور آواز، جو راہ کے اوپر سے آتی ہے، ہر اُس وقت خبردار کرتی ہے جب کوئی شخص کسی دروازے کا پردہ ہٹانے لگتا ہے۔وہ کہتا ہے: دیکھو! اس پردے کو مت اٹھاؤ، ورنہ تم اندر داخل ہو جاؤ گے۔''

اسی طرح سیدھی راہ اسلام کی ہے اور وہ دونوں دیواریں اللہ کے مقرر کئے ہوئے حدود ہیں اور دروازے اللہ کے حرام کئے ہوئے کام ہیں اور سیدھی راہ کے سرے پر موجود پکارنے والا اللہ کی کتاب ہے اور سیدھی راہ کے اوپر سے پکارنے والا اللہ کی طرف ہر مسلمان کے دل میں موجود خیر کی دعوت دینے والا جذبہ ہے۔**(ترمذی:۲۸۵۹)**

جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

قَالَ رَبُّنَا الَّذِیْٓ اَعْطٰی كُلَّ شَیْءٍ خَلْقَهٗ ثُمَّ هَدٰی ﴿۵۰﴾ **(سورہ طٰہٰ:۵۰)**

ترجمہ: (موسیٰ نے) کہا ''ہمارا رب وہ ہے جس نے ہر چیز کو اس کی شکل وصورت دی، پھر راہ دکھائی۔''

دوسری جگہ ارشاد ہے:

وَجَعَلْنَا مِنْهُمْ اَىِٕمَّةً یَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا لَمَّا صَبَرُوْا ؕ وَكَانُوْا بِاٰیٰتِنَا یُوْقِنُوْنَ ﴿۲۴﴾ **(سورۃ سجدہ:۲۴)**

ترجمہ: ''اور ہم نے ان میں سے پیشوا بنائے تھے، جو ہمارے حکم سے ہدایت کیا کرتے تھے، وہ صبر پر قائم رہے اور ہماری آیتوں پر یقین رکھتے رہے۔''

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَالَّذِیْنَ جَاهَدُوْا فِیْنَا لَنَهْدِیَنَّهُمْ سُبُلَنَا ؕ وَاِنَّ اللّٰهَ لَمَعَ الْمُحْسِنِیْنَ **(سورہ عنکبوت:۶۹)**

ترجمہ: ''جو لوگ ہماری راہ میں جہاد کریں گے ہم ضرور ان پر اپنی راہیں کھول دیں گے اور اللہ اچھے کام کرنے والوں کے ساتھ ہے۔''

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَنَزَعْنَا مَا فِيْ صُدُوْرِهِمْ مِّنْ غِلٍّ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهِمُ الْاَنْهٰرُ ۚ وَقَالُوا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ هَدٰىنَا لِهٰذَا ۫ وَمَا كُنَّا لِنَهْتَدِيَ لَوْلَآ اَنْ هَدٰىنَا اللّٰهُ ۚ لَقَدْ جَآءَتْ رُسُلُ رَبِّنَا بِالْحَقِّ ۭ وَنُوْدُوْٓا اَنْ تِلْكُمُ الْجَنَّةُ اُوْرِثْتُمُوْهَا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۴۳﴾ (سورہ اعراف:۴۳)

ترجمہ: ''اور ان کے سینے میں ایک دوسرے کے درمیان جو رنجش ہوگی، اسے ہم دور کر دینگے۔ ان کے نیچے نہریں بہہ رہی ہونگی اور وہ کہیں گے، ''سبھی تعریفیں اللہ کے لئے ہے، جس نے اس کی طرف ہمیں راہ دکھائی، اور اگر اللہ ہمیں راہ نہ دکھاتا تو ہم ہرگز راہ نہ پا سکتے تھے، بیشک ہمارے رب کے رسول حق لے کر آئے تھے۔'' اور انہیں آواز دی جائیگی، ''یہ جنت ہے جس کے تم وارث بنائے گئے ان کے بدلے میں جو تم (دنیا میں) کیا کرتے تھے۔'' (سورہ اعراف:۴۳)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَاِنَّكَ لَتَهْدِيْٓ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۵۲﴾ (سورہ الشوریٰ:۵۲)

ترجمہ: ''اور بیشک آپ سیدھے راستے کی طرف رہنمائی کر رہے ہیں''۔

اِنَّكَ لَا تَهْدِيْ مَنْ اَحْبَبْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَاۗءُ ۚ وَهُوَ اَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِيْنَ ﴿۵۶﴾

ترجمہ: ''(اے محمد) آپ جسے چاہیں راہ (ہدایت) پر نہیں لا سکتے، مگر اللہ جسے چاہتا ہے، راہ دکھاتا ہے اور وہی راہ پانے والوں کو خوب جانتا ہے''۔ (سورہ قصص:۵۶)

ہدایت کی پہلی قسم

یہ ''عام یا فطری ہدایت'' ہے، یعنی وہ الہامی رہنمائی جو اللہ تعالیٰ اپنی ہر مخلوق کو عطا کرتا ہے۔ اس ہدایت کی بنا پر ہر مخلوق اپنی زندگی کے تقاضے پورے کرنے کے لائق بن جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نوزائیدہ بچہ ماں کے دودھ کو پہچان کر پینے لگتا ہے، پرندے اپنے گھونسلے بنانا سیکھ لیتے ہیں اور درخت زمین سے غذا لے کر بڑھتے اور پھلتے پھولتے ہیں۔ قرآن نے اسی ہدایت کو حضرت موسیٰؑ کی زبان سے بیان کیا ہے کہ: ''ہمارا رب وہ ہے جس نے ہر شے کو پیدا کیا اور پھر اسے اس کے شایانِ شان رہنمائی عطا فرمائی''۔ (طٰہٰ:۵۰)

ہدایت کی دوسری قسم

یہ ہدایت خاص طور پر انسانوں اور جنات کے ساتھ وابستہ ہے، کیونکہ انہی کو عقل و شعور عطا ہوا ہے۔ اس

ہدایت کا ذریعہ انبیاء کرامؑ کی تعلیمات، آسمانی صحیفے، اور علماء وصلحاء کی رہنمائی ہے۔ اس کے ذریعے انسان حق و باطل میں تمیز کرتا ہے۔ چنانچہ جو اس کو قبول کر لے وہ مومن ومؤحد قرار پاتا ہے اور جو اس سے انکار کرے وہ کفر وشرک کی راہ اختیار کرتا ہے۔

ہدایت کی تیسری قسم

یہ ہدایت صرف اہل ایمان اور متقی لوگوں کے ساتھ خاص ہے، جسے ''توفیقِ الٰہی'' کہا جاتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے لئے ایسے حالات اور اسباب پیدا کر دیتا ہے جن سے نیکی کے راستے پر چلنا آسان ہو جاتا ہے۔ دل میں نیک خیالات اور صالح ارادے ڈال دیے جاتے ہیں اور عملِ خیر پر استقامت عطا کر دی جاتی ہے۔ یہ ہدایت بے حد وحساب ہے اور اس کے مدارج لامحدود ہیں۔ یہی روحانی ترقی کا حقیقی میدان ہے۔ انبیاء و رسل سے لے کر اولیاء وصلحاء تک ہر نیک انسان اس کے لئے عمر بھر دعا کرتا رہتا ہے، کیونکہ قربِ الٰہی کی کوئی حد نہیں۔ جس مقام پر بندہ پہنچتا ہے، اسی سے بلند تر مرتبے کی طلب اور دعا اس کے دل میں جنم لیتی رہتی ہے۔

الصِّرَاطَ ''راستہ''

صراط کہتے ہیں راستہ کو، لیکن علماء صراط اس راستے کو کہتے ہیں جس میں چار خصوصیت ہوں (۱) عظیم اور وسیع ہو (۲) سیدھا ہو (۳) سب سے زیادہ قریب ہو (۴) منزل مقصود کے لئے ایک راستے کے سوا کوئی دوسرا راستہ نہ ہو۔

الْمُسْتَقِيْمَ ''سیدھا''

یعنی 'مستقیم' کا مطلب ہے اعتدال اور توازن۔ قرآن میں جب صراطِ مستقیم کہا گیا تو اس سے مراد ''دینِ اسلام'' اور ''دینِ حق'' ہے، جس میں درج ذیل خصوصیات پائی جاتی ہیں:

۱۔ اسلام وہ وسیع اور عظیم شاہراہِ حق ہے جس پر اگر پوری انسانیت چل پڑے تو کسی پر تنگی نہ آئے۔

۲۔ اسلام کا ہر حکم اعتدال پر مبنی ہے، نہ ضرورت سے زیادہ سختی ہے اور نہ ہی بے جا نرمی؛ یہی حقیقی سیدھی راہ ہے۔

۳۔ اسلام کی راہ ہی منزلِ مقصود تک پہنچنے کی سب سے قریبی اور آسان راہ ہے۔

۴۔ انسان کی زندگی کا اصل مقصد اللہ کی رضا ہے اور دینِ اسلام ہی وہ راستہ ہے جو براہِ راست اسی مقصد تک پہنچاتا ہے۔

۵۔ اللہ کی رضا اور آخرت کی کامیابی تک پہنچنے والا راستہ صرف اسلام ہے، اس کے علاوہ کوئی اور راہ منزل تک نہیں لے جاتی۔

اسی لیے ''اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ'' وہ جامع دعا ہے جو ہر بندے کو سکھائی گئی تاکہ وہ ہر لمحہ اللہ سے سیدھی راہ کی طلب کرے۔ قرآن کہتا ہے: ''اللہ جسے چاہے سیدھی راہ دکھا دے اور جسے چاہے گمراہ کر دے''۔

ہرگز اس کا یہ مطلب نہیں کہ اللہ بلاوجہ کسی کو راہ دکھائے اور کسی کو بہکا دے؛ اللہ تو عادل ہے، وہ ایسا نہیں کر سکتا۔ اسی مقصد کے لیے اس نے انبیاء بھیجے، آسمانی کتابیں نازل کیں اور آخر میں حضرت محمد ﷺ کو آخری رسول بنا کر بھیجا اور ان پر قرآن نازل فرمایا۔

درحقیقت سیدھے اور ٹیڑھے راستے کا مطلب یہ ہے کہ جیسے صحت کا قانون ہے: جو اس پر عمل کرتا ہے وہ تندرست رہتا ہے، اور جو اس کے خلاف چلتا ہے وہ بیمار پڑ جاتا ہے۔ اسی طرح جو شخص سیدھی راہ پر چلنا چاہتا ہے، اللہ اس کے لیے وہی راستہ آسان کر دیتا ہے۔ اور جو بھٹکنے کا ارادہ کرتا ہے، وہ خود ہی گمراہی میں جا پڑتا ہے۔ اچھے اور بُرے انجام کا قانون اللہ نے مقرر کر رکھا ہے۔

اللہ نے انسان کو عقل، شعور اور ارادہ دیا ہے۔ اسے اختیار دیا کہ چاہے تو اچھے کام کرے اور چاہے تو برے۔ بولنے کی طاقت ملی تو اس سے نیک کلامی بھی کر سکتا ہے اور برے الفاظ بھی استعمال کر سکتا ہے۔ اسی طرح آنکھ، کان، ہاتھ، پیر اور دوسرے اعضاء کو وہ چاہے تو بھلائی میں لگائے اور چاہے تو برائی میں۔

یعنی سیدھا اور کجی والا راستہ اللہ کے مقرر کردہ اصول کا حصہ ہے۔ اللہ کسی کو بلاوجہ گمراہ نہیں کرتا؛ انسان جس راہ کا انتخاب کرتا ہے، اللہ اپنے اٹل قانون کے مطابق اس کے ساتھ ویسا ہی معاملہ فرماتا ہے۔ اسی لیے اس آیت میں یہ دعا سکھائی گئی کہ: اے اللہ! ہمیں سیدھی راہ دکھا اور اسی پر ثابت قدم رکھ۔

آیت نمبر (۶) صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ

ترجمہ: ''ان لوگوں کا راستہ جن پر تو نے انعام فرمایا''

تفسیر اس آیت میں ''اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ'' کا ذکر آیا ہے اور انعاماتِ الٰہی کا حوالہ دیا گیا ہے۔ دراصل اللہ تعالیٰ کے بے شمار انعامات ہر انسان پر سایہ فگن ہیں۔ خواہ وہ مومن ہو یا کافر، اطاعت گزار ہو یا نافرمان، اللہ اپنی نعمتوں سے کسی کو محروم نہیں رکھتا۔

یہ نعمتیں متنوع ہیں: کچھ دنیاوی ہیں، کچھ اخروی؛ کچھ روحانی ہیں اور کچھ ظاہری و باطنی۔ اسی لیے ''اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ'' کے الفاظ یہ حقیقت اجاگر کرتے ہیں کہ سب سے بڑی نعمتیں وہ ہیں جن کا ثمرہ موت کے بعد ظاہر ہوگا، جیسے ایمان، نیک اعمال، اللہ کی توفیق، اس کی مدد، تقویٰ اور پرہیزگاری۔ قرآنِ حکیم نے خود سورۂ نساء میں وضاحت فرما دی ہے کہ یہی وہ لوگ ہیں جن پر اللہ کے حقیقی انعامات ہوئے۔

اُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ

ترجمہ: ''وہ لوگ جن پر اللہ تعالیٰ کا انعام ہوا انبیاء اور صدیقین اور شہداء اور نیک لوگ ہیں''۔(سورہ نساء:۶۹)

فائدہ: اس آیت سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے دراصل انعام کا مستحق چار طرح کے لوگوں کو قرار دیا ہے، یا یوں کہیے کہ اللہ کے مقبول بندوں کے چار اعلیٰ مراتب ہیں۔

سب سے بلند مرتبہ انبیاء علیہم السلام کا ہے، جنہیں اللہ نے اپنے پیغام کی تبلیغ کے لیے منتخب فرمایا اور اپنی وحی کے ذریعے انسانیت کی رہنمائی کا شرف بخشا۔ ان کی تعلیمات سب سے افضل اور برتر ہیں۔

انبیاء کے بعد دوسرا درجہ صدیقین کا ہے، یعنی وہ سچے اور راست باز لوگ جو اپنے نبی کی امت میں عدل و انصاف اور صداقت کا اعلیٰ نمونہ ہوتے ہیں۔

اس کے بعد مقام ہے شہداء کا، جو دین اور ایمان کی محبت میں اپنی جانیں قربان کر کے ہمیشہ کے لیے امر ہو گئے۔

ان کے بعد مرتبہ ملتا ہے صالحین کو، یعنی وہ نیک بندے جو اللہ کے احکام پر عمل پیرا رہتے ہیں اور اپنے نبی کے ارشادات کی دل و جان سے پیروی کرتے ہیں۔

اس طرح یہ چاروں طبقات وہ ہیں جن کے نقشِ قدم پر چلنا ہی درحقیقت صراطِ مستقیم پر چلنا ہے۔

آیت نمبر(۷) غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ.

ترجمہ: ''ان لوگوں کا راستہ نہیں غضب ہوا جن پر اور نہ حق سے بھٹکنے والوں کا''

سیدھے راستے کی وضاحت کے ساتھ یہ بھی ضروری تھا کہ ان لوگوں کا راستہ بھی بیان کر دیا جائے جو ہدایت سے منہ موڑ کر بغاوت اور مخالفت کے گروہ میں شامل ہو گئے، تاکہ بندہ دعا کرتے وقت صرف انعام یافتہ لوگوں کے راستے کی طلب نہ کرے بلکہ یہ بھی عرض کرے کہ اے اللہ! ہمیں ان راہوں سے محفوظ رکھ، جن پر تیرا غضب نازل ہوا اور جو گمراہی کے اندھیروں میں بھٹک گئے۔ یہی تعلیم الفاظ ''غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ ''میں دی گئی ہے۔

یعنی وہ لوگ جن پر اللہ کا غصہ اور عذاب اترا، جنہوں نے اس کے احکام کی نافرمانی کی، اس کے نبیوں کو جھٹلایا اور حق کو مٹانے کی کوشش کی، یہاں تک کہ اپنے برے اعمال کے سبب اللہ کے غضب کا شکار ہو گئے۔

وَلَا الضَّآلِّيْنَ

''اور نہ گمراہوں میں'' سے مراد وہ لوگ ہیں جو جہالت اور ہٹ دھرمی کے باعث دین کی سیدھی راہ چھوڑ کر غلط راستوں پر چل پڑے، اپنی فطری سچائی کو گنوا بیٹھے اور حد سے آگے بڑھ گئے۔ جیسے نصاریٰ جنہوں نے نبی کی تعظیم میں اس قدر غلو کیا کہ انہیں خدائی کے مرتبے تک پہنچا دیا۔ مفسرین نے واضح کیا ہے کہ ''غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ '' سے

مراد یہود ہیں اور ''وَلَا الضَّآلِّيْنَ'' سے مراد نصاریٰ (عیسائی) ہیں۔

بعض علماء نے لکھا ہے کہ ''مغضوب'' ان لوگوں کو کہا گیا ہے جو دین کو جاننے اور سمجھنے کے باوجود اپنی شرارتوں، خواہشات اور دنیا پرستی کی خاطر اس کے خلاف چلتے ہیں، یا اللہ کے احکام پر عمل میں کوتاہی کرتے ہیں۔ یہی حال اکثر یہودیوں کا تھا کہ دنیاوی مفاد کے لیے دین کو قربان کرتے اور نبیوں کی گستاخی سے بھی باز نہ آتے۔

اسی طرح بندہ اپنے رب کے حضور یہ دعا کرتا ہے کہ اے اللہ! ہمیں ان راہوں سے محفوظ فرما جو تیری نافرمانی، بغاوت اور دین سے دوری کی طرف لے جاتی ہیں، اور نہ ہمیں ان راستوں پر ڈال جو جہالت، گمراہی اور دین میں تبدیلی کرنے والوں کے ہیں۔

آمین کا مطلب

سورۃ الفاتحہ کے اختتام پر ''آمین'' کہنا سنت ہے۔ اس کے معنیٰ ہیں: اے اللہ! ایسا ہی کر یا اے اللہ! ہماری دعا قبول فرما۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جب امام ''آمین'' کہے تو تم بھی آمین کہو، کیونکہ جس کی آمین فرشتوں کی آمین سے مل جائے اس کے سابقہ گناہ بخش دیے جاتے ہیں''۔ (بخاری:۷۸۰)

یہ بات تمام مفسرین کے نزدیک مسلم ہے کہ ''آمین'' نہ تو قرآن کا جز ہے، نہ سورۃ الفاتحہ کا حصہ، بلکہ ایک مستقل دعا ہے، جیسا کہ دیگر دعاؤں کے بعد آمین کہنا سنت ہے، اسی طرح سورۃ الفاتحہ کے بعد بھی سنت ہے۔ البتہ اس میں اختلاف ہے کہ آمین بلند آواز سے کہی جائے یا آہستہ۔ امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک آہستہ کہنا افضل ہے، جبکہ امام شافعیؒ بلند آواز سے پڑھنے کے قائل ہیں۔ ان کی دلیل حضرت وائل بن حجرؓ کی روایت ہے جس میں جہراً کا ذکر ہے، لیکن امام ابوحنیفہؒ ابن مفضل اور حضرت انس رضی اللہ عنہما کی روایت کی بنیاد پر خفیہ آمین کے قائل ہیں، اور قرآن کی آیت ''اُدْعُوْا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَّخُفْيَةً'' بھی اسی پر دلالت کرتی ہے۔

حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت بھی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جب امام آمین کہے تو تم بھی کہو، کیونکہ جس کی آمین فرشتوں کی آمین سے مل جائے گی اس کے گناہ معاف کر دیے جائیں گے''۔ (بخاری رقم:۷۸۰، ومسلم رقم:۴۱۰)

یہی وجہ ہے کہ احناف کے نزدیک اگر آمین بالجہر مطلوب ہوتی تو رسول اللہ ﷺ اس طرح ارشاد فرماتے: ''إذا قال الامام آمين فقولوا آمين'' (یعنی جب امام بلند آواز سے آمین کہے تو تم بھی کہو)۔ خلفائے راشدین کے عمل سے بھی ثابت ہے کہ ''سبحانك اللهم''، ''أعوذ بالله''، ''بسم الله'' اور ''آمين'' سب آہستہ پڑھا کرتے تھے۔ پس یہ اختلاف ناجائز یا جائز کا نہیں بلکہ افضل وغیر افضل کا ہے۔

سورۃ الفاتحہ کا مضمون نہایت جامع ہے: ابتداء میں اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا بیان ہوئی، پھر اسی کی عبادت اور اسی سے مدد مانگنے کا اقرار کیا گیا، اور اس کے بعد ایک عظیم دعا کی تلقین کی گئی جو تمام انسانی حاجات کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے۔ اس سورۃ سے چند بنیادی تعلیمات سامنے آتی ہیں:

(۱) دعا کا طریقہ یہ ہے کہ پہلے اللہ کی حمد وثنا ہو، پھر اس کی توحید وعبادت کا اقرار، اس کے بعد اپنی ضرورت پیش کی جائے۔ دعا جامع اور مختصر ہوتا کہ سب مقاصد اس میں شامل ہوسکیں۔ (۲) حمد وتعریف صرف اللہ کے لیے ہے؛ انسان کو اپنی تعریف کی اجازت نہیں۔ (۳) دنیا میں جو لوگ واسطۂ نعمت ہیں، ان کا شکر ادا کرنا بھی لازم ہے۔ (۴) ''رب'' کا لفظ صرف اللہ کے لیے بولا جائے گا، اور اللہ کے سوا کسی کو سجدۂ تعظیمی جائز نہیں۔ (۵) کسی چیز کو حلال یا حرام قرار دینے کا حق اللہ کے سوا کسی کو دینا شرک ہے۔ اسی طرح کسی کے نام کی نذر ونیاز ماننا، یا اللہ کے علاوہ کسی کو حاجت روا یا مشکل کشا سمجھ کر پکارنا بھی شرک ہے۔ ایسے ہی وہ اعمال جو مشرکانہ ہیں انہیں نافع سمجھ کر کرنا، جیسے سر پر چوٹی رکھنا، تلک لگانا، جنیو پہننا وغیرہ بھی سب حرام ہیں۔ (۶) غیر اللہ سے مدد (استعانت) بھی ممنوع ہے۔ اگر کسی کو اللہ کے برابر قادر مطلق سمجھ کر مدد مانگی جائے تو یہ کھلا شرک ہے۔ اور اگر یہ عقیدہ رکھا جائے کہ اللہ نے اپنے اختیار کا کچھ حصہ کسی کو دے دیا ہے، تو یہ بھی شرک ہے۔

مگر مشرکین اکثر معجزات وکرامات دیکھ کر دھوکے میں پڑ جاتے ہیں اور یہ سمجھ بیٹھتے ہیں کہ یہ سب نبی، ولی یا فرشتہ کے اختیار سے ہوا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ تمام تصرف اللہ ہی کا ہے۔ انبیاء واولیاء کے ہاتھوں جو معجزات وکرامات ظاہر ہوتے ہیں، وہ اللہ کی قدرت سے ہیں، ان کے اپنے اختیار میں کچھ نہیں۔ اس لیے عقیدہ یہی ہونا چاہیے کہ سب کچھ اللہ تعالیٰ ہی کی مشیت اور قدرت سے ہوتا ہے۔

❁❁❁

بسم اللہ الرحمن الرحیم

سورہ بقرہ کا مختصر تعارف

اس سورہ کا نام ''سورۃ البقرۃ'' ہے۔ ''بقرۃ'' کا مطلب ہے ''گائے'' اور اس نام کی وجہ یہ ہے کہ اس سورہ کے آٹھویں رکوع میں بنی اسرائیل کے ایک واقعے کا تفصیلی ذکر ہے، جس میں اللہ تعالیٰ نے ایک گائے ذبح کرنے کا حکم فرمایا تھا۔ اسی نسبت سے اس سورہ کو ''البقرۃ'' کہا گیا۔ تمام سورتوں کے نام رسول اللہ ﷺ نے اللہ تعالیٰ کے حکم سے ہی مقرر فرمائے تھے۔

قرآن کی ترتیب کے اعتبار سے یہ دوسری سورہ ہے، مگر نزول کے اعتبار سے اس کا نمبر ۹۱ ہے۔ یعنی اس سے پہلے نوّے سورتیں مکہ میں نازل ہو چکی تھیں اور اس کے بعد مدینہ میں تئیس سورتیں نازل ہوئیں۔

اسبابِ نزول

اس سورہ کا بیشتر حصہ مدینہ منورہ میں رسول اللہ ﷺ کی ہجرت کے بعد نازل ہوا۔ چند آیات حج کے موقع پر نازل ہوئیں، مگر مفسرین ان آیات کو بھی ''مدنی'' ہی شمار کرتے ہیں۔ یہ قرآن کریم کی سب سے طویل سورہ ہے اور اس میں شریعت کے احکام بھی سب سے زیادہ بیان کیے گئے ہیں۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ: ''سورہ نساء اور سورہ بقرہ اُس زمانے میں نازل ہوئیں جب میں رسول اللہ ﷺ کے نکاح میں آ چکی تھی''۔ **(بخاری: ۴۹۹۳)**

یعنی یہ سورت ۲ ہجری میں نازل ہونی شروع ہوئی اور مختلف اوقات میں بتدریج نازل ہوتی رہی۔ اس میں سود سے متعلق جو آیات ہیں وہ رسول اللہ ﷺ کی زندگی کے آخری دور میں، فتح مکہ کے بعد نازل ہوئیں۔ اسی سورہ میں ایک آیت وہ بھی ہے جو پورے قرآن کی بالکل آخری آیت ہے، جو ۱۰ ہجری کو ۱۰ ذی الحج کے دن منیٰ میں نازل ہوئی، اس وقت رسول اللہ ﷺ حجۃ الوداع کے ارکان ادا فرما رہے تھے۔ **(قرطبی)** اس آیت کے تقریباً ۸۰ یا ۹۰ دن بعد آپ ﷺ کا وصال ہوا اور وحی کا سلسلہ ہمیشہ کے لیے بند ہو گیا۔

مدینہ کے حالات

جب رسول اللہ ﷺ مکہ سے ہجرت کر کے مدینہ پہنچے تو وہاں یہودیوں کا بڑا اثر و رسوخ تھا۔ یہودی نہ صرف دولت مند تھے بلکہ بڑے بڑے عالم اور دانشور بھی انہی میں تھے۔ آپ ﷺ کی آمد کے بعد وہ اسلام اور

مسلمانوں کے کھلے دشمن بن گئے۔ مدینہ اور اس کے گرد ونواح میں دشمنانِ اسلام کے دو بڑے گروہ موجود تھے:

۱۔ وہ جو اعلانیہ کفر پر قائم تھے اور رسالتِ محمدی کے منکر تھے۔ ۲۔ وہ منافق جو بظاہر مسلمان تھے مگر دل سے اعلانیہ اسلام کے دشمن تھے۔

یہ منافقین مسلمانوں کے دلوں میں شکوک پیدا کرنے کی کوشش کرتے اور در پردہ یہودیوں کے ساتھ ملے رہتے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے باطل وساوس اور شبہات کو زائل کرنے کے لیے یہ سورہ نازل فرمانا شروع کی۔ یہودیوں کے ایک بڑے سردار ''مالک بن سیف'' کی عادت تھی کہ مسلمانوں کے ایمان میں کھوٹ پیدکرتا اور کہتا: ''یہ وہ کتاب نہیں ہے جس کی خبر پچھلی آسمانی کتابوں میں دی گئی ہے''۔

چنانچہ اللہ تعالیٰ نے سورہ کے آغاز میں اس کے وسوسوں کا جواب دیا۔ پھر چار آیات میں ایمان والوں کی صفات اور ان کی عظمت بیان کی، اس کے بعد دو آیات کفار کے بارے میں نازل ہوئیں اور پھر تیرہ آیات میں منافقین کے حالات اور ان کی باطنی کیفیت کو کھول کر بیان فرمایا۔

سورہ کا مختصر خلاصہ

سورۃ البقرہ کے مرکزی مضامین: اس سورہ کا اصل موضوع ''دعوتِ توحید'' ہے اور اس کے اہم مضامین درج ذیل ہیں: (۱) توحید (۲) رسالت (۳) اللہ کے راستے میں جہاد (۴) اللہ کی راہ میں خرچ کرنا (۵) اور کچھ خاص معاملات سے متعلق احکام۔

اس میں سب سے پہلے بتایا گیا ہے کہ قرآن مجید اللہ کی وہ کتاب ہے جس میں ذرّہ برابر بھی شک کی گنجائش نہیں۔ یہ کتاب صرف انہی لوگوں کے لیے ہدایت نامہ ہے جن کے دل اللہ کے خوف اور تقویٰ سے لبریز ہیں۔ پھر یہ حقیقت بیان کی گئی کہ قرآن کے نزول پر لوگوں کا ردِعمل تین طرح کا ہوگا: ایک وہ جو اس پر ایمان لا کر سچے مومن بنیں گے، دوسرے وہ کافر جو ضد اور انکار پر قائم رہیں گے اور تیسرے وہ منافق جو زبان سے تو ایمان کا دعویٰ کریں گے لیکن دل میں منکر اور مخالف ہوں گے۔

اسی طرح اس سورہ میں پوری انسانیت کو ''توحید کی دعوت'' دی گئی ہے۔ سب کو عبادت و بندگی کی طرف بلایا گیا ہے اور قرآن مجید کے برحق ہونے کو دلائل کے ساتھ ثابت کیا گیا ہے۔

اس میں حضرت آدمؑ کی تخلیق، ابلیس کی نافرمانی، آدمؑ وحواؑ کو بہکا کر جنت سے نکالنے کا واقعہ اور ان کی توبہ کی قبولیت کا ذکر ہے۔ پھر بنی اسرائیل کی تاریخ اور ان پر اللہ کے بے شمار انعامات بیان کیے گئے ہیں، مگر ان کے کفرانِ نعمت اور سرکشی کو بھی واضح کیا گیا ہے؛ جیسے سنیچر کے دن کی خلاف ورزی، تورات ملنے کے بعد ناشکری، گائے کے واقعہ

میں ضد، انبیاء کے قتل کی سازش، جادو کے ذریعے بگاڑ پیدا کرنے کی کوشش، نبیوں کی توہین اور باطل عقائد۔

اسی تسلسل میں حضرت اسمٰعیلؑ کے حالات، ان کی نسل سے خاتم النبیین ﷺ کی آمد، حضرت ابراہیم و حضرت اسمٰعیل علیہما السلام کے ذریعے کعبہ کی تعمیر اور پھر اہلِ اسلام کے لیے قبلہ کی تبدیلی (بیت المقدس سے خانۂ کعبہ کی طرف) کا ذکر کیا گیا ہے۔ مزید یہ کہ اس سورہ میں نماز اور صبر کے ذریعے اللہ سے مدد مانگنے کی تعلیم دی گئی ہے۔ اللہ کی راہ میں شہید ہونے والوں کو جنت کی دائمی زندگی کی بشارت دی گئی ہے۔ حج وعمرہ کا ذکر، اللہ کی قدرت کی نشانیاں، اس کی خالقیت کے دلائل، مشرکوں کے باطل عقائد کا رد اور شرک سے بچنے کی ہدایات بھی اسی سورہ میں موجود ہیں۔

پھر پاک وناپاک اور حلال وحرام اشیاء کا ذکر آتا ہے۔ پچیسویں رکوع تک ایمان، صدقہ، خیرات، نماز، روزہ، اعتکاف، حج، اللہ کی راہ میں خرچ کرنا اور معاشرت میں خوش اخلاقی اختیار کرنے کی تعلیم دی گئی ہے۔ اس کے بعد جہاد کے احکام، شراب و جوا کی حرمت، یتیموں اور غریبوں کی کفالت، نکاح وطلاق، عدت، ایلاء، دوسرا نکاح، بچوں کی پرورش اور مہر کے مسائل بیان کیے گئے ہیں۔

بتیسویں اور تینتسویں رکوع میں بنی اسرائیل کے ایک نبی کی دعا سے مردوں کا زندہ ہونا، طالوت وجالوت کی جنگ، بنی اسرائیل کی سلطنت اور حضرت داؤدؑ کے عہد کا ذکر ہے۔ چونتیسویں رکوع میں مشہور آیت الکرسی اور اسلام قبول کرنے میں جبر نہ ہونے کا حکم بیان کیا گیا ہے۔ پھر حضرت ابراہیمؑ کے چار پرندوں کو زندہ کرنے کا معجزہ، حضرت عزیرؑ کا واقعہ، صدقہ وخیرات، سود کی ممانعت اور معاملاتِ زندگی جیسے قرض، گواہی اور لین دین کے اصول واضح کیے گئے ہیں اور آخر میں ایمان واسلام کا خلاصہ اور ایک عظیم دعا کے ساتھ اس سورہ کو مکمل کیا گیا ہے۔

سورہ بقرہ کی فضیلت

● حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جس گھر میں سورۃ البقرہ کی تلاوت کی جاتی ہے، وہاں سے شیطان نکل بھاگتا ہے''۔ (ترمذی: ۲۸۷۷)

● حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''دو روشن سورتیں یعنی سورۃ البقرہ اور سورۃ آل عمران پڑھا کرو، قیامت کے دن یہ دونوں اس حال میں آئیں گی جیسے دو سائبان (بادل کے ٹکڑے) یا دو پرندوں کے غول، اور اپنے پڑھنے والوں کی طرف سے جھگڑیں گی (یعنی شفاعت کریں گی)''۔ (ترمذی: ۲۸۸۳)

● حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے کہ اس سورہ میں ایک ایسی آیت ہے جو پورے قرآن کی آیتوں میں سب سے افضل ہے اور وہ ہے ''آیت الکرسی''۔ (ترمذی: ۲۸۸۴)

● اسی طرح حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ''سورۃ البقرہ کی دس آیات ایسی ہیں کہ اگر

کوئی شخص رات کو انہیں پڑھ لے تو اس رات شیطان اور جن اس کے گھر میں داخل نہ ہوں گے، نہ اسے اور نہ ہی اس کے گھر والوں کو کوئی آفت یا بیماری پہنچے گی۔ اور اگر یہ آیات کسی مجنون پر پڑھی جائیں تو وہ تندرست ہو جائے گا اور وہ دس آیات یہ ہیں: ابتدائی چار آیات، آیت الکرسی، اس کے بعد کی دو آیات اور آخری تین آیات۔ **(سنن دارمی: ۳۴۲۶)**

● حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''قرآن پڑھا کرو، کیونکہ یہ قیامت کے دن اپنے پڑھنے والوں کے لیے سفارشی بن کر آئے گا۔ سورۃ البقرہ اور سورۃ آل عمران کی تلاوت کیا کرو، یہ دونوں روشنی دینے والی ہیں۔ قیامت کے دن یہ ایسے آئیں گی جیسے دو بادل یا پرندوں کے دو جھنڈ، اور اپنے پڑھنے والوں کی طرف سے دفاع کریں گی۔ سورۃ البقرہ پڑھو، کیونکہ اس کا پڑھنا برکت ہے، اور اس کا ترک کرنا حسرت ہے، اور جادوگر اس کے پڑھنے والوں پر اثر انداز نہیں ہو سکتے''۔ **(مسلم: ۱۸۷۴)**

● حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے موقوفاً اور مرفوعاً روایت ہے کہ: ''شیطان اس گھر سے بھاگ جاتا ہے جس میں سورۃ البقرہ کی تلاوت کی جاتی ہے''۔ **(مستدرک حاکم: ۲۰۲۶)**

❁❁❁

ترجمہ وتفسیر-سورہ بقرہ

ترجمہ-آیت نمبر ۱ سے ۱۰ تک

یہ سورہ مدنی ہے۔اس میں ۴۰ رکوع اور ۲۸۶ آیتیں ہیں

الٓمّٓ ① ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ ۛ فِيْهِ ۛ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ ② الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ③ وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ ۚ وَبِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ ④ اُولٰٓئِكَ عَلٰى هُدًى مِّنْ رَّبِّهِمْ ۗ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ⑤ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا سَوَآءٌ عَلَيْهِمْ ءَاَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ⑥ خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰى سَمْعِهِمْ ۭ وَعَلٰٓى اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ ۠ وَّلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ⑦ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَبِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَمَا هُمْ بِمُؤْمِنِيْنَ ⑧ يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۚ وَمَا يَخْدَعُوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُوْنَ ⑨ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ ۙ فَزَادَهُمُ اللّٰهُ مَرَضًا ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۢ بِمَا كَانُوْا يَكْذِبُوْنَ ⑩

ترجمہ:

(۱)۔الف،لام،میم۔(۲)۔یہ وہ کتاب ہے جس میں کوئی شک نہیں،ہدایت ہے ان لوگوں کے لیے جو اللہ سے ڈرتے ہیں۔(۳)۔جو غیب پر ایمان لاتے ہیں،نماز قائم کرتے ہیں اور جو کچھ ہم نے انہیں دیا ہے،اس میں سے اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں۔(۴)۔اور وہ لوگ جو ایمان رکھتے ہیں اس چیز پر جو آپ پر نازل کی گئی،اور ان چیزوں پر بھی جو آپ سے پہلے نازل کی گئیں،اور وہ آخرت پر یقین رکھتے ہیں۔(۵)۔یہی لوگ اپنے رب کی طرف سے ہدایت پر ہیں،اور یہی ہیں کامیاب ہونے والے۔(۶)۔بے شک جن لوگوں نے کفر کیا،ان کے لیے برابر ہے،چاہے آپ انہیں خبردار کریں یا نہ کریں،وہ ایمان نہیں لائیں گے۔(۷)۔اللہ نے ان کے دلوں اور کانوں پر مہر لگا دی ہے اور ان کی آنکھوں پر پردہ ہے اور ان کے لیے بہت بڑا عذاب ہے۔(۸)۔اور کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو کہتے ہیں کہ ہم اللہ پر اور یومِ آخرت پر ایمان لائے،حالانکہ وہ حقیقت میں ایمان والے نہیں ہیں۔(۹)۔وہ اللہ کو اور ان لوگوں کو جو ایمان لائے،دھوکہ دیتے ہیں،لیکن حقیقت میں وہ اپنے آپ کو دھوکہ دیتے ہیں اور وہ اس کا شعور بھی نہیں رکھتے۔(۱۰)۔ان کے دلوں میں بیماری ہے،تو اللہ نے ان کا مرض بڑھا دیا اور ان کے لیے بڑا دردناک عذاب ہے،

اس وجہ سے کہ وہ جھوٹ بولا کرتے تھے۔

تفسیر- آیت نمبر ۱ سے ۱۰ تک

آیت نمبر (۱) الٓمّٓ ① اس سورہ کی شروعات لفظ الٓمّٓ سے ہوئی ہے، اس طرح کے حروف قرآن مجید کی کئی سورتوں کے شروع میں آئے ہیں، جن کو 'حروف مقطعات' کہتے ہیں۔

تفسیر

حروف مقطعات

قرآن مجید کی ۲۹ سورتوں کی ابتداء ''حروفِ مقطعات'' سے ہوتی ہے۔ انہیں ''مقطعات'' اس لیے کہا جاتا ہے کہ یہ حروف الگ الگ پڑھے جاتے ہیں، مثلاً: الٓمٓ، الٓمٓصٓ، حٰمٓ۔

علمائے تفسیر کے مابین ان کے معانی کے بارے میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ بعض مفسرین کے نزدیک ان کا صحیح مفہوم صرف اللہ تعالیٰ ہی کو معلوم ہے اور کوئی دوسرا ان کے راز تک رسائی نہیں رکھتا۔ امام قرطبی نے یہ قول حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ، حضرت علیؓ اور حضرت ابن مسعودؓ سے نقل کیا ہے۔

حروف مقطعات کے معانی

۱۔ سورتوں کے نام

کچھ مفسرین کی رائے ہے کہ یہ دراصل سورتوں کے نام ہیں۔ حضرت عبدالرحمٰن بن زید بن اسلمؒ فرماتے ہیں: ''یہ سورتوں کے نام ہیں'' اور مشہور مفسر علامہ ابوالقاسم محمود بن عمر زمخشریؒ نے بھی اپنی تفسیر میں لکھا ہے کہ اکثر مفسرین اس بات پر متفق ہیں کہ یہ سورتوں کے نام ہیں۔

۲۔ اللہ تعالیٰ کے نام

بعض مفسرین کے نزدیک یہ الفاظ اللہ تعالیٰ کے نام ہیں۔ حضرت شعبیؒ، سالم بن عبداللہؒ اور اسماعیل بن عبدالرحمنؒ نے بھی یہی رائے دی ہے۔ حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کے بڑے ناموں میں سے ہیں۔ ایک اور روایت کے مطابق الٓمٓ، حٰمٓ، طٰسٓ اللہ تعالیٰ کے عظیم نام ہیں۔ یہی رائے حضرت علیؓ اور حضرت ابن عباسؓ سے بھی منقول ہے۔

۳۔ اللہ کی قسم

بعض اہلِ علم کے نزدیک یہ اللہ تعالیٰ کی قسم ہے۔ حضرت عکرمہؒ نے فرمایا کہ یہ الفاظ قسم کے طور پر آئے

ہیں۔اسی طرح حضرت ابن عباسؓ، حضرت ابن مسعودؓ اور دیگر صحابہ سے بھی روایت ہے کہ یہ دراصل اللہ تعالیٰ کے اسماء کے ابتدائی حروف ہیں۔

۴۔قوموں کی مدت اور وقت

حضرت ابوالعالیہؒ فرماتے ہیں کہ یہ حروف جیسے: الف، لام، میم، وہ حروف ہیں جو تمام زبانوں میں استعمال ہوتے ہیں۔ان میں سے ہر حرف اللہ تعالیٰ کے ایک ایک نام کا آغاز ہے۔ان کے ذریعے قوموں کی مدت اور ان کے وقت کا اشارہ دیا گیا ہے۔مثلاً: الف سے مراد ''اللہ''، لام سے ''لطیف'' اور میم سے ''مجید'' ہے۔

اختصار (یعنی ''الف سے اللہ'')

بعض علماء کا کہنا ہے کہ جس طرح آج کل ''شارٹ ہینڈ'' میں الفاظ یا جملوں کو علامتی حروف کے ذریعے مختصر کر کے لکھا جاتا ہے، تاکہ تیزی سے تحریر ممکن ہو، اسی طرح عربوں کے ہاں بھی چند الفاظ علامتی انداز میں رائج تھے۔اسی تناظر میں حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ ''الف'' سے انعاماتِ الٰہی، ''لام'' سے لطفِ باری تعالیٰ اور ''میم'' سے ملک مراد ہے۔گویا یہ کہ اللہ کی تمام نعمتیں اور سلطنت اسی کے لطف و کرم سے قائم ہیں۔

● اسی طرح ایک اور روایت کے مطابق ''الف'' سے اللہ، ''لام'' سے جبرئیلؑ اور ''میم'' سے محمد ﷺ مراد ہیں۔مطلب یہ کہ کلامِ الٰہی جبرئیل امین کے ذریعے حضرت محمد ﷺ پر نازل ہوا۔

● حضرت ابوالعالیہؒ کا خیال ہے کہ ان حروف میں قوموں کی تاریخ اور ان کے عروج و زوال کی داستانیں پوشیدہ ہیں۔

روایت میں آتا ہے کہ ایک مرتبہ کچھ یہودی رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔آپ ﷺ نے ان کے سامنے ''الف لام میم'' کی تلاوت فرمائی۔وہ کہنے لگے: ''ہم ایسے دین میں کیسے داخل ہوں جس کی کل مدت صرف ۷۱ سال ہے؟'' یہ سن کر رسول اللہ ﷺ مسکرا دیے اور پھر ''الف لام میم صاد'' اور ''الف لام را'' پڑھ کر سنایا۔یہودی کہنے لگے: ''ان کی گنتی تو ۱۶۱ بنتی ہے، جو پہلی گنتی سے زیادہ ہے۔'' اس پر معاملہ اختلافی بن گیا اور وہ کسی حتمی نتیجے تک نہ پہنچ سکے۔

کوڈ ورڈ (Code word خفیہ الفاظ)

ہر زبان میں کچھ مختصر اور علامتی الفاظ استعمال ہوتے ہیں جو کسی خاص پیغام یا مخصوص مطلب کے لیے رکھے جاتے ہیں۔ان کے معانی عام لوگوں پر نہیں کھلتے بلکہ صرف اہلِ علم یا متعلقہ افراد ہی سمجھ پاتے ہیں۔انگریزی میں انہیں ''کوڈ ورڈ'' کہا جاتا ہے۔قرآنِ مجید میں جو حروفِ مقطعات آئے ہیں، ان کا اصل مفہوم اور حقیقت صرف اللہ اور اس کے رسول ﷺ ہی جانتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کے خاص راز

حضرت عامر، شعبی، سفیان ثوری اور دیگر محدثین کا کہنا ہے کہ ہر آسمانی کتاب میں اللہ تعالیٰ کے کچھ خاص راز پوشیدہ رہے ہیں۔ قرآن کے یہ حروفِ مقطعات بھی دراصل اللہ تعالیٰ کے وہی راز ہیں۔ ہمارا کام ان پر ایمان لانا اور ان کی تلاوت سے ثواب حاصل کرنا ہے، نہ کہ ان کے معنیٰ کے کھوج میں پڑنا۔

دعویٰ (چیلنج)

مفسرین کے نزدیک ایک بڑی حکمت یہ بھی ہے کہ ان حروف کو سورتوں کے آغاز میں لانے کا مقصد عربوں کو چیلنج دینا تھا۔ انہیں باور کرایا گیا کہ یہ کتاب انہی حروف سے بنی ہے جو تمہاری زبان اور تمہارے محاوروں میں روزمرہ استعمال ہوتے ہیں۔ اگر تمہیں اپنی عقل و دانش پر اتنا ناز ہے تو انہی حروف کے ذریعے اس جیسی کوئی کتاب بنا کر دکھاؤ۔

لیکن جب بڑے بڑے ماہرینِ لسان و ادب بھی اس چیلنج میں ناکام رہے، تو یہ کیسے ممکن ہے کہ ایک اُمی (یعنی غیر تعلیم یافتہ) ہستی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جس نے کسی سے کچھ نہ پڑھا ہو، وہ اپنی طرف سے ایسا کلام بنالے؟ حقیقت یہ ہے کہ اگر یہ کتاب اللہ کے سوا کسی اور کی طرف سے ہوتی تو تم ضرور اس جیسا کلام لے آتے۔

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''جس نے اللہ کی کتاب کا ایک حرف پڑھا، اسے ایک نیکی ملے گی اور وہ نیکی دس گنا بڑھا دی جائے گی۔ میں یہ نہیں کہتا کہ 'الف لام میم' ایک ہی حرف ہے بلکہ الف ایک حرف ہے، لام ایک حرف ہے اور میم ایک الگ حرف ہے''۔ **(مشکوۃ: ۲۱۳۷)**

خلاصہ

الغرض، چاہے یہ سورتوں کے نام ہوں، یا اللہ تعالیٰ کے اسماء وصفات کی طرف اشارہ، یا پھر سورتوں کے آغاز میں آنے والے منفرد الفاظ، ان سب میں حکمت پوشیدہ ہے۔ ممکن ہے کہ ہر حرف اللہ تعالیٰ کے کسی نہ کسی نام یا صفت کی طرف اشارہ کرتا ہو۔

تمام صحابہ، تابعین اور علماء کا اجماعی موقف یہی ہے کہ ان حروف کا اصل علم صرف اللہ تعالیٰ کے پاس ہے۔ بعید نہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہ راز بطورِ خاص عطا کیا گیا ہو، لیکن چونکہ اس کی عدمِ وضاحت سے دین میں کوئی کمی یا عملی رکاوٹ پیدا نہیں ہوتی تھی، اس لیے اُمت کو اس کی تفصیل نہ بتائی گئی۔ البتہ کچھ مفسرین نے اپنی فہم و بصیرت کے مطابق ان کے ممکنہ معانی کا اندازہ لگانے کی کوشش ضرور کی ہے۔

آیت نمبر (۲) ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ ۛ فِيْهِ ۛ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ ۝۲

ترجمہ: ''یہ وہ کتاب ہے جس میں کوئی شک نہیں، ہدایت ہے ان لوگوں کے لئے جو اللہ سے ڈرتے ہیں''۔

تفسیر

ذٰلِكَ الْكِتَاب

حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ یہاں لفظ ''ذٰلِكَ'' کے معنیٰ ''هٰذا'' کے ہیں۔ اسی طرح مجاہدؒ، سعید بن زبیر، سدی، مقاتل بن حیان، زید بن اسلم وغیرہ نے بھی یہی کہا ہے۔ **(ابن کثیر)**

امام بخاریؒ سے بھی یہی روایت نقل ہوئی ہے کہ لفظ ''ذٰلِكَ'' اصل میں تو ''وہ'' کے لیے استعمال ہوتا ہے، لیکن کبھی قریب کے معنیٰ میں ''یہ'' کے لیے بھی آتا ہے۔ اس مقام پر اس کا مفہوم یہی ہے: ''یہ کتاب ایسی ہے جس میں کسی شک کی گنجائش نہیں''۔

الْكِتَاب

الکتاب سے مراد قرآنِ مجید ہے، یعنی وہ عظیم کتاب جو حقیقی معنوں میں کتاب ہے۔ اس میں علم وحکمت کے ایسے خزانے اور واضح حقائق بیان کیے گئے ہیں جو پچھلی کتابوں میں موجود نہیں تھے۔

حضرت محمد ﷺ کے زمانے میں یہودی اپنی کتابوں میں آپ ﷺ کی پیشین گوئی دیکھ کر مدینہ اور اس کے قریب آباد ہوئے تاکہ آخری نبی کا انتظار کر سکیں۔ قرآن کریم ان کی توقع کی تصدیق کرتا ہے کہ یہ وہی کتاب ہے جس کا ذکر پچھلی آسمانی کتابوں میں آیا تھا۔

مدینہ کے یہودیوں میں سے مالک بن سیف مسلمانوں کے دلوں میں شک ڈالتا تھا کہ یہ قرآن وہ کتاب نہیں جس کی خبر پہلی کتابوں میں دی گئی تھی۔ قرآن کریم نے اس شک کو دور کیا اور واضح فرمایا کہ یہ وہی کتاب ہے جس کی خبر پچھلی آسمانی کتابوں میں دی گئی تھی۔ آج بھی جو شخص دل سے قرآن کا مطالعہ کرے گا، وہ یہ تسلیم کرے گا کہ یہ اللہ کی کتاب ہے۔

هُدًى (ہدایت)

لفظ ''هُدیٰ'' کے دو معنیٰ ہیں:

۱۔ رہنمائی کرنا اور راہِ حق کو واضح کرنا: قرآن کریم گمراہ لوگوں کے لیے ہدایت ہے تاکہ وہ حق کی طرف لوٹیں، چاہے وہ اس سے فائدہ اٹھائیں یا نہ اٹھائیں۔

۲۔ دل میں ہدایت قبول کرنے کی صلاحیت پیدا کرنا: قرآن ان لوگوں کے لیے بھی ہدایت ہے جنہیں اللہ تعالیٰ نے

اپنے فضل سے راہِ حق پر چلنے کی توفیق دی ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ''یہی لوگ ہیں جنہیں اللہ نے ہدایت دی''۔

متقی

حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ ''متقی'' وہ شخص ہے جو اللہ کے عذاب سے ڈرتا ہے اگر وہ ہدایت پر نہ چلے اور اللہ کی رحمت کی امید رکھتا ہے اگر دینِ اسلام کی تصدیق کر کے اس پر عمل کرے۔

حضرت ابو ہریرہؓ سے کسی نے پوچھا کہ تقویٰ کیا ہے؟ تو آپؓ نے مثال دی: ''کیا تم کبھی خاردار راستے پر چلے ہو؟'' اس نے کہا: ہاں! پھر آپؓ نے پوچھا: ''تم نے راستہ کیسے طے کیا؟'' اس نے کہا: ''جب کانٹا دیکھتا تو اس سے الگ ہو جاتا۔'' آپؓ نے فرمایا: ''یہی تقویٰ ہے''۔

غلط فہمی

کچھ لوگ قرآن کو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تخلیق سمجھتے ہیں، یہ ایک بہت بڑی غلط فہمی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم امی (غیر پڑھا لکھا) تھے۔ اللہ تعالیٰ کے فرشتہ جبرئیلؑ قرآن لے کر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس آتے تھے، اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اسے حفظ کر کے یا بعد میں لکھوا دیا کرتے تھے۔ مزید یہ کہ قرآن خود دعویٰ کرتا ہے کہ اس جیسی کتاب انسان اور جنات مل کر بھی نہیں بنا سکتے۔

آیت نمبر (۳) الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ۝۳

ترجمہ: ''جو غیب پر ایمان لاتے ہیں، نماز قائم کرتے ہیں اور جو کچھ ہم نے انہیں دیا ہے، اس میں سے اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں''۔

تفسیر سورۃ بقرہ کے تیئسویں رکوع میں قرآن کو تمام انسانوں کے لیے ہدایت کی کتاب بتایا گیا ہے اور خاص طور پر متقی لوگوں کے لیے یہ ہدایت کا ذریعہ ہے۔ دونوں باتیں اپنی اپنی جگہ درست ہیں: قرآن کا پیغام ہر انسان کے لیے عام ہے، اسے بار بار سمجھایا گیا اور دلیلیں پیش کی گئی ہیں۔ تھوڑی سی عقل رکھنے والا بھی ان دلائل کے ذریعے ہدایت حاصل کر سکتا ہے۔

لیکن قرآن سے وہی لوگ حقیقی فائدہ اٹھا سکتے ہیں جو اپنی عقل و فہم استعمال کر کے حق کو قبول کرتے ہیں، اور یہ طے کر لیتے ہیں کہ انہیں سیدھی راہ اختیار کرنی ہے، بری چیزوں سے بچنا ہے، یعنی شرک و کفر سے دور رہنا، چھوٹے اور بڑے گناہوں سے بچنا اور اپنے پیدا کرنے والے مالک کے حکم کے مطابق زندگی گزارنا۔

اس سے واضح ہوتا ہے کہ قرآن کی تعلیمات تین سطحوں پر اثر ڈالتی ہیں: ۱۔ کافروں کے لیے: توحید کا راستہ

دکھانا۔ ۲۔ فاسق اور گنہگار لوگوں کے لیے: چھوٹے بڑے گناہوں سے بچنے کی ہدایت دینا۔ ۳۔ نیک اور متقی لوگوں کے لیے: انہیں ولی، صدیقین اور اعلیٰ درجات تک پہنچانا۔

پرہیزگاروں کے اوصاف

ایمان کی تعریف

لفظی طور پر ''ایمان'' کا مطلب ہے کسی بات کو کسی کے بھروسے پر یقین کے طور پر تسلیم کر لینا۔ اصطلاحی طور پر ایمان کا مفہوم یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی باتوں کو دل و جان سے قبول کر لینا، یعنی حضرت محمد ﷺ کے بھروسے پر ان کی تمام تعلیمات اور احکام کو تسلیم کر لینا ایمان کہلاتا ہے۔

غیب کا مطلب

لفظی معنیٰ میں ''غیب'' ایسی چیزیں ہیں جو نہ ظاہری طور پر معلوم ہوں اور نہ باطنی طور پر۔ یعنی وہ چیزیں جو آنکھ سے نظر نہ آئیں، کان سے نہ سنی جائیں، ناک سے نہ سونگی جائیں، زبان سے نہ چکھی جائیں اور ہاتھ سے چھو کر نہ معلوم ہو سکیں۔ غیب سے مراد وہ تمام حقائق ہیں جن کی خبر حضرت محمد ﷺ نے دی ہے اور جن کا علم ظاہری یا باطنی طور پر ممکن نہیں جیسے: اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات، تقدیر، جنت و دوزخ کے حالات، قیامت اور اس میں پیش آنے والے امور، فرشتے، تمام آسمانی کتابیں، پچھلے انبیاء کا ذکر۔ یہ بات واضح کرتی ہے کہ صرف علم حاصل کرنا ایمان نہیں ہے، کیونکہ ابلیس، شیطان اور بہت سے کافر بھی یہ جانتے تھے کہ حضرت محمد ﷺ سچے ہیں، لیکن انہوں نے ایمان نہیں لایا، اس لیے وہ مؤمن نہیں بن سکے۔

ایمان اور اسلام میں فرق

حقیقی معنوں میں ''ایمان'' دل سے کسی حقیقت کی تصدیق کرنا ہے، جبکہ ''اسلام'' اطاعت اور فرمانبرداری کو کہتے ہیں۔ ایمان بغیر اسلام معتبر نہیں، یعنی صرف دل سے تصدیق کر لینا کافی نہیں، بلکہ زبان سے اقرار اور عمل کے ذریعے فرمانبرداری بھی ضروری ہے۔ اسی طرح اسلام بغیر ایمان بھی معتبر نہیں، یعنی زبان سے اطاعت کا اظہار صرف اس وقت قابلِ قبول ہے جب دل میں ایمان ہو۔

نماز قائم کرنا

اقامتِ نماز کا مطلب صرف نماز پڑھنا نہیں، بلکہ نماز کے تمام فرائض، واجبات اور سنتوں کو خشوع و خضوع

کے ساتھ صحیح طور پر ادا کرنا ہے۔ حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں: نماز قائم کرنے کا مطلب ہے کہ رکوع وسجدہ مکمل ہو، تلاوت صحیح ہو، خشوع موجود ہو اور نماز کے دوران دل کا دھیان بھی ہو۔ حضرت قتادہؓ فرماتے ہیں: وقت کی پابندی، وضو صحیح طریقے سے کرنا، رکوع وسجدہ درست ادا کرنا اقامتِ نماز کے مقاصد میں شامل ہیں۔ نماز قائم کرنے کا مقصد یہ ہے کہ نماز کو مکمل طور پر فرائض، واجبات، سنت اور مستحبات کے ساتھ انجام دیا جائے۔ منافقین بھی نماز پڑھ سکتے ہیں، لیکن ان کی نماز قبول نہیں ہوتی۔

اللہ کی راہ میں خرچ کرنا

● اس آیت کے مطابق ''اللہ کی راہ میں خرچ'' ہر قسم کے صدقات وخیرات شامل ہیں، چاہے وہ فرض زکوٰۃ ہو یا نفلی صدقات وخیرات۔

● قرآن میں لفظ ''انفاق'' نفلی صدقات کے لیے استعمال ہوا ہے، جبکہ ''زکوٰۃ'' فرض زکوٰۃ کے لیے۔

● حضرت ابن عباسؓ، ابن مسعودؓ اور دیگر صحابہ کے نزدیک اس سے مراد ''بچوں کو کھلانا پلانا'' بھی ہے، کیونکہ یہ زکوٰۃ کے نفاذ سے پہلے کی آیت ہے۔

● حضرت ضحاکؒ فرماتے ہیں: زکوٰۃ کی سات آیتیں سورۃ توبہ میں نازل ہونے سے پہلے، لوگ اپنی استطاعت کے مطابق جو ہو سکے دیتے رہیں۔

آیت نمبر (۴-۵) وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ ۚ وَبِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ ۝ اُولٰٓئِكَ عَلٰى هُدًى مِّنْ رَّبِّهِمْ ۗ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝

ترجمہ: ''اور وہ لوگ جو ایمان رکھتے ہیں اس چیز پر جو آپ پر نازل کی گئی، اور ان چیزوں پر بھی جو آپ سے پہلے نازل کی گئیں، اور وہ آخرت پر یقین رکھتے ہیں۔ یہی لوگ اپنے رب کی طرف سے ہدایت پر ہیں، اور یہی ہیں کامیاب ہونے والے''۔

تفسیر

مومنوں کی دو قسمیں

اس آیت میں پرہیزگاروں کی صفات بیان کی گئی ہیں۔ حضرت عبداللہ بن مسعود اور حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ حضرت محمد ﷺ کے زمانے میں مؤمن دو طرح کے تھے: ۱۔ پہلے مشرکوں میں سے وہ لوگ جو اسلام قبول کر چکے تھے۔ ۲۔ وہ لوگ جو پہلے اہلِ کتاب یعنی یہودی یا عیسائی تھے اور بعد میں مسلمان ہوئے۔

پچھلی آیت میں پہلی قسم کا ذکر تھا اور اس آیت میں دوسری قسم کی بات کی گئی ہے۔ اسی وجہ سے یہاں قرآن

پر ایمان لانے کے ساتھ پچھلی آسمانی کتابوں پر ایمان لانے کی بھی تاکید کی گئی ہے، تاکہ یہ دوگنا ثواب حاصل ہو: ایک طرف پچھلی کتابوں کے زمانے میں ایمان اور عمل کرنے کا ثواب، دوسری طرف قرآن کے زمانے میں ایمان اور عمل کرنے کا ثواب۔ یعنی پچھلی آسمانی کتابوں پر ایمان لانا آج بھی ہر مسلمان پر فرض ہے، لیکن عمل صرف قرآن کی تعلیمات کے مطابق ہوگا۔

آخری وحی

یہ آیت یہ بھی واضح کرتی ہے کہ حضرت محمد ﷺ کی وحی ''آخری وحی'' ہے کیونکہ اگر قرآن کے بعد کوئی اور کتاب نازل ہونے والی ہوتی تو یہاں اسی طرح مستقبل میں نازل ہونے والی کتاب اور وحی پر ایمان لانے کا ذکر ضرور آتا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن ہی وہ کتاب ہے جو قیامت تک باقی رہے گی اور اس پر عمل کیے بغیر نجات ممکن نہیں۔

دنیا میں کوئی بھی آسمانی کتاب قرآن کے سوا اپنے اصلی اور محفوظ شکل میں موجود نہیں ہے۔ بہت سی قومیں اپنی کتابوں کو خدائی کتاب بتاتی ہیں، لیکن وہ اس بات کی دلیل دینے میں ناکام رہتی ہیں کہ یہ کتاب کب اور کس پر نازل ہوئی اور جتنی نازل ہوئی تھی، وہ بغیر کسی تبدیلی کے پوری طرح موجود ہے یا نہیں۔

قرآن مجید ایک نبی اُمی ﷺ پر نازل ہوا، جو نہ کبھی کوئی کتاب پڑھی اور نہ لکھی، مگر انہوں نے پچھلی آسمانی کتابوں کی تعلیمات، پچھلے نبیوں کے قصے، مذاہب وفرقوں کے عقائد اور کردار کی تفصیل بیان کر دی۔ آج بھی قرآن میں ایک حرف کی بھی تبدیلی نہیں آئی۔ چاہے وہ قرآن جو اس وقت نازل ہوا یا آج کا قرآن، دونوں میں کوئی فرق نہیں، کیونکہ ہر زمانے میں اس کے یاد کرنے والوں کی تعداد ہزاروں بلکہ لاکھوں میں رہی ہے۔ لہٰذا جس کو اپنے پیدا کرنے والے مالک کے مطابق زندگی گزارنی ہو، اسے چاہیے کہ قرآن کے مطابق عمل کرے۔

اسلام کے بنیادی عقائد

حدیث مبارکہ میں ہے کہ: ''اسلام کی بنیاد پانچ چیزوں پر ہے'' جیسے: (۱) یہ اقرار کرنا کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور حضرت محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں۔ (۲) نماز قائم کرنا۔ (۳) زکوٰۃ ادا کرنا۔ (۴) حج ادا کرنا۔ (۵) رمضان کے روزے رکھنا۔ **(صحیح بخاری، الایمان، باب ۲؛ حدیث ۸)**

آخرت پر ایمان

ایمان والوں کی ایک اہم صفت یہ بھی ہے کہ وہ آخرت پر ایمان رکھتے ہیں۔ ایمان کے تین بنیادی حصے ہیں:
(۱) توحید (۲) رسالت (۳) آخرت

یہی عقیدہ دنیا کی صورت حال بدل دیتا ہے، جیسا کہ پہلے بھی تمام نبیوں نے بتایا تھا۔اس عقیدے کی وجہ سے انسان برائی سے بچتا ہے، کیونکہ وہ جانتا ہے کہ: دیکھنے والا موجود ہے، لکھنے والا ہر عمل کو نوٹ کر رہا ہے اور کل قیامت کے دن حساب کتاب ہوگا۔اس طرح انسان برائی سے بچتا ہے اور اپنے اعمال پر غور کرتا ہے۔مرنے کے بعد کی زندگی کے سلسلے میں تمام مذاہب اور اقوام کے مختلف عقائد ونظریات ہیں جن کا تذکرہ مختصراً درج ذیل ہے

مرنے کے بعد زندگی

مرنے کے بعد کی زندگی کا تصور انسانی تاریخ کا ایک ایسا موضوع ہے جس پر ہر مذہب اور ہر قوم نے اپنے اپنے انداز میں روشنی ڈالی ہے۔کسی نے اسے نجات اور ابدی سکون کا ذریعہ قرار دیا تو کسی نے حساب وکتاب اور جزا و سزا کی دنیا سے تعبیر کیا۔کہیں اسے روح کی ازلی مسافت کہا گیا، تو کہیں دوبارہ جنم کی صورت میں بیان کیا گیا۔مختلف تہذیبوں اور ادیان نے اس موضوع کو اپنے عقائد وفلسفے کے آئینے میں دیکھا اور اپنے متبعین کو اس حوالے سے مخصوص تعلیمات دیں۔اس طرح بعد الموت کی زندگی انسان کے عقیدے، امید اور خوف کا مرکز بن کر ہمیشہ اس کے فکری اور روحانی سفر کا حصہ رہی ہے اس سلسلے میں چند مخصوص مذاہب کے تصوراتِ آخرت درج ذیل ہیں:

یہودیت میں آخرت کا تصور

یہودی مذہب میں آخرت کا عقیدہ موجود ہے لیکن یہ اسلام کی طرح ایک ہی واضح اور یکساں شکل میں نہیں ملتا۔مختلف ادوار اور یہودی فرقوں (فریسی، صدوقی، کبالہ وغیرہ) کے تصورات کچھ مختلف ہیں۔بنیادی طور پر یہودیت میں ایمان اس بات پر ہے کہ موت کے بعد حساب ہوگا، نیک لوگوں کو جزا اور بدکاروں کو سزا ملے گی، اور قیامت کے دن مردوں کو زندہ کیا جائے گا جیسے:

۱۔شیول (Sheol) ابتدائی تصور اس کا عبرانی بائبل (تورات اور دیگر کتب) میں ''شیول'' کے نام سے ذکر ہے۔یہ ایک زیر زمین جگہ ہے جہاں تمام مردے (نیک اور بد دونوں) جاتے ہیں۔وہاں زندگی کا کوئی شعور نہیں ہوتا، بس ایک خاموش سایہ جیسا وجود ہے جیسا کہ کتاب ایوب 9:7 میں ذکر ہے کہ ''جیسے بادل غائب ہو کر جاتا ہے، ویسے ہی جو شیول میں اترتا ہے وہ واپس نہیں آتا''۔

۲۔گہنّا (Gehinnom / Gehenna) دوزخ کا تصور یعنی بعد کے یہودی ادب (تلمود، ربانی تفاسیر) میں ''گہنّا'' کا تصور ملتا ہے۔یہ برے لوگوں کے لئے عذاب کی جگہ ہے۔زیادہ تر علماء کہتے ہیں کہ یہ دائمی نہیں بلکہ 12 ماہ تک عذاب کے بعد روحیں پاک ہو کر باہر آجاتی ہیں (سوائے سخت بدکاروں کے)۔جیسا کہ تلمود روش ہشانہ 17a میں

ذکر ہے کہ ''گناہگار اسرائیل کے لوگ گہنّا میں 12 مہینے رہیں گے، پھر ان کی روحیں پاک کردی جائیں گی''۔

۳۔ گن عیدَن (Gan Eden) جنت کا تصور یعنی نیک روحوں کے لئے ''گن عیدَن'' (یعنی باغِ عدن) ہے۔ یہاں روحیں خدا کے قریب سکون، خوشی اور روحانی لذت پاتی ہیں۔ جیسا کہ عہد قدیم یسعیاہ 3:51 میں ذکر ہے کہ ''خداوند صیون کو تسلی دے گا... وہ اس کے بیابان کو عدن کی مانند کرے گا، اور اس کے ریگستان کو خداوند کے باغ کی مانند''۔

۴۔ قیامت (Resurrection of the Dead) یعنی یہودی عقیدہ ہے کہ قیامت کے دن مردے زندہ کئے جائیں گے۔ نیک لوگوں کو ابدی زندگی ملے گی اور بدکاروں کو سزا۔ جیسا کہ دانی ایل 2:12 میں ذکر ہے کہ ''اور زمین کی خاک میں سونے والے بہت سے جاگ اٹھیں گے، بعض ہمیشہ کی زندگی کے لئے اور بعض شرمندگی اور ہمیشہ کی نفرت کے لئے''۔

۵۔ عالمِ ارواح (The World to Come Olam Ha-Ba) یعنی یہودی عقیدہ میں ''عالمِ ارواح'' یا ''اُولم ہابا'' (Olam Ha-Ba) بھی ہے۔ یہ نیک لوگوں کے لئے آخرت کی وہ ابدی دنیا ہے جس میں خدا کے قریب رہ کر روحانی لذتیں ملیں گی۔ اس کا ذکر مِشنہ (Pirkei Avot 4:16) میں اس طرح ہے کہ ''یہ دنیا بس ایک راہ داری ہے، اصل گھر آنے والی دنیا (Olam Ha-Ba) ہے''۔

خلاصہ

ابتدائی دور میں شیول کا تصور تھا جہاں سب مردے جاتے ہیں۔ بعد میں نیک و بد کی تمیز کے ساتھ گن عیدَن (مثل جنت) گہنّا (مثل دوزخ) کا تصور آیا۔ یہودی مذہب میں دوزخ کا تصور زیادہ تر عارضی ہے (زیادہ سے زیادہ ۱۲ ماہ) اور قیامت کے دن سب زندہ کئے جائیں گے پھر نیک ہمیشہ کی زندگی میں رہیں گے اور بدکار ذلت و عذاب میں رہیں گے۔ نیک روحوں کے لئے آخری مقام اُولم ہابا (عالمِ ارواح The World to Come) جیسی جگہ ہے۔

عیسائی مذہب میں آخرت کا تصور

عیسائیوں کے عقیدے کے مطابق موت کے بعد انسان کی روح فنا نہیں ہوتی بلکہ وہ قیامت کے دن دوبارہ زندہ کی جائے گی، اور پھر خدا (God) کے حضور حساب ہوگا۔ اس حساب کے نتیجے میں نیکوکاروں کو جنت (Heaven) اور گناہگاروں کو جہنم (Hell) میں بھیجا جائے گا۔

۱۔ قیامت (The Last Day / Resurrection): مسیحی عقیدہ ہے کہ دنیا کے آخر میں قیامت برپا ہوگی۔ مردے دوبارہ زندہ کیے جائیں گے اور خدا کے حضور پیش ہوں گے۔ جیسا کہ انجیل یوحنا 28:5-29 میں ذکر ہے کہ ''قبر میں رہنے والے سب اُس کی آواز سنیں گے اور نکل آئیں گے۔ جنہوں نے بھلائی کی ہے وہ زندگی کی قیامت

کے لئے نکلیں گے اور جنہوں نے بدی کی ہے وہ عدالت کی قیامت کے لئے''۔

۲۔حساب اور جزا و سزا (Judgment) یعنی قیامت کے دن انسان کے اعمال کا حساب ہوگا۔نیک اعمال کرنے والے جنت میں جائیں گے اور بدکار اور گناہگار جہنم میں جائیں گے جس کا ذکر رومیوں کا خط 14:10-12 میں موجود ہے''ہم سب خدا کی عدالت کے آگے حاضر ہوں گے... ہر ایک اپنی جان کا حساب خدا کو دے گا''۔

۳۔جنت (Heaven) یعنی جنت ابدی سکون، خوشی اور خدا کے ساتھ رہنے کی جگہ ہے۔ یہاں دکھ، موت، بھوک یا پیاس نہیں ہوگی جیسا کہ مکاشفہ 4:21 میں ذکر ہے کہ''وہ اُن کی آنکھوں سے سب آنسو پونچھ دے گا۔نہ موت ہوگی، نہ ماتم، نہ رونا، نہ درد؛ کیونکہ پہلی چیزیں جاتی رہیں''۔

۴۔جہنم (Hell) یعنی جہنم کو ابدی آگ، عذاب اور خدا سے دوری کی جگہ بتایا گیا ہے۔ بدکار اور گناہگار ہمیشہ کے لئے جہنم میں رہیں گے جیسا کہ متی 46:25 میں ذکر ہے کہ''اور یہ لوگ ابدی سزا میں جائیں گے، مگر راستباز ابدی زندگی میں''۔اسی طرح دوسری جگہ متی 50:13 میں ذکر ہے کہ''اور وہ اُن کو آگ کی بھٹی میں ڈالیں گے، جہاں رونا اور دانت پیسنا ہوگا''۔

۵۔ابدی زندگی (Eternal Life) یعنی ایمان لانے والے (خصوصاً یسوع مسیح پر ایمان لانے والے) کو ابدی زندگی ملے گی۔ یہ عیسائی مذہب کا سب سے بنیادی عقیدہ ہے جیسا کہ انجیل یوحنا 16:3 میں ذکر ہے''کیونکہ خدا نے دنیا سے ایسی محبت رکھی کہ اپنا اکلوتا بیٹا بخش دیا، تاکہ جو کوئی اُس پر ایمان لائے وہ ہلاک نہ ہو بلکہ ہمیشہ کی زندگی پائے''

۶۔پُرگٹری (Purgatory) کیتھولک عقیدہ یعنی کیتھولک عیسائیوں کے نزدیک کچھ روحیں مرنے کے بعد براہِ راست جنت یا جہنم میں نہیں جاتیں بلکہ ایک درمیانی مقام''پُرگٹری'' (Purgatory) میں پاک صاف کی جاتی ہیں۔ یہاں گناہوں کی تطہیر کے بعد روح جنت میں داخل ہوتی ہے۔

لیکن پروٹسٹنٹ عیسائی عام طور پر اس عقیدے کو نہیں مانتے۔جیسا کہ کرنتھیوں 15:3 میں ذکر ہے کہ''اگر کسی کا کام جل جائے تو وہ نقصان اٹھائے گا، مگر وہ آپ نجات پائے گا، لیکن آگ کے ذریعے سے''۔(اس آیت کو کیتھولک علماء پُرگٹری کے ثبوت کے طور پر پیش کرتے ہیں)۔

خلاصہ

عیسائیت میں موت کے بعد انسان فنا نہیں ہوتا بلکہ قیامت کے دن دوبارہ زندہ ہوگا۔قیامت کے دن خدا کے حضور حساب ہوگا۔نیک اور ایمان والے جنت (ابدیت اور خدا کے ساتھ سکون) میں ہوں گے اور بدکار اور کافر جہنم (ابدیت اور آگ کا عذاب) میں ہوں گے مگر کیتھولک عقیدے کے مطابق کچھ روحیں پہلے پُرگٹری میں پاک کی جائیں گی۔

ہندو مذہب میں آخرت کا تصور

ہندو دھرم میں آخرت کا تصور ''مسلسل جنم و مرگ'' یعنی تناسخ (पुनर्जन्म) اعمال یا کرم (कर्म) کے اصول پر مبنی ہے۔ یعنی انسان کے اعمال کے مطابق اس کی اگلی زندگی طے ہوتی ہے۔ نیک اعمال کی جزا اچھا جنم (اچھے خاندان، صحت، خوشحالی) یا سورگ میں مقام کی صورت میں ملتا ہے اور برے اعمال کی سزا برے جنم (پست طبقہ، بیماریاں، دکھ) یا نرک میں عارضی عذاب کی شکل میں ملتا ہے جیسے:

۱۔ تناسخ (पुनर्जन्म) یعنی موت کے بعد روح (آتما) فنا نہیں ہوتی بلکہ نئے جسم میں داخل ہوتی ہے۔ یہ سلسلہ تب تک چلتا رہتا ہے جب تک کہ روح ''موکچھ'' (نجات) حاصل نہ کر لے جیسا کہ بھگوت گیتا (باب 2، شلوک 22) میں ذکر ہوا ہے: ''جس طرح انسان پرانے کپڑے بدل کر نئے پہن لیتا ہے، اسی طرح روح بھی پرانا جسم چھوڑ کر نیا جسم اختیار کر لیتی ہے''۔

۲۔ کرم کا اصول یعنی ہر عمل (نیکی یا بدی) کا اثر انسان کی موجودہ اور آئندہ زندگی پر پڑتا ہے، اچھے کرم کا بدلہ اگلی زندگی میں انعام کی صورت میں سورگ (स्वर्ग مثل جنت) ملتا ہے اور برے کرم کا بدلہ اگلی زندگی میں دکھ یا نرک (नर्क مثل جہنم) ملتا ہے جیسا کہ بریہدارنیک اپنشد 5.4.4 میں ذکر ہوا ہے: ''آدمی جیسا کرم کرتا ہے ویسا ہی پھل پاتا ہے۔ نیک کرم کرنے والا نیک جنم پاتا ہے اور برا کرم کرنے والا برا جنم لیتا ہے''۔

۳۔ سورگ (स्वर्ग مثل جنت) اور نرک (नर्क مثل جہنم) کا تصور: سورگ میں نیک لوگوں کی روحیں جاتی ہیں۔ جہاں دیوتاؤں کے ساتھ خوشی، سکون اور لذتیں ملتی ہیں۔ مگر یہ ابدی نہیں ہے، کرم کے اثر کے بعد دوبارہ جنم لینا پڑتا ہے۔ اسی طرح نرک (دوزخ) گناہگار روحیں یم راج (موت کے دیوتا) کے پاس عذاب پاتی ہیں۔ جہاں مختلف قسم کی سزائیں ملتی ہیں لیکن یہ بھی عارضی ہوتی ہیں۔ جیسا کہ اس کا ذکر گروڑ پران ادھیائے 5 میں ہے کہ: ''گناہگار روحیں یم راج کے پاس لے جائی جاتی ہیں جہاں وہ اپنے کرموں کے مطابق نرک میں عذاب پاتی ہیں''۔

۴۔ موکش (मोक्ष / मुक्ति) یعنی آخرت میں سب سے بڑا انعام موکچھ ہے جس میں تناسخ کے چکر سے ہمیشہ کے لیے نجات مل جاتی ہے اور موکچھ ملنے کے بعد روح برہما (کائنات کی روح) میں ضم ہو جاتی ہے اور ہمیشہ کی آزادی حاصل ہو جاتی ہے جیسا کہ چھاندوگیہ اپنشد (1.15.6) میں ذکر ہے کہ ''جو برہما کو جان لیتا ہے، وہ جنم مرن کے چکر سے آزاد ہو جاتا ہے''۔

خلاصہ

ہندو مذہب میں آخرت کا تصور دائمی سورگ یا دائمی نرک نہیں ہے بلکہ موت کے بعد روح کے لئے تنا

سخ (پیدائش وموت کا چکر) ہے، اعمال (کرم) کی بنیاد پر نیک عمل کرنے والے کو جزا اور بدکار کو سزا ملتی ہے۔ سورگ اور نرک عارضی ہیں، ہمیشہ کے نہیں، سب سے اعلیٰ درجہ موکچھ (نجات) ہے جو روح کو ابدی سکون برہما سے ملاپ کے بعد عطا ہوتا ہے۔

بدھ مت میں آخرت کا تصور

بدھ مذہب میں آخرت کا نظریہ تناسخ (पुनर्जन्म) اور کرم (कर्म) پر مبنی ہے۔ موت کے بعد روح (یا وجود) کی کوئی ابدی ''آتما'' نہیں رہتی مگر انسان کے اعمال (کرم) کی طاقت ایک نئی پیدائش تناسخ (पुनर्जन्म) کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ یہی سلسلہ چلتا رہتا ہے جب تک کہ انسان نروان (निर्वाण) حاصل نہ کر لے جیسے:

۱۔ انتّا (अनत्ता No Soul Doctrine) کے مطابق بدھ مت میں کوئی ابدی روح نہیں ہے، بلکہ وجود پانچ عناصر (पंच स्कन्ध) سے مل کر بنتا ہے: (۱) جسم، (۲) احساس، (۳) ادراک، (۴) خیالات، (۵) شعور۔ موت کے بعد یہ اجزاء بکھر جاتے ہیں لیکن اعمال (کرم) کے اثر سے نئی پیدائش ہوتی ہے۔ دھمّپد (धम्मपद 279) کے مطابق ''تمام اشیاء بے خودی ہیں۔ جب کوئی اس کو حکمت سے دیکھ لیتا ہے، تو وہ دکھ سے آزاد ہو جاتا ہے''۔

۲۔ تناسخ (पुनर्जन्म) یعنی موت کے بعد انسان دوبارہ جنم لیتا ہے اور یہ جنم چھ عالم (छः लोकों) میں سے کسی میں ہوتا ہے: ۱۔ دیوتاؤں کا عالم (देवलोक)، جہاں خوشی اور سکون ہے۔ ۲۔ اسُروں کا عالم (असुर लोक)، جہاں حسد اور لڑائی ہے۔ ۳۔ انسانوں کا عالم (मनुष्य लोक)، جہاں دین ودھرم اور نجات (موکچھ) کا موقع ملتا ہے۔ ۴۔ جانوروں کا عالم (पशु लोक)، جہاں جہالت اور تکلیف زیادہ ہے۔ ۵۔ بھوت پریتوں کا عالم (प्रेत लोक)، جہاں لالچ، پیاس اور بھوک کی اذیت رہتی ہے۔ ۶۔ نرک عالم (नरक लोक)، جہاں گناہوں کی سزا اور عذاب ملتا ہے جیسا کہ مجّھم نکای (मज्झिम निकाय 135) میں ذکر کیا گیا کہ: ''کچھ لوگ اپنے کرموں کے سبب جہنم میں پیدا ہوتے ہیں، کچھ جانوروں میں، کچھ بھوتوں میں، اور کچھ انسان یا دیوتا کے عالم میں''۔

۳۔ کرم (कर्म) یعنی ہر اچھے یا برے عمل کا اثر اگلی پیدائش پر ہوتا ہے۔ اچھے کرم کرنے پر سورگ یا انسان کا بہتر جنم اور برے کرم کرنے پر جانور، بھوکے بھوت یا نرک ملتا ہے جیسا کہ انگتّر نکای (अंगुत्तर निकाय 6.39) میں ذکر ہوا ہے کہ: ''جو لوگ برے کرم کرتے ہیں وہ نچلی جگہوں (جانور یا بھوت) میں دوبارہ پیدا ہوتے ہیں۔ جو نیک کرم کرتے ہیں وہ اعلیٰ جگہوں (انسان یا دیوتا) میں دوبارہ پیدا ہوتے ہیں''۔

۴۔ نرک (नर्क): بدھ مت میں نرک مستقل نہیں ہے بلکہ ایک عارضی عذاب ہے۔ برے اعمال کے حساب سے مختلف قسم کی جہنم ہیں جیسے: آٹھ ''گرم نرک'' (جہاں آگ ہی آگ کے عذاب ہیں)، اسی طرح آٹھ ''سرد نرک''

(جہاں برف اور شدید ٹھنڈ کے عذاب ہیں)، اس طرح سزا پوری ہونے کے بعد دوبارہ جنم ہوتا ہے جیسا کہ پالی کینن دیگھ نکای(दीघ निकाय 1,पाली कैनन) میں ذکر ہے کہ: ''برے کرم کرنے والے موت کے بعد نرک میں پیدا ہوتے ہیں، جہاں وہ سخت عذاب سہتے ہیں''۔

۵۔نروان (निर्वाण) آخری نجات یعنی بدھ مت کے نزدیک آخرت میں سب سے بڑی کامیابی نروان ہے۔نروان = تناسخ اور دکھ سے مکمل آزادی۔نروان پانے والا دوبارہ پیدا نہیں ہوتا جیسا کہ سنیوکت نکای (56.11 संयुक्त निकाय/ धम्मचक्कप्पवत्तन सुत्त) میں ذکر ہوا ہے کہ: ''یہی دکھ کا خاتمہ ہے، تناسخ کے خاتمے اور نروان کا راستہ''۔

خلاصہ

بدھ مت میں کوئی ابدی روح (آتما) کا عقیدہ نہیں ہے۔موت کے بعد انسان کے اعمال نئے جنم کی بنیاد بنتے ہیں۔جس میں سے چھ عالم میں پیدائش ممکن ہے جیسے: (۱) عالم سورگ، (۲) عالم اسورا، (۳) عالم انسان، (۴) عالم جانور، (۵) عالم بھوکھا بھوت پریت۔(۶) عالم نرک، اس طرح بدھ مت میں سورگ دائمی نہیں ہے بلکہ وقتی ہیں۔سب سے اعلیٰ مقصد نروان ہے جس میں دکھ اور تناسخ سے ہمیشہ کی نجات ہے۔

جین مذہب میں آخرت کا تصور

جین دھرم میں بھی ہندومت کی طرح تناسخ (पुनर्जन्म) اور اعمال یا کرم (कर्म) کے اصول پر آخرت کا نظریہ قائم ہے لیکن اس میں خاص بات یہ ہے کہ: روح (आत्मा) ہمیشہ موجود رہتی ہے، یہ فنا نہیں ہوتی۔روح اپنے اعمال کے مطابق مختلف جنم لیتی ہے۔جس کا آخری مقام موکچھ (मोक्ष /نجات) ہے، یعنی جنم و مرگ کے چکر سے آزادی ہو جاتی ہے جس کی تفصیل درج ذیل ہے:

ا۔جین فلسفہ کہتا ہے کہ کائنات دو حقیقتوں پر قائم ہے:ا۔ जीव (روح) زندہ جوہر (روحانی وجود) ۲۔अजीव (غیر روحانی مادّہ) وقت، فضا، مادّہ، حرکت وغیرہ۔

موت کے بعد روح (जीव) فنا نہیں ہوتی بلکہ کرم کے اثر سے نیا جسم اختیار کر لیتی ہے۔جیسا کہ تتوارتھ سوتر (तत्त्वार्थ सूत्र 2:10) میں ذکر ہے کہ ''جیو (روح) ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گی۔یہ کرم کے سبب تناسخ میں بندھی رہتی ہے اور جب کرم ختم ہو جاتے ہیں تو موکچھ پا جاتا ہے''۔

۲۔تناسخ (पुनर्जन्म) یعنی جین مت کے مطابق موت کے بعد روح فوراً نیا جنم اختیار کرتی ہے۔یہ جنم چار عالموں میں سے کسی میں ہو سکتا ہے:ا۔عالم دیوتا (देवलोक) ۲۔عالم انسانی (मनुष्य लोक) ۳۔عالم جانور (तिर्यंच लोक) اس میں جانور، پرندے، کیڑے مکوڑے اور درخت وغیرہ ہوتے ہیں ۴۔عالم نرک (नरक

लोक)۔جیسا کہ تتوارتھ سوتر (तत्त्वार्थ सूत्र 1:3) میں ذکر ہے کہ ''روح کرم کے مطابق چار عالموں (دیوتا، انسان، جانور، نرک) میں جنم لیتی ہے''۔

۳۔اعمال یا کرم کا اصول یعنی جین دھرم میں کرم کوئی محض فلسفیانہ اصول نہیں بلکہ ایک مادّی ذرات (Matter Particles) کی طرح مانا جاتا ہے جو روح سے چمٹ جاتے ہیں۔نیک اعمال اچھے والے جنم، خوشحالی اور برے اعمال والے برا جنم، دکھ اور نرک، اس سلسلے میں اُتراد ھین سوتر (उत्तराध्ययन सूत्र 3) میں ذکر ہے کہ ''جس نے نیک کرم کیا وہ خوشی پاتا ہے، جس نے برا کرم کیا وہ دکھ پاتا ہے''۔

۴۔سورگ اور نرک (مثل جنت اور جہنم) کا تصور جس میں نیک روحیں دیوتاؤں کے عالم میں خوشی اور شان و شوکت سے رہتی ہیں، لیکن یہ دائمی نہیں۔اعمال کا اثر ختم ہونے پر دوبارہ تناسخ میں آتی ہیں اور نرک (مثل دوزخ) ہے جس میں گناہگار روحیں نرک کے عالم میں دکھ سہتی ہیں۔وہاں مختلف قسم کے عذاب ہیں (شدید گرمی، سردی، اندھیرا وغیرہ)۔لیکن یہ بھی وقتی ہیں۔جیسا کہ تتوارتھ سوتر (तत्त्वार्थ सूत्र 6:3) میں ذکر ہوا ہے کہ ''جو برے کرم کرتا ہے وہ نرک کے عالم میں جنم لیتا ہے اور وہاں سخت دکھ سہتا ہے''۔

۵۔موکچھ (मोक्ष/نجات) جین دھرم میں آخرت کا سب سے بڑا انعام موکچھ ہے۔یعنی موکچھ = جب روح تمام کرموں سے پاک ہوجائے۔اس کے بعد روح سِدھ شِلا सिद्धशिला (کائنات کے اوپر ایک مقام) میں جا کر ہمیشہ کے لئے آزاد اور پُرسکون رہتی ہے جیسا کہ تتوارتھ سوتر (तत्त्वार्थ सूत्र 2:10) میں ذکر ہوا ہے کہ ''جب روح تمام کرموں کو ختم کر دیتی ہے، تو وہ سِدھ شِلا میں جا کر موکش پاتی ہے''۔

خلاصہ

جین مذہب میں روح (جیو) ہمیشہ زندہ رہتی ہے، یہ فنا نہیں ہوتی۔اس کا موت کے بعد فوراً نیا جنم ہوتا ہے (چار عالموں میں سے کسی میں) کرم کے اثرات سے نیک و بد اعمال سبب بنتے ہیں۔ان کے یہاں سورگ اور نرک دونوں عارضی ہیں، دائمی نہیں۔سب سے بڑا انعام موکچھ ہے کرم سے آزادی اور ابدی سکون ہوجاتا ہے۔

سکھ مذہب میں آخرت کا تصور

سکھ مذہب (सिख धर्म) میں آخرت کا نظریہ ہندو دھرم سے کچھ مشابہت رکھتا ہے جیسے: سکھ مذہب کے مطابق انسان کے اعمال (कर्म) اور خدا کی عنایت (गुरु प्रसाद) پر موت کے بعد کا حال منحصر ہوتا ہے۔ان کے عقیدے کے مطابق موت کے بعد روح دوبارہ جنم لیتی ہے (पुनर्जन्म) جب تک کہ وہ خدا (واہگرو) کے ساتھ مل نہ جائے۔آخری

مقصد موکچھ/مکتی ہے، یعنی جنم مرن کے چکر سے نجات اور خدا میں ابدی سکون ملتا ہے جس کی تفصیل درج ذیل ہے:

۱۔جنم مرن کا چکر (Death Cycle of Birth) یعنی انسان اپنے اعمال اور خواہشات کی وجہ سے بار بار جنم لیتا ہے۔یعنی نیک اعمال والے بہتر جنم اور برے اعمال والے برا جنم لیتے ہیں۔جیسا کہ گرو گرنتھ صاحب (GG 176 गुरु ग्रंथ साहिब) میں ذکر ہے کہ ''کرم کے حساب سے ہی جنم ملتا ہے، مگر خدا کی رحمت سے مکتی حاصل ہوتی ہے''۔

۲۔اعمال یا کرم (कर्म) اور فضلِ الٰہی (Grace of God) یعنی سکھ مذہب میں کرم اہم ہے لیکن صرف کرم سے نجات نہیں ملتی بلکہ نجات کے لئے خدا کی عنایت اور گرو کی رہنمائی ضروری ہے جیسا کہ گرو گرنتھ صاحب (GG 2) میں ذکر ہے کہ ''کرم کے بندھن سے مکتی نہیں ملتی، مکتی صرف اُس کے فضل سے ملتی ہے''۔

۳۔سورگ (स्वर्ग مثل جنت) اور نرک (नर्क مثل جہنم) یعنی سکھ مت میں سورگ اور نرک کو زیادہ تر روحانی حالت کے طور پر بیان کیا گیا ہے، نہ کہ کسی مخصوص مقام کے طور پر یعنی نیک لوگ دنیا ہی میں خدا کے قرب اور سکون کی حالت کو ''سورگ'' کہتے ہیں۔گناہگار لوگ دنیا ہی میں خواہشات اور دکھ میں مبتلا رہتے ہیں، یہی اُن کے لئے ''نرک'' ہے۔جیسا کہ گرو گرنتھ صاحب (GG 24) میں ذکر ہوا ہے کہ ''جن کے دل میں خدا بستا ہے، وہی سورگ ہے۔جن کے دل میں لالچ ہے، وہی نرک ہے''۔

۴۔نرک اور سورگ (Temporary Realms) یعنی بعض مقامات پر گرو گرنتھ صاحب میں ''نرک'' اور ''سورگ'' کا ذکر آتا ہے، لیکن یہ دائمی نہیں۔یہ بھی تناسخ (पुनर्जन्म) کا حصہ ہیں اور اعمال کے مطابق روح ان میں آسکتی ہے۔جیسا کہ گرو گرنتھ صاحب (GG 300) میں ذکر ہے کہ ''جو خدا کو بھول جاتے ہیں وہ نرک میں جاتے ہیں، اور جو خدا کو یاد رکھتے ہیں وہ سورگ میں رہتے ہیں''۔

۵۔مکتی (Liberation/Mukti) یعنی سکھ مت میں آخرت کا سب سے اعلیٰ مقصد مکتی ہے۔مکتی = جنم مرن کے چکر سے آزادی اور روح کا خدا (واہگرو) میں مل جانا۔مکتی حاصل کرنے کے لئے سچائی، نیک اعمال، نسبت الٰہی (नाम सिमरन) اور گرو کی تعلیم ضروری ہے۔جیسا کہ گرو گرنتھ صاحب (GG 614) میں ذکر ہے ''جو اُس کے نام کا دھیان کرتے ہیں، وہ مکتی پاتے ہیں اور جنم مرن کے چکر سے آزاد ہو جاتے ہیں''۔

خلاصہ

سکھ مذہب میں موت کے بعد روح فنا نہیں ہوتی بلکہ کرم یا اعمال کے مطابق دوبارہ جنم لیتی ہے۔جنت اور دوزخ زیادہ تر روحانی حالت ہیں، جسمانی مقامات نہیں۔اچھے اعمال سکون اور خدا کا قرب ہیں اور برے اعمال دکھ اور خواہشات کا غلام ہونا ہے سب سے اعلیٰ انعام مکتی ہے یعنی واہگرو میں ضم ہو کر ہمیشہ کے لئے سکون پا جانا۔

خلاصۂ بحث

مرنے کے بعد کی زندگی کا تصور انسانی فکر کا ایسا ابدی سوال ہے جس کا جواب تقریباً ہر مذہب نے اپنے اپنے انداز میں دیا ہے۔ یہودیت میں شیول، گہنّا، گن عیدَن اور اُولم ہابا کے تصورات ملتے ہیں جہاں جزا و سزا اور قیامت کا عقیدہ نمایاں ہے، عیسائیت میں قیامت کے دن دوبارہ زندہ ہونا، اعمال کا حساب، جنت و جہنم اور بعض فرقوں میں پُرگٹری (Purgatory) کا نظریہ (یعنی جنت اور جہنم کے درمیان ایک عارضی جگہ، صفائی/تطہیر کا مرحلہ جہاں روح کو پاک کیا جاتا ہے) پایا جاتا ہے۔ ہندو دھرم اور بدھ مت میں کرم اور تناسخ کی اساس پر آخرت کا نظریہ قائم ہے، فرق صرف اتنا ہے کہ ہندو مت میں روح ابدی ہے اور نجات کو موکچھ کہا گیا ہے، جب کہ بدھ مت میں روح کا انکار کر کے نجات کو نروان کا نام دیا گیا ہے۔ جین مت میں روح کی ازلیت اور کرم کی گرفت کے ساتھ تناسخ کا سلسلہ جاری رہتا ہے اور اس کا خاتمہ موکچھ میں ہوتا ہے۔ سکھ مذہب میں کرم اور فضلِ الٰہی دونوں کو بنیاد مانا گیا ہے، جہاں سورگ و نرک کو زیادہ تر روحانی کیفیت سمجھا گیا ہے اور مکتی کو سب سے اعلیٰ مقصد قرار دیا گیا ہے۔ ان سب میں مشترک پہلو نیکی کی جزا اور بدی کی سزا کا اعتراف ہے، البتہ جنت و دوزخ کے دائمی یا عارضی ہونے میں اختلاف پایا جاتا ہے۔

اسلام کا تصورِ آخرت

جبکہ اسلام کا تصورِ آخرت سب سے زیادہ واضح، جامع اور دل نشین ہے جو انسان کو یہ سبق دیتا ہے کہ یہ دنیا محض ایک عارضی قیام گاہ ہے، اصل اور دائمی زندگی اُس آخرت کی ہے جہاں انجام کار سب کچھ بے نقاب ہوگا۔ قرآنِ مجید بار بار یاد دلاتا ہے کہ دنیا فانی اور دھوکے کی چمک ہے، جب کہ آخرت کی زندگی حقیقی اور پائدار ہے۔ وہاں نہ دولت کا رعب چلے گا نہ نسب کی برتری، بلکہ صرف ایمان اور اعمالِ صالحہ ہی کام آئیں گے۔ نیکوکار اور خدا پر ایمان رکھنے والے ہمیشہ کے لیے جنت کے گلزاروں میں رہیں گے، جہاں نہ غم ہوگا نہ دکھ، بلکہ سراسر امن، سکون اور رب کی قربت کی سرشاری ہوگی۔ برعکس اس کے، سرکش اور بدکار لوگ جہنم کی ہولناک وادیوں میں ڈالے جائیں گے، جہاں آگ کا عذاب، حسرت و ندامت اور خدا کی رحمت سے محرومی ان کا مقدر بنے گی۔ اسلام انسان کو مایوسی کے اندھیروں میں بھٹکنے نہیں دیتا بلکہ اُسے یہ یقین عطا کرتا ہے کہ آخرت کی کامیابی کے دروازے ایمان، عملِ صالح، تقویٰ اور اللہ کی رحمت کے ساتھ ہر اُس شخص پر کھلے ہیں جو دنیا کی وقتی لذتوں کو چھوڑ کر اپنی اصل منزل کی تیاری کرے۔ یہی وہ انقلابی اور امید افزا تصور ہے جو انسان کی زندگی کو مقصدیت بخشتا ہے اور اُسے فانی دنیا کی فریب کاریوں سے نکال کر ابدی نجات کی شاہراہ پر گامزن کرتا ہے۔

آیت نمبر (۶) إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا سَوَآءٌ عَلَيْهِمْ ءَأَنذَرْتَهُمْ أَمْ لَمْ تُنذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ ۝٦

ترجمہ: ''بے شک جن لوگوں نے کفر کیا، ان کے لئے برابر ہے، چاہے آپ انہیں خبردار کریں یا نہ کریں، وہ ایمان نہیں لائیں گے''۔

تفسیر ابن جریر نے ابن اسحاق، سعدی اور ابن عباس رضی اللہ عنہم کے واسطے سے بیان کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان'' إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا'' کے بارے میں یہ دو آیات مدینہ منورہ کے یہودیوں کے لیے نازل ہوئیں۔ نیز، ابن جریر نے ربیع بن انسؓ کے واسطے سے نقل کیا ہے کہ ''إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا ... وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ'' تک کی یہ آیات جنگ احزاب کے بارے میں نازل ہوئیں۔

ان آیات میں ان لوگوں کا ذکر ہے جن کے اوصاف پہلے بیان کیے گئے تھے، جیسے: غیب پر ایمان لانا، نماز قائم رکھنا، اللہ کے دیے ہوئے مال میں سے خرچ کرنا، رسول اللہ ﷺ پر نازل ہونے والی اور آپ سے پہلے نازل ہونے والی کتابوں پر ایمان لانا، آخرت پر ایمان رکھنا، برائیوں اور حرام کاموں سے بچنا۔

یہی لوگ ہدایت یافتہ ہیں، سیدھی راہ پر چلنے والے ہیں، دنیا و آخرت میں کامیابی حاصل کرنے والے ہیں، اور آخرت میں اللہ کی رضا حاصل کر کے جنت میں داخل ہونے والے ہیں۔ جہاں پہلے کی آیات میں اللہ تعالیٰ نے پرہیزگاروں کی حالت اور ان کے انجام کا ذکر کیا، وہیں اگلی آیات میں کافروں کا حال بیان کیا گیا ہے کہ چاہے آپ انہیں ڈرائیں یا نہ ڈرائیں، وہ ایمان نہیں لائیں گے۔

کافروں کی گمراہی

لفظ 'کافر' کے اصل معنیٰ ہیں ''چھپانے والا، ڈھانپنے والا یا انکار کرنے والا''، یعنی وہ شخص جو حق یا حقیقت کو تسلیم نہ کرے اور اسے رد کر دے۔ اسی وجہ سے جو کوئی اللہ تعالیٰ اور حضرت محمد ﷺ کو آخری نبی تسلیم نہ کرے، اور ان کے ذریعے بھیجے گئے دین کو قبول کرنے سے انکار کرے، چاہے وہ مسلم گھرانے میں ہی پیدا ہوا ہو، اسے 'کافر' کہا جائے گا۔

کفر کی اقسام

کفر کا لغوی مطلب ہے ''انکار کرنا''، اور یہ ایمان کا سراسر مخالف ہے۔ ایمان کا بنیادی خلاصہ یہ ہے کہ حضرت محمد ﷺ کو رسول تسلیم کرنا اور جو کچھ آپ ﷺ پر اللہ کی طرف سے نازل ہوا، اس کی دل سے تصدیق کرنا۔ اگر کوئی شخص رسول اللہ ﷺ کی تعلیمات میں سے کسی ایک بات کو بھی حق نہ سمجھے یا اس کی تصدیق نہ کرے، تو وہ کافر شمار ہوگا۔ علماء کرام نے قرآن کی آیات کی روشنی میں کفر کی پانچ اہم اقسام بیان کی ہیں:

۱۔کفر تکذیب: نبیوں اور رسولوں کو جھٹلانا۔
۲۔کفر استکبار: غرور اور تکبر کی وجہ سے اللہ اور اس کے رسول کے احکام کو نہ ماننا اور انکار کرنا۔
۳۔کفر اعراض: اللہ کے پیغمبروں کی تصدیق نہ کرنا، اور نہ جھٹلانا، بلکہ ان سے منہ موڑ کر رہنا۔
۴۔کفر تردد: حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سچے یا جھوٹے ہونے پر شک میں پڑنا، یقین نہ ہونا۔
۵۔کفر نفاق: زبان سے اقرار کرنا مگر دل سے انکار کرنا۔

کافروں کے بارے میں خاص وضاحت

یہ بات سمجھنا ضروری ہے کہ قرآن کی ان آیات میں ہر کافر کا ذکر نہیں کیا گیا، بلکہ خاص قسم کے کافروں کی بات ہو رہی ہے۔ ایسے کافر جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دعوت پر ایمان نہ لائیں اور قیامت تک نہ لائیں، اور جن کے دل ضد اور عناد کی وجہ سے سیاہ ہو چکے ہیں، نصیحت یا ڈرانے کا ان پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔ ان آیات کے مطابق، ایسے کافروں کے بارے میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ڈرانے یا نصیحت کرنے کا کوئی فرق نہیں پڑتا، کیونکہ ان کے ارادے پہلے ہی یہ طے کر چکے تھے کہ وہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بات نہیں مانیں گے۔

اشکال کا جواب

یہاں ایک سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ ایسے کافروں کو سمجھانے کی کیا ضرورت تھی، جب کہ پہلے ہی طے تھا کہ وہ ایمان نہیں لائیں گے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ ڈرانے یا نہ ڈرانے کا مقصد نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو تسلی دینا ہے، تاکہ آپ ان ہٹ دھرمیوں کے باوجود یہ نہ سوچیں کہ آپ کی تبلیغ اور پیغام پہنچانے کی کوشش بے نتیجہ ہے۔ آپ کی ذمہ داری صرف پیغام پہنچانا اور تبلیغ کرنا ہے اور اس کا اجر اللہ تعالیٰ کی طرف سے ملے گا۔ یہ ہمیں یہ بھی سکھاتا ہے کہ کسی کے کفر پر جمے رہنے کی وجہ سے دعوت و تبلیغ کو ترک نہیں کرنا چاہیے، بلکہ مستقل طور پر دعوت دیتے رہنا چاہیے۔

اللہ تعالیٰ اور انسان کی ذمہ داری

ایک اور سوال یہ پیدا ہو سکتا ہے کہ جب اللہ ہی نے ان کے ایمان نہ لانے کی بات فرما دی تو پھر ان پر ایمان نہ لانے کا الزام کیوں ہوگا؟

یہ بالکل ایسے ہے جیسے کوئی ڈاکٹر کسی خطرناک کینسر کی بیماری دیکھ کر مریض کے مرنے کی پیشین گوئی کرے۔ کیا اس ڈاکٹر پر الزام آئے گا کہ اس نے بیماری کا ذکر کر دیا، اس لیے مریض مرا؟ نہیں، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ مریض کی

حالت ایسی تھی کہ اس کا مرنا طے تھا۔ اسی طرح، ان لوگوں کے ایمان نہ لانے کی وجہ یہ نہیں کہ حق ان پر ظاہر نہیں ہوا، بلکہ وجہ یہ تھی کہ انہوں نے حق کو ٹھکرانے کا راستہ اپنایا۔ اس کے نتیجے میں وہ قدرت کے قانون کی گرفت میں آ گئے اور ان میں حق کو سننے، سمجھنے اور پہچاننے کی طاقت ختم ہوگئی۔

حق کے داخل ہونے کے راستے

انسان کے دل میں حق اسی صورت میں داخل ہوسکتا ہے جب وہ دل، کان اور آنکھ کھلے رکھے۔ علم حاصل کرنے کے تین بنیادی ذرائع ہیں: دل، کان اور آنکھ۔ اگر یہ تینوں ذرائع بند ہوجائیں تو ہدایت کی کیا امید ہوسکتی ہے؟ قرآن میں اس حالت کو یوں بیان کیا گیا ہے کہ ان کے دلوں اور کانوں پر مہر لگ چکی ہے اور ان کی آنکھوں پر پردہ ہے، یعنی حق کو قبول کرنے کے تمام راستے بند ہو چکے ہیں۔

آیت نمبر (۷) خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰى سَمْعِهِمْ ؕ وَعَلٰٓى اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ ۫ وَّلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ۧ

ترجمہ: ''اللہ نے ان کے دلوں اور کانوں پر مہر لگا دی ہے اور ان کی آنکھوں پر پردہ ہے اور ان کے لیے بہت بڑا عذاب ہے''۔

تفسیر یہاں ایک اور سوال یہ ہوسکتا ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ نے ان کے دل اور کان پر مہر لگائی اور آنکھوں پر پردہ ڈال دیا، تو انہیں سزا کیوں دی جائے گی؟

مفسرین کا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ظالم نہیں ہیں، اور کسی کو بغیر قصور کے سزا نہیں دیتے۔ یہاں جس کا ذکر ہے وہ سرکش اور ضدی کافر ہیں، اور ان کی حالت ان کے اپنے اعمال کا نتیجہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو دل و دماغ، آنکھیں اور کان دیے تاکہ وہ حق اور باطل میں فرق کر سکے۔ ان کے لئے اللہ کے پیغمبر آئے، حق کو واضح کیا، لیکن انہوں نے نہ آنکھوں سے، نہ کانوں سے، نہ عقل سے کام لیا۔ اس کے نتیجے میں ان کے رگ رگ میں انکار بیٹھ گیا اور ان پر گمراہی کا اندھیرا چھا گیا۔ اسی حالت کو قرآن میں مہر یا سیل کہا گیا ہے۔

دل میں کالا نکتہ

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''جب کوئی بندہ گناہ کر بیٹھتا ہے تو اس کے دل میں کالا نکتہ پڑ جاتا ہے۔ اگر وہ توبہ کر کے گناہ سے رک جائے تو اس کا دل پہلے کی طرح صاف ہو جاتا ہے، لیکن اگر وہ توبہ نہ کرے اور گناہ پر گناہ کرتا رہے تو کالا نکتہ بڑھ کر پورے دل پر چھا جاتا ہے۔'' **(ترمذی رقم: ۳۳۳۴)**

یہ حدیث اس بات کی وضاحت کرتی ہے کہ مہر لگنا یا اندھیرا چھا جانا انسان کی اپنی ضد اور مسلسل انکار کا نتیجہ ہے، نہ کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے انہیں کفر پر مجبور کیا گیا ہو۔

● رسول اللہ ﷺ نے فرمایا یہ وہ زنگ ہے جسے اللہ تعالیٰ نے سورہ مطففین آیت نمبر ۱۴ میں فرمایا:

كَلَّا بَلْ ۜ رَانَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ﴿۱۴﴾

ترجمہ: یعنی ''ان کے کرتوتوں کی وجہ سے ان کے دلوں پر زنگ چڑھ گیا۔'' (سورہ مطففین ۱۴)

اسی کو قرآن نے ''ختم'' (مہر) لگ جانا کہا ہے۔

آیت نمبر (۸) وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَبِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَمَا هُمْ بِمُؤْمِنِيْنَ ﴿۸﴾

ترجمہ: ''اور کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو کہتے ہیں کہ ہم اللہ پر اور یومِ آخرت پر ایمان لائے، حالانکہ وہ حقیقت میں ایمان والے نہیں ہیں''۔

تفسیر سورہ کے پہلے رکوع میں دو گروہوں کا ذکر ہوا: (۱) وہ جو دل و جان سے ایمان لائے اور ظاہر و باطن دونوں طرح سے مخلص تھے۔ (۲) وہ جو اسلام اور حق کی دعوت کو نہ دل سے قبول کرتے اور نہ زبان سے، بلکہ کھل کر اس کی مخالفت میں جمے رہے۔ تیسرا وہ گروہ جو صرف دکھاوا کے لیے ظاہری طور پر اسلام قبول کر لیتے، مگر اندر سے کافر ہی رہتے۔ اس گروہ کو ''منافقین'' کہا جاتا ہے۔

منافق وہ ہے جو زبان سے ایمان کا اقرار کرے، نماز پڑھے اور دیگر اسلامی اعمال بھی ادا کرے، مگر دل میں کافر ہو اور اسلام کے خلاف عقیدہ رکھے۔ یہ گروہ مدینہ میں رسول اللہ ﷺ کی آمد کے بعد پیدا ہوا۔

نفاق کی قسمیں

نفاق کئی طرح کا ہو سکتا ہے، جن میں تین اعتقادی اقسام سب سے اہم ہیں:

(۱) زبان سے ظاہر، دل سے انکار: منافق زبان سے اسلام اور ایمان کا دعویٰ کرے، مگر دل سے انکار کرے۔

(۲) یقین کی کمی یا شک: دل میں یقین نہ ہو اور نہ انکار ہو، بس شک کی حالت میں رہے۔

(۳) ادھورا یقین اور دنیا کی چاہت: دل میں کچھ تصدیق ہو، مگر دنیاوی لذتیں اور مفاد ایمان پر غالب ہوں۔

ایسے لوگ دنیا کے فائدے کے لیے اسلام قبول کرنے والوں کا مقابلہ کرنے اور دین کی توہین کرنے میں بھی دریغ نہیں کرتے۔

یہ تینوں اعتقادی نفاق اللہ تعالیٰ کے نزدیک سخت کفر کے زمرے میں ہیں اور جہنم کے سب سے نچلے درجے میں رہیں گے: اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ فِي الدَّرْكِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ

ترجمہ: ''بیشک منافقین سب سے نچلے درجے کی آگ میں ہوں گے''۔(سورہ نساء:۱۴۵)

منافقین کی حقیقت

ان آیات میں منافقوں کے ایمان کی حقیقت بیان کی گئی ہے۔جیسا کہ علامہ ابن کثیر نے لکھا ہے:''جب حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مدینہ ہجرت کر کے تشریف لائے،'اوس' اور'خزرج' کے اکثر لوگ انصار بن کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ساتھ دینے آئے،مگر یہودی اللہ تعالیٰ کی اس نعمت سے محروم رہے''۔

مدینہ کے یہودیوں سے صلح اور منافقین

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مدینہ کے یہودیوں اور عرب کے کچھ گروہوں کے ساتھ صلح کر لی تھی۔جب جنگ بدر ہوئی اور اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو فتح عطا فرمائی،تو کفر کا زور ٹوٹ گیا۔اس کے بعد''منافقین'' کا گروہ ابھر کر سامنے آیا۔اس گروہ کا سردار عبداللہ بن ابی تھا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مدینہ آمد سے قبل اوس اور خزرج قبیلوں نے عبداللہ بن ابی کو اپنا بادشاہ بنانے اور تاج پہنانے کا منصوبہ بنایا تھا،مگر مدینہ والوں کی توجہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف ہوگئی،جس سے اس کی سرداری خطرے میں پڑ گئی۔مسلمانوں کی بڑھتی ہوئی طاقت کے باعث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خلاف کھل کر آواز اٹھانا آسان نہ رہا۔

چنانچہ عبداللہ بن ابی اور اس کے ساتھیوں نے ظاہری طور پر اسلام قبول کر کے اپنے آپ کو مسلمانوں میں شامل کر لیا،لیکن اندر سے وہ دشمنی اور سازش میں مصروف رہے،اور موقع ملتے ہی اسلام چھوڑنے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خلاف بغاوت کا ارادہ رکھتے تھے۔

یہ لوگ ظاہر میں مسلمان تھے،مگر دل سے کافر تھے اس طرح منافقوں کا ایک گروہ مدینہ اور اس کے آس پاس ظاہر ہونے لگا۔اس گروہ میں مکہ کے مہاجر شامل نہیں تھے،بلکہ زیادہ تر مدینہ کے یہود اور اوس وخزرج کے کچھ افراد شامل تھے۔

یہ لوگ مسلمانوں سے کہتے تھے کہ ہم ایمان والے ہیں،مگر اندر سے اسلام سے دشمنی کی آگ دلوں میں بھڑک رہی تھی۔ وہ اللہ اور ایمان والوں کو دھوکہ دیتے اور کافروں کے ساتھ تنہائی میں مل کر کہتے:''ہم تمہارے ساتھ ہیں''۔نماز میں بھی یہ لوگ ساتھ تو پڑھتے،مگر دل سے نماز نہیں پڑھتے،جماعت کی پابندی میں سستی اور کاہلی کا مظاہرہ کرتے،اور جہاد میں بھی کبھی راستے سے واپس آجاتے یا ساتھ رہ کر بھی دھوکہ دیتے۔یہ منافق جھوٹی قسمیں کھا کر کہتے کہ ہم مسلمان ہیں،مگر اسلام کے خلاف چالبازی کرتے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو تکلیف پہنچاتے۔

قرآن میں منافقین کی حقیقت

ان لوگوں کے حالات سورہ بقرہ کے دوسرے رکوع، سورہ نساء کے اکیسویں رکوع، سورہ منافقون اور سورہ حشر میں تفصیل سے بیان ہوئے ہیں، اور سورہ توبہ میں ان کی پوری اندرونی حالت واضح کی گئی ہے۔ کتاب ''البدایۃ والنہایۃ'' میں یہودی علماء اور پادری، جو اسلام اور رسول اللہ ﷺ کی کھل کر مخالفت کرتے تھے اور مدینہ کے منافقین کے اس میں نام ذکر کیے گئے ہیں۔

رسول اللہ ﷺ نے ان کے ساتھ نرمی کا برتاؤ فرمایا، تاکہ شاید یہ لوگ اصلی مسلمان بن جائیں۔ اس نرمی کی حکمت یہ بھی تھی کہ اگر سختی کی جاتی تو دیگر لوگ جو ابھی اسلام کے قریب آئے ہیں، وہ بھی دور ہو سکتے تھے اور شیطان انہیں یہ سمجھا سکتا تھا کہ ''محمد ﷺ اپنے ماننے والوں کے ساتھ سخت رویہ اختیار کرتے ہیں''۔ لیکن ایک وقت آیا کہ ان لوگوں کو ذلت کے ساتھ مسجد نبوی سے نکال دیا گیا۔

ایمان اور منافقین

قرآن میں فرمایا کہ جو لوگ دعویٰ کرتے ہیں کہ اللہ اور آخرت پر ایمان لائے، وہ حقیقت میں جھوٹ بولتے ہیں۔ صرف زبانی دعویٰ کسی کو ایمان والا نہیں بناتا، جب تک دل سے ان باتوں کی تصدیق نہ ہو جو نبیوں نے بتائی اور جن پر ایمان لانے کا حکم دیا گیا ہے۔

اس آیت سے ایمان و اسلام کی حقیقت واضح ہوتی ہے: منافقین نہ صرف کلمہ پڑھتے تھے، بلکہ جماعت کے ساتھ نماز پڑھتے، اور دیگر اسلامی اعمال بھی انجام دیتے، لیکن اللہ تعالیٰ نے فرمایا: **وَمَا هُمْ بِمُؤْمِنِيْنَ**۔ یعنی یہ لوگ ایمان والے نہیں ہیں۔ بعد کی آیت میں ان کی دورخی چال اور اندرونی حقیقت کا ذکر کیا گیا ہے۔

آیت نمبر (۹) يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۚ وَمَا يَخْدَعُوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُوْنَ ۝۹

ترجمہ: ''وہ اللہ کو اور ان لوگوں کو جو ایمان لائے، دھوکہ دیتے ہیں، لیکن حقیقت میں وہ اپنے آپ کو دھوکہ دیتے ہیں اور وہ اس کا شعور بھی نہیں رکھتے''۔

تفسیر مفسرین لکھتے ہیں کہ دھوکہ اور فریب تو صرف اس شخص کو دیا جا سکتا ہے جو علم نہ رکھتا ہو اور حقیقت سے لاعلم ہو۔ لیکن اللہ تعالیٰ عالم الغیب ہیں، ہر چھپی اور ظاہر چیز سے باخبر ہیں، اس لیے کوئی بھی اللہ تعالیٰ کو دھوکہ نہیں دے سکتا۔ ظاہر ہے کہ اللہ کو دھوکہ دینا ممکن نہیں، مگر منافقین نے رسول اللہ ﷺ اور مسلمانوں کو دھوکہ دینے کی کوشش کی،

جسے قرآن میں ایک طرح سے اللہ کے ساتھ چالبازی اور دھوکہ کے طور پر بیان کیا گیا ہے۔

یہ منافق لوگ اللہ کے ساتھ چالبازی کرتے ہیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم وایمان والوں کے ساتھ بھی دھوکہ دہی کے ذریعے دنیاوی فائدہ حاصل کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ظاہر میں اسلام قبول کرنے سے وہ مسلمانوں کے درمیان شامل ہوجاتے، ان کا جان و مال محفوظ رہتا اور غنائم میں بھی برابر کے حصہ دار ہوتے لیکن اللہ تعالیٰ نے منافقوں کی دو رخی چال اور چالبازی کا علم دے دیا تھا۔ یہ لوگ ظاہر میں اسلام اور مسلمانوں کے ساتھ رہتے اور اندر سے کفر اور دشمنی کے ساتھ، یعنی دونوں طرف سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتے تھے، تاکہ مسلمانوں اور کافروں دونوں کو خوش رکھیں۔

حقیقت یہ ہے کہ منافقین نہ تو اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دھوکہ دے رہے ہیں، نہ ایمان والوں کو نقصان پہنچا رہے ہیں، بلکہ خود اپنی جانوں کو دھوکہ دے رہے ہیں۔ اپنے ان اعمال کے نتیجے میں وہ دین و دنیا دونوں کو نقصان پہنچا رہے ہیں، مگر انہیں یہ شعور نہیں کہ یہ سب ان کی اپنی تباہی اور بربادی کا سبب بن رہا ہے۔ اس لیے ان کی چالبازی اور دھوکہ دہی ایمان والوں کے لیے نقصان نہیں، بلکہ خود ان کے لیے نقصان دہ ہے۔

آیت نمبر (۱۰) فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ ۙ فَزَادَهُمُ اللّٰهُ مَرَضًا ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۢ بِمَا كَانُوْا يَكْذِبُوْنَ ۝۱۰

ترجمہ: ''ان کے دلوں میں بیماری ہے، تو اللہ نے ان کا مرض بڑھا دیا اور ان کے لیے بڑا دردناک عذاب ہے، اس وجہ سے کہ وہ جھوٹ بولا کرتے تھے''۔

تفسیر

دلوں کا مرض

''ان کے دلوں میں بڑا مرض تھا، تو اللہ تعالیٰ نے ان کے مرض کو اور بڑھا دیا، اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے، کیونکہ وہ جھوٹ بولا کرتے تھے''۔

یہاں منافقوں کے غلط عقائد، نفاق، شک، جھوٹ، انکار، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ایمان والوں سے دشمنی، حسد وغیرہ کو ایک بیماری یا مرض قرار دیا گیا ہے۔ لفظ مرض سے ان کے اندر چھپی نفسیاتی اور روحانی کمزوریوں کی طرف اشارہ ہے۔

آیت میں بتایا گیا ہے کہ یہ بیماری ان کے دلوں میں پہلے سے موجود تھی، لیکن وقت کے ساتھ ساتھ بڑھتی گئی۔ جیسے جیسے اسلام اور مسلمان دشمنوں پر فتح حاصل کرتے گئے، ان کے دلوں میں جلن وحسد کی آگ بھڑکتی گئی۔ یہ

مرض ان کے بُرے اعمال اور بد پرہیزیوں کا نتیجہ تھا۔

مزید فرمایا گیا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے مرض کو اور بڑھا دیا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ لوگ اسلام اور مسلمانوں کی ترقی پر جلتے ہیں، لیکن اسلام اور مسلمان ترقی کرتے رہیں گے۔ اس طرح ان کا مرض دن بدن بڑھتا چلا جائے گا اور آخر کار انہیں بربادی اور ناکامی کا سامنا کرنا پڑے گا۔

❁❁❁

ترجمہ- آیت نمبر ۱۱ سے ۲۰ تک

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ لَا تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ ۙ قَالُوْٓا اِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُوْنَ ⑪ اَلَآ اِنَّهُمْ هُمُ الْمُفْسِدُوْنَ وَلٰكِنْ لَّا يَشْعُرُوْنَ ⑫ وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ اٰمِنُوْا كَمَآ اٰمَنَ النَّاسُ قَالُوْٓا اَنُؤْمِنُ كَمَآ اٰمَنَ السُّفَهَآءُ ۭ اَلَآ اِنَّهُمْ هُمُ السُّفَهَآءُ وَلٰكِنْ لَّا يَعْلَمُوْنَ ⑬ وَاِذَا لَقُوا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قَالُوْٓا اٰمَنَّا ۚ وَاِذَا خَلَوْا اِلٰى شَيٰطِيْنِهِمْ ۙ قَالُوْٓا اِنَّا مَعَكُمْ ۙ اِنَّمَا نَحْنُ مُسْتَهْزِءُوْنَ ⑭ اَللّٰهُ يَسْتَهْزِئُ بِهِمْ وَيَمُدُّهُمْ فِيْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ ⑮ اُولٰۗىِٕكَ الَّذِيْنَ اشْتَرَوُا الضَّلٰلَةَ بِالْهُدٰى ۠ فَمَا رَبِحَتْ تِّجَارَتُهُمْ وَمَا كَانُوْا مُهْتَدِيْنَ ⑯ مَثَلُهُمْ كَمَثَلِ الَّذِي اسْتَوْقَدَ نَارًا ۚ فَلَمَّآ اَضَاۗءَتْ مَا حَوْلَهٗ ذَهَبَ اللّٰهُ بِنُوْرِهِمْ وَتَرَكَهُمْ فِيْ ظُلُمٰتٍ لَّا يُبْصِرُوْنَ ⑰ صُمٌّۢ بُكْمٌ عُمْيٌ فَهُمْ لَا يَرْجِعُوْنَ ⑱ اَوْ كَصَيِّبٍ مِّنَ السَّمَاۗءِ فِيْهِ ظُلُمٰتٌ وَّرَعْدٌ وَّبَرْقٌ ۚ يَجْعَلُوْنَ اَصَابِعَهُمْ فِيْٓ اٰذَانِهِمْ مِّنَ الصَّوَاعِقِ حَذَرَ الْمَوْتِ ۭ وَاللّٰهُ مُحِيْطٌۢ بِالْكٰفِرِيْنَ ⑲ يَكَادُ الْبَرْقُ يَخْطَفُ اَبْصَارَهُمْ ۭ كُلَّمَآ اَضَاۗءَ لَهُمْ مَّشَوْا فِيْهِ ۙ وَاِذَآ اَظْلَمَ عَلَيْهِمْ قَامُوْا ۭ وَلَوْ شَاۗءَ اللّٰهُ لَذَهَبَ بِسَمْعِهِمْ وَاَبْصَارِهِمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۧ ⑳

ترجمہ:

(۱۱)۔اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ زمین میں فساد نہ کرو، تو وہ کہتے ہیں: ہم ہی تو اصلاح کرنے والے ہیں۔(۱۲)۔خبردار! بلاشبہ وہی لوگ فساد کرنے والے ہیں، لیکن وہ شعور نہیں رکھتے۔(۱۳)۔اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ ایمان لاؤ جیسے اور لوگ ایمان لائے، تو وہ کہتے ہیں: کیا ہم بھی ایمان لائیں جیسے یہ بیوقوف ایمان لائے؟ خبردار! بے شک وہی بیوقوف ہیں، لیکن وہ جانتے نہیں۔(۱۴)۔اور جب وہ ان لوگوں سے ملتے ہیں جو ایمان لائے، تو کہتے ہیں: ہم ایمان لائے اور جب اکیلے میں ہوتے ہیں اپنے شیطانوں کے ساتھ، تو کہتے ہیں: یقیناً ہم تمہارے ساتھ ہیں، ہم تو صرف مذاق کرنے والے ہیں (ان ایمان والوں کے ساتھ)۔(۱۵)۔اللہ مذاق کرتا ہے ان سے اور انہیں مہلت دیے جا رہا ہے، کہ وہ اپنی سرکشی میں بھٹکتے پھر رہے ہیں۔(۱۶)۔یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے ہدایت کے بدلے گمراہی خرید لی، تو ان کی یہ تجارت انہیں نفع نہ دے سکی اور نہ ہی وہ ہدایت پانے والے ہوئے۔(۱۷)۔ان کی مثال اُس شخص کی سی ہے، جس نے آگ جلائی، پھر جب اُس آگ نے اُس کے اردگرد کو روشن کر دیا، تو اللہ نے ان کی روشنی کو لے لیا اور انہیں اندھیروں میں چھوڑ دیا، جہاں وہ کچھ نہیں دیکھتے۔(۱۸)۔وہ بہرے ہیں، گونگے ہیں، اندھے ہیں، لہٰذا وہ واپس نہیں لوٹتے (سیدھے راستے پر)۔(۱۹)۔یا پھر ان کی مثال ایسی ہے جیسے آسمان سے زور کی بارش ہو، جس میں

اندھیرا ہو، گرج اور بجلی ہو، وہ بجلی کی کڑک کی وجہ سے، موت کے ڈر سے، اپنی انگلیاں اپنے کانوں میں ٹھونس لیتے ہیں، اور اللہ نے کافروں کو گھیرے میں لیا ہوا ہے۔(۲۰)۔قریب ہے کہ بجلی ان کی آنکھوں کو اچک لے، جب بھی وہ ان پر چمکتی ہے، تو وہ اس کی روشنی میں چلنے لگتے ہیں اور جب اندھیرا ہو جاتا ہے، تو کھڑے ہو جاتے ہیں۔اور اگر اللہ چاہے تو ان کی سماعت اور بصارت کو لے جائے، یقیناً اللہ ہر چیز پر پوری قدرت رکھتا ہے۔

تفسیر-آیت نمبر ۱۱ سے ۲۰ تک

آیت نمبر(۱۱-۱۲) وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ لَا تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ ۙ قَالُوْٓا اِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُوْنَ ⑪ اَلَآ اِنَّهُمْ هُمُ الْمُفْسِدُوْنَ وَلٰكِنْ لَّا يَشْعُرُوْنَ ⑫

ترجمہ: ''اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ زمین میں فساد نہ کرو، تو وہ کہتے ہیں: ہم ہی تو اصلاح کرنے والے ہیں۔خبردار! بلاشبہ وہی لوگ فساد کرنے والے ہیں، لیکن وہ شعور نہیں رکھتے''۔

تفسیر

منافقوں کا فساد

اوپر کی آیات میں منافقوں کے حالات بیان کیے گئے ہیں۔جب انہیں کہا جاتا کہ ''زمین میں فساد نہ کرو''، تو وہ جواب دیتے، ''ہم کہاں فساد کرنے والے ہیں، ہمارا کام تو اصلاح کرنا ہے''۔لیکن حقیقت یہ تھی کہ وہ مسلمانوں کے راز آشکار کر کے انہیں کافروں تک پہنچاتے، کبھی کافروں کو مسلمانوں کے خلاف اکساتے، اور مسلمانوں کے سامنے کافروں کے اعتراضات بیان کرتے۔حقیقت میں نفاق خود ایک ایسا فساد تھا جس سے بڑا کوئی فساد نہیں۔

مفسر ابن کثیرؒ فرماتے ہیں کہ ان منافقوں کا کہنا تھا کہ وہ مسلمانوں اور کافروں کے درمیان مصالحت کا ذریعہ ہیں۔انہوں نے اپنے نفاق کو اصلاح اور سدھار کا نام دیا۔ان کا یہ دعویٰ سراسر جھوٹ تھا، کیونکہ دونوں گروہوں میں سے ہر گروہ انہیں اپنے مقابل گروہ سے الگ سمجھتا تھا۔اس طرح ان کے اعمال سے جو فساد پھیلتا، وہ نہ انہیں سمجھ میں آتا اور نہ انہیں اس کی آخرت میں سزا کا اندازہ ہوتا۔

آیت نمبر(۱۳-۱۴-۱۵) وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ اٰمِنُوْا كَمَآ اٰمَنَ النَّاسُ قَالُوْٓا اَنُؤْمِنُ كَمَآ اٰمَنَ السُّفَهَآءُ ۭ اَلَآ اِنَّهُمْ هُمُ السُّفَهَآءُ وَلٰكِنْ لَّا يَعْلَمُوْنَ ⑬ وَاِذَا لَقُوا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قَالُوْٓا اٰمَنَّا ۚ وَاِذَا خَلَوْا اِلٰى شَيٰطِيْنِهِمْ ۙ قَالُوْٓا اِنَّا مَعَكُمْ ۙ اِنَّمَا نَحْنُ مُسْتَهْزِءُوْنَ ⑭ اَللّٰهُ يَسْتَهْزِئُ بِهِمْ وَيَمُدُّهُمْ فِيْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ ⑮

ترجمہ: ''اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ ایمان لاؤ جیسے اور لوگ ایمان لائے، تو وہ کہتے ہیں: کیا

ہم بھی ایمان لائیں جیسے یہ بیوقوف ایمان لائے؟ خبردار! بے شک وہی بیوقوف ہیں، لیکن وہ جانتے نہیں۔اور جب وہ ان لوگوں سے ملتے ہیں جو ایمان لائے، تو کہتے ہیں: ہم ایمان لائے اور جب اکیلے میں ہوتے ہیں اپنے شیطانوں کے ساتھ، تو کہتے ہیں: یقیناً ہم تمہارے ساتھ ہیں، ہم تو صرف مذاق کرنے والے ہیں (ان ایمان والوں کے ساتھ)۔اللہ مذاق کرتا ہے ان سے اور انہیں مہلت دیے جارہا ہے، کہ وہ اپنی سرکشی میں بھٹکتے پھر رہے ہیں''۔

تفسیر

منافقوں کا ایمان

جب منافقوں سے کہا جاتا کہ ''ایمان لے آؤ''، یعنی اسلام کو دل کی سچائی کے ساتھ قبول کرو، تو وہ جواب دیتے: ''جو لوگ ایمان لا چکے ہیں، وہ تو بیوقوف ہیں، ہم ایسی بیوقوفی ہرگز نہیں کریں گے۔'' انہوں نے خصوصاً صحابۂ کرامؓ، بالخصوص انصار کے دونوں قبائل 'اوس' اور 'خزرج' کو بیوقوف قرار دیا، حالانکہ حقیقت میں یہی منافق خود بیوقوف تھے لیکن انہیں اپنی بیوقوفی کا شعور نہ تھا۔ایمان کو چھوڑ کر کفر کو اختیار کرنے سے انہوں نے نہ صرف اسلام کو نقصان پہنچایا بلکہ اپنی آخرت بھی برباد کرلی اور دنیا میں مومن اور کافر دونوں کی ملامت سمیٹی۔

منافقین ایمان والوں کے سامنے کہتے تھے کہ ''ہم بھی ایمان لے آئے ہیں''، لیکن جب اکیلے اپنے شیطانوں یعنی کافروں کے سرداروں کے پاس پہنچتے تو اقرار کرتے: ''ہم تمہارے ساتھ ہیں، مسلمانوں سے جو کچھ کہتے ہیں، وہ محض ان کا مذاق اڑانے کے لئے ہوتا ہے۔''

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ''یہ ایمان والوں کا مذاق اڑاتے ہیں، لیکن آخرت میں انہی کے مذاق کا بدلہ ذلت و رسوائی کی صورت میں انہی کو دیا جائے گا۔'' اللہ تعالیٰ انہیں مہلت دے رہا ہے اور وہ یہ گمان کرتے ہیں کہ ہم فائدے میں ہیں، حالانکہ وہ آہستہ آہستہ جہنم کی طرف بڑھ رہے ہیں۔

یہ منافق دنیا میں اپنے مال و جائیداد کے نشے میں ڈوبے رہتے ہیں اور اسے کامیابی سمجھتے ہیں، لیکن حقیقت میں یہ ان کی بہت بڑی بھول اور فریبِ نفس ہے۔

اس آیت سے متعلق بعض غیر مسلموں کے اعتراض کا جواب:

بعض غیر مسلموں کا اشکال ہوتا ہے کہ اَللّٰهُ يَسْتَهْزِئُ بِهِمْ۔(سورہ بقرہ آیت ۱۵) کا مطلب یہ ہے کہ ''اللہ مذاق اڑاتا ہے، ہنسی باز ہے''۔اب اس اعتراض کا جواب تو ایک اسلامی ہے اور دوسرا عقلی، سائنسی اور نفسیاتی۔

۱۔قرآن کا اسلوبِ بیان: قرآن میں اکثر ''مُشابہ الفاظ'' استعمال ہوتے ہیں تاکہ بات انسانوں کو سمجھ آئے۔اللہ تعالیٰ مخلوق کے ساتھ ان کی زبان و انداز میں خطاب کرتا ہے تاکہ وہ حقیقت کو آسانی سے سمجھ سکیں۔چنانچہ

یہاں ''استہزاء'' کا مطلب جزاوسزا کے قانون کے مطابق ردعمل ہے، نہ کہ انسانی سطح پر مذاق۔

مفسرین میں امام غزالیؒ، امام رازیؒ اور دیگر مفسرین نے اس کی وضاحت کی ہے کہ یہاں ''استہزاء'' کا مطلب یہ ہے کہ: اللہ ان منافقین کو حقیر و ذلیل کر دے گا اور ان کے عیوب کو ظاہر کرے گا تا کہ دنیا ان پر ہنسے۔ یہ ان کے اپنے استہزاء کا الٹا نتیجہ ہے، یعنی جزاء من جنس العمل (یعنی جیسا کرو گے ویسا بھرو گے)۔

۲۔**عدل الٰہی کے پہلو سے:** یعنی منافقین نے اہل ایمان کا استہزاء کیا، تو اللہ نے ان کو بدلے میں ایسا انجام دیا کہ خود ان پر دنیا ہنسے اور آخرت میں وہ ذلیل ہوں۔ یہ مزاح نہیں بلکہ عدل ہے۔

۳۔**عقلی پہلو سے:** اللہ تعالیٰ کو انسان کی طرح ''ہنسی مذاق'' کی حاجت نہیں۔ وہ کمال مطلق ہے، اس کی صفات انسانی کمزوریوں جیسی نہیں۔ یہاں عقل یہ کہتی ہے کہ اگر کوئی شخص ہمیشہ دوسروں کا مذاق اڑائے اور بالآخر خود لوگوں کے ہنسنے کا سبب بنے، تو یہ قدرتی عدل ہے، نہ کہ ''مذاق بازی''۔ مثال کے طور پر: ایک طالب علم دوسروں کو ''ناکام ہونے'' پر چڑھائے، لیکن آخر میں خود ناکام ہو جائے تو سب اس پر ہنسیں گے۔ یہ ''قدرتی عدل'' ہے، کوئی ہنسی بازی نہیں۔

۴۔**سائنسی پہلو سے:** ''قانونِ ری ایکشن'' (Newton's 3rd Law of Motions) یعنی فزکس میں اصول ہے کہ ہر عمل کا مساوی اور مخالف ردعمل ہوتا ہے۔ منافقین نے اہل ایمان کو استہزاء کا نشانہ بنایا، تو قدرتی طور پر وہ خود ردعمل میں استہزاء کا شکار ہوئے۔ اسی طرح جو قوم دوسروں کو نیچا دکھانے کی عادت ڈالتی ہے، آخر کار خود سماجی طور پر نیچا دکھائی دیتی ہے۔ یہ اللہ کا قانونِ قدرت ہے۔

۵۔**نفسیاتی پہلو سے:** منافقین کے ذہن میں دوغلا پن تھا یعنی سامنے کچھ، پیچھے کچھ۔ ایسے لوگ نفسیاتی طور پر عدمِ توازن (Split Personality) کا شکار ہوتے ہیں۔ جب ایسے لوگ رسوا ہوتے ہیں تو معاشرہ ان کی منافقت کو بے نقاب کر کے ان پر ہنستا ہے۔ یہ نفسیاتی ''بوم رینگ ایفیکٹ'' (Boomerang Effect) ہے: یعنی جو دوسروں پر کیا، وہی واپس خود اپنے اوپر آیا۔ یہاں قرآن کی نفسیاتی حکمت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے لفظ ''استہزاء'' استعمال کر کے منافقین کو آئینہ دکھایا کہ وہ جو دوسروں پر ہنسی کرتے ہیں، وہی انجام ان کا ہوگا۔ یہ نفسیاتی طور پر بہت گہرا اثر ڈالتا ہے۔

خلاصہ

اس طرح آیت اَللّٰهُ يَسْتَهْزِئُ بِهِمْ کا مطلب یہ نہیں کہ اللہ مذاق کرتا ہے، بلکہ یہ عدل الٰہی (جزاء من جنس العمل) ہے۔ یہ قدرتی قانونِ ردعمل ہے اور یہ نفسیاتی الٹا اثر ہے چنانچہ یہ منافقت کے انجام کی پیشین گوئی ہے جو دنیا و آخرت میں پوری ہوگئی۔ قرآن کی یہ آیت دراصل ایک اخلاقی و نفسیاتی قانون بیان کرتی ہے، جسے آج

سوشیالوجی اور سائنس بھی تسلیم کرتی ہے کہ ''جو دوسروں کے لیے گڑھا کھودے گا، خود اس میں گرے گا''۔

آیت نمبر (۱۶-۱۷-۱۸-۱۹) اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اشْتَرَوُا الضَّلٰلَةَ بِالْهُدٰى ۪ فَمَا رَبِحَتْ تِّجَارَتُهُمْ وَمَا كَانُوْا مُهْتَدِيْنَ ﴿۱۶﴾ مَثَلُهُمْ كَمَثَلِ الَّذِي اسْتَوْقَدَ نَارًا ۚ فَلَمَّآ اَضَآءَتْ مَا حَوْلَهٗ ذَهَبَ اللّٰهُ بِنُوْرِهِمْ وَتَرَكَهُمْ فِيْ ظُلُمٰتٍ لَّا يُبْصِرُوْنَ ﴿۱۷﴾ صُمٌّۢ بُكْمٌ عُمْيٌ فَهُمْ لَا يَرْجِعُوْنَ ﴿۱۸﴾ اَوْ كَصَيِّبٍ مِّنَ السَّمَآءِ فِيْهِ ظُلُمٰتٌ وَّرَعْدٌ وَّبَرْقٌ ۚ يَجْعَلُوْنَ اَصَابِعَهُمْ فِيْٓ اٰذَانِهِمْ مِّنَ الصَّوَاعِقِ حَذَرَ الْمَوْتِ ۭ وَاللّٰهُ مُحِيْطٌۢ بِالْكٰفِرِيْنَ ﴿۱۹﴾

ترجمہ: ''یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے ہدایت کے بدلے گمراہی خرید لی، تو ان کی یہ تجارت انہیں نفع نہ دے سکی اور نہ ہی وہ ہدایت پانے والے ہوئے۔ ان کی مثال اُس شخص کی سی ہے، جس نے آگ جلائی، پھر جب اُس آگ نے اُس کے اردگرد کو روشن کر دیا، تو اللہ نے ان کی روشنی کو لے لیا اور انہیں اندھیروں میں چھوڑ دیا، جہاں وہ کچھ نہیں دیکھتے۔ وہ بہرے ہیں، گونگے ہیں، اندھے ہیں، لہٰذا وہ واپس نہیں لوٹتے (سیدھے راستے پر)۔ یا پھر ان کی مثال ایسی ہے جیسے آسمان سے زور کی بارش ہو، جس میں اندھیرا ہو، گرج اور بجلی ہو، وہ بجلی کی کڑک کی وجہ سے، موت کے ڈر سے، اپنی انگلیاں اپنے کانوں میں ٹھونس لیتے ہیں، اور اللہ نے کافروں کو گھیرے میں لیا ہوا ہے''۔

تفسیر **ہدایت کے بدلے گمراہی:** اس آیت میں منافقوں کے انجام کو ایک تجارت کی مثال سے واضح کیا گیا ہے۔ فرمایا گیا کہ ان منافقوں کو تجارت کا طریقہ تک معلوم نہیں، کہ انہوں نے ہدایت جیسی قیمتی متاع چھوڑ کر گمراہی جیسی گھٹیا اور بے کار چیز خرید لی۔ چونکہ اکثر منافق تاجر پیشہ لوگ تھے، اس لیے انہیں مثال دے کر سمجھایا گیا کہ یہ لوگ نفع بخش سودا کرنے کے بجائے گھاٹے کا سودا کر بیٹھے۔ ایمان جیسی قیمتی دولت کو چھوڑ کر کفر اور ضلالت کو اپنا لیا۔ آگے کی آیات میں اس حقیقت کو مزید دو مثالوں کے ذریعے واضح کیا گیا ہے۔

منافقوں کی دو قسمیں

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے میں منافق دو طرح کے تھے:

۱۔ وہ دل سے اسلام کا انکار کرتے، مگر زبان سے ایمان کا دعویٰ کرتے تاکہ مسلمانوں کے درمیان رہ کر فائدہ اٹھا سکیں۔

۲۔ وہ جو کمزور دل کے تھے اسلام کے حق ہونے میں شک کرتے رہتے۔ کبھی اسلام کی خوبیاں دیکھ کر متاثر ہو

جاتے ،لیکن جب خواہشِ نفس یا دنیاوی مفاد سامنے آتا تو فوراً بدل جاتے ۔قرآن کی ان آیات میں دونوں گروہوں کی مثالیں دی گئی ہیں۔

پہلی قسم کے منافقوں کی مثال ایسے شخص کی دی گئی ہے جو اندھیری رات میں آگ جلاتا ہے۔آگ کی روشنی سے اردگرد کی چیزیں روشن ہوجاتی ہیں اور وہ فائدہ اٹھانے لگتا ہے،لیکن اچانک اس کی آنکھوں کی روشنی چھین لی جاتی ہے۔اب وہ روشنی موجود ہونے کے باوجود اندھے کی طرح کچھ دیکھ نہیں سکتا۔ بالکل اسی طرح یہ منافقین بھی تھے، جنہوں نے حق کا نور پھیلتے دیکھا مگر اس سے فائدہ نہ اٹھایا اور بالآخر گمراہی کے اندھیروں میں بھٹک گئے۔

ان کی حالت یہ ہوگئی کہ وہ گویا بہرے، گونگے اور اندھے ہوگئے ہیں۔ان کے کان حق بات سننے کے قابل نہ رہے، زبان حق کہنے کے لائق نہ رہی اور آنکھیں حق دیکھنے کی صلاحیت سے محروم ہوگئیں۔ایسی حالت میں ان کے حق کی طرف پلٹ آنے کی کیا امید کی جاسکتی ہے؟

آیت نمبر(۲۰) يَكَادُ الْبَرْقُ يَخْطَفُ اَبْصَارَهُمْ ؕ كُلَّمَآ اَضَآءَ لَهُمْ مَّشَوْا فِيْهِ ۙ وَاِذَآ اَظْلَمَ عَلَيْهِمْ قَامُوْا ؕ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَذَهَبَ بِسَمْعِهِمْ وَاَبْصَارِهِمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَىْءٍ قَدِيْرٌ ۝۲۰

ترجمہ: ''قریب ہے کہ بجلی ان کی آنکھوں کو اچک لے، جب بھی وہ ان پر چمکتی ہے،تو وہ اس کی روشنی میں چلنے لگتے ہیں اور جب اندھیرا ہوجاتا ہے،تو کھڑے ہوجاتے ہیں۔اور اگر اللہ چاہے تو ان کی سماعت اور بصارت کو لے جائے، یقیناً اللہ ہر چیز پر پوری قدرت رکھتا ہے''۔

تفسیر 'ابن جریر'، سدی کبیر، ابو مالک، ابوسالم، ابوصالح، حضرت ابن عباسؓ، حضرت ابن مسعودؓ اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی ایک جماعت نے یہ واقعہ بیان کیا ہے کہ مدینہ منورہ کے منافقین میں سے دو آدمی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس سے نکل کر مشرکین کی طرف روانہ ہوئے۔راستے میں ان کا سامنا اسی بارش سے ہوا جس کا ذکر قرآن میں آیا ہے۔اس بارش کے ساتھ شدید اندھیرا، زبردست گرج اور تیز بجلی کی چمک تھی۔

جب گرج زور سے ہوتی تو وہ دونوں خوف کے مارے انگلیاں اپنے کانوں میں ڈال لیتے کہ کہیں گرج کی آواز سے کان پھٹ نہ جائیں۔جب بجلی کڑکتی اور روشنی پھیلتی تو اس میں قدم بڑھا لیتے ،لیکن جیسے ہی بجلی کی چمک مدھم ہوتی اور اندھیرا چھا جاتا، وہ راستہ بھٹک کر پھر وہیں کھڑے رہ جاتے۔دل ہی دل میں یہ سوچتے اور افسوس کرتے کہ کاش صبح ہوجائے تو ہم واپس جا کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوں اور اسلام قبول کرلیں۔ چنانچہ جب صبح

ہوئی تو وہ دونوں بارگاہِ نبوی میں حاضر ہوئے اور اسلام لے آئے۔

اللہ تعالیٰ نے ان دو منافقین کی کیفیت کو بیان فرمایا، مگر یہ کیفیت درحقیقت دیگر منافقین کا بھی حال تھا۔ ان کا طریقہ یہ تھا کہ جب وہ رسول اللہ ﷺ کی مجلس میں بیٹھتے تو کانوں میں انگلیاں ڈال لیتے، اس خوف سے کہ کہیں ان کے بارے میں قرآن کی کوئی آیت نازل نہ ہو جائے یا ان کی بات کھل نہ جائے جس کے نتیجے میں ان پر قتل کی تلوار نہ چلے۔

اسی طرح جب کبھی ان کے پاس مال و دولت اور غنیمت آتی تو دین کی تائید کرنے لگتے اور دعویٰ کرتے کہ محمد ﷺ کا دین ہی سچا ہے۔ لیکن جب وہ مصیبتوں اور آزمائشوں میں گرفتار ہوتے اور مال و اولاد کا نقصان دیکھتے تو فوراً زبان سے کہہ اٹھتے کہ یہ سب کچھ محمد ﷺ کے دین کی وجہ سے ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے بارش کے طوفان میں وہ روشنی دیکھ کر قدم بڑھاتے اور اندھیرے میں کھڑے کے کھڑے رہ جاتے۔

دوسری مثال

اسی حقیقت کو قرآن نے دوسری مثال میں بیان کیا ہے: تیز بارش، چاروں طرف اندھیرا، بادل کی زوردار گرج، بجلی کی چمک اور موت کا خوف طاری، لوگ گرج کی آواز سے کانوں میں انگلیاں ڈالے ہوئے ہیں، بجلی کی چمک آنکھوں کو چوندھیا دینے پر ہے۔ کبھی بجلی چمکتی ہے تو روشنی میں دو قدم چل لیتے ہیں اور جب اندھیرا چھا جاتا ہے تو حیران و سرگرداں کھڑے رہ جاتے ہیں۔

ٹھیک یہی حال منافقوں کا ہے۔ جب اسلام کو ترقی کرتا دیکھتے ہیں تو اس کی طرف مائل ہو جاتے ہیں اور جب دنیا کی محبت غالب آتی ہے اور مفاد نظر آتا ہے تو رک جاتے ہیں اور ایمان کی طرف بڑھنے سے باز آ جاتے ہیں۔ لیکن اللہ تعالیٰ اپنی قدرت و علم سے سب کو گھیرے میں لیے ہوئے ہے۔ وہ چاہے تو ان کے سننے اور دیکھنے کی قوت سلب کر لے۔ بیشک وہ ہر چیز پر قادر ہے۔

ام المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا روایت کرتی ہیں کہ جب رسول اللہ ﷺ بارش دیکھتے تو دعا فرماتے: ''اے اللہ! ہمارے لئے اس بارش کو نفع بخش بنا دے''۔ **(بخاری: ۱۰۳۲)**

❁❁❁

ترجمہ-آیت نمبر ۲۱ سے ۲۹ تک

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴿۲۱﴾ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ فِرَاشًا وَّالسَّمَآءَ بِنَآءً ۖ وَّاَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزْقًا لَّكُمْ ۚ فَلَا تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ اَنْدَادًا وَّاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۲۲﴾ وَاِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ ۖ وَادْعُوْا شُهَدَآءَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۲۳﴾ فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا وَلَنْ تَفْعَلُوْا فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِيْ وَقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ ۖ اُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِيْنَ ﴿۲۴﴾ وَبَشِّرِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۭ كُلَّمَا رُزِقُوْا مِنْهَا مِنْ ثَمَرَةٍ رِّزْقًا ۙ قَالُوْا هٰذَا الَّذِيْ رُزِقْنَا مِنْ قَبْلُ ۙ وَاُتُوْا بِهٖ مُتَشَابِهًا ۭ وَلَهُمْ فِيْهَآ اَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ ۙ وَّهُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۲۵﴾ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَسْتَحْيٖٓ اَنْ يَّضْرِبَ مَثَلًا مَّا بَعُوْضَةً فَمَا فَوْقَهَا ۭ فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فَيَعْلَمُوْنَ اَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ ۚ وَاَمَّا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَيَقُوْلُوْنَ مَاذَآ اَرَادَ اللّٰهُ بِهٰذَا مَثَلًا ۘ يُضِلُّ بِهٖ كَثِيْرًا ۙ وَّيَهْدِيْ بِهٖ كَثِيْرًا ۭ وَمَا يُضِلُّ بِهٖٓ اِلَّا الْفٰسِقِيْنَ ﴿۲۶﴾ الَّذِيْنَ يَنْقُضُوْنَ عَهْدَ اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مِيْثَاقِهٖ ۠ وَيَقْطَعُوْنَ مَآ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖٓ اَنْ يُّوْصَلَ وَيُفْسِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ ۭ اُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ﴿۲۷﴾ كَيْفَ تَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَكُنْتُمْ اَمْوَاتًا فَاَحْيَاكُمْ ۚ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ ثُمَّ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴿۲۸﴾ هُوَ الَّذِيْ خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا ۤ ثُمَّ اسْتَوٰٓى اِلَى السَّمَآءِ فَسَوّٰىهُنَّ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ ۭ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴿۲۹﴾

ترجمہ:

(۲۱)۔اے انسانو! تم عبادت کرو اپنے رب کی، جس نے تمہیں پیدا کیا اور ان کو بھی جو تم سے پہلے تھے، تاکہ تم متقی بن جاؤ (۲۲)۔جس نے تمہارے لیے زمین کو بچھونا بنایا اور آسمان کو چھت، اور اُس نے آسمان سے پانی نازل کیا، پھر اُس کے ذریعے پھلوں سے تمہارے لیے رزق نکالا، لہٰذا تم اللہ کا شریک کسی کو نہ ٹھہراؤ، حالانکہ تم جانتے ہو (۲۳)۔اور اگر تم شک میں ہو اس قرآن کے بارے میں جو ہم نے اپنے بندے (محمد) پر نازل کیا، تو تم اس جیسی ایک سورت لے آؤ اور اپنے مددگاروں کو بھی بلا لو اللہ کے سوا، اگر تم سچے ہو (۲۴)۔پھر اگر تم نہ کر سکو اور ہرگز نہ کر سکو گے، تو اس آگ سے ڈرو، جس کا ایندھن انسان اور پتھر ہیں، جو تیار کی گئی ہے کافروں کے لیے (۲۵)۔اور خوشخبری دے دو ان لوگوں کو جو ایمان لائے اور جنہوں نے نیک عمل کیے، کہ یقیناً ان کے لیے باغات ہیں، جن کے نیچے نہریں

بہتی ہیں۔ جب بھی ان میں سے کوئی پھل انہیں کھانے کے لیے دیا جائے گا، تو وہ کہیں گے: یہ تو وہی ہے جو ہمیں پہلے بھی دیا گیا تھا اور انہیں (ایسا) پھل دیا جائے گا جو ملتا جلتا ہوگا۔ اور ان کے لیے وہاں پاکیزہ بیویاں ہوں گی اور وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے (۲۶)۔ بے شک اللہ نہیں شرماتا کہ مثال بیان کرے کسی بھی چیز کی، چاہے مچھر کی ہو یا اس سے بھی زیادہ (حقیر چیز کی)۔ تو وہ لوگ جو ایمان لائے، وہ جانتے ہیں کہ بے شک یہ (مثال) ان کے رب کی طرف سے حق ہے۔ اور وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا، وہ کہتے ہیں: اللہ نے اس مثال سے کیا ارادہ کیا؟ وہ گمراہ کرتا ہے اس سے بہت سوں کو، اور ہدایت دیتا ہے اس سے بہت سوں کو اور وہ گمراہ نہیں کرتا اس سے مگر فاسقوں ہی کو (۲۷)۔ جو توڑتے ہیں اللہ کے عہد کو، اُس کے پختہ کر لینے کے بعد اور وہ کاٹتے ہیں اس چیز کو جس کے بارے میں اللہ نے حکم دیا کہ اسے جوڑا جائے، اور وہ زمین میں فساد کرتے ہیں۔ یہی لوگ ہیں جو نقصان اٹھانے والے ہیں (۲۸)۔ تم اللہ کے ساتھ کیسے کفر کرتے ہو؟ حالانکہ تم بے جان تھے، پھر اس نے تمہیں زندگی دی، پھر وہی تمہیں موت دے گا، پھر وہی تمہیں زندہ کرے گا، پھر اُسی کی طرف تم لوٹائے جاؤ گے (۲۹)۔ وہی ہے (اللہ) جس نے تمہارے لیے پیدا کیا جو کچھ زمین میں ہے، سب کچھ، پھر اس نے توجہ فرمائی آسمان کی طرف، چنانچہ انہیں ٹھیک کر کے بنا دیا سات آسمان اور وہ ہر چیز کو خوب جاننے والا ہے۔

تفسیر-آیت نمبر ۲۱ سے ۲۹ تک

آیت نمبر (۲۱-۲۲) يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴿۲۱﴾ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ فِرَاشًا وَّالسَّمَآءَ بِنَآءً ۖ وَّاَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزْقًا لَّكُمْ ۚ فَلَا تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ اَنْدَادًا وَّاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۲۲﴾

ترجمہ: ''اے انسانو! تم عبادت کرو اپنے رب کی، جس نے تمہیں پیدا کیا اور ان کو بھی جو تم سے پہلے تھے، تاکہ تم متقی بن جاؤ۔ جس نے تمہارے لیے زمین کو بچھونا بنایا اور آسمان کو چھت، اور اُس نے آسمان سے پانی نازل کیا، پھر اُس کے ذریعے پھلوں سے تمہارے لیے رزق نکالا، لہٰذا تم اللہ کا شریک کسی کو نہ ٹھہراؤ، حالانکہ تم جانتے ہو''۔

تفسیر

توحید اور دعوت

سورۂ بقرہ کی ابتداء سے اب تک تین گروہوں کا ذکر کیا گیا: (۱) متقی یعنی پرہیزگار، (۲) کافر، (۳) منافق۔

ان کی صفات، انجام اور بدلے کو واضح کرنے کے بعد اب انسان کو تقویٰ کی راہ پر لانے کے لئے جن بنیادی امور کی ضرورت ہے، ان کا بیان سامنے آتا ہے۔

عبادت

عبادت کا مفہوم یہ ہے کہ بندہ اپنی زندگی کے ہر گوشے میں سراسر اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور اس کے احکام کے سامنے سر جھکا دے۔ نماز، روزہ، حج اور زکوٰۃ ہی نہیں بلکہ عقائد کی درستگی، معاملات میں دیانت، سیاست میں عدل و انصاف اور معاشرتی زندگی کے تمام امور کو اللہ کے حکم کے مطابق بسر کرنا ہی اصل عبادت ہے۔

اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا کہ ''میری عبادت کرو'' بلکہ ارشاد ہوا: ''اپنے رب کی عبادت کرو''۔ یعنی اس ہستی کی بندگی کرو جو ہر لمحہ تمہاری پرورش کرنے والی ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں فرمایا:

۱۔ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ

سب سے پہلی عقلی دلیل یہ ہے کہ وہ اللہ ہی ہے جس نے تمہیں وجود بخشا، تمہیں بے شمار نعمتیں عطا کیں، لہٰذا حقیقی عبادت کا مستحق بھی وہی ہے۔

۲۔ وَالَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ

تمہارے باپ دادا اور سابقہ تمام نسلیں بھی اسی کی پیدا کردہ ہیں۔ جب ہر دور کا خالق وہی ہے تو عبادت بھی صرف اسی کی ہونی چاہیے۔

۳۔ الَّذِیْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ فِرَاشًا

اس نے زمین کو تمہارے لئے گہوارہ بنا دیا، نہ اتنی نرم کہ ٹھہر نہ سکو اور نہ اتنی سخت کہ اس پر زندگی بسر نہ کر سکو۔ تم اس پر چلتے پھرتے ہو، بستیاں آباد کرتے ہو، کھیت کھلیان اگاتے ہو۔ یہ سب اسی کی قدرت کے مظاہر ہیں۔

۴۔ وَالسَّمَآءَ بِنَآءً

اس نے آسمان کو تمہارے لئے مضبوط چھت بنایا۔ کائنات گویا ایک گھر ہے: آسمان اس کی چھت، زمین اس کا فرش اور سورج، چاند اور ستارے اس کے چراغ ہیں۔

۵۔ وَاَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً

وہی ہے جو بارش برساتا ہے اور مردہ زمین کو زندہ کر کے اس سے غلہ، پھل، سبزیاں اور ترکاریاں تمہارے رزق کے لئے پیدا کرتا ہے۔ انسان کی زندگی کی ہر ضرورت اسی بارش اور زمین کی سرسبزی سے وابستہ ہے۔ یہ سب کچھ اسی کی رحمت اور قدرت کا جلوہ ہے۔

علامہ ابن کثیرؒ نے امام مالکؒ کا ایک قول نقل کیا ہے کہ جب ہارون الرشید نے ان سے اللہ تعالیٰ کے وجود پر دلیل پوچھی تو آپؒ نے فرمایا: ''زبانوں کا مختلف ہونا اور آوازوں کے انداز کا جدا ہونا ہی اس بات کی دلیل ہے کہ ایک ایسی ذات موجود ہے جس کا نام اللہ ہے''۔ اس سورہ میں سب سے پہلے انسان کو یہ حکم دیا گیا ہے کہ وہ صرف اللہ کی عبادت کرے اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرائے، کیونکہ یہی اسلام کی سب سے بنیادی اور اولین تعلیم ہے۔

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے دریافت کیا: ''اللہ کے نزدیک سب سے بڑا گناہ کون سا ہے؟'' آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''یہ کہ تو اللہ کا شریک ٹھہرائے، حالانکہ وہی تجھے پیدا کرنے والا ہے''۔ میں نے عرض کیا: ''اس کے بعد کون سا گناہ بڑا ہے؟'' آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''یہ کہ تو اپنی اولاد کو اس خوف سے قتل کردے کہ وہ تیرے رزق میں شریک ہو جائیں گے''۔ میں نے پھر پوچھا: ''پھر اس کے بعد کون سا؟'' آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''یہ کہ تو اپنے پڑوسی کی بیوی کے ساتھ زنا کرے''۔ **(بخاری: ۴۴۷۷)**

آیت نمبر (۲۳) وَاِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ ۪ وَادْعُوْا شُهَدَآءَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۲۳﴾

ترجمہ: ''اور اگر تم شک میں ہو اس قرآن کے بارے میں جو ہم نے اپنے بندے (محمد) پر نازل کیا، تو تم اس جیسی ایک سورت لے آؤ اور اپنے مددگاروں کو بھی بلا لو اللہ کے سوا، اگر تم سچے ہو''۔

تفسیر

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے رسول ہونے کی دلیل

ان آیات میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رسالت کو واضح طور پر ثابت کیا گیا ہے۔ نبوت کی سب سے بڑی دلیل معجزات ہوتے ہیں، اسی لیے ہر نبی کو اپنے اپنے زمانے کے حالات کے مطابق معجزات عطا کیے گئے تاکہ ان کی سچائی نمایاں ہو۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بھی بے شمار معجزات عطا ہوئے، مگر ان تمام میں سب سے عظیم اور دائمی معجزہ قرآن مجید ہے، جو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت کی سب سے مضبوط دلیل ہے۔

کفار اور مشرکین یہ الزام لگاتے تھے کہ ''محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خود ہی باتیں لکھ لی ہیں اور پھر انہیں اللہ کا کلام کہہ کر لوگوں کو سنا دیتے ہیں''۔ اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''یہ وہ کتاب ہے جس میں کوئی شک نہیں، ہم نے ہی اپنے بندے پر اسے نازل کیا ہے''۔

پھر چیلنج دیا گیا ہے کہ اگر تمہیں اس میں ذرا سا بھی شک ہے تو تم بھی اس جیسی کوئی چھوٹی سی سورہ بنا کر لے آؤ۔

تم اہلِ زبان ہو، عربی تمہاری مادری زبان ہے، تم شعر و خطابت میں یکتائے روزگار سمجھے جاتے ہو، جبکہ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تو امی ہیں، پڑھنا لکھنا تک نہیں جانتے۔ تو آؤ! تم بھی ایک مختصر سی سورہ پیش کر کے دکھاؤ۔

یہی چیلنج قرآن میں چار اور مقامات پر بھی دہرایا گیا ہے (یونس: آیت نمبر ۱۴، ہود: آیت نمبر ۳۴، بنی اسرائیل: آیت نمبر ۸۸، الطور: آیت نمبر ۳۴۔ یہ ایک ایسا اعلان ہے جس کا جواب نہ اس وقت دیا جا سکا اور نہ آج تک کوئی اس کا جواب دے پایا، نہ ہی قیامت تک دے سکے گا۔ اس سے تین حقائق بالکل واضح ہو گئے: (۱) اللہ تعالیٰ کی ذات کا وجود۔ (۲) قرآن کا اللہ کی طرف سے نازل ہونا۔ (۳) رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سچائی اور رسالت۔ یہ کھلا اور اٹل چیلنج مکی دور میں کئی مرتبہ دیا گیا، جیسا کہ سورہ بنی اسرائیل، سورہ ہود اور سورہ یونس میں مذکور ہے۔

قرآن جیسا کلام لانے سے عاجز

تاریخ اس بات کی گواہ ہے کہ پورے عرب نے اس کلام کو اپنی فصاحت و بلاغت میں بے مثال مانا۔ آج چودہ سو سال سے زائد عرصہ گزر چکا ہے، مگر کوئی انسان قرآن کے ہم پلہ کلام نہیں لا سکا۔ شام، مصر، فلسطین اور دمشق جیسے علاقوں میں آج بھی لاکھوں یہودی اور عربی دان بستے ہیں، جو زبان و بیان پر قدرت رکھتے ہیں، اخبارات و مجلّات شائع کرتے ہیں، لیکن قرآن کی ایک سورت کے برابر بھی کچھ پیش نہ کر سکے۔

اسی آیت میں یہ خبر بھی دے دی گئی تھی کہ قیامت تک کوئی شخص قرآن جیسا کلام نہیں لا سکے گا۔ پس جب یہ ثابت ہو گیا کہ قرآن اللہ کا کلام ہے اور محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس کے سچے پیغمبر ہیں، تو پھر اے انکار کرنے والو! اگر اب بھی ضد پر قائم رہے تو تمہارا ٹھکانہ جہنم ہے، وہ آگ جس کا ایندھن کافر انسان اور پتھر ہوں گے، اور جو خاص طور پر تم جیسے منکروں کے لیے تیار کی گئی ہے۔

آیت نمبر (۲۴) فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا وَلَنْ تَفْعَلُوْا فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِیْ وَقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ ۚ اُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِیْنَ ﴿۲۴﴾

ترجمہ: ”پھر اگر تم نہ کر سکو اور ہرگز نہ کر سکو گے، تو اس آگ سے ڈرو، جس کا ایندھن انسان اور پتھر ہیں، جو تیار کی گئی ہے کافروں کے لیے۔“

تفسیر یہاں پتھر سے مراد عام پتھر بھی ہو سکتے ہیں اور وہ گندھک کے پتھر بھی مراد لیے جا سکتے ہیں جن سے آگ کی شدت اور لپٹیں اور زیادہ بھڑک اٹھتی ہیں۔ بعض مفسرین کے نزدیک اس سے مراد وہی بت بھی ہیں جنہیں کافر

پوجتے تھے، تاکہ جب وہ اپنے معبودانِ باطل کو جہنم میں بے بس اور عذاب میں گرفتار دیکھیں تو اپنے شرک پر مزید حسرت وندامت میں ڈوب جائیں۔

پھر فرمایا گیا کہ یہ آگ دراصل کافروں کے لیے تیار کی گئی ہے۔ اس سے یہ حقیقت واضح ہوگئی کہ جہنم اصلاً کافروں کا ٹھکانہ ہے۔ البتہ اگر اہلِ ایمان میں سے کوئی اپنے گناہوں کے سبب وہاں ڈالا بھی گیا تو وہ ہمیشہ کے لیے نہ ہوگا، بلکہ عذاب کی مدت پوری ہونے کے بعد اللہ کی رحمت سے نجات پالے گا۔

آیت نمبر (۲۵) وَبَشِّرِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ؕ كُلَّمَا رُزِقُوْا مِنْهَا مِنْ ثَمَرَةٍ رِّزْقًا ۙ قَالُوْا هٰذَا الَّذِيْ رُزِقْنَا مِنْ قَبْلُ ۙ وَاُتُوْا بِهٖ مُتَشَابِهًا ؕ وَلَهُمْ فِيْهَآ اَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ ۙ وَّهُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۲۵﴾

ترجمہ: ''اور خوشخبری دے دو ان لوگوں کو جو ایمان لائے اور جنہوں نے نیک عمل کیے، کہ یقیناً ان کے لیے باغات ہیں، جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں۔ جب بھی ان میں سے کوئی پھل انہیں کھانے کے لیے دیا جائے گا، تو وہ کہیں گے: یہ تو وہی ہے جو ہمیں پہلے بھی دیا گیا تھا اور انہیں (ایسا) پھل دیا جائے گا جو ملتا جلتا ہوگا۔ اور ان کے لیے وہاں پاکیزہ بیویاں ہوں گی اور وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے''۔

تفسیر

ایمان والوں کے لیے جنت کی خوشخبری

ان آیات میں ایمان والوں کو خوشخبری سنائی جارہی ہے۔ وہ لوگ جو اس قرآن پر ایمان لاتے ہیں، اسے اللہ تعالیٰ کا کلام مانتے ہیں، حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اللہ کا برحق رسول تسلیم کرتے ہیں، اور آخرت پر یقین رکھتے ہوئے دنیا کی زندگی قرآن کے مطابق گزارتے ہیں، نیک اعمال کرتے ہیں، ان کے لیے آخرت میں جنت کے باغات ہوں گے جہاں طرح طرح کی نعمتیں ان کے استقبال کے لیے موجود ہوں گی۔

جنت

لغوی اعتبار سے جنت کے معنیٰ ہیں ''باغ''، لیکن شرعی اصطلاح میں یہ وہ دائمی مقام ہے جو اہل ایمان کو آخرت میں عطا کیا جائے گا۔ جنت میں جب اہل جنت کو ایک بار پھل دیے جائیں گے، پھر دوسری مرتبہ دیے جائیں گے تو وہ دیکھنے میں بالکل پہلے جیسے ہوں گے۔ جنتی کہیں گے: * یہ تو وہی پھل ہیں جو ہمیں پہلے مل چکے ہیں، مگر جب کھائیں گے تو ذائقہ ہر بار مختلف پائیں گے۔ یعنی جنت کے پھل شکل میں ایک دوسرے سے ملتے جلتے ہوں گے مگر ہر

پھل کا ذائقہ جدا گانہ ہوگا۔ بعض مفسرین نے یہ بھی لکھا ہے کہ جنت کے پھل صورت میں دنیا کے پھلوں کی طرح ہوں گے اور جب جنتی انہیں دیکھیں گے تو دنیا کے پھل یاد آئیں گے، لیکن ذائقہ دنیا سے کہیں بڑھ کر اور انوکھا ہوگا۔

اہل جنت کو صرف عمدہ مکانات، خوش ذائقہ میوے اور انواع واقسام کی لذتیں ہی نہیں ملتیں، بلکہ ان کے سکون وراحت کے لیے پاکیزہ حوریں بھی ہوں گی۔ وہ ہر طرح کی ظاہری وباطنی آلائشوں سے پاک ہوں گی۔ ظاہری نجاستیں جیسے میل کچیل، پاخانہ، پیشاب، حیض ونفاس وغیرہ اور باطنی برائیاں جیسے بدنیتیاں اور بری عادتیں سب وہاں مفقود ہوں گی۔ ان تمام نعمتوں کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ دائمی ہوں گی اور کبھی ختم نہ ہوں گی۔

حضرت ابو ہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''میں نے اپنے نیک بندوں کے لیے ایسی نعمتیں تیار کی ہیں جنہیں نہ کسی آنکھ نے دیکھا، نہ کسی کان نے سنا اور نہ کسی دل میں ان کا تصور گزرا''۔ (بخاری: ۳۲۴۴)

اہل جنت کا حال

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: جنت میں داخل ہونے والا پہلا گروہ چودھویں رات کے چاند کی مانند روشن ومنور ہوگا۔ ان پر تھوک، ناک کی رطوبت اور پاخانے پیشاب جیسی آلائشوں کا کوئی اثر نہ ہوگا۔ ان کے برتن سونے کے ہوں گے، اور کنگھیاں سونے اور چاندی کی۔ ان کے چولہوں میں عود کی خوشبودار لکڑیاں جلائی جائیں گی۔ جنت کی حوریں اس قدر حسین ہوں گی کہ ان کی پنڈلیوں کی ہڈی کا گودا بھی باہر سے جھلکتا دکھائی دے گا۔ جنتی آپس میں بغض وکینہ سے پاک ہوں گے، ان کے دل ایک ہوں گے، اور وہ صبح وشام اللہ کی تسبیح بیان کریں گے۔ (بخاری: ۳۲۴۵)

آیت نمبر (۲۶) اِنَّ اللّٰهَ لَا يَسْتَحْيٖٓ اَنْ يَّضْرِبَ مَثَلًا مَّا بَعُوْضَةً فَمَا فَوْقَهَا ؕ فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فَيَعْلَمُوْنَ اَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ ۚ وَاَمَّا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَيَقُوْلُوْنَ مَاذَآ اَرَادَ اللّٰهُ بِهٰذَا مَثَلًا ۘ يُضِلُّ بِهٖ كَثِيْرًا ۙ وَّيَهْدِيْ بِهٖ كَثِيْرًا ؕ وَمَا يُضِلُّ بِهٖٓ اِلَّا الْفٰسِقِيْنَ ۙ﴿۲۶﴾

ترجمہ: ''بے شک اللہ نہیں شرماتا کہ مثال بیان کرے کسی بھی چیز کی، چاہے مچھر کی ہو یا اس سے بھی زیادہ (حقیر چیز کی)، تو وہ لوگ جو ایمان لائے، وہ جانتے ہیں کہ بے شک یہ (مثال) ان کے رب کی طرف سے حق ہے، اور وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا، وہ کہتے ہیں: اللہ نے اس مثال سے کیا ارادہ کیا؟ وہ گمراہ کرتا ہے اس سے بہت سوں کو، اور ہدایت دیتا ہے اس سے بہت سوں کو اور وہ گمراہ نہیں کرتا اس سے مگر فاسقوں ہی کو''۔

تفسیر جب اللہ تعالیٰ نے منافقین کی مثالیں بیان فرمائیں: ''كَمَثَلِ الَّذِي اسْتَوْقَدَ نَارًا'' اور ''أَوْ كَصَيِّبٍ مِّنَ السَّمَاءِ'' تو منافقین نے کہا کہ اللہ جیسی بلند و برتر ہستی کے شایانِ شان نہیں کہ ایسی مثالیں بیان کرے۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیات نازل فرمائیں کہ بلاشبہ اللہ تعالیٰ کو اس بات سے کوئی عار نہیں کہ وہ چاہے تو مچھر کی مثال دے یا اس سے بھی زیادہ حقیر چیز کی، کیونکہ مثال کا مقصد اصل بات کو واضح کرنا ہوتا ہے۔

حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ جب مکھی کے بارے میں فرمایا گیا کہ اگر وہ ان کے معبودوں سے کچھ چھین لے تو وہ اسے واپس نہیں لے سکتے، یا مکڑی کے جالے کی مثال بیان کی گئی تو کفار نے کہا: دیکھو، محمد ﷺ پر جو کلام نازل ہوا ہے اس میں مکھی اور مکڑی جیسی حقیر مخلوقات کا ذکر ہے! ان چھوٹی چیزوں کا تذکرہ اللہ کے کلام کے شایانِ شان کیسے ہوسکتا ہے؟ اس پر اللہ تعالیٰ نے ان کی نادانی کا جواب دیتے ہوئے یہ آیات نازل فرمائیں۔

کافروں کا اعتراض

کافروں کا اعتراض یہ تھا کہ قرآن میں مکڑی، مچھر اور ایسی کمتر مخلوقات کی مثالیں کیوں دی گئی ہیں؟ اگر یہ اللہ کا کلام ہوتا تو ان حقیر چیزوں کا ذکر نہ آتا۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ مثال کا مقصد بات کو صاف طور پر سمجھانا ہوتا ہے۔ اور جب کسی جھوٹے مذہب کی کمزوری اور بت پرستی کی بے بسی کو واضح کرنا مقصود ہو تو اس کے لئے کم تر اور حقیر مخلوق سے بہتر مثال نہیں ہوسکتی۔ اس لئے ایسی مثالیں دراصل کافروں کے دین کی کمزوری کو نمایاں کرنے کے لئے زیادہ موزوں ہیں۔

پس، کافروں کا یہ اعتراض محض ان کی کوتاہ فہمی اور کم عقلی کی دلیل ہے۔ اہلِ ایمان کے دلوں میں اس طرح کے وسوسے نہیں اٹھتے۔ وہ تو اس پر کامل یقین رکھتے ہیں کہ اللہ ہی معبودِ حقیقی ہے، محمد ﷺ اللہ کے سچے رسول ہیں اور قرآن اللہ کا ہی کلام ہے۔ اعتراض وہی کرتے ہیں جن کے دل کفر کی وجہ سے مردہ ہو چکے ہیں اور جن میں حق کی تلاش کا جذبہ باقی نہیں رہا۔ وہ صرف اس کوشش میں لگے رہتے ہیں کہ اللہ کے کلام میں کسی نہ کسی طرح کوئی نقص نکالا جائے۔

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ یہ مثالیں کچھ لوگوں کے لئے گمراہی کا سبب بن جاتی ہیں، لیکن بہت سوں کے لئے ہدایت کا ذریعہ بنتی ہیں۔ اور حقیقت یہ ہے کہ اللہ کسی کو بلا وجہ گمراہ نہیں کرتے۔ یہ مثالیں صرف ان لوگوں کے لئے گمراہی کا سبب بنتی ہیں جو فسق و نافرمانی میں ڈوبے رہتے ہیں۔ آگے ان فاسق لوگوں کی مزید صفات اور حقیقت کو واضح کیا گیا ہے کہ وہ کون ہیں جو اللہ سے کئے ہوئے عہد کو توڑ ڈالتے ہیں۔

آیت نمبر (۲۷) الَّذِيْنَ يَنْقُضُوْنَ عَهْدَ اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مِيْثَاقِهٖ ۠ وَيَقْطَعُوْنَ مَآ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖٓ اَنْ يُّوْصَلَ وَيُفْسِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ ۭ اُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ۲۷

ترجمہ: ''جو توڑتے ہیں اللہ کے عہد کو، اُس کے پختہ کر لینے کے بعد اور وہ کاٹتے ہیں اس چیز کو جس کے بارے میں اللہ نے حکم دیا کہ اسے جوڑا جائے، اور وہ زمین میں فساد کرتے ہیں۔ یہی لوگ ہیں جو نقصان اٹھانے والے ہیں''۔

تفسیر

اللہ سے کیا ہوا وعدہ

مفسرین نے لکھا ہے کہ اس آیت میں اللہ کو ماننے کا مطلب یہ ہے کہ بندہ اللہ کو رب تسلیم کرے اور اس کی فرمانبرداری کا اقرار کرے۔ جیسا کہ سورۂ اعراف آیت ۱۲۲ میں بیان ہوا کہ جب عالمِ ارواح میں اللہ تعالیٰ نے حضرت آدمؑ کی پشت سے تمام انسانوں کو پیدا فرمایا اور انہیں عقل وفہم اور گویائی کی قوت عطا کی، تو ان سے عہد لیا: ''اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ'' (کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟) سب نے یک زبان ہو کر کہا: ''بَلٰى'' (کیوں نہیں!)۔

حضرت ابن عباسؓ اور حضرت ابی بن کعبؓ سے روایت ہے کہ اس آیت میں ''عہدُ اللہ'' سے مراد یہی عہدِ الست ہے، جو ہر انسان اور اس کے رب کے درمیان طے پایا تھا۔ اس لئے لازم تھا کہ انسان اپنے رب کو ماننے سے انکار نہ کرتا اور اس کی فرمانبرداری اختیار کرتا۔ لیکن کافروں اور مشرکوں نے اس معاہدے کو توڑ ڈالا اور اللہ کے ساتھ دوسروں کو معبود بنالیا۔

فاسقوں کے اعمال

فاسقوں کی ایک اور علامت یہ بیان ہوئی کہ وہ ان رشتوں اور تعلقات کو کاٹ ڈالتے ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے جوڑنے کا حکم دیا ہے۔ اس میں بندے اور اللہ کے درمیان تعلق بھی شامل ہے اور بندوں کے باہمی حقوق بھی۔ انہی حقوق کو ادا کرنا ہی اصل اسلام ہے، اور ان کو توڑنا فسق وفجور ہے۔

فاسقوں کی تیسری نشانی یہ بیان کی گئی کہ وہ زمین میں فساد برپا کرتے ہیں۔ چاہے وہ کھلے ظلم اور حقوق تلفی کی صورت میں ہو، یا اندرونی فساد کی شکل میں، جیسے کفر کرنا یا نبی اکرم ﷺ سے حسد رکھنا۔ مفسرین نے وضاحت کی ہے کہ جو بھی بات، عمل یا حرکت اللہ کی رضا اور اس کے حکم کے خلاف ہو، وہی اصل فتنہ وفساد ہے۔ اور یہی وہ لوگ ہیں جو درحقیقت گھاٹے اور خسارے میں رہنے والے ہیں۔

منافق کی پہچان

حضرت ابو ہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''منافق کی تین نشانیاں ہیں: جب بولتا ہے تو جھوٹ بولتا ہے، جب امانت سپرد کی جاتی ہے تو خیانت کرتا ہے، اور جب وعدہ کرتا ہے تو وعدہ خلافی کرتا ہے''۔ **(صحیح بخاری: ۳۳)**

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''قطع رحمی کرنے والا جنت میں داخل نہ ہوگا''۔ (بخاری: ۵۹۸۴)

آیت نمبر (۲۸) كَيْفَ تَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَ كُنْتُمْ اَمْوَاتًا فَاَحْيَاكُمْ ۚ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ ثُمَّ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴿۲۸﴾

ترجمہ: ''تم اللہ کے ساتھ کیسے کفر کرتے ہو؟ حالانکہ تم بے جان تھے، پھر اس نے تمہیں زندگی دی، پھر وہی تمہیں موت دے گا، پھر وہی تمہیں زندہ کرے گا، پھر اُسی کی طرف تم لوٹائے جاؤ گے''۔

انسان کی پہلی پیدائش

تفسیر اس آیت میں فرمایا جارہا ہے کہ آخر تم اپنے پیدا کرنے والے مالک کا انکار کس طرح کر سکتے ہو؟ وہی تو ہے جس نے تمہیں عدم سے وجود بخشا۔ تم نطفے کی صورت میں بے جان تھے، تو اللہ تعالیٰ نے تمہیں زندگی عطا کی، تمہارا جسم بنایا اور اس میں روح پھونکی۔ اور یہ صرف ایک مرتبہ کا احسان نہیں کہ مردہ ہونے کے بعد زندگی دی، بلکہ یہ حقیقت بھی ہے کہ جب تمہاری مقررہ مدت پوری ہوجائے گی تو وہی تمہیں موت دے گا، اور پھر دوبارہ زندہ کر کے اپنے حضور لے جائے گا۔ اس وقت تمہارے اعمال ہی تمہارے انجام کا فیصلہ کریں گے۔

دنیا میں اللہ تعالیٰ نے چار بنیادی عناصر پیدا فرمائے: (۱) آگ، (۲) ہوا، (۳) پانی اور (۴) مٹی۔ انہی سے انسان کی غذا تیار ہوتی ہے۔ جب انسان ان چیزوں کو کھاتا ہے تو اس کے جسم میں خون بنتا ہے، اسی خون سے نطفہ وجود میں آتا ہے، پھر یہ نطفہ ماں کے رحم میں ٹھہرتا ہے اور ایک بے جان قطرہ سے مراحل طے کرتا ہوا جمے ہوئے خون کی شکل اختیار کرتا ہے، پھر گوشت کی بوٹی بنتا ہے، پھر اس میں ہڈیاں بنتی ہیں، پھر ان ہڈیوں پر گوشت چڑھایا جاتا ہے، اور آخر کار اس میں جان ڈال دی جاتی ہے۔ اس طرح وہ بے جان قطرہ ایک جاندار وجود میں ڈھلتا ہے اور ماں کے بطن سے اس دنیا میں آتا ہے۔

یہی ہے انسان کی پہلی پیدائش کہ اللہ تعالیٰ نے اسے بے جان نطفے سے جاندار بنایا، پھر اس کی ایک مقررہ عمر مقرر کی۔ جب وہ عمر پوری ہوجائے تو موت دیتا ہے، اور ایک طے شدہ وقت کے بعد قیامت کے دن دوبارہ سب کو زندہ کرے گا۔

آیت نمبر (۲۹) هُوَ الَّذِيْ خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا ۚ ثُمَّ اسْتَوٰۤى اِلَى السَّمَآءِ فَسَوّٰىهُنَّ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ ؕ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴿۲۹﴾

ترجمہ: ''وہی ہے (اللہ) جس نے تمہارے لیے پیدا کیا جو کچھ زمین میں ہے، سب کچھ، پھر اس نے

توجہ فرمائی آسمان کی طرف، چنانچہ انہیں ٹھیک کر کے بنا دیا سات آسمان اور وہ ہر چیز کو خوب جاننے والا ہے"۔

تفسیر

زمین و آسمان کی پیدائش

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اس نے آسمان اور زمین کو وجود بخشا اور زمین میں جو کچھ ہے وہ سب تمہارے لیے پیدا کیا، تاکہ تم شریعت کے مطابق ان سے فائدہ اٹھا سکو۔ صرف زمین ہی انسان کے لیے عظیم نعمت ہے، اور انسان اس کے اندر پائی جانے والی بے شمار چیزوں سے استفادہ کرتا ہے، جنہیں شمار کرنا ممکن نہیں۔

گزشتہ آیات سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ سب سے پہلے زمین کو بنایا گیا، پھر اس پر پہاڑ جما دیے گئے۔ اس کے بعد سات آسمان تخلیق کیے گئے جو اس سے قبل دھوئیں کی صورت میں تھے۔ پھر زمین کو اس کی موجودہ حالت میں بچھا دیا گیا۔ قرآن مجید نے سورہ حم السجدہ میں اس کی وضاحت کی ہے کہ آسمانوں کو دھوئیں کی حالت سے نکال کر سات آسمانوں کی صورت دی گئی اور انہیں بہترین انداز میں بنایا گیا، جن میں نہ کوئی دراڑ ہے، نہ کوئی کمی۔ ساتوں آسمان تہہ بہ تہہ ایک کامل نظام کے ساتھ قائم ہیں جن میں نقص یا خلل کا کوئی شائبہ تک نہیں۔

یہ وسیع و عریض آسمان، یہ عظیم و بے پایاں زمین اور ان میں جو کچھ موجود ہے، جو کبھی تھا یا جو آنے والا ہے بی سب کا علم صرف اور صرف اللہ ہی کے پاس ہے۔ اور وہی اپنے ہر بندے کو اس کے عقیدے اور عمل کے مطابق جزا یا سزا دے گا۔

❁❁❁

ترجمہ- آیت نمبر ۳۰ سے ۳۹ تک

وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّيْ جَاعِلٌ فِي الْاَرْضِ خَلِيْفَةً ؕ قَالُوْٓا اَتَجْعَلُ فِيْهَا مَنْ يُّفْسِدُ فِيْهَا وَيَسْفِكُ الدِّمَآءَ ۚ وَنَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ ؕ قَالَ اِنِّيْٓ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۳۰﴾ وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَى الْمَلٰٓئِكَةِ ۙ فَقَالَ اَنْۢبِـُٔوْنِيْ بِاَسْمَآءِ هٰٓؤُلَآءِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۳۱﴾ قَالُوْا سُبْحٰنَكَ لَا عِلْمَ لَنَآ اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا ؕ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ ﴿۳۲﴾ قَالَ يٰٓاٰدَمُ اَنْۢبِئْهُمْ بِاَسْمَآئِهِمْ ۚ فَلَمَّآ اَنْۢبَاَهُمْ بِاَسْمَآئِهِمْ ۙ قَالَ اَلَمْ اَقُلْ لَّكُمْ اِنِّيْٓ اَعْلَمُ غَيْبَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۙ وَاَعْلَمُ مَا تُبْدُوْنَ وَمَا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ ﴿۳۳﴾ وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ ؕ اَبٰى وَاسْتَكْبَرَ ۫ وَكَانَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۳۴﴾ وَقُلْنَا يٰٓاٰدَمُ اسْكُنْ اَنْتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ وَكُلَا مِنْهَا رَغَدًا حَيْثُ شِئْتُمَا ۪ وَلَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ فَتَكُوْنَا مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۳۵﴾ فَاَزَلَّهُمَا الشَّيْطٰنُ عَنْهَا فَاَخْرَجَهُمَا مِمَّا كَانَا فِيْهِ ۪ وَقُلْنَا اهْبِطُوْا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ ۚ وَلَكُمْ فِي الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّمَتَاعٌ اِلٰى حِيْنٍ ﴿۳۶﴾ فَتَلَقّٰٓى اٰدَمُ مِنْ رَّبِّهٖ كَلِمٰتٍ فَتَابَ عَلَيْهِ ؕ اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ﴿۳۷﴾ قُلْنَا اهْبِطُوْا مِنْهَا جَمِيْعًا ۚ فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّيْ هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۳۸﴾ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَآ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۳۹﴾

ترجمہ:

(۳۰)۔اور یاد کرو جب تمہارے رب نے فرشتوں سے کہا: یقیناً میں زمین میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں۔ (تو فرشتوں نے) کہا: کیا تو بنائے گا اس (زمین) میں اس کو جو فساد کرے گا اس میں اور خون بہائے گا؟ حالانکہ ہم تیری حمد کے ساتھ تسبیح کرتے ہیں اور تیری پاکیزگی بیان کرتے ہیں۔ (اللہ نے) فرمایا: بے شک میں جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے۔(۳۱)۔اور سکھا دیے آدمؑ کو تمام چیزوں کے نام، پھر پیش کیا انہیں فرشتوں کے سامنے، اور فرمایا: "اگر تم سچے ہو تو بتاؤ ان کے نام۔(۳۲)۔انہوں نے کہا: پاک ہے تیری ذات! ہمیں کوئی علم نہیں مگر وہی جو تو نے ہمیں سکھایا، بے شک تو ہی سب کچھ جاننے والا، بڑی حکمت والا ہے۔(۳۳)۔اللہ نے فرمایا: اے آدمؑ! بتاؤ انہیں ان چیزوں کے نام۔ پھر جب آدمؑ نے انہیں ان کے نام بتا دیے، تو اللہ نے فرمایا: کیا میں نے تم سے نہیں کہا تھا کہ بے شک میں جانتا ہوں آسمانوں اور زمین کی چھپی باتیں اور میں وہ بھی جانتا ہوں جو تم ظاہر کرتے ہو اور وہ بھی جو تم چھپاتے ہو؟(۳۴)۔

اور جب ہم نے فرشتوں سے کہا: سجدہ کرو آدمؑ کو، تو سب نے سجدہ کیا، سوائے ابلیس کے؛ اس نے انکار کیا، تکبر کیا اور وہ کافروں میں سے ہو گیا۔ (۳۵)۔ اور ہم نے کہا: اے آدمؑ! تم اور تمہاری بیوی جنت میں رہو اور وہاں سے جو چاہو سکون سے کھاؤ، لیکن اس درخت کے قریب نہ جانا، ورنہ تم دونوں ظالموں میں شمار ہو گے۔ (۳۶)۔ پھر شیطان نے ان دونوں کو اس درخت کے ذریعے پھسلا دیا اور انہیں اس (جنت کی) حالت سے نکال دیا جس میں وہ تھے۔ اور ہم نے فرمایا: اتر جاؤ تم سب یہاں سے، تم ایک دوسرے کے دشمن ہو اور زمین میں تمہارے لیے ایک وقت تک ٹھہرنے کی جگہ اور (زندگی کے) فائدے ہیں۔ (۳۷)۔ پھر آدمؑ نے اپنے رب سے کچھ کلمات سیکھ لیے (جن کے ذریعے توبہ کی)، تو اللہ نے ان کی توبہ قبول فرمالی۔ بے شک وہی بہت توبہ قبول کرنے والا، بڑا مہربان ہے۔ (۳۸)۔ ہم نے فرمایا: تم سب یہاں سے اتر جاؤ، پھر اگر میری طرف سے تمہارے پاس کوئی ہدایت آئے، تو جو لوگ میری ہدایت کی پیروی کریں گے، ان پر نہ کوئی خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔ (۳۹)۔ اور جو لوگ کفر کریں گے اور ہماری آیات کو جھٹلائیں گے، وہی دوزخی ہیں، وہ ہمیشہ اس میں رہیں گے۔

تفسیر- آیت نمبر ۳۰ سے ۳۹ تک

آیت نمبر (۳۰) وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّيْ جَاعِلٌ فِي الْاَرْضِ خَلِيْفَةً ۭ قَالُوْٓا اَتَجْعَلُ فِيْهَا مَنْ يُّفْسِدُ فِيْهَا وَيَسْفِكُ الدِّمَاۗءَ ۚ وَنَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ ۭ قَالَ اِنِّىْٓ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ۝۳۰

ترجمہ: ''اور یاد کرو جب تمہارے رب نے فرشتوں سے کہا: یقیناً میں زمین میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں۔ (تو فرشتوں نے) کہا: کیا تو بنائے گا اس (زمین) میں اس کو جو فساد کرے گا اس میں اور خون بہائے گا؟ حالانکہ ہم تیری حمد کے ساتھ تسبیح کرتے ہیں اور تیری پاکیزگی بیان کرتے ہیں۔ (اللہ نے) فرمایا: بے شک میں جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے''۔

تفسیر

حضرت آدمؑ کی پیدائش

قرآنِ مجید میں حضرت آدمؑ کا ذکر تقریباً پچیس جگہ مذکور ہے۔ انبیائے کرام کے تذکروں میں سب سے پہلا نام حضرت آدمؑ ہی کا ہے جن کا نام درج ذیل سورتوں میں موجود ہے، جیسے:

(۱) سورہ بقرہ (۲) سورہ اعراف (۳) سورہ بنی اسرائیل (۴) سورہ کہف (۵) سورہ طٰہٰ (۶) سورہ حجر (۷)

سورہ صٓ (۸) سورہ آل عمران (۹) سورہ مائدہ (۱۰) سورہ مریم (۱۱) سورہ یٰسٓ۔

اوپر بیان کردہ آیات میں حضرت آدمؑ کے ذکر کا خلاصہ اس طرح ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے حضرت آدمؑ کی تخلیق کا ارادہ فرمایا تو فرشتوں سے فرمایا کہ ''میں زمین پر اپنا خلیفہ بنانے والا ہوں''۔ یہ سن کر فرشتوں نے عرض کیا کہ اگر انسان کی پیدائش کا مقصد صرف تسبیح وتقدیس ہے تو ہم تو پہلے ہی اس خدمت پر قائم ہیں۔ پھر ایسی مخلوق کو پیدا کرنے کی کیا حکمت ہے جو نیک بھی ہوگی اور بدی وخونریزی کی مرتکب بھی؟

اللہ تعالیٰ نے اس کے جواب میں فرمایا کہ تم آدمؑ کی تخلیق اور زمین میں خلافت کی اصل حقیقت اور اس کی حکمت سے ناواقف ہو، اس کا کامل علم صرف میرے پاس ہے۔

اس کے بعد دوسرا جواب یہ دیا گیا کہ جب حضرت آدمؑ کو تمام اشیاء کے نام سکھائے گئے اور انہوں نے انہیں فرشتوں کے سامنے بیان کردیا، تو یوں یہ حقیقت آشکار ہوگئی کہ اللہ نے آدمؑ کو خصوصی علم عطا فرمایا ہے۔ اس طرح فرشتوں پر بھی حضرت آدمؑ کی عظمت اور اپنی محدودیت ظاہر ہوگئی۔

آیت نمبر (۳۱-۳۳) وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَى الْمَلٰٓئِكَةِ ۙ فَقَالَ اَنْۢبِـُٔوْنِيْ بِاَسْمَآءِ هٰٓؤُلَآءِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۳۱﴾ قَالُوْا سُبْحٰنَكَ لَا عِلْمَ لَنَآ اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا ؕ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ ﴿۳۲﴾ قَالَ يٰٓاٰدَمُ اَنْۢبِئْهُمْ بِاَسْمَآئِهِمْ ۚ فَلَمَّآ اَنْۢبَاَهُمْ بِاَسْمَآئِهِمْ ۙ قَالَ اَلَمْ اَقُلْ لَّكُمْ اِنِّيْٓ اَعْلَمُ غَيْبَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۙ وَاَعْلَمُ مَا تُبْدُوْنَ وَمَا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ ﴿۳۳﴾

ترجمہ: ''اور سکھا دیے آدمؑ کو تمام چیزوں کے نام، پھر پیش کیا انہیں فرشتوں کے سامنے، اور فرمایا: اگر تم سچے ہو تو بتاؤ ان کے نام۔ انہوں نے کہا: پاک ہے تیری ذات! ہمیں کوئی علم نہیں مگر وہی جو تو نے ہمیں سکھایا، بے شک تو ہی سب کچھ جاننے والا، بڑی حکمت والا ہے۔ اللہ نے فرمایا: اے آدمؑ! بتاؤ انہیں ان چیزوں کے نام۔ پھر جب آدمؑ نے انہیں ان کے نام بتا دیے، تو اللہ نے فرمایا: کیا میں نے تم سے نہیں کہا تھا کہ بے شک میں جانتا ہوں آسمانوں اور زمین کی چھپی باتیں اور میں وہ بھی جانتا ہوں جو تم ظاہر کرتے ہو اور وہ بھی جو تم چھپاتے ہو؟''۔

تفسیر

حضرت آدمؑ کا ذکر

اللہ تعالیٰ نے حضرت آدمؑ کو پیدا فرما کر انہیں بے شمار علوم عطا کیے۔ زمین کی مختلف اشیاء اور ان کی خصوصیات کا

علم دیا اور پھر فرشتوں کے سامنے وہ چیزیں پیش کر کے فرمایا: ''بتاؤ! ان کے نام کیا ہیں؟'' فرشتے عاجز آ گئے اور اپنی ناتوانی کا اعتراف کرتے ہوئے عرض کیا کہ ''ہم اتنا ہی جانتے ہیں جتنا آپ نے ہمیں سکھایا''۔ تب اللہ تعالیٰ نے حضرت آدمؑ کو حکم دیا کہ فرشتوں کو ان چیزوں کے نام بتائیں۔ چنانچہ حضرت آدمؑ نے سب کے نام بیان کر دیے۔ یوں حضرت آدمؑ کی فضیلت ثابت ہوئی اور انہیں معلم کا مرتبہ ملا، جبکہ فرشتے طالب علم کے درجے پر قرار پائے۔

اس واقعے سے یہ حقیقت واضح ہوئی کہ فرشتوں کو بھی علمِ غیب حاصل نہیں، اور یہ بھی کہ عالم کا مقام محض عبادت گزار سے بلند تر ہے۔ جب اللہ تعالیٰ نے آدمؑ کی برتری ظاہر فرمانا چاہی تو انہیں علم میں زیادتی عطا کی، جس کے سامنے فرشتوں کو اپنی کمی کا اعتراف کرنا پڑا۔

احادیث میں چند بڑے فرشتوں کے نام اور ذمہ داریاں اس طرح بیان کی گئی ہیں:

۱۔ حضرت جبرائیلؑ (نبیوں پر وحی لانے والے)
۲۔ حضرت میکائیلؑ (مخلوق تک رزق پہنچانے والے)
۳۔ حضرت عزرائیلؑ (روحوں کو قبض کرنے والے)
۴۔ حضرت اسرافیل (قیامت کے دن صور پھونکنے والے)

اس طرح جب حضرت آدمؑ کی فضیلت اور ان کے اندر خلافت کے لئے ضروری علم کا ہونا ظاہر ہو گیا تو اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو حکم دیا کہ وہ حضرت آدمؑ کو سجدۂ تعظیمی کریں۔ یہ اس بات کی کھلی دلیل تھی کہ حضرت آدمؑ کو فرشتوں پر برتری حاصل ہے، جس کا تذکرہ آگے کی آیات میں کیا گیا ہے۔

آیت نمبر (۳۴) وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ ؕ اَبٰى وَاسْتَكْبَرَ ۫ وَكَانَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۳۴﴾

ترجمہ: ''اور جب ہم نے فرشتوں سے کہا: سجدہ کرو آدمؑ کو، تو سب نے سجدہ کیا، سوائے ابلیس کے؛ اس نے انکار کیا، تکبر کیا اور وہ کافروں میں سے ہو گیا''۔

تفسیر

حضرت آدمؑ کے لئے سجدہ

جب حضرت آدمؑ کی فضیلت اور برتری فرشتوں پر واضح ہو گئی تو اللہ تعالیٰ نے انہیں حکم دیا کہ وہ آدمؑ کو سجدہ کریں۔ یہ حکم اس سے پہلے بھی دیا جا چکا تھا، جیسا کہ سورہ حجر اور سورہ صٓ میں مذکور ہے: ''جب میں اسے درست کر لوں

اور اس میں اپنی روح پھونک دوں، تو تم اس کے سامنے سجدہ میں گر جانا''۔

چنانچہ جب آدمؑ کی افضلیت کا علم ظاہر ہوا تو پہلے دیے گئے حکم کو دہرا دیا گیا، تاکہ فرشتے اپنے علم کے ذریعے ان کی برتری کو تسلیم کریں۔ اس حکم کی تعمیل میں تمام فرشتوں نے سجدہ کیا، مگر ابلیس نے انکار کر دیا۔

سجدۂ تعظیمی کی حقیقت

یہ بات سبھی مسلمانوں کے نزدیک مسلم ہے کہ وہ سجدہ عبادت کے لئے نہ تھا، کیونکہ عبادت تو صرف اور صرف اللہ تعالیٰ ہی کے لئے مخصوص ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ سجدہ کس نوعیت کا تھا؟ اس سلسلے میں مفسرین نے تین آراء بیان کی ہیں:

۱۔ بعض علماء کے نزدیک یہ سجدہ دراصل اللہ ہی کے لئے تھا، حضرت آدمؑ تو صرف ''قبلہ'' کی حیثیت رکھتے تھے۔ جیسے خانہ کعبہ کو قبلہ بنایا گیا ہے اور اس سے کعبہ کی فضیلت ظاہر ہوتی ہے، اسی طرح حضرت آدمؑ کا رُخ کرنا ان کے شرف کو نمایاں کرتا ہے۔

۲۔ بعض علماء کے نزدیک یہ سجدہ براہِ راست حضرت آدمؑ کے لئے تھا، مگر یہ سجدہ تعظیمی تھا، عبادت کا نہ تھا۔ اس کی مثال قرآن میں حضرت یوسفؑ کے بھائیوں کے سجدے سے ملتی ہے۔ **(بیضاوی)**

۳۔ تیسری رائے یہ ہے کہ چونکہ یہ سجدہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے کیا گیا تھا، لہٰذا دراصل یہ اللہ کے حکم کی اطاعت تھی۔ اگر اسے تعظیمی سجدہ تسلیم بھی کیا جائے تو یہ پچھلی شریعتوں میں جائز تھا۔ البتہ کسی کو معبود سمجھ کر سجدہ کرنا ہر شریعت میں حرام رہا ہے۔ شریعتِ محمدی میں تو یہ اصول اور بھی سخت کر دیا گیا کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو کسی بھی صورت میں سجدہ جائز نہیں۔

سجدے کی شرعی حیثیت

لفظ ''سجدہ'' کے لغوی معنٰی ہیں سر جھکا کر ادب و فرمانبرداری کا اظہار کرنا۔ مگر شریعت کی اصطلاح میں سجدہ کا مطلب ہے پیشانی زمین پر رکھنا۔ چونکہ یہ عزت و تعظیم کا سب سے اعلیٰ درجہ ہے، اس لئے اسلام میں اس عمل کو صرف اللہ تعالیٰ کے لئے خاص کر دیا گیا ہے۔

گزشتہ شریعتوں میں سجدۂ تعظیمی یعنی عزت کے طور پر جھک جانا جائز تھا۔ جیسا کہ سورہ یوسف میں بیان ہے کہ حضرت یوسفؑ کے والدین اور بھائیوں نے انہیں سجدہ کیا۔ اس وقت یہ سجدہ دراصل سلام اور تعظیم کے طور پر رائج تھا۔ لیکن شریعتِ محمدی میں یہ عمل ہمیشہ کے لئے ممنوع قرار دے دیا گیا۔

ایک حدیث میں حضرت معاذ بن جبلؓ بیان کرتے ہیں کہ میں نے شام کے لوگوں کو اپنے سرداروں اور علماء

کے سامنے سجدہ کرتے دیکھا۔ میں نے عرض کیا: ''یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! آپ تو ان سے زیادہ حقدار ہیں کہ آپ کو سجدہ کیا جائے۔'' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''اگر میں کسی انسان کو کسی دوسرے انسان کے سامنے سجدہ کرنے کی اجازت دیتا، تو عورت کو حکم دیتا کہ وہ اپنے شوہر کو سجدہ کرے، کیونکہ شوہر کا اپنی بیوی پر بڑا حق ہے''۔ (جامع ترمذی:۱۱۵۹)

ابلیس کے معنیٰ

ابلیس کے لفظی معنیٰ ہیں: ''مایوسی کے سبب غمگین اور حیرت زدہ ہوجانا''۔ یہ شیطان کا لقب ہے، جب کہ اس کا اصل نام 'عزازیل' تھا۔ چونکہ وہ اللہ کی رحمت سے ہمیشہ کے لئے ناامید ہوگیا، اس لئے اسے ''ابلیس'' کہا گیا۔

ابلیس دراصل فرشتہ نہ تھا بلکہ جنّات میں سے تھا، کیونکہ اسے آگ سے پیدا کیا گیا تھا۔ اپنی غیر معمولی عبادت اور علم کی کثرت کی وجہ سے اسے فرشتوں کی جماعت میں شامل کرلیا گیا تھا۔

جب اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو حکم دیا کہ وہ حضرت آدمؑ کے سامنے سجدہ کریں تو ابلیس بھی، فرشتوں کے ساتھ رہنے کی وجہ سے، اس حکم کا مخاطب ہوا۔ لیکن اس نے اللہ کے حکم کی تعمیل سے انکار کردیا اور تکبر میں آگیا۔ جیسا کہ قرآن کریم میں کئی مقامات پر بیان ہوا ہے، اللہ تعالیٰ نے اس سے پوچھا: ''جب میں نے تجھے حکم دیا تو تجھے کس چیز نے سجدہ کرنے سے روکا؟''

ابلیس نے جواب دیا: ''میں آدم سے بہتر ہوں۔ آپ نے مجھے آگ سے پیدا کیا اور اسے مٹی سے''۔

اس کے جواب کا مطلب یہ تھا کہ آگ مٹی سے برتر ہے، لہٰذا میں مٹی سے بنے ہوئے انسان کے آگے کیسے جھکوں؟ یہی گھمنڈ اور نافرمانی اس کے زوال اور اللہ کی رحمت سے محرومی کا سبب بن گئی۔

ابلیس نے تین بڑے کفر کیے: (۱) اللہ کے حکم کو ماننے سے انکار کیا۔ (۲) اللہ کی حکمت کو ناقص سمجھا اور اپنی عقل کو برتر جانا۔ (۳) اپنی سرکشی کو اللہ کے حکم سے بہتر عمل قرار دیا۔

قرآن مجید میں اس کے کافر ہوجانے کے لئے دو الفاظ استعمال ہوئے ہیں: ''أبیٰ'' اور ''استکبر''۔

''أبیٰ'' کا مطلب ہے ضد اور ہٹ دھرمی کے ساتھ انکار کرنا۔ اس سے یہ بات واضح ہوئی کہ جو شخص اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حکم کو جان بوجھ کر برا سمجھے، اس میں عیب نکالے یا اس کا انکار کرے، وہ بھی اسی جرم کا مرتکب ہے۔

''إستکبر'' کے معنیٰ ہیں تکبر کرنا، یعنی اپنے آپ کو بڑا سمجھتے ہوئے دوسرے کو حقیر جاننا۔ یہی وہ مرض ہے جس نے ابلیس کو ہمیشہ کے لئے گمراہ اور ملعون بنادیا۔

اللہ تعالیٰ جمال کو پسند کرتا ہے

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''وہ شخص جنت میں داخل نہ ہوگا

جس کے دل میں ذرہ برابر بھی گھمنڈ ہوگا''۔ یہ سن کر ایک صحابیؓ نے عرض کیا: یا رسول اللہ! ہر شخص یہ چاہتا ہے کہ اس کا لباس اچھا ہو اور اس کا جوتا عمدہ ہو۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''اللہ خود جمیل ہے اور حسن و جمال کو پسند کرتا ہے۔ گھمنڈ یہ نہیں کہ انسان اچھی چیزیں استعمال کرے، بلکہ گھمنڈ یہ ہے کہ حق کو ٹھکرا دیا جائے اور لوگوں کو حقیر سمجھا جائے''۔ (صحیح مسلم:۲۶۵)

گھمنڈ یا تکبر کے نتائج

۱۔ ابلیس کی مثال: گھمنڈ ایک ایسا گناہ ہے جس نے ابلیس کو اللہ کے دربار سے رسوا ہو کر نکلوا دیا۔ لہٰذا غرور ہمیشہ ذلت اور بربادی کا سبب بنتا ہے۔

۲۔ اللہ کی رضا پر راضی رہنا: بندے کے لئے لازم ہے کہ اللہ کی مرضی پر راضی رہے۔ شیطان نے اللہ کے فیصلے کو تسلیم نہ کیا اور اسی سرکشی کا انجام اس کی بربادی نکلا۔

۳ علم و عبادت پر غرور نہ کرنا: انسان کو اپنے علم، عبادت یا ایمان پر کبھی فخر نہیں کرنا چاہئے، کیونکہ اصل کامیابی کا دارومدار انجام پر ہے۔ شیطان نے ہزاروں برس عبادت کی، مگر آخر کار اس کا غرور اسے ہلاکت کی وادی میں لے گیا۔

۴۔ اللہ کے حکم کی اطاعت: اللہ کے حکم کی نافرمانی اور اس میں اپنی رائے داخل کرنا بڑا گناہ ہے۔ اس کے کسی حکم پر تاخیر یا سستی کرنا درست نہیں۔ فرشتوں نے جب حکم پایا تو فوراً سجدے میں گر گئے، اس طرح اطاعت کی اصل مثال قائم کی۔

۵۔ گناہ کا وبال: بعض اوقات کوئی گناہ اتنا شدید ہوتا ہے کہ اللہ کی مدد انسان سے چھن جاتی ہے۔ پھر اس کے تمام اعمال اور کوششیں اسے ہدایت کے بجائے مزید گمراہی کی طرف دھکیل دیتی ہیں۔

اس آیت سے متعلق بعض غیر مسلموں کے اشکالات کا جواب:

وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ: اس واقعے میں سجدہ شرک نہیں بلکہ اللہ کے حکم کے تحت آدم کی عظمت و منصبِ خلافت اور ان کی تعلیم و امتیاز کا اظہار تھا۔ سجدہ اللہ کے حکم کی تعمیل تھا نہ کہ آدم کو الٰہ سمجھ کر عبادت۔ جسے اللہ نے حکم دیا وہ خدا کی اطاعت ہے، اس لیے شرک کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔

قرآن میں یہی واقعہ کئی مقامات پر آیا ہے جیسے سورہ البقرہ آیت نمبر ۳۴ میں، سورہ الاعراف آیت نمبر ۱۱، ۱۲ سورہ الحجر اور سورہ ص آیت نمبر ۷۱ تا ۸۵ میں بھی تفصیل ملتی ہے اور سورۃ الکہف آیت نمبر ۵۰ میں یہ بھی آیا ہے کہ اِبلیس جِنّوں میں سے تھا۔ اسی طرح قرآن واضح طور پر صرف اللہ کی عبادت کا حکم دیتا ہے اور کسی مخلوق کو الٰہ ٹھہرانا منع کرتا ہے۔ اسی متن میں سجدہ کا حکم اللہ کے حکمِ اطاعت کے طور پر آیا۔ (یعنی عمل کی سمت اللہ کی ہدایت ہے، نہ کہ مخلوق کی تعظیم کو عبادت سمجھا گیا ہے)۔

سجدہ کا مطلب عربی کلمہ ''اسجدوا'' کا بنیادی معنیٰ جھک جانا/سر جھکانا ہے یہ ہر صورت میں ''عبادتِ خالصہ'' کا لازمی نام نہیں ہوتا، اس کے معنیٰ اور مقصد سیاق سے طے ہوتے ہیں۔ اللہ جب حکم دیتا ہے تو اس فرمان کا اطاعت کے ذریعے احترام و اعتراف دکھانا مراد ہوتا ہے۔ مذہبی لحاظ سے ''عبادت'' کا مفہوم وہ ہے جو صرف اللہ کے لیے مخصوص صفات (خضوع، طلبِ معونت، پرستش) کے ساتھ کیا جائے۔ جب سجدہ اللہ کے حکم پر کیا جائے تو وہ دراصل حکمِ الٰہی کی تعمیل ہے، نہ کہ مخلوق کو معبود قرار دینا۔

عقلی نقطۂ نظر سے یہ ہے کہ جس کا ذکر سورہ بقرہ آیت نمبر ۳۰ میں اللہ فرماتا ہے کہ وہ زمین پر ایک خلیفہ مقرر کرے گا اس حکم کا عملی اظہار آدم کو مقامِ عزت دینا تھا تاکہ انسان کی قدر اور ذمہ داری واضح ہو اور اللہ نے آدم کو اسماء سکھائے۔ (سورہ بقرہ آیت نمبر ۳۱) علم کی یہ اہلیت ظاہر کرنے کے لیے کارِ نمائشی بھی ضروری تھی یعنی اللہ کی حکمت میں بعض اوقات اطاعت اور انکار کے وسیلے سے حق اور باطل کو ظاہراً دکھایا جاتا ہے یہاں فرشتوں، آدم اور اِبلیس کے رویّوں نے اطاعت بمقابلہ تکبّر کا فرق واضح کر دیا۔

اِبلیس کا انکار: قرآن خود اِبلیس کے بہانے کی وجہ بتاتا ہے کہ اس نے کہا ''أَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ خَلَقْتَنِي مِن نَّارٍ وَخَلَقْتَهُ مِن طِينٍ'' (مثلاً سورہ الاعراف: ۱۲) یعنی خود برتری/خود پسندی اور مأخذِ پیدائش کی بنا پر حق بجانب ہونے کا جذباتی فہم تھا۔ نفسیاتی طور پر یہ عُجب، غرور اور خود اعتمادی حد سے زائد تھی اسی طرح جدید نفسیات میں اسی طرزِ عمل کو narcissism یا superiority complex کہا جاتا ہے۔

خلاصہ: جو شخص اللہ کے حکم پر بھی جھکنے سے اجتناب کرے وہ اصل میں اللہ کے خلاف نہیں بلکہ اپنے نفس کے تابع ہو رہا ہے اسے قرآن نے گناہ کی اصل قرار دیا ہے۔ اسی طرح شرک کا امکان اس اعتراض کا براہِ راست جواب ہے کہ شرک تب ہوتا ہے جب کسی مخلوق کو خود مختار الٰہی حیثیت، معبودیت یا اس کے ساتھ مساوی حیثیت دے دی جائے۔ یہاں دوسری کیفیت تھی جیسے: ۱۔ سجدہ اللہ کے حکم سے تھا اس لیے بنیادی نیت اللہ کی اطاعت تھی۔ ۲۔ قرآن اور رسول (سنت) نے بارہا واضح کیا کہ عبادت صرف اللہ کے لیے ہے اگر آدم کو خدا سمجھ لیا جاتا تو قرآن خود اس کی واضح تردید کرتا ہے۔ ۳۔ تاریخی طور پر بھی اس واقعے کے بعد آدم کو عبادت کا منصب یا معبود نہیں بنایا گیا بلکہ آدم انسانوں کے لیے نمائندہ/خلیفہ قرار پایا۔ اس لیے شرک کا الزام بے بنیاد ہے۔

بیشتر مفسّرین (ابنِ کثیر، طبری، قرطبی وغیرہ) اس واقعے کو اللہ کے حکم سے آدم کو عزت دینے اور اِبلیس کی تکبّر۔ ناک مخالفت کے طور پر بیان کرتے ہیں وہ اس کو شرک نہیں مانتے بلکہ اللہ کی طرف سے ایک امتحان اور بندگی و نافرمانی کا مظہر قرار دیتے ہیں۔ اس واقعہ سے چند نصیحتیں حاصل ہوتی ہیں جیسے:

۱۔ اللہ کی رضا اور حکم کی تعمیل اصل معیار ہے چاہے وہ دوسرے مخلوق کے لیے کسی احترام کا اظہار کا صورت اختیار کرے۔ ۲۔ تکبّر، تعصب، اور خود برتری انسان کو ہدایت سے دور کر دیتی ہے اِبلیس کی کہانی اس امر کی رہبری کرتی ہے۔ ۳۔ خدا نے واقعہ بیان کر کے مومنوں کو خبردار کیا کہ اطاعت کا تقاضا کیا ہے اور انکار کے نتائج کیا ہوں گے۔ اس طرح اللہ نے فرشتوں سے آدم کی طرف سجدہ کروایا، یہ سجدہ شرک نہیں بلکہ اللہ کے حکم پر آدم کی عظمت و منصبِ خلافت کا اظہار اور اطاعت و انکار کے فرق کی امتیازی نمائش تھی۔ اِبلیس کے انکار کی وجہ تکبّر اور اپنی برتری کا احساس تھا جس کی تردید اور انسانوں کی تربیت اور عبرت کے لیے یہ واقعہ رونما کروایا گیا۔

آیت نمبر (۳۵) وَقُلْنَا يٰٓاٰدَمُ اسْكُنْ اَنْتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ وَكُلَا مِنْهَا رَغَدًا حَيْثُ شِئْتُمَا ۪ وَلَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ فَتَكُوْنَا مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۳۵﴾

ترجمہ: ''اور ہم نے کہا: اے آدمؑ! تم اور تمہاری بیوی جنت میں رہو اور وہاں سے جو چاہو سکون سے کھاؤ، لیکن اس درخت کے قریب نہ جانا، ورنہ تم دونوں ظالموں میں شمار ہو گے''۔

تفسیر

حضرت آدمؑ اور حضرت حوا کی تخلیق

اس آیت میں بیان ہوا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدمؑ کو جنت میں ٹھہرنے کا حکم دیا۔ پھر ان کی تنہائی کو دور کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے ان کی پسلی سے حضرت حوا کو پیدا فرمایا۔ ''تفسیر عزیزی'' میں شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ لکھتے ہیں کہ جب حضرت آدمؑ نے تنہائی محسوس کی اور دل میں ہم جنس کی تمنا کی، تو اللہ تعالیٰ نے ان پر رحمت فرمائی۔ جب حضرت آدمؑ نیند میں تھے، فرشتوں کو حکم ہوا کہ ان کی بائیں پسلی کو چیر کر وہاں سے ایک حسین عورت پیدا کی جائے، اور پھر وہ پسلی دوبارہ جوڑ دی گئی۔ اس عمل سے حضرت آدمؑ کو کوئی تکلیف نہ پہنچی۔ بیدار ہونے پر انہوں نے اپنے پہلو میں ایک ہم جنس کو دیکھا اور پوچھا: ''تم کون ہو؟'' تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''یہ میری بندی ہے، اس کا نام ''حوا'' ہے اور یہ تمہارے لیے پیدا کی گئی ہے''۔ پھر ان دونوں کا نکاح ہوا اور فرشتے اس کے گواہ بنے۔

جنت میں قیام اور ممانعت

حضرت آدمؑ اور حضرت حوا کو جنت میں رہنے کا حکم دیا گیا، مگر ایک درخت کے بارے میں پابندی عائد کی گئی کہ اس کے قریب نہ جانا اور اس کے پھل یا پتے نہ کھانا۔ فرمایا گیا کہ اگر تم نے اس میں سے کچھ کھا لیا تو تم ظالموں میں شمار ہو گے۔ اس ظلم کے دو پہلو ہو سکتے ہیں:

(۱) اللہ کے منع کئے ہوئے حکم کو توڑنا، جو کہ بڑا گناہ ہے اور سزا کا موجب بنتا ہے۔ (۲) جنت کی نعمتوں سے محروم ہو جانا اور وہاں سے نکال دیا جانا۔

اس درخت کی حقیقت کے بارے میں مفسرین میں اختلاف ہے: حضرت ابن عباسؓ اور بعض دیگر صحابہؓ کے مطابق وہ گیہوں کا درخت تھا اور حضرت ابن مسعودؓ اور ابن عباسؓ سے ایک روایت ہے کہ وہ انگور کا درخت تھا اور حضرت مجاہدؒ نے فرمایا کہ وہ انجیر کا درخت تھا۔ (تفسیر درمنثور) واللہ اعلم بالصواب۔

حضرت آدمؑ وحوا کو بہکانا

اللہ تعالیٰ نے پہلے ہی تنبیہ فرما دی تھی کہ ابلیس تمہارا دشمن ہے۔ ابلیس اس تاک میں رہا کہ کسی طرح ان کو جنت سے محروم کرے۔ اسے علم تھا کہ اگر آدمؑ اور حوا اس درخت کے قریب جائیں گے تو ضرور ان پر گرفت ہوگی اور یہی ان کے جنت سے نکلنے کا سبب بنے گا۔

چنانچہ اس نے حضرت آدمؑ اور حوا کو بہکاتے ہوئے کہا: ''تمہیں اس درخت کے قریب جانے سے اس لیے روکا گیا ہے کہ اگر تم نے اس کا پھل کھا لیا تو ہمیشہ جنت میں رہو گے، کبھی فنا نہ ہوگی اور نہ یہاں کی راحت میں کمی آئے گی۔ بلکہ اس درخت کا پھل کھا کر تم فرشتوں کی مانند ہو جاؤ گے اور ہمیشہ زندہ رہو گے۔'' (سورہ اعراف، سورہ طٰہٰ)

شیطان نے محض بات ہی نہ کی بلکہ قسم کھا کر کہا: ''میں تم دونوں کا خیر خواہ ہوں''۔ (سورہ اعراف:۲۱)

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''بے شک شیطان تمہارا دشمن ہے، اس لیے تم بھی اسے دشمن ہی سمجھو۔ وہ اپنے ساتھیوں کو بلاتا ہے تاکہ وہ سب جہنم کا ایندھن بن جائیں''۔ (سورہ فاطر:۶)

حضرت آدمؑ کی پیدائش اور نزول

حضرت ابو ہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''جمعہ کا دن سب سے افضل دن ہے۔ اسی دن حضرت آدمؑ کو پیدا کیا گیا اور اسی دن انہیں جنت سے نکالا گیا''۔ (ترمذی:۴۸۸)

اس آیت سے متعلق بعض غیر مسلموں کے اشکالات کا جواب:

یہ اعتراض دراصل الفاظ کی ظاہری تاویلات سے پیدا ہوا ہے، حالانکہ قرآنِ حکیم کی آیات اپنی حقیقت میں نہایت حکیمانہ اور عمیق معنویت رکھتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو جنت میں بسایا اور اُنہیں بے شمار نعمتوں سے نوازا، مگر ساتھ ہی ایک حکم فرمایا کہ اس درخت کے قریب نہ جانا ورنہ ظالموں میں شمار ہو گے۔ (البقرہ:۳۵) یہاں اصل مقصود کسی درخت کے مادی نام کا ذکر نہیں، بلکہ اطاعت اور نافرمانی کے امتحان کو نمایاں کرنا ہے۔

قرآن نے اس درخت کا نام اس لیے نہیں بتایا کہ اہمیت نام یا نباتاتی شناخت کی نہیں تھی بلکہ اس امر کی تھی کہ اللہ کے حکم کی پاسداری کی جائے۔ اگر اس کا نام ذکر کر دیا جاتا تو انسانی ذہن اُس درخت کی نوعیت میں اُلجھ جاتا اور اصل پیغام پسِ پشت رہ جاتا۔ یہی وجہ ہے کہ مفسرین نے مختلف احتمالات ذکر کیے انار، انگور، زیتون یا گندم لیکن یہ سب محض قیاسی ہیں، وحی کی قطعی بنیاد نہیں رکھتے۔ قرآنِ حکیم کی آیت ''وَلَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ فَتَكُوْنَا مِنَ الظّٰلِمِيْنَ'' (سورہ البقرہ:۳۵) یہ اعتراض دراصل قرآن کے اصل مقصد کو نظر انداز کرنے کے مترادف ہے۔ اس کا جواب تین پہلوؤں سے واضح کیا جا سکتا ہے:

ا۔ اسلامی نکتۂ نظر سے قرآن کی تعلیمات میں اصل زور مقاصد پر ہے نہ کہ غیر ضروری تفصیلات پر۔ درخت کا نام نہ بتانے کی حکمت یہ ہے کہ انسان اصل سبق سمجھے جیسے: (۱) اطاعت و نافرمانی کا فرق۔ (۲) اللہ کے حکم کی اہمیت۔ (۳) چھوٹی سے چھوٹی نافرمانی بھی بڑی محرومی کا سبب بن سکتی ہے۔

اگر درخت کا نام ذکر ہوتا تو انسان اصل پیغام سے ہٹ کر اُس درخت کی نوعیت، شکل وصورت یا نباتاتی پہچان میں الجھ جاتا اور مقصد فوت ہو جاتا۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے اسے تمثیلی اور علامتی انداز میں بیان کیا تاکہ اصل توجہ ''امرِ الٰہی کی تعمیل'' پر رہے۔

۲۔ تقابل مذاہب کی روشنی میں: جیسا کہ اوپر ذکر ہوا کہ بائبل میں اس درخت کو ''نیک و بد کی پہچان کا درخت'' کہا گیا (Genesis 2:17)۔ یعنی وہ درخت حقیقت میں کسی نباتاتی جنس کا نام نہیں بلکہ آزمائش کی علامت تھا۔ قرآن کا پیغام بھی یہی ہے کہ انسان کو یہ سمجھایا جائے کہ آزادیِ ارادہ کے باوجود اسے اللہ کی حدود میں رہنا ہے۔ یعنی درخت کا اصل نام اہم نہیں بلکہ اُس کی حیثیت ایک کسوٹی کی تھی اطاعت یا نافرمانی۔ اس لیے دونوں کتب کا مفہوم ایک ہی حقیقت کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

۳۔ سائنسی و تحقیقی پہلو سے سائنس کی روشنی میں انسانی نفسیات اور اخلاقیات کا ارتقا ''چوائس اور کنسیکوئنس'' (Choice & Consequence) کے اصول پر ہے۔ ایک چھوٹا سا حکم اور اُس کی خلاف ورزی ایک بڑا نتیجہ ہے اور دوسرا قانونِ فطرت یہ ہے کہ آزادی کے ساتھ ذمہ داری اور نتائج بھی لازم ہیں۔ قرآن نے اسی سچائی کو ''درخت'' کی صورت میں بطورِ 'استعارہ' بیان کیا تاکہ یہ انسانی شعور میں ہمیشہ زندہ رہے کہ انسان کی اصل آزمائش اطاعت و بندگی ہے، نہ کہ مادی درخت کھانے یا نہ کھانے کا مسئلہ۔

خلاصہ

درخت کا نام نہ بتانا قرآن کی حکمت ہے تاکہ انسان اصل سبق پر غور کرے، نہ کہ ظاہر کی بحث میں الجھ

جائے اور یہ درخت اطاعت و نافرمانی کی کسوٹی تھا۔ سائنسی اعتبار سے یہ واقعہ انسان کو آزادی اور ذمہ داری کا ابدی اصول سکھاتا ہے۔ لہٰذا اعتراض محض الفاظ میں الجھنے کی کوشش ہے، جبکہ حقیقت یہ ہے کہ قرآن کا پیغام اپنی جگہ بالکل واضح، مضبوط اور مقصدیت سے بھرپور ہے: ''اللہ کا حکم حرفِ آخر ہے، اُس کی اطاعت نجات ہے اور نافرمانی تباہی''۔

آیت نمبر (۳۶) فَاَزَلَّهُمَا الشَّيْطٰنُ عَنْهَا فَاَخْرَجَهُمَا مِمَّا كَانَا فِيْهِ ۠ وَقُلْنَا اهْبِطُوْا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ ۚ وَلَكُمْ فِي الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّمَتَاعٌ اِلٰى حِيْنٍ ۝۳۶

ترجمہ: ''پھر شیطان نے ان دونوں کو اس درخت کے ذریعے پھسلا دیا اور انہیں اس (جنت کی) حالت سے نکال دیا جس میں وہ تھے۔ اور ہم نے فرمایا: اتر جاؤ تم سب یہاں سے، تم ایک دوسرے کے دشمن ہو اور زمین میں تمہارے لیے ایک وقت تک ٹھہرنے کی جگہ اور (زندگی کے) فائدے ہیں''۔

تفسیر

شیطان کا دھوکہ

شیطان کے بہکانے اور قسم کھانے کے باعث حضرت آدمؑ اور حضرت حوا نے اس ممنوعہ درخت میں سے کچھ کھا لیا، اور یوں وہ دھوکہ کھا گئے۔ درخت کا پھل چکھتے ہی جنتی لباس ان سے جدا ہو گئے اور ان کی شرمگاہیں ایک دوسرے کے سامنے ظاہر ہو گئیں۔ اس شرمندگی کو چھپانے کے لیے وہ جنت کے پتے توڑ کر اپنے جسم پر لپیٹنے لگے۔ اسی وقت اللہ تعالیٰ نے انہیں پکارا: ''کیا میں نے تمہیں اس درخت سے منع نہیں کیا تھا؟ اور کیا میں نے نہیں کہا تھا کہ شیطان تمہارا کھلا دشمن ہے؟'' دونوں اپنی لغزش کے اقرار کرنے لگے اور گڑگڑا کر معافی مانگنے لگے۔

شیطان کا وسوسہ

یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب شیطان کو جنت سے نکال دیا گیا تھا تو اس نے حضرت آدمؑ اور حضرت حوا کو بہکایا کیسے؟ ''تفسیر بیضاوی'' میں بیان ہے کہ شیطان کو عزت و اکرام کے ساتھ وہاں رہنے سے منع کیا گیا تھا، لیکن چونکہ اللہ تعالیٰ کو حضرت آدمؑ و حوا کا امتحان لینا مقصود تھا، اس لیے اسے وسوسہ ڈالنے کا موقع دیا گیا۔ ممکن ہے کہ وہ جنت کے دروازے پر کھڑا ہو کر بہکاتا رہا ہو۔ بہرحال، اس نے وسوسہ ڈالا اور حضرت آدمؑ و حوا نے اس کی بات مان لی، جس کے نتیجے میں انہیں زمین پر اترنے کا حکم دیا گیا۔

زمین پر نزول

یاد رہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدمؑ کو زمین پر اپنا خلیفہ بنانے کا فیصلہ پہلے ہی فرما دیا تھا۔ مگر شیطان کے

بہکانے اور درخت کے پھل کھانے کو زمین پر اترنے کا ذریعہ بنا دیا گیا۔ چنانچہ حکم ہوا: ''یہاں سے اتر جاؤ، اب زمین ہی تمہارا ٹھکانا ہے۔ تم میں سے بعض بعض کے دشمن ہوں گے اور ایک مدت تک تمہیں زمین سے فائدہ اٹھانا ہے''۔

اس فرمان کے دو پہلو ہیں: (۱) حضرت آدمؑ، حضرت حوا اور ان کی ساری اولاد کو قیامت تک زمین پر رہنا ہے، جہاں ایک مقررہ وقت تک زندگی بسر کرنا ہے۔

(۲) ہر انسان کو اپنی موت آنے تک زمین پر قیام کرنا ہے اور دنیا کی نعمتوں سے ضرورت کے بقدر فائدہ اٹھانا ہے۔

آیت نمبر (۳۷) فَتَلَقّٰٓى اٰدَمُ مِنْ رَّبِّهٖ كَلِمٰتٍ فَتَابَ عَلَيْهِ ؕ اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ﴿۳۷﴾

ترجمہ: ''پھر آدمؑ نے اپنے رب سے کچھ کلمات سیکھ لیے (جن کے ذریعے توبہ کی)، تو اللہ نے ان کی توبہ قبول فرمالی۔ بے شک وہی بہت توبہ قبول کرنے والا، بڑا مہربان ہے''۔

تفسیر

حضرت آدمؑ کی توبہ

حضرت آدمؑ اور ان کی زوجہ سے جو لغزش سرزد ہوئی، اس پر وہ نہایت شرمندہ اور نادم تھے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت سے انہیں چند کلمات سکھائے جن کے ذریعے انہوں نے توبہ کی۔ اکثر مفسرین کے نزدیک وہ کلمات سورۂ اعراف کی یہ دعا تھی:

رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا ۖ وَاِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ﴿۲۳﴾

ترجمہ: ''اے ہمارے رب ہم نے اپنی جانوں پر ظلم کیا اور اگر آپ نے ہماری مغفرت نہ فرمائی اور ہم پر رحم نہ فرمایا تو ہم نقصان میں پڑنے والوں میں ہو جائیں گے۔'' (سورہ اعراف: ۲۳)

حضرت آدمؑ اور حضرت حواؑ دونوں نے انہی الفاظ کے ذریعے گڑگڑا کر دعا کی، اور اللہ تعالیٰ نے ان کی توبہ قبول فرمالی۔ بخشش اور مغفرت تو عطا ہو گئی، لیکن جنت میں دوبارہ واپسی نہیں ہوئی۔

جنت سے دنیا کی طرف

ابن جریرؒ اور ابن ابی حاتمؒ کی روایت کے مطابق جس جگہ حضرت آدمؑ کو زمین پر اتارا گیا اس کا نام ''دَجنا'' تھا۔ بعض کے نزدیک یہ ''دکن'' ہے جو آج کے بھارت کے جنوبی خطے کا معروف نام ہے۔

جنت سے نکل کر کون کہاں اترا، اس بارے میں مفسرین کے اقوال مختلف ہیں۔ اکثر مفسرین کے مطابق حضرت آدمؑ کو ''سراندیپ'' (موجودہ لنکا یا سری لنکا) میں اتارا گیا اور حضرت حواؑ کو ''جدہ'' میں۔

حضرت ابن عمرؓ کے قول کے مطابق حضرت آدمؑ ''صفا'' پر اور حضرت حواؑ ''مروہ'' پر اتاری گئیں۔ بعد میں دونوں کی ملاقات ''عرفات'' میں ہوئی اور وہیں ایک دوسرے کو پہچانا۔ اسی نسبت سے اس جگہ کا نام ''عرفات'' رکھا گیا، یعنی پہچان کی سرزمین۔

حضرت آدمؑ اور حضرت موسیٰؑ کا مکالمہ

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ایک موقع پر حضرت آدمؑ اور حضرت موسیٰؑ کی ملاقات ہوئی۔ حضرت موسیٰؑ نے کہا: ''آپ ہی وہ ہیں جنہوں نے اپنی خطا سے بنی نوع انسان کو مصیبت میں ڈالا اور جنت سے نکلنے کا سبب بنے''۔

اس پر حضرت آدمؑ نے فرمایا: ''کیا تم وہی موسیٰ نہیں ہو جنہیں اللہ تعالیٰ نے اپنی رسالت کے لیے برگزیدہ فرمایا اور تم پر تورات نازل کی؟'' حضرت موسیٰؑ نے کہا: ''جی ہاں۔'' حضرت آدمؑ نے فرمایا: ''کیا تم نے تورات میں نہیں پڑھا کہ یہ فیصلہ میری پیدائش سے پہلے ہی لکھ دیا گیا تھا؟'' حضرت موسیٰؑ نے جواب دیا: ''ہاں'' اس پر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''یوں دلیل کے اعتبار سے حضرت آدمؑ، حضرت موسیٰؑ پر غالب آ گئے''۔ **(بخاری: ۶۶۱۴)**

خلافتِ ارضی کا فیصلہ

یہ بات ذہن نشین رہنی چاہیے کہ حضرت آدمؑ کو زمین پر بھیجنا محض ان کی لغزش کا کفارہ نہ تھا۔ جیسا کہ سورۂ بقرہ کی آیت ۳۰ میں پہلے ہی اللہ تعالیٰ فرما چکے تھے: ''میں زمین میں اپنا نائب بنانے والا ہوں''۔ لہٰذا زمین پر ان کا نزول، اللہ تعالیٰ کی ابدی حکمت اور پہلے سے طے شدہ فیصلے کا حصہ تھا۔

عیسائی عقیدے کا رد

یہاں اس عقیدے کی تردید بھی موجود ہے جو عیسائی پیش کرتے ہیں کہ حضرت آدمؑ کا گناہ نسل در نسل انسانوں میں منتقل ہوتا رہا اور حضرت عیسیٰؑ اس کے کفارہ کے لیے صلیب پر چڑھائے گئے۔ قرآن نے صاف طور پر بیان کر دیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدمؑ کی توبہ قبول فرمالی۔ لہٰذا زمین پر بھیجا جانا گناہ کی سزا نہ تھی، بلکہ ایک مقررہ تدبیر اور اللہ کے ازلی فیصلے کے تحت تھا، کیونکہ حضرت آدمؑ کو تو ابتداء ہی سے خلافتِ ارضی کے لیے پیدا کیا گیا تھا۔

سورۂ اعراف میں ذکر

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''جب میں نے تجھے حکم دیا تو سجدہ کرنے سے کس چیز نے روکا؟'' ابلیس نے کہا: ''میں

اس سے بہتر ہوں، مجھے آپ نے آگ سے پیدا کیا اور اسے مٹی سے''۔ اللہ تعالیٰ نے حکم دیا: ''نکل جا یہاں سے! یہاں تکبر کی کوئی جگہ نہیں، بیشک تو ذلیل و رسوا ہے''۔ ابلیس نے عرض کیا: ''مجھے قیامت تک کی مہلت دیجئے''۔ اللہ نے فرمایا: ''تجھے مہلت ہے''۔ ابلیس نے کہا: ''چونکہ تو نے مجھے گمراہی میں ڈالا ہے، اس لیے میں بھی تیری سیدھی راہ پر انسانوں کے لیے گھات لگا کر بیٹھوں گا۔ میں ان کے آگے، پیچھے، دائیں اور بائیں سے آؤں گا اور تو ان میں سے اکثر کو شکر گزار نہ پائے گا''۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''نکل جا یہاں سے، ذلیل و خوار ہو کر! جو تیری پیروی کریں گے، میں ضرور جہنم کو تم سب سے بھر دوں گا''۔

پھر اللہ تعالیٰ نے حضرت آدمؑ اور حضرت حوّا سے فرمایا: ''جنت میں رہو اور جہاں سے چاہو کھاؤ، مگر اس درخت کے پاس نہ جانا ورنہ تم ظالموں میں شمار ہو گے''۔ شیطان نے بہکا کر کہا: ''تمہارے رب نے تمہیں اس درخت سے محض اس لیے روکا ہے کہ کہیں تم فرشتے نہ بن جاؤ یا ہمیشہ زندہ نہ رہو''۔ اور اس نے ان کے سامنے قسم کھا کر کہا: ''میں ہی تمہارا خیر خواہ ہوں''۔

اس طرح اس نے دھوکے سے انہیں راضی کر لیا۔ جیسے ہی انہوں نے درخت کا پھل چکھا تو ان کی شرمگاہیں ایک دوسرے کے سامنے کھل گئیں اور وہ باغ کے پتوں کو جوڑ جوڑ کر ڈھانپنے لگے۔

تب اللہ تعالیٰ نے پکارا: ''کیا میں نے تمہیں اس درخت سے منع نہ کیا تھا؟ اور کہا نہ تھا کہ شیطان تمہارا کھلا دشمن ہے؟''

دونوں عرض گزار ہوئے: ''اے ہمارے رب! ہم نے اپنی جانوں پر ظلم کیا۔ اگر تو نے ہمیں معاف نہ فرمایا اور ہم پر رحم نہ کیا تو ہم خسارہ پانے والوں میں سے ہو جائیں گے''۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''نکل جاؤ! تم ایک دوسرے کے دشمن ہو، اور تمہارے لیے زمین میں ایک مقررہ مدت تک ٹھکانہ اور سامانِ زیست ہوگا۔ اسی زمین میں تمہیں جینا ہے، اسی میں مرنا ہے اور اسی سے اٹھائے جاؤ گے''۔ **(الاعراف:۱۲-۲۵)**

حضرت آدمؑ کی معافی کا ذکر

قرآن مجید آگے بیان کرتا ہے: ''پھر آدمؑ نے اپنے رب سے چند کلمات سیکھے اور ان کے ذریعے توبہ کی، تو اللہ نے ان کی توبہ قبول فرمالی۔ بیشک وہی توبہ قبول کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے''۔

پھر فرمایا: ''تم سب یہاں سے اتر جاؤ! اب اگر میری طرف سے تمہارے پاس ہدایت آئے تو جو اس ہدایت کی پیروی کرے گا اس پر نہ خوف ہوگا نہ غم۔ اور جنہوں نے انکار کیا اور ہماری آیات کو جھٹلایا، وہی دوزخی ہیں اور ہمیشہ

جہنم میں رہیں گے''۔(البقرہ:۳۷-۳۹)

اس طرح زمین پر سب سے پہلے بھیجے جانے والے انسان حضرت آدمؑ، ہمارے جدِ امجد، نہ صرف انسانیت کے باپ ہیں بلکہ اللہ کے برگزیدہ نبی اور پیغمبر بھی ہیں۔ان کی زمین پر آمد سزا نہیں بلکہ اللہ کی حکمتِ کاملہ اور انسان کے امتحان کا آغاز تھی۔

آیت نمبر(۳۸-۳۹) قُلْنَا اهْبِطُوْا مِنْهَا جَمِيْعًا ۚ فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّيْ هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۳۸﴾ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَآ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۳۹﴾

ترجمہ:''ہم نے فرمایا: تم سب یہاں سے اتر جاؤ، پھر اگر میری طرف سے تمہارے پاس کوئی ہدایت آئے، تو جو لوگ میری ہدایت کی پیروی کریں گے، ان پر نہ کوئی خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔ اور جو لوگ کفر کریں گے اور ہماری آیات کو جھٹلائیں گے، وہی دوزخی ہیں، وہ ہمیشہ اس میں رہیں گے''۔

تفسیر

ہدایت قبول کرنے والوں کے لئے انعام

پہلا حکم ''اِهْبِطُوا'' (اتر جاؤ) اس حقیقت کو ظاہر کرتا ہے کہ اب تمہیں جنت سے نکل کر ایسی جگہ جانا ہے جو مصیبت و مشقت کا گہوارہ ہوگی۔ وہاں تمہارے درمیان دشمنی اور کشمکش قائم رہے گی اور تمہیں محدود مدت تک ہی قیام نصیب ہوگا۔

دوسرا حکم اس پہلو کو اجاگر کرتا ہے کہ اگرچہ زمین ابتلاء اور تکالیف کی سرزمین ہے، لیکن وہاں تمہارے رب کی طرف سے ہدایت بھی نازل ہوگی۔ اللہ کے برگزیدہ پیغمبر آئیں گے، ان پر وحی نازل کی جائے گی، اور انسانوں کو حکم ہوگا کہ وہ ان رسولوں اور ان پر اتاری گئی کتابوں پر ایمان لائیں اور اپنی زندگی انہی تعلیمات کے مطابق بسر کریں۔

جو لوگ اس ہدایت کو قبول کریں گے اور اس پر عمل پیرا ہوں گے، ان کے لیے انجام کار جنت کا وہی ابدی اور پُرسکون ٹھکانا ہوگا، جہاں نہ خوف ہوگا اور نہ غم۔ اس کے برعکس جو لوگ انکار کریں گے، ہماری آیات کو جھٹلائیں گے اور حق سے منہ موڑیں گے، ان کا مقدر جہنم کی آگ ہوگی۔ جس طرح اہلِ ایمان ہمیشہ جنت کی نعمتوں میں رہیں گے، اسی طرح یہ منکرین ابدالآباد تک جہنم میں عذاب جھیلتے رہیں گے۔

❁❁❁

ترجمہ- آیت نمبر ۴۰ سے ۵۰ تک

يٰبَنِيۡۤ اِسۡرَآءِيۡلَ اذۡكُرُوۡا نِعۡمَتِىَ الَّتِىۡۤ اَنۡعَمۡتُ عَلَيۡكُمۡ وَاَوۡفُوۡا بِعَهۡدِىۡۤ اُوۡفِ بِعَهۡدِكُمۡ ۚ وَاِيَّاىَ
فَارۡهَبُوۡنِ ﴿۴۰﴾ وَاٰمِنُوۡا بِمَاۤ اَنۡزَلۡتُ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمۡ وَلَا تَكُوۡنُوۡۤا اَوَّلَ كَافِرٍۢ بِهٖ ۪ وَلَا تَشۡتَرُوۡا بِاٰيٰتِىۡ
ثَمَنًا قَلِيۡلًا ۫ وَّاِيَّاىَ فَاتَّقُوۡنِ ﴿۴۱﴾ وَلَا تَلۡبِسُوا الۡحَقَّ بِالۡبَاطِلِ وَتَكۡتُمُوا الۡحَقَّ وَاَنۡتُمۡ تَعۡلَمُوۡنَ ﴿۴۲﴾
وَاَقِيۡمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَارۡكَعُوۡا مَعَ الرّٰكِعِيۡنَ ﴿۴۳﴾ اَتَاۡمُرُوۡنَ النَّاسَ بِالۡبِرِّ وَتَنۡسَوۡنَ
اَنۡفُسَكُمۡ وَاَنۡتُمۡ تَتۡلُوۡنَ الۡكِتٰبَ ؕ اَفَلَا تَعۡقِلُوۡنَ ﴿۴۴﴾ وَاسۡتَعِيۡنُوۡا بِالصَّبۡرِ وَالصَّلٰوةِ ؕ وَاِنَّهَا
لَكَبِيۡرَةٌ اِلَّا عَلَى الۡخٰشِعِيۡنَ ﴿۴۵﴾ الَّذِيۡنَ يَظُنُّوۡنَ اَنَّهُمۡ مُّلٰقُوۡا رَبِّهِمۡ وَاَنَّهُمۡ اِلَيۡهِ رٰجِعُوۡنَ ﴿۴۶﴾ يٰبَنِيۡۤ
اِسۡرَآءِيۡلَ اذۡكُرُوۡا نِعۡمَتِىَ الَّتِىۡۤ اَنۡعَمۡتُ عَلَيۡكُمۡ وَاَنِّىۡ فَضَّلۡتُكُمۡ عَلَى الۡعٰلَمِيۡنَ ﴿۴۷﴾ وَاتَّقُوۡا يَوۡمًا لَّا
تَجۡزِىۡ نَفۡسٌ عَنۡ نَّفۡسٍ شَيۡـًٔا وَّلَا يُقۡبَلُ مِنۡهَا شَفَاعَةٌ وَّلَا يُؤۡخَذُ مِنۡهَا عَدۡلٌ وَّلَا هُمۡ يُنۡصَرُوۡنَ ﴿۴۸﴾
وَاِذۡ نَجَّيۡنٰكُمۡ مِّنۡ اٰلِ فِرۡعَوۡنَ يَسُوۡمُوۡنَكُمۡ سُوۡٓءَ الۡعَذَابِ يُذَبِّحُوۡنَ اَبۡنَآءَكُمۡ وَيَسۡتَحۡيُوۡنَ
نِسَآءَكُمۡ ؕ وَفِىۡ ذٰلِكُمۡ بَلَآءٌ مِّنۡ رَّبِّكُمۡ عَظِيۡمٌ ﴿۴۹﴾ وَاِذۡ فَرَقۡنَا بِكُمُ الۡبَحۡرَ فَاَنۡجَيۡنٰكُمۡ وَاَغۡرَقۡنَاۤ
اٰلَ فِرۡعَوۡنَ وَاَنۡتُمۡ تَنۡظُرُوۡنَ ﴿۵۰﴾

ترجمہ:

(۴۰)۔اے بنی اسرائیل! یاد کرو میری نعمت کو جو میں نے تم پر انعام کیا اور پورا کرو میرا عہد، میں پورا کروں گا تمہارا عہد اور صرف مجھ ہی سے ڈرو۔(۴۱)۔اور تم ایمان لاؤ اس پر جو میں نے نازل کیا، جو تصدیق کرنے والی ہے ان کتابوں کی جو تمہارے پاس ہیں اور تم سب سے پہلے انکار کرنے والے نہ بنو اس کے اور نہ بیچو میری آیتوں کو تھوڑی قیمت پر، اور مجھ ہی سے ڈرو۔(۴۲)۔اور نہ ملاؤ حق کو باطل کے ساتھ اور نہ چھپاؤ حق کو، اس حال میں کہ تم جانتے ہو۔(۴۳)۔اور قائم کرو نماز اور ادا کرو زکوٰۃ اور رکوع کرو رکوع کرنے والوں کے ساتھ۔(۴۴)۔کیا تم حکم دیتے ہو لوگوں کو نیکی کا اور بھول جاتے ہو اپنے آپ کو؟ حالانکہ تم پڑھتے ہو کتاب، تو کیا تم عقل نہیں رکھتے؟(۴۵)۔اور تم مدد مانگو صبر کے ذریعے اور نماز کے ذریعے اور بے شک وہ (نماز) بہت بھاری ہے، مگر ان پر نہیں جو عاجزی کرنے والے ہیں۔(۴۶)۔وہ لوگ جو یقین رکھتے ہیں کہ وہ ضرور اپنے رب سے ملاقات کرنے والے ہیں اور بے شک وہ اسی کی طرف لوٹ کر جانے والے ہیں۔(۴۷)۔اے بنی اسرائیل! یاد کرو میری وہ نعمت جو میں نے تم پر انعام کی اور بے

شک میں نے تمہیں فضیلت دی تمام جہانوں پر۔(۴۸)۔اور ڈرو اس دن سے، جب کوئی جان کسی جان کے کچھ بھی کام نہ آئے گی اور نہ اس سے کوئی سفارش قبول کی جائے گی اور نہ اس سے کوئی بدلہ لیا جائے گا اور نہ ہی وہ مدد کیے جائیں گے۔(۴۹)۔اور جب ہم نے تمہیں نجات دی فرعون والوں سے، وہ دیتے تھے تمہیں سخت ترین عذاب، وہ ذبح کرتے تھے تمہارے بیٹوں کو اور زندہ رکھتے تھے تمہاری عورتوں کو اور اس میں تمہارے رب کی طرف سے بہت بڑی آزمائش تھی۔(۵۰)۔اور جب ہم نے تمہارے لیے سمندر کو پھاڑا، تو ہم نے تمہیں نجات دی اور غرق کر دیا فرعون والوں کو اور تم دیکھ رہے تھے۔

تفسیر-آیت نمبر ۴۰ سے ۵۰ تک

آیت نمبر(۴۰) يٰبَنِيۡۤ اِسۡرَآءِيۡلَ اذۡكُرُوۡا نِعۡمَتِىَ الَّتِىۡۤ اَنۡعَمۡتُ عَلَيۡكُمۡ وَاَوۡفُوۡا بِعَهۡدِىۡۤ اُوۡفِ بِعَهۡدِكُمۡ ۚ وَاِيَّاىَ فَارۡهَبُوۡنِ ﴿۴۰﴾

ترجمہ: ''اے بنی اسرائیل! یاد کرو میری نعمت کو جو میں نے تم پر انعام کیا اور پورا کرو میرا عہد، میں پورا کروں گا تمہارا عہد اور صرف مجھ ہی سے ڈرو''۔

تفسیر

بنی اسرائیل

اوپر کی آیت میں لفظ'' يٰبَنِيۡۤ اِسۡرَآءِيۡلَ '' آیا ہے، جس سے مراد یہودی ہیں۔''اسرائیل'' دراصل حضرت یعقوبؑ کا لقب ہے۔ یہ عبرانی زبان کا لفظ ہے جس کے معنیٰ ''اللہ کا نیک بندہ'' یا ''عبداللہ'' یعنی ''اللہ کا بندہ'' ہیں۔ حضرت یعقوبؑ کے بارہ بیٹے تھے جن کی نسلیں بارہ قبیلوں میں تقسیم ہوئیں اور یہی سب ''بنی اسرائیل'' کہلائے۔

حضرت ابراہیمؑ کی نسلیں

حضرت ابراہیمؑ کی ایک بیوی کا نام سارہؑ تھا، جو ان کے چچا کی بیٹی تھیں، اور دوسری بیوی کا نام ہاجرہؑ تھا۔ حضرت سارہؑ سے حضرت اسحٰقؑ پیدا ہوئے، اور حضرت ہاجرہؑ سے حضرت اسمٰعیلؑ۔ حضرت اسحٰقؑ کے بیٹے حضرت یعقوبؑ تھے، جنہیں ''اسرائیل'' کہا گیا اور جن کی نسل ہی ''بنی اسرائیل'' کہلائی۔ انہی کے بارہ بیٹوں میں حضرت یوسفؑ بھی شامل تھے، جو بعد میں مصر جا کر مقیم ہوئے۔

اس طرح بارہ بھائیوں کی اولاد بارہ بڑے قبیلوں میں بٹ گئی، جن کی تعداد لاکھوں میں جا پہنچی۔ ان کا اصل وطن ''کنعان'' (فلسطین) تھا۔ حضرت اسماعیلؑ کی اولاد مکہ مکرمہ میں آباد رہی، جبکہ حضرت اسحٰقؑ کی اولاد پہلے کنعان اور

پھر مصر میں جا بسی۔ مگر جب حضرت یوسفؑ کے زمانے کے بعد ان کی قوم کی حکومت ختم ہوئی تو چونکہ وہ مصر کے اصل باشندے نہ تھے، اس لیے مصری قوم (قبطی) نے ان پر ظلم ڈھانا شروع کر دیا۔ یہاں تک کہ ان کے لڑکوں کو قتل اور لڑکیوں کو غلام بنایا جانے لگا، اور وہ بے بس ہو گئے۔

حضرت موسیٰؑ اور فرعون

ایسے ہی حالات میں بنی اسرائیل میں حضرت موسیٰؑ پیدا ہوئے۔ اس وقت کا بادشاہ ''فرعون'' حضرت موسیٰؑ کا سخت مخالف تھا۔ حضرت موسیٰؑ نے اسے اللہ کی وحدانیت کی طرف بلایا اور بنی اسرائیل کو آزاد کرنے کا مطالبہ کیا، مگر فرعون نہ ہدایت پر آیا نہ ہی بنی اسرائیل کو چھوڑنے پر آمادہ ہوا۔

بنی اسرائیل کا مصر سے خروج

آخر کار، اللہ کے حکم سے بنی اسرائیل راتوں رات مصر سے نکل کھڑے ہوئے اور سمندر کے کنارے جا پہنچے۔ فرعون کو خبر ملی تو وہ اپنی فوج کے ساتھ ان کے پیچھے پہنچ گیا۔ حضرت موسیٰؑ نے اپنا عصا سمندر پر مارا تو وہ پھٹ گیا اور اس میں خشک راستے بن گئے۔ بنی اسرائیل ان راستوں سے گزر کر پار ہو گئے۔ فرعون اپنی فوج سمیت پیچھے لپکا مگر جب وہ بیچ سمندر پہنچا تو اللہ نے پانی کو ملا دیا اور وہ اپنی فوج سمیت غرق ہو گیا۔ اللہ نے عبرت کے لیے اس کی لاش کو محفوظ رکھا، جو آج بھی مصر کے عجائب گھر میں موجود ہے تا کہ منکرین انجام دیکھ سکیں۔

صحرائے تیہ میں چالیس برس

نجات کے بعد بنی اسرائیل اپنے وطن واپس جانا چاہتے تھے۔ ان کے باپ دادا کبھی اونٹ پر سوار ہو کر چند دنوں میں وہاں پہنچ گئے تھے، مگر یہ قوم صحرائے ''تیہ'' میں چالیس برس تک بھٹکتی رہی۔ صبح جس جگہ سے چلتے، شام کو پھر وہیں جا نکلتے۔ اس دوران یہ لوگ حضرت موسیٰؑ کو بار بار ستاتے رہے۔

جب حضرت موسیٰؑ طور پہاڑ پر وحی لینے گئے تو ان کی غیر موجودگی میں ان لوگوں نے ایک بچھڑا بنا کر اس کی پوجا شروع کر دی۔ حضرت موسیٰؑ کی واپسی پر انہوں نے یہ شرط بھی رکھی کہ جب تک اللہ کو اپنی آنکھوں سے نہ دیکھ لیں، وہ ایمان نہ لائیں گے۔

اللہ نے ان کے لیے ''من وسلویٰ'' کی نعمتیں اتاریں، مگر انہوں نے ناشکری کرتے ہوئے کہا کہ ہم ایک کھانے پر صبر نہیں کر سکتے، ہمیں سبزی، پیاز، کھیرا اور ککڑی چاہیے۔ انہوں نے تورات کو بھی تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ اس پر اللہ نے طور پہاڑ کو سائبان کی طرح ان پر تان دیا تا کہ وہ اپنی نافرمانی کا انجام دیکھ سکیں۔ یہ سب صحرائے تیہ میں

ہوااوراسی دوران حضرت موسیٰؑ کا وصال ہوا۔

ان کے بعد حضرت یوشع بن نونؑ کے دور میں بنی اسرائیل کو فتح نصیب ہوئی اور وہ بیت المقدس میں داخل ہوئے۔حکم یہ تھا کہ عاجزی کے ساتھ اور معافی مانگتے ہوئے شہر میں قدم رکھیں،مگر انہوں نے اس ہدایت کی بھی خلاف ورزی کی۔

انہی بنی اسرائیل میں حضرت داؤدؑ اور حضرت سلیمانؑ جیسے عظیم نبی اور بادشاہ مبعوث ہوئے۔ یہی قوم ''یہودی'' کے نام سے مشہور ہوئی۔

مدینہ میں یہودیوں کی تاریخ

مؤرخین لکھتے ہیں کہ جب بخت نصر (مشہور بادشاہ) نے بیت المقدس کو مسمار کیا اور وہاں کے باشندوں کو جلاوطن کر دیا، نیز بنی اسرائیل (یہود) کے ایک بڑے گروہ کو قید کرلیا،تو ان میں سے ایک جماعت نے حجاز کا رخ کیا۔ ان میں سے کچھ ''وادی القریٰ'' اور کچھ ''مدینہ'' میں آ کر آباد ہو گئے، جہاں پہلے سے بنی جرہم اور عمالقہ کی بستیاں موجود تھیں۔ یہ لوگ کھجوروں کے باغ لگاتے اور کھیتی باڑی کرتے تھے۔ یہودی بھی ان کے ساتھ شریکِ حیات ہوئے، پھر رفتہ رفتہ یہ تعداد اور اثر میں بڑھتے گئے اور بنی جرہم وعمالقہ کمزور پڑتے گئے، یہاں تک کہ یہودیوں نے ان کو مدینہ سے بے دخل کر دیا اور ان کی عمارتوں اور کھیتوں پر قابض ہو گئے۔(فتح الباری)

بعض مؤرخین نے یہ بھی بیان کیا ہے کہ یہودی علماء تورات میں حضرت محمد ﷺ کے اوصاف پڑھتے تھے، جن میں یہ بھی درج تھا کہ یہ نبی ایک ایسے شہر کی طرف ہجرت کریں گے جو کھجوروں کا گہوارہ ہوگا اور دو پتھریلی زمینوں کے درمیان واقع ہوگا۔اسی پیشین گوئی کی بنیاد پر وہ شام سے آئے اور مدینہ میں سکونت اختیار کی تاکہ اس نبی پر ایمان لائیں اور ان کی پیروی کریں۔(معجم البلدان)

اس وقت مدینہ میں دو بڑے قبائل ''اوس'' اور ''خزرج'' آباد تھے۔ جب رسول اللہ ﷺ مدینہ تشریف لائے تو یہاں تین بڑے یہودی قبائل بھی مقیم تھے:(۱) بنونظیر (۲) بنوقریظہ (۳) بنوقینقاع

یہود، اوس وخزرج

اوس وخزرج بت پرست تھے، اور ان کے درمیان آپس کی لڑائیاں بھی جاری رہتی تھیں۔ ان کی یہود کے ساتھ بھی جھڑپیں رہتی تھیں۔ چونکہ یہودی اہل کتاب اور اہل علم شمار ہوتے تھے، وہ اوس وخزرج کو دھمکاتے اور کہتے کہ جب آخری نبی آئیں گے تو ہم ان کے ساتھ ہو کر تمہیں نیست ونابود کر دیں گے۔

اوس وخزرج کا اسلام قبول کرنا

حج کے موقع پر پہلی بار جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اوس وخزرج کے چند افراد کو اسلام کی دعوت دی، تو وہ آپس میں کہنے لگے: ''یہ تو وہی نبی معلوم ہوتے ہیں جن کی بشارت یہودی دیا کرتے اور جن کے حوالے سے ہمیں ڈراتے تھے کہ وہ آئیں گے تو ہم تمہیں فنا کر دیں گے۔'' انہوں نے سوچا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ یہودی ہم پر سبقت لے جائیں۔ چنانچہ انہوں نے اسلام قبول کر لیا اور مدینہ واپس آ کر اسلام کی تبلیغ شروع کر دی، جس کے نتیجے میں دونوں قبیلوں میں اسلام تیزی سے پھیل گیا۔ اگلے سال حج کے موقع پر انہی قبیلوں کے بارہ افراد نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ملاقات کی، بیعت کی اور مدینہ آنے کی دعوت دی۔

یہودیوں کا انکار

جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مدینہ تشریف لائے تو یہودی، باوجود اس کے کہ جانتے تھے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم وہی نبی ہیں جن کی پیشین گوئی ان کی کتابوں میں موجود ہے، ایمان نہ لائے۔ ہاں، حضرت عبداللہ بن سلامؓ جیسے خوش نصیبوں نے اسلام قبول کیا، لیکن اکثریت نے ضد اور عناد کی راہ اختیار کی اور انکار کر دیا۔

اللہ تعالیٰ نے ان کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا: ''اے بنی اسرائیل! میری ان نعمتوں کو یاد کرو جو میں نے تم پر کی ہیں، اور میرا عہد پورا کرو، میں بھی تم سے کیا ہوا وعدہ پورا کروں گا۔ اور مجھ ہی سے ڈرتے رہو''۔

عہد کی حقیقت

یہ عہد دراصل دو پہلو رکھتا ہے: (۱) پہلا عہد عالمِ ارواح میں لیا گیا کہ اللہ ہی کو رب اور معبود مانیں گے اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرائیں گے۔ (۲) دوسرا عہد یہ تھا کہ اللہ کی طرف سے نازل کردہ احکام کی مکمل پیروی کریں گے اور ان پر عمل کریں گے۔

وَلَقَدْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ۚ وَبَعَثْنَا مِنْهُمُ اثْنَىْ عَشَرَ نَقِيْبًا ۭ وَقَالَ اللّٰهُ اِنِّىْ مَعَكُمْ ۭ لَىِٕنْ اَقَمْتُمُ الصَّلٰوةَ وَاٰتَيْتُمُ الزَّكٰوةَ وَاٰمَنْتُمْ بِرُسُلِىْ وَعَزَّرْتُمُوْهُمْ وَاَقْرَضْتُمُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا لَّاُكَفِّرَنَّ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ وَلَاُدْخِلَنَّكُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِىْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۚ

ترجمہ: ''اور اللہ نے بنی اسرائیل سے وعدہ لیا تھا، اور ہم نے ان میں بارہ سردار مقرر کئے تھے؛ پھر اللہ نے کہا تھا، میں تمہارے ساتھ ہوں، اگر تم نے نماز قائم رکھی، اور زکوٰۃ دیتے رہے، اور میرے رسولوں

پر ایمان لائے، اور ان کی مدد کی اور اللہ کو اچھا قرض دیا، تو' میں' ضرور تمہاری برائیاں تم سے دور کر دونگا، اور ضرور تمہیں ایسے باغوں میں داخل کرونگا، جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہونگی''۔ (سورۃ المائدہ۔۱۲)

آیت نمبر (۴۱) وَاٰمِنُوْا بِمَآ اَنْزَلْتُ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ وَلَا تَكُوْنُوْٓا اَوَّلَ كَافِرٍۭ بِهٖ ۠ وَلَا تَشْتَرُوْا بِاٰيٰتِيْ ثَمَنًا قَلِيْلًا ۠ وَّاِيَّايَ فَاتَّقُوْنِ ﴿۴۱﴾

ترجمہ: ''اور تم ایمان لاؤ اس پر جو میں نے نازل کیا، جو تصدیق کرنے والی ہے ان کتابوں کی جو تمہارے پاس ہیں اور تم سب سے پہلے انکار کرنے والے نہ بنو اس کے اور نہ بیچو میری آیتوں کو تھوڑی قیمت پر، اور مجھ ہی سے ڈرو''۔

تفسیر

قرآن پر ایمان

اللہ تعالیٰ یہودیوں کو خطاب کرتے ہوئے فرماتا ہے کہ اس کتاب قرآن مجید پر ایمان لاؤ جو میں نے محمد ﷺ پر نازل کی ہے۔ اس کے ایمان لانے کی پہلی بنیاد یہی ہے کہ یہ اللہ کی طرف سے نازل ہوئی کتاب ہے۔ جس طرح تم تورات پر ایمان لائے ہو کہ وہ اللہ کا کلام ہے، اسی طرح یہ بھی اللہ کا اتارا ہوا کلام ہے، لہٰذا اس پر ایمان لانا تم پر لازم ہے۔ مزید یہ کہ قرآن، اس کتاب کی تصدیق کرتا ہے جو موسیٰؑ پر نازل ہوئی تھی یعنی تورات، اور چونکہ تورات میں آخری نبی کی آمد کا ذکر بھی موجود ہے، اس لئے سب سے پہلے ایمان لانے والے تمہیں ہونا چاہیے۔

اس آیت میں یہ بھی فرمایا گیا ہے کہ تم سب سے پہلے انکار کرنے والوں میں شامل نہ ہو۔ اگرچہ مکہ کے مشرکین پہلے ہی انکار کر چکے تھے، مگر ان کا انکار لاعلمی اور جہالت کی بنا پر تھا۔ مدینہ میں ہجرت کے بعد سورۃ البقرۃ پہلی سورت ہے جو نازل ہوئی۔ یہاں پہلا سامنا اہلِ کتاب سے تھا، اور ان میں سب سے پہلے یہود تھے جو مدینہ وخیبر میں آباد تھے، جبکہ دوسری جماعت شام اور یمن میں مقیم تھی۔ یہود چونکہ اہلِ علم سمجھے جاتے تھے اور انبیائے کرام کی اولاد میں سے تھے، اس لئے اگر وہ محمد ﷺ کی نبوت اور قرآن کا انکار کرتے تو نصاریٰ (عیسائی) بھی ان کی پیروی میں انکار پر جم جاتے۔ اسی وجہ سے فرمایا گیا کہ: ''اے یہود! تم اہلِ کتاب میں سب سے پہلے منکر نہ بنو، ورنہ قیامت تک آنے والے تمام اہلِ کتاب کے انکار کا وبال بھی تمہارے سر لکھا جائے گا''۔

یہود کی عادت

اس کے بعد آگے کی آیات میں یہودیوں کی اس عادت کو بیان کیا گیا ہے کہ وہ اپنی خواہش اور مفاد کے

مطابق آسمانی کتابوں میں تحریف کرتے، کہیں گھٹا دیتے اور کہیں بڑھا دیتے۔ کبھی الفاظ بدل دیتے اور کبھی مفہوم کو توڑ مروڑ کر پیش کرتے۔ اس کے ساتھ یہ بھی حقیقت تھی کہ ان میں کوئی ایک عالم بھی ایسا نہ تھا جو پوری کتاب کا صحیح حافظ ہو۔ اس زمانے میں کوئی مضبوط لائبریری یا ذخیرۂ کتب بھی نہ تھا جہاں الہامی کتابوں کو محفوظ رکھا جاتا۔ لہٰذا ہر عالم کے پاس جو نسخہ ہوتا، وہی سند سمجھا جاتا اور اس طرح ان کے لئے اپنی بات کے ثبوت میں تبدیلی کرنا آسان تھا۔

اسی لئے اللہ تعالیٰ نے تنبیہ فرمائی: ''میری آیات کو نہ بدلو اور نہ ہی حق کو چھپاؤ تاکہ دنیاوی فائدہ حاصل کرو۔ اللہ سے ڈرو جیسا کہ اس سے ڈرنے کا حق ہے''۔

یہاں ''تھوڑی قیمت میں نہ بیچو'' کا یہ مطلب نہیں کہ زیادہ قیمت ملنے پر سودا کرلو، بلکہ اس کا اصل مفہوم یہ ہے کہ اللہ کے حکم اور اس کی کتاب کے مقابلے میں کسی دنیاوی مفاد کو ترجیح نہ دو۔ یہ حکم صرف اس وقت کے یہود کے لئے نہیں بلکہ قیامت تک آنے والے تمام خدا ترس اور متقی لوگوں کے لئے ہے۔ (فتح الباری)

آیت نمبر (۴۲) فَتَلَقّٰٓى اٰدَمُ مِنْ رَّبِّهٖ كَلِمٰتٍ فَتَابَ عَلَيْهِ ؕ اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ﴿۳۷﴾

ترجمہ: ''اور نہ ملاؤ حق کو باطل کے ساتھ اور نہ چھپاؤ حق کو، اس حال میں کہ تم جانتے ہو''۔

تفسیر

یہودی علماء کی تحریف

اس آیت میں یہودی علماء کی روش کو واضح کیا گیا ہے کہ وہ ''توریت'' میں تحریف کر چکے تھے۔ جو حق باتیں اب تک اس میں باقی تھیں، ان کو بھی باطل کے ساتھ خلط ملط کر دیتے۔ اگر کوئی شخص ان سے سوال کرتا تو اپنی خواہش کے مطابق جواب گھڑ کر بیان کر دیتے۔ اور جب کسی سائل کو خوش کرنا مقصود ہوتا یا اس سے رشوت پانے کی امید ہوتی تو اس کی مرضی کے مطابق ہی تفسیر بیان کر ڈالتے۔

مزید یہ کہ توریت میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی آمد کی جو واضح نشانیاں درج تھیں، انہیں دانستہ چھپا لیتے تاکہ ان کی حقیقت ظاہر نہ ہو۔ اسی لئے حکم دیا گیا کہ: حق کو باطل کے ساتھ نہ ملاؤ۔ تم اچھی طرح جانتے ہو کہ یہ عمل سراسر باطل ہے، پھر بھی تم اسے اختیار کرتے ہو اور یہ بھی جانتے ہو کہ اس کا انجام کتنا ہولناک ہے، اس کے باوجود ایسی حرکتوں سے باز نہیں آتے۔

آیت نمبر (۴۳) وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَارْكَعُوْا مَعَ الرّٰكِعِيْنَ ﴿۴۳﴾

ترجمہ: ''اور قائم کرو نماز اور ادا کرو زکوٰۃ اور رکوع کرو رکوع کرنے والوں کے ساتھ''۔

تفسیر

نماز اور زکوٰۃ

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے نماز قائم کرنے اور زکوٰۃ ادا کرنے کا حکم دیا ہے۔ نماز جسمانی عبادت ہے جبکہ زکوٰۃ مالی عبادت۔ قرآن مجید میں بارہا ان دونوں کو ساتھ ذکر کیا گیا ہے۔ یہ حکم تو سب کے لیے ہے لیکن خاص طور پر یہودیوں کو اس لیے مخاطب کیا گیا کہ ان کے اندر ''اقتدار اور مال کی حرص'' کا مرض عام تھا۔ نماز اور زکوٰۃ دونوں اس بیماری کا علاج ہیں۔ مزید یہ کہ یہودیوں کی نماز میں رکوع شامل نہ تھا، لہٰذا انہیں کہا گیا کہ اب وہ نماز پڑھو جو رسول اللہ ﷺ نے تعلیم فرمائی ہے۔

کچھ علما نے اس آیت سے نماز باجماعت کے وجوب پر استدلال کیا ہے۔ اور جن کے نزدیک جماعت واجب نہیں، وہ بھی اس کے افضل و اہم ہونے پر متفق ہیں۔ یوں یہ آیت نماز باجماعت کی فضیلت اور اس کی دینی حیثیت کو اجاگر کرتی ہے۔

سجدہ اور رکوع

قرآن مجید میں ارشاد ہے: وَارْكَعُوْا مَعَ الرّٰكِعِيْنَ۔

رکوع کے لغوی معنیٰ جھکنے کے ہیں اور بسا اوقات سجدہ کو بھی رکوع کہا جاتا ہے۔ لیکن یہاں رکوع کے لفظ سے مراد یہ ہے کہ یہود چونکہ بغیر رکوع کے نماز پڑھتے تھے، لہٰذا مسلمانوں کو حکم دیا گیا کہ وہ رکوع کے ساتھ نماز پڑھیں اور جماعت کے ساتھ نماز ادا کریں۔ اس آیت سے بظاہر جماعت کی فرضیت کا اشارہ ملتا ہے۔ امام احمدؒ کے نزدیک جماعت فرض ہے جبکہ دیگر فقہا کے نزدیک واجب یا سنت مؤکدہ ہے۔

حضرت ابو ہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے! میرا دل چاہا کہ لکڑیاں جمع کرنے کا حکم دوں، پھر اذان دی جائے اور کسی کو امام بنا کر مقرر کیا جائے اور میں خود ان لوگوں کے گھروں کی طرف جاؤں جو جماعت میں شریک نہ ہوئے، اور ان کے گھروں کو آگ لگا دوں''۔

(بخاری: ۶۴۴)

اسی طرح حضرت عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں: ''میں نے وہ زمانہ دیکھا ہے کہ جماعت کی نماز سے صرف وہی شخص پیچھے رہ جاتا تھا جس کا نفاق سب پر ظاہر ہو چکا ہوتا، یا پھر وہ بیمار ہوتا۔ بلکہ بیمار کا بھی یہ حال تھا کہ اگر دو آدمیوں کے سہارے چل کر آ سکتا تو ضرور جماعت میں حاضر ہوتا''۔

انہوں نے مزید فرمایا: ''رسول اللہ ﷺ نے ہمیں ہدایت کے جو طریقے بتائے ہیں ان میں سے ایک یہ بھی

ہے کہ نماز اسی مسجد میں ادا کی جائے جہاں اذان دی جاتی ہے''۔(مسلم:۵۵۰)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پیشین گوئی

اس آیت میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وہ صفات مراد ہیں جو تورات اور انجیل میں درج تھیں۔جیسا کہ ان میں لکھا ہے:''اے نبی! ہم نے آپ کو حق کا پیغام پہنچانے والا، خوشخبری دینے والا اور ڈرانے والا بنا کر بھیجا ہے۔آپ عرب کے ان امیوں کو آخرت کے عذاب سے بچانے والے ہیں۔آپ میرے بندے اور میرے رسول ہیں۔نہ بدزبان ہیں، نہ سخت دل، نہ بازاروں میں شور و ہنگامہ کرنے والے، نہ برائی کا بدلہ برائی سے دینے والے؛ بلکہ درگزر کرنے والے اور معاف کرنے والے ہیں۔اللہ اس وقت تک آپ کو دنیا سے نہ اٹھائے گا جب تک کہ آپ اس بگڑی ہوئی قوم کو سیدھا نہ کر دیں، یہاں تک کہ وہ 'لا الہ الا اللہ' کہنے لگیں۔اور آپ کی برکت سے اندھی آنکھیں روشن ہوں، بہرے کان سننے لگیں اور دلوں کے پردے ہٹ جائیں''۔(بخاری:۲۱۲۵)

آیت نمبر (۴۴) اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ وَاَنْتُمْ تَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿۴۴﴾

ترجمہ:''کیا تم حکم دیتے ہو لوگوں کو نیکی کا اور بھول جاتے ہو اپنے آپ کو؟ حالانکہ تم پڑھتے ہو کتاب، تو کیا تم عقل نہیں رکھتے؟''۔

تفسیر

مدینہ کے یہودی علماء کی تلقین

مدینہ اور اس کے اطراف کے کچھ یہودی علماء رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایمان لا چکے تھے اور اسلام قبول کر چکے تھے۔جب وہ اپنے علماء یہود سے دینی گفتگو کرتے تو وہ علماء چھپ کر ان سے یہ کہا کرتے:''یقیناً یہ نبی برحق ہیں، تم اسلام کو نہ چھوڑو اور محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اطاعت پر ثابت قدم رہو۔ہم کچھ مصلحتوں کی وجہ سے اسلام کا اظہار نہیں کرتے''۔

اس طرح یہودی علماء دل سے اسلام کی حقانیت کے قائل تھے اور دوسروں کو اس پر ثابت قدم رہنے کی تلقین بھی کرتے تھے، لیکن خود ایمان لانے کی جرأت نہ کرتے تھے۔اسی رویے پر اللہ تعالیٰ نے قرآن میں فرمایا:

''کیا تم لوگوں کو نیکی (ایمان لانے) کی دعوت دیتے ہو اور خود اپنی خبر نہیں لیتے؟ حالانکہ تم تورات پڑھتے ہو، تو کیا اتنی سی بات بھی نہیں سمجھتے؟''۔(یہاں نیکی سے مراد رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایمان لانا اور اسلام قبول کرنا ہے)۔

بُرے اعمال کی سزا

حدیث میں آتا ہے: حضرت اسامہ کی روایت میں ہے کہ ''قیامت کے دن ایک شخص کو جہنم میں لایا جائے گا، وہ آگ میں یوں گھومتا پھرے گا جیسے چکی کا پاٹ گھومتا ہے۔ دوزخی اس کے گرد جمع ہو کر کہیں گے: 'کیا تم وہی نہ تھے جو دنیا میں نیکی کا حکم دیتے اور برائی سے روکتے تھے؟' وہ کہے گا: ''میں نیکی کا حکم تو دیتا تھا لیکن خود عمل نہیں کرتا تھا اور برائی سے روکتا تھا مگر خود برے کام کرتا تھا''۔ (بخاری: ۷۰۹۸)

یہاں قابل غور بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان پر دوسروں کو نیکی کی دعوت دینے کی وجہ سے گرفت نہیں کی، بلکہ خود عمل نہ کرنے پر ملامت کی۔ اس سے یہ حقیقت واضح ہوئی کہ نیکی کی دعوت دینا اپنی جگہ ایک نیکی بلکہ واجب امر ہے، مگر اس کے ساتھ ساتھ واعظ کو خود بھی عمل پیرا ہونا چاہیے۔ البتہ اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ جو شخص خود عمل میں کوتاہی کرے وہ دوسروں کو نصیحت نہ کرے۔

بے عمل کی نصیحت

یہ آیت ہرگز اس بات کی دلیل نہیں کہ بے عمل شخص کو نصیحت کرنے کا حق نہیں۔ عمل کرنا ایک الگ فریضہ ہے اور نیکی کی دعوت دینا ایک الگ ذمہ داری۔ اگر کوئی شخص دونوں پہلوؤں پر عمل کرے تو بہترین ہے، یعنی خود بھی عامل اور دوسروں کے لیے داعی۔ لیکن اگر کوئی صرف عامل ہے مگر دعوت نہیں دیتا، یا دعوت دیتا ہے مگر خود عمل میں کمی رکھتا ہے تو دونوں کو برابر نہیں کہا جا سکتا۔ پھر بھی وہ اپنی ایک نیکی کا اجر پائے گا اور ایک کمی کا وبال اٹھائے گا۔

مثال کے طور پر: جو شخص نماز بھی پڑھتا ہے اور داڑھی بھی رکھتا ہے، وہ اعلیٰ درجے کا عمل کرنے والا ہے۔ لیکن اگر کوئی نماز پڑھتا ہے مگر داڑھی نہیں رکھتا تو یہ نہیں کہا جائے گا کہ چونکہ داڑھی نہیں رکھتا اس لیے نماز بھی نہ پڑھے۔ اسی طرح یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ وہ دوسروں کو داڑھی رکھنے کی ترغیب نہ دے۔

نصیحت کے لیے پرہیزگاری شرط نہیں

امام مالکؒ نے سعید بن جبیرؒ کا قول نقل کیا ہے: ''اگر کوئی شخص یہ طے کرے کہ جب تک میں تمام گناہوں کو چھوڑ نہ دوں تب تک کسی کو نصیحت نہیں کروں گا تو اس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ دنیا میں کوئی مبلغ باقی نہیں رہے گا، کیونکہ نبیوں کے سوا کوئی بھی گناہوں سے بالکل پاک نہیں''۔

حسن بصریؒ فرماتے ہیں: ''شیطان کی سب سے بڑی خواہش یہ ہے کہ لوگ اس وہم میں پڑ کر تبلیغ کا فریضہ ترک کر دیں کہ پہلے خود کامل ہو جاؤ، پھر دوسروں کو نصیحت کرو''۔ لہٰذا آیت کا مقصد یہ نہیں کہ بے عمل شخص دوسروں کو وعظ

نہ کرے، بلکہ یہ ہے کہ نصیحت کرنے والا خود بھی اپنے قول کے مطابق عمل کرے، کیونکہ بے عملی سے نصیحت کی تاثیر گھٹ جاتی ہے۔ اصل کمال یہ ہے کہ واعظ قول وفعل دونوں میں یکساں ہو۔

آیت نمبر (۴۵-۴۶) وَاسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ ؕ وَاِنَّهَا لَكَبِيْرَةٌ اِلَّا عَلَى الْخٰشِعِيْنَ ۙ﴿۴۵﴾ الَّذِيْنَ يَظُنُّوْنَ اَنَّهُمْ مُّلٰقُوْا رَبِّهِمْ وَاَنَّهُمْ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ ﴿۴۶﴾

ترجمہ: ''اور تم مدد مانگو صبر کے ذریعے اور نماز کے ذریعے اور بے شک وہ (نماز) بہت بھاری ہے، مگر ان پر نہیں جو عاجزی کرنے والے ہیں۔ وہ لوگ جو یقین رکھتے ہیں کہ وہ ضرور اپنے رب سے ملاقات کرنے والے ہیں اور بے شک وہ اسی کی طرف لوٹ کر جانے والے ہیں''۔

تفسیر ان آیتوں میں یہودیوں کو صاف طور پر سمجھا دیا گیا ہے کہ انہیں اسلام قبول کر لینا چاہیے، کیونکہ وہ بخوبی جانتے ہیں کہ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اللہ کے سچے رسول ہیں۔ لیکن مال و دولت اور عزت و جاہ کی محبت نے ان کے دلوں پر پردہ ڈال رکھا ہے۔ انہیں یہ اندیشہ تھا کہ اگر وہ ایمان لے آئیں گے تو نذرانے اور چڑھاوے چھن جائیں گے اور جو عزت و وجاہت قوم میں حاصل ہے وہ بھی ختم ہو جائے گی۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے ان کی اس بیماری کا علاج تجویز فرمایا کہ: صبر اور نماز سے مدد حاصل کرو یعنی ایمان لا کر صبر و نماز کو اپنی زندگی کا لازمی حصہ بناؤ۔ صبر مال کی محبت کو کم کرتا ہے اور نماز جاہ و منصب کی محبت کو دل سے نکال دیتی ہے۔ صبر اور نماز ایک مومن کے لیے دنیا کی مصیبتوں کو سہنے کا سب سے بڑا سہارا اور مضبوط ہتھیار ہیں۔ جب کوئی مصیبت آتی ہے تو بندہ نماز کے ذریعے اللہ سے مدد مانگتا ہے، اگر مصیبت ٹل گئی تو اللہ کا شکر ادا کرتا ہے اور اگر دور نہ بھی ہوئی تو صبر کے ذریعے اس پر ثابت قدم رہتا ہے اور اس کے بدلے میں اللہ کے یہاں اجر و ثواب پاتا ہے۔

حضرت حذیفہؓ روایت کرتے ہیں: ''غزوۂ خندق کے موقع پر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس واپس آیا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم چادر اوڑھے نماز میں مشغول تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عادت یہ تھی کہ جب بھی کوئی مشکل معاملہ پیش آتا تو فوراً نماز کا سہارا لیتے''۔

اسی طرح حضرت علیؓ فرماتے ہیں: ''غزوۂ بدر کی رات میں نے یہ منظر دیکھا کہ سب لوگ آرام سے سو رہے تھے مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مسلسل نماز اور دعا میں مصروف تھے اور صبح تک اللہ کے حضور گریہ وزاری کرتے رہے''۔ (ابن کثیر)

آیت نمبر (۴۷) يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِيَ الَّتِيْٓ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَاَنِّيْ فَضَّلْتُكُمْ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ﴿۴۷﴾

ترجمہ: ''اے بنی اسرائیل! یاد کرو میری وہ نعمت جو میں نے تم پر انعام کی اور بے شک میں نے تمہیں فضیلت دی تمام جہانوں پر''۔

تفسیر

بنی اسرائیل کے انعامات

یہاں سے بنی اسرائیل کو وہ عظیم انعامات یاد دلائے جا رہے ہیں جو ان پر کیے گئے تھے۔ ان میں سب سے بڑا انعام یہ تھا کہ انہیں تمام دنیا کی قوموں پر فضیلت عطا کی گئی۔ یعنی امتِ محمدیہ سے پہلے بنی اسرائیل کو سب سے افضل قوم کا درجہ حاصل تھا۔ لیکن جب انہوں نے اللہ کے احکام کو توڑا اور اس کی نافرمانی کی تو یہ شرف ان سے چھین لیا گیا اور امتِ محمدیہ کو ''خیر امت'' کا لقب دے کر دنیا میں سب سے بلند مقام عطا کیا گیا۔

یہ حقیقت بھی ان آیات میں واضح کی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے انعامات اور فضیلت کسی خاص نسل یا قوم کی میراث نہیں، بلکہ یہ ایمان اور اعمالِ صالحہ کے ساتھ وابستہ ہیں۔ جو قوم ایمان اور عملِ صالح پر قائم رہے گی، اللہ کا فضل اسی کے حصے میں آئے گا، اور جو اس راہ سے ہٹ جائے گی اس سے یہ شرف چھین لیا جائے گا۔

آیت نمبر (۴۸) وَاتَّقُوْا يَوْمًا لَّا تَجْزِيْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَيْـًٔا وَّلَا يُقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ وَّلَا يُؤْخَذُ مِنْهَا عَدْلٌ وَّلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ ﴿۴۸﴾

ترجمہ: ''اور ڈرو اس دن سے، جب کوئی جان کسی جان کے کچھ بھی کام نہ آئے گی اور نہ اس سے کوئی سفارش قبول کی جائے گی اور نہ اس سے کوئی بدلہ لیا جائے گا اور نہ ہی وہ مدد کیے جائیں گے''۔

تفسیر

کوئی کسی کی مدد نہ کر سکے گا

اس آیت میں بنی اسرائیل کو قیامت کے دن کے بارے میں تنبیہ کی گئی ہے کہ وہاں نہ کوئی کسی کے کام آئے گا، نہ سفارش قبول کی جائے گی، نہ کسی فدیے کے ذریعے چھٹکارا مل سکے گا اور نہ ہی کوئی مددگار موجود ہوگا۔

بنی اسرائیل کا یہ گمان تھا کہ چونکہ ہم اللہ کے محبوب اور برگزیدہ ہیں، نبیوں کی اولاد ہیں، اس لیے ہمیں عذاب نہیں دیا جائے گا اور ہمارے انبیاء ہمیں اللہ کے عذاب سے بچا لیں گے۔ مگر اللہ تعالیٰ نے صاف فرما دیا کہ قیامت کے دن نافرمانوں کو کوئی سہارا نہیں ملے گا۔

اسی فریب میں آج کے بہت سے مسلمان بھی مبتلا ہیں۔ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شفاعت انہیں ہر حال میں بچا لے گی، اس لیے برے اعمال کرتے رہتے ہیں۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شفاعت

یقینی طور پر ہوگی اور اللہ تعالیٰ اسے قبول بھی فرمائے گا، لیکن یہ شفاعت مشرکین کے لیے نہیں ہوگی۔ حدیثوں میں واضح طور پر آیا ہے کہ شرک کرنے والے اس شرف سے محروم رہیں گے۔

یہ آیت دراصل کافروں کے لیے شفاعت کی نفی کرتی ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''فَمَا تَنْفَعُهُمْ شَفَاعَةُ الشّٰفِعِيْنَ'' یعنی سفارش کرنے والوں کی سفارش انہیں کچھ فائدہ نہ دے سکے گی۔ (سورہ مدثر: ۴۸)

اسی طرح فرمایا: ''فَمَا لَنَا مِنْ شَافِعِيْنَ'' یعنی آج ہمارے لیے کوئی سفارش کرنے والا نہیں۔ (سورہ شعراء: ۱۰۰)

البتہ مؤمنین کے حق میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شفاعت ثابت ہے۔ یہی اہلِ سنت والجماعت کا عقیدہ ہے اور قرآن وسنت سے بھی یہی حقیقت واضح ہوتی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اہلِ ایمان کی شفاعت فرمائیں گے اور اللہ تعالیٰ ان کی شفاعت کو قبول کرے گا۔

یہ بھی درست ہے کہ بعض گناہگار مؤمنین کو دوزخ میں سزا دی جائے گی، لیکن بعد میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شفاعت سے انہیں نکال لیا جائے گا۔ اب سوال یہ ہے کہ کیا جہنم کی یہ سخت اور ناقابلِ برداشت سزا صرف اس امید پر مول لی جاسکتی ہے کہ شفاعت ہمیں آخر کار بچالے گی؟ کیا یہ عقل مندی ہے کہ انسان شفاعت کے بھروسے پر گناہوں میں ڈوبا رہے؟

آیت نمبر (۴۹) وَاِذْ نَجَّيْنٰكُمْ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ يَسُوْمُوْنَكُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ يُذَبِّحُوْنَ اَبْنَآءَكُمْ وَيَسْتَحْيُوْنَ نِسَآءَكُمْ ۭ وَفِيْ ذٰلِكُمْ بَلَآءٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَظِيْمٌ ﴿۴۹﴾

ترجمہ: ''اور جب ہم نے تمہیں نجات دی فرعون والوں سے، وہ دیتے تھے تمہیں سخت ترین عذاب، وہ ذبح کرتے تھے تمہارے بیٹوں کو اور زندہ رکھتے تھے تمہاری عورتوں کو اور اس میں تمہارے رب کی طرف سے بہت بڑی آزمائش تھی''۔

تفسیر

بنی اسرائیل پر اللہ تعالیٰ کی نعمتیں

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل پر اپنی نعمتوں کی تفصیل بیان فرمائی ہے۔ اگرچہ خطاب مدینہ کے یہودیوں سے ہے، مگر اس سے مراد ان کے باپ دادا ہیں۔ اور ''آلِ فرعون'' سے مراد فرعون اور اس کے پیروکار ہیں۔ مورخین کے مطابق اس فرعون کا نام میرن پتاہ (Merneptah) تھا۔

جب حضرت یوسفؑ نے کنعان سے اپنے والدین، بھائیوں اور دیگر رشتہ داروں کو مصر بلایا تو بادشاہِ مصر کے

حکم سے ان کے لیے زمینیں مخصوص کر دی گئیں۔ وہاں ان کی نسل میں خوب برکت ہوئی اور اولاد کی کثرت سے وہ تعداد میں بڑھتے چلے گئے۔ حضرت یوسفؑ اور حضرت عزیزؑ کے وصال کے بعد اگرچہ ان کی عزت وعظمت میں کمی آ گئی، لیکن ان کی آبادی پھیلتی رہی، یہاں تک کہ چار سو برس میں ان کی تعداد لاکھوں تک جا پہنچی۔

فرعون کا لقب اور ظلم

مصر کے بادشاہوں کا لقب ''فرعون'' ہوا کرتا تھا۔ میرن پتاہ نے ایک خواب دیکھا کہ بنی اسرائیل میں کوئی ایسا بچہ پیدا ہوگا جو اس کی سلطنت کے زوال کا سبب بنے گا۔ خواب کی وحشت سے اس نے ایک سفاک حکم جاری کیا کہ بنی اسرائیل کے ہر نومولود لڑکے کو قتل کر دیا جائے اور لڑکیوں کو لونڈی بنا لیا جائے۔

اس کے ساتھ ساتھ بنی اسرائیلیوں پر طرح طرح کے مظالم ڈھائے گئے۔ مردوں سے مشقت بھرے کام لیے جاتے، بھاری ٹیکس وصول کیے جاتے اور عورتوں کو کپڑے سلوانے پر مجبور کیا جاتا۔ گویا مصر کی سرزمین پر رہنے والے یہ مہاجر بنی اسرائیل، ظلم وذلت کی چکی میں پستے رہے۔

نجات اور آزمائش

اسی سخت آزمائش کی طرف اس آیت میں اشارہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو ان مظالم سے حضرت موسیٰؑ کے ذریعے نجات عطا کی۔ اور آخر میں فرمایا کہ یہ ایک بڑی آزمائش تھی۔ اس سے یہ حقیقت بھی واضح ہوتی ہے کہ اللہ کی آزمائشیں مختلف صورتوں میں آتی ہیں، کبھی راحت میں اور کبھی سختیوں میں۔

آیت نمبر(۵۰) وَاِذْ فَرَقْنَا بِكُمُ الْبَحْرَ فَاَنْجَيْنٰكُمْ وَاَغْرَقْنَآ اٰلَ فِرْعَوْنَ وَاَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ۝۵۰

ترجمہ: ''اور جب ہم نے تمہارے لیے سمندر کو پھاڑا، تو ہم نے تمہیں نجات دی اور غرق کر دیا فرعون والوں کو اور تم دیکھ رہے تھے''۔

تفسیر

بنی اسرائیل اور فرعون

اس آیت میں بنی اسرائیل پر دوسرا انعام یاد دلایا گیا ہے۔ اے مدینہ کے یہود! اس نعمت کو یاد کرو کہ جب ہم نے سمندر کو پھاڑ کر تمہارے لیے راستہ بنا دیا اور تمہیں ڈوبنے سے بچا لیا۔

یہ واقعہ اس وقت پیش آیا جب حضرت موسیٰؑ بنی اسرائیل کے ایک گھرانے میں پیدا ہوئے، مگر اللہ کی حکمت

سے فرعون کے محل ہی میں پروان چڑھے۔ پھر ایک موقع پر ایک مصری کے دھوکے سے قتل ہونے پر فرعون کی گرفت سے نکل کر مدین جا پہنچے۔ طویل عرصے کے بعد اللہ تعالیٰ نے انہیں نبوت عطا فرمائی اور وہ واپس مصر آئے۔ برسوں تک انہوں نے فرعون کو اللہ کی طرف بلایا، مگر وہ سرکشی پر قائم رہا۔ آخر کار اللہ کا حکم ہوا کہ حضرت موسیٰؑ بنی اسرائیل کو ساتھ لے کر خاموشی کے ساتھ مصر سے نکل جائیں۔

جب وہ سمندر کے کنارے پہنچے تو پیچھے فرعون کی فوج تعاقب میں تھی۔ ایسے وقت میں اللہ کے حکم سے حضرت موسیٰؑ نے اپنی لاٹھی سمندر پر ماری، تو پانی دو حصوں میں تقسیم ہو گیا اور درمیان میں خشک راستہ بن گیا۔ بنی اسرائیل سکون کے ساتھ گزر گئے اور دوسرے کنارہ تک پہنچ گئے۔ لیکن جب فرعون اپنی فوج کے ساتھ اسی راستے پر اترا تو پانی نے ہر طرف سے انہیں گھیر لیا اور وہ سب ڈوب کر ہلاک ہو گئے۔ یہ منظر بنی اسرائیل نے اپنی آنکھوں سے دیکھا۔

عاشورہ کا روزہ

حضرت ابن عباسؓ روایت کرتے ہیں کہ جب رسول اللہ ﷺ مدینہ تشریف لائے تو دیکھا کہ یہود محرم کی دسویں تاریخ کو روزہ رکھتے ہیں۔ آپ ﷺ نے ان سے دریافت فرمایا: ''یہ کون سا روزہ ہے؟'' انہوں نے عرض کیا: ''یہ وہ دن ہے جب اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰؑ اور بنی اسرائیل کو ان کے دشمنوں سے نجات عطا کی تھی، اس شکرانے کے طور پر حضرت موسیٰؑ نے روزہ رکھا تھا۔'' اس پر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''میں موسیٰؑ کا تم سے زیادہ حقدار ہوں۔'' پھر آپ ﷺ نے خود بھی روزہ رکھا اور دوسروں کو بھی روزہ رکھنے کا حکم فرمایا۔ **(بخاری: ۲۰۰۴)**

❁❁❁

ترجمہ آیت نمبر ۵۱ سے ۶۰ تک

وَاِذْ وٰعَدْنَا مُوْسٰٓى اَرْبَعِيْنَ لَيْلَةً ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ مِنْۢ بَعْدِهٖ وَاَنْتُمْ ظٰلِمُوْنَ ﴿۵۱﴾ ثُمَّ عَفَوْنَا عَنْكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۵۲﴾ وَاِذْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ وَالْفُرْقَانَ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ﴿۵۳﴾ وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ يٰقَوْمِ اِنَّكُمْ ظَلَمْتُمْ اَنْفُسَكُمْ بِاتِّخَاذِكُمُ الْعِجْلَ فَتُوْبُوْٓا اِلٰى بَارِئِكُمْ فَاقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ ؕ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ عِنْدَ بَارِئِكُمْ ؕ فَتَابَ عَلَيْكُمْ ؕ اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ﴿۵۴﴾ وَاِذْ قُلْتُمْ يٰمُوْسٰى لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى نَرَى اللّٰهَ جَهْرَةً فَاَخَذَتْكُمُ الصّٰعِقَةُ وَاَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ ﴿۵۵﴾ ثُمَّ بَعَثْنٰكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَوْتِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۵۶﴾ وَظَلَّلْنَا عَلَيْكُمُ الْغَمَامَ وَاَنْزَلْنَا عَلَيْكُمُ الْمَنَّ وَالسَّلْوٰى ؕ كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ ؕ وَمَا ظَلَمُوْنَا وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ﴿۵۷﴾ وَاِذْ قُلْنَا ادْخُلُوْا هٰذِهِ الْقَرْيَةَ فَكُلُوْا مِنْهَا حَيْثُ شِئْتُمْ رَغَدًا وَّادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا وَّقُوْلُوْا حِطَّةٌ نَّغْفِرْ لَكُمْ خَطٰيٰكُمْ ؕ وَسَنَزِيْدُ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۵۸﴾ فَبَدَّلَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا قَوْلًا غَيْرَ الَّذِيْ قِيْلَ لَهُمْ فَاَنْزَلْنَا عَلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا رِجْزًا مِّنَ السَّمَآءِ بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ ﴿۵۹﴾ وَاِذِ اسْتَسْقٰى مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ فَقُلْنَا اضْرِبْ بِّعَصَاكَ الْحَجَرَ ؕ فَانْفَجَرَتْ مِنْهُ اثْنَتَا عَشْرَةَ عَيْنًا ؕ قَدْ عَلِمَ كُلُّ اُنَاسٍ مَّشْرَبَهُمْ ؕ كُلُوْا وَاشْرَبُوْا مِنْ رِّزْقِ اللّٰهِ وَلَا تَعْثَوْا فِى الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ ﴿۶۰﴾

ترجمہ:

(۵۱)۔اور جب ہم نے موسیٰؑ سے چالیس راتوں کا وعدہ کیا،تو تم نے بنالیا بچھڑے کو(معبود)،اس کے (موسیٰؑ کے) جانے کے بعداورتم ظلم کررہے تھے۔(۵۲)۔پھرہم نے معاف کردیاتمہیں اس کے بعدبھی،تاکہ تم شکر کرو۔(۵۳)۔اور جب ہم نے دی موسیٰؑ کو کتاب اورفرقان (حق و باطل میں فرق کرنے والی چیز)،تاکہ تم ہدایت حاصل کرو۔(۵۴)۔اور جب کہا موسیٰؑ نے اپنی قوم سے:اے میری قوم!بے شک تم نے ظلم کیااپنے آپ پر،بچھڑے کو(معبود) بنا کر،پس توبہ کرواپنے پیدا کرنے والے کی طرف اورقتل کرواپنے آپ کو۔یہی ہے بہترتمہارے لیے تمہارے پیدا کرنے والے کے نزدیک،تواس نے تمہاری توبہ قبول کرلی۔بے شک وہی بہت توبہ قبول کرنے والا،بڑا مہربان ہے۔(۵۵)۔اور جب تم نے کہا:اے موسیٰؑ!ہم ہرگز ایمان نہیں لائیں گے آپ پر،جب تک کہ ہم اللہ کوعلانیہ نہ دیکھ لیں،تو پکڑ لیاتمہیں بجلی (کے عذاب) نے اورتم دیکھ رہے تھے۔(۵۶)۔پھرہم نے زندہ کیاتمہیں تمہاری موت

کے بعد، تاکہ تم شکر کرو۔(۵۷)۔اور ہم نے سایہ کیا تم پر بادلوں کا اور نازل کیا تم پر من وسلویٰ، (کہا:) کھاؤ ان پاکیزہ چیزوں میں سے جو ہم نے تمہیں دیں اور انہوں نے ہم پر ظلم نہ کیا، لیکن وہ خود اپنی جانوں پر ظلم کرتے تھے۔(۵۸)۔اور جب ہم نے کہا: داخل ہو جاؤ اس بستی میں اور کھاؤ اس میں سے جہاں سے چاہو سیر ہو کر اور داخل ہونا دروازے میں سجدہ کرتے ہوئے اور کہنا بخشش مانگتے ہوئے (تو) ہم معاف کر دیں گے تمہاری خطائیں اور جلد ہی ہم زیادہ دیں گے نیکی کرنے والوں کو۔(۵۹)۔پھر بدل دیا ان لوگوں نے جنہوں نے ظلم کیا، بات کو خلاف اس کے جو کہی گئی تھی ان سے، تو ہم نے نازل کیا ظلم کرنے والوں پر عذاب آسمان سے، اس وجہ سے کہ وہ نافرمانیاں کرتے تھے۔(۶۰)۔اور جب پانی مانگا موسیٰؑ نے اپنی قوم کے لیے، تو ہم نے کہا: مارو اپنے عصا سے پتھر پر، تو پھوٹ نکلے اس سے بارہ چشمے، تو جان لیا سب لوگوں نے اپنی اپنی پینے کی جگہ، (ہم نے کہا:) کھاؤ اور پیو اللہ کے رزق سے اور نہ پھرو زمین میں فساد کرتے ہوئے۔

تفسیر آیت نمبر ۵۱ سے ۶۰ تک

آیت نمبر(۵۱) وَاِذْ وٰعَدْنَا مُوْسٰٓى اَرْبَعِيْنَ لَيْلَةً ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ مِنْۢ بَعْدِهٖ وَاَنْتُمْ ظٰلِمُوْنَ ﴿۵۱﴾

ترجمہ: ''اور جب ہم نے موسیٰؑ سے چالیس راتوں کا وعدہ کیا، تو تم نے بنا لیا بچھڑے کو (معبود)، اس کے (موسیٰؑ کے) جانے کے بعد اور تم ظلم کر رہے تھے''۔

تفسیر

حضرت موسیٰؑ کا کوہِ طور پر جانا

جب حضرت موسیٰؑ 'بحرِ قلزم' کو پار کر کے 'وادیِ تیہہ' میں پہنچے، جہاں سے انہیں اپنے وطن فلسطین جانا تھا، تو اللہ تعالیٰ نے انہیں حکم فرمایا: ''اے موسیٰؑ! ہمارے حضور کوہِ طور پر آؤ اور ایک ماہ تک عبادت میں مشغول رہو تاکہ تمہیں کتابِ توریت عطا کی جائے''۔اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق حضرت موسیٰؑ اپنی قوم سے تیس راتوں کا وعدہ کر کے کوہِ طور پر تشریف لے گئے، لیکن وہاں انہیں مزید دس راتیں قیام کرنے کا حکم ملا۔جب ایک مہینہ گزر گیا اور حضرت موسیٰؑ واپس نہ آئے، تو بنی اسرائیل میں یہ افواہ پھیل گئی کہ حضرت موسیٰؑ وفات پا گئے ہیں۔

سامری کا بچھڑا

جب بنی اسرائیل مصر سے نکلنے لگے تو انہوں نے قبطیوں سے (جو مصر کے اصل باشندے تھے) زیورات

مانگ لئے۔ انہی زیورات کو ایک شخص 'سامری' نے جمع کیا جو پیشے سے سنار تھا۔ اس نے ان زیورات کو پگھلا کر ایک بچھڑے کی مورت بنا ڈالی اور اس کے منہ میں ایک خاص مٹی ڈال دی۔ اللہ تعالیٰ کے حکم سے اس مٹی میں ایسا اثر پیدا ہوا کہ اس بچھڑے سے بیل کی سی آواز آنے لگی۔

چونکہ مصر کے لوگ گائے، بیل اور بلی کی پرستش کرتے تھے، اس لیے بنی اسرائیل بھی ان کے رنگ میں رنگے گئے تھے۔ جب اس بچھڑے کی آواز سنی تو کہنے لگے: ''یہی ہمارا معبود ہے۔'' اور اسی کے آگے جھکنے لگے۔

حضرت ہارونؑ کو حضرت موسیٰؑ بنی اسرائیل کی نگرانی پر چھوڑ گئے تھے۔ انہوں نے سختی سے سمجھایا کہ ''یہ بچھڑا معبود نہیں بلکہ کھلا ہوا شرک ہے، صبر کرو اور حضرت موسیٰؑ کا انتظار کرو۔'' لیکن اکثر لوگوں نے ان کی بات ماننے سے انکار کر دیا، یہاں تک کہ انہیں قتل کرنے پر آمادہ ہو گئے۔ اس صورتِ حال میں حضرت ہارونؑ خاموش ہو گئے اور چند افراد کے سوا باقی سب بچھڑے کی پرستش کرنے لگے۔

بچھڑے کا انجام

جب حضرت موسیٰؑ توریت کی تختیاں لے کر واپس آئے اور اپنی قوم کی اس حرکت کو دیکھا تو نہایت غضبناک ہوئے۔ اپنے بھائی حضرت ہارونؑ پر بھی خفا ہوئے کہ ''میں نے تمہیں اپنا نائب بنایا تھا، پھر تم نے ان کو کیوں نہ روکا؟'' حضرت ہارونؑ نے عرض کیا: ''میں نے روکا تھا لیکن اگر سختی کرتا تو یہ مجھے قتل کر ڈالتے''۔ پھر حضرت موسیٰؑ نے سامری سے باز پرس کی: ''تم نے یہ شرارت کیوں کی؟'' اس نے سارا واقعہ بیان کر دیا۔ اس پر حضرت موسیٰؑ نے اس پر بددعا کی اور فرمایا: ''اللہ نے تجھ پر یہ سزا مقرر کر دی ہے کہ زندگی بھر تو جسے دیکھے گا کہے گا: مجھے نہ چھونا''۔ چنانچہ وہ کوڑھ کی بیماری میں مبتلا ہو گیا۔ نہ کوئی اس کے قریب آتا اور نہ وہ کسی کو چھو سکتا۔ اسی حالت میں وہ مر گیا۔ اس کے بعد حضرت موسیٰؑ نے اس بچھڑے کو جلا کر اس کی راکھ سمندر میں بہا دی۔

آیت نمبر (۵۲) ثُمَّ عَفَوْنَا عَنْكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۵۲﴾

ترجمہ: ''پھر ہم نے معاف کر دیا تمہیں اس کے بعد بھی، تاکہ تم شکر کرو''۔

تفسیر ان آیتوں میں انہیں یاد دلایا گیا ہے کہ اس جرمِ عظیم کو اللہ تعالیٰ نے معاف کر دیا تاکہ وہ شکر کے طور پر اس کی طرف رجوع ہوں یہ ان کے توبہ کرنے کے بعد کی بات ہے ان کی توبہ کا ذکر آگے کی آیت میں ہے۔

آیت نمبر (۵۳) وَاِذْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ وَالْفُرْقَانَ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ﴿۵۳﴾

ترجمہ: ''اور جب ہم نے دی موسیٰؑ کو کتاب اور فرقان (حق و باطل میں فرق کرنے والی چیز)، تاکہ تم ہدایت حاصل کرو''۔

تفسیر اس آیت میں تورات کے عطا کیے جانے کا ذکر ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰؑ کو ان کی رہنمائی کے لیے توریت عطا فرمائی۔ یہ اللہ کی ایک عظیم نعمت تھی، جس کی یاد دہانی اس لیے کرائی گئی کہ اس میں موجود بشارت کے مطابق وہ رسول اللہ ﷺ پر ایمان لائیں اور دینِ اسلام پر عمل کر کے گمراہی سے نجات حاصل کریں۔

یہاں لفظ 'کتاب' سے مراد بعض مفسرین کے نزدیک 'تورات' ہے، جس کی ایک نمایاں صفت 'فرقان' ہے، یعنی وہ کتاب جو حق و باطل کے درمیان امتیاز قائم کرتی ہے۔ جبکہ بعض اہلِ علم نے 'کتاب' سے مراد تورات اور 'فرقان' سے مراد وہ معجزات لیے ہیں جو اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰؑ کو عطا فرمائے، تاکہ ان کے ذریعے کفر و ایمان میں فرق واضح ہو سکے۔

آیت نمبر (۵۴) وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ يٰقَوْمِ اِنَّكُمْ ظَلَمْتُمْ اَنْفُسَكُمْ بِاتِّخَاذِكُمُ الْعِجْلَ فَتُوْبُوْٓا اِلٰى بَارِئِكُمْ فَاقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ ؕ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ عِنْدَ بَارِئِكُمْ ؕ فَتَابَ عَلَيْكُمْ ؕ اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ﴿۵۴﴾

ترجمہ: ''اور جب کہا موسیٰؑ نے اپنی قوم سے: اے میری قوم! بے شک تم نے ظلم کیا اپنے آپ پر، بچھڑے کو (معبود) بنا کر، پس توبہ کرو اپنے پیدا کرنے والے کی طرف اور قتل کرو اپنے آپ کو۔ یہی ہے بہتر تمہارے لیے تمہارے پیدا کرنے والے کے نزدیک، تو اس نے تمہاری توبہ قبول کر لی۔ بے شک وہی بہت توبہ قبول کرنے والا، بڑا مہربان ہے''۔

بنی اسرائیل کی توبہ

تفسیر جب حضرت موسیٰؑ ''تورات'' لے کر واپس اپنی قوم کے پاس پہنچے تو دیکھا کہ بنی اسرائیل بچھڑے کی عبادت میں مشغول ہو چکے ہیں۔ یہ منظر دیکھ کر انہیں شدید غصہ آیا اور انہوں نے اپنی قوم کو بت پرستی سے توبہ کرنے پر آمادہ کیا۔ مفسرین کے بیان کے مطابق حکم ہوا کہ جن لوگوں نے بچھڑے کی عبادت نہیں کی تھی وہ ان لوگوں کو قتل کریں جنہوں نے یہ شرک کا ارتکاب کیا تھا۔

قتل کے اس حکم پر جب رشتہ دار اور عزیز ایک دوسرے کے مقابل آتے تو ان کے ہاتھ کانپنے لگتے اور وہ جھجک جاتے۔ تب اللہ تعالیٰ نے سیاہ بادل نازل فرما دیے تاکہ وہ ایک دوسرے کو پہچان نہ سکیں۔ یوں صبح سے شام تک

یہ سلسلہ جاری رہا۔ پھر حضرت موسیٰؑ اور حضرت ہارونؑ کی دعا کے نتیجے میں بادل ہٹ گیا اور توبہ کی راہ کھل گئی۔ اس وقت تک ستر ہزار افراد قتل ہو چکے تھے۔ جنہیں قتل کیا گیا وہ اللہ کی رحمت سے بخش دیے گئے اور جو باقی رہ گئے ان کی توبہ قبول فرمالی گئی۔ (بیضاوی، ابن کثیر)

یہ واقعہ اس حقیقت پر دلیل ہے کہ انسان کتنا ہی بڑا گناہ کرلے، اس کے لیے توبہ کا دروازہ ہمیشہ کھلا ہے۔ شرط یہ ہے کہ وہ اخلاص کے ساتھ پلٹ آئے، اسلام کو دل سے قبول کرے، اور توحید و رسالت پر ایمان لے آئے۔ تب ہی اس کی توبہ بارگاہِ الٰہی میں مقبول ہوتی ہے۔

آیت نمبر (۵۵-۵۶) وَاِذْ قُلْتُمْ يٰمُوْسٰى لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى نَرَى اللّٰهَ جَهْرَةً فَاَخَذَتْكُمُ الصّٰعِقَةُ وَاَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ ﴿۵۵﴾ ثُمَّ بَعَثْنٰكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَوْتِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۵۶﴾

ترجمہ: ''اور جب تم نے کہا: اے موسیٰؑ! ہم ہرگز ایمان نہیں لائیں گے آپ پر، جب تک کہ ہم اللہ کو علانیہ نہ دیکھ لیں، تو پکڑ لیا تمہیں بجلی (کے عذاب) نے اور تم دیکھ رہے تھے۔ پھر ہم نے زندہ کیا تمہیں تمہاری موت کے بعد، تاکہ تم شکر کرو''۔

تفسیر

بنی اسرائیل کا سوال

بنی اسرائیل نے حضرت موسیٰؑ سے کہا کہ آپ جو کچھ فرما رہے ہیں کہ یہ اللہ کی کتاب ہے، اس کی کیا دلیل ہے؟ ہم تو اس وقت مانیں گے جب اللہ تعالیٰ خود ہم سے خطاب کرے اور فرمائے کہ یہ میری کتاب ہے۔ حضرت موسیٰؑ نے جواب دیا: ''چلو، جو لوگ میرے ساتھ آنا چاہیں، وہ روزہ رکھیں اور طہارت و پاکیزگی کے ساتھ چلیں۔'' چنانچہ حضرت موسیٰؑ ستر آدمیوں کو ساتھ لے گئے۔ وہاں انہوں نے اللہ کا کلام سن کر اطمینان پایا، لیکن پھر بھی کہنے لگے: ''ہم اس وقت مانیں گے جب اللہ کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں۔''

ان کی یہ جسارت تھی کہ اچانک آسمانی بجلی کی کڑک نے ان کی جان لے لی۔ یہ منظر دیکھ کر حضرت موسیٰؑ کے دل میں خیال گزرا کہ بنی اسرائیل تو یہ کہیں گے کہ موسیٰؑ نے اپنے ساتھیوں کو ہلاک کروا دیا۔ اس پر حضرت موسیٰؑ نے عاجزی سے دعا کی اور اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت سے انہیں دوبارہ زندگی عطا فرمادی۔ یہ ان پر اللہ کا ایک اور عظیم احسان تھا۔ (ابن کثیر، بیضاوی)

یہ واقعہ اس بات کی واضح دلیل ہے کہ دنیا میں اللہ تعالیٰ کو دیکھنا ممکن نہیں، البتہ آخرت میں اہلِ ایمان اور

صادقین کو یہ سعادت نصیب ہوگی کہ وہ اپنے رب کا دیدار کر سکیں گے۔

اس آیت سے متعلق بعض غیر مسلموں کے اشکالات کا جواب:

اعتراض: بنی اسرائیل کو بجلی نے مار دیا اور پھر اللہ نے انہیں زندہ کر دیا یہ کیسے ممکن ہے؟

جواب: لفظ صٰعِقَة قرآن میں ہمیشہ ''شدید آواز، بجلی کی کڑک یا خوفناک منظر دیکھ کر بیہوش ہونا'' کے معنیٰ میں آتا ہے، نہ کہ ہمیشہ ''جل کر مر جانا'' کے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَخَرَّ مُوْسٰى صَعِقًا فَلَمَّآ اَفَاقَ۔ (اعراف: ۱۴۳) یعنی 'موسیٰؑ بیہوش ہو گئے تھے، پھر ہوش میں آئے'۔

اسی طرح یہاں بھی مطلب یہ ہے کہ بنی اسرائیل ''شدید آواز و منظر سے بیہوش'' ہو گئے تھے۔ لفظ موت قرآن میں ہمیشہ 'جسمانی موت' نہیں، بلکہ 'نیند، غشی، یا نشو و نما رک جانے' کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے جیسے: اَلَّذِيْ يَتَوَفّٰىكُمْ بِالَّيْلِ (الانعام: ۶۰) یعنی 'وہ اللہ ہے جو رات کو تمہیں (نیند میں) موت دیتا ہے'۔

لہٰذا آیت کا مطلب یہ ہے کہ ''تم خوفناک آواز سے بیہوش ہو گئے، پھر ہم نے تمہیں تمہاری موت (یعنی غشی اور حواس کھو جانے) کے بعد دوبارہ زندہ کیا تا کہ تم شکر گزار بنو''۔ یہ کوئی حقیقی موت اور دوبارہ حیات نہیں، بلکہ بیہوشی کے بعد ہوش میں آنا ہے۔

عقلی پہلو: اللہ تعالیٰ کے لیے ''موت دینا اور زندہ کرنا'' کوئی مشکل نہیں، لیکن یہاں 'موت' نیند اور بیہوشی کے معنیٰ میں ہے، جو روزانہ کا مشاہدہ ہے۔ انسان جب بیہوش ہوتا ہے تو ایک 'عارضی موت' کی کیفیت ہوتی ہے۔ پھر ہوش میں آنے پر وہ دوبارہ زندہ جیسا محسوس کرتا ہے۔ اس لیے اس آیت میں کوئی غیر عقلی یا ناقابلِ یقین بات نہیں، بلکہ فطری اور عقل سے قریب بات ہے۔

سائنسی پہلو: میڈیکل سائنس میں بھی ثابت ہے کہ بعض شدید صدمات (Trauma, Shock) سے انسان کا Nervous System بند ہو جاتا ہے اور وہ Coma یا Unconscious State میں چلا جاتا ہے۔ جدید طب میں بھی اسے Clinical Death کہا جاتا ہے، جب دماغی یا جسمانی افعال رک جائیں لیکن پھر Revival ممکن ہو۔ کئی بار بجلی کے جھٹکے، دھماکے کی آواز، یا خوفناک Shock انسان کو بیہوش کر دیتے ہیں، لیکن بعد میں وہ Revive (زندہ) ہو جاتا ہے۔ قرآن کا بیان اسی حقیقت کو واضح کرتا ہے۔

نفسیاتی پہلو: بنی اسرائیل نے اللہ کی نشانی دیکھنے کے باوجود ضد اور ہٹ دھرمی کی۔ جب ان پر اللہ کی قدرتی نشانی ظاہر ہوئی (سخت آواز/کڑک)، وہ شدید خوف اور Trauma میں آ گئے اور اجتماعی طور پر بیہوش ہو گئے۔ یہ ایک Psychological Collapse تھا۔ پھر جب اللہ نے انہیں دوبارہ ہوش دیا تو وہ اس نعمت کو سمجھ کر شکر گزار ہونے پر

مجبور ہوئے۔ قرآن نے اس کو 'موت' اور 'بعث' کے الفاظ سے بیان کیا تا کہ واقعے کی شدت واضح ہو۔

خلاصہ یہ کہ لفظ 'صاعقہ' اور 'موت' قرآن میں ہمیشہ حقیقی موت کے معنیٰ میں نہیں، بلکہ 'بیہوشی، نیند یا قوی صدمہ' کے معنیٰ میں بھی آتے ہیں۔ یہ واقعہ اصل میں شدید آواز یا منظر سے بیہوشی کا تھا، پھر اللہ نے انہیں دوبارہ ہوش دیا۔ سائنسی طور پر آج بھی Shock یا بجلی کے جھٹکے سے انسان بے ہوش ہو کر Revive ہو سکتا ہے۔ نفسیاتی طور پر یہ بنی اسرائیل کے لیے ایک سبق آموز صدمہ تھا تا کہ وہ اللہ کی نعمتوں کو پہچانیں۔ لہٰذا یہ آیت کوئی خلافِ عقل یا ناقابلِ یقین قصہ نہیں، بلکہ ایک سائنسی و نفسیاتی حقیقت کی طرف اشارہ ہے جسے قرآن نے موت اور زندگی کے الفاظ سے بیان کیا ہے۔

آیت نمبر (۵۷) وَظَلَّلْنَا عَلَيْكُمُ الْغَمَامَ وَاَنْزَلْنَا عَلَيْكُمُ الْمَنَّ وَالسَّلْوٰى ؕ كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ ؕ وَمَا ظَلَمُوْنَا وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ۝۵۷

ترجمہ: ''اور ہم نے سایہ کیا تم پر بادلوں کا اور نازل کیا تم پر من وسلویٰ، (کہا:) کھاؤ ان پاکیزہ چیزوں میں سے جو ہم نے تمہیں دیں اور انہوں نے ہم پر ظلم نہ کیا، لیکن وہ خود اپنی جانوں پر ظلم کرتے تھے''۔

تفسیر میدانِ تیہ میں بنی اسرائیل کا من وسلویٰ

بادلوں کا سایہ اور ''من وسلویٰ'' کا واقعہ وادیِ تیہ میں اس وقت پیش آیا جب بنی اسرائیل اپنے اصل وطن، ملک شام، کو لوٹنے کے ارادے سے نکلے۔ حضرت یوسفؑ کے زمانے میں یہ مصر آ کر آباد ہو گئے تھے اور اسی دوران شام میں ''عمالقہ'' نامی قوم کو غلبہ حاصل ہو گیا تھا۔ فرعون کی ہلاکت کے بعد جب یہ لوگ آزاد اور مطمئن ہوئے تو اللہ تعالیٰ نے انہیں حکم دیا کہ شام جا کر عمالقہ کے خلاف جہاد کریں اور اپنی سرزمین ان کے قبضے سے واپس لیں۔ لیکن جب انہوں نے عمالقہ کی طاقت اور قوت کا حال سنا تو خوف زدہ ہو کر جہاد سے انکار کر دیا۔ اس نافرمانی کی سزا یہ ملی کہ چالیس برس تک ایک ہی میدان میں بھٹکتے رہے اور اپنے گھروں کو واپس نہ پہنچ سکے۔

یہ علاقہ نہایت وسیع نہ تھا بلکہ مصر اور شریا کے درمیان کوئی دس میل کے رقبے پر مشتمل ایک میدان تھا۔ دن بھر سفر کرتے اور جب شام کو کسی جگہ اترتے تو صبح دیکھتے کہ وہیں موجود ہیں جہاں سے چلے تھے۔ یوں چالیس برس مسلسل پریشانی اور حیرانی میں گزارتے رہے۔ اسی وجہ سے اس جگہ کو ''وادیِ تیہ'' کہا گیا، کیونکہ ''تیہ'' کا مطلب ہی ہے بھٹک جانا اور پریشانی میں پڑنا۔

یہ میدان بالکل کھلا اور سنسان تھا، نہ وہاں کوئی عمارت تھی نہ درخت جس کے سائے میں آرام ملتا۔ نہ کھانے

پینے کا کوئی سامان تھا اور نہ لباس میسر تھا۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی حضرت موسیٰؑ کی دعا سے معجزانہ طور پر ان کی ہر ضرورت پوری فرمائی۔

من وسلویٰ

مفسرین کے مطابق ''من'' ایک قسم کی شیریں گوند تھی جو پیڑ سے حاصل ہوتی اور ''سلویٰ'' بٹیر کی مانند ایک پرندہ تھا جو ان کے قریب آجاتا اور پکڑنے سے نہ بھاگتا۔ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ کھنبی ''من'' کی ہی ایک قسم ہے، کیونکہ یہ بھی بغیر مشقت کے حاصل ہوجاتی ہے اور اس کے پانی میں آنکھوں کے لئے شفا ہے۔ **(صحیح بخاری، التفسیر، باب ۴، حدیث ۴۴۷۸)**

بنی اسرائیل کی ضروریات

جب بنی اسرائیل نے دھوپ کی شدت کی شکایت کی تو اللہ تعالیٰ نے ان پر سفید بادل کا سایہ کر دیا۔ بھوک کے لئے ''من'' اور ''سلویٰ'' مہیا کر دیے گئے۔ پیڑوں سے میٹھی گوند جیسی چیز اترتی جسے یہ جمع کرتے اور بٹیر کے مانند پرندے ان کے ہاتھوں میں آجاتے جنہیں یہ ذبح کر کے کھاتے۔ جب پیاس لگی تو حضرت موسیٰؑ کو ایک پتھر پر عصا مارنے کا حکم دیا گیا، جس سے بارہ چشمے پھوٹ پڑے۔ رات کے اندھیرے سے شکایت کی تو اللہ تعالیٰ نے ان کے درمیان نور پیدا کر دیا۔ کپڑے میلے اور پرانے ہونے لگے تو اللہ نے ایسا کر دیا کہ نہ وہ میلے ہوتے نہ پھٹتے، اور بچوں کے لباس ان کے بڑھتے جسموں کے ساتھ ساتھ خود بخود بڑے ہوجاتے۔ **(تفسیر قرطبی)**

انہیں حکم دیا گیا تھا کہ یہ نعمتیں بس ضرورت کے مطابق استعمال کریں، لیکن انہوں نے اس حکم کی خلاف ورزی کی اور گوشت وغیرہ جمع کرنے لگے۔ اس نافرمانی کا نتیجہ یہ نکلا کہ جو چیز ذخیرہ کرتے وہ سڑ جاتی اور یوں اپنی سرکشی سے خود ہی نقصان اٹھاتے رہے۔

اس آیت سے متعلق بعض غیر مسلموں کے اعتراض کا جواب:

اعتراض یہ ہے کہ: قرآن میں کہا گیا ہے کہ بنی اسرائیل پر ابر کا سایہ کیا گیا، یہ کون سا بڑا احسان ہے جو بار بار جتلایا جارہا ہے؟

جواب: اس کا جواب اسلامی شریعت، عقلی، سائنسی اور نفسیاتی پہلوؤں سے درج ذیل ہے:

پہلا جواب یہ ہے کہ بنی اسرائیل طویل عرصے تک صحرائے سینا میں رہے، جہاں دھوپ اور گرمی شدید تھی۔ قرآن کہتا ہے: وَظَلَّلْنَا عَلَيْكُمُ الْغَمَامَ (ہم نے تم پر ابر کا سایہ کیا)۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ نے اپنی رحمت

سے بادلوں کو ان پر مسلط رکھا تا کہ وہ دھوپ اور گرمی کی شدت سے بچیں۔ یہ واقعہ اللہ کی قدرت و ربوبیت کی نشانی اور ان پر خصوصی رحمت تھی۔ اسی لیے اللہ نے اسے احسان کے طور پر یاد دلایا۔ قرآن میں احسانات کو یاد دلانے کا مقصد یہ ہے کہ: تم اللہ کی نعمتوں کو پہچانو اور شکر ادا کرو۔

عقلی پہلو سے جواب یہ ہے کہ اگر کوئی قوم کھلے صحرا میں بھٹکتی رہے، پانی اور کھانے کی کمی ہو، دھوپ برداشت سے باہر ہو اور اللہ ان کے لیے قدرتی سایہ دار بادل مہیا کرے تو یہ یقیناً ایک بڑا انعام ہے۔ عقل کہتی ہے کہ مشکل میں چھوٹا سہارا بھی بہت بڑی نعمت ہوتی ہے۔ چنانچہ یہ اعتراض کرنا ''چھوٹی چیز پر بڑا احسان جتانا'' حقیقت کے خلاف ہے۔ اصل میں اس وقت ان کی زندگی کے لیے یہ بہت بڑی ضرورت تھی۔

سائنسی پہلو سے دیکھا جائے تو کلائمیٹ سائنس کہتی ہے کہ ریگستانی علاقے میں درجہ حرارت دن میں تقریباً ۵۰ ڈگری سینٹی گریڈ سے اوپر جا سکتا ہے۔ اور دھوپ کے براہِ راست اثر سے ہیٹ اسٹروک، پانی کی کمی، ڈی ہائیڈریشن جیسی کیفیت ہونے کی وجہ سے فوراً موت کا سبب بن سکتی ہیں لیکن اگر کوئی بادل مسلسل سایہ کر لے تو درجہ حرارت کم ہو جاتا ہے، سانس لینا آسان ہو جاتا ہے اور انسانی جسم کی جان بچ جاتی ہے۔ آج بھی Desert Survival Guidelines میں یہ بتایا جاتا ہے کہ سب سے اہم چیز ''shade'' یعنی سایہ ہے۔ لہٰذا قرآن کا یہ بیان بالکل سائنسی حقیقت کے مطابق ہے۔

نفسیاتی پہلو سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ جب کوئی قوم بھوک، پیاس اور گرمی سے نڈھال ہو تو ذرا سا سایہ بھی ان کے لیے ذہنی سکون اور امید کا ذریعہ ہوتا ہے۔ یہ نفسیاتی ریلیف تھا، جس سے بنی اسرائیل کی مایوسی ٹوٹتی اور وہ اللہ کی نعمت کا شکر کرنے پر آمادہ ہوتے۔ قرآن نے اس کو ''احسان'' کے طور پر بیان کیا تا کہ بنی اسرائیل جان لیں کہ ان کی جسمانی ہی نہیں بلکہ نفسیاتی ضرورتیں بھی اللہ پوری کر رہا ہے۔

خلاصہ: یہ کوئی معمولی بات نہیں تھی کہ بنی اسرائیل سخت گرمی میں بھٹک رہے تھے اور جس وقت وہ موت کے دہانے پر تھے۔ اس وقت اللہ نے بادل کا سایہ دے کر ان کی جانیں بچائیں۔ صحرا میں Shade یعنی سایہ سب سے قیمتی نعمت ہے، جس کے بغیر Survival ممکن نہیں۔ اسی لیے قرآن نے اسے احسان کہا ہے۔ یہ واقعہ شریعت کے مطابق اللہ کی نعمتوں کی یاد دہانی، عقل کے مطابق زندگی کے لیے بنیادی سہولت، سائنس کے مطابق ریگستان میں زندگی بچانے والی حقیقت، اور نفسیات کے مطابق سکون و امید کا ذریعہ ہے۔

آیت نمبر (۵۸) وَاِذْ قُلْنَا ادْخُلُوْا هٰذِهِ الْقَرْيَةَ فَكُلُوْا مِنْهَا حَيْثُ شِئْتُمْ رَغَدًا وَّادْخُلُوا

الْبَابَ سُجَّدًا وَّقُوْلُوْا حِطَّةٌ نَّغْفِرْ لَكُمْ خَطٰيٰكُمْ ؕ وَسَنَزِيْدُ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۵۸﴾

ترجمہ: ''اور جب ہم نے کہا: داخل ہو جاؤ اس بستی میں اور کھاؤ اس میں سے جہاں سے چاہو سیر ہو کر اور داخل ہونا دروازے میں سجدہ کرتے ہوئے اور کہنا بخشش مانگتے ہوئے (تو) ہم معاف کر دیں گے تمہاری خطائیں اور جلد ہی ہم زیادہ دیں گے نیکی کرنے والوں کو''۔

تفسیر

بستی میں ادب کے ساتھ داخل ہونے کا حکم

حضرت ابو ہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: بنی اسرائیل کو حکم دیا گیا تھا کہ جب وہ بستی کے دروازے سے داخل ہوں تو عاجزی وانکساری کے ساتھ جھک کر داخل ہوں اور زبان سے ''حِطَّةٌ'' کہیں، یعنی گناہوں کی معافی طلب کریں۔ لیکن انہوں نے حکم الٰہی کی نافرمانی کی۔ وہ دروازے میں سرین کے بل گھسٹتے ہوئے داخل ہوئے اور ''حِطَّةٌ'' کی جگہ تمسخر کے طور پر کہنے لگے: ''حَبَّةٌ فِي سُنْبُلَاتٍ'' (یعنی دانا بالی کے اندر)۔

(بخاری: ۴۴۷۹)

اب سوال یہ ہے کہ قرآنِ کریم میں جس بستی کا ذکر آیا ہے وہ کون سی تھی؟ بعض مفسرین کے نزدیک اس سے مراد ''بیت المقدس'' ہے، جبکہ کچھ کے مطابق یہ ''اریحا'' نامی بستی تھی۔ مگر مفسر ابن کثیر کے نزدیک پہلا قول ہی درست ہے، کیونکہ بنی اسرائیل مصر سے نکل کر اپنے اصل علاقوں کی طرف جا رہے تھے اور ان کے راستے میں ''اریحا'' نہیں آتا تھا۔ ابن کثیر مزید لکھتے ہیں کہ یہ واقعہ حضرت موسیٰؑ کے زمانے کا نہیں بلکہ اس وقت کا ہے جب بنی اسرائیل چالیس برس وادیِ تیہ میں سرگرداں رہے اور پھر حضرت یوشع بن نونؑ کی قیادت میں ''بیت المقدس'' میں داخل ہوئے۔

اصل میں وہ زمین جسے اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے لکھ دی تھی، اس میں ''عمالقہ'' نامی قوم آباد تھی جو قد آور اور نہایت طاقتور لوگ تھے۔ جب حضرت موسیٰؑ نے بنی اسرائیل کو فرمایا کہ اس مقدس سرزمین میں داخل ہو جاؤ، تو انہوں نے بزدلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے جواب دیا: ''وہاں تو بڑے زبردست لوگ بستے ہیں، ہم ان سے ہرگز نہیں لڑ سکتے۔ اے موسیٰؑ! تم اور تمہارا رب جاؤ اور قتال کرو، ہم تو یہیں بیٹھے ہیں۔'' ان کی اسی نافرمانی اور گستاخی کی وجہ سے چالیس برس کے لئے ان پر بیت المقدس کی زمین حرام کر دی گئی، اور پھر حضرت یوشعؑ کی قیادت میں وہ سرزمین ان کے لئے فتح ہوئی۔

آیت نمبر (۵۹) فَبَدَّلَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا قَوْلًا غَيْرَ الَّذِيْ قِيْلَ لَهُمْ فَاَنْزَلْنَا عَلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا رِجْزًا مِّنَ السَّمَآءِ بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ ﴿۵۹﴾

ترجمہ: ''پھر بدل دیا ان لوگوں نے جنہوں نے ظلم کیا، بات کو خلاف اس کے جو کہی گئی تھی ان سے، تو

ہم نے نازل کیا ظلم کرنے والوں پر عذاب آسمان سے، اس وجہ سے کہ وہ نافرمانیاں کرتے تھے''۔

'بیت المقدس' میں داخلہ

تفسیر

جب بنی اسرائیل کو ''بیت المقدس'' میں داخل ہونے کا موقع ملا تو اللہ تعالیٰ کا حکم تھا کہ شکر گزاری اور انکساری کے ساتھ اس مقدس سرزمین میں قدم رکھیں۔ یہ اللہ کی بڑی نعمت تھی کہ اس نے ان کا کھویا ہوا علاقہ انہیں واپس عطا فرمایا، فتح نصیب کی اور وادیِ تیہ کی طویل سرگردانی و پریشانی سے نجات بخشی۔ اس نعمت کے شکر کے طور پر عملی ہدایت یہ دی گئی کہ وہ عاجزی کے ساتھ جھک کر شہر میں داخل ہوں اور زبان سے ''حِطَّةٌ'' کہیں، یعنی اے اللہ! ہم اپنے گناہوں کی بخشش کے طلبگار رہیں۔

اللہ تعالیٰ نے وعدہ فرمایا کہ اگر تم ایسا کرو گے تو تمہارے گناہ معاف کر دیے جائیں گے اور نیکوکاروں کو مزید اجر و ثواب عطا کیا جائے گا۔ لیکن ظالموں نے اس حکم میں تحریف کی۔ جھک کر داخل ہونے کے بجائے وہ بچوں کی طرح سرینوں کے بل گھسٹتے ہوئے شہر میں آئے اور ''حِطَّةٌ'' کہنے کے بجائے تمسخرانہ انداز میں لفظ بدل کر ''حَبَّةٌ فِي شَعِيرَةٍ'' کہتے ہوئے داخل ہوئے۔ (بخاری:۴۴۷۹)

یہ صریح گستاخی اور اللہ کے حکم کی اہانت تھی، جس پر اللہ تعالیٰ نے ان پر عذاب نازل فرمایا۔ مفسرین کے مطابق یہ عذاب ''طاعون'' کی صورت میں آیا۔ جیسا کہ حدیث شریف میں ہے: ''طاعون ایک قسم کا عذاب ہے جو بنی اسرائیل کے ایک گروہ پر نازل کیا گیا تھا'' یا فرمایا: ''یہ اگلے لوگوں پر نازل ہوا تھا''۔

پھر آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''جب سنو کہ کسی سرزمین میں طاعون پھیل گیا ہے تو وہاں داخل نہ ہو اور اگر وہ وبا کسی ایسی جگہ پھوٹ پڑے جہاں تم موجود ہو تو وہاں سے بھاگنے کی نیت سے نہ نکلو''۔

(صحیح بخاری، احادیث الانبیاء، باب ۵۴، حدیث: ۳۴۷۳)

آیت نمبر (۶۰) وَاِذِ اسْتَسْقٰى مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ فَقُلْنَا اضْرِبْ بِّعَصَاكَ الْحَجَرَ ؕ فَانْفَجَرَتْ مِنْهُ اثْنَتَا عَشْرَةَ عَيْنًا ؕ قَدْ عَلِمَ كُلُّ اُنَاسٍ مَّشْرَبَهُمْ ؕ كُلُوْا وَاشْرَبُوْا مِنْ رِّزْقِ اللّٰهِ وَلَا تَعْثَوْا فِي الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ ﴿۶۰﴾

ترجمہ: ''اور جب پانی مانگا موسیٰؑ نے اپنی قوم کے لیے، تو ہم نے کہا: مارو اپنے عصا سے پتھر پر، تو پھوٹ نکلے اس سے بارہ چشمے، تو جان لیا سب لوگوں نے اپنی اپنی پینے کی جگہ، (ہم نے کہا:) کھاؤ اور پیو اللہ کے رزق سے اور نہ پھرو زمین میں فساد کرتے ہوئے''۔

تفسیر

پتھر سے پانی کے چشمے

یہ واقعہ بھی میدانِ تیہہ میں پیش آیا۔ جب بنی اسرائیل کو سخت پیاس نے ستایا تو انہوں نے حضرت موسیٰؑ علیہ السلام سے پانی کی درخواست کی۔ حضرت موسیٰؑ نے اپنے رب سے دعا کی، تو اللہ تعالیٰ نے وحی فرمائی: ''اپنی لاٹھی کو پتھر پر مارو، اس سے پانی پھوٹ نکلے گا''۔

چنانچہ حضرت موسیٰؑ نے حکمِ الٰہی کے مطابق پتھر پر عصا مارا تو فوراً بارہ چشمے ابل پڑے، اور ہر قبیلے کے لئے علیحدہ علیحدہ چشمہ جاری ہوگیا، تاکہ سب اپنی ضرورت کے مطابق پانی حاصل کریں۔

❁❁❁

ترجمہ- آیت نمبر ۶۱ سے ۷۱ تک

وَاِذْ قُلْتُمْ يٰمُوْسٰى لَنْ نَّصْبِرَ عَلٰى طَعَامٍ وَّاحِدٍ فَادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُخْرِجْ لَنَا مِمَّا تُنْۢبِتُ الْاَرْضُ مِنْۢ بَقْلِهَا وَقِثَّآئِهَا وَفُوْمِهَا وَعَدَسِهَا وَبَصَلِهَا ؕ قَالَ اَتَسْتَبْدِلُوْنَ الَّذِىْ هُوَ اَدْنٰى بِالَّذِىْ هُوَ خَيْرٌ ؕ اِهْبِطُوْا مِصْرًا فَاِنَّ لَكُمْ مَّا سَاَلْتُمْ ؕ وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ ۗ وَبَآءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَيَقْتُلُوْنَ النَّبِيّٖنَ بِغَيْرِ الْحَقِّ ؕ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ ﴿۶۱﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِيْنَ هَادُوْا وَالنَّصٰرٰى وَالصّٰبِـِٕيْنَ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۶۲﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِيْنَ هَادُوْا وَالنَّصٰرٰى وَالصّٰبِـِٕيْنَ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۶۲﴾ وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَكُمْ وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّوْرَ ؕ خُذُوْا مَآ اٰتَيْنٰكُمْ بِقُوَّةٍ وَّاذْكُرُوْا مَا فِيْهِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴿۶۳﴾ ثُمَّ تَوَلَّيْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ ۚ فَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ لَكُنْتُمْ مِّنَ الْخٰسِرِيْنَ ﴿۶۴﴾ وَلَقَدْ عَلِمْتُمُ الَّذِيْنَ اعْتَدَوْا مِنْكُمْ فِى السَّبْتِ فَقُلْنَا لَهُمْ كُوْنُوْا قِرَدَةً خٰسِـِٕيْنَ ﴿۶۵﴾ فَجَعَلْنٰهَا نَكَالًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهَا وَمَا خَلْفَهَا وَمَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِيْنَ ﴿۶۶﴾ وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖٓ اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تَذْبَحُوْا بَقَرَةً ؕ قَالُوْٓا اَتَتَّخِذُنَا هُزُوًا ؕ قَالَ اَعُوْذُ بِاللّٰهِ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ ﴿۶۷﴾ قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَّنَا مَا هِىَ ؕ قَالَ اِنَّهٗ يَقُوْلُ اِنَّهَا بَقَرَةٌ لَّا فَارِضٌ وَّلَا بِكْرٌ ؕ عَوَانٌۢ بَيْنَ ذٰلِكَ ؕ فَافْعَلُوْا مَا تُؤْمَرُوْنَ ﴿۶۸﴾ قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَّنَا مَا لَوْنُهَا ؕ قَالَ اِنَّهٗ يَقُوْلُ اِنَّهَا بَقَرَةٌ صَفْرَآءُ ۙ فَاقِعٌ لَّوْنُهَا تَسُرُّ النّٰظِرِيْنَ ﴿۶۹﴾ قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَّنَا مَا هِىَ ۙ اِنَّ الْبَقَرَ تَشٰبَهَ عَلَيْنَا ؕ وَاِنَّآ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ لَمُهْتَدُوْنَ ﴿۷۰﴾ قَالَ اِنَّهٗ يَقُوْلُ اِنَّهَا بَقَرَةٌ لَّا ذَلُوْلٌ تُثِيْرُ الْاَرْضَ وَلَا تَسْقِى الْحَرْثَ ۚ مُسَلَّمَةٌ لَّا شِيَةَ فِيْهَا ؕ قَالُوا الْـٰٔنَ جِئْتَ بِالْحَقِّ ؕ فَذَبَحُوْهَا وَمَا كَادُوْا يَفْعَلُوْنَ ﴿۷۱﴾

ترجمہ:

(۶۱) اور جب تم نے کہا: اے موسیٰ! ہم ایک ہی طرح کے کھانے پر ہرگز صبر نہیں کر سکتے، پس دعا کرو ہمارے لیے اپنے رب سے کہ وہ ہمیں نکال کر دے زمین کی پیداوار سے کچھ چیزیں، جیسے سبزی، ککڑی، گیہوں، مسور اور پیاز۔ تو موسیٰ نے کہا: کیا تم اس بہتر چیز کے بدلے ادنیٰ چیز لینا چاہتے ہو؟ اچھا تو کسی بھی شہر میں چلے جاؤ، تمہیں وہاں وہ سب کچھ مل جائے گا جو تم مانگ رہے ہو۔ اور ان پر مسلط کر دی گئی ذلت اور محتاجی اور وہ اللہ کے غضب میں

گھر گئے۔ یہ اس وجہ سے ہوا کہ وہ اللہ کی آیات کا انکار کرتے تھے اور نبیوں کو ناحق قتل کرتے تھے۔ یہ سب اس لیے کہ وہ نافرمان تھے اور حد سے بڑھ گئے تھے۔(۶۲)۔ بیشک جو لوگ ایمان لائے اور جو یہودی ہوئے اور نصاریٰ اور صابئین، ان میں سے جو بھی ایمان لایا اللہ پر اور یومِ آخرت پر اور کیے نیک عمل، تو ان کے لیے ان کے رب کے پاس ان کا اجر ہے اور ان پر نہ کوئی خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔(۶۳)۔ اور جب ہم نے تم سے پختہ عہد لیا اور ہم نے بلند کیا تمہارے اوپر طور پہاڑ کو، (اور کہا): مضبوطی سے تھامو اس کتاب کو جو ہم نے تمہیں دی ہے اور یاد رکھو اس کے احکام، تاکہ تم پرہیزگار بنو۔(۶۴)۔ پھر تم اس عہد کے بعد بھی منہ موڑ بیٹھے، تو اگر اللہ کا فضل اور اس کی رحمت تم پر نہ ہوتی، تو تم ضرور خسارہ پانے والوں میں سے ہو جاتے۔(۶۵)۔ اور یقیناً تم ان لوگوں کو جان چکے ہو جنہوں نے تم میں سے ہفتہ کے دن زیادتی کی، تو ہم نے ان سے کہا: ذلیل بندر بن جاؤ۔(۶۶)۔ چنانچہ ہم نے اس واقعہ کو ان لوگوں کے لئے عبرت بنا دیا جو اس وقت موجود تھے اور جو ان کے بعد آنے والے ہیں اور یہ تقویٰ کرنے والوں کے لیے ایک نصیحت۔(۶۷)۔ اور جب موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا: بیشک اللہ تمہیں حکم دیتا ہے کہ تم ایک گائے ذبح کرو۔ وہ کہنے لگے: کیا آپ ہم سے مذاق کرتے ہیں؟ موسیٰ نے کہا: میں اللہ کی پناہ مانگتا ہوں اس بات سے کہ جاہلوں میں شامل ہو جاؤں۔(۶۸)۔ وہ کہنے لگے: ہمارے لیے اپنے رب سے دعا کرو کہ وہ ہمیں بتائے کیسی ہو وہ گائے؟ موسیٰ نے کہا: اللہ فرماتا ہے کہ وہ نہ بوڑھی ہو اور نہ بچھیا، بلکہ درمیانی عمر کی ہو، لہٰذا اب وہی کرو جو تمہیں حکم دیا جا رہا ہے۔(۶۹)۔ پھر وہ کہنے لگے: ہمارے لیے اپنے رب سے دعا کرو کہ وہ ہمیں بتائے اس کا رنگ کیسا ہو؟ موسیٰ نے کہا: اللہ فرماتا ہے کہ وہ گہرا زرد رنگ ہو، جو دیکھنے والوں کو خوشی دے۔(۷۰)۔ پھر وہ کہنے لگے: ہمارے لیے اپنے رب سے دعا کرو کہ وہ ہمیں مزید بتائے کیسی ہو، کیونکہ وہ گائے ہم پر مشتبہ ہو گئی ہے اور ان شاء اللہ ہم ضرور راہ پا لیں گے۔(۷۱)۔ موسیٰ نے کہا: اللہ فرماتا ہے کہ وہ ایک ایسی گائے ہو جو نہ زمین جوتتی ہو، نہ کھیت کو پانی دیتی ہو، سلامت ہو، اس میں کوئی عیب نہ ہو۔ وہ کہنے لگے: اب آپ نے صحیح بات بتائی ہے۔ پھر انہوں نے اسے ذبح کر دیا، حالانکہ وہ لگتے نہ تھے کہ وہ ایسا کریں گے۔

تفسیر-آیت نمبر ۶۱ سے ۷۱ تک

آیت نمبر(۶۱) وَاِذْ قُلْتُمْ يٰمُوْسٰى لَنْ نَّصْبِرَ عَلٰى طَعَامٍ وَّاحِدٍ فَادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُخْرِجْ لَنَا مِمَّا تُنْۢبِتُ الْاَرْضُ مِنْۢ بَقْلِهَا وَقِثَّآئِهَا وَفُوْمِهَا وَعَدَسِهَا وَبَصَلِهَا ؕ قَالَ اَتَسْتَبْدِلُوْنَ الَّذِىْ هُوَ اَدْنٰى بِالَّذِىْ هُوَ خَيْرٌ ؕ اِهْبِطُوْا مِصْرًا فَاِنَّ لَكُمْ مَّا سَاَلْتُمْ ؕ وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ

الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ ۗ وَبَآءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ ۭ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَيَقْتُلُوْنَ النَّبِيّٖنَ بِغَيْرِ الْحَقِّ ۭ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ ﴿۶۱﴾

ترجمہ: ''اور جب تم نے کہا: اے موسیٰ! ہم ایک ہی طرح کے کھانے پر ہرگز صبر نہیں کر سکتے، پس دعا کرو ہمارے لیے اپنے رب سے کہ وہ ہمیں نکال کر دے زمین کی پیداوار سے کچھ چیزیں، جیسے سبزی، ککڑی، گیہوں، مسور اور پیاز۔ تو موسیٰ نے کہا: کیا تم اس بہتر چیز کے بدلے ادنیٰ چیز لینا چاہتے ہو؟ اچھا تو کسی بھی شہر میں چلے جاؤ، تمہیں وہاں وہ سب کچھ مل جائے گا جو تم مانگ رہے ہو۔ اور ان پر مسلط کر دی گئی ذلت اور محتاجی اور وہ اللہ کے غضب میں گھر گئے۔ یہ اس وجہ سے ہوا کہ وہ اللہ کی آیات کا انکار کرتے تھے اور نبیوں کو ناحق قتل کرتے تھے۔ یہ سب اس لیے کہ وہ نافرمان تھے اور حد سے بڑھ گئے تھے''۔

تفسیر بنی اسرائیل کا پیاز اور لہسن مانگنا

'میدانِ تیہہ' میں بنی اسرائیل کو صبح و شام کے کھانے کے لئے من وسلویٰ جیسی پاکیزہ نعمت ملتی تھی، لیکن ان کے دل اس پر اُکتا گئے اور انہیں مصر میں گزرا ہوا وقت یاد آنے لگا۔ چنانچہ انہوں نے حضرت موسیٰؑ علیہ السلام سے مطالبہ کیا کہ ہمیں سبزی، ککڑی، لہسن، پیاز اور دال جیسی غذائیں دی جائیں۔

حضرت موسیٰؑ نے اس پر تنبیہ کی اور فرمایا: ''تم کیسے لوگ ہو! کہ اعلیٰ اور پاکیزہ کھانے چھوڑ کر گھٹیا اور عام کھانے مانگتے ہو؟ یہ چیزیں تو ہر شہر میں موجود ہیں، اگر یہی تمہیں چاہیے تو کسی بستی میں جا کر لے لو۔ یہ چیزیں ایسی نہیں کہ میں تمہارے لئے اللہ سے دعا کروں''۔

اللہ تعالیٰ نے جب بنی اسرائیل پر اپنی نعمتوں کا ذکر فرمایا تو ساتھ ہی ان کی ناشکری اور برائیوں کو بھی بیان کیا۔ انہوں نے نبیوں کو جھٹلایا، حتیٰ کہ قتل کیا، کفر کیا اور سرکشی پر اتر آئے۔ ان جرائم کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ نے ان پر ہمیشہ کے لئے ذلت اور محتاجی مسلط کر دی۔ یہی وجہ ہے کہ تاریخ کے ہر دور میں جہاں بھی وہ رہے، قوموں نے انہیں ذلیل وخوار کیا۔

یہی سبب ہے کہ یہودیوں سے بڑھ کر دنیا میں کوئی قوم ذلت ورسوائی اور مال کی حرص میں مبتلا نہیں۔ دولت مند ہونے کے باوجود پیسے کے لئے اپنی جان تک قربان کر دینا اور معمولی نقصان پر دل کا دورہ پڑ جانا، ان کے دلوں کی کمزوری اور حرص ولالچ کی عکاسی کرتا ہے۔

آیت نمبر(۶۲) اِنَّ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَالَّذِیۡنَ هَادُوۡا وَالنَّصٰرٰی وَالصّٰبِـُٔوۡنَ مَنۡ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالۡیَوۡمِ الۡاٰخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهُمۡ اَجۡرُهُمۡ عِنۡدَ رَبِّهِمۡ ۚ وَلَا خَوۡفٌ عَلَیۡهِمۡ وَلَا هُمۡ یَحۡزَنُوۡنَ ﴿۶۲﴾

ترجمہ: ''بیشک جولوگ ایمان لائے اور جو یہودی ہوئے اور نصاریٰ اور صابئین، ان میں سے جو بھی ایمان لایا اللہ پر اور یومِ آخرت پر اور کیے نیک عمل، تو ان کے لیے ان کے رب کے پاس ان کا اجر ہے اور ان پر نہ کوئی خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے''۔

تفسیر اِنَّ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَالَّذِیۡنَ هَادُوۡا، حضرت ابن عباسؓ، حضرت حاتمؒ اور حضرت عدیؓ نے اپنی سند میں ابن ابی نجیح کے واسطے سے مجاہد سے روایت کیا ہے کہ حضرت سلمان فارسیؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ان اہلِ دین کے بارے میں دریافت کیا، جن پر وہ خود پہلے تھے۔ جب انہوں نے ان کی نماز اور عبادت کا ذکر کیا تو اس پر یہ آیتِ کریمہ نازل ہوئی۔

'واحدی' نے روایت کیا ہے کہ جب حضرت سلمانؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اپنے ساتھیوں کا تذکرہ کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''وہ سب جہنم میں ہیں''۔ حضرت سلمانؓ فرماتے ہیں کہ یہ سنتے ہی میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ لیکن پھر یہ آیتِ کریمہ نازل ہوئی، جس سے میرا دل ایسے مطمئن ہوا جیسے کوئی پہاڑ میرے اوپر سے ہٹ گیا ہو۔ ابن جریر اور ابن ابی حاتم نے سدی سے نقل کیا ہے کہ یہ آیت دراصل حضرت سلمان فارسیؓ کے انہی ساتھیوں کے بارے میں نازل ہوئی۔ (تفسیر ابن عباس)

اس آیت سے یہ حقیقت واضح ہوگئی کہ جب سے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت ہوئی ہے، کامیابی اور نجات کا راستہ صرف اور صرف آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی لائی ہوئی شریعت میں ہے، خواہ وہ یہودی ہوں، عیسائی ہوں، صابئین ہوں یا کسی بھی قوم سے تعلق رکھتے ہوں۔

یہود کا مطلب

''الَّذِیۡنَ هَادُوۡا'' سے مراد یہود ہیں۔ لفظ **هادوا** اصل میں باب 'نصر' سے ہے: **هادَ، یهودُ، هُودًا**، جس کے معنیٰ ہیں ''رجوع کرنا'' یا ''توبہ کرنا''۔ اس کا سبب یہ ہے کہ ان لوگوں نے بچھڑے کی عبادت سے توبہ کی تھی، اسی لیے انہیں یہود کہا گیا۔ ان کا معروف نام ''یہود'' ہے، پوری قوم کو یہود اور فرد کو یہودی کہا جاتا ہے۔ آج کل انہیں ''Jews'' کہا جاتا ہے۔

کچھ مفسرین کے نزدیک یہ نام حضرت یعقوب علیہ السلام کے بڑے بیٹے ''یہودا'' کی طرف منسوب ہے۔ ایک دوسری رائے یہ ہے کہ یہ لفظ ''تہوذ'' سے ماخوذ ہے جس کے معنیٰ ''حرکت کرنا'' ہیں۔ چونکہ یہ لوگ توریت کی تلاوت کے وقت جسم کو حرکت دیتے تھے، اس لئے انہیں یہود کہا گیا۔ بعض کے نزدیک یہ لفظ حضرت یعقوب علیہ السلام کے بیٹے یہودا کی نسبت سے رائج ہوا۔

الغرض ''یہود'' ان کا مذہبی نام ہے، جبکہ دورِ حاضر میں ان کا سیاسی نام ''صیہونی'' (Zionist) ہے۔

اَلنَّصٰرٰی

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت بیت المقدس کے ایک گاؤں ''نصاریٰ'' میں ہوئی۔ یہودی ان کے پیروکاروں کو نصاریٰ کا بدعتی فرقہ کہہ کر پکارنے لگے اور یہی نام ان کے ساتھ مشہور ہو گیا۔

اللہ تعالیٰ نے ان پر کرم فرمایا کہ قرآن میں انہیں ''نصاریٰ'' یعنی ''اللہ کے انصار'' کے لقب سے یاد کیا۔ جب حضرت عیسیٰؑ نے فرمایا: ''مَنْ اَنْصَارِیْ اِلَی اللّٰہِ'' تو ان کے حواریوں نے جواب دیا: ''نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰہِ''۔ (سورہ صف) اسی نسبت سے ان کا نام نصاریٰ قرار پایا۔

لفظ ''نصاریٰ'' کی ایک وجہ یہ بھی بیان کی جاتی ہے کہ وہ ایک بستی میں مقیم ہوئے جسے نصاریٰ کہا جاتا تھا۔

خلاصہ یہ کہ نصاریٰ وہ ہیں جو حضرت عیسیٰؑ کے ماننے والے تھے۔ ان میں وہ بھی شامل تھے جو اصل دین پر قائم رہے اور وہ بھی جنہوں نے دین میں تحریف کر کے حضرت عیسیٰؑ کو اللہ کا بیٹا قرار دیا اور ان کے ساتھ ساتھ حضرت مریمؑ کو بھی معبود ماننے لگے۔ قرآن مجید نے ان کے لئے لفظ ''نصاریٰ'' استعمال کیا ہے، نہ کہ ''عیسائی'' کیونکہ مشرکین کو حضرت عیسیٰؑ کی طرف منسوب نہیں کیا جا سکتا۔

حضرت جابر بن عبداللہؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''عیسیٰ ابن مریم دوبارہ نازل ہوں گے۔ مسلمان انہیں امامت کے لئے آگے بڑھائیں گے، لیکن وہ کہیں گے: نہیں، تم میں سے ہی کوئی ایک تمہاری امامت کرے''۔ یہ اس امت کے لئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک عظیم اعزاز ہوگا۔ **(مسلم:۳۹۵)**

اَلصّٰبِئِیْنَ

قرآن کے نزول کے زمانے میں ''صابئین'' ایک ایسا فرقہ تھا جس کے بارے میں مختلف اقوال ملتے ہیں۔ حضرت مجاہدؒ فرماتے ہیں کہ یہ لوگ مجوسیت، یہودیت اور نصرانیت کے درمیان تھے اور ان کا کوئی مستقل دین نہ تھا۔ حضرت حسن بصریؒ کے مطابق یہ فرشتوں کی عبادت کرتے تھے۔ ابن ابی زناد نے اپنے والد سے روایت کیا ہے کہ یہ وہ

لوگ تھے جو عراق کے قریب آباد تھے، تمام انبیاء پر ایمان لاتے تھے، سال میں تیس روزے رکھتے اور یمن کی سمت رخ کر کے نماز پڑھتے تھے۔

حضرت عبدالرحمن بن زید کا کہنا ہے کہ یہ لوگ موصل کے قریب جزیرہ میں رہتے تھے اور ان کا دین صرف ''لا الٰہ الا اللہ'' پر مبنی تھا۔ حضرت خلیلؒ نے بیان کیا ہے کہ ان کا دین نصاریٰ سے مشابہ تھا اور ان کا قبیلہ شمالی حبشہ کے اطراف میں آباد تھا۔ یہ اپنے آپ کو حضرت نوحؑ کے دین پر سمجھتے تھے۔

حضرت وہب بن منبہؒ کا قول ہے کہ وہ نہ یہودی تھے، نہ نصرانی، نہ مجوسی اور نہ ہی مشرک۔ وہ فطرت کے مطابق زندگی گزارتے تھے لیکن ان کا کوئی باقاعدہ اور مقرر دین نہ تھا۔ بعض علماء کے نزدیک یہ وہ لوگ تھے جنہوں نے یہود و نصاریٰ کا دین ترک کر کے فرشتوں کی عبادت شروع کر دی تھی۔

یہاں قرآن نے یہ حقیقت واضح کی کہ توبہ کا دروازہ یہود اور غیر یہود سب کے لئے کھلا ہے۔ خواہ گناہ کتنے ہی سنگین کیوں نہ ہوں، جیسے یہود کے وہ اعمال جن سے اللہ کا غضب نازل ہوا، لیکن اگر وہ توبہ کر کے نبی اکرم ﷺ پر ایمان لے آئیں تو انہیں دنیا و آخرت میں وہی اجر ملے گا جو دوسرے مومنین کو ملتا ہے۔

اسی کے ساتھ یہ اصول بھی بتایا گیا کہ پچھلی امتوں میں سے جن لوگوں نے اپنے اپنے زمانے کے نبی کی اطاعت کی، اللہ تعالیٰ انہیں بہترین بدلہ عطا فرمائے گا۔ اور قیامت تک جو بھی لوگ نبی اکرم ﷺ کی بات مانیں گے، انہیں ہمیشہ کے لئے بھلائی نصیب ہوگی اور وہ کسی خوف یا اندیشے میں مبتلا نہ ہوں گے۔

آیت نمبر (۶۳-۶۶) وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَكُمْ وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّوْرَ ؕ خُذُوْا مَآ اٰتَيْنٰكُمْ بِقُوَّةٍ وَّاذْكُرُوْا مَا فِيْهِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴿۶۳﴾ ثُمَّ تَوَلَّيْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ ۚ فَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ لَكُنْتُمْ مِّنَ الْخٰسِرِيْنَ ﴿۶۴﴾ وَلَقَدْ عَلِمْتُمُ الَّذِيْنَ اعْتَدَوْا مِنْكُمْ فِي السَّبْتِ فَقُلْنَا لَهُمْ كُوْنُوْا قِرَدَةً خٰسِـِٕيْنَ ﴿۶۵﴾ فَجَعَلْنٰهَا نَكَالًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهَا وَمَا خَلْفَهَا وَمَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِيْنَ ﴿۶۶﴾

ترجمہ: ''اور جب ہم نے تم سے پختہ عہد لیا اور ہم نے بلند کیا تمہارے اوپر طور پہاڑ کو، (اور کہا): مضبوطی سے تھامو اس کتاب کو جو ہم نے تمہیں دی ہے اور یاد رکھو اس کے احکام، تاکہ تم پرہیزگار بنو۔ پھر تم اس عہد کے بعد بھی منہ موڑ بیٹھے، تو اگر اللہ کا فضل اور اس کی رحمت تم پر نہ ہوتی، تو تم ضرور خسارہ پانے والوں میں سے ہو جاتے۔ اور یقیناً تم ان لوگوں کو جان چکے ہو جنہوں نے تم میں سے ہفتہ کے دن زیادتی کی، تو

ہم نے ان سے کہا: ذلیل بندر بن جاؤ۔ چانچہ ہم نے اس واقعہ کو ان لوگوں کے لئے عبرت بنا دیا جو اس وقت موجود تھے اور جو ان کے بعد آنے والے ہیں اور یہ تقویٰ کرنے والوں کے لیے ایک نصیحت''۔

تفسیر

بنی اسرائیل کا عہد

جب حضرت موسیٰؑ علیہ السلام تورات لے کر آئے اور شریعت بنی اسرائیل کو عطا کی گئی تو ان سے عہد لیا گیا۔ اس موقع پر اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت کا مظاہرہ کرتے ہوئے طور پہاڑ کو ان کے سروں پر اٹھا دیا اور فرمایا کہ اس کتاب کو مضبوطی سے تھامو اور اس کے احکام کو یاد رکھو۔ بنی اسرائیل نے اس وقت تو عہد کر لیا، لیکن بعد میں اس کو توڑ ڈالا اور عہد شکنی کی۔ سزا تو یہ تھی کہ ان پر اللہ کا عذاب نازل ہوتا، لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت سے درگزر فرمایا اور ان کی اصلاح و رہنمائی کے لئے انبیاء کو بھیجا تا کہ وہ سیدھی راہ پر آ جائیں۔

سنیچر کے دن کا شکار

یہاں یہود کی ایک بستی کا ذکر ہے جس نے اپنے عہد کی خلاف ورزی کرتے ہوئے حیلہ سازی سے کام لیا۔ جس طرح مسلمانوں کے لئے جمعہ کا دن فضیلت والا قرار دیا گیا ہے، اسی طرح یہود کے لئے ہفتہ (سنیچر) کو خاص تقدس حاصل تھا۔ انہیں حکم دیا گیا تھا کہ اس دن مچھلی کا شکار نہ کریں۔ ان کے امتحان کے طور پر اسی دن مچھلیاں کثرت سے ظاہر ہوتیں۔ لیکن انہوں نے فریب سے کام لیا: ہفتہ سے پہلے جال ڈال دیتے تا کہ مچھلیاں ان میں پھنس جائیں اور پھر ہفتے کے گزر جانے کے بعد انہیں پکڑ لیتے۔ اپنے دل کو یہ کہہ کر بہلاتے کہ ہم نے تو ہفتے کے دن کوئی شکار نہیں کیا، وہ تو خود آ کر پھنس گئیں۔

اللہ تعالیٰ نے ان کی اس حیلہ سازی پر سخت عذاب بھیجا اور ان کی شکلیں مسخ کر کے بندر بنا دیا۔ وہ بندروں کی طرح آوازیں نکالتے تھے اور ان کے دم بھی پیدا ہو گئے تھے۔ جب وہ لوگ جنہوں نے ان کو روکا تھا، ان کے پاس آئے اور کہا: ''کیا ہم نے تمہیں منع نہیں کیا تھا؟'' تو وہ سر ہلا ہلا کر اقرار کرتے مگر زبان سے بول نہیں پاتے تھے۔

بندر اور سور میں مسخ

حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ ہفتے کی خلاف ورزی کرنے والوں کو بندر اور سور بنا دیا گیا۔ ان میں نوجوان بندر بنے اور بوڑھے خنزیر۔ مزید یہ کہ یہ مسخ شدہ قوم تین دن سے زیادہ زندہ نہ رہی، ان ایام میں نہ کچھ کھایا نہ پیا اور آخر کار ان کی نسل ہی مٹ گئی۔ یہودیوں کے لئے ہفتے کا دن مبارک قرار دیا گیا تھا مگر انہوں نے اس کی حرمت پامال کر دی۔ **(تفصیل کے لئے دیکھئے سورہ اعراف: ۱۶۴)**

امت محمدیہ میں مسخ

امت محمدیہ تا حال مسخ کے عذاب سے محفوظ رہی ہے، لیکن قیامت کے قریب اس کا ظہور ہوگا۔ جیسا کہ 'سنن ترمذی' کی کتاب الفتن اور 'صحیح بخاری' میں مسخ کے ذکر کی روایات موجود ہیں۔ **(بخاری:۵۵۹۰)**

یہود نے ایک اور حیلہ یہ کیا کہ ان پر چربی حرام کی گئی تھی۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''انہوں نے اس چربی کو عمدہ صورت میں ڈھال کر بیچا''۔ **(بخاری:۲۲۳۶)**

محدثین لکھتے ہیں کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ چربی کو پگھلا کر اس میں دوسری چیزیں ملا دیتے، اس کا نام بدل دیتے اور پھر فروخت کرتے تھے۔ آج امت محمدیہ میں بھی اسی طرح کے حیلے رائج ہیں۔

شراب کو حلال کرنے کا بہانہ

ایک حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''لوگ شراب کو حلال کر لیں گے۔'' صحابہؓ نے عرض کیا: یا رسول اللہ! یہ کیسے ہوگا جبکہ اللہ تعالیٰ نے اسے حرام قرار دیا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ''وہ شراب کا دوسرا نام رکھ لیں گے اور اس طرح اسے حلال کر لیں گے۔'' **(مشکوٰۃ:۵۳۷۷)**

آج یہی صورت حال ہے۔ شراب پیتے ہیں مگر اس کا نام بدل دیتے ہیں، سود لیتے ہیں مگر اسے ''نفع'' کہتے ہیں، زکوٰۃ کے واجب الادا ہونے سے بچنے کے لئے حیلے نکالتے ہیں، داڑھی منڈوانے کو جائز قرار دینے کی تاویلیں گھڑتے ہیں۔ یہ سب انتہائی خطرناک روش ہے جو عہد شکنی اور دین سے کھیلنے کے مترادف ہے۔

آیت نمبر (۶۷-۷۱) وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖٓ اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تَذْبَحُوْا بَقَرَةً ؕ قَالُوْٓا اَتَتَّخِذُنَا هُزُوًا ؕ قَالَ اَعُوْذُ بِاللّٰهِ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ ﴿۶۷﴾ قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَّنَا مَا هِيَ ؕ قَالَ اِنَّهٗ يَقُوْلُ اِنَّهَا بَقَرَةٌ لَّا فَارِضٌ وَّلَا بِكْرٌ ؕ عَوَانٌۢ بَيْنَ ذٰلِكَ ؕ فَافْعَلُوْا مَا تُؤْمَرُوْنَ ﴿۶۸﴾ قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَّنَا مَا لَوْنُهَا ؕ قَالَ اِنَّهٗ يَقُوْلُ اِنَّهَا بَقَرَةٌ صَفْرَآءُ ۙ فَاقِعٌ لَّوْنُهَا تَسُرُّ النّٰظِرِيْنَ ﴿۶۹﴾ قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَّنَا مَا هِيَ ۙ اِنَّ الْبَقَرَ تَشٰبَهَ عَلَيْنَا ؕ وَاِنَّآ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ لَمُهْتَدُوْنَ ﴿۷۰﴾ قَالَ اِنَّهٗ يَقُوْلُ اِنَّهَا بَقَرَةٌ لَّا ذَلُوْلٌ تُثِيْرُ الْاَرْضَ وَلَا تَسْقِى الْحَرْثَ ۚ مُسَلَّمَةٌ لَّا شِيَةَ فِيْهَا ؕ قَالُوا الْـٰٔنَ جِئْتَ بِالْحَقِّ ؕ فَذَبَحُوْهَا وَمَا كَادُوْا يَفْعَلُوْنَ ﴿۷۱﴾

ترجمہ: ''اور جب موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا: بیشک اللہ تمہیں حکم دیتا ہے کہ تم ایک گائے ذبح

کرو۔ وہ کہنے لگے: کیا آپ ہم سے مذاق کرتے ہیں؟ موسیٰ نے کہا: میں اللہ کی پناہ مانگتا ہوں اس بات سے کہ جاہلوں میں شامل ہو جاؤں۔ وہ کہنے لگے: ہمارے لیے اپنے رب سے دعا کرو کہ وہ ہمیں بتائے کیسی ہو وہ گائے؟ موسیٰ نے کہا: اللہ فرماتا ہے کہ وہ نہ بوڑھی ہو اور نہ بچھیا، بلکہ درمیانی عمر کی ہو، لہٰذا اب وہی کرو جو تمہیں حکم دیا جا رہا ہے۔ پھر وہ کہنے لگے: ہمارے لیے اپنے رب سے دعا کرو کہ وہ ہمیں بتائے اس کا رنگ کیسا ہو؟ موسیٰ نے کہا: اللہ فرماتا ہے کہ وہ گہرا زرد رنگ ہو، جو دیکھنے والوں کو خوشی دے۔ پھر وہ کہنے لگے: ہمارے لیے اپنے رب سے دعا کرو کہ وہ ہمیں مزید بتائے کیسی ہو، کیونکہ وہ گائے ہم پر مشتبہ ہو گئی ہے اور ان شاء اللہ ہم ضرور راہ پالیں گے۔ موسیٰ نے کہا: اللہ فرماتا ہے کہ وہ ایک ایسی گائے ہو جو نہ زمین جوتتی ہو، نہ کھیت کو پانی دیتی ہو، سلامت ہو، اس میں کوئی عیب نہ ہو۔ وہ کہنے لگے: اب آپ نے صحیح بات بتائی ہے۔ پھر انہوں نے اسے ذبح کر دیا، حالانکہ وہ لگتے نہ تھے کہ وہ ایسا کریں گے''۔

تفسیر بقرہ کا مفہوم

ان آیتوں میں ''بقرہ'' کے ذبح کرنے کا ذکر ہے۔ عربی زبان میں ''بقرہ'' کا اطلاق گائے اور بیل، دونوں پر ہوتا ہے۔ بعض مفسرین نے اس کا ترجمہ ''بیل'' کیا ہے اور ان کا استدلال یہ ہے کہ قصے کے اختتام پر فرمایا گیا کہ وہ بقرہ ایسا ہو جسے نہ ہل جوتنے میں استعمال کیا گیا ہو اور نہ کھیتی کی سینچائی میں لگایا گیا ہو۔ چونکہ یہ کام عموماً بیل سے ہی لیا جاتا ہے، اس لیے اکثر علماء کے نزدیک بقرہ سے مراد بیل ہے۔

دوسری طرف کچھ مفسرین نے بقرہ کا ترجمہ ''گائے'' کیا ہے اور چونکہ بقرہ ایک اسمِ جنس ہے اس لیے ''گائے'' کا ترجمہ بھی درست ہے۔ علامہ قرطبیؒ نے وضاحت کی ہے کہ بقرہ دراصل گائے کے لیے ہی بولا جاتا ہے جو ''ثور'' یعنی بیل کا مؤنث ہے۔

واقعہ

یہ قصہ کس طرح پیش آیا؟ اس سلسلے میں قرآن کی آیت سے اشارہ ملتا ہے اور تفسیر ابن کثیر میں حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں ایک نہایت مالدار بوڑھا شخص تھا جس کی کوئی اولاد نہ تھی۔ اس کے بھائیوں کے بیٹے مفلس تھے اور وہ اس کے مرنے کے بعد اس کے ترکے کے حقدار تھے۔ مگر چونکہ اس کی عمر دراز تھی اور وہ مرنے کا نام نہ لیتا تھا، شیطان نے انہیں بہکایا کہ اپنے چچا کو قتل کر دو تاکہ اس کے مال کے وارث بن جاؤ۔

چنانچہ انہوں نے اپنے ہی سگے چچا کو قتل کر کے لاش دوسری بستی کے قریب ڈال دی۔ صبح ہوئی تو انہوں نے

اس قتل کا الزام اس بستی والوں پر عائد کر دیا اور بدلہ لینے پر اُتر گئے۔ بستی والے قسمیں کھانے لگے کہ قتل ہم نے نہیں کیا۔ اس طرح یہ جھگڑا حضرت موسیٰؑ کی خدمت میں پیش ہوا۔ آپؑ نے اللہ کے حکم سے فرمایا کہ ایک گائے ذبح کرو اور اس کے گوشت کا ایک ٹکڑا مقتول کے جسم پر مارو، وہ زندہ ہو کر قاتل کا نام بتائے گا۔ **(فتح الباری)**

ابتدا میں بنی اسرائیل نے حضرت موسیٰؑ کی بات کا مذاق اڑایا اور کہا کہ یہ کیسے ممکن ہے کہ گائے کا گوشت مقتول کو زندہ کر دے اور وہ قاتل کا نام بتا دے۔ یہ گستاخانہ جواب سن کر حضرت موسیٰؑ کو سخت ناگوار گزرا اور آپؑ نے فرمایا: ''میں جاہلوں میں سے ہونے سے اللہ کی پناہ مانگتا ہوں، یہ تو سراسر جہالت کی بات ہے۔''

پھر جب وہ گائے ذبح کرنے پر آمادہ ہوئے تو سیدھی بات ماننے کے بجائے طرح طرح کے سوالات کرنے لگے، اس کی عمر کیا ہو؟ اس کا رنگ کیسا ہو؟ اور دیگر تفصیلات۔ ان کے کثرتِ سوالات کی وجہ سے حکم میں سختی آتی گئی اور معاملہ ان پر تنگ ہو گیا۔ آخر کار وہ گائے صرف ایک شخص کے پاس ملی، جس نے اس کے عوض میں بھاری قیمت طلب کی۔ بنی اسرائیل کو مجبوراً وہ گائے خریدنی پڑی۔

مزید روایات

درمنثور میں حضرت ابن عباسؓ سے نقل ہے کہ بنی اسرائیل نے اس گائے کی کھال کو دیناروں سے بھر کر دینے کا وعدہ کیا اور پھر اسے ذبح کیا۔ **(درمنثور، جلد اول، ص: ۲۵۲-۲۵۳)**

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''تم سے پہلے لوگ اپنے انبیاء سے کثرتِ سوالات اور ان کے ساتھ اختلاف کی وجہ سے ہلاک ہوئے۔ اگر میں تمہیں کسی بات سے منع کروں تو اس سے رک جاؤ، اور اگر میں تمہیں کسی چیز کا حکم دوں تو حتی المقدور اس پر عمل کرو''۔ **(بخاری: ۷۲۸۸)**

نتیجہ

اس واقعے سے یہ سبق ملتا ہے کہ دین میں باریکیوں میں پڑ کر بلاوجہ سختی اختیار کرنا اور بے جا سوالات کرنا ممنوع ہے۔ شریعت کی سادگی اور سہولت کو مشکل بنانا خود اپنے لیے رکاوٹیں کھڑی کرنے کے مترادف ہے۔

اس آیت سے متعلق بعض غیر مسلموں کے اشکال کا جواب:

بعض لوگوں کا اعتراض یہ ہے کہ: ''اللہ نے بنی اسرائیل کو حکم دیا کہ ایک گائے ذبح کرو۔ اس سے اللہ کو کیا فائدہ تھا؟ گائے ذبح کرنے کا مطلب کیا ہے؟''

جواب: اسلامی و شرعی پہلو سے دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل مصر سے نکلنے کے بعد بھی گائے کی پوجا کی

طرف مائل تھے (سورہ طٰہٰ میں بچھڑے کی پوجا کا ذکر ہے)۔انہیں اللہ نے حضرت موسیٰؑ کے ذریعے حکم دیا کہ وہ اسی گائے کو ذبح کریں جسے وہ مقدس سمجھتے تھے تاکہ ان کے دلوں سے گائے پرستی ختم ہوجائے اور وہ سمجھ جائیں کہ جسے وہ معبود مانتے تھے وہ ذبح کے قابل ہے، معبود نہیں۔ساتھ ہی ایک قتل کا معاملہ تھا جس میں قاتل پوشیدہ تھا۔اللہ نے حکم دیا کہ اس گائے کے ایک حصے کو مقتول کے جسم سے لگاؤ تو مقتول زندہ ہوکر قاتل کی نشاندہی کرے گا۔اس طرح گائے ذبح کرنے میں دو حکمتیں تھیں: (۱) گائے پرستی ختم کرنا۔(۲) عدل وانصاف قائم کرنا۔

اس طرح جب حضرت موسیٰؑ نے حکم دیا کہ گائے ذبح کرو، تو سیدھے حکم ماننے کے بجائے وہ بہانے کرنے لگے: کون سی گائے؟، کس رنگ کی ہو؟ کیسی ہو؟ یہ سب ہٹ دھرمی اور تاخیر تھی، ورنہ اللہ کے نزدیک کوئی بھی گائے ذبح کردینا کافی تھا۔چنانچہ ان کے سوالات سے ان کی نفسیات ظاہر ہوگئی کہ وہ اللہ کے حکم پر فوراً عمل کرنے والے نہیں تھے بلکہ بحث کرنے والے تھے۔آخر کار انہیں وہی گائے ذبح کرنا پڑی جو انہوں نے تعظیم کے لیے رکھی ہوئی تھی۔اس طرح ان کی گائے پرستی بھی ٹوٹی اور ضدی پن بھی بے نقاب ہوا۔

عقلی پہلو سے اگر دیکھا جائے تو اللہ تعالیٰ کو نہ گائے کے ذبح سے کوئی فائدہ ہے نہ نقصان (سورہ حج:۳۷)۔بلکہ یہ حکم بنی اسرائیل کے لیے ایک آزمائش اور تربیت کے لئے تھا تاکہ ان کے دل سے گائے کی تعظیم نکلے اور وہ سمجھ جائیں کہ عقل وعدل اللہ کے حکم کے تابع ہے، خواہ ہمیں اس کی حکمت فوراً سمجھ میں نہ آئے۔جیسے آج بھی ڈاکٹر مریض کو ایسی دوائی دیتا ہے جس کا ذائقہ کڑوا ہوتا ہے مگر علاج کا ذریعہ وہی ہوتا ہے۔مریض کے لیے سوال یہ نہیں ہوتا کہ دوائی کا ذائقہ کیوں ایسا ہے؟ بلکہ یہ کہ اس میں فائدہ کیا ہے۔اسی طرح گائے کے ذبح کا حکم اصل میں ان کے مرضِ شرک کا علاج تھا۔

سائنسی پہلو سے بھی یہ واقعہ ایک معجزہ تھا یعنی مقتول دوبارہ زندہ ہوا اور قاتل کا نام بتایا۔یہ اللہ کی قدرت کا مظہر تھا۔سائنسی اعتبار سے یہ بتایا جاسکتا ہے کہ: اللہ جس نے زندگی دی، وہ وقتی طور پر زندگی واپس بھی دے سکتا ہے۔Medical Science میں بھی ''Clinical Death'' اور ''Revival'' کے کیسز موجود ہیں، جہاں انسان مرنے کے قریب ہوتا ہے اور دوبارہ زندہ ہوجاتا ہے۔قرآن نے اس واقعے کو بطور نشانی بیان کیا تاکہ لوگ سمجھیں کہ اللہ مردوں کو بھی زندہ کرنے پر قادر ہے۔

نفسیاتی پہلو سے دیکھا جائے تو کہا جائے گا کہ بار بار سوال کرنا بنی اسرائیل کی ضدی اور ناقابلِ اصلاح ذہنیت کو ظاہر کرتا ہے۔یہ ایک نفسیاتی بیماری ہے کہ جب آدمی عمل سے بھاگنا چاہے تو ''سوال در سوال'' کرکے وقت ضائع کرتا ہے۔اللہ نے آخر کار انہیں مجبور کیا کہ جس گائے کو وہ تعظیم دیتے تھے، وہی ان کے ہاتھوں ذبح ہو، تاکہ دلوں سے وہم نکل جائے اور اطاعتِ الٰہی ان پر غالب ہو لیکن بنی اسرائیل ضدی اور ہٹ دھرم تھے۔گائے کے ذبح کے حکم پر وہ

بار بار ٹال مٹول کرتے اور سوالات کرتے رہے۔ اس سے ان کی منافقت، شک اور انکارِ حق ظاہر ہو گیا۔ پھر جب انہیں وہی کرنا پڑا تو ان کے دلوں میں بیٹھ گیا کہ اللہ کے حکم کے سامنے چالاکی اور تاخیر کام نہیں آتی۔ اس کا ایک نفسیاتی فائدہ یہ بھی تھا کہ ان کے اندر سے ''گائے کی تعظیم'' کا وہم ختم ہو جائے اور وہ صرف اللہ پر توکل کرنا سیکھیں۔

خلاصہ: اللہ کو گائے کے ذبح سے کوئی فائدہ نہیں تھا بلکہ یہ حکم شرک و گائے پرستی کے خاتمے کے لیے تھا۔ اور قاتل کی نشاندہی کے معجزے کے لیے تھا۔ یعنی توحید کی تعلیم اور آزمائش کے لیے تھا۔ قرآن بار بار واضح کرتا ہے: ''نہ ان کا گوشت اللہ تک پہنچتا ہے نہ خون، بلکہ تمہاری تقویٰ (نیت و اطاعت) پہنچتی ہے''۔ (سورہ الحج: ۳۷) یہ واقعہ شریعت کے لحاظ سے توحید کی تعلیم، عقل کے لحاظ سے آزمائش و اصلاح، سائنس کے لحاظ سے معجزہ و Revival کا ثبوت، اور نفسیات کے لحاظ سے ہٹ دھرمی کو توڑنے کا ذریعہ تھا۔ اس طرح گائے ذبح کرنے کا حکم اللہ کو فائدہ دینے کے لیے نہیں تھا بلکہ بنی اسرائیل کو فائدہ دینے کے لیے تھا۔ اس سے ان کی گائے پرستی ختم ہوئی، قاتل کا راز کھلا، اور انہیں معلوم ہوا کہ اصل طاقت گائے میں نہیں بلکہ اللہ کے حکم میں ہے۔

❁❁❁

ترجمہ-آیت نمبر ۷۲ سے ۸۲ تک

وَاِذْ قَتَلْتُمْ نَفْسًا فَادّٰرَءْتُمْ فِيْهَا ؕ وَاللّٰهُ مُخْرِجٌ مَّا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ ﴿۷۲﴾ فَقُلْنَا اضْرِبُوْهُ بِبَعْضِهَا ؕ كَذٰلِكَ يُحْيِ اللّٰهُ الْمَوْتٰى ۙ وَيُرِيْكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ﴿۷۳﴾ ثُمَّ قَسَتْ قُلُوْبُكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ فَهِيَ كَالْحِجَارَةِ اَوْ اَشَدُّ قَسْوَةً ؕ وَاِنَّ مِنَ الْحِجَارَةِ لَمَا يَتَفَجَّرُ مِنْهُ الْاَنْهٰرُ ؕ وَاِنَّ مِنْهَا لَمَا يَشَّقَّقُ فَيَخْرُجُ مِنْهُ الْمَآءُ ؕ وَاِنَّ مِنْهَا لَمَا يَهْبِطُ مِنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ ؕ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿۷۴﴾ اَفَتَطْمَعُوْنَ اَنْ يُّؤْمِنُوْا لَكُمْ وَقَدْ كَانَ فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ يَسْمَعُوْنَ كَلٰمَ اللّٰهِ ثُمَّ يُحَرِّفُوْنَهٗ مِنْۢ بَعْدِ مَا عَقَلُوْهُ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ﴿۷۵﴾ وَاِذَا لَقُوا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قَالُوْٓا اٰمَنَّا ۚۖ وَاِذَا خَلَا بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ قَالُوْٓا اَتُحَدِّثُوْنَهُمْ بِمَا فَتَحَ اللّٰهُ عَلَيْكُمْ لِيُحَآجُّوْكُمْ بِهٖ عِنْدَ رَبِّكُمْ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿۷۶﴾ اَوَلَا يَعْلَمُوْنَ اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا يُسِرُّوْنَ وَمَا يُعْلِنُوْنَ ﴿۷۷﴾ وَمِنْهُمْ اُمِّيُّوْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ الْكِتٰبَ اِلَّآ اَمَانِيَّ وَاِنْ هُمْ اِلَّا يَظُنُّوْنَ ﴿۷۸﴾ فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ يَكْتُبُوْنَ الْكِتٰبَ بِاَيْدِيْهِمْ ۗ ثُمَّ يَقُوْلُوْنَ هٰذَا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ لِيَشْتَرُوْا بِهٖ ثَمَنًا قَلِيْلًا ؕ فَوَيْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا كَتَبَتْ اَيْدِيْهِمْ وَوَيْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا يَكْسِبُوْنَ ﴿۷۹﴾ وَقَالُوْا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّآ اَيَّامًا مَّعْدُوْدَةً ؕ قُلْ اَتَّخَذْتُمْ عِنْدَ اللّٰهِ عَهْدًا فَلَنْ يُّخْلِفَ اللّٰهُ عَهْدَهٗٓ اَمْ تَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۸۰﴾ بَلٰى مَنْ كَسَبَ سَيِّئَةً وَّاَحَاطَتْ بِهٖ خَطِيْٓـَٔتُهٗ فَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۸۱﴾ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۸۲﴾

ترجمہ:

(۷۲) اور جب تم نے قتل کیا ایک شخص کو، پھر تم آپس میں اس بارے میں جھگڑنے لگے اور اللہ ظاہر کرنے والا تھا اس چیز کو جسے تم چھپا رہے تھے۔ (۷۳)۔ پس ہم نے کہا: مارو اسے اس گائے کے ایک حصے سے۔ اسی طرح اللہ مردوں کو زندہ کرتا ہے اور تمہیں اپنی نشانیاں دکھاتا ہے، تاکہ تم عقل سے کام لو۔ (۷۴)۔ پھر اس کے بعد بھی تمہارے دل سخت ہو گئے، وہ پتھروں کی مانند بلکہ اس سے بھی زیادہ سخت۔ اور بے شک کچھ پتھر ایسے ہیں جن سے نہریں بہہ نکلتی ہیں اور کچھ ایسے ہیں جو پھٹ جاتے ہیں تو ان سے پانی نکلتا ہے اور کچھ ایسے ہیں جو اللہ کے خوف سے گر پڑتے ہیں۔ اور اللہ اس سے بے خبر نہیں ہے جو تم کرتے ہو۔ (۷۵)۔ کیا تم اب بھی یہ امید رکھتے ہو کہ وہ (یہودی) تم پر ایمان لے آئیں گے؟ حالانکہ ان میں ایک گروہ ایسا بھی تھا جو اللہ کا کلام سنتا تھا، پھر اس کو سمجھ لینے کے بعد بھی اس میں تحریف کر دیتا

تھا، حالانکہ وہ جانتے تھے۔(۷۶)۔اور جب وہ ان لوگوں سے ملتے ہیں جو ایمان لائے، تو کہتے ہیں: ہم بھی ایمان لائے ہیں اور جب آپس میں تنہا ہوتے ہیں تو کہتے ہیں: کیا تم ان سے وہ باتیں بھی بیان کرتے ہو جو اللہ نے تم پر کھولی ہیں، تاکہ وہ ان کے ذریعے تمہارے رب کے سامنے تم سے حجت کریں؟ کیا تم عقل نہیں رکھتے؟(۷۷)۔کیا وہ نہیں جانتے کہ اللہ جانتا ہے ہر وہ بات جو وہ چھپاتے ہیں اور جو ظاہر کرتے ہیں؟(۷۸)۔اور ان میں کچھ لوگ ایسے ہیں جو ان پڑھ ہیں، وہ کتاب کو نہیں جانتے سوائے اپنی جھوٹی تمناؤں کے اور وہ محض گمان کرتے ہیں۔(۷۹)۔سو ہلاکت ہے ان لوگوں کے لیے جو اپنے ہاتھوں سے کتاب لکھتے ہیں، پھر کہتے ہیں: یہ اللہ کی طرف سے ہے، تاکہ اس کے بدلے تھوڑا فائدہ حاصل کریں۔سو ہلاکت ہے ان کے لیے، اس وجہ سے جو ان کے ہاتھوں نے لکھا اور ہلاکت ہے ان کے لیے، اس کی وجہ سے جو وہ کماتے ہیں۔(۸۰)۔اور وہ کہتے ہیں: ہمیں آگ ہرگز نہ چھوئے گی، مگر گنتی کے چند دنوں کے لیے۔کہہ دیجیے: کیا تم نے اللہ سے کوئی وعدہ لے لیا ہے؟ کیونکہ اللہ اپنے وعدے کے خلاف نہیں کرے گا، یا تم اللہ کے بارے میں ایسی بات کہہ رہے ہو جس کا تمہیں علم نہیں؟(۸۱)۔کیوں نہیں! جس نے کوئی برائی کمائی اور اس کے گناہ نے اسے گھیر لیا، تو وہی لوگ ہیں جو دوزخ والے ہیں اور وہ ہمیشہ اس میں رہیں گے۔(۸۲)۔اور جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے نیک عمل کیے، وہی لوگ جنت والے ہیں، وہ ہمیشہ اس میں رہیں گے۔۔

تفسیر آیت نمبر ۷۲ سے ۸۲ تک

آیت نمبر(۷۲۔۷۳) وَاِذْ قَتَلْتُمْ نَفْسًا فَادّٰرَءْتُمْ فِيْهَا ؕ وَاللّٰهُ مُخْرِجٌ مَّا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ ﴿۷۲﴾ فَقُلْنَا اضْرِبُوْهُ بِبَعْضِهَا ؕ كَذٰلِكَ يُحْيِ اللّٰهُ الْمَوْتٰى ۙ وَيُرِيْكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ﴿۷۳﴾

ترجمہ: ''اور جب تم نے قتل کیا ایک شخص کو، پھر تم آپس میں اس بارے میں جھگڑنے لگے اور اللہ ظاہر کرنے والا تھا اس چیز کو جسے تم چھپا رہے تھے۔پس ہم نے کہا: مارو اسے اس گائے کے ایک حصے سے۔اسی طرح اللہ مردوں کو زندہ کرتا ہے اور تمہیں اپنی نشانیاں دکھاتا ہے، تاکہ تم عقل سے کام لو''۔

تفسیر یہ وہی قتل کا واقعہ ہے جس کے سبب بنی اسرائیل کو گائے ذبح کرنے کا حکم دیا گیا تھا، مگر اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت سے اس راز کو آشکار کر دیا۔حالانکہ یہ قتل رات کی تاریکی میں پوشیدہ طور پر کیا گیا تھا، لیکن اس سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ نیکی ہو یا بدی، چھپ کر کی جائے یا اعلانیہ، سب اللہ کے علم میں ہے اور وہ جب چاہے اسے ظاہر کر سکتا

ہے۔لہٰذا انسان کو چاہیے کہ خلوت ہو یا جلوت، ہر حال میں نیکی کو اپنا شعار بنائے۔

اس حکم کی ایک حکمت یہ بھی تھی کہ بنی اسرائیل کی ضد اور حجت بازی کا حال نہ صرف اُن کے اپنے دور کے لوگوں پر ظاہر ہو جائے بلکہ بعد کی نسلیں بھی اس سے عبرت حاصل کریں اور اس روش سے بچیں۔اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے یہ اعلان فرمایا کہ ''اسی طرح اللہ مردوں کو زندہ کرتا ہے اور اپنی نشانیاں تمہارے سامنے رکھتا ہے تاکہ تم عقل وفہم سے کام لو۔''

آیت نمبر (۷۴) ثُمَّ قَسَتْ قُلُوْبُكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ فَهِيَ كَالْحِجَارَةِ اَوْ اَشَدُّ قَسْوَةً ؕ وَاِنَّ مِنَ الْحِجَارَةِ لَمَا يَتَفَجَّرُ مِنْهُ الْاَنْهٰرُ ؕ وَاِنَّ مِنْهَا لَمَا يَشَّقَّقُ فَيَخْرُجُ مِنْهُ الْمَآءُ ؕ وَاِنَّ مِنْهَا لَمَا يَهْبِطُ مِنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ ؕ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿۷۴﴾

ترجمہ: ''پھر اس کے بعد بھی تمہارے دل سخت ہو گئے، وہ پتھروں کی مانند بلکہ اس سے بھی زیادہ سخت۔اور بے شک کچھ پتھر ایسے ہیں جن سے نہریں بہہ نکلتی ہیں اور کچھ ایسے ہیں جو پھٹ جاتے ہیں تو ان سے پانی نکلتا ہے اور کچھ ایسے ہیں جو اللہ کے خوف سے گر پڑتے ہیں۔اور اللہ اس سے بے خبر نہیں ہے جو تم کرتے ہو''۔

یہودیوں کی سختی

تفسیر اس آیت میں یہودیوں کے دلوں کی سختی کا ذکر ہے کہ وہ پتھروں کی مانند ہو گئے ہیں، بلکہ بعض پہلوؤں سے پتھروں سے بھی زیادہ سخت۔اللہ کی بے شمار نشانیاں دیکھنے کے باوجود وہ حق کو قبول کرنے پر آمادہ نہ ہوئے۔

حالانکہ پتھروں کی کیفیت یہ ہے کہ کچھ پتھروں سے نہریں پھوٹتی ہیں، کچھ پھٹ کر چشمے جاری کرتے ہیں اور کچھ اللہ کے خوف سے اپنی جگہ سے لڑھک کر نیچے گر پڑتے ہیں۔اس مثال کے ذریعے یہ بتایا گیا کہ ان کے دلوں کی سختی، پتھر کی سختی سے بڑھ کر ہے۔پتھر تو اپنی اصل میں لوہے اور رانگے سے بھی زیادہ سخت ہوتا ہے، کیونکہ لوہا آگ میں پگھل جاتا ہے لیکن پتھر اپنی جگہ قائم رہتا ہے۔پھر بھی پتھر ان کے دلوں سے بہتر ہے، اس لیے کہ اس میں کبھی نہ کبھی نرمی اور انکساری پیدا ہو جاتی ہے، جب کہ ان کے دل ہر نصیحت اور ہر نشانی کے باوجود بدستور سخت ہی رہتے ہیں۔

حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ کے ذکر کے علاوہ زیادہ باتوں میں مشغول نہ ہو، کیونکہ ذکرِ الٰہی کے سوا گفتگو دل کو سخت کر دیتی ہے، اور بے شک اللہ سے سب سے زیادہ دور وہی شخص ہے جس کا دل سخت ہو۔'' **(ترمذی:۲۴۱۱)**

آیت نمبر (۷۵) اَفَتَطْمَعُوْنَ اَنْ يُّؤْمِنُوْا لَكُمْ وَقَدْ كَانَ فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ يَسْمَعُوْنَ كَلٰمَ اللّٰهِ

ثُمَّ يُحَرِّفُوْنَهٗ مِنْۢ بَعْدِ مَا عَقَلُوْهُ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ﴿۷۵﴾

ترجمہ: ''کیا تم اب بھی یہ امید رکھتے ہو کہ وہ (یہودی) تم پر ایمان لے آئیں گے؟ حالانکہ ان میں ایک گروہ ایسا بھی تھا جو اللہ کا کلام سنتا تھا، پھر اس کو سمجھ لینے کے بعد بھی اس میں تحریف کر دیتا تھا، حالانکہ وہ جانتے تھے''۔

تفسیر یہود کے دلوں کی سختی بیان کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا کہ کیا اب بھی تم یہ گمان رکھتے ہو کہ یہ لوگ تمہارے دین کو قبول کر لیں گے؟ حالانکہ ان کے باپ دادا کا حال یہ رہا ہے کہ وہ تورات کو سننے اور سمجھنے کے باوجود اس میں تحریف کرتے، حلال کو حرام اور حرام کو حلال بنا دیتے، حق کو باطل اور باطل کو حق ثابت کرتے۔ آج کے یہ لوگ بھی اپنے آباواجداد سے کسی طرح کم نہیں ہیں۔ اے مسلمانو! کیا تم توقع رکھتے ہو کہ یہ بدبخت ایمان لے آئیں گے، جبکہ ان میں ایک گروہ ایسا ہے جو جان بوجھ کر اللہ کے کلام میں تبدیلی کرتا ہے؟

اس آیت سے یہ حقیقت بھی واضح ہوتی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پہچان کے لئے تورات میں صاف نشانیاں موجود تھیں، جنہیں یہود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مدینہ تشریف آوری سے پہلے بیان کیا کرتے تھے۔ کچھ لوگ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مدینہ آنے کے بعد بھی ان نشانیوں کا ذکر کر دیتے اور بظاہر کہتے کہ ہم بھی اس نبی پر ایمان رکھتے ہیں۔ لیکن جب اپنے ہم مذہبوں کے پاس پہنچتے تو سرزنش کرتے ہوئے کہتے کہ تم مسلمانوں کو تورات کی وہ باتیں کیوں بتاتے ہو جو خود تمہارے خلاف حجت بنتی ہیں؟ گویا یہ لوگ خود جانتے تھے کہ مسلمانوں کے سامنے انکار کی کوئی گنجائش نہیں، اس کے باوجود ہٹ دھرمی پر قائم رہے۔ اس لئے ان سے سچے دین میں داخل ہونے کی امید رکھنا نری خام خیالی ہے۔

آیت نمبر (۷۶) وَاِذَا لَقُوا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قَالُوْٓا اٰمَنَّا ۚ وَاِذَا خَلَا بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ قَالُوْٓا اَتُحَدِّثُوْنَهُمْ بِمَا فَتَحَ اللّٰهُ عَلَيْكُمْ لِيُحَآجُّوْكُمْ بِهٖ عِنْدَ رَبِّكُمْ ۭ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿۷۶﴾

ترجمہ: ''اور جب وہ ان لوگوں سے ملتے ہیں جو ایمان لائے، تو کہتے ہیں: ہم بھی ایمان لائے ہیں اور جب آپس میں تنہا ہوتے ہیں تو کہتے ہیں: کیا تم ان سے وہ باتیں بھی بیان کرتے ہو جو اللہ نے تم پر کھولی ہیں، تاکہ وہ ان کے ذریعے تمہارے رب کے سامنے تم سے حجت کریں؟ کیا تم عقل نہیں رکھتے؟۔

تفسیر اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ''وَاِذَا لَقُوا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا''

حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے، جسے ''ابن جریر'' نے عکرمہؓ کے واسطے سے نقل کیا ہے، کہ جب یہ

یہودی مسلمانوں سے ملاقات کرتے تو کہتے: ہم بھی اس بات پر ایمان لاتے ہیں کہ تمہارے محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اللہ کے رسول ہیں، لیکن وہ صرف تمہارے لئے خاص رسول ہیں۔ پھر جب یہ اپنے خفیہ اجتماع میں آپس میں ملتے تو اس بات کو چھپانے کے بجائے برائی اور انکار کا اظہار کرتے، تو اس پر یہ آیت نازل ہوئی: ''وَاِذَا لَقُوا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا ''

اسی طرح ''سدی'' سے روایت ہے کہ یہ آیت یہودیوں کے ایک گروہ کے بارے میں نازل ہوئی، جو پہلے ایمان لایا تھا لیکن بعد میں نفاق اختیار کرلیا۔ یہ لوگ جب مسلمانوں کے پاس جاتے تو کچھ باتیں ان کے سامنے ظاہر کر دیتے۔ ان میں سے بعض یہود نے ان پر اعتراض کیا اور کہا: تم وہ باتیں مسلمانوں کے سامنے کیوں ظاہر کرتے ہو جو اللہ نے تمہارے حق میں بیان کی ہیں؟ اس پر وہ جواب دیتے کہ ہم اللہ کی نظر میں تم سے زیادہ محبوب اور تم سے زیادہ عزت والے ہیں۔ **(لباب النقول فی اسباب النزول)**

منافقوں اور اہل کتاب کا حال

ان آیات میں منافقین اور اہل کتاب کی کیفیت کو واضح کیا گیا ہے کہ جب یہ مسلمانوں سے ملتے ہیں تو بظاہر کہتے ہیں: ''ہم بھی تمہاری طرح مسلمان ہیں۔'' مگر جب تنہائی میں اپنے ہم مذہبوں کے پاس ہوتے ہیں تو ایک دوسرے کو ملامت کرتے ہیں اور کہتے ہیں: ''تم مسلمانوں کے سامنے اسلام و ایمان کا اظہار کیوں کرتے ہو؟ یہ بات تو ہمارے خلاف ان کے لئے دلیل بن جاتی ہے۔'' وہ مزید کہتے: ''یہود نے خود ہی اقرار کرلیا ہے کہ مسلمان جس دین پر ہیں وہی حق ہے، اور ہم جس دین پر ہیں وہ باطل ہے۔ قیامت کے دن یہی مسلمان اللہ کے حضور ہمارے خلاف گواہی دیں گے کہ تم دنیا میں خود کہا کرتے تھے کہ ہماری کتابوں میں اسلام اور محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سچائی کی شہادت موجود ہے۔ اس دن تو ساری مخلوق کے سامنے ہماری رسوائی ہوگی۔''

آیت نمبر (۷۷) اَوَلَا یَعْلَمُوْنَ اَنَّ اللّٰهَ یَعْلَمُ مَا یُسِرُّوْنَ وَمَا یُعْلِنُوْنَ۝۷۷

ترجمہ: ''کیا وہ نہیں جانتے کہ اللہ جانتا ہے ہر وہ بات جو وہ چھپاتے ہیں اور جو ظاہر کرتے ہیں؟''۔

تفسیر اس آیت میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ تم بتاؤ یا نہ بتاؤ اللہ کو تو ہر بات کا علم ہے اور وہ ان باتوں کو بھی تمہارے بتلائے بغیر مسلمانوں پر ظاہر فرما سکتا ہے۔

آیت نمبر (۷۸) وَمِنْهُمْ اُمِّیُّوْنَ لَا یَعْلَمُوْنَ الْكِتٰبَ اِلَّآ اَمَانِیَّ وَاِنْ هُمْ اِلَّا یَظُنُّوْنَ۝۷۸

ترجمہ: ''اور ان میں کچھ لوگ ایسے ہیں جو ان پڑھ ہیں، وہ کتاب کو نہیں جانتے سوائے اپنی جھوٹی

تمناؤں کے اور وہ محض گمان کرتے ہیں''۔

تفسیر اس آیت میں جاہل یہودی عوام کا حال بیان ہوا ہے کہ وہ نہ تو توریت پڑھنے کی صلاحیت رکھتے تھے اور نہ ہی کسی حقیقی علم سے بہرہ ور تھے۔ لیکن ان کی زندگیاں جھوٹی تمنّاؤں اور بے بنیاد امیدوں میں الجھی ہوئی تھیں۔ وہ گمان کرتے تھے کہ جنت تو لازمی طور پر انہیں ہی ملنی ہے، اور اگر کبھی عذاب ہوا بھی تو محض چند دن جہنم میں رہ کر انہیں ضرور نکال لیا جائے گا۔ ان کا یہ زعم تھا کہ ہم انبیاء کی اولاد اور اللہ کے محبوب ہیں، اور نبوت صرف ہمارے ہی خاندان کے حصے میں آئی ہے۔ اسی غرور اور خود فریبی کی بنا پر وہ بے شمار باطل آرزوؤں کے جال میں پھنسے رہے۔

آیت نمبر (۷۹) فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ يَكْتُبُوْنَ الْكِتٰبَ بِاَيْدِيْهِمْ ۗ ثُمَّ يَقُوْلُوْنَ هٰذَا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ لِيَشْتَرُوْا بِهٖ ثَمَنًا قَلِيْلًا ؕ فَوَيْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا كَتَبَتْ اَيْدِيْهِمْ وَوَيْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا يَكْسِبُوْنَ ﴿۷۹﴾

ترجمہ: ''سو ہلاکت ہے ان لوگوں کے لیے جو اپنے ہاتھوں سے کتاب لکھتے ہیں، پھر کہتے ہیں: یہ اللہ کی طرف سے ہے، تاکہ اس کے بدلے تھوڑا فائدہ حاصل کریں۔ سو ہلاکت ہے ان کے لیے، اس وجہ سے جو ان کے ہاتھوں نے لکھا اور ہلاکت ہے ان کے لیے، اس کی وجہ سے جو وہ کماتے ہیں''۔

تفسیر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ''فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ''۔ 'نسائی' نے حضرت ابن عباسؓ سے روایت کی ہے کہ یہ آیت یہودیوں کے بارے میں نازل ہوئی، جبکہ 'ابن ابی حاتم' نے عکرمہ کے واسطے سے حضرت ابن عباسؓ سے نقل کیا ہے کہ یہ آیت یہودی علماء کے حق میں اتری۔ ان علماء نے تورات میں رسول اللہ ﷺ کی وہ حقیقی صفات دیکھیں کہ آپؐ درمیانہ قد کے، سرگیں آنکھوں والے، حسین و جمیل چہرے کے مالک اور معتدل بالوں والے ہوں گے جو نہ بالکل سیدھے ہوں گے اور نہ بالکل گھنگریالے۔ مگر حسد، بغض اور عداوت کے باعث انہوں نے ان اوصاف کو مٹا ڈالا اور ان کی جگہ یہ لکھ دیا کہ آپؐ لمبے قد، نیلی آنکھوں اور بالکل سیدھے بالوں والے ہوں گے۔

پھر اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ''وَقَالُوْا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ''۔ اس آیت کے بارے میں 'طبرانی' نے ''**المعجم الکبیر**'' میں اور 'ابن ابی حاتم' نے ابن اسحٰق، محمد بن بکر، عکرمہ اور سعید بن جبیرؓ کے واسطے سے حضرت ابن عباسؓ سے روایت کی ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ مدینہ منورہ تشریف لائے تو یہود کہا کرتے تھے کہ دنیا کی کل عمر سات ہزار برس ہے، اور ہر ہزار برس کے بدلے میں ہمیں ایک دن عذاب دیا جائے گا، کیونکہ آخرت کا ایک دن دنیا کے ہزار برس کے برابر ہے، اس طرح یہ کل سات دن ہوئے۔

اسی پر یہ پوری آیت کریمہ نازل ہوئی۔ ابن جریر نے ضحاک کے واسطے سے حضرت ابن عباسؓ سے یہ بھی نقل کیا ہے کہ یہود کہا کرتے تھے: ''ہم دوزخ میں نہیں جائیں گے، مگر صرف ان دنوں کے برابر جن میں ہم نے بچھڑے کی پرستش کی تھی۔'' وہ مدت چالیس راتوں کی تھی۔ ان کا خیال تھا کہ جب یہ ایام پورے ہو جائیں گے تو ہمارا عذاب بھی ختم ہو جائے گا۔ (لباب النقول فی اسباب النزول)

یہودی علماء اور دنیا پرستی

اس آیت میں یہودی علماء اور ان کی دنیا پرستی کا نقشہ کھینچا گیا ہے۔ جب عام لوگ مسائل پوچھنے کے لیے ان کے پاس آتے تو ساتھ ہی کچھ رشوت بھی دے دیتے، اور یہ علماء ان کی مرضی کے مطابق فتویٰ سنا دیتے اور کہتے کہ یہی اللہ کا حکم ہے۔ یوں وہ ایک طرف اللہ کی کتاب میں تحریف کے مرتکب ہوتے اور دوسری طرف رشوت خوری کے گناہ میں ڈوبے رہتے۔ **(تفصیل کے لیے دیکھیں: سورۃ المائدۃ، آیت ۱۷)**

اللہ تعالیٰ نے ان کے اس حال کو بیان کرنے کے بعد فرمایا کہ ان کے لیے دوہری ہلاکت اور بربادی ہے، اسی لیے ان کے بارے میں ''ویل'' کا لفظ دو مرتبہ آیا۔ ایک اس لیے کہ انہوں نے توریت کو بدل ڈالا، اور دوسرے اس لیے کہ وہ دوسروں کا مال ناجائز طریقے سے کھاتے تھے۔

ایسے باطل وہم اور خود ساختہ عقیدے صرف یہودیوں تک محدود نہیں رہے، بلکہ تقریباً ہر مذہب کے لوگوں نے اپنی اپنی طرف سے گڑھ لیے۔ عیسائیوں نے یہ نظریہ تراشا کہ حضرت عیسیٰؑ کو سولی پر چڑھا کر پوری امت کا کفارہ ادا ہو گیا۔ امتِ محمدیہ بھی ان راہوں میں پیچھے نہ رہی اور پیروں کی شفاعت جیسی گمراہ کن باتیں ایجاد کر لیں، گویا پیر قیامت کے دن اپنے مریدوں کو عذاب سے بچا لیں گے خواہ انہوں نے دنیا میں کیسا ہی عمل کیا ہو۔ ایسے عقائد امت کو دین کی اصل بنیادوں سے کاٹ کر بے عملی کی طرف لے جاتے ہیں۔

حدیث میں آیا ہے کہ ''ویل'' جہنم کی ایک وادی کا نام ہے، جس کی گہرائی کا یہ حال ہے کہ اگر ایک کافر کو اس میں گرایا جائے تو اسے اس کی تہہ تک پہنچنے میں چالیس برس لگ جائیں گے۔ (ترمذی: ۳۱۶۴)

آیت نمبر (۸۰) وَقَالُوْا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّآ اَيَّامًا مَّعْدُوْدَةً ۭ قُلْ اَتَّخَذْتُمْ عِنْدَ اللّٰهِ عَهْدًا فَلَنْ يُّخْلِفَ اللّٰهُ عَهْدَهٗٓ اَمْ تَقُوْلُوْنَ عَلَي اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ۝۸۰

ترجمہ: '' اور وہ کہتے ہیں: ہمیں آگ ہرگز نہ چھوئے گی، مگر گنتی کے چند دنوں کے لیے۔ کہہ دیجیے: کیا تم نے اللہ سے کوئی وعدہ لے لیا ہے؟ کیونکہ اللہ اپنے وعدے کے خلاف نہیں کرے گا، یا تم

اللہ کے بارے میں ایسی بات کہہ رہے ہو جس کا تمہیں علم نہیں؟''۔

تفسیر یہودی اس غلط فہمی میں مبتلا تھے کہ وہ اللہ کے لاڈلے اور چہیتے ہیں، اس لیے انہیں جہنم میں کبھی نہیں ڈالا جائے گا۔ اگر ڈالے بھی گئے تو صرف چند دن کے لیے۔ کوئی کہتا کہ دنیا کی عمر سات ہزار برس ہے اور ہم ایک ہزار برس کے بدلے محض ایک دن جہنم میں رہیں گے۔ کچھ کا کہنا تھا کہ چونکہ ہم نے بچھڑے کی عبادت چالیس دن کی تھی، اس لیے عذاب بھی صرف اتنی ہی مدت کے لیے ہوگا۔

اللہ تعالیٰ نے ان کے اس زعم کی کئی جہتوں سے تردید فرمائی۔ کہیں ارشاد ہوا: ''کیا تمہارے پاس اللہ کا کوئی عہد ہے؟ اگر ایسا ہے تو پیش کرو''۔ اور ایک اور جگہ فرمایا: ''اے یہودیو! اگر تمہیں یہ گمان ہے کہ تم ہی اللہ کے چہیتے ہو، اور دوسرے لوگ نہیں، تو پھر موت کی تمنا کرو اگر تم اپنے دعوے میں سچے ہو''۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اپنے گناہوں اور کرتوتوں کے باعث وہ کبھی بھی موت کی آرزو نہیں کر سکیں گے، اور اللہ ظالموں کے حال سے بخوبی واقف ہے۔ (سورۃ الجمعہ: ۶-۷)

حضرت ابن عباسؓ اور مجاہدؒ سے روایت ہے کہ یہود کہا کرتے تھے: دنیا کی کل عمر سات ہزار سال ہے اور ہم ہر ہزار کے بدلے ایک دن عذاب بھگتیں گے۔ حضرت ابن عباسؓ سے ایک اور روایت منقول ہے کہ وہ کہا کرتے تھے: چونکہ ہم نے بچھڑے کی پرستش چالیس دن کی، لہٰذا ہمیں صرف اتنے ہی دن عذاب دیا جائے گا، اس کے بعد ہمیں نجات مل جائے گی۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے اس گمان پر فرمایا: ''کیا تم نے اس بارے میں اللہ سے کوئی پکا عہد لیا ہے؟'' دراصل یہ اللہ پر ایک بہتان تھا۔

قرآن وسنت کی روشنی میں یہ بات بالکل واضح ہے کہ تمام کافر ومشرک ہمیشہ جہنم میں رہیں گے، البتہ وہ مسلمان جو شرک سے بچے رہے مگر گناہوں میں ڈوبے رہے، انہیں بالآخر جہنم سے نکال لیا جائے گا۔

آیت نمبر (۸۱-۸۲) بَلٰى مَنْ كَسَبَ سَيِّئَةً وَّاَحَاطَتْ بِهٖ خَطِيْٓـَٔتُهٗ فَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۸۱﴾ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۸۲﴾

ترجمہ: ''کیوں نہیں! جس نے کوئی برائی کمائی اور اس کے گناہ نے اسے گھیر لیا، تو وہی لوگ ہیں جو دوزخ والے ہیں اور وہ ہمیشہ اس میں رہیں گے۔ اور جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے نیک عمل کیے، وہی لوگ جنت والے ہیں، وہ ہمیشہ اس میں رہیں گے''۔

تفسیر ان دونوں آیتوں میں جنت اور جہنم میں داخلے کا اصول نہایت وضاحت کے ساتھ بیان ہوا ہے۔ جو لوگ

برائیوں ہی میں ڈوبے رہیں گے، یعنی کفر وشرک کے مرتکب ہوں گے، تو خواہ انہوں نے کچھ نیکیاں بھی کی ہوں، ان کے تمام اعمال رائیگاں جائیں گے اور وہ ہمیشہ کے لیے جہنم کے ایندھن بنیں گے۔ اس کے برعکس جو لوگ ایمان لائے اور نیک اعمال بجالائے، وہ لازمی طور پر جنت کے وارث ہوں گے۔

البتہ جو اہلِ ایمان گناہوں میں آلودہ رہے، ان کا معاملہ اللہ کے سپرد ہوگا۔ وہ چاہے تو اپنے فضل وکرم سے ان کے گناہ بخش دے اور چاہے تو انہیں کچھ مدت کے لیے جہنم میں رکھے۔ مگر بالآخر نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شفاعت کے طفیل انہیں جنت میں داخل کر دیا جائے گا، جیسا کہ صحیح احادیث میں اس کی صراحت موجود ہے۔

❁❁❁

ترجمہ- آیت نمبر ۸۳ سے ۸۷ تک

وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ لَا تَعْبُدُوْنَ اِلَّا اللّٰهَ ۭ وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا وَّذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَقُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْنًا وَّاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ ۭ ثُمَّ تَوَلَّيْتُمْ اِلَّا قَلِيْلًا مِّنْكُمْ وَاَنْتُمْ مُّعْرِضُوْنَ ۝ وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَكُمْ لَا تَسْفِكُوْنَ دِمَآءَكُمْ وَلَا تُخْرِجُوْنَ اَنْفُسَكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ ثُمَّ اَقْرَرْتُمْ وَاَنْتُمْ تَشْهَدُوْنَ ۝ ثُمَّ اَنْتُمْ هٰٓؤُلَاۗءِ تَقْتُلُوْنَ اَنْفُسَكُمْ وَتُخْرِجُوْنَ فَرِيْقًا مِّنْكُمْ مِّنْ دِيَارِهِمْ تَظٰهَرُوْنَ عَلَيْهِمْ بِالْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ ۭ وَاِنْ يَّاْتُوْكُمْ اُسٰرٰى تُفٰدُوْهُمْ وَهُوَ مُحَرَّمٌ عَلَيْكُمْ اِخْرَاجُهُمْ ۭ اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَتَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ ۚ فَمَا جَزَاۗءُ مَنْ يَّفْعَلُ ذٰلِكَ مِنْكُمْ اِلَّا خِزْيٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يُرَدُّوْنَ اِلٰٓى اَشَدِّ الْعَذَابِ ۭ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ۝ اُولٰۗىِٕكَ الَّذِيْنَ اشْتَرَوُا الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا بِالْاٰخِرَةِ ۠ فَلَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ وَلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ ۝ وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ وَقَفَّيْنَا مِنْۢ بَعْدِهٖ بِالرُّسُلِ ۠ وَاٰتَيْنَا عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنٰتِ وَاَيَّدْنٰهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ ۭ اَفَكُلَّمَا جَاۗءَكُمْ رَسُوْلٌۢ بِمَا لَا تَهْوٰٓى اَنْفُسُكُمُ اسْتَكْبَرْتُمْ ۚ فَفَرِيْقًا كَذَّبْتُمْ ۠ وَفَرِيْقًا تَقْتُلُوْنَ ۝

ترجمہ:

(۸۳) اور جب ہم نے بنی اسرائیل سے پختہ وعدہ لیا تھا کہ: اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو اور والدین کے ساتھ حسنِ سلوک کرو اور رشتہ داروں، یتیموں اور مسکینوں کے ساتھ بھی اور لوگوں سے اچھی بات کہو اور نماز قائم رکھو اور زکوٰۃ دیتے رہو۔ پھر تم میں سے چند لوگوں کے سوا باقی سب پھر گئے اور تم تو ہو ہی منہ موڑنے والے۔ (۸۴)۔ اور جب ہم نے تم سے پختہ وعدہ لیا کہ: تم آپس میں خون نہ بہاؤ گے اور نہ ہی اپنے لوگوں کو ان کے گھروں سے نکالو گے۔ پھر تم نے اس کا اقرار کیا تھا اور تم خود اس پر گواہ ہو۔ (۸۵)۔ پھر تم ہی وہ لوگ ہو کہ اپنے لوگوں کو قتل کرتے ہو اور اپنے ہی ایک گروہ کو ان کے گھروں سے نکالتے ہو، ان پر گناہ اور زیادتی کے ساتھ چڑھائی کرتے ہو اور اگر وہ تمہارے پاس قیدی بن کر آئیں تو ان کو فدیہ دے کر چھوڑاتے ہو، حالانکہ ان کا نکالنا تم پر حرام کیا گیا تھا۔ کیا تم کتاب کے ایک حصے پر ایمان رکھتے ہو اور دوسرے حصے کا انکار کرتے ہو؟ تو جو ایسا کرے تم میں سے، اس کی سزا دنیا کی زندگی میں رسوائی کے سوا کچھ نہیں اور قیامت کے دن وہ سخت ترین عذاب کی طرف لوٹائے جائیں گے اور اللہ بے خبر نہیں ہے ان کاموں سے جو تم کرتے ہو۔ (۸۶)۔ یہی وہ لوگ ہیں جنہوں نے دنیا کی زندگی خرید لی ہے آخرت کے بدلے، چنانچہ نہ ان سے عذاب

ہلکا کیا جائے گا اور نہ ہی ان کی مدد کی جائے گی۔(۸۷)۔اور بیشک ہم نے موسیٰ کو کتاب دی اور اس کے بعد پے در پے کئی رسول بھیجے اور ہم نے عیسیٰ ابنِ مریم کو واضح نشانیاں عطا کیں اور روح القدس (جبرائیل) کے ذریعے ان کی مدد کی، تو کیا جب بھی تمہارے پاس کوئی رسول ایسی بات لے کر آیا جو تمہارے نفس کو پسند نہ آئی، تو تم نے تکبر کیا؟ کچھ رسولوں کو جھٹلا دیا اور کچھ کو قتل ہی کر ڈالا۔

تفسیر- آیت نمبر ۸۳ سے ۸۷ تک

آیت نمبر(۸۳) وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ لَا تَعْبُدُوْنَ اِلَّا اللّٰهَ ۭ وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا وَّذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَقُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْنًا وَّاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ ۭ ثُمَّ تَوَلَّيْتُمْ اِلَّا قَلِيْلًا مِّنْكُمْ وَاَنْتُمْ مُّعْرِضُوْنَ ۝۸۳

ترجمہ: ''اور جب ہم نے بنی اسرائیل سے پختہ وعدہ لیا تھا کہ: اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو اور والدین کے ساتھ حسنِ سلوک کرو اور رشتہ داروں، یتیموں اور مسکینوں کے ساتھ بھی اور لوگوں سے اچھی بات کہو اور نماز قائم رکھو اور زکوٰۃ دیتے رہو۔ پھر تم میں سے چند لوگوں کے سوا باقی سب پھر گئے اور تم تو ہو ہی منہ موڑنے والے''۔

تفسیر اس آیت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے عہد کے یہودیوں کو ان کی وہ باتیں یاد دلائی جا رہی ہیں، جن کا حکم اللہ تعالیٰ نے ان کے باپ دادا کو دیا تھا اور اس پر ان سے عہد لیا تھا۔ لیکن یہ ایک سخت دل قوم ثابت ہوئی جس نے کبھی بھی کسی وعدے کی پاسداری نہ کی، اور چند افراد کو چھوڑ کر پوری قوم نے بدعہدی کی۔

اس عہد میں سب سے پہلی تاکید صرف ایک اللہ کی عبادت کی گئی، جو ہر نبی کی دعوت کا بنیادی پیغام رہا ہے، جیسا کہ سورۂ نساء آیت ۳۶ اور سورۂ انبیاء آیت ۲۵ میں بھی بیان ہوا ہے۔ اس کے بعد والدین، رشتہ داروں، یتیموں اور مسکینوں کے ساتھ حسنِ سلوک کا حکم دیا گیا، نیز نماز قائم کرنے اور زکوٰۃ ادا کرنے کی تاکید کی گئی۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ یہ عبادات سابقہ شریعتوں میں بھی موجود تھیں۔

والدین کے ساتھ حسنِ سلوک

اگرچہ خطاب بظاہر مدینہ کے یہودیوں سے ہے، لیکن یہ تعلیمات پوری انسانیت کے لیے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی عبادت کے ساتھ والدین کے ساتھ حسنِ سلوک کو جوڑا ہے، جس سے ان کی عظیم اہمیت ظاہر ہوتی ہے۔ قرآن میں

دعا کے طور پر یہ الفاظ سکھائے گئے: ''اے میرے رب! جس طرح انہوں نے بچپن میں مجھے پالا ہے، تو بھی ان پر رحم فرما''۔ یہ ان چند دعاؤں میں سے ہے جنہیں مانگنے کا طریقہ خود اللہ نے بتایا ہے۔

مسکینوں کے ساتھ سلوک

حدیث میں مسکین کی تعریف یہ بیان کی گئی ہے: ''مسکین وہ نہیں جو گھروں کے چکر لگائے، ایک آدھ لقمے یا چند کھجوروں کی خواہش میں در بدر پھرے۔ بلکہ حقیقی مسکین وہ ہے جس کے پاس ضرورت پوری کرنے کے لیے کافی مال نہ ہو، اور لوگ اس کی حالت سے بے خبر ہوں کہ اسے خیرات دیں، اور نہ ہی وہ خود کسی سے سوال کرے''۔

(صحیح بخاری، کتاب الزکوۃ، باب ۵۳، حدیث ۱۴۷۹)

سب سے بہترین عمل

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ روایت کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے پوچھا: ''کون سا عمل سب سے بہتر ہے؟'' آپ ﷺ نے فرمایا: ''وقت پر نماز ادا کرنا''۔ میں نے پوچھا: ''پھر کون سا؟'' آپ ﷺ نے فرمایا: ''والدین کے ساتھ حسنِ سلوک کرنا''۔ میں نے پھر پوچھا: ''اس کے بعد کون سا؟'' آپ ﷺ نے فرمایا: ''اللہ کی راہ میں جہاد کرنا''۔ **(بخاری: ۵۲۷)**

لوگوں کے ساتھ خوش اخلاقی

ان آیات میں دوسروں سے خوش کلامی اور اچھے برتاؤ کا حکم بھی دیا گیا ہے۔ امام حسن بصریؒ فرماتے ہیں کہ اس سے مراد نیکی کا حکم دینا اور برائی سے روکنا ہے۔ ''ناس'' کے لفظ میں یہ اشارہ ہے کہ یہ حکم سب کے لیے ہے، حتیٰ کہ کفار کے ساتھ بھی خوش اخلاقی اور مسکراتے ہوئے گفتگو کرنی چاہیے۔ مسلمان نہ بدزبان ہوتا ہے، نہ گالی گلوچ کرنے والا اور نہ ہی جھگڑالو۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''کسی نیکی کو حقیر مت جانو، خواہ وہ یہ ہی کیوں نہ ہو کہ اپنے بھائی سے مسکراتے ہوئے ملو''۔ **(مسلم: ۶۶۹۰)**

بدعہدی اور انجام

ان آیات میں یہ بھی واضح کیا گیا کہ بنی اسرائیل نے اپنے عہد کو توڑا اور نیک اعمال کے بجائے گمراہی اختیار کی، سوائے چند افراد کے جنہوں نے حقوق کی ادائیگی میں کوتاہی نہ کی اور رسول اللہ ﷺ پر ایمان لے آئے۔ لیکن اس سے یہ حقیقت بھی عیاں ہوئی کہ اگر کسی قوم میں کچھ نیک لوگ موجود ہوں، تب بھی پوری قوم پر عذابِ الٰہی کا نزول رک نہیں سکتا۔

آیت نمبر (۸۴-۸۵) وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَكُمْ لَا تَسْفِكُوْنَ دِمَآءَكُمْ وَلَا تُخْرِجُوْنَ اَنْفُسَكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ ثُمَّ اَقْرَرْتُمْ وَاَنْتُمْ تَشْهَدُوْنَ۝۸۴ ثُمَّ اَنْتُمْ هٰٓؤُلَآءِ تَقْتُلُوْنَ اَنْفُسَكُمْ وَتُخْرِجُوْنَ فَرِيْقًا مِّنْكُمْ مِّنْ دِيَارِهِمْ تَظٰهَرُوْنَ عَلَيْهِمْ بِالْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَاِنْ يَّاْتُوْكُمْ اُسٰرٰى تُفٰدُوْهُمْ وَهُوَ مُحَرَّمٌ عَلَيْكُمْ اِخْرَاجُهُمْ اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَتَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ فَمَا جَزَآءُ مَنْ يَّفْعَلُ ذٰلِكَ مِنْكُمْ اِلَّا خِزْيٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يُرَدُّوْنَ اِلٰٓى اَشَدِّ الْعَذَابِ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ۝۸۵

ترجمہ: ''اور جب ہم نے تم سے پختہ وعدہ لیا کہ: تم آپس میں خون نہ بہاؤ گے اور نہ ہی اپنے لوگوں کو ان کے گھروں سے نکالو گے۔ پھر تم نے اس کا اقرار کیا تھا اور تم خود اس پر گواہ ہو۔ پھر تم ہی وہ لوگ ہو کہ اپنے لوگوں کو قتل کرتے ہو اور اپنے ہی ایک گروہ کو ان کے گھروں سے نکالتے ہو، ان پر گناہ اور زیادتی کے ساتھ چڑھائی کرتے ہو اور اگر وہ تمہارے پاس قیدی بن کر آئیں تو ان کو فدیہ دے کر چھوڑاتے ہو، حالانکہ ان کا نکالنا تم پر حرام کیا گیا تھا۔ کیا تم کتاب کے ایک حصے پر ایمان رکھتے ہو اور دوسرے حصے کا انکار کرتے ہو؟ تو جو ایسا کرے تم میں سے، اس کی سزا دنیا کی زندگی میں رسوائی کے سوا کچھ نہیں اور قیامت کے دن وہ سخت ترین عذاب کی طرف لوٹائے جائیں گے اور اللہ بے خبر نہیں ہے ان کاموں سے جو تم کرتے ہو''۔

تفسیر ان آیات میں بنی اسرائیل کو ان کا وہ عہد یاد دلایا جا رہا ہے جو اللہ تعالیٰ نے ان سے تورات میں لیا تھا کہ وہ ایک دوسرے کو قتل نہیں کریں گے، نہ گھروں سے نکالیں گے اور نہ ہی ایک دوسرے کو غلام بنائیں گے۔ مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے کے یہودیوں نے اس عہد کی پاسداری نہ کی۔ وہ ایک دوسرے کا خون بہاتے رہے، اپنے ہی بھائیوں کو گھروں سے بے دخل کرتے رہے اور عہد کو توڑتے رہے۔

ایسے بدعہد لوگوں پر اللہ کی طرف سے عبرتناک سزا مسلط ہوئی۔ چنانچہ غزوۂ خندق (۵ ہجری) کے بعد ''بنو قریظہ'' کو قتل کیا گیا اور ان کی عورتیں اور بچے غلام بنا لیے گئے۔ ''بنو نضیر'' کو ۴ ہجری میں جلا وطن کیا گیا اور ان پر جزیہ عائد کیا گیا، جیسا کہ سورۂ حشر آیت ۳ میں اس کی تفصیل موجود ہے۔

اس وقت مدینہ میں دو بڑے انصاری قبیلے تھے: ''اوس'' اور ''خزرج'' جو اکثر ایک دوسرے سے برسرِ پیکار رہتے تھے۔ اسی طرح یہودیوں کے تین بڑے قبیلے آباد تھے: (۱) بنو قینقاع (۲) بنو نضیر (۳) بنو قریظہ

یہ بھی باہم دشمنی اور لڑائی میں شریک رہتے تھے۔ ''بنو قریظہ''، ''اوس'' کے حلیف تھے، جبکہ ''بنو قینقاع'' اور ''بنو نضیر''، ''خزرج'' کے ساتھی تھے۔ یہ جنگوں میں اپنے حلیفوں کی مدد کرتے، مخالف یہودیوں کو قتل کرتے، ان کے گھروں کو لوٹتے اور انہیں جلاوطن کر دیتے، حالانکہ تورات کی رو سے یہ سب کچھ حرام تھا۔

پھر جب یہی یہودی قیدی بن جاتے تو ان کے ہم مذہب یہودی انہیں فدیہ دے کر چھڑاتے اور یہ جواز پیش کرتے کہ تورات نے ہمیں یہی حکم دیا ہے۔ ان آیات میں انہی کی اس دورخی روش کو بیان کیا گیا ہے کہ یہ اپنی خواہش کے مطابق کچھ باتوں پر ایمان لاتے ہیں اور کچھ کو پسِ پشت ڈال دیتے ہیں۔

ان کی اس حرکت کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ نے دنیا میں ان پر ذلت اور رسوائی مسلط کر دی، اپنے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ان کے خلاف ابھارا اور وہ قتل، قید اور جلاوطنی کی مصیبتوں میں مبتلا ہوئے۔ اور آخرت میں بھی ان کے لیے سخت ترین عذاب مقدر ہے۔

حافظ ابن کثیرؒ لکھتے ہیں کہ یہودیوں کی اس خباثت کی وجہ سے، کہ انہوں نے تورات کے بعض احکام کو اپنی خواہش کے مطابق بیان کیا اور جنہیں چاہا چھپا لیا، بالخصوص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صفات، آپ کی بعثت اور ہجرت کی خبریں، ان کی تحریف کی بنا پر ان پر کوئی بھروسہ نہیں کیا جا سکتا۔

آیت نمبر (۸۶) اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اشْتَرَوُا الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا بِالْاٰخِرَةِ ۠ فَلَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ وَلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ ﴿۸۶﴾

ترجمہ: ''یہی وہ لوگ ہیں جنہوں نے دنیا کی زندگی خرید لی ہے آخرت کے بدلے، چنانچہ نہ ان سے عذاب ہلکا کیا جائے گا اور نہ ہی ان کی مدد کی جائے گی''۔

تفسیر اللہ تعالیٰ نے توریت کے کچھ احکام پر ان کے عمل نہ کرنے کا ذریعہ یہ بتایا ہے کہ انہوں نے دنیا کی زندگی کو آخرت پر ترجیح دی کہ اگر اپنے ساتھیوں کی حمایت نہ کی تو دنیا کے لوگ کیا کہیں گے۔ اس کہنے کے مقابلے میں آگ کے عذاب کو قبول کر لیا۔

آیت نمبر (۸۷) وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ وَقَفَّيْنَا مِنْۢ بَعْدِهٖ بِالرُّسُلِ ۠ وَاٰتَيْنَا عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنٰتِ وَاَيَّدْنٰهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ ؕ اَفَكُلَّمَا جَآءَكُمْ رَسُوْلٌۢ بِمَا لَا تَهْوٰٓى اَنْفُسُكُمُ اسْتَكْبَرْتُمْ ۚ فَفَرِيْقًا كَذَّبْتُمْ ۠ وَفَرِيْقًا تَقْتُلُوْنَ ﴿۸۷﴾

ترجمہ: ''اور بیشک ہم نے موسیٰ کو کتاب دی اور اس کے بعد پے در پے کئی رسول بھیجے اور ہم نے عیسیٰ ابنِ مریم کو واضح نشانیاں عطا کیں اور روح القدس (جبرائیل) کے ذریعے ان کی مدد کی، تو کیا جب بھی تمہارے پاس کوئی رسول ایسی بات لے کر آیا جو تمہارے نفس کو پسند نہ آئی، تو تم نے تکبر کیا؟ کچھ رسولوں کو جھٹلا دیا اور کچھ کو قتل ہی کر ڈالا''۔

تفسیر

بنی اسرائیل کا جرم

اس مقام پر بنی اسرائیل کے چند سنگین جرائم کا ذکر کیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں تورات عطا فرمائی، مگر انہوں نے اس میں تحریف کی۔ حضرت موسیٰؑ کے بعد اللہ تعالیٰ نے ان میں ایک کے بعد ایک نبی اور رسول بھیجے تاکہ وہ تورات کے احکام کو نافذ کریں، لیکن بنی اسرائیل نے ان کے ساتھ نافرمانی اور سرکشی کا سلوک کیا۔ کچھ کو جھٹلایا اور بہت سے انبیاء کو بے دردی سے قتل کر ڈالا۔ آخر میں جب اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰؑ کو مبعوث فرمایا تاکہ وہ اللہ کے حکم سے لوگوں کو حق کی طرف بلائیں، تو بنی اسرائیل نے انہیں بھی جھٹلا دیا، ان کے خلاف بغاوت کی اور برابر ان کی تعلیمات کا انکار کرتے رہے۔

بیانات و معجزات

یہاں ''بیانات'' سے مراد وہ روشن معجزات ہیں جو اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰؑ کو عطا فرمائے۔ ان کا ذکر سورۂ آلِ عمران اور سورۂ مائدہ میں تفصیل سے موجود ہے۔ اللہ کے حکم سے وہ مردوں کو زندہ کرتے، مٹی سے پرندے کی شکل بنا کر اس میں پھونک مارتے تو وہ زندہ ہو کر اڑنے لگتا۔ وہ پیدائشی نابینا کو بینا کر دیتے اور کوڑھ کے مریض کو شفا بخشتے۔ اس کی صراحت سورۂ آل عمران آیت ۴۹ میں موجود ہے۔

روح القدس

اس آیت میں ''روح القدس'' سے مراد حضرت جبرائیلؑ ہیں۔ انہیں روح القدس کہنے کی وجہ یہ ہے کہ وہ اللہ کے حکم سے پیدا ہوئے، جیسے حضرت عیسیٰؑ کو بھی ''روح'' کہا گیا ہے اور ''قدس'' سے مراد اللہ کی ذات ہے۔ امام ابن کثیرؒ نے بھی اسی رائے کو ترجیح دی ہے، کیونکہ سورۂ مائدہ آیت ۱۱۰ میں ''روح القدس'' اور ''انجیل'' دونوں الگ الگ بیان ہوئے ہیں، لہٰذا روح القدس سے انجیل مراد لینا درست نہیں۔

قرآن میں ایک اور مقام پر بھی حضرت جبرائیلؑ کو ''روح القدس'' کہا گیا ہے۔ اسی طرح نبی اکرم ﷺ نے حضرت حسانؓ کے بارے میں دعا کی: ''اے اللہ! روح القدس کے ذریعے اس کی تائید فرما''۔ نیز ایک اور حدیث

میں آیا ہے کہ جبرائیلؑ تمہارے ساتھ ہیں۔ ان تمام نصوص سے واضح ہوتا ہے کہ ''روح القدس'' سے مراد جبرائیلؑ ہی ہیں۔ (فتح الباری)

یہودیوں کی ضد اور عناد

یہودی حضرت عیسیٰؑ کو جھٹلانے اور ان کے قتل کے درپے ہونے کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ وہ جو احکام سناتے تھے، وہ ان کی خواہشات کے خلاف ہوتے تھے۔ اپنی ضد، ہٹ دھرمی اور دنیا پرستی کے باعث وہ اللہ کے انبیاء کو تسلیم کرنے کے بجائے ان کی مخالفت میں کھڑے ہو گئے۔

❁❁❁

ترجمہ- آیت نمبر ۸۸ سے ۹۶ تک

وَقَالُوْا قُلُوْبُنَا غُلْفٌ ؕ بَلْ لَّعَنَهُمُ اللّٰهُ بِكُفْرِهِمْ فَقَلِيْلًا مَّا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۸۸﴾ وَلَمَّا جَآءَهُمْ كِتٰبٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ ۙ وَكَانُوْا مِنْ قَبْلُ يَسْتَفْتِحُوْنَ عَلَى الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۚ فَلَمَّا جَآءَهُمْ مَّا عَرَفُوْا كَفَرُوْا بِهٖ ۚ فَلَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ ﴿۸۹﴾ بِئْسَمَا اشْتَرَوْا بِهٖۤ اَنْفُسَهُمْ اَنْ يَّكْفُرُوْا بِمَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ بَغْيًا اَنْ يُّنَزِّلَ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ۚ فَبَآءُوْ بِغَضَبٍ عَلٰى غَضَبٍ ؕ وَلِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ﴿۹۰﴾ وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ اٰمِنُوْا بِمَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا نُؤْمِنُ بِمَاۤ اُنْزِلَ عَلَيْنَا وَيَكْفُرُوْنَ بِمَا وَرَآءَهٗ ۚ وَهُوَ الْحَقُّ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَهُمْ ؕ قُلْ فَلِمَ تَقْتُلُوْنَ اَنْۢبِيَآءَ اللّٰهِ مِنْ قَبْلُ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۹۱﴾ وَلَقَدْ جَآءَكُمْ مُّوْسٰى بِالْبَيِّنٰتِ ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ مِنْۢ بَعْدِهٖ وَاَنْتُمْ ظٰلِمُوْنَ ﴿۹۲﴾ وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَكُمْ وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّوْرَ ؕ خُذُوْا مَاۤ اٰتَيْنٰكُمْ بِقُوَّةٍ وَّاسْمَعُوْا ؕ قَالُوْا سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا ۚ وَاُشْرِبُوْا فِيْ قُلُوْبِهِمُ الْعِجْلَ بِكُفْرِهِمْ ؕ قُلْ بِئْسَمَا يَاْمُرُكُمْ بِهٖۤ اِيْمَانُكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۹۳﴾ قُلْ اِنْ كَانَتْ لَكُمُ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ عِنْدَ اللّٰهِ خَالِصَةً مِّنْ دُوْنِ النَّاسِ فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۹۴﴾ وَلَنْ يَّتَمَنَّوْهُ اَبَدًۢا بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالظّٰلِمِيْنَ ﴿۹۵﴾ وَلَتَجِدَنَّهُمْ اَحْرَصَ النَّاسِ عَلٰى حَيٰوةٍ ۛۚ وَمِنَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا ۚ يَوَدُّ اَحَدُهُمْ لَوْ يُعَمَّرُ اَلْفَ سَنَةٍ ۚ وَمَا هُوَ بِمُزَحْزِحِهٖ مِنَ الْعَذَابِ اَنْ يُّعَمَّرَ ؕ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِمَا يَعْمَلُوْنَ ﴿۹۶﴾

ترجمہ:

(۸۸)۔اورانہوں نے کہا: ہمارے دلوں پر پردے ہیں۔نہیں، بلکہ اللہ نے ان پر لعنت کی ہے ان کے کفر کے سبب، سو وہ بہت کم ہی ایمان لاتے ہیں۔(۸۹)۔اور جب ان کے پاس اللہ کی طرف سے ایک کتاب آئی، جو تصدیق کرتی ہے اس (کتاب) کی جو ان کے پاس ہے اور اس سے پہلے وہ کافروں کے خلاف فتح مانگا کرتے تھے، تو جب ان کے پاس وہ آ گیا جسے وہ پہچان بھی چکے تھے، تو اس کا انکار کر دیا۔تو کافروں پر اللہ کی لعنت ہے۔(۹۰)۔بہت بری ہے وہ چیز جس کے بدلے میں انہوں نے اپنی جانیں بیچ دیں، کہ وہ انکار کرتے ہیں اس چیز کا جو اللہ نے نازل کی، صرف اس ضد کی وجہ سے کہ اللہ اپنے فضل سے (وحی) نازل کر رہا ہے اپنے بندوں میں سے جس پر وہ چاہے، تو وہ بار بار اللہ کے غضب کا شکار ہوئے، اور کافروں کے لیے رسوا کن عذاب ہے۔(۹۱)۔اور جب ان سے کہا جاتا ہے: ایمان

لاؤ اس پر جو اللہ نے نازل کیا ہے، تو وہ کہتے ہیں: ہم تو اس پر ایمان لاتے ہیں جو ہم پر نازل کیا گیا اور انکار کرتے ہیں اس کے سوا ہر چیز کا، حالانکہ وہ (قرآن) حق ہے اور اس کی تصدیق کرتا ہے جو ان کے پاس ہے۔ (ان سے) کہہ دو: تو پھر تم اللہ کے نبیوں کو پہلے کیوں قتل کرتے رہے، اگر تم ایمان والے تھے؟ (۹۲)۔ اور یقیناً موسیٰ تمہارے پاس واضح نشانیاں لے کر آئے، پھر بھی تم نے اس کے بعد بچھڑے کو معبود بنا لیا اور تم ہی ہو ظالم۔ (۹۳)۔ اور جب ہم نے تم سے وعدہ لیا اور طور کو تمہارے اوپر بلند کیا (اور کہا): مضبوطی سے پکڑو جو ہم نے تمہیں دیا اور سنو۔ تو انہوں نے کہا: ہم نے سنا اور نافرمانی کی اور ان کے دلوں میں بچھڑے کی محبت بسا دی گئی ان کے کفر کی وجہ سے۔ (اے نبی!) کہہ دو: بری ہے وہ بات جس کا تمہارا ایمان تمہیں حکم دیتا ہے، اگر تم واقعی مومن ہو۔ (۹۴)۔ کہہ دو: اگر تم سمجھتے ہو کہ آخرت کا گھر اللہ کے پاس صرف تمہارے ہی لیے مخصوص ہے، دوسرے لوگوں کو چھوڑ کر، تو موت کی تمنا کرو، اگر تم سچے ہو۔ (۹۵)۔ اور وہ کبھی بھی موت کی تمنا نہیں کریں گے، ان گناہوں کی وجہ سے جو ان کے ہاتھوں نے آگے بھیجے اور اللہ خوب جاننے والا ہے ظالموں کو۔ (۹۶)۔ اور یقیناً آپ پائیں گے کہ یہ (یہود) زندگی کے بارے میں سب لوگوں سے زیادہ حریص ہیں، یہاں تک کہ ان مشرکوں سے بھی زیادہ، ان میں سے ہر ایک چاہتا ہے کہ کاش اسے ہزار سال عمر ملے، حالانکہ اتنی عمر بھی اسے عذاب سے نہیں بچا سکتی۔ اور اللہ دیکھ رہا ہے جو وہ کرتے ہیں۔

تفسیر- آیت نمبر ۸۸ سے ۹۶ تک

آیت نمبر (۸۸) وَقَالُوْا قُلُوْبُنَا غُلْفٌ ؕ بَلْ لَّعَنَهُمُ اللّٰهُ بِكُفْرِهِمْ فَقَلِيْلًا مَّا يُؤْمِنُوْنَ ۝۸۸

ترجمہ: ''اور انہوں نے کہا: ہمارے دلوں پر پردے ہیں۔ نہیں، بلکہ اللہ نے ان پر لعنت کی ہے ان کے کفر کے سبب، سو وہ بہت کم ہی ایمان لاتے ہیں''۔

تفسیر جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مدینہ کے یہودیوں کو اسلام کی دعوت دی تو انہوں نے دل شکنی کے انداز میں وہ باتیں کہیں جن کا ذکر اس آیت میں ہے۔ ان کا مقصد یہ تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دوبارہ انہیں دعوتِ حق نہ دے سکیں۔

حضرت ابن عباس ؓ اس آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ یہودی کہا کرتے تھے: ''ہمارے دلوں پر پردے پڑے ہیں، اس لیے تمہاری بات ہماری سمجھ میں نہیں آتی، لہٰذا ہم پر محنت نہ کرو''۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ایک دوسرا قول یہ بھی منقول ہے کہ یہودیوں کا کہنا تھا: ''ہمارے دل علم و معرفت (یعنی اللہ کی پہچان) سے بھرے ہوئے ہیں، اب ان میں محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے علم کے لیے کوئی گنجائش باقی نہیں''۔

اللہ تعالیٰ نے ان کے اس زعم کو باطل قرار دیتے ہوئے فرمایا کہ یہ بات درست نہیں کہ ان کے دلوں میں حق قبول کرنے کی صلاحیت نہیں رہی، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ کفر وضد کی بنا پر اللہ نے ان پر لعنت فرمائی اور ان کے دلوں پر مہر لگادی، یہی وجہ ہے کہ وہ تورات کے بھی صرف چند احکام پر ایمان رکھتے ہیں۔

اور جب اللہ تعالیٰ کی جانب سے ان کے پاس ایک نئی کتاب (قرآن) آئی، جو ان کی اپنی کتاب کی تصدیق کرتی تھی، تو وہ اس کے منکر بن بیٹھے، حالانکہ اس سے پہلے وہ کفار پر غلبے کی تمنا کیا کرتے تھے۔

آیت نمبر (۸۹) وَلَمَّا جَآءَهُمْ كِتٰبٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ ۙ وَكَانُوْا مِنْ قَبْلُ يَسْتَفْتِحُوْنَ عَلَى الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۚ فَلَمَّا جَآءَهُمْ مَّا عَرَفُوْا كَفَرُوْا بِهٖ ۚ فَلَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ ﴿۸۹﴾

ترجمہ: ''اور جب ان کے پاس اللہ کی طرف سے ایک کتاب آئی، جو تصدیق کرتی ہے اس (کتاب) کی جو ان کے پاس ہے اور اس سے پہلے وہ کافروں کے خلاف فتح مانگا کرتے تھے، تو جب ان کے پاس وہ آ گیا جسے وہ پہچان بھی چکے تھے، تو اس کا انکار کر دیا۔ تو کافروں پر اللہ کی لعنت ہے''۔

تفسیر

یہودیوں کی سرکشی

مدینہ میں یہودی اس غرض سے آ کر آباد ہوئے تھے کہ جب آخری نبی مبعوث ہوں گے تو ہم ان پر ایمان لا کر ان کی معیت میں دنیا پر غلبہ حاصل کریں گے۔ وہ اپنے آپ کو توحید پرست سمجھتے تھے اور اس بات پر فخر کرتے تھے کہ ان کے پاس آسمانی علم موجود ہے۔ ادھر یمن سے ہجرت کر کے 'اوس' اور 'خزرج' نامی دو قبائل بھی مدینہ میں آباد ہو گئے تھے، جو بت پرست مشرک تھے۔ یہودیوں کی ان قبائل سے اکثر جنگیں ہوا کرتی تھیں اور اس موقع پر یہودی فخر سے کہا کرتے تھے کہ ''جب آخری نبی مبعوث ہوں گے تو ہم ان پر ایمان لا کر ان کے ساتھ تمہارے خلاف جہاد کریں گے اور اس وقت تمہیں قومِ عاد کی طرح نیست و نابود کر دیں گے''۔

یہودی آخری نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صفات سے بخوبی واقف تھے، کیونکہ ان کا ذکر ان کی اپنی کتاب تورات میں موجود تھا۔ جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت ہو گئی اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مدینہ منورہ تشریف لائے تو یہودیوں نے ان نشانیوں سے آپ کو پہچان بھی لیا۔ انہوں نے آپ کے معجزات بھی دیکھے اور اس بات پر یقین کر لیا کہ آپ ہی وہ آخری نبی ہیں جن کا وہ مدتوں سے انتظار کرتے چلے آ رہے تھے۔ لیکن جب ایمان لانے کا وقت آیا تو ضد اور حسد کی بنا پر انکار کر گئے۔

اوس اور خزرج کے بعض افراد نے انہیں سمجھایا کہ ''اے یہود! اللہ سے ڈرو اور اسلام قبول کرلو۔ یہی وہ نبی ہیں جن کا تم ذکر کیا کرتے تھے۔ اب جبکہ وہ آ گئے ہیں تو ان پر ایمان لے آؤ''۔ مگر انہوں نے کہا: ''یہ وہ نبی نہیں جن کے ہم منتظر تھے۔ وہ تو ہم ہی میں سے ہوگا، عربوں میں سے نہیں''۔ یوں جانتے بوجھتے ہوئے انکار کر گئے۔ اصل میں انہیں حسد اس بات کا تھا کہ نبوت بنی اسرائیل کے بجائے عربوں میں کیوں ظاہر ہوئی۔ اس آیت میں انہی کے اس انکار اور روگردانی کا ذکر ہے، اور آخر میں بتایا گیا ہے کہ اللہ کی لعنت ہے ان کافروں پر جو سچائی کو جاننے کے باوجود اس کے ماننے سے انکار کر گئے۔ (تفسیر ابن کثیر)

آخری نبی کا انتظار

حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں کہ یہودی عرب میں ذلت کی زندگی گزار رہے تھے۔ اس لیے وہ اپنے تحفظ اور طاقت کے لیے عرب کے کچھ قبیلوں کے ساتھ مل جل کر رہنے کو ترجیح دیتے تھے۔ جب 'اوس' اور 'خزرج' ان پر ظلم کرتے تو یہ کہا کرتے: ''جلد ہی آخری نبی مبعوث ہونے والے ہیں۔ ہم ان پر ایمان لا کر تمہارے خلاف لڑیں گے اور تم پر غالب آ جائیں گے''۔ لیکن جب اللہ تعالیٰ نے اپنے آخری نبی کو بنی اسماعیل میں مبعوث کیا تو یہودیوں نے صرف اس حسد کی وجہ سے کہ نبی بنی اسرائیل میں کیوں نہ آیا، انکار کر دیا۔

حضرت عبداللہ بن سلامؓ (جو ایک بڑے یہودی عالم تھے اور بعد میں اسلام لے آئے) نے اپنی قوم سے کہا: ''اے یہود! اللہ سے ڈرو۔ اس اللہ کی قسم جس کے سوا کوئی معبود نہیں، تمہیں خوب معلوم ہے کہ محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں اور دینِ حق لے کر آئے ہیں''۔ (بخاری: ۳۳۲۹ اور ۴۴۸۰)

بیشتر یہودیوں نے حسد کی وجہ سے انکار کیا، مگر کچھ اہلِ علم اور دیانت دار یہودیوں نے اپنے صحیفوں میں پائی جانے والی پیشین گوئیوں کی روشنی میں حضرت محمد ﷺ پر ایمان لے آئے۔

حضرت زید بن سعنہ کا اسلام

ان ہی میں ایک مالدار اور جید یہودی عالم ''حضرت زید بن سعنہ'' تھے، جن کا ذکر احادیث میں ملتا ہے۔ حضرت عبداللہ بن سلامؓ بیان کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے جب زید بن سعنہ کو ہدایت دینے کا ارادہ فرمایا تو یہ واقعہ پیش آیا۔

زید بن سعنہ کہتے ہیں: ''میں نے نبوت کی تمام علامتیں حضرت محمد ﷺ میں دیکھ لیں، سوائے دو کے۔ پہلی یہ کہ ان کی نرم مزاجی سخت مزاجی پر غالب ہوگی۔ دوسری یہ کہ جتنا ان کے ساتھ برا سلوک کیا جائے گا، اتنا ہی ان کا حلم اور بردباری بڑھتی جائے گی''۔ یہ دونوں باتیں پرکھنے کے لیے زید نے سوچا کہ رسول اللہ ﷺ سے قریب ہو کر ان کا

امتحان لیا جائے۔ اتفاق سے ایک موقع پر ایک بدوی عرب نے اپنے قبیلے کے لیے اسلام کی طرف مائل کرنے کی غرض سے آپ ﷺ سے مالی مدد طلب کی۔ لیکن اس وقت رسول اللہ ﷺ کے پاس کچھ موجود نہ تھا۔ چنانچہ زید بن سعنہ نے پیشکش کی: ''آپ مجھ سے سونا قرض لے لیجئے اور مقررہ وقت پر اس کے بدلے کھجور ادا کر دیجیے گا''۔

آپ ﷺ نے یہ بات مان لی اور قرض لے کر وہ رقم اس بدوی کو دے دی۔ جب ادائیگی کی مدت میں کچھ دن باقی تھے تو زید اپنے قرض کی یاد دہانی کے لیے آپ ﷺ کے پاس آئے۔ اس وقت رسول اللہ ﷺ نمازِ جنازہ ادا کر کے دوپہر کی دھوپ میں ایک دیوار کے سائے میں تشریف فرما تھے.....

قرض کی ادائیگی کا مطالبہ

حضرت زید بن سعنہ منصوبے کے مطابق سیدھے حضرت محمد ﷺ کے پاس پہنچے۔ انہوں نے آپ ﷺ کا دامن پکڑا اور سختی سے قرض کی ادائیگی کا مطالبہ کیا اور کہا: ''میرا قرض کیوں ادا نہیں کرتے، اے محمد! میں عبدالمطلب کی اولاد کو بخوبی جانتا ہوں، وہ ہمیشہ ایسے ہی ہوتے ہیں''۔

یہ سن کر صحابہ میں سے کئی افراد غصے سے پھٹ پڑے۔ حضرت عمرؓ برداشت نہ کر سکے اور زید بن سعنہ کو ڈانٹتے ہوئے کہا: ''اے خدا کے دشمن! تو رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں کیا بکواس کر رہا ہے؟ میں سن رہا ہوں اور اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں کہ تم ان کے ساتھ کیسی برائی کر رہے ہو۔ اس ذات کی قسم جس نے آپ ﷺ کو دینِ حق کے ساتھ بھیجا، اگر مجھے آپ ﷺ کی ناراضی کا ڈر نہ ہوتا تو میں ابھی اپنی تلوار سے تیرا سر قلم کر دیتا!

ادھر حضرت عمرؓ یہ کہہ رہے تھے اور ادھر رسول اللہ ﷺ بڑے سکون کے ساتھ مسکرا رہے تھے۔ پھر آپ ﷺ نے حضرت عمرؓ سے فرمایا: ''تم اسے اور مجھے اس بات کے علاوہ کچھ اور سمجھاتے تو بہتر ہوتا۔ مجھ سے یہ کہتے کہ اس کا قرض بغیر کسی تاخیر کے ادا کر دیں اور اس سے کہتے کہ اچھے انداز میں مطالبہ کرو''۔

پھر آپ ﷺ نے فرمایا: ''اے عمر! جاؤ اور اس کا قرض ادا کرنے کا انتظام کرو اور جو تم نے سخت آواز میں کہا، اس کے بدلے میں اسے بیس صاع کھجوریں دو، بلکہ اور زیادہ دے دو''۔

زید بن سعنہ کا اسلام قبول کرنا

حقیقت میں حضرت زید بن سعنہ کو نہ قرض لینا تھا اور نہ بیس صاع سے زیادہ کھجوروں کی ضرورت تھی۔ نہ ہی حضرت محمد ﷺ کی ڈانٹ نے ان کے دل پر اثر ڈالا۔ بلکہ وہ ایک عجیب خوشی محسوس کرنے لگے، کیونکہ وہ جس چیز کو آزمانے آئے تھے اور جس کا ذکر ان کی کتابوں میں پیشین گوئی کے طور پر موجود تھا، اسے آزما چکے تھے۔ اب انہیں

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اللہ کا نبی ماننے اور اسلام قبول کرنے میں کوئی ہچکچاہٹ نہ رہی۔

اسلام کی قبولیت اور صدقہ

اسی وقت انہوں نے حضرت عمرؓ کو گواہ بنا کر اسلام قبول کرنے کا اعلان کیا اور اپنا آدھا مال مسلمانوں کے لیے صدقہ کر دیا۔ جب وہ اپنی قوم کے پاس واپس آئے تو ان کے اسلام قبول کرنے کی خبر ان کے پہنچنے سے پہلے ہی وہاں پہنچ چکی تھی۔ دوسرے یہودی علماء نے طنزاً پوچھا: ''تم تو قرض وصول کرنے گئے تھے، محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس، یہ کیا ہوا؟''۔ زید نے اطمینان سے جواب دیا: ''میں قرض لینے نہیں گیا تھا، یہ تو پہلے سے میرے ذمے تھا''۔ بعد میں وہ تمام جنگوں میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ رہے اور جس سال غزوۂ تبوک ہوا، اسی سال ان کی وفات ہوگئی۔

اللہ کے کتاب کی تصدیق

اللہ تعالیٰ قرآن مجید کی صفت بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں: ''مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ ''یعنی قرآن وہ کتاب ہے جو ان کی کتاب (توریت) کی تصدیق کرتی ہے۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ اگر یہ نبی کسی ایسے نبی کے خلاف ہوتا جو ان کی کتاب پر مبنی ہو یا اس کتاب کے احکام کو منسوخ کرتا جو اللہ نے ان کے نبی پر نازل کی تھی، تو اس کا انکار جائز ہوتا۔ لیکن حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تمام نبیوں پر ایمان لانے اور اللہ کی تمام کتابوں کو ماننے کی دعوت دیتے ہیں۔ لہٰذا اس حسد کی وجہ سے کہ نبی عرب میں پیدا ہوئے، انکار کرنا نہ صرف جہالت بلکہ اللہ تعالیٰ پر اعتراض کرنے کے مترادف ہے۔

آیت نمبر (۹۰) بِئْسَمَا اشْتَرَوْا بِهٖٓ اَنْفُسَهُمْ اَنْ يَّكْفُرُوْا بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ بَغْيًا اَنْ يُّنَزِّلَ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ۚ فَبَآءُوْ بِغَضَبٍ عَلٰى غَضَبٍ ۭ وَلِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ۝۹۰

ترجمہ: ''بہت بری ہے وہ چیز جس کے بدلے میں انہوں نے اپنی جانیں بیچ دیں، کہ وہ انکار کرتے ہیں اس چیز کا جو اللہ نے نازل کی، صرف اس ضد کی وجہ سے کہ اللہ اپنے فضل سے (وحی) نازل کر رہا ہے اپنے بندوں میں سے جس پر وہ چاہے، تو وہ بار بار اللہ کے غضب کا شکار ہوئے، اور کافروں کے لیے رسوا کن عذاب ہے''۔

تفسیر

یہودیوں کی سرکشی اور دوزخ کا حقدار ہونا

اس آیت میں واضح کیا گیا ہے کہ انہوں نے اپنی جانوں کو دوزخ کا حقدار بنا لیا۔ اللہ تعالیٰ جس بندے پر

چاہے نبوت اور رسالت عطا فرمائے اور جس پر چاہے اپنی کتاب نازل کرے، یہ اس کا مکمل حق ہے۔ کسی کو یہ اختیار نہیں کہ اللہ تعالیٰ پر اعتراض کرے کہ فلانے کو نبی بنایا اور فلاں کو کیوں نہیں بنایا۔

یہودیوں نے حضرت عیسیٰؑ کی نبوت کا انکار کیا اور اعتراض کر کے کفر اختیار کیا۔ پھر اللہ کے آخری نبی حضرت محمد ﷺ اور قرآن کی رسالت کو بھی جھٹلا کر اپنے کفر میں اضافہ کیا، جس کی وجہ سے وہ اللہ کے غضب کے حقدار بن گئے اور آخرت میں ذلت وعذاب میں گرفتار ہوں گے۔

اگر وہ آخری نبی پر ایمان لے آتے تو اپنی جانوں کو دوزخ کے عذاب سے بچا سکتے تھے، لیکن انہوں نے انکار کیا۔ انکار کرنے کے نتیجے میں انہوں نے ہمیشہ کے لیے اپنی ہلاکت کا بیج بو دیا اور دوزخ کے عذاب کے حقدار بن گئے۔

یہ ایک نہایت سنگین بات تھی کہ حسد اور نسلی تعصب کی بنیاد پر، باوجود اس کے کہ وہ حضرت محمد ﷺ کی نبوت کے ثبوت جانتے تھے، ایمان نہ لائے۔ یوں انہوں نے اللہ کے غضب کے ایک بعد دوسرے غضب کے مستحق بن کر اپنی جانوں کو ہلاکت میں ڈال دیا۔

آیت نمبر (۹۱) وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ اٰمِنُوْا بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا نُؤْمِنُ بِمَآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا وَيَكْفُرُوْنَ بِمَا وَرَآءَهٗ ۚ وَهُوَ الْحَقُّ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَهُمْ ۭ قُلْ فَلِمَ تَقْتُلُوْنَ اَنْۢبِيَآءَ اللّٰهِ مِنْ قَبْلُ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝۹۱

ترجمہ: ''اور جب ان سے کہا جاتا ہے: ایمان لاؤ اس پر جو اللہ نے نازل کیا ہے، تو وہ کہتے ہیں: ہم تو اس پر ایمان لاتے ہیں جو ہم پر نازل کیا گیا اور انکار کرتے ہیں اس کے سوا ہر چیز کا، حالانکہ وہ (قرآن) حق ہے اور اس کی تصدیق کرتا ہے جو ان کے پاس ہے۔ (ان سے) کہہ دو: تو پھر تم اللہ کے نبیوں کو پہلے کیوں قتل کرتے رہے، اگر تم ایمان والے تھے؟''۔

تفسیر یہودیوں کا جواب اور اللہ تعالیٰ کی وضاحت

اس آیت میں یہودیوں کی وہ دلیل ذکر کی گئی ہے کہ ''ہم صرف توریت پر ایمان لاتے ہیں، اس کے سوا کسی کتاب کو نہیں مانتے''۔ اللہ تعالیٰ نے اس کے جواب میں فرمایا: ''وَهُوَ الْحَقُّ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَهُمْ'' یعنی جو کتاب ہم نے حضرت محمد ﷺ پر نازل کی ہے، وہ ان کی کتاب (توریت) کی تصدیق کرنے والی ہے جس پر وہ ایمان رکھنے کے دعویدار ہیں۔

قرآن کو نہ ماننا دراصل توریت کو نہ ماننے کے مترادف ہے۔ توریت میں کہیں بھی یہ نہیں لکھا کہ ''بنی اسرائیل

کے علاوہ کسی قوم میں نبی آئے تو اسے قبول نہ کرو اور اللہ کی دوسری کتاب پر ایمان نہ لاؤ''۔ یہودیوں کا یہ انکار صرف حسد اور تعصب کی وجہ سے تھا۔ توریت میں آخری نبی کے آنے کی خبر موجود تھی اور جب حضرت محمد ﷺ کی بعثت ہوئی تو ان کی نشانیوں اور صفات کے ذریعے یہودیوں نے پہچان لیا کہ یہ وہ آخری نبی ہیں۔

اس کے باوجود قرآن اور حضرت محمد ﷺ کو نہ ماننا دراصل توریت پر ایمان نہ لانے کے مترادف ہے۔ یہودی دعویٰ کرتے تھے کہ ان کا ایمان صرف توریت پر ہے، حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ وہ توریت پر بھی ایمان نہیں رکھتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے اس دعوے کو تین بنیادی دلائل کے ذریعے رد فرمایا:

۱۔ دوسری کتاب کا انکار: جب اللہ کی طرف سے نئی کتاب حق ثابت ہوگئی اور اس کا نزول قطعی طور پر ثابت ہو گیا، تو اس کا انکار کرنا ایمان کے خاتمے کے مترادف ہے۔

۲۔ توریت میں آخری نبی کا ذکر: جب توریت میں آخری نبی ﷺ اور قرآن کی خبر موجود ہے، تو قرآن اور آخری نبی کا انکار دراصل توریت کے انکار کے مترادف ہے۔ ایسے میں یہودیوں کا توریت پر ایمان کا دعویٰ سراسر جھوٹا ہے۔

۳۔ نبیوں کا قتل: تمام آسمانی کتابوں کے مطابق نبیوں کا قتل کرنا کفر ہے۔ اگر آپ اپنے باپ دادا کے اس عمل سے راضی ہیں اور ان قاتلوں کو اپنا رہنما مانتے ہیں، تو یہ بھی توریت کے ساتھ تمہارا انکار ثابت کرتا ہے۔

ان تین دلیلوں کے ذریعے اللہ تعالیٰ نے واضح فرما دیا کہ یہودیوں کا توریت پر ایمان کا دعویٰ بالکل بے بنیاد ہے اور وہ قرآن اور آخری نبی ﷺ کو نہ مان کر کفر میں گرفتار ہیں۔

آگلی آیت میں ان کے جھوٹے ایمان کا چوتھا ثبوت بھی بیان کیا گیا ہے۔

آیت نمبر (۹۲) وَلَقَدْ جَآءَكُمْ مُّوْسٰى بِالْبَيِّنٰتِ ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ مِنْۢ بَعْدِهٖ وَاَنْتُمْ ظٰلِمُوْنَ ﴿۹۲﴾

ترجمہ: ''اور یقیناً موسیٰ تمہارے پاس واضح نشانیاں لے کر آئے، پھر بھی تم نے اس کے بعد بچھڑے کو معبود بنالیا اور تم ہی ہو ظالم''۔

تفسیر اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ تم تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں ہی کفر کر چکے تھے، حالانکہ حضرت موسیٰ تمہارے پاس واضح دلائل لے کر آئے تھے جو یہ ثابت کرتے تھے کہ عبادت اور پرستش صرف اللہ کے لیے مخصوص ہے، اور کوئی دوسرا معبود اس کے لائق نہیں۔ پھر بھی تم، یعنی تمہاری یہودی قوم نے، حضرت موسیٰؑ کے طور پر کوہِ طور پر جانے کے بعد ایک بچھڑے کو اپنا معبود بنالیا۔ یہ معاملہ صرف اسی زمانے کا نہیں، بلکہ مدینہ کے یہودی بھی اس سے

مختلف نہیں تھے، جو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے میں موجود تھے اور جن سے یہ آیات خطاب کر رہی ہیں۔ ان کے باپ دادا بھی اسی روش کے پیروکار تھے، اس لیے یہ بھی اسی گناہ میں شامل ہیں۔

اسی تناظر میں اللہ تعالیٰ نے اشارہ کیا ہے کہ جن کے باپ دادا نے حضرت موسیٰؑ کو جھٹلایا اور کفر کیا، ان کے بعد آنے والے لوگوں کے لیے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا انکار کرنا کوئی حیرت کی بات نہیں۔ اس کے بعد یہود کے ایمان لانے کے دعوے کی بے بنیاد ہونے کی واضح دلیلیں بیان کی گئی ہیں۔ (ابن کثیر)

آیت نمبر (۹۳) وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَكُمْ وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّوْرَ ؕ خُذُوْا مَآ اٰتَيْنٰكُمْ بِقُوَّةٍ وَّاسْمَعُوْا ؕ قَالُوْا سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا ۪ وَاُشْرِبُوْا فِىْ قُلُوْبِهِمُ الْعِجْلَ بِكُفْرِهِمْ ؕ قُلْ بِئْسَمَا يَاْمُرُكُمْ بِهٖٓ اِيْمَانُكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۹۳﴾

ترجمہ: ''اور جب ہم نے تم سے وعدہ لیا اور طور کو تمہارے اوپر بلند کیا (اور کہا): مضبوطی سے پکڑو جو ہم نے تمہیں دیا اور سنو۔ تو انہوں نے کہا: ہم نے سنا اور نافرمانی کی اور ان کے دلوں میں بچھڑے کی محبت بسا دی گئی ان کے کفر کی وجہ سے۔ (اے نبی!) کہہ دو: بری ہے وہ بات جس کا تمہارا ایمان تمہیں حکم دیتا ہے، اگر تم واقعی مومن ہو''۔

تفسیر

یہودیوں سے عہد

اس سورہ کے آٹھویں رکوع میں پہلے ہی یہودیوں سے مضبوط عہد لینے کا ذکر آ چکا ہے، جب انہیں کوہِ طور پر اٹھایا گیا اور توریت کو مضبوطی سے پکڑ کر اس پر عمل کرنے کا وعدہ لیا گیا۔ یہاں دوبارہ اس کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور ساتھ ہی یہ واضح کیا گیا ہے کہ جب انہیں حکم دیا گیا کہ توریت کو مضبوطی سے تھامو اور اس کے احکام پر عمل کرو، تو انہوں نے کہا کہ ہم نے سن لیا، لیکن ہم عمل نہیں کریں گے۔

حکم تھا کہ دل کے کانوں سے سنو، یعنی قبول کرنے کے لیے سنو، مگر انہوں نے اپنے اوپر پہاڑ گرنے کے ڈر سے عارضی طور پر ہاں کہہ دی اور دل سے بھی اقرار کر لیا، جیسا کہ مفسرین نے بیان کیا ہے۔ لیکن بعد میں اپنی بات سے پھر گئے، نافرمانی کرنے لگے اور کہنے لگے: ''ہم نے سنا، لیکن عمل کرنا ہمارے بس کا کام نہیں''۔

بچھڑے کی محبت

پھر فرمایا کہ ان کی بچھڑے کی عبادت کی وجہ سے ان کے کفر کا یہ عالم ہو گیا کہ بچھڑے کی محبت ان کے دلوں

میں جڑ پکڑ چکی تھی۔

اسی طرح فرمایا کہ اگر تم حقیقت میں مومن ہو، جیسا کہ تم دعویٰ کرتے ہو، تو تمہارے ایمان کو یہ سکھانا چاہیے کہ برے کاموں سے بچو، نہ کہ تمہیں کفر اور شرک کی طرف مائل کرے۔ یہ کیسا ایمان ہے جو توحید کی تعلیم نہیں دیتا اور اللہ تعالیٰ کی نافرمانی اور آخری نبی حضرت محمد ﷺ کو جھٹلانے کی طرف ابھارتا ہے، جن کا نبی ہونا واضح ہو چکا ہے۔

یہود کا ایک غلط عقیدہ یہ بھی تھا کہ جنت صرف ہمارے لیے مخصوص ہے اور دیگر مذاہب یا قوموں کے لوگوں کے لیے نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اس غلط من گھڑت عقیدے کو رد فرمایا، جس کا تفصیل سے ذکر اگلی آیات میں موجود ہے۔

آیت نمبر (۹۴) قُلْ اِنْ كَانَتْ لَكُمُ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ عِنْدَ اللّٰهِ خَالِصَةً مِّنْ دُوْنِ النَّاسِ فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۹۴﴾

ترجمہ: ''کہہ دو! اگر تم سمجھتے ہو کہ آخرت کا گھر اللہ کے پاس صرف تمہارے ہی لیے مخصوص ہے، دوسرے لوگوں کو چھوڑ کر، تو موت کی تمنا کرو، اگر تم سچے ہو''۔

تفسیر اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ''قُلْ اِنْ كَانَتْ لَكُمُ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ...'' ابن جریرؒ نے ابوالعالیہ سے روایت کیا ہے کہ یہودی یہ دعویٰ کرتے تھے کہ جنت صرف یہودیوں کے لیے مخصوص ہے۔ اسی دعوے کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی، جس کا مفہوم یہ ہے کہ اگر واقعی جنت صرف تمہارے لیے ہے تو موت کی تمنا کرو اور دکھاؤ کہ تم سچے ہو۔

مَوت کی تمنا

یہود دعویٰ کرتے تھے کہ جنت میں صرف وہی داخل ہوں گے، دوسرے لوگ نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان سے فرمایا کہ اگر تم سچے ہو تو موت کی تمنا کرو، تاکہ جلد از جلد دنیا کی پریشانیوں سے نجات پا کر جنت کے لائق بن جاؤ۔ ابن جریرؒ نے بھی یہی تفسیر بیان کی ہے۔

حافظ ابن کثیرؒ لکھتے ہیں کہ اس آیت میں دعوت 'مباہلہ' ہے اور ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اے میرے رسول ﷺ! یہودیوں سے کہو کہ اگر تم اپنے دعوے میں سچے ہو تو دعا کرو کہ اللہ تعالیٰ جھوٹے گروہوں کو ہلاک کر دے۔ لیکن جب رسول اللہ ﷺ نے انہیں اس دعا کے لیے کہا تو انہوں نے انکار کر دیا، کیونکہ وہ اپنے گناہوں سے بخوبی واقف تھے، اور قرآن مجید نے خود اس کی خبر دی کہ وہ کبھی ایسا نہیں کریں گے۔

امام بخاریؒ نے ابن عباسؓ سے روایت کیا ہے کہ اگر یہودی اس دعوت 'مباہلہ' کے بعد واقعی موت کی تمنا کرتے، تو سب کے سب مر جاتے اور جہنم میں اپنے ٹھکانے کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیتے۔

آیت نمبر (۹۵) وَلَنْ يَّتَمَنَّوْهُ اَبَدًۢا بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالظّٰلِمِيْنَ ۝۹۵

ترجمہ: ''اور وہ کبھی بھی موت کی تمنا نہیں کریں گے، ان گناہوں کی وجہ سے جو ان کے ہاتھوں نے آگے بھیجے اور اللہ خوب جاننے والا ہے ظالموں کو''۔

تفسیر اس میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ یہ موت کی تمنا کیسے کر سکتے ہیں، یہ تو لمبی عمر کے آخری درجے کی خواہش رکھتے ہیں کیونکہ موت کے بعد انہیں اپنے برے انجام کا پتہ ہے۔ یہ تو چاہتے ہیں کہ جتنے دن ہو سکے موت ان سے ٹلتی رہے۔

آیت نمبر (۹۶) وَلَتَجِدَنَّهُمْ اَحْرَصَ النَّاسِ عَلٰي حَيٰوةٍ ۚ وَمِنَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا ۚ يَوَدُّ اَحَدُهُمْ لَوْ يُعَمَّرُ اَلْفَ سَنَةٍ ۚ وَمَا هُوَ بِمُزَحْزِحِهٖ مِنَ الْعَذَابِ اَنْ يُّعَمَّرَ ۭ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِمَا يَعْمَلُوْنَ ۝۹۶

ترجمہ: ''اور یقیناً آپ پائیں گے کہ یہ (یہود) زندگی کے بارے میں سب لوگوں سے زیادہ حریص ہیں، یہاں تک کہ ان مشرکوں سے بھی زیادہ، ان میں سے ہر ایک چاہتا ہے کہ کاش اسے ہزار سال عمر ملے، حالانکہ اتنی عمر بھی اسے عذاب سے نہیں بچا سکتی۔ اور اللہ دیکھ رہا ہے جو وہ کرتے ہیں''۔

تفسیر یہ لوگ دوسرے مشرکوں سے بھی زیادہ دنیا کی محبت اور زندگی کی ہوس میں مبتلا ہیں، حالانکہ وہ کسی کتاب کی تصدیق نہیں کرتے۔ ان کی آرزو ہے کہ کاش وہ ہزار سال زندہ رہ سکتے۔ لیکن حتیٰ کہ اگر انہیں ہزار سال کی زندگی بھی مل جائے، تو یہ عذاب سے نجات کا سبب نہیں بن سکتی۔ موت ایک ناگزیر حقیقت ہے اور اس کے بعد ہر انسان کو اس کے اعمال کے مطابق جزا یا سزا ملتی ہے۔ جیسے ابلیس (شیطان) کو ہزاروں سال کی زندگی عطا کی گئی، لیکن انجام اس کا دوزخ ہی تھا۔

احادیث میں موت کو یاد رکھنے کی فضیلت بیان کی گئی ہے اور یہ بھی واضح کیا گیا ہے کہ موت کی بے صبری سے خواہش کرنا یا اس کے لیے دعا کرنا جائز نہیں۔ زندگی اللہ تعالیٰ کی ایک عظیم نعمت ہے اور آخرت میں کامیابی کے لیے اس کا صحیح استعمال ضروری ہے۔ مومن کے لیے طویل عمر نیکی کی علامت ہے، کیونکہ زیادہ وقت کے ساتھ زیادہ نیک اعمال کرنے کا موقع ملتا ہے، جبکہ موت آتے ہی اعمال کا سلسلہ ختم ہو جاتا ہے۔ لہٰذا، عمر کی برکت نیکی میں اضافے کا سبب بن سکتی ہے، لیکن دنیا کی تکالیف سے گھبرا کر موت کی طلب کرنا اسلام میں ناجائز ہے۔

حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ جب کسی کو کوئی مصیبت پہنچے تو وہ مرنے کی خواہش نہ کرے۔ اگر مرنے کی

دعا کرنا ضروری ہو، تو یوں دعا کرے: ''اے اللہ! مجھے زندہ رکھ اس وقت تک جب تک زندگی میرے لیے بہتر ہو، اور موت عطا فرما جب میرا مرنا میرے لیے بہتر ہو''۔ (بخاری:۶۳۵۱)

اللہ تعالیٰ سے ملاقات کی تمنا بھی مومن کے دل کی فطرت ہے۔ حضرت عبادہ بن صامتؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جو شخص اللہ تعالیٰ سے ملاقات کو پسند کرتا ہے، اللہ تعالیٰ بھی اس سے ملاقات کو پسند کرتا ہے، اور جو اس ملاقات کو برا سمجھے، اللہ تعالیٰ بھی اسے پسند نہیں کرتا''۔

جب حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا یا دیگر صحابیات نے عرض کیا کہ ہم موت کو برا سمجھتے ہیں، تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''نہیں، حقیقت یہ ہے کہ مومن کے لیے جب موت آتی ہے، اسے خوشخبری دی جاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ اس سے راضی ہے۔ اس وقت مومن کے نزدیک اللہ کی رضا سے بہتر کوئی چیز نہیں ہوتی اور وہ بے چینی کے ساتھ اللہ تعالیٰ سے ملاقات کا خواہاں ہو جاتا ہے۔ جبکہ کافر کے لیے موت کا وقت سخت اور خوفناک ہوتا ہے، اور وہ اللہ تعالیٰ سے ملاقات کو ناپسند کرتا ہے''۔

جب حضرت محمد ﷺ اس دنیا سے رخصت ہونے لگے تو انتقال کے قریب فرمایا: ''اَللّٰهُمَّ اَلْحِقْنِيْ بِالرَّفِيقِ الْاَعْلٰى'' یعنی: ''اے اللہ! مجھے اعلیٰ مقام والے اصحاب کے ساتھ ملا دے اور اپنے دیدار سے شرف بخشنے والوں میں شامل فرما''۔

مگر جنہیں آخرت پر یقین نہیں ہوتا، وہ دنیاوی زندگی کی حفاظت اور مال و دولت کے حصول کے لیے اپنی جان کی پرواہ نہیں کرتے۔ اور جب دنیاوی مصائب سے تنگ آ جاتے ہیں تو بے صبری کے ساتھ موت کی تمنا کرنے لگتے ہیں تاکہ مشکلات سے نجات پائیں۔ ایسے حالات میں موت کی خواہش کرنا اسلام میں ممنوع ہے۔ (بخاری:۶۳۵۱)

❁❁❁

ترجمہ- آیت نمبر ۹۷ سے ۱۰۳ تک

قُلْ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّجِبْرِيْلَ فَاِنَّهٗ نَزَّلَهٗ عَلٰى قَلْبِكَ بِاِذْنِ اللّٰهِ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ وَهُدًى وَّبُشْرٰى لِلْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۹۷﴾ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّلّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَرُسُلِهٖ وَجِبْرِيْلَ وَمِيْكٰىلَ فَاِنَّ اللّٰهَ عَدُوٌّ لِّلْكٰفِرِيْنَ ﴿۹۸﴾ وَلَقَدْ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ اٰيٰتٍۢ بَيِّنٰتٍ ۚ وَمَا يَكْفُرُ بِهَآ اِلَّا الْفٰسِقُوْنَ ﴿۹۹﴾ اَوَكُلَّمَا عٰهَدُوْا عَهْدًا نَّبَذَهٗ فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ ۭ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۰۰﴾ وَلَمَّا جَآءَهُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ نَبَذَ فَرِيْقٌ مِّنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ ۙ كِتٰبَ اللّٰهِ وَرَآءَ ظُهُوْرِهِمْ كَاَنَّهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۰۱﴾ وَاتَّبَعُوْا مَا تَتْلُوا الشَّيٰطِيْنُ عَلٰي مُلْكِ سُلَيْمٰنَ ۚ وَمَا كَفَرَ سُلَيْمٰنُ وَلٰكِنَّ الشَّيٰطِيْنَ كَفَرُوْا يُعَلِّمُوْنَ النَّاسَ السِّحْرَ ۚ وَمَآ اُنْزِلَ عَلَي الْمَلَكَيْنِ بِبَابِلَ هَارُوْتَ وَمَارُوْتَ ۭ وَمَا يُعَلِّمٰنِ مِنْ اَحَدٍ حَتّٰى يَقُوْلَآ اِنَّمَا نَحْنُ فِتْنَةٌ فَلَا تَكْفُرْ ۭ فَيَتَعَلَّمُوْنَ مِنْهُمَا مَا يُفَرِّقُوْنَ بِهٖ بَيْنَ الْمَرْءِ وَزَوْجِهٖ ۭ وَمَا هُمْ بِضَاۗرِّيْنَ بِهٖ مِنْ اَحَدٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ۭ وَيَتَعَلَّمُوْنَ مَا يَضُرُّهُمْ وَلَا يَنْفَعُهُمْ ۭ وَلَقَدْ عَلِمُوْا لَمَنِ اشْتَرٰىهُ مَا لَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ ۣ وَلَبِئْسَ مَا شَرَوْا بِهٖٓ اَنْفُسَهُمْ ۭ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۰۲﴾ وَلَوْ اَنَّهُمْ اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَمَثُوْبَةٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ خَيْرٌ ۭ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۰۳﴾

ترجمہ:

(۹۷)۔ کہہ دیجئے: جو جبرئیل کا دشمن ہے (تو وہ سن لے) کہ جبرئیل ہی نے تو یہ قرآن آپ کے دل پر اللہ کے حکم سے نازل کیا ہے، ان کتابوں کی تصدیق کرتا ہوا جو اس سے پہلے ہیں اور ہدایت وخوشخبری ہے ایمان والوں کے لیے۔(۹۸)۔ جو کوئی اللہ کا اور اس کے فرشتوں کا اور اس کے رسولوں کا اور جبرئیل اور میکائیل کا دشمن ہے، تو بیشک اللہ بھی کافروں کا دشمن ہے۔(۹۹)۔ اور ہم نے آپ کی طرف واضح آیات نازل کی ہیں اور ان کا انکار صرف نافرمان لوگ ہی کرتے ہیں۔(۱۰۰)۔ کیا یہ ہمیشہ یہی کرتے رہے ہیں؟ کہ جب کبھی انہوں نے کوئی عہد کیا، تو ان میں سے ایک گروہ نے اسے پھینک دیا؟ بلکہ ان میں سے اکثر ایمان ہی نہیں لاتے۔(۱۰۱)۔ جب ان کے پاس اللہ کی طرف سے ایسا رسول آیا جو ان (آسمانی) کتابوں کی تصدیق کرنے والا تھا جو ان کے پاس تھیں، تو اہلِ کتاب میں سے ایک گروہ نے اللہ کی کتاب کو ایسے پیٹھ پیچھے پھینک دیا گویا وہ اسے جانتے ہی نہ تھے۔(۱۰۲)۔ اور انہوں نے اس چیز کی پیروی شروع کر دی جو سلیمانؑ کی بادشاہی کے دور میں شیاطین پڑھا کرتے تھے۔ حالانکہ سلیمانؑ نے کفر نہیں کیا تھا، بلکہ

شیاطین ہی کفر کرتے تھے، وہ لوگوں کو جادو سکھاتے تھے۔ اور وہ اُس (جادو کے علم) کی بھی پیروی کرتے تھے جو بابل شہر میں دو فرشتوں، ہاروت اور ماروت پر نازل کیا گیا تھا۔ حالانکہ وہ دونوں کسی کو بھی (یہ علم) سکھانے سے پہلے خبردار کر دیتے تھے کہ ہم تو محض آزمائش کے لیے ہیں، لہٰذا تم کفر نہ کرو۔ پھر بھی لوگ ان سے وہ چیز سیکھتے تھے جس سے شوہر اور بیوی کے درمیان جدائی ڈال دیتے تھے۔ حالانکہ وہ اس جادو سے کسی کو بھی نقصان نہیں پہنچا سکتے تھے، مگر اللہ کے حکم سے۔ اور وہ ایسی چیز سیکھتے تھے جو ان کے لیے نقصان دہ تھی اور فائدہ مند نہ تھی۔ اور یقیناً وہ جانتے تھے کہ جو اس (علم) کو اختیار کرے گا، اس کا آخرت میں کوئی حصہ نہیں۔ اور کتنی بری چیز تھی جس کے بدلے انہوں نے اپنی جانوں کا سودا کر لیا، کاش وہ جانتے! (۱۰۳)۔ اور اگر وہ ایمان لے آتے اور تقویٰ اختیار کرتے تو اللہ کے یہاں کا اجر ان کے لیے کہیں بہتر ہوتا، کاش وہ سمجھتے۔

تفسیر- آیت نمبر ۹۷ سے ۱۰۳ تک

آیت نمبر (۹۷) قُلْ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّجِبْرِيْلَ فَاِنَّهٗ نَزَّلَهٗ عَلٰى قَلْبِكَ بِاِذْنِ اللّٰهِ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ وَهُدًى وَّبُشْرٰى لِلْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۹۷﴾

ترجمہ: ''کہہ دیجئے: جو جبرئیل کا دشمن ہے (تو وہ سن لے) کہ جبرئیل ہی نے تو یہ قرآن آپ کے دل پر اللہ کے حکم سے نازل کیا ہے، ان کتابوں کی تصدیق کرتا ہوا جو اس سے پہلے ہیں اور ہدایت و خوشخبری ہے ایمان والوں کے لیے''۔

تفسیر امام بخاریؒ نے حضرت انسؓ سے روایت نقل کی ہے کہ حضرت عبداللہ بن سلامؓ جب رسول اللہ ﷺ کے آنے کی خبر سنے تو وہ ایک زمین میں پھل جمع کر رہے تھے۔ حضرت عبداللہ بن سلامؓ فوراً رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ میں آپ سے تین باتیں دریافت کرنا چاہتا ہوں، جن کا علم نبی ﷺ کے سوا کسی اور کو نہیں ہے: (۱) قیامت کی نشانیاں کیا ہیں؟ (۲) جنتیوں کا سب سے پہلا کھانا کیا ہوگا؟ (۳) لڑکا اپنے باپ یا ماں کے کس سے مشابہ ہوتا ہے؟

آپ ﷺ نے فرمایا: ''ان سوالات کے جوابات کے متعلق ابھی جبرائیل امینؑ نے مجھے آگاہ کیا ہے۔'' حضرت عبد اللہ بن سلامؓ نے کہا: ''جبرائیل؟'' آپ ﷺ نے فرمایا: ''ہاں، جبرائیل۔'' ابن سلامؓ نے کہا: ''فرشتوں میں سب سے زیادہ جبرائیلؑ یہودیوں کے دشمن ہیں۔'' اس پر آپ ﷺ نے یہ آیت تلاوت فرمائی: ''قُلْ

مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّجِبْرِيْلَ ''۔ (بخاری:۳۳۲۹)

حافظ ابن حجر عسقلانیؒ فرماتے ہیں کہ حدیث کے سیاق وسباق سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے یہودیوں کی رد کے لیے یہ آیت تلاوت فرمائی، اور اس کی تلاوت کے ساتھ ہی آیت کا نزول لازمی نہیں۔ یہی بات زیادہ صحیح معلوم ہوتی ہے، کیونکہ اس آیت کے نزول کے متعلق حضرت عبداللہ بن سلامؓ کے واقعہ کے علاوہ بھی دیگر واقعات موجود ہیں۔

امام احمد، ترمذی اور نسائی نے بکر بن شہاب اور سعید بن جبیر کے ذریعے حضرت ابن عباسؓ سے نقل کیا ہے کہ یہودیوں کی ایک جماعت رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئی اور عرض کیا: ''اے عبدالقاسم ﷺ! ہم آپ سے پانچ باتیں جاننا چاہتے ہیں۔ اگر آپ ہمیں ان پانچ باتوں کے جوابات بتادیں تو ہم پہچان لیں گے کہ آپ واقعی نبی ہیں۔'' یہودیوں نے یہ سوالات پوچھے: ۱۔ بنی اسرائیل نے اپنے اوپر کون سی چیزیں حرام کی تھیں؟ ۲۔ نبی ﷺ کی علامات کیا ہیں؟ ۳۔ بچہ مرد یا عورت کیوں ہوتا ہے؟ ۴۔ آسمان سے وحی کون لے کر آتا ہے؟

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جبرائیل امین۔'' یہودیوں نے کہا: ''یہ تو جنگ وقتال اور عذاب الٰہی کے احکام لے کر آتے ہیں، جو ہمارے دشمن ہیں۔ اگر آپ میکائیل کا نام لیتے تو وہ رحمت کی بارش لے کر آتے، جو بہتر ہوتا''۔ تب یہ آیت کریمہ نازل ہوئی۔

مفسرین کے مطابق اس آیت کے نزول کے دیگر اسباب بھی ہیں: جب رسول اللہ ﷺ مدینہ تشریف لائے اور یہودیوں کو سمجھانے لگے، تو انہوں نے اپنے کچھ علماء کو آپ ﷺ کے پاس بھیجا۔ یہ علماء نے کہا کہ ہم آپ سے چند باتیں پوچھنا چاہتے ہیں، جنہیں صرف نبی ہی جانتے ہیں۔ اگر آپ صحیح جواب دے دیں تو ہم یقین کرلیں گے کہ آپ وہ نبی ہیں جن کی پیشین گوئی حضرت موسیٰؑ نے کی تھی۔

ان یہودیوں کے سوالات اس طرح تھے:

۱۔ سب سے پہلے حضرت یعقوبؑ نے اپنے اوپر کون سی چیز حرام کی تھی؟ ۲۔ نبی امیؐ جن کا ذکر توریت میں آیا ہے، ان کی نشانیاں کیا ہیں؟ ۳۔ بچہ پیٹ کے اندر کس طرح مرد یا عورت بنتا ہے؟ ۴۔ آپ کے پاس وحی کون لے کر آتا ہے؟

یہودیوں کے سوالات کے جوابات

۱۔ حضرت یعقوبؑ کے پسندیدہ کھانے کے جواب کے سلسلے میں حضرت محمد ﷺ نے فرمایا: ''تم جانتے ہو کہ حضرت یعقوبؑ کو ایک سخت مرض لاحق ہوا۔ جب یہ مرض طویل ہوگیا تو انہوں نے اللہ سے وعدہ کیا کہ اگر اللہ تعالیٰ

انہیں شفا دے گا تو وہ اپنا پسندیدہ کھانا ہمیشہ کے لیے ترک کر دیں گے۔ ان کا سب سے محبوب کھانا اونٹ کا گوشت اور دودھ تھا۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں صحت دی اور انہوں نے اپنی منت پوری کی، یوں اونٹ کا گوشت کھانا چھوڑ دیا''۔

۲۔ نبی امی کی نشانی کے سلسلے میں آپ ﷺ نے فرمایا: ''وہ نبی امی جس کا ذکر توریت میں آیا ہے، اس کی خصوصیات میں سے یہ ہے کہ رات کے وقت اس کی آنکھیں سوئیں گی، لیکن دل ہمیشہ بیدار رہے گا''۔

۳۔ بچے کی جنس کا تعین کے سلسلے میں آپ ﷺ نے فرمایا: ''تم جانتے ہو کہ مرد کا بیضہ گاڑھا اور سفید ہوتا ہے اور عورت کا بیضہ پتلا اور زرد رنگ کا ہوتا ہے۔ ان دونوں میں جو بیضہ اللہ کے حکم سے غالب آجاتا ہے، بچہ اسی جنس کا پیدا ہوتا ہے''۔

۴۔ وحی کے قاصد کے سلسلے میں آپ ﷺ نے فرمایا: ''جبرائیلؑ میرے پاس وحی لاتے ہیں اور ہر نبی کے پاس وحی جبرائیلؑ ہی لے کر آتے تھے''۔

یہودیوں نے کہا: ''آپ نے سب کچھ بالکل صحیح بتایا، لیکن جبرائیل ہمارا دشمن ہے۔ یہی وہ فرشتہ ہیں جو عذاب اور سزا لے کر آتے ہیں، اور ہمارے باپ دادا کو تباہ و برباد کیا۔ اگر میکائیلؑ آپ کے پاس وحی لاتے، جو بارش اور رحمت لے کر آتے، تو ہم یقیناً آپ پر ایمان لے آتے''۔

اس پر یہود نے رسول اللہ ﷺ پر ایمان لانے سے انکار کر دیا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے یہ آیتیں نازل فرمائیں۔

جبرائیلؑ سے دشمنی کا مفہوم

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ جو شخص جبرائیلؑ کا دشمن ہے، درحقیقت وہ اللہ کا دشمن ہے۔ جبرائیلؑ کا کوئی ذاتی قصور نہیں، وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے مقرر ہیں، اور جو کچھ انہیں دیا جاتا ہے وہی وہ پہنچاتے ہیں۔ جبرائیلؑ کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے قرآن نازل کیا، جو پچھلی آسمانی کتابوں کی تصدیق کرتا ہے اور اہل ایمان کے لیے خوشخبری لاتا ہے۔ جو شخص جبرائیلؑ سے دشمنی رکھتا ہے، وہ حقیقت میں اللہ کے قاصد سے دشمنی کرتا ہے۔ جبرائیلؑ کو اللہ تعالیٰ نے قاصد بنایا ہے، اور جو کچھ اللہ نے ان کے ذریعے نبیوں تک پہنچایا، وہ بالکل ویسا ہی پہنچایا جیسا اللہ نے حکم دیا تھا۔

آیت نمبر (۹۸) مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّلّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَرُسُلِهٖ وَجِبْرِيْلَ وَمِيْكٰىلَ فَاِنَّ اللّٰهَ عَدُوٌّ لِّلْكٰفِرِيْنَ ﴿۹۸﴾

ترجمہ: ''جو کوئی اللہ کا اور اس کے فرشتوں کا اور اس کے رسولوں کا اور جبرئیل اور میکائیل کا دشمن

ہے، تو بیشک اللہ بھی کافروں کا دشمن ہے''۔

تفسیر جو شخص اللہ، اس کے فرشتوں، اس کے رسولوں، حضرت جبرئیلؑ اور حضرت میکائیلؑ کا دشمن ہوگا، وہ حقیقت میں کافر ہے، اور اللہ تعالیٰ کافروں کا دشمن ہے۔ یہودیوں کی بات کس قدر عجیب ہے کہ وہ کہتے ہیں: ''ہم اس کتاب کو نہیں مانتے جسے جبرئیلؑ لے کر آئے۔'' حالانکہ اصل بات یہ ہے کہ جبرئیلؑ جو کچھ لے کر آئے، وہ اللہ کا کلام ہے۔ یہاں لانے والے کو نہیں بلکہ بھیجنے والے کو دیکھا جاتا ہے۔ جب احکام دینے والا خود اللہ تعالیٰ ہے تو پھر اس کے حکم کو محض اس وجہ سے نہ ماننا کہ جبرئیلؑ لے کر آئے ہیں، نہایت بڑی محرومی اور بدبختی کی علامت ہے۔

جبرئیلؑ کا دشمن

مفسر ابن کثیر لکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے فرشتوں اور رسولوں کے ذکر کے بعد خاص طور پر جبرئیلؑ اور میکائیلؑ کا ذکر کیا، تاکہ یہ حقیقت واضح ہو جائے کہ اللہ کے کسی بھی رسول یا فرشتے سے دشمنی رکھنا، دراصل اللہ تعالیٰ سے دشمنی کے مترادف ہے۔ جو یہ کہے کہ ''ہمیں جبرئیلؑ سے دشمنی ہے مگر میکائیلؑ ہمارے دوست ہیں'' وہ غلط بات کرتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جو ایک فرشتے سے دشمنی کرے، وہ سب فرشتوں کا دشمن ہے اور یہ کفر ہے۔ یہودیوں کا یہ گمان کہ میکائیلؑ ان کے دوست ہیں، محض خام خیالی ہے۔ جبرئیلؑ یا کسی بھی فرشتے سے دشمنی، تمام فرشتوں سے دشمنی ہے، اور اس میں دراصل اللہ تعالیٰ کی دشمنی پوشیدہ ہے۔

امام بخاریؒ نے حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حدیثِ قدسی میں فرمایا: ''جو میرے کسی دوست سے دشمنی کرے گا، میں اس کے خلاف اعلانِ جنگ کرتا ہوں''۔ اور جس کا دشمن خود اللہ ہو جائے، اس کی دنیا اور آخرت دونوں تباہ و برباد ہو جائیں۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جبرئیلؑ کے دشمنوں کے بارے میں اپنے غضب اور قہر کا اعلان فرمایا ہے۔ **(بخاری: ۶۵۰۲)**

آیت نمبر (۹۹) وَلَقَدْ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ اٰيٰتٍۢ بَيِّنٰتٍ ۚ وَمَا يَكْفُرُ بِهَآ اِلَّا الْفٰسِقُوْنَ ۝۹۹

ترجمہ: ''اور ہم نے آپ کی طرف واضح آیات نازل کی ہیں اور ان کا انکار صرف نافرمان لوگ ہی کرتے ہیں''۔

تفسیر

آیاتِ بَیِّنٰت کا انکار

حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ ایک یہودی، ابنِ سوریا، نے رسول اللہ ﷺ سے کہا: ''اے محمد!

آپ کوئی ایسی چیز نہیں لائے جسے ہم پہچانتے ہوں، اور نہ ہی آپ کے پاس کوئی ایسی کھلی دلیل ہے جس کی بنیاد پر ہم آپ کی بات مان لیں۔''

اس پر یہ آیت نازل ہوئی کہ: اے محمد ﷺ! ہم نے آپ کی طرف روشن اور واضح آیات نازل کی ہیں۔ یہ وہ آیات بینات ہیں جن میں یہودیوں کی چھپی ہوئی باتیں، ان کے راز، ان کی گزرے ہوئے لوگوں کی تاریخ، اور وہ تبدیلیاں بھی ظاہر کی گئی ہیں جو انہوں نے خود اپنی کتابوں میں کر ڈالی تھیں۔ اللہ تعالیٰ نے یہ سب حقیقتیں آپ پر منکشف فرمائیں اور اپنی کتاب میں اتار دیں۔

جو شخص انصاف پسند ہو اور حسد وجلن کی آگ میں اپنی جان کو ہلاکت میں نہ ڈالے، اس کے لیے یہ آیات بینہ کافی دلیل ہیں۔ لیکن جو حق اور اہلِ حق سے بغض وعناد رکھے، اور جس کی فطرت ہی برائی میں ڈھل گئی ہو، وہی ان روشن آیات کا انکار کرتا ہے۔

ان آیات کو سننے کے بعد تو ہونا یہ چاہیے تھا کہ یہ لوگ رسول اللہ ﷺ پر ایمان لے آتے، کیونکہ آپ ﷺ نے کسی انسان سے کچھ سیکھے بغیر ان چھپی ہوئی حقیقتوں کو بیان فرمایا۔ لیکن افسوس! وہ اس عظیم نعمت سے محروم رہ گئے۔ **(تفسیر دُرِّ المنثور، حصہ ۱، ص ۹۴)**

آیت نمبر (۱۰۰) اَوَكُلَّمَا عٰهَدُوْا عَهْدًا نَّبَذَهٗ فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ ؕ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۰۰﴾

ترجمہ: ''کیا یہ ہمیشہ یہی کرتے رہے ہیں؟ کہ جب کبھی انہوں نے کوئی عہد کیا، تو ان میں سے ایک گروہ نے اسے پھینک دیا؟ بلکہ ان میں سے اکثر ایمان ہی نہیں لاتے''۔

تفسیر وَلَقَدْ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ اٰيٰتٍۭ بَيِّنٰتٍ 'ابن ابی حاتم' نے 'سعید' اور 'عکرمہ' کے ذریعے سے حضرت ابن عباسؓ سے نقل کیا ہے کہ 'ابن سوریا' نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا کہ آپ ہمارے پاس کوئی ایسی چیز لیکر نہیں آئے جسے ہم پہچانتے ہوں اور نہ آپ پر کوئی بیان کرنے والی واضح آیت نازل ہوئی ہے، تو اس پر اللہ تعالیٰ نے اس آیت وَلَقَدْ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ اٰيٰتٍۭ بَيِّنٰتٍ کو نازل فرمایا۔ **(تفسیر ابن عباس)**

وعدے کی خلاف ورزی

تفسیر ابن کثیر میں بیان ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے یہودیوں کو وہ عہد یاد دلایا جو ان سے خاتم النبیین، یعنی آخری نبی ﷺ کے بارے میں لیا گیا تھا۔ لیکن انہوں نے صاف انکار کر دیا۔ انہی میں سے ایک شخص ''مالک بن

سیف'' نے کہا: ''اللہ کی قسم! محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں ہم سے کوئی عہد نہیں لیا گیا''۔اس پر یہ آیت نازل ہوئی: ''اَوَكُلَّمَا عٰهَدُوْا عَهْدًا نَّبَذَهٗ فَرِيْقٌ''۔

یعنی: ''یہ لوگ ہر بار اپنے عہد کا انکار کرتے ہیں اور جب بھی انہوں نے کوئی وعدہ کیا تو ان میں سے ایک گروہ نے اسے توڑ ڈالا۔یہی ان کی فطرت ہے کہ عہد شکنی ان کی عادت بن چکی ہے''۔

'روح المعانی' میں یہ وضاحت بھی ملتی ہے کہ اس موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو تسلی دی گئی کہ ان کے رویے کی پرواہ نہ کریں، اور ان کی مخالفت کو اپنے دل کا بوجھ نہ بنائیں۔

آیت نمبر(۱۰۱) اَوَكُلَّمَا عٰهَدُوْا عَهْدًا نَّبَذَهٗ فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ ؕ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ۝۱۰۰

ترجمہ: ''جب ان کے پاس اللہ کی طرف سے ایسا رسول آیا جو ان (آسمانی) کتابوں کی تصدیق کرنے والا تھا جو ان کے پاس تھیں، تو اہلِ کتاب میں سے ایک گروہ نے اللہ کی کتاب کو ایسے پیٹھ پیچھے پھینک دیا گویا وہ اسے جانتے ہی نہ تھے''۔

تفسیر یہی بری عادت ان کی ہلاکت کا باعث بنی کہ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مبعوث ہوئے اور قرآن نے توریت کی تصدیق کی، تو یہودیوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تمام نشانیاں جاننے اور پہچاننے کے باوجود انکار کر دیا اور قرآن کو اللہ کی کتاب ماننے سے صاف انکار کر دیا۔

انہوں نے صرف قرآن ہی کو رد نہیں کیا بلکہ توریت کے بھی منکر بن گئے۔توریت میں جو صفات اور دلائل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت کے بارے میں بیان کیے گئے تھے، ان کو چھپا لیا اور اس انداز سے انکار کرنے لگے جیسے وہ جانتے ہی نہ ہوں کہ توریت اللہ کی نازل کردہ کتاب ہے۔حالانکہ وہ خوب جانتے تھے کہ اس میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت کے روشن دلائل درج ہیں۔**(روح المعانی، حصہ ۱، ص ۳۳۶)**

آیت نمبر(۱۰۲) وَاتَّبَعُوْا مَا تَتْلُوا الشَّيٰطِيْنُ عَلٰى مُلْكِ سُلَيْمٰنَ ۚ وَمَا كَفَرَ سُلَيْمٰنُ وَلٰكِنَّ الشَّيٰطِيْنَ كَفَرُوْا يُعَلِّمُوْنَ النَّاسَ السِّحْرَ ۗ وَمَآ اُنْزِلَ عَلَى الْمَلَكَيْنِ بِبَابِلَ هَارُوْتَ وَمَارُوْتَ ؕ وَمَا يُعَلِّمٰنِ مِنْ اَحَدٍ حَتّٰى يَقُوْلَآ اِنَّمَا نَحْنُ فِتْنَةٌ فَلَا تَكْفُرْ ؕ فَيَتَعَلَّمُوْنَ مِنْهُمَا مَا يُفَرِّقُوْنَ بِهٖ بَيْنَ الْمَرْءِ وَزَوْجِهٖ ؕ وَمَا هُمْ بِضَآرِّيْنَ بِهٖ مِنْ اَحَدٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ وَيَتَعَلَّمُوْنَ مَا يَضُرُّهُمْ وَلَا يَنْفَعُهُمْ ؕ وَلَقَدْ عَلِمُوْا لَمَنِ اشْتَرٰىهُ مَا لَهٗ فِيْ

الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ ۚ وَلَبِئْسَ مَا شَرَوْا بِهٖٓ اَنْفُسَهُمْ ۭ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ۝۱۰۲

ترجمہ: ''اورانہوں نے اس چیز کی پیروی شروع کردی جوسلیمانؑ کی بادشاہی کے دور میں شیاطین پڑھا کرتے تھے۔ حالانکہ سلیمانؑ نے کفرنہیں کیا تھا، بلکہ شیاطین ہی کفر کرتے تھے، وہ لوگوں کو جادو سکھاتے تھے۔ اوروہ اُس (جادو کے علم) کی بھی پیروی کرتے تھے جو بابل شہر میں دوفرشتوں، ہاروت اور ماروت پر نازل کیا گیا تھا۔ حالانکہ وہ دونوں کسی کو بھی (یہ علم) سکھانے سے پہلے خبردار کردیتے تھے کہ ہم تو محض آزمائش کے لیے ہیں، لہٰذا تم کفر نہ کرو۔ پھر بھی لوگ ان سے وہ چیز سیکھتے تھے جس سے شوہر اور بیوی کے درمیان جدائی ڈال دیتے تھے۔ حالانکہ وہ اس جادو سے کسی کو بھی نقصان نہیں پہنچا سکتے تھے، مگر اللہ کے حکم سے۔ اور وہ ایسی چیز سیکھتے تھے جو ان کے لیے نقصان دہ تھی اور فائدہ مند نہ تھی۔ اور یقیناً وہ جانتے تھے کہ جو اس (علم) کو اختیار کرے گا، اس کا آخرت میں کوئی حصہ نہیں۔ اور کتنی بری چیز تھی جس کے بدلے انہوں نے اپنی جانوں کا سودا کرلیا، کاش وہ جانتے''۔

تفسیر وعدہ شکنی اور اعتراضات

حضرت مالک بن ابی سیفؓ بیان کرتے ہیں کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مبعوث ہوئے اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہودیوں کو وہ عہد و میثاق یاد دلایا جو ان سے لیا گیا تھا، بالخصوص وہ وعدہ جو خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں تھا، تو یہودی صاف مکر گئے اور بولے: ''قسم ہے! ہم سے محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے متعلق کوئی وعدہ نہیں لیا گیا''۔ اسی پر یہ آیت نازل ہوئی: ''وَاتَّبَعُوْا مَا تَتْلُوا الشَّيٰطِيْنُ''۔

حضرت ابن جریرؒ نے شہر بن حوشب سے نقل کیا ہے کہ یہودی کہا کرتے تھے: ''محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دیکھو! یہ حق اور باطل کو خلط ملط کرتے ہیں، اور سلیمانؑ کو انبیاء کرام میں شمار کرتے ہیں۔ حالانکہ وہ تو جادوگر تھے، ہوا پر سواری کرتے تھے!'' ان کی اس جسارت پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: ''وَاتَّبَعُوْا مَا تَتْلُوا الشَّيٰطِيْنُ''۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سوالات

ابن ابی حاتم نے ابوالعالیہ سے روایت نقل کی ہے کہ یہودی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کبھی کسی زمانے کی بات دریافت کرتے، کبھی کسی اور معاملے میں سوال کرتے۔ اور اللہ تعالیٰ ہر سوال کے جواب میں وحی نازل فرماتا، یہاں تک کہ وہ حیران رہ جاتے اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے علم پر تعجب کرتے۔ یہ دیکھ کر وہ آپس میں کہنے لگے: ''یہ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تو ان

باتوں کو بھی جانتے ہیں جو ہمارے پاس ہیں، بلکہ اس سے کہیں زیادہ علم رکھتے ہیں''۔

پھر انہوں نے جادو کے بارے میں سوالات اور اعتراضات شروع کیے۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: ''وَاتَّبَعُوْا مَا تَتْلُوا الشَّيٰطِيْنُ''۔ (تفسیر ابن عباس)

جادو اور یہود کی گمراہی

ان آیات میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ یہودیوں نے نہ تو اللہ کی کتاب توریت کو مانا، اور نہ ہی جادو جیسی شیطانی و کافرانہ باتوں کو ترک کیا۔ وہ انہی باطل باتوں کے پیچھے پڑ گئے جن کا چرچا خبیث جنات حضرت سلیمانؑ کے زمانے میں کیا کرتے تھے۔

یہ بدکار جن خود بھی کفر اور سحر (جادو) میں مبتلا تھے اور دوسروں کو بھی اس کی تعلیم دیتے تھے۔ یہی جادو ان کے ذریعے نسل در نسل منتقل ہوا اور آج تک جاری ہے، اور یہی سحر ہے جس کی یہود پیروی کرتے رہے۔ اسی طرح وہ اس جادو کی بھی پیروی کرنے لگے جو بابل شہر میں دو فرشتوں ''ہاروت'' اور ''ماروت'' پر ایک خاص حکمت کے تحت نازل کیا گیا تھا۔

جادو کا سبب

دنیا میں جو کچھ بھی وقوع پذیر ہوتا ہے، وہ سب اللہ کے حکم اور مشیت سے ہوتا ہے، خواہ اس کا ظاہری سبب کچھ بھی ہو۔ جادو بھی ایک سبب ہے، جس کے نتیجے میں کبھی کسی پر اثر پڑ جاتا ہے اور جس پر جادو کیا جائے، وہ تکلیف محسوس کرتا ہے۔ چنانچہ حضرت ہودؑ کی قوم نے ان سے کہا: ''اِنَّمَآ اَنْتَ مِنَ الْمُسَحَّرِيْنَ'' (یعنی تم تو ان ہی لوگوں میں سے ہو جن پر جادو کر دیا گیا ہے)۔ یہی الزام حضرت شعیبؑ پر بھی ان کی قوم نے لگایا۔ حضرت موسیٰؑ کا جادوگروں سے مقابلہ تو قرآن میں نہایت مشہور ہے۔ اسی طرح جادوگری کا سلسلہ حضرت سلیمانؑ کے زمانے میں بھی جاری رہا اور ان کے بعد بھی باقی رہا۔ حتیٰ کہ بخاری شریف کی روایت کے مطابق ایک یہودی نے رسول اللہ ﷺ پر بھی جادو کر دیا تھا۔ آج بھی دنیا میں جادوگر موجود ہیں اور جادوگری کا رواج پایا جاتا ہے۔

سلیمانؑ اور جادو کا فتنہ

یہود کی پہلی شکایت کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ انہوں نے کتابِ الٰہی کو پس پشت ڈال دیا۔ پھر ارشاد فرمایا کہ حضرت سلیمانؑ کے زمانے میں شیاطین جادو پڑھتے تھے، یعنی جادو کرتے اور اس میں مصروف رہتے۔ مفسرین نے لکھا ہے کہ ایک موقع پر چند روز کے لیے حضرت سلیمانؑ کی سلطنت عارضی طور پر ان سے سلب ہو گئی تھی۔ اس دوران شیاطین نے ان کے تخت کے نیچے جادو کے کچھ آلات اور تحریریں دفن کر دیں۔ جب حضرت سلیمانؑ کا

وصال ہوا تو شیاطین نے ان چیزوں کو نکال کر ظاہر کیا اور مشہور کر دیا کہ ''سلیمانؑ نبی نہیں تھے بلکہ جادو کے زور پر حکومت کرتے تھے''۔

بنی اسرائیل کے علماء نے اس بات کو جھٹلایا، لیکن عام لوگ اس فتنے میں مبتلا ہو گئے۔ انہوں نے کہنا شروع کر دیا کہ ''یہی جادو سلیمانؑ کا اصل علم تھا۔'' پھر وہ اسی جادو کے سیکھنے سکھانے میں لگ گئے اور انبیاء کی کتابوں کو پسِ پشت ڈال دیا۔

قرآن کی وضاحت

جب رسول اللہ ﷺ نے وضاحت فرمائی کہ سلیمان بن داؤدؑ اللہ کے برگزیدہ نبی تھے، تو یہود نے اعتراض کیا اور کہا: ''محمد ﷺ کہتے ہیں کہ سلیمانؑ نبی تھے، حالانکہ وہ تو صرف جادوگر تھے''۔

اس پر اللہ تعالیٰ نے قرآن کی یہ آیت نازل فرما کر حضرت سلیمانؑ کو جادو کے الزام سے بری کر دیا: ''وَمَا كَفَرَ سُلَيْمَانُ وَلَٰكِنَّ الشَّيَاطِينَ كَفَرُوا''۔ (سلیمانؑ نے کفر نہیں کیا، بلکہ شیاطین نے کفر کیا)۔ یعنی جادو اور کفر کا کام حضرت سلیمانؑ کا نہیں، بلکہ شیاطین کا تھا۔ وہی لوگوں کو جادو سکھاتے اور اس گمراہی میں ڈالتے تھے۔

(تفسیر قرطبی و ابن کثیر)

بابل کا جادو اور ہاروت و ماروت

قدیم زمانے میں یہود کا بڑا چرچا تھا، خصوصاً عراق کے شہر 'بابل' میں جادو کے اثرات دیکھ کر لوگ ان سے بے حد متأثر ہوتے اور جادوگروں کو غیر معمولی ہستی سمجھنے لگے۔ جادو کے نقصانات اور اس کی حقیقت آشکار کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے دو فرشتوں کو بھیجا، جن کے نام ''ہاروت'' اور ''ماروت'' تھے، تاکہ وہ لوگوں کو سحر (جادو) اور معجزے کے فرق سے آگاہ کریں اور ساتھ ہی ایمان و کفر کے درمیان ایک کسوٹی قائم ہو کہ کون خیر و ہدایت کو پسند کرتا ہے اور کون شر و باطل کا دلدادہ بنتا ہے۔

جب ان فرشتوں نے اپنا مشن شروع کیا تو لوگ ان کے پاس آنے لگے اور اصرار کرنے لگے کہ ہمیں بھی جادو کے طریقے سکھائے جائیں۔ فرشتے ہر بار سب سے پہلے تنبیہ کرتے کہ: ''ہم اللہ کے حکم سے تمہاری آزمائش کے لیے بھیجے گئے ہیں۔ یہ علم تمہارے لیے ایک امتحان ہے۔ دیکھنا! اس کے ذریعے نہ تو اپنے دین کو برباد کرنا اور نہ ہی اس سے دوسروں کو نقصان پہنچانا''۔

وہ نصیحت کرتے کہ: ''اگر جادو کا علم حاصل بھی کرو تو صرف اس نیت سے کرو کہ برائی سے بچ سکو، اس کو غلط مقاصد کے لیے استعمال نہ کرنا''۔ جو لوگ ان کی یہ شرط مان لیتے، انہیں جادو کا طریقہ بتایا جاتا، لیکن بعد میں اگر وہ عہد

توڑ کر اس علم کو شر اور فساد میں استعمال کرتے تو اس کا وبال ان ہی کے اپنے عمل پر ہوتا۔ **(روح المعانی)**

جادو کا اثر

قرآن مجید بیان کرتا ہے کہ یہ لوگ ان دونوں فرشتوں سے وہ طریقے سیکھ لیتے تھے جن کے ذریعے میاں بیوی کے درمیان جدائی ڈال دیتے تھے۔ اس سے معلوم ہوا کہ جادو کے اثر سے محبت کرنے والوں کے دلوں میں نفرت پیدا کی جاسکتی ہے اور پیار و مودّت رکھنے والے جدا بھی کیے جاسکتے ہیں۔

اس زمانے میں جادو کے ذریعے بڑے بڑے فتنہ انگیز کام کیے جاتے اور لوگوں کو اذیت پہنچائی جاتی۔ ان تمام تباہ کن اثرات میں سے قرآن نے صرف ایک مثال ذکر کی ہے، اور وہ ہے میاں بیوی کے درمیان جدائی ڈالنا یہ وہ عمل ہے جو اللہ تعالیٰ کو سخت ناپسند اور شیطان کو بے حد پسند ہے۔

ابلیس کا تخت

حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''یقیناً ابلیس اپنا تخت پانی پر بچھاتا ہے اور پھر اپنے لشکروں کو فتنہ و فساد پھیلانے کے لیے روانہ کرتا ہے۔ ان میں سے سب سے زیادہ قربت اسی کو حاصل ہوتی ہے جو فتنہ انگیزی میں سب سے بڑھ کر ہو۔''

یہ لشکر اپنے اپنے فتنے سجا کر اس کے پاس لے کر آتے ہیں۔ کوئی کہتا ہے: ''میں نے فلاں شخص کو بہکایا اور فلاں گناہ پر آمادہ کیا۔'' ابلیس جواب دیتا ہے: ''تو نے کچھ خاص نہیں کیا''۔ پھر ایک اور آتا ہے اور کہتا ہے: ''میں نے فلاں مرد اور اس کی بیوی کے درمیان جدائی ڈال دی۔'' اس کی یہ بات سن کر ابلیس نہایت خوش ہوتا ہے، اسے اپنے قریب بلا لیتا ہے اور کہتا ہے: ''ہاں! تو نے واقعی کمال کا کام کیا''۔

حضرت اعمشؒ فرماتے ہیں: ''جہاں تک مجھے یاد ہے، حدیث میں یہ بھی آیا ہے کہ ابلیس ایسے شخص کو اپنے ساتھ چمٹا لیتا ہے جس نے میاں بیوی میں جدائی ڈالی ہو۔'' **(مسلم: ۷۱۰۶)**

اللہ تعالیٰ نے قرآن میں فرمایا کہ جادوگر اپنے جادو سے کسی کو ہرگز نقصان نہیں پہنچا سکتے، مگر اللہ کے حکم سے۔ اس سے معلوم ہوا کہ جادو کی حقیقت ضرور ہے، مگر اس کا اثر بھی اللہ کے اذن کے بغیر ظاہر نہیں ہوتا۔ جادوگر بعض اوقات میاں بیوی کے تعلقات میں بھی رخنہ ڈال دیتے ہیں اور جدائی پیدا کر دیتے ہیں، لیکن دراصل جو کچھ ہوتا ہے وہ اللہ تعالیٰ کے ارادے سے ہوتا ہے۔

یہ معاملہ اسی طرح ہے جیسے: آگ جلانے کا سبب ہے، لیکن جلانا اللہ کے حکم سے ہے۔ چھری کاٹنے کا کام

کرتی ہے، مگر اللہ کے ارادے کے بغیر کچھ نہیں کاٹ سکتی۔ کھانا کھانے سے پیٹ بھرتا ہے، مگر بعض امراض میں انسان خوب کھالے پھر بھی پیٹ نہیں بھرتا ہے۔

اسی طرح جادو کے اثرات بھی اللہ کے حکم سے ظاہر ہوتے ہیں۔ جب اللہ چاہے تو جادو بے اثر ہو جاتا ہے، جیسے حضرت ابراہیمؑ کو آگ نے نہیں جلایا اور حضرت اسماعیلؑ کو چھری نے نہیں کاٹا۔

کم علم لوگ جادوگروں سے بہت جلد متأثر ہو جاتے ہیں، اور جاہل پیروں میں سے کچھ لوگ معمولی جادو سیکھ کر عوام کو دھوکہ دے کر اپنے کاروبار چمکاتے ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ جادو کا اثر بھی اللہ کے ارادے پر موقوف ہے اور جب وہ چاہے تو اسے مٹا دیتا ہے۔

چنانچہ جب جادوگر حضرت موسیٰؑ کے مقابلے میں آئے تو آپؑ نے فرمایا: ''تم جو کچھ لائے ہو وہ جادو ہے، اور اللہ جلد ہی اسے نیست و نابود کر دے گا''۔

یقیناً بڑے بڑے جادوگروں کے اعمال بھی ان دو سورتوں کی تلاوت سے ختم ہو جاتے ہیں: ''قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ ۙ'' اور ''قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ ۙ''۔

جادو کے طریقے

جادو کے کئی طریقے اور ذرائع ہیں۔ ان میں ایک یہ ہے کہ جادوگر شیطانوں کی مدد حاصل کرنے کے لیے انہیں خوش کرتا ہے۔ اس مقصد کے لیے کبھی وہ ایسے کلمات پڑھتا ہے جن میں کفر اور شرک کے الفاظ شامل ہوتے ہیں اور شیطانوں کی تعریف کی جاتی ہے، کبھی ستاروں کی پرستش کی جاتی ہے، اور کبھی ایسے ناپاک اعمال اختیار کیے جاتے ہیں جو شیاطین کو محبوب ہیں۔ مثال کے طور پر: کسی انسان کو جان بوجھ کر قتل کر کے اس کے خون سے کام لینا، ناپاکی کی حالت میں رہنا اور نجاست میں ملوث رہنا۔

اسی لیے زیادہ تر کامیاب جادو انہی لوگوں کا ہوتا ہے جو طہارت اور پاکیزگی سے دور اور گندگی و ناپاکی میں ڈوبے رہتے ہیں۔ رفتہ رفتہ انہیں خبیث اعمال کی عادت پڑ جاتی ہے۔ جادوگر عورتیں عموماً حیض کے زمانے میں جادو کرتی ہیں کیونکہ اس حالت میں ان کے جادو کا اثر زیادہ گہرا ہوتا ہے۔ شیاطین ان جادوگروں کی پکار پر ان کے لیے کچھ کام انجام دے دیتے ہیں، اور دیکھنے والا یہ سمجھتا ہے کہ یہ سب جادوگر کے اپنے کرتب سے ہوا ہے۔

جس طرح فرشتے ان بندگانِ خدا کی مدد کرتے ہیں جو متقی اور پرہیزگار ہوں، پاکیزگی و طہارت اختیار کرتے ہوں، بدبو اور نجاست سے دور رہتے ہوں، اور اللہ کے ذکر و اعمالِ خیر میں مشغول ہوں، اسی طرح شیاطین ان لوگوں

کے مددگار رہوتے ہیں جو قول، فعل اور عقیدے کے اعتبار سے گندگی اور خباثت میں ان جیسے ہوں۔ مدد حاصل کرنے کے لیے مزاج کی ہم آہنگی ضروری ہے۔ (روح المعانی)

جادو کی قسمیں

مفسر ابن کثیرؒ نے ''ابوعبداللہ رازی'' سے جادو کی آٹھ قسمیں نقل کی ہیں۔ ان میں قوتِ خیالیہ کا اثر، نظر بندی، اور دواؤں کے استعمال کو بھی شامل کیا ہے۔ ان اقسام میں جو چیز ہاتھ کی صفائی، قوتِ خیالیہ یا بعض ادویہ کے ذریعے ظاہر کی جاتی ہے، اسے بھی جادو کہا گیا ہے۔

نظر بندی کو مثال سے یوں سمجھا جا سکتا ہے: ریل کی گاڑی میں بیٹھنے والے کو یوں محسوس ہوتا ہے کہ زمین بھی اس کے ساتھ چل رہی ہے، یا پلیٹ فارم پر کھڑے شخص کو لگتا ہے کہ برابر والی گاڑی حرکت کر رہی ہے، حالانکہ حقیقت اس کے برعکس ہوتی ہے۔

اسی طرح قرآن کریم میں حضرت موسیٰؑ کے مقابلے میں آنے والے جادوگروں کے بارے میں ارشاد ہوا ہے: ''يُخَيَّلُ إِلَيْهِ مِن سِحْرِهِمْ أَنَّهَا تَسْعَىٰ'' (ان کے جادو کے اثر سے حضرت موسیٰؑ کو ایسا محسوس ہوا کہ جیسے ان کی رسیاں اور لاٹھیاں دوڑ رہی ہیں)۔ (سورہ طٰہٰ)

نظروں کو مسحور کرنا

سورۂ اعراف میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ''جب انہوں نے اپنی لاٹھیاں اور رسیاں ڈالیں تو لوگوں کی آنکھوں پر جادو کر دیا، ان پر ہیبت طاری ہوگئی اور بڑا جادو کر دکھایا''۔

اس سے واضح ہوتا ہے کہ جادوگروں نے اپنی چال سے لوگوں کی نظروں کو مسحور کر دیا تھا۔ حتیٰ کہ حضرت موسیٰؑ علیہ السلام کو بھی وہ رسیاں اور لاٹھیاں سانپ نظر آنے لگیں اور دل میں کچھ خوف پیدا ہوا۔

چنانچہ سورۂ طٰہٰ میں ارشاد ہے: ''فَأَوْجَسَ فِي نَفْسِهِ خِيفَةً مُّوسَىٰ'' (موسیٰؑ نے اپنے دل میں خوف محسوس کیا)۔

اس پر اللہ تعالیٰ نے تسلی دیتے ہوئے فرمایا: ''لَا تَخَفْ إِنَّكَ أَنتَ الْأَعْلَىٰ ... وَلَا يُفْلِحُ السَّاحِرُ''۔

(ڈرو مت، تم ہی غالب رہو گے۔ جو کچھ تمہارے ہاتھ میں ہے اسے ڈال دو، ان کا سارا جادو تمہاری لاٹھی نگل جائے گی۔ یہ سب محض جادو کا دھوکہ ہے اور جادوگر کبھی کامیاب نہیں ہوتا)۔

'سحر' یعنی جادو کا اثر بھی مخصوص اسباب کے تحت ہوتا ہے۔ یہ اسباب عام لوگوں پر ظاہر نہیں ہوتے بلکہ صرف

جادوگران خفیہ اسباب سے واقف ہوتے ہیں۔ برخلاف اس کے، انبیائے کرام علیہم السلام کے معجزات کسی سبب یا ظاہری ذریعہ کے محتاج نہیں ہوتے بلکہ براہِ راست اللہ تعالیٰ کے حکم سے ظاہر ہوتے ہیں، مثال کے طور پر:

حضرت ابراہیمؑ کے لیے آگ کا ٹھنڈی اور سلامتی والی ہوجانا، حضرت موسیٰؑ کے عصا سے سمندر کا پھٹ جانا اور پتھر سے چشموں کا جاری ہوجانا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دستِ مبارک سے تھوڑی سی مٹی کافروں کی آنکھوں میں پہنچ جانا، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی انگلیوں سے پانی کا بہہ نکلنا، قلیل کھانے کا سینکڑوں لوگوں کے لیے کافی ہوجانا۔

یہ سب امور کسی سبب یا جادو کے زور پر نہیں بلکہ محض اللہ تعالیٰ کے حکم اور قدرت سے وقوع پذیر ہوئے۔ اور ختمِ نبوت کے بعد مسلمان کے لیے یہ عقیدہ ضروری ہے کہ اب نہ کوئی نبی آسکتا ہے اور نہ کسی جھوٹے مدعی یا جادوگر کا فریب کسی مؤمن کو دھوکہ دے سکتا ہے۔

معجزہ اور جادو میں فرق

معجزہ اور جادو میں نمایاں فرق ہے۔ جادو ہمیشہ گمراہ، ناپاک اور فاسق لوگوں سے ظاہر ہوتا ہے، جبکہ معجزات پاکیزہ اور برگزیدہ انبیائے کرام کے ہاتھوں رونما ہوتے ہیں۔ اسی لیے دونوں میں کبھی التباس نہیں ہوسکتا۔

'روح المعانی' کے مصنف کے مطابق: اللہ تعالیٰ نے کسی جادوگر کو یہ طاقت نہیں دی کہ وہ سمندر کو پھاڑ سکے، مردوں کو زندہ کرے یا بے جان اشیاء سے کلام کروادے۔ یہ امور صرف انبیاء کرام کے معجزات ہیں۔

مزید یہ کہ بعض محققین نے معجزہ اور جادو کے فرق کی وضاحت یوں کی ہے: معجزہ ہمیشہ نبوت کے دعوے کے ساتھ ظاہر ہوتا ہے۔ جب نبی کے ہاتھ پر کوئی غیر معمولی امر ظاہر ہوتا ہے تو وہ دراصل اس کی نبوت کی دلیل بنتا ہے۔ اس کے مقابلے میں مدعی سے اسی جیسی چیز لانے کا مطالبہ بھی کیا جاتا ہے، اور یہی بات کسی جادوگر یا جھوٹے مدعیِ نبوت کے حق میں کبھی ثابت نہیں ہوتی۔

چونکہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد نبوت ختم ہوچکی ہے، اس لیے اب معجزہ بھی کسی کے ہاتھ پر ظاہر نہیں ہوسکتا۔

نبوت کا جھوٹا دعویٰ کرنے والے

تاریخ اس بات پر گواہ ہے کہ بہت سے جھوٹے لوگ نبوت کے دعوے کے ساتھ اٹھے، مگر ان کا ہر کرتب محض دکھاوا ثابت ہوا۔ یہ سب جھوٹے اپنے انجام کو پہنچ کر خود ہی ختم ہوگئے۔ جادوگر کبھی نبوت کا دعویٰ نہیں کرتے کیونکہ وہ مقابلے کی تاب نہیں رکھتے۔ ایک جادوگر دوسرے جادوگر کے عمل کو کاٹ دیتا ہے، اور اس طرح ان کا تماشا خود انہی میں ختم ہوجاتا ہے۔ مثال کے طور پر، کوئی جادوگر بانسری بجاتا ہے تو دوسرا جادوگر اس کی آواز بند کردیتا ہے۔ لیکن انبیاء

کرام علیہم السلام کے معجزات ایسی حقیقت رکھتے ہیں جن کا نہ کوئی جادوگر مقابلہ کرسکتا ہے اور نہ ہی انہیں زائل کرسکتا ہے۔اس پر تاریخ گواہی دیتی ہے۔

کرامات

اللہ کے برگزیدہ اولیاء سے بعض اوقات کرامت بھی ظاہر ہوتی ہے۔لیکن یہ کرامت نہ ان کے لیے اللہ کی قربت میں اضافہ کرتی ہے اور نہ ہی ان کے درجات کو بڑھاتی ہے۔ اکثر اوقات تو خود صاحبِ کرامت کو بھی اپنی کرامت کا علم نہیں ہوتا۔یہی وجہ ہے کہ اکثر علماء کے نزدیک کرامت کی کوئی حیثیت یا اہمیت نہیں سمجھی جاتی۔

سحر یا جادو

سحر یعنی جادو میں اگر اس میں ایسے کلمات استعمال ہوں جو کفریہ ہوں، مثلاً شیاطین یا ستاروں سے مدد طلب کی جائے، تو یہ کھلا کفر ہے۔

قرآن میں فرمایا گیا ہے: ''وَيَتَعَلَّمُوْنَ مَا يَضُرُّهُمْ وَلَا يَنْفَعُهُمْ ''(وہ لوگ ایسی چیز سیکھتے تھے جو ان کے لیے نقصان دہ تھی، فائدہ دینے والی نہ تھی)۔

علامہ قرطبیؒ اس کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ جادو کا اصل نقصان آخرت میں ہوگا، چاہے دنیا میں وقتی فائدہ حاصل کرلیں۔بعض علماء نے یہ بھی کہا ہے کہ دنیا میں بھی جادو کا نقصان جادوگر ہی کو پہنچتا ہے، کیونکہ اسلامی حکومت اسے سزا دیتی ہے اور جادوگری کی نحوست اس پر مسلط ہوجاتی ہے۔

'روح المعانی' کے مصنف لکھتے ہیں کہ آیت میں ''وَلَا يَنْفَعُهُمْ '' کے الفاظ اس بات کی وضاحت کرتے ہیں کہ جادو سراسر شر ہے، اور اس میں دنیا و آخرت میں کوئی حقیقی فائدہ نہیں۔یہی وجہ ہے کہ اس آیت میں جادو سے بچنے کی سخت تاکید کی گئی ہے۔

جادوگروں کی حالت

اگر کبھی کسی جادوگر کے عمل سے کسی مسلمان کو وقتی فائدہ پہنچ بھی جائے، مثلاً کسی نقصان سے بچالے، تو یہ ایک استثناء ہی سمجھا جائے گا، ورنہ عمومی طور پر جادو محض نقصان ہی پہنچانے والی چیز ہے۔جادوگر عموماً بے دین اور بدعمل ہوتے ہیں۔کبھی کسی جادوگر کو یہ نہیں دیکھا گیا کہ وہ جادو کے زور پر دنیا کی دولت سمیٹ لے، جائیدادیں جمع کرلے یا حکومت پر قابض ہوجائے۔

جادوگر ہمیشہ بدحالی میں ہی نظر آتے ہیں۔دین و ایمان سے تو وہ پہلے ہی دور ہوتے ہیں، ساتھ ہی طہارت،

ذکر اور عبادت کی روشنی سے بھی محروم رہتے ہیں۔ دنیاوی اعتبار سے بھی وہ میلے کچیلے اور پھٹے پرانے کپڑوں میں زندگی گزارتے ہیں۔ ان کی گزر بسر تماشے دکھا کر اور دوسروں پر جادو کر کے چند ٹکوں کے عوض ہوتی ہے۔ محض تھوڑی سی دنیا کے لئے وہ دوسروں کو اذیت دیتے ہیں اور اس طرح اپنی دنیا و آخرت کی بربادی کو خود اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں۔

اسی پس منظر میں قرآن کہتا ہے: ''وَلَقَدْ عَلِمُوْا لَمَنِ اشْتَرٰىهُ مَا لَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ'' یعنی یہودیوں کو بخوبی معلوم تھا کہ جس نے اللہ کی کتاب کو چھوڑ کر جادو کا راستہ اختیار کیا، اس کا آخرت میں کوئی حصہ نہیں۔

اس کے باوجود انہوں نے جادو کو چنا اور کفر مول لیا۔ پھر فرمایا گیا: ''وَلَبِئْسَ مَا شَرَوْا بِهٖٓ اَنْفُسَهُمْ ؕ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ''۔

یعنی انہوں نے اپنی جانوں کو بیچ ڈالا، گویا ایمان اور آخرت کی نعمتوں کے بدلے جادو اور کفر خرید لیا۔ یوں وہ اپنی جانوں کو دائمی عذاب کا مستحق بنا بیٹھے۔ یہ نہایت برا سودا ہے، اگر وہ حقیقت کو سمجھتے تو کبھی ایسا نہ کرتے۔ (روح المعانی)

مفسرین نے یہاں سوال اٹھایا ہے کہ ایک جگہ تو فرمایا گیا ''وَلَقَدْ عَلِمُوْا'' یعنی وہ جانتے تھے، اور آگے کہا گیا ''لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ'' یعنی کاش وہ جانتے۔ بظاہر یہ اختلاف معلوم ہوتا ہے۔

اس کی توجیہ یہ کی گئی ہے کہ ان کا جاننا حقیقتاً نہ جاننے کے برابر تھا، کیونکہ جب آدمی نقصان کو جاننے کے باوجود اسے اختیار کرے اور ایمان سے منہ موڑ لے تو گویا وہ جاننے کے باوجود جاہل ہے۔ 'روح المعانی' میں یہ بھی لکھا ہے کہ وہ عذاب کے وجود کو تو جانتے تھے مگر اس کی شدت اور حقیقت کو نہیں سمجھتے تھے، اس لیے یہاں ''يَعْلَمُوْنَ'' کا مفعول محذوف ہے۔

تین قسم کے لوگ جنت میں داخل نہ ہوں گے

حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''تین قسم کے لوگ جنت میں داخل نہ ہوں گے: شراب کا عادی، رشتہ توڑنے والا اور جادو پر یقین رکھنے والا''۔ (مشکوۃ المصابیح، ۳۶۵۶)

حضرت سعدؓ روایت کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا: ''جو شخص صبح کے وقت سات عجوہ کھجوریں کھالے، اس پر اس دن نہ تو جادو کا اثر ہوگا اور نہ زہر کا''۔ (بخاری: ۵۷۶۹)

آیت نمبر (۱۰۳) وَلَوْ اَنَّهُمْ اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَمَثُوْبَةٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ خَيْرٌ ؕ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ۝۱۰۳

ترجمہ: ''اور اگر وہ ایمان لے آتے اور تقویٰ اختیار کرتے تو اللہ کے یہاں کا اجر ان کے لیے کہیں بہتر ہوتا، کاش وہ سمجھتے''۔

تفسیر

ایمان اور آخرت کا بدلہ

اگر یہ لوگ اللہ کے پیغمبروں پر ایمان لے آتے، جن میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایمان بھی شامل ہے، اور کفر و معصیت سے بچتے، تو اللہ تعالیٰ انہیں اس سے کہیں بہتر بدلہ عطا فرماتا جس کے بدلے میں انہوں نے اپنی جانیں بیچ ڈالیں۔ اگر وہ حقیقت جانتے تو آخرت کے ثواب کو کبھی ضائع نہ ہونے دیتے اور بھلائی کی طرف بڑھتے۔ آخرت کا تھوڑا سا حصہ بھی دنیا کے بڑے سے بڑے فائدے پر بھاری ہے۔

جادوگر کی سزا

روح المعانی کے مصنف نے لکھا ہے کہ حضرت امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک جادوگر کی سزا قتل ہے۔ اگر اس پر جادوگر ہونے کا ثبوت قائم ہوجائے تو اس کا یہ کہنا قابلِ قبول نہیں کہ میں توبہ کرتا ہوں یا آئندہ جادو نہیں کروں گا۔

شیطان کو راضی کرنے کی صورتیں

قرآن وسنت میں جادو ہر وہ عجیب وغریب عمل ہے جس میں شیاطین کو خوش کرکے ان کی مدد حاصل کی جائے۔ شیطانوں کو راضی کرنے کی کئی صورتیں ہیں۔ کبھی ایسے منتر پڑھنے پڑتے ہیں جن میں کفر وشرک کے الفاظ اور شیاطین کی تعریف ہوتی ہے، کبھی ستاروں کی پرستش کی جاتی ہے جس سے وہ خوش ہوتے ہیں۔ کبھی ایسے قبیح اعمال اپنائے جاتے ہیں جو شیطان کو محبوب ہیں، جیسے کسی کو جان بوجھ کر قتل کرکے اس کا خون استعمال کرنا، یا جنابت ونجاست کی حالت میں رہنا اور طہارت وپاکیزگی سے دور رہنا۔

قرآن وسنت میں جادو دراصل کفر اعتقادی ہے یا کم از کم کفر عملی سے خالی نہیں۔ اسی لئے اس کا سیکھنا، سکھانا اور اس پر عمل کرنا سب کے سب حرام ہیں۔ امام ابوحنیفہؒ اور امام مالکؒ کے نزدیک جادو سیکھنے اور اس پر عمل کرنے والا کافر ہے۔ البتہ امام ابوحنیفہؒ کے بعض شاگردوں کا قول ہے کہ اگر کوئی جادو کو محض بچاؤ کے لئے سیکھے تو کافر نہیں ہوگا، لیکن جو اس پر اعتقاد رکھے اور اسے نفع دینے والا سمجھے تو یہ بھی کافر ہے اور اس کی سزا قتل ہے۔

جادوگر کا حکم

ملا علی قاریؒ ''شرح فقہ اکبر'' میں لکھتے ہیں کہ جو جادو کفر کے درجے میں ہے، اس کا ارتکاب کرنے والا مرد مرتد ہونے کی وجہ سے قتل کیا جائے گا، لیکن جادوگر عورت کو قتل نہیں کیا جائے گا کیونکہ مرتد عورت کو قتل نہیں کیا جاتا، بلکہ وہ ہمیشہ کے لئے قید میں رہے گی۔ البتہ جو جادو فسق کے درجے میں ہو تو محض اس کی بنیاد پر قتل نہیں کیا جائے گا۔

ہاں! اگر اس کے نتیجے میں کسی کی جان لی گئی، بیماری ڈال دی گئی یا میاں بیوی کے درمیان جدائی ڈال دی گئی تو یہ ''فساد فی الارض'' ہے، اور ایسی صورت میں مرد جادوگر اور جادوگرنی دونوں کو قتل کیا جائے گا، کیونکہ یہ ارتداد نہیں بلکہ زمین پر فساد پھیلانے کا جرم ہے۔

سر جدا کرنے کے بعد کا واقعہ

حضرت جندب بن کعبؓ نے دیکھا کہ ایک شخص جادو کے کرتب دکھا رہا ہے۔ اس نے ایک انسان کو ذبح کیا، پھر اس کا سر جدا کر دیا اور بعد میں دوبارہ جوڑ دیا۔ یہ منظر دیکھ کر لوگ خوشی سے پکارنے لگے کہ سبحان اللہ! یہ تو مردوں کو زندہ کرتا ہے۔ حضرت جندبؓ نے فوراً تلوار کھینچی اور اس جادوگر کی گردن اڑا دی پھر فرمایا: اگر یہ سچا ہے تو اپنے آپ کو زندہ کر کے دکھائے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت جندبؓ کے بارے میں فرمایا تھا: ''یہ ایک ایسی تلوار کا وار کرے گا جس کی وجہ سے تنہا ایک امت کے برابر اجر پائے گا''۔ (الاصابہ ۱/۲۵۰)

چونکہ اس جادوگر کے کرتب سے لوگ گمراہ ہو کر یہ سمجھنے لگے تھے کہ وہ مردوں کو زندہ کرتا ہے، اس لئے اس کا قتل فتنے اور فساد کو ختم کرنے کے لئے ضروری ہو گیا۔

'تفسیر قرطبی' میں یہ واقعہ یوں بیان کیا گیا ہے کہ ''ولید بن عقبہ'' (امیرِ عراق) کے پاس ایک شخص کرتب دکھا رہا تھا۔ وہ کبھی رسی پر چلتا، اور کبھی گدھے کی دُم کے اندر سے داخل ہو کر اس کے منہ سے باہر نکل جاتا۔ حضرت جندبؓ نے یہ تماشہ دیکھا تو فوراً اس کو قتل کر دیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس موقع پر ارشاد فرمایا: ''میری امت میں ایک شخص ہوگا جسے جندب کہا جائے گا۔ وہ ایک مرتبہ ایسا تلوار کا وار کرے گا جو حق اور باطل کے درمیان فیصلہ کن فرق ڈال دے گا''۔

(تفسیر قرطبی، حصہ ۲، صفحہ ۴۷)

اگرچہ قرآن و حدیث کے الفاظ بذاتِ خود سراپا خیر ہیں، لیکن انہیں ناجائز مقاصد کے لئے استعمال کرنا درست نہیں۔ مثال کے طور پر کسی کو جان بوجھ کر نقصان پہنچانے کے لئے تعویذ دینا یا وظیفہ پڑھنا، چاہے وہ اللہ تعالیٰ کے اسماء الحسنیٰ پر مشتمل ہو یا قرآنی آیات پر، یہ سب حرام ہے۔

تعویذ گنڈے اور سحر

جو لوگ تعویذ گنڈے وغیرہ کرتے ہیں، وہ اکثر جنات اور شیاطین کی مدد سے یہ کام انجام دیتے ہیں، اور یہ سب سحر (جادو) کے حکم میں داخل ہے، لہٰذا حرام ہے۔ اسی طرح اگر کسی تعویذ یا کلمات کے الفاظ مشتبہ ہوں، ان کے معنی معلوم نہ ہوں، یا ان میں شیاطین اور بتوں سے مدد طلب کرنے کا احتمال ہو، تو وہ بھی ناجائز اور حرام ہے۔

❁❁❁

ترجمہ- آیت نمبر ۱۰۴ سے ۱۱۳ تک

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقُوْلُوْا رَاعِنَا وَقُوْلُوا انْظُرْنَا وَاسْمَعُوْا ؕ وَلِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۱۰۴﴾ مَا يَوَدُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ وَلَا الْمُشْرِكِيْنَ اَنْ يُّنَزَّلَ عَلَيْكُمْ مِّنْ خَيْرٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ ؕ وَاللّٰهُ يَخْتَصُّ بِرَحْمَتِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ﴿۱۰۵﴾ مَا نَنْسَخْ مِنْ اٰيَةٍ اَوْ نُنْسِهَا نَاْتِ بِخَيْرٍ مِّنْهَآ اَوْ مِثْلِهَا ؕ اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۱۰۶﴾ اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ ﴿۱۰۷﴾ اَمْ تُرِيْدُوْنَ اَنْ تَسْـَٔلُوْا رَسُوْلَكُمْ كَمَا سُئِلَ مُوْسٰى مِنْ قَبْلُ ؕ وَمَنْ يَّتَبَدَّلِ الْكُفْرَ بِالْاِيْمَانِ فَقَدْ ضَلَّ سَوَآءَ السَّبِيْلِ ﴿۱۰۸﴾ وَدَّ كَثِيْرٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ لَوْ يَرُدُّوْنَكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ اِيْمَانِكُمْ كُفَّارًا ۚ حَسَدًا مِّنْ عِنْدِ اَنْفُسِهِمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ الْحَقُّ ۚ فَاعْفُوْا وَاصْفَحُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۱۰۹﴾ وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ ؕ وَمَا تُقَدِّمُوْا لِاَنْفُسِكُمْ مِّنْ خَيْرٍ تَجِدُوْهُ عِنْدَ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴿۱۱۰﴾ وَقَالُوْا لَنْ يَّدْخُلَ الْجَنَّةَ اِلَّا مَنْ كَانَ هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى ؕ تِلْكَ اَمَانِيُّهُمْ ؕ قُلْ هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۱۱۱﴾ بَلٰى ۚ مَنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَلَهٗۤ اَجْرُهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ ۪ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۱۱۲﴾ وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ لَيْسَتِ النَّصٰرٰى عَلٰى شَيْءٍ ۪ وَّقَالَتِ النَّصٰرٰى لَيْسَتِ الْيَهُوْدُ عَلٰى شَيْءٍ ۙ وَّهُمْ يَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ ؕ كَذٰلِكَ قَالَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ مِثْلَ قَوْلِهِمْ ۚ فَاللّٰهُ يَحْكُمُ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فِيْمَا كَانُوْا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ﴿۱۱۳﴾

ترجمہ:

(۱۰۴)۔ اے ایمان والو! 'راعِنا' نہ کہا کرو بلکہ 'اُنظُرنا' کہا کرو اور توجہ سے سنو، اور کافروں کے لیے دردناک عذاب ہے۔ (۱۰۵)۔ وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا، اہلِ کتاب میں سے اور مشرکین میں سے، وہ نہیں چاہتے کہ تم پر تمہارے رب کی طرف سے کوئی بھلائی نازل کی جائے۔ لیکن اللہ جسے چاہتا ہے اپنی رحمت کے لیے منتخب کر لیتا ہے اور اللہ بڑا فضل والا ہے۔ (۱۰۶)۔ ہم جس آیت کو منسوخ کرتے ہیں یا بھلا دیتے ہیں، اس کی جگہ اس سے بہتر یا ویسی ہی دوسری آیت لے آتے ہیں۔ کیا تم نہیں جانتے کہ اللہ ہر چیز پر قادر ہے؟ (۱۰۷)۔ کیا تم نہیں جانتے کہ اللہ ہی کے لیے آسمانوں اور زمین کی بادشاہی ہے؟ اور اللہ کے سوا تمہارا نہ کوئی حمایتی ہے نہ مددگار۔ (۱۰۸)۔ کیا تم بھی اپنے رسول

سے اسی طرح سوالات کرنا چاہتے ہو جیسے اس سے پہلے موسیٰؑ سے کیے گئے تھے؟ اور جو شخص ایمان کے بدلے کفر کو اختیار کرے، تو وہ سیدھی راہ سے بھٹک چکا ہے۔(۱۰۹)۔ اہلِ کتاب میں سے اکثر لوگ چاہتے ہیں کہ کاش وہ تمہیں تمہارے ایمان لانے کے بعد دوبارہ کفر کی طرف لوٹا دیں، صرف حسد کی وجہ سے، حالانکہ ان پر حق ظاہر ہو چکا ہے۔ سو تم انہیں معاف کرو اور درگزر کرو یہاں تک کہ اللہ اپنا حکم نازل کر دے۔ بے شک اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔(۱۱۰)۔ اور تم نماز قائم کرو اور زکوٰۃ ادا کرو اور جو کچھ تم اپنے لیے بھلائی کے طور پر آگے بھیجو گے، وہ اللہ کے پاس پالو گے۔ بے شک اللہ تمہارے اعمال کو خوب دیکھ رہا ہے۔(۱۱۱)۔ اور وہ کہتے ہیں کہ جنت میں صرف یہودی یا نصرانی ہی داخل ہوں گے۔ یہ ان کی خواہشیں ہیں! ان سے کہو: اگر تم سچے ہو تو اپنی دلیل لے آؤ۔(۱۱۲)۔ کیوں نہیں! جو بھی اللہ کے لیے اپنا چہرہ جھکا دے (یعنی اس کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دے) اور وہ نیک عمل کرے، تو اس کے لیے اس کے رب کے پاس اجر ہے اور نہ ان پر کوئی خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔(۱۱۳)۔ یہود کہتے ہیں نصرانی کسی راہ پر نہیں، اور نصرانی کہتے ہیں یہود کسی راہ پر نہیں، حالانکہ وہ سب کتاب پڑھتے ہیں۔ اسی طرح کی بات وہ لوگ بھی کرتے ہیں جن کے پاس علم نہیں۔ سو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن ان کے درمیان فیصلہ کر دے گا، ان باتوں میں جن میں وہ اختلاف کرتے رہے۔

تفسیر-آیت نمبر ۱۰۴ سے ۱۱۳ تک

آیت نمبر(۱۰۴) يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقُوْلُوْا رَاعِنَا وَقُوْلُوا انْظُرْنَا وَاسْمَعُوْا ؕ وَلِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۱۰۴﴾

ترجمہ: ''اے ایمان والو! 'راعِنا' نہ کہا کرو بلکہ 'اُنظُرنا' کہا کرو اور توجہ سے سنو، اور کافروں کے لیے دردناک عذاب ہے''۔

تفسیر

لفظ 'راعِنَا' اور یہود کی شرارت

'ابن منذر' نے 'سدی' سے نقل کیا ہے کہ یہودیوں میں سے دو شخص، 'مالک بن سیف' اور 'رفاعہ بن یزید'، جب بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ملاقات کرتے تو ''راعنا'' کہا کرتے۔ ان کی بظاہر مراد یہ ہوتی کہ آپ ہم سے گفتگو فرمائیں، لیکن حقیقت میں وہ یہ کہہ کر آپ کی بات کو سننے سے پہلوتہی کرتے۔ مسلمانوں نے جب یہ سنا تو یہ سمجھا کہ یہ اہلِ کتاب اپنے انبیاء کی تعظیم کے لئے یہ لفظ استعمال کرتے ہیں، چنانچہ وہ بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے یہی لفظ کہنے لگے۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: ''اے ایمان والو! تم 'راعنا' نہ کہا کرو بلکہ 'انظرنا' کہا کرو''۔

ابونعیم نے 'دلائل' میں 'سدی صغیر'، ابو صالح اور حضرت ابن عباسؓ کے واسطے سے نقل کیا ہے کہ ''راعنا'' یہودیوں کی زبان میں نہایت گندی گالی تھی۔ یہودی یہ لفظ بول کر آپس میں ہنستے اور خوش ہوتے، تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔

حضرت سعد بن معاذؓ جب یہ آیت سن چکے تو انہوں نے یہودیوں سے کہا: ''اے اللہ کے دشمنو! اگر آج کے بعد میں نے تم میں سے کسی کو یہ کلمہ رسول اللہ ﷺ کے سامنے کہتے دیکھا تو اس کی گردن اڑا دوں گا''۔ **(تفسیر ابن عباس)**

شرارت کی حقیقت

یہ آیت دراصل یہودیوں کی شرارت کو ظاہر کرتی ہے۔ وہ جب رسول اللہ ﷺ کے پاس آتے تو ''راعنا'' کہہ کر خطاب کرتے۔ ''راعنا'' کا مطلب عبرانی زبان میں ''بیوقوف'' یا ''شیخی باز'' تھا، جبکہ عربی زبان میں اس کا مطلب ''ہماری طرف توجہ فرمایئے'' یا ''ہماری رعایت کیجئے'' بنتا ہے۔ عربی جاننے والے مسلمانوں کے لئے یہ فرق واضح نہ تھا، اس لئے وہ ان کی شرارت کو نہیں سمجھ پاتے تھے۔ کبھی یہودی زبان دبا کر ''راعنا'' کہتے جس کے معنیٰ ہوتے ''اے ہمارے چرواہے''۔

مسلمانوں کو ان بُرے معنوں اور یہود کی سازش کا علم نہ تھا۔ وہ یہ سمجھتے تھے کہ چونکہ یہ اہلِ کتاب اپنے انبیاء کے آداب سے واقف ہیں، اس لئے یہ لفظ ضرور تعظیم کے لئے ہوگا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمان بھی یہ لفظ استعمال کرنے لگے، اور یہود اور بھی خوش ہو گئے۔ اب وہ کہتے کہ ہم تو پہلے چھپ کر برائی کرتے تھے، لیکن اب ایسی ترکیب ہاتھ آ گئی ہے کہ علانیہ کہہ کر بھی ہم ان کا مذاق اڑائیں اور خود مسلمان بھی ہمارے ساتھ شریک ہو جائیں۔

حضرت سعد بن معاذؓ چونکہ یہودیوں کی زبان جانتے تھے، اس لئے انہوں نے فوراً محسوس کر لیا کہ یہودی ''راعنا یا محمد'' کہہ کر ہنستے ہیں۔ انہوں نے سختی سے کہا کہ اگر کسی نے آئندہ یہ لفظ استعمال کیا تو گردن ماردی جائے گی۔ یہودیوں نے کہا: تم بھی تو یہی لفظ بولتے ہو۔ اسی موقع پر یہ آیت نازل ہوئی: ''اے ایمان والو! تم 'راعنا' نہ کہا کرو بلکہ 'انظرنا' کہا کرو، یعنی ہماری طرف دیکھئے اور ہم پر توجہ فرمایئے''۔

نصیحت

یہ تعلیم دی گئی کہ ایسے الفاظ استعمال کئے جائیں جن کے معنیٰ میں کسی قسم کے بُرے یا مشتبہ مفہوم کا امکان نہ ہو، تاکہ دشمنوں کو اعتراض اور شرارت کا موقع نہ ملے۔ ساتھ ہی مسلمانوں کو ہدایت دی گئی کہ بات کو غور سے سنو اور پھر دوسروں تک پہنچاؤ۔ مزید فرمایا کہ کافروں کے لئے دردناک عذاب ہے، وہ اپنی مکاریوں اور شرارتوں کی سزا آخرت

میں ضرور پائیں گے۔ (معالم التنزیل، حصہ ۱، صفحہ ۱۰۲)

مذاق نہ اڑایا جائے

اوپر کی تفسیر سے یہ اصول سامنے آتا ہے کہ وہ الفاظ جن کے دو معنٰی ہوں، ایک اچھا اور دوسرا برا، ان کا استعمال جائز نہیں۔ ہاں، اگر کوئی ایسا قرینہ شامل کر دیا جائے جو اس لفظ کو صرف اچھے معنٰی کے لئے مخصوص کر دے تو پھر اجازت ہے۔ مزید یہ کہ کسی کا مذاق اڑانا سختی سے منع ہے اور وہ تمام الفاظ جن میں استہزا یا تمسخر کا شائبہ ہو، بولنے سے روکے گئے ہیں۔

مفسر ابن کثیرؒ فرماتے ہیں کہ ایمان والوں کو کافروں کی مشابہت اختیار کرنے سے منع کیا گیا ہے، خواہ وہ قول میں ہو یا عمل میں۔ پھر انہوں نے ''مسند احمد (حدیث: ۵۱۱۴)'' اور ''سنن ابی داؤد (حدیث: ۴۰۳۱)'' سے یہ حدیث نقل کی: ''جو شخص کسی قوم کی مشابہت اختیار کرے وہ انہی میں سے ہے''۔

اس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ کافروں کے ساتھ ان کے طور طریقوں میں مشابہت اختیار کرنا سخت منع ہے۔ چاہے وہ بات چیت کے انداز میں ہو، اعمال میں، لباس میں، تہواروں میں یا عبادت کے طریقوں میں۔

اچھے نام رکھنا

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ کسی کو ''مالک الملک'' یعنی ''شہنشاہ'' نہ کہا جائے، کیونکہ اصل بادشاہی صرف اللہ کی ہے۔ اسی طرح ایک لڑکی کا نام ''عاصیہ'' (گنہگار) تھا، تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کا نام بدل کر ''جمیلہ'' رکھ دیا۔ **(صحیح مسلم: ۵۶۰۴)**

ایک اور حدیث میں ہے کہ تم میں سے کوئی شخص اپنے غلام یا باندی کو ''عبدی'' (میرا بندہ) یا ''عمتی'' (میری بندی) نہ کہے، کیونکہ تم سب اللہ کے بندے ہو اور تمہاری سب عورتیں اللہ کی بندیاں ہیں۔ ان الفاظ کی بجائے ''غلامیاں'' اور ''جاریات'' کہا جائے۔

آیت نمبر (۱۰۵) مَا يَوَدُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ وَلَا الْمُشْرِكِيْنَ اَنْ يُّنَزَّلَ عَلَيْكُمْ مِّنْ خَيْرٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ ؕ وَاللّٰهُ يَخْتَصُّ بِرَحْمَتِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ﴿۱۰۵﴾

ترجمہ: ''وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا، اہلِ کتاب میں سے اور مشرکین میں سے، وہ نہیں چاہتے کہ تم پر تمہارے رب کی طرف سے کوئی بھلائی نازل کی جائے۔ لیکن اللہ جسے چاہتا ہے اپنی رحمت کے لیے

منتخب کر لیتا ہے اور اللہ بڑا فضل والا ہے''۔

تفسیر

یہودیوں کا حسد

جب مسلمان یہودیوں کو دعوت دیتے کہ وہ اسلام قبول کریں اور محمد رسول اللہ ﷺ پر ایمان لے آئیں تو یہودی جواب دیتے: ''جس دین کی طرف تم ہمیں بلاتے ہو وہ ہمارے دین سے بہتر نہیں ہے، اگر تمہارا دین برتر ہوتا تو ہم ضرور اس کو اختیار کرتے''۔

اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی کہ: ''اے مسلمانوں! یہ لوگ تمہارے لیے کسی قسم کی بھلائی کو پسند نہیں کرتے''۔ یہودی دراصل اس حسد میں مبتلا تھے کہ آخری نبی حضرت محمد ﷺ حضرت اسماعیل علیہ السلام کی نسل سے کیوں مبعوث ہوئے اور حضرت اسحاق علیہ السلام کی اولاد میں سے کیوں نہ آئے۔ دوسری طرف مشرکین اس لیے ناراض تھے کہ نبی اکرم ﷺ نے جو دین پیش کیا وہ ان کی خواہشات کے خلاف تھا۔ وہ توحید کے بجائے اپنے گھڑے ہوئے معبودوں سے محبت رکھتے تھے، چنانچہ جب ان باطل معبودوں کو رد کیا گیا تو یہ انہیں گراں گزرا۔

اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں واضح فرما دیا کہ تمہاری خواہشات کا وہ پابند نہیں۔ جسے چاہے اپنی رحمت کے لیے منتخب کرے، جسے چاہے نبوت عطا فرمائے اور جسے چاہے ہدایت بخش دے۔ اس فیصلے پر کسی کو اعتراض کرنے کا کوئی حق حاصل نہیں۔ **(روح المعانی، حصہ ۱، ص ۳۵۰)**

اسی لیے اللہ تعالیٰ نے یہاں مسلمانوں کو کافروں کی دشمنی سے آگاہ فرمایا تاکہ وہ ان کی سازشوں اور مکاریوں سے ہوشیار رہیں اور ساتھ ہی اللہ کا شکر بجا لائیں کہ اس نے انہیں حضرت محمد ﷺ کے ذریعے اسلام جیسی عظیم نعمت عطا فرمائی۔ **(ابن کثیر)**

آیت نمبر (۱۰۶) مَا نَنْسَخْ مِنْ اٰيَةٍ اَوْ نُنْسِهَا نَاْتِ بِخَيْرٍ مِّنْهَآ اَوْ مِثْلِهَا ؕ اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَىْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۱۰۶﴾

ترجمہ: ''ہم جس آیت کو منسوخ کرتے ہیں یا بھلا دیتے ہیں، اس کی جگہ اس سے بہتر یا ویسی ہی دوسری آیت لے آتے ہیں۔ کیا تم نہیں جانتے کہ اللہ ہر چیز پر قادر ہے؟''۔

تفسیر

احکام کی تبدیلی

یہود اپنی دشمنی مختلف طریقوں سے ظاہر کرتے تھے۔ کبھی قرآن اور اسلام پر اعتراض کرتے، کبھی مسلمانوں

کے دلوں میں شبہات ڈالتے اور کہتے: ''اگر یہ قرآن اللہ کی طرف سے ہے اور تمہاری شریعت واقعی آسمانی ہے تو اس نے تورات کے احکام کو کیوں منسوخ کیا؟ اور پھر اپنی ہی شریعت کے بعض احکام کو پہلے نافذ کر کے بعد میں ختم کیوں کر دیا؟'' مثال کے طور پر پہلے تمہارا قبلہ بیت المقدس تھا، پھر مسجد حرام کی طرف کر دیا گیا۔

یہودی چونکہ اللہ کے حکموں کے نسخ (یعنی تبدیلی یا منسوخی) کے قائل نہ تھے، اسی لیے وہ انجیل اور قرآن کو بھی تسلیم نہ کرتے، کیونکہ ان میں تورات کے بعض احکام منسوخ ہو گئے تھے۔ اسی بنیاد پر وہ ان کتابوں کے انبیاء کی نبوت کو بھی ماننے سے انکار کر دیتے تھے۔ اس موقع پر اللہ تعالیٰ نے ان کے اعتراض کا جواب دیا۔

نسخ کا مفہوم

اس آیت میں قرآن مجید کے ''نسخ'' یعنی کسی حکم کے ختم یا تبدیل کیے جانے کی تمام صورتوں کو واضح کر دیا گیا ہے۔ لغوی طور پر ''نسخ'' کے معنیٰ ہیں: مٹانا، بدل دینا، بیکار کرنا، یا نقل کرنا۔ لیکن شریعت میں ''نسخ'' سے مراد یہ ہے کہ ایک حکم کو ختم کر کے اس کی جگہ دوسرا حکم جاری کر دیا جائے۔ یہ تبدیلی کئی صورتوں میں واقع ہوتی ہے:

پہلی صورت

کبھی قرآن کی آیت کے الفاظ تو باقی رہتے ہیں مگر اس کا حکم منسوخ ہو جاتا ہے۔ اسے ''منسوخ الحکم'' کہتے ہیں۔ مثال کے طور پر بیوہ عورت کے لیے عدت ایک سال مقرر تھی، بعد میں یہ حکم چار مہینے دس دن کر دیا گیا۔ مگر وہ آیت جس میں ایک سال کا ذکر ہے، قرآن میں اب بھی موجود ہے: ''مَتَاعًا اِلَى الْحَوْلِ غَيْرَ اِخْرَاجٍ''۔

دوسری صورت

کبھی آیت کی تلاوت منسوخ ہو جاتی ہے مگر حکم باقی رہتا ہے۔ اسے ''منسوخ التلاوت'' کہا جاتا ہے۔ اس کی مثال آیتِ رجم ہے۔

تیسری صورت

کبھی پہلا حکم منسوخ کر کے اس کی جگہ دوسرا حکم دیا جاتا ہے۔ مثلاً: ''پہلے نماز کا رخ بیت المقدس کی طرف تھا، پھر کعبہ کی طرف کر دیا گیا۔'' ابتدا میں قریبی رشتہ داروں کے لیے وصیت واجب تھی، پھر یہ حکم آیاتِ میراث سے منسوخ ہو گیا۔

چوتھی صورت

کچھ مواقع پر پہلا حکم تو منسوخ کر دیا گیا مگر اس کی جگہ دوسرا حکم نازل نہیں ہوا۔ مثال کے طور پر سورہ ممتحنہ کی

آیت اِذَا جَآءَ كُمُ الْمُؤْمِنٰتُ اسی زمرے میں آتی ہے۔

''ننسہا'' یعنی بھلا دینا

آیت میں ''نَنْسَخْ'' کے ساتھ ''نُنْسِهَا'' بھی آیا ہے، جس کے معنی ''بھلا دینے'' کے ہیں۔ یعنی بعض آیات ایسی تھیں جنہیں بالکل ہی قرآن سے اور لوگوں کے حافظے سے مٹا دیا گیا۔ بعض بزرگوں کا قول ہے کہ سورہ احزاب اور سورہ بقرہ کے بعض حصے ایسے تھے جو اٹھا لیے گئے، نہ ان کی تلاوت باقی رہی نہ ان کے احکام۔

درمنثور میں حضرت سہل بن حنیفؓ سے روایت ہے کہ ایک صحابی تہجد میں وہ سورت پڑھنے کھڑے ہوئے جو انہیں یاد تھی، لیکن ''بسم اللہ الرحمن الرحیم'' کے سوا کچھ نہ پڑھ سکے۔ یہی کیفیت کئی دوسرے صحابہ پر بھی اس رات طاری ہوئی۔ صبح کو جب رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں عرض کیا گیا تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''یہ سورت گزشتہ رات منسوخ کر دی گئی ہے، اسے لوگوں کے سینوں سے بھی مٹا دیا گیا اور جہاں جہاں وہ لکھی ہوئی تھی وہاں سے بھی اٹھا لی گئی''۔ (معالم التنزیل، حصہ ۱، ص ۱۰۴)

آیت نمبر (۱۰۷) اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ ﴿۱۰۷﴾

ترجمہ: ''کیا تم نہیں جانتے کہ اللہ ہی کے لیے آسمانوں اور زمین کی بادشاہی ہے؟ اور اللہ کے سوا تمہارا نہ کوئی حمایتی ہے نہ مددگار''۔

تفسیر اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''کیا تم نہیں جانتے کہ اللہ ہر چیز پر قادر ہے؟'' وہ جس حکم کو چاہے باقی رکھ سکتا ہے اور جسے چاہے منسوخ کر سکتا ہے۔ حتیٰ کہ انسانوں کے اذہان سے کسی حکم کو بھلا دینا بھی اسی کی قدرت میں ہے۔ وہ اپنی حکمت کے مطابق جو چاہتا ہے کرتا ہے؛ جس حکم کو باقی رکھنا چاہے رکھے اور جسے چاہے منسوخ کر دے۔ بندوں کو اس میں اعتراض کا کوئی حق حاصل نہیں۔ اگر کوئی اللہ کے فیصلوں پر نکتہ چینی کرے گا تو انجام کار اس کے نتائج بھگتے گا۔ آسمانوں اور زمین کی بادشاہت تنہا اسی کے ہاتھ میں ہے۔ جب وہ کافروں پر اپنا عذاب نازل کرے گا تو ان کے لیے نہ کوئی مددگار ہوگا نہ کوئی دوست جو انہیں اس کی پکڑ سے بچا سکے۔

آیت نمبر (۱۰۸) اَمْ تُرِيْدُوْنَ اَنْ تَسْـَٔلُوْا رَسُوْلَكُمْ كَمَا سُئِلَ مُوْسٰى مِنْ قَبْلُ ؕ وَمَنْ يَّتَبَدَّلِ الْكُفْرَ بِالْاِيْمَانِ فَقَدْ ضَلَّ سَوَآءَ السَّبِيْلِ ﴿۱۰۸﴾

ترجمہ: ''کیا تم بھی اپنے رسول سے اسی طرح سوالات کرنا چاہتے ہو جیسے اس سے پہلے موسیٰؑ سے کیے گئے تھے؟ اور جو شخص ایمان کے بدلے کفر کو اختیار کرے، تو وہ سیدھی راہ سے بھٹک چکا ہے''۔

آیت نازل ہونے کے مختلف مواقع

ابن حاتم نے 'سعید' اور 'عکرمہؓ' کے واسطے سے حضرت ابن عباسؓ سے روایت کی ہے کہ ''رافع بن حرمالہ'' اور ''وہب بن زید'' نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا: ''ہمارے پاس کوئی ایسی کتاب لائیے جو براہِ راست آسمان سے اتری ہوتا کہ ہم خود اسے پڑھ سکیں، یا ہمارے لیے نہریں جاری کر دی جائیں تاکہ ہم آپ کی پیروی کریں اور آپ کی تصدیق کریں''۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی:

''اَمْ تُرِيْدُوْنَ اَنْ تَسْئَلُوْا رَسُوْلَكُمْ كَمَا سُئِلَ مُوْسٰى مِنْ قَبْلُ ۭ وَمَنْ يَّتَبَدَّلِ الْكُفْرَ بِالْاِيْمَانِ فَقَدْ ضَلَّ سَوَاۗءَ السَّبِيْلِ''۔

● اسی طرح 'ہوی بن اخطب' اور 'ابو یاسر بن اخطب' یہودیوں میں سے تھے، جو بھرپور کوشش کرتے تھے کہ لوگوں کو اسلام سے روکیں۔ ان کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی: ''وَدَّ كَثِيْرٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ...''

● ابن جریر نے مجاہد سے روایت کیا ہے کہ قریش نے رسول اللہ ﷺ سے کہا: ''صفا پہاڑ کو سونے کا کر دیجئے''۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''اگر یہ مطالبہ پورا کر دیا گیا اور تم پھر بھی نہ مانے تو تم پر بھی وہی عذاب آئے گا جو بنی اسرائیل پر آیا تھا''۔ لیکن وہ اپنی ضد سے باز نہ آئے تو یہ آیت نازل ہوئی: ''اَمْ تُرِيْدُوْنَ..''

● سدیؒ نے بیان کیا ہے کہ بعض عربوں نے رسول اللہ ﷺ سے کہا: ''ہمارے پاس اللہ کو لے آیئے تاکہ ہم بغیر پردے کے اس کا دیدار کر سکیں''۔ اس پر بھی یہی آیت نازل ہوئی۔

● اسی طرح اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''وَمَنْ يَّعْمَلْ سُوْۗءًا اَوْ يَظْلِمْ نَفْسَهٗ...'' یعنی جو برائی کرے یا اپنے اوپر ظلم ڈھائے، پھر توبہ کرے اور مغفرت مانگے تو اللہ بخشنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔ چنانچہ نمازیں اور جمعہ سے جمعہ تک درمیانی گناہوں کا کفارہ ہیں۔ اس موقع پر بھی یہی آیت نازل کی گئی۔

● 'معالم التنزیل' میں اس آیت کے دو شانِ نزول بیان ہوئے ہیں:

۱۔ یہودیوں نے کہا: ''اے محمد ﷺ! آپ بھی آسمان سے ایک پوری کتاب لے آیئے جیسی موسیٰؑ تورات لے کر آئے تھے''۔

۲۔ مشرکینِ مکہ نے کہا: ''ہم اس وقت تک نہیں مانیں گے جب تک اللہ اور فرشتوں کو ہمارے سامنے نہ لے آؤ''۔

ممکن ہے کہ یہ آیت ان دونوں کے مطالبوں کے جواب میں اتری ہو۔ اللہ تعالیٰ نے تنبیہ فرمائی کہ ایسے فضول اور ضد پر مبنی سوالات نہ کرو جیسے بنی اسرائیل نے حضرت موسیٰؑ سے کیے تھے۔ انہوں نے کہا تھا: ''اَرِنَا اللّٰهَ جَهْرَةً'' (ہمیں اللہ کو کھلم کھلا دکھا دیجئے)۔

یہ وہ سوالات تھے جن کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ اور جنہیں اعتراض کرنا ہو، وہ خواہ جتنی نشانیاں دیکھ لیں، ایمان نہیں لاتے۔ حضرت موسیٰؑ پوری کتاب ایک ساتھ لائے تھے، پھر بھی ان میں سے کئی لوگوں نے انکار کیا۔ جیسا کہ قصص میں ہے: ''فَلَمَّا جَآءَهُمُ الْحَقُّ مِنْ عِنْدِنَا قَالُوْا لَوْلَآ اُوْتِيَ مِثْلَ مَآ اُوْتِيَ مُوْسٰى...''

یعنی جب ان کے پاس ہماری طرف سے حق آیا تو کہنے لگے: اسے وہی کچھ کیوں نہ دیا گیا جو موسیٰؑ کو دیا گیا تھا؟ حالانکہ وہ موسیٰؑ کو دی گئی کتاب کے بھی منکر ہو چکے تھے اور کہنے لگے: ''یہ دونوں (موسیٰؑ اور ہارونؑ) جادوگر ہیں، جو ایک دوسرے کی مدد کر رہے ہیں۔ ہم تو دونوں کے منکر ہیں''۔

بلاضرورت سوالات

'صحیح مسلم' میں حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''اے لوگو! تم پر حج فرض کیا گیا ہے، لہٰذا حج ادا کرو''۔ یہ سن کر ایک شخص نے سوال کیا: ''یا رسول اللہ! کیا ہر سال حج فرض ہے؟'' آپ ﷺ خاموش رہے، یہاں تک کہ اس نے تین بار یہی سوال دہرایا۔ اس پر آپ ﷺ نے فرمایا: ''اگر میں ہاں کہہ دیتا تو یہ ہر سال فرض ہو جاتا اور تم اس پر عمل نہ کر پاتے''۔ پھر فرمایا: ''جب تک میں کسی چیز کا حکم نہ دوں تم بھی سوال کرنے سے باز رہو۔ تم سے پہلے قومیں اسی لیے ہلاک ہوئیں کہ وہ ضرورت سے زیادہ سوال کرتی تھیں اور اپنے انبیاء کی نافرمانی کرتی تھیں۔ پس جب میں کسی چیز کا حکم دوں تو اپنی استطاعت کے مطابق اس پر عمل کرو اور جب کسی چیز سے روک دوں تو اسے چھوڑ دو''۔ **(مسلم، رقم: ۳۲۵۷)**

● اسی طرح ایک اور حدیث میں حضرت مغیرہ بن شعبہؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے تین چیزیں ناپسند کی ہیں: بال کی کھال کھودنا (یعنی بے فائدہ باریک بینی کرنا)، کثرتِ سوال، اور مال ضائع کرنا''۔ **(بخاری: ۵۹۷۵)**

گو آیت کا شانِ نزول وہی ہے جو ''معالم التنزیل'' میں بیان ہوا، لیکن اس کے ساتھ مسلمانوں کو یہ نصیحت بھی مل گئی کہ احکامِ دین میں فضول اور بے محل سوالات نہ کریں بلکہ صرف وہی پوچھیں جو واقعی ضرورت ہو۔

● حضرت ابو ہریرہؓ ہی سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جسے میں چھوڑ دوں تم بھی چھوڑ دو۔ تم

سے پہلی امتیں اپنے نبیوں سے حد سے زیادہ سوالات اور ان کی نافرمانیوں کی وجہ سے ہلاک کر دی گئیں۔ پس جب میں تمہیں کسی چیز سے منع کروں تو فوراً رک جاؤ اور جب کسی بات کا حکم دوں تو اسے پورے طور پر بجالاؤ''۔ (مسلم، رقم:۱۳۳۷)

اسی بات کو سورۂ مائدہ میں اس طرح بیان کیا گیا: ''اے ایمان والو! ایسی باتیں مت پوچھو کہ اگر وہ تم پر ظاہر کر دی جائیں تو تمہارے لیے ناگواری کا سبب بنیں''۔ (سورۃ المائدہ)

اسی طرح ایک مرتبہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''مسلمانوں میں سب سے بڑا گناہ گار وہ شخص ہے جس کے فضول سوال کرنے کی وجہ سے کوئی چیز، جو پہلے حلال تھی، حرام کر دی گئی''۔ (بخاری، رقم:۷۲۸۹)

آیت نمبر (۱۰۹) وَدَّ كَثِيْرٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ لَوْ يَرُدُّوْنَكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ اِيْمَانِكُمْ كُفَّارًا ۚ حَسَدًا مِّنْ عِنْدِ اَنْفُسِهِمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ الْحَقُّ ۚ فَاعْفُوْا وَاصْفَحُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝۱۰۹

ترجمہ: ''اہلِ کتاب میں سے اکثر لوگ چاہتے ہیں کہ کاش وہ تمہیں تمہارے ایمان لانے کے بعد دوبارہ کفر کی طرف لوٹا دیں، صرف حسد کی وجہ سے، حالانکہ ان پر حق ظاہر ہو چکا ہے۔ سو تم انہیں معاف کرو اور درگزر کرو یہاں تک کہ اللہ اپنا حکم نازل کر دے۔ بے شک اللہ ہر چیز پر قادر ہے''۔

تفسیر یہودیوں پر یہ بات اچھی طرح روشن ہو چکی تھی کہ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم واقعی اللہ کے سچے نبی ہیں، مگر حسد نے انہیں ایمان لانے سے روک دیا۔ اسی حسد کے باعث وہ ہر ممکن کوشش کرتے کہ دوسرے لوگ اسلام قبول نہ کریں اور جو ایمان لے آتے انہیں بھی بہلا پھسلا کر دوبارہ اپنے مذہب کی طرف لوٹا لیں۔ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو ان کے ان خفیہ ارادوں سے آگاہ کر دیا تاکہ وہ ان کی میٹھی باتوں اور جھوٹی ہمدردیوں کے جال میں نہ پھنسیں۔

چونکہ مسلمان اور یہودی ایک ہی شہر، مدینہ منورہ، میں ساتھ رہتے تھے اور اس وقت مسلمانوں کی ظاہری طاقت نمایاں نہ ہوئی تھی، اس لیے اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو حکم دیا کہ صبر اور درگزر سے کام لو اور اس کے فیصلے کا انتظار کرو۔ اللہ ہی قادر ہے کہ تمہیں ان پر غلبہ عطا کرے۔ چنانچہ وہ دن بھی آیا کہ قبیلہ ''بنونضیر'' کو مدینہ سے جلاوطن کر کے خیبر کی طرف بھیج دیا گیا اور دوسرے قبیلے ''بنوقریظہ'' کے مردوں کو کیفرِ کردار تک پہنچا دیا گیا۔

آیت نمبر (۱۱۰) وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ ۭ وَمَا تُقَدِّمُوْا لِاَنْفُسِكُمْ مِّنْ خَيْرٍ تَجِدُوْهُ عِنْدَ اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ۝۱۱۰

ترجمہ: ''اور تم نماز قائم کرو اور زکوٰۃ ادا کرو اور جو کچھ تم اپنے لیے بھلائی کے طور پر آگے بھیجو گے، وہ اللہ کے پاس پالو گے۔ بے شک اللہ تمہارے اعمال کو خوب دیکھ رہا ہے''۔

تفسیر

صبر وصلوٰۃ

ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ نماز قائم کرو، زکوٰۃ ادا کرتے رہو اور جو نیکیاں اپنی جانوں کے لیے آگے بھیجو گے وہ سب اللہ کے یہاں محفوظ رہیں گی اور وہاں تمہیں ضرور ملیں گی۔ یہاں اعمالِ صالحہ میں مشغول رہنے اور جان ومال دونوں سے عبادت ادا کرتے رہنے کی تلقین کی گئی ہے، جیسا کہ ''وَاعْفُوا وَاصْفَحُوا'' میں صبر کا حکم دیا گیا ہے۔

صبر اور نماز، اللہ تعالیٰ کی مدد حاصل کرنے کے بہترین ذرائع ہیں، جسے قرآن نے صاف لفظوں میں بیان فرمایا: ''وَاسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ''۔ نیک اعمال کی تاثیر یہ بھی ہے کہ وہ دشمن پر غلبہ عطا کرتے ہیں، دنیا میں کامیابی کا ذریعہ بنتے ہیں اور آخرت میں اجر وثواب کا سبب۔ جو خیر یہاں سے آگے بھیجی جائے گی، وہ اللہ کے ہاں جمع رہے گی اور جب بندہ وہاں پہنچے گا تو وہ اس کا پورا بدلہ پالے گا۔

آخر میں فرمایا گیا: ''اِنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ'' یعنی اللہ تعالیٰ تمہارے تمام اعمال پر نگاہ رکھتا ہے، خیر ہو یا شر، سب اس کے علم میں ہے۔ جو نیکی یا برائی بندہ اپنے ساتھ لے کر حاضر ہوگا، وہ اسی کے مطابق جزا یا سزا پائے گا۔

● حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''جو شخص حلال کمائی سے ایک کھجور کے برابر بھی صدقہ کرے (اور اللہ تعالیٰ صرف حلال ہی قبول کرتا ہے) تو اللہ تعالیٰ اسے قبول فرماتا ہے اور اس کی پرورش کرتا رہتا ہے، یہاں تک کہ وہ پہاڑ جتنا بڑا ہو جاتا ہے، جیسے تم میں سے کوئی اپنے گھوڑے کے بچے کی پرورش کرتا ہے۔''

(بخاری: ۱۴۱۰)

آیت نمبر (۱۱۱) وَقَالُوْا لَنْ يَّدْخُلَ الْجَنَّةَ اِلَّا مَنْ كَانَ هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى ؕ تِلْكَ اَمَانِيُّهُمْ ؕ قُلْ هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۱۱۱﴾

ترجمہ: ''اور وہ کہتے ہیں کہ جنت میں صرف یہودی یا نصرانی ہی داخل ہوں گے۔ یہ ان کی خواہشیں ہیں! ان سے کہو: اگر تم سچے ہو تو اپنی دلیل لے آؤ''۔

تفسیر ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے یہود ونصاریٰ کے گھمنڈ کو بے نقاب فرمایا ہے۔ ان دونوں گروہوں میں سے ہر ایک یہ دعویٰ کرتا تھا کہ جنت میں داخلہ صرف اسی کے دین کے پیروکاروں کے لیے مخصوص ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے

اس زعم باطل کو رد کرتے ہوئے فرمایا کہ یہ محض تمہاری بے بنیاد آرزوئیں ہیں، ایسی تمنائیں جن کی صداقت پر تمہارے پاس کوئی دلیل موجود نہیں۔ اگر واقعی تم اپنے دعوے میں سچے ہو تو اپنی سچائی پر کوئی دلیل پیش کرو۔

آیت نمبر (۱۱۲) بَلٰی ۚ مَنۡ اَسۡلَمَ وَجۡهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحۡسِنٌ فَلَهٗۤ اَجۡرُهٗ عِنۡدَ رَبِّهٖ ۪ وَلَا خَوۡفٌ عَلَيۡهِمۡ وَلَا هُمۡ يَحۡزَنُوۡنَ ﴿۱۱۲﴾

ترجمہ: ''کیوں نہیں! جو بھی اللہ کے لیے اپنا چہرہ جھکا دے (یعنی اس کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دے) اور وہ نیک عمل کرے، تو اس کے لیے اس کے رب کے پاس اجر ہے اور نہ ان پر کوئی خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے''۔

تفسیر ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے یہود و نصاریٰ کے زعم باطل کو ایک مرتبہ پھر رد فرمایا۔ ان کا یہ دعویٰ کہ جنت صرف انہی کے لیے ہے، حقیقت سے خالی ہے۔ جنت تو ہر اس شخص کا نصیب ہوگی جو خالص توحید پر قائم ہو، اپنے اعمال میں اخلاص رکھتا ہو اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنت کا پابند ہو۔ اس اصول سے یہ حقیقت واضح ہوگئی کہ یہود و نصاریٰ جنت میں داخل نہیں ہوں گے، کیونکہ نہ وہ توحید کے قائل ہیں، نہ اعمال میں اخلاص رکھتے ہیں اور نہ ہی سنت کے پابند ہیں۔

● حافظ ابن کثیرؒ فرماتے ہیں کہ عمل کے قبول ہونے کی دو بنیادی شرطیں ہیں: پہلی شرط یہ کہ عمل خالصتاً اللہ کے لیے ہو، اور دوسری یہ کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنت اور شریعت کے مطابق ہو۔ اگر نیت میں اخلاص ہو لیکن عمل سنت کے مطابق نہ ہو تو وہ عمل مردود قرار پائے گا، جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''جس نے کوئی ایسا عمل کیا جس کا ہم نے حکم نہیں دیا تو وہ رد کر دیا جائے گا''۔ **(بخاری: ۲۶۹۷)**

اسی طرح اگر کوئی عمل بظاہر شریعت کے مطابق ہو لیکن اس کی نیت اللہ کی رضا کے بجائے کسی اور غرض کے لیے ہو تو وہ عمل بھی بارگاہِ الٰہی میں قبول نہیں ہوگا۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے سورہ نساء میں فرمایا: ''بیشک منافقین اللہ کو دھوکہ دینا چاہتے ہیں''۔ **(النساء: ۴۲)**

آیت نمبر (۱۱۳) وَقَالَتِ الۡيَهُوۡدُ لَيۡسَتِ النَّصٰرٰى عَلٰى شَىۡءٍ ۖ وَّقَالَتِ النَّصٰرٰى لَيۡسَتِ الۡيَهُوۡدُ عَلٰى شَىۡءٍ ۙ وَّهُمۡ يَتۡلُوۡنَ الۡكِتٰبَ ؕ كَذٰلِكَ قَالَ الَّذِيۡنَ لَا يَعۡلَمُوۡنَ مِثۡلَ قَوۡلِهِمۡ ۚ فَاللّٰهُ يَحۡكُمُ بَيۡنَهُمۡ يَوۡمَ الۡقِيٰمَةِ فِيۡمَا كَانُوۡا فِيۡهِ يَخۡتَلِفُوۡنَ ﴿۱۱۳﴾

ترجمہ: ''یہود کہتے ہیں نصرانی کسی راہ پر نہیں، اور نصرانی کہتے ہیں یہود کسی راہ پر نہیں، حالانکہ وہ

سب کتاب پڑھتے ہیں۔ اسی طرح کی بات وہ لوگ بھی کرتے ہیں جن کے پاس علم نہیں۔ سو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن ان کے درمیان فیصلہ کردے گا، ان باتوں میں جن میں وہ اختلاف کرتے رہے''۔

تفسیر

آیت کے نازل ہونے کا سبب

تفسیر درمنثور میں حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ جب نجران کے نصاریٰ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے تو یہودی علما بھی وہاں پہنچ گئے۔ دونوں فریقوں کے درمیان بحث شروع ہوگئی۔

یہودیوں نے حضرت عیسیٰؑ کی نبوت اور انجیل کے اللہ کی کتاب ہونے کا انکار کیا۔ اس پر نصاریٰ میں سے ایک شخص نے جواباً یہودیوں سے کہا: ''تم کسی چیز پر نہیں ہو''، یعنی تمہارے دین کی کوئی حقیقت یا بنیاد نہیں۔ اس ردّعمل میں وہ اس حد تک بڑھ گئے کہ حضرت موسیٰؑ کی نبوت اور تورات کے کتاب اللہ ہونے ہی کا انکار کر بیٹھے۔

اللہ تعالیٰ نے ان کے اس طرزِ عمل کو بیان کرتے ہوئے فرمایا: ''وَهُمْ يَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ'' حالانکہ ہر فریق اللہ کی کتاب کی تلاوت کرتا ہے۔ یعنی وہ رسولوں اور آسمانی کتابوں کو جانتے بھی ہیں اور پڑھتے بھی ہیں، مگر اس کے باوجود انکار کرتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ہر گروہ کو دوسرے گروہ کے بارے میں بخوبی معلوم تھا کہ تحریف کے باوجود ان کی نسبت کسی نہ کسی طرح اللہ کی کتاب اور رسول سے جڑی ہوئی ہے، مگر محض ضد اور کفر کی وجہ سے ایک دوسرے کی تکذیب کرتے رہے، اور یہ نسبت ان کے لیے نجات کا ذریعہ نہ بن سکی۔

یہود کی دشمنی

اس سے ان کے باہمی بغض اور شدید دشمنی کا اندازہ ہوتا ہے۔ حالانکہ اہل کتاب ہونے کا تقاضا تو یہ تھا کہ وہ ایک دوسرے کو نہ جھٹلاتے، کیونکہ تورات اور انجیل ایک دوسرے کی تصدیق کرتی ہیں۔ درحقیقت اللہ تعالیٰ کی تمام آسمانی کتابیں ایک دوسرے کی موافقت اور تائید میں نازل ہوئیں۔ مگر معاملہ یہاں تک جا پہنچا کہ بت پرست، جن کے پاس نہ کوئی علم ہے اور نہ کوئی آسمانی کتاب، وہ بھی اہل کتاب کے بارے میں یہی کہتے تھے کہ یہ لوگ ہدایت پر نہیں ہیں۔ اس اشارے میں یہ حقیقت پوشیدہ ہے کہ اہل کتاب نے اپنی باہمی عداوت کی وجہ سے وہی روش اختیار کر لی جو بت پرستوں کی تھی، اور بالآخر انہی کی مانند ہو گئے۔

خلاصہ

اسی طرح امتِ محمدیہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں بھی بعض جماعتیں ایسی پیدا ہوئیں جنہوں نے زبان سے تو قرآن کی پیروی کا دعویٰ کیا، مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنت کا انکار کر دیا۔ حتیٰ کہ کچھ لوگ قرآن وسنت دونوں کی اتباع کا دعویٰ کرتے ہیں،

لیکن ان کا عمل سنت کے خلاف ہوتا ہے۔ مختلف تاویلوں کے ذریعے وہ سنت کو اپنی زندگی سے خارج کر دیتے ہیں۔

حالانکہ رسول اللہ ﷺ نے صراحت کے ساتھ فرمایا: ''میں تمہارے درمیان دو چیزیں چھوڑے جا رہا ہوں۔ اگر تم ان دونوں کو مضبوطی سے تھامے رکھو گے تو میرے بعد کبھی گمراہ نہ ہوگے: اللہ کی کتاب اور میری سنت''۔ **(مستدرک حاکم: ۳۱۹)**

❁❁❁

ترجمہ- آیت نمبر ۱۱۴ سے ۱۲۱ تک

وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ مَّنَعَ مَسٰجِدَ اللّٰهِ اَنْ يُّذْكَرَ فِيْهَا اسْمُهٗ وَسَعٰى فِيْ خَرَابِهَا ؕ اُولٰٓئِكَ مَا كَانَ لَهُمْ اَنْ يَّدْخُلُوْهَآ اِلَّا خَآئِفِيْنَ ؕ لَهُمْ فِي الدُّنْيَا خِزْيٌ وَّلَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ﴿۱۱۴﴾ وَلِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ ۚ فَاَيْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ﴿۱۱۵﴾ وَقَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا ۙ سُبْحٰنَهٗ ؕ بَلْ لَّهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ كُلٌّ لَّهٗ قٰنِتُوْنَ ﴿۱۱۶﴾ بَدِيْعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ وَاِذَا قَضٰٓى اَمْرًا فَاِنَّمَا يَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ﴿۱۱۷﴾ وَقَالَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ لَوْلَا يُكَلِّمُنَا اللّٰهُ اَوْ تَاْتِيْنَآ اٰيَةٌ ؕ كَذٰلِكَ قَالَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ مِّثْلَ قَوْلِهِمْ ؕ تَشَابَهَتْ قُلُوْبُهُمْ ؕ قَدْ بَيَّنَّا الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ ﴿۱۱۸﴾ اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ بِالْحَقِّ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا ۙ وَّلَا تُسْـَٔلُ عَنْ اَصْحٰبِ الْجَحِيْمِ ﴿۱۱۹﴾ وَلَنْ تَرْضٰى عَنْكَ الْيَهُوْدُ وَلَا النَّصٰرٰى حَتّٰى تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ ؕ قُلْ اِنَّ هُدَى اللّٰهِ هُوَ الْهُدٰى ؕ وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَآءَهُمْ بَعْدَ الَّذِيْ جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ ۙ مَا لَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ ﴿۱۲۰﴾ اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَتْلُوْنَهٗ حَقَّ تِلَاوَتِهٖ ؕ اُولٰٓئِكَ يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ ؕ وَمَنْ يَّكْفُرْ بِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ﴿۱۲۱﴾

ترجمہ:

(۱۱۴)۔اور اس شخص سے بڑھ کر ظالم کون ہوسکتا ہے جو اللہ کی مسجدوں میں اس کا نام لینے سے روکے اور ان کی بربادی کی کوشش کرے؟ ایسے لوگوں کو ان میں داخل ہونے کا بھی حق نہیں، مگر ڈرتے ہوئے۔ان کے لیے دنیا میں رسوائی ہے اور آخرت میں بڑا عذاب۔(۱۱۵)۔اور مشرق اور مغرب اللہ ہی کے لیے ہیں، لہٰذا تم جدھر بھی رخ کرو، اُدھر ہی اللہ کا رخ ہے۔ بے شک اللہ وسعت والا اور سب کچھ جاننے والا ہے۔(۱۱۶)۔اور انہوں نے کہا کہ اللہ نے اولاد بنالی ہے۔ وہ پاک ہے (اس سے)، بلکہ جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے، سب اسی کا ہے اور سب اسی کے فرمانبردار ہیں۔(۱۱۷)۔وہ آسمانوں اور زمین کا موجد ہے، جب وہ کسی کام کا فیصلہ کرتا ہے تو صرف یہی کہتا ہے کہ 'ہوجا' تو وہ ہوجاتا ہے۔(۱۱۸)۔اور ان لوگوں نے کہا جنہیں علم نہیں، کہ کیوں نہیں اللہ ہم سے خود بات کرتا یا ہمارے پاس کوئی نشانی آتی؟ اسی طرح کی باتیں ان لوگوں نے بھی کیں جو ان سے پہلے تھے۔ان سب کے دل ایک جیسے ہیں۔ہم نے تو نشانیاں بیان کردی ہیں ان لوگوں کے لیے جو یقین رکھتے ہیں۔(۱۱۹)۔اے نبی! ہم نے آپ کو حق کے ساتھ

خوشخبری دینے والا اور ڈرانے والا بنا کر بھیجا ہے اور آپ سے دوزخ والوں کے بارے میں نہیں پوچھا جائے گا۔ (۱۲۰)۔اور یہود و نصاریٰ آپ سے کبھی راضی نہیں ہوں گے جب تک آپ ان کے طریقے پر نہ چلیں۔ کہہ دیجئے! بے شک اللہ ہی کی ہدایت اصل ہدایت ہے۔اور اگر آپ نے ان کی خواہشات کی پیروی کی، اس کے بعد کہ علم آچکا ہے، تو آپ کا اللہ کے مقابلے میں نہ کوئی مددگار ہوگا اور نہ کوئی حمایتی۔(۱۲۱)۔وہ لوگ جنہیں ہم نے کتاب دی، وہ اس کی تلاوت کرتے ہیں جیسے تلاوت کا حق ہے۔یہی لوگ اس پر ایمان لاتے ہیں اور جو اس کا انکار کرے، تو وہی نقصان اٹھانے والے ہیں۔

تفسیر-آیت نمبر ۱۱۴ سے ۱۲۱ تک

آیت نمبر (۱۱۴) وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ مَّنَعَ مَسٰجِدَ اللّٰهِ اَنْ يُّذْكَرَ فِيْهَا اسْمُهٗ وَسَعٰى فِيْ خَرَابِهَا ؕ اُولٰٓئِكَ مَا كَانَ لَهُمْ اَنْ يَّدْخُلُوْهَآ اِلَّا خَآئِفِيْنَ ؕ لَهُمْ فِي الدُّنْيَا خِزْيٌ وَّلَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ﴿۱۱۴﴾

ترجمہ: ''اور اس شخص سے بڑھ کر ظالم کون ہوسکتا ہے جو اللہ کی مسجدوں میں اس کا نام لینے سے روکے اور ان کی بربادی کی کوشش کرے؟ ایسے لوگوں کو ان میں داخل ہونے کا بھی حق نہیں، مگر ڈرتے ہوئے۔ان کے لیے دنیا میں رسوائی ہے اور آخرت میں بڑا عذاب''۔

مسجد میں ذکر سے روکنا

تفسیر اس آیتِ کریمہ میں اُن لوگوں کو بدترین ظالم قرار دیا گیا ہے جو اللہ کی مسجدوں میں آنے سے روکتے ہیں، یا ان میں اللہ کا نام لینے اور عبادت کرنے سے منع کرتے ہیں، یا پھر ان کے ویران کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔سوال یہ ہے کہ یہ لوگ کون تھے جن کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی؟

معالم التنزیل (ص: ۱۰۷) میں حضرت عطا اور عبدالرحمن بن زید سے منقول ہے کہ یہ آیت مشرکینِ مکہ کے بارے میں نازل ہوئی۔سنِ ہجرت کے چھٹے سال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے صحابہ کرامؓ کے ساتھ عمرہ کی نیت سے مکہ مکرمہ تشریف لے گئے، مگر قریش نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حدیبیہ کے مقام پر روک دیا اور مسجدِ حرام تک پہنچنے نہ دیا۔

مسجد کو آباد کرنے کا مطلب

مسجد کو آباد کرنے سے مراد یہ ہے کہ اس میں وہ اعمال انجام دیے جائیں جن کے لیے وہ بنی ہیں؛ مثلاً نماز،

تلاوتِ قرآن، ذکر واذکار اور اعتکاف وغیرہ۔ خاص طور پر مسجدِ حرام کی آبادی میں طواف بھی شامل ہے۔ جو شخص ان امور سے روکے، وہ دراصل مسجد کو ویران کرنے والا ہے۔

مشرکینِ مکہ اس وقت مسجدِ حرام کے متولی تھے لیکن انہوں نے خانہ کعبہ کے اندر بت رکھ دیے تھے۔ ان کے نزدیک صرف ظاہری عمارت کی حفاظت ہی "آبادی" تھی، جب کہ وہ حقیقی مقصد سے غافل تھے۔ وہاں شرک کے اعمال رائج تھے اور نمازیوں کو نماز پڑھنے تک نہیں دی جاتی تھی۔ انہی کی زیادتیوں کی وجہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور صحابہؓ کو ہجرت کرنا پڑی، اور جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم عمرہ کی نیت سے تشریف لے گئے تو پھر بھی روک دیا گیا۔ بہت سمجھایا گیا کہ عمرہ کر کے لوٹ جائیں گے مگر انہوں نے ضد نہ چھوڑی۔ آخر کار آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم صحابہؓ کے ہمراہ واپس لوٹ آئے اور اگلے سال قضا عمرہ ادا فرمایا۔

آیتِ کریمہ میں یہ بشارت دی گئی کہ عنقریب مکہ پر مسلمانوں کو غلبہ حاصل ہوگا اور مشرکین اس میں خوف زدہ ہو کر داخل ہوں گے۔ اسی اعلان کے تحت بعد میں یہ حکم آیا کہ آئندہ سے کوئی مشرک حج نہ کرے۔ **(معالم التنزیل، ج۱، ص۱۰۷)**

یہود و نصاریٰ کی روش

بعض مفسرین کے نزدیک اس آیت میں یہود و نصاریٰ کا ذکر ہے جنہوں نے مختلف ادوار میں بیت المقدس کی بے حرمتی کی۔ حضرت مجاہدؒ کے مطابق اس سے مراد نصاریٰ ہیں جو مسجد میں گندگی اور تکلیف دہ اشیاء پھینک دیتے اور نمازیوں کو روکتے تھے۔ قتادہؒ کے نزدیک رومی مراد ہیں جنہوں نے یہودیوں کے حسد میں بخت نصر کی مدد کی اور بیت المقدس کو اجاڑنے میں حصہ لیا۔ کعب الاحبارؒ نے فرمایا کہ جب نصاریٰ بیت المقدس پر غالب آئے تو انہوں نے اسے جلا کر خاک کر دیا۔

قرآن کا عمومی حکم

نزولِ آیات کا پس منظر خواہ مشرکینِ مکہ ہوں یا اہلِ کتاب، قرآن کا عمومی بیان یہ بتاتا ہے کہ مسجدوں میں اللہ کا ذکر روکنا بدترین ظلم ہے۔

البتہ اگر کوئی ایسی جماعت مسجد میں داخل ہونا چاہے جو اسلام کے دائرے سے خارج ہو، مثلاً کسی جھوٹے مدعی نبوت پر ایمان لانے والے (جیسے قادیانی وغیرہ)، تو انہیں مسجد سے روک دینا درست ہے۔ یہ ذکرِ الٰہی سے روکنا نہیں بلکہ مسلمانوں کو کفر و گمراہی سے بچانا ہے۔ ایسے لوگ جب اس آیت کو اپنے حق میں پیش کرتے ہیں تو قرآن ہی کی ایک اور آیت ان کا رد کرتی ہے:

''اور اس سے بڑا ظالم کون ہوسکتا ہے جو اللہ پر جھوٹ باندھے یا کہے کہ مجھ پر وحی آئی ہے حالانکہ اسے وحی نہ دی گئی ہو، یا جو یہ کہے کہ جیسا اللہ نے اتارا ہے ویسا میں بھی اتاروں گا''۔ **(سورہ انعام: ۹۳)**

عمومی اطلاق

کچھ مفسرین نے فرمایا کہ آیتِ کریمہ ''أُولٰئِكَ مَا كَانَ لَهُمْ أَنْ يَدْخُلُوهَا إِلَّا خَائِفِينَ'' صرف مسجدِ حرام تک محدود نہیں بلکہ تمام مساجد کو شامل ہے۔ **(تفسیر ابن کثیر، ج۱، ص۱۵۷)**

حدیثِ قدسی

حدیثِ قدسی میں ارشاد ہے: ''ابن آدم نے مجھے جھٹلایا حالانکہ اسے یہ حق نہ تھا اور اس نے مجھے گالی دی حالانکہ یہ بھی اس کا حق نہ تھا۔ اس کا مجھے جھٹلانا یہ ہے کہ وہ کہتا ہے کہ میں پہلی بار پیدا کرنے کے بعد دوبارہ زندہ کرنے پر قادر نہیں اور اس کا مجھے گالی دینا یہ ہے کہ وہ کہتا ہے کہ میری اولاد ہے، حالانکہ میں اس عیب سے پاک ہوں کہ میری کوئی بیوی یا اولاد ہو''۔ **(صحیح بخاری، کتاب التفسیر، باب ۸، حدیث ۴۴۸۲)**

اللہ تعالیٰ کا وعدہ

اللہ تعالیٰ نے مومنوں سے یہ وعدہ فرمایا ہے کہ وہ ان کی مدد کرے گا اور مساجد کو کافروں کے تسلط سے آزاد کرے گا۔ 'صاحب روح المعانی' لکھتے ہیں: ''الحمدللہ! اللہ تعالیٰ نے اپنا وعدہ پورا فرمایا اور بیت المقدس مسلمانوں کے قبضے میں آ گیا۔ نصرانی اگر کبھی اس میں داخل ہوتے بھی تو خفیہ طور پر، اپنی شکل وصورت بدل کر داخل ہوتے''۔ پھر انہوں نے قتادہ کا قول نقل کیا ہے کہ اگر کوئی نصرانی بیت المقدس میں پایا جاتا تو اسے سخت سزا دی جاتی تھی۔

روح المعانی کے مصنف مزید فرماتے ہیں: ''اگر یہ سوال کیا جائے کہ بیت المقدس دوبارہ نصاریٰ کے قبضے میں چلا گیا اور پھر صلاح الدین ایوبیؒ نے اسے دوبارہ فتح کیا، تو اس پر اعتراض نہیں کیا جا سکتا۔ اس لیے کہ آیت میں کوئی ایسا لفظ موجود نہیں جو اس بات پر دلالت کرے کہ بیت المقدس ہمیشہ مسلمانوں ہی کے قبضے میں رہے گا۔ جب اللہ تعالیٰ نے اسے مسلمانوں کے اختیار میں دیا تھا تو ان پر لازم تھا کہ اسے قائم رکھتے۔ لیکن جب ایمان اور اعمال میں کمزوری آئی اور تدبیر وحوصلہ کمزور پڑ گیا تو مسجد اقصیٰ ہاتھ سے نکل گئی۔ یہ ان کا قصور اور ایمانی تقاضوں کے خلاف طرزِ عمل تھا''۔

بعض مفسرین نے آیتِ کریمہ ''أُولٰئِكَ مَا كَانَ لَهُمْ أَنْ يَدْخُلُوهَا إِلَّا خَائِفِينَ'' کی تفسیر میں لکھا ہے کہ ان لوگوں کو چاہیے تھا کہ وہ کبھی بھی بے باکی اور گستاخی کے ساتھ مسجد میں داخل نہ ہوں۔ اگر جانا بھی ہوتا تو نہایت خوف و ادب، عظمت و حرمت کے ساتھ داخل ہوتے۔ جب انہیں بے باکی کے ساتھ داخلے کا حق ہی حاصل نہیں تو

حرمت شکنی کا حق کہاں سے حاصل ہوسکتا ہے؟ یہی طرزِ عمل ان کا ظلم قرار دیا گیا۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ آیت میں مسجد کے احترام اور ادب کو بیان کیا گیا ہے، اور یہی معنی زیادہ قرینِ صواب ہیں، واللہ اعلم۔

دنیا و آخرت کی رسوائی

پھر ارشاد فرمایا گیا: ''لَهُمْ فِي الدُّنْيَا خِزْيٌ وَّلَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيْمٌ''۔

یعنی دنیا میں ان لوگوں کے لیے رسوائی ہے اور آخرت میں ان کے لیے بڑا عذاب ہے۔ وہ تمام قومیں جو مسجد حرام یا بیت المقدس میں اللہ کے ذکر اور عبادت سے روکتی رہیں اور ان کے ویران کرنے کی کوشش کرتی رہیں، دنیا میں ذلیل و مغلوب ہوئیں۔ کبھی مسلمانوں کی حکومت کے تحت رہیں اور جزیہ دینے پر مجبور ہوئیں۔ اور آخرت میں ان سب کافروں کے لیے سخت اور عظیم عذاب ہوگا۔ قرآن مجید نے بار بار اس انجام کو یاد دلایا ہے۔

آیت نمبر (۱۱۵) وَلِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ ۚ فَاَيْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ﴿۱۱۵﴾

ترجمہ: ''اور مشرق اور مغرب اللہ ہی کے لیے ہیں، لہٰذا تم جدھر بھی رخ کرو، اُدھر ہی اللہ کا رخ ہے۔ بے شک اللہ وسعت والا اور سب کچھ جاننے والا ہے''۔

وہ کسی رخ میں موجود نہیں

تفسیر اس سلسلے میں مفسرین نے تین واقعات بیان کیے ہیں جن میں اس آیت کے نزول کا ذکر آتا ہے۔ تینوں واقعات کا خلاصہ یہ ہے کہ صحابہ کرام سفر میں تھے۔ اندھیری رات (اور بعض روایات کے مطابق بادل کی وجہ سے) قبلے کے بارے میں اشتباہ پیدا ہوگیا۔ ہر ایک نے اپنے فہم اور غور و فکر کے مطابق جس سمت کو قبلہ سمجھا، اسی جانب رخ کر کے نماز ادا کر لی۔ صبح ہوئی تو حقیقت منکشف ہوئی اور غلطی کا پتا چلا۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اس واقعے کا ذکر کیا گیا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خاموشی اختیار فرمائی۔ اسی وقت اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔ ان ہی واقعات میں سے ایک کا ذکر *سنن ترمذی* کی ''ابواب التفسیر'' میں بھی موجود ہے۔

حضرت ابن عمرؓ روایت کرتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مکہ سے مدینہ آتے وقت اپنی سواری پر نفل نماز ادا فرما رہے تھے۔ جس سمت سواری کا رخ ہوتا، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اسی طرف رخ کر لیتے۔ پھر انہوں نے یہی آیت تلاوت کی اور فرمایا کہ یہ آیت اسی موقع پر نازل ہوئی۔ (مسلم: ۱۶۱۱)

حضرت قتادہؓ فرماتے ہیں کہ یہ آیت منسوخ ہے اور اس کا ناسخ یہ حکم ہے: ''فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ''۔(اپنا رخ نماز کی حالت میں مسجد حرام کی طرف کرو، سورہ بقرہ: ۱۴۴)

اس آیت کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ پورب اور پچھّم ہی کا نہیں بلکہ تمام سمتوں کا مالک ہے۔ شمال اور جنوب بھی اسی کی ملکیت ہیں، جیسا کہ ارشاد ہے: ''فَلَآ اُقْسِمُ بِرَبِّ الْمَشَارِقِ وَالْمَغَارِبِ اِنَّا لَقٰدِرُوْنَ ''۔(المعارج: ۴۰)

چونکہ معبود صرف وہی ہے اور سب قبلے اسی کی مخلوق ہیں، اس لئے اختیار بھی اسی کو حاصل ہے کہ جس سمت کو چاہے قبلہ قرار دے۔ اگر وہ بیت المقدس کو قبلہ بنائے تو اسی کا حکم معتبر ہے، اگر کعبہ کو قبلہ مقرر کرے تو یہ بھی اس کی مرضی ہے، بلکہ اگر وہ کسی اور سمت میں نماز پڑھنے کی اجازت دے دے تو بھی اختیار اسی کو ہے۔ عبادت گذاروں کے لئے حکم خداوندی ہی اصل ہے، کسی کو اس پر اعتراض کا حق نہیں۔

اللہ ہر جہت میں ہے

اللہ تعالیٰ جسم یا مکان سے پاک ہے اور کسی سمت کا محتاج نہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جدھر بھی رخ کرو گے، اللہ وہیں ہے۔ یعنی اس نے جس جانب رخ کرنے کا حکم دیا ہے، اسی سمت نماز پڑھنے میں اس کی رضا پوشیدہ ہے۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ یہ آیت سفر میں نفل نماز پڑھنے کے بارے میں نازل ہوئی۔ آپ ﷺ مکہ سے مدینہ تشریف لا رہے تھے اور اپنی سواری پر نفل ادا کر رہے تھے۔ سواری جدھر بھی متوجہ ہوتی، آپ ﷺ نماز جاری رکھتے۔(نسائی: ۴۹۲)

حضرت انس بن سیرین فرماتے ہیں کہ ہم نے حضرت انس بن مالکؓ کا استقبال کیا جب وہ شام سے واپس آ رہے تھے۔ ہم نے دیکھا کہ وہ راستے میں سواری پر نماز پڑھ رہے ہیں اور قبلہ کی سمت کے بجائے بائیں جانب رخ تھا۔ میں نے کہا: ''میں دیکھ رہا ہوں کہ آپ قبلے کے سوا دوسری طرف نماز پڑھ رہے ہیں! تو انہوں نے فرمایا: ''اگر میں نے رسول اللہ ﷺ کو ایسا کرتے نہ دیکھا ہوتا تو میں ہرگز ایسا نہ کرتا''۔(مسلم: ۱۶۲۰)

اللہ کی وسعت اور علم

آیت کے آخر میں فرمایا: ''اِنَّ اللّٰهَ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ''یعنی اللہ نے اپنے بندوں کے دین میں وسعت رکھی ہے اور وہ کوئی ایسا حکم نہیں دیتا جو انسان کی طاقت سے باہر ہو۔ بعض حضرات کے نزدیک 'واسع' کے معنیٰ یہ ہیں کہ اس کا علم ہر شے کو محیط ہے۔ جیسا کہ فرمایا: ''وَسِعَ كُلَّ شَيْءٍ عِلْمًا ''۔(طٰہٰ: ۹۸)

'الفراء' کا قول ہے کہ 'واسع' کے معنیٰ ''سخی اور عطا کرنے والا'' ہیں، یعنی اس کا دین سب کے لئے آسان اور

عام ہے۔ بعض مفسرین کے مطابق یہاں ''واسع المغفرۃ'' مراد ہے، یعنی کوئی گناہ ایسا نہیں جسے معاف کرنا اس کے لئے مشکل ہو۔ (قرطبی، حصہ ۲، ص ۸۴)

روح المعانی میں ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی ملکیت اور رحمت کے اعتبار سے ہر چیز کا احاطہ کئے ہوئے ہے۔ اس لئے اس نے قبلے کے معاملے میں آسانی رکھی اور تنگی نہیں فرمائی۔ وہ بندوں کی مصلحتوں کو خوب جانتا ہے، ان کے اعمال سے باخبر ہے اور ان کے دلوں کے حال سے بھی واقف ہے۔ وہ سب کو ان کے علم اور اخلاص کے مطابق بدلہ دے گا۔

استقبالِ قبلہ کے مسائل

نماز کی بنیادی شرائط میں سے ایک شرط قبلہ رخ ہونا ہے۔ غیر قبلہ کی طرف رخ کر کے نماز پڑھنے سے نماز درست نہیں ہوتی۔ البتہ اگر کسی شخص کو دشمن قبلہ رخ ہونے سے روک دے تو جس سمت میں وہ سہولت سے نماز پڑھ سکتا ہو، وہی سمت اس کے لئے قبلہ شمار ہوگی۔

اگر کسی جگہ کوئی شخص یا جماعت موجود ہو اور قبلہ کا تعین مشکل ہو جائے اور وہاں رہنمائی کرنے والا بھی نہ ہو تو ہر فرد اپنی استطاعت کے مطابق غور وفکر کرے اور جس سمت پر دل کو اطمینان ہو اسی طرف رخ کر کے نماز پڑھ لے۔ اگر نماز کے دوران ہی معلوم ہو جائے کہ قبلہ دوسری جانب ہے تو فوراً اسی سمت رخ کر لے، نماز دہرانے کی حاجت نہیں۔

اسی طرح اگر غور وخوض کے بعد قبلہ متعین کر کے نماز ادا کی اور نماز کے بعد معلوم ہوا کہ رخ درست نہ تھا، تو پھر بھی نماز لوٹانے کی ضرورت نہیں۔

اگر اندھیری رات میں چند مسلمان جمع ہوں اور سب کو قبلہ معلوم نہ ہو تو ہر ایک اپنے اجتہاد کے مطابق نماز ادا کر سکتا ہے۔ اگر ان میں سے ایک امام بن جائے اور مقتدیوں کو یہ علم نہ ہو کہ امام کس طرف رخ کئے ہوئے ہے تو ان سب کی نماز درست ہو جائے گی۔ لیکن اگر کسی مقتدی کو یقین ہو کہ امام کا رخ غلط سمت میں ہے اور وہ جان بوجھ کر اس کی اقتدا کرتا ہے تو اس کی نماز درست نہ ہوگی، کیونکہ وہ اپنے امام کو خطا پر سمجھتے ہوئے اس کی پیروی کر رہا ہے۔

اسی طرح اگر کوئی مقتدی امام سے آگے کھڑا ہو جائے، حتیٰ کہ امام کا چہرہ اس مقتدی کی پشت کی طرف ہو، تو ایسی اقتدا بھی صحیح نہیں۔

نوٹ: فرض نماز غیر قبلہ کی طرف رخ کر کے درست نہیں، سوائے اس کے کہ قبلہ معلوم نہ ہو اور کوئی بتانے والا بھی نہ ہو۔ ایسی صورت میں اجتہاد وغور وفکر کے بعد جو سمت متعین ہو اسی طرف نماز درست ہوگی۔ سفر میں ریل یا جہاز کے اندر بھی عام طور پر قبلہ رخ ہو کر نماز ادا کرنا ممکن ہوتا ہے۔

رخ کی حکمت

قبلہ کے لئے ایک خاص رخ مقرر کرنے میں کئی حکمتیں اور مصلحتیں پوشیدہ ہیں۔ اگر رخ مقرر نہ کیا جاتا اور ہر شخص کو اختیار ہوتا کہ جس سمت چاہے نماز ادا کرے تو اس میں اختلاف اور انتشار پیدا ہوتا۔ لیکن جب ایک ہی سمت کو قبلہ قرار دے دیا گیا تو اس میں اتحاد اور یگانگت کا عظیم سبق موجود ہے۔

ہجرت کے بعد ابتدائی ایک سال بیت المقدس کی طرف رخ کر کے نماز پڑھی گئی، پھر کعبہ شریف کو قبلہ قرار دیا گیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ اصل مقصود صرف اللہ تعالیٰ کی عبادت ہے۔ جس سمت اللہ کا حکم ہوا سی رخ کو قبلہ مان کر نماز پڑھنا بندگی کی علامت ہے۔ رخ یا عمارت کی عبادت نہیں ہوتی بلکہ اس کے ذریعے اللہ ہی کی عبادت مقصود ہوتی ہے۔

یہ وضاحت اس اعتراض کو بھی ختم کر دیتی ہے جو مشرکین کرتے ہیں کہ مسلمان کعبہ کو سجدہ کرتے ہیں، حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ مسلمان رخ تو کعبہ کی طرف کرتے ہیں مگر عبادت صرف اللہ کی کرتے ہیں۔ اس کے برعکس مشرکین بتوں کے سامنے جھکتے ہیں اور انہی کو معبود بناتے ہیں، چاہے وہ زبان سے یہ دعویٰ کریں کہ ہم ان کے ذریعے اصل خدا تک پہنچتے ہیں۔

اسی طرح بیت المقدس کو پہلے قبلہ اور بعد میں کعبہ شریف کو قبلہ قرار دینے سے یہ حقیقت کھل کر سامنے آ گئی کہ کسی بھی رخ کی تقدیس بذاتِ خود مقصود نہیں، بلکہ اطاعتِ الٰہی اور عبادتِ خالصہ ہی اصل مقصد ہے۔ جب کعبہ شریف کو قبلہ قرار دیا گیا تو پوری دنیا کے مسلمانوں کو اسی رخ پر جمع کر دیا گیا۔ اس طرح جب مشرق و مغرب، شمال و جنوب کے مسلمان نماز میں کھڑے ہوتے ہیں تو سب کا رخ مختلف سمتوں سے کعبہ کی طرف ہوتا ہے اور ''فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ'' (جس طرف بھی رخ کرو، اللہ کی ذات وہیں ہے) کا مفہوم پورے طور پر نمایاں ہو جاتا ہے۔

آیت نمبر (۱۱۶) وَقَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا سُبْحٰنَهٗ ؕ بَلْ لَّهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ كُلٌّ لَّهٗ قٰنِتُوْنَ ﴿۱۱۶﴾

ترجمہ: ''اور انہوں نے کہا کہ اللہ نے اولاد بنالی ہے۔ وہ پاک ہے (اس سے)، بلکہ جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے، سب اسی کا ہے اور سب اسی کے فرمانبردار ہیں''۔

اللہ تعالیٰ کے لئے اولاد

تفسیر اس آیت میں یہود، نصاریٰ اور مشرکینِ عرب کے ان بے بنیاد عقائد کو باطل قرار دیا گیا ہے جن میں وہ کبھی

عزیرؑ کو، کبھی مسیحؑ ابنِ مریم کو اللہ کا بیٹا قرار دیتے اور کبھی فرشتوں کو اللہ کی بیٹیاں کہتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے اعلان فرمایا کہ وہ ان سب جھوٹے دعووں سے بالکل پاک ہے۔

یہود کہتے تھے کہ ''عزیر اللہ کا بیٹا ہے'' اور نصاریٰ کہتے تھے کہ ''مسیح ابنِ مریم اللہ کے بیٹے ہیں۔'' اللہ تعالیٰ نے واضح فرمایا کہ زمین و آسمان میں جو کچھ ہے سب اس کی مخلوق ہے۔ وہ جب کسی چیز کو پیدا کرنا چاہتا ہے تو صرف ''کن'' کہتا ہے اور وہ فوراً وجود میں آجاتی ہے۔ ایسی قدرت رکھنے والی ہستی کو اولاد کی کیا حاجت ہوسکتی ہے؟

حضرت ابو ہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ابنِ آدم نے مجھے جھٹلایا حالانکہ یہ اس کے شایانِ شان نہیں تھا، اور مجھے گالی دی حالانکہ یہ بھی اس کے لائق نہ تھا۔ اس کا مجھے جھٹلانا یہ ہے کہ وہ کہتا ہے: اللہ مجھے دوبارہ پیدا نہیں کرے گا، حالانکہ دوبارہ پیدا کرنا میرے لئے پہلی بار پیدا کرنے سے زیادہ مشکل نہیں۔ اور اس کا مجھے گالی دینا یہ ہے کہ وہ کہتا ہے: اللہ نے اپنے لئے بیٹا بنایا ہے۔ حالانکہ میں ایک ہوں، بے نیاز ہوں، نہ میری کوئی اولاد ہے نہ میں کسی کی اولاد ہوں اور نہ کوئی میرے برابر ہے۔'' **(بخاری: ۴۹۷۴)**

زمین و آسمان اور ان کے درمیان موجود ہر شے اللہ کی ملکیت ہے۔ سب اسی کے حضور عاجزی و انکساری سے جھکے ہوئے ہیں۔ پھر مخلوق میں سے کوئی کس طرح اللہ کا بیٹا ہوسکتا ہے؟ اولاد تو نر و مادہ کے تعلق سے وجود میں آتی ہے، حالانکہ نہ اللہ کی کوئی زوجہ ہے اور نہ اس کا کوئی شریک۔ پس اولاد کا تصور ہی اس کی شان کے خلاف ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اللہ سے زیادہ صبر کرنے والا کوئی نہیں۔ لوگ اس کے لئے اولاد ثابت کرتے ہیں اور بیٹے کا دعویٰ کرتے ہیں، لیکن وہ پھر بھی انہیں روزی دیتا ہے اور راحت پہنچاتا ہے، یعنی پوری مخلوق اسی کی نگہبانی اور کفالت میں ہے۔'' **(بخاری: ۷۳۷۸)**

آیت نمبر (۱۱۷) بَدِيْعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ وَاِذَا قَضٰٓى اَمْرًا فَاِنَّمَا يَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ﴿۱۱۷﴾

ترجمہ: ''وہ آسمانوں اور زمین کا موجد ہے، جب وہ کسی کام کا فیصلہ کرتا ہے تو صرف یہی کہتا ہے کہ 'ہوجا' تو وہ ہوجاتا ہے''۔

تفسیر اللہ تعالیٰ نے آسمان اور زمین کا بے مثال موجد ہے۔ جس طرح اس نے مسیحؑ کو بغیر کسی باپ کے 'کن' لفظ سے پیدا کیا تھا کہ جب وہ کسی چیز کے ہوجانے کا فیصلہ کرتا ہے تو 'کن' (یعنی ہوجا) کہتا ہے اور وہ چیز اللہ کے ارادے کے مطابق وجود میں آجاتی ہے۔

آیت نمبر (۱۱۸) وَقَالَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ لَوْ لَا يُكَلِّمُنَا اللّٰهُ اَوْ تَاْتِيْنَآ اٰيَةٌ ؕ كَذٰلِكَ قَالَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ مِّثْلَ قَوْلِهِمْ ؕ تَشَابَهَتْ قُلُوْبُهُمْ ؕ قَدْ بَيَّنَّا الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ ﴿۱۱۸﴾

ترجمہ: ''اور ان لوگوں نے کہا جنہیں علم نہیں، کہ کیوں نہیں اللہ ہم سے خود بات کرتا یا ہمارے پاس کوئی نشانی آتی؟ اسی طرح کی باتیں ان لوگوں نے بھی کیں جو ان سے پہلے تھے۔ ان سب کے دل ایک جیسے ہیں۔ ہم نے تو نشانیاں بیان کر دی ہیں ان لوگوں کے لیے جو یقین رکھتے ہیں''۔

تفسیر 'ابن جریر' اور 'ابن حاتم' نے حضرت ابن عباسؓ سے روایت نقل کی ہے، وہ فرماتے ہیں کہ 'رافع بن خزیمہ' نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے عرض کیا: ''اگر واقعی آپ اللہ کے رسول ہیں جیسا کہ آپ دعویٰ کرتے ہیں تو اللہ تعالیٰ سے کہیے کہ وہ ہم سے براہِ راست کلام کرے تا کہ ہم اس کا کلام اپنے کانوں سے سن سکیں''۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی: ''وَقَالَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ''۔

عبدالرزاق نے ثوری، موسیٰ بن عبیدہ اور محمد بن کعب قرظیؓ کے واسطے سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''کاش مجھے معلوم ہوتا کہ میرے والدین کا انجام کیا ہوا''۔

اس پر یہ آیات نازل ہوئیں: ''اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ.....'' یعنی ''ہم نے آپ کو حق کے ساتھ خوشخبری دینے والا اور ڈرانے والا بنا کر بھیجا ہے۔ آپ سے دوزخیوں کے بارے میں کوئی سوال نہیں کیا جائے گا''۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی حیاتِ مبارکہ کے بقیہ دنوں میں والدین کا ذکر نہیں کیا۔ یہ روایت مرسل ہے۔

اسی طرح ابن جریر نے ابن جریج کے واسطے سے داؤد بن ابی عاصم سے روایت کی ہے کہ ایک دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''میرے والدین کہاں ہیں؟'' اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ یہ روایت بھی مرسل ہے۔ (تفسیر ابن عباس)

''ربیع بن انس، قتادہ اور سدی' وغیرہ کی رائے یہ ہے کہ یہ آیت مشرکینِ عرب کے بارے میں نازل ہوئی۔ ان لوگوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کہا تھا: ''اگر واقعی تم اللہ کے رسول ہو تو اللہ خود ہم سے کیوں نہیں بات کرتا تا کہ ہمیں یقین ہو جائے کہ اس نے تمہیں رسول بنا کر بھیجا ہے''۔

ان کے نزدیک ''اَلَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ'' سے مراد یہود و نصاریٰ ہیں۔ مشرکین ہمیشہ اپنی مرضی کی نشانیاں طلب کرتے اور شرارت انگیز سوالات کرتے۔ وہ کہتے: ''ہم اللہ کو اپنی آنکھوں سے دیکھنا چاہتے ہیں''۔ ''اگر تم واقعی رسول ہو تو تمہارے ساتھ ایک فرشتہ کیوں نہیں ہوتا جو تمہاری رسالت کی گواہی دیتا اور لوگوں کو تمہاری طرف بلاتا؟'' ''تمہارے پاس کوئی خزانہ کیوں نہیں ہے؟'' ''تمہارے پاس کھجوروں اور انگوروں کے باغات کیوں نہیں ہیں؟''۔

ان کے یہ سوالات کسی سنجیدہ جستجو یا ہدایت کے جذبے پر مبنی نہیں ہوتے تھے بلکہ محض ہٹ دھرمی، شرارت اور فتنہ انگیزی کے لئے ہوتے تھے۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیشہ انبیاء و رسل کے ساتھ نشانیاں صرف ہدایت کے لئے بھیجی ہیں۔

آگے کی آیت میں اللہ تعالیٰ نے واضح فرما دیا کہ مشرکینِ عرب اور یہود و نصاریٰ کے دل کفر اور سرکشی میں ایک دوسرے سے بالکل ملتے جلتے ہیں۔ رہی بات اہلِ ایمان کی، تو ان کے لئے وہ نشانیاں کافی ہیں جو اللہ تعالیٰ نے قرآنِ کریم میں بیان فرما دی ہیں۔

آیت نمبر (۱۱۹) اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ بِالْحَقِّ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا ۙ وَّلَا تُسْـَٔلُ عَنْ اَصْحٰبِ الْجَحِيْمِ ﴿۱۱۹﴾

ترجمہ: ''اے نبی! ہم نے آپ کو حق کے ساتھ خوشخبری دینے والا اور ڈرانے والا بنا کر بھیجا ہے اور آپ سے دوزخ والوں کے بارے میں نہیں پوچھا جائے گا''۔

اسلام میں زور زبردستی نہیں

تفسیر اس آیت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے فرمایا گیا ہے کہ: ''ہم نے آپ کو حق (یعنی دینِ اسلام) کے ساتھ بھیجا ہے۔ آپ کا منصب یہ ہے کہ جنت کی خوشخبری سنائیں اور دوزخ کے عذاب سے آگاہ کریں''۔

پھر اللہ تعالیٰ نے یہ بھی فرمایا کہ آپ سے دوزخیوں کے بارے میں باز پرس نہیں کی جائے گی۔ اس آیت میں آپ کو تسلی دی گئی ہے کہ جو لوگ اسلام قبول نہیں کرتے، ان کے بارے میں پریشان نہ ہوں۔ آپ کا کام صرف حق پہنچانا اور دعوت دینا ہے، ہدایت دینا آپ کی ذمہ داری نہیں۔ کافر ایمان لائیں یا نہ لائیں، ان کے انجام کا حساب اللہ کے سپرد ہے۔

اسی حقیقت کو سورہ ''ق'' کے آخر میں بھی بیان کیا گیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فریضہ صرف لوگوں کو حق کی دعوت دینا اور انذار و تبشیر ہے، جبکہ ان کے اعمال کا حساب اللہ خود لے گا۔

آیت نمبر (۱۲۰) وَلَنْ تَرْضٰى عَنْكَ الْيَهُوْدُ وَلَا النَّصٰرٰى حَتّٰى تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ ۭ قُلْ اِنَّ هُدَى اللّٰهِ هُوَ الْهُدٰى ۭ وَلَىِٕنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَاۗءَهُمْ بَعْدَ الَّذِيْ جَاۗءَكَ مِنَ الْعِلْمِ ۙ مَا لَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ ﴿۱۲۰﴾

ترجمہ: ''اور یہود و نصاریٰ آپ سے کبھی راضی نہیں ہوں گے جب تک آپ ان کے طریقے پر نہ

چلیں۔ کہہ دیجئے! بے شک اللہ ہی کی ہدایت اصل ہدایت ہے۔ اور اگر آپ نے ان کی خواہشات کی پیروی کی، اس کے بعد کہ علم آچکا ہے، تو آپ کا اللہ کے مقابلے میں نہ کوئی مددگار ہوگا اور نہ کوئی حمایتی''۔

تفسیر

یہود و نصاریٰ کبھی راضی نہیں ہو سکتے

ثعلبی نے حضرت ابن عباسؓ سے روایت کیا ہے کہ مدینہ منورہ کے یہودی اور نجران کے عیسائی یہ امید لگائے بیٹھے تھے کہ رسول اللہ ﷺ ان کے قبلے کی طرف رخ کر کے نماز پڑھیں گے۔ لیکن جب اللہ تعالیٰ نے قبلہ بیت اللہ کی طرف پھیر دیا تو وہ مایوس ہو گئے اور سمجھ گئے کہ آپ ﷺ ان کے دین کو اختیار نہیں کریں گے۔ اسی موقع پر یہ حکم نازل ہوا کہ ''یہود و نصاریٰ آپ سے ہرگز راضی نہ ہوں گے۔'' **(لباب النقول فی اسباب النزول)**

تفسیر قرطبی (حصہ ۲، صفحہ ۹۳) میں اس آیت کی تفسیر میں لکھا ہے کہ اے محمد ﷺ! ان کا دلائل اور معجزات کا مطالبہ اس لئے نہیں ہے کہ واقعی ایمان لے آئیں، بلکہ اگر آپ ان کے کہنے کے مطابق معجزات دکھا بھی دیں تو یہ راضی نہیں ہوں گے۔ ان کا اصل مقصد یہ ہے کہ آپ ﷺ اپنے دینِ اسلام کو ترک کر کے ان کے دین کی پیروی کریں۔ جب تک آپ ایسا نہ کریں، یہ آپ سے کبھی خوش نہیں ہو سکتے۔

اس آیت میں صاف طور پر یہ حقیقت بیان کر دی گئی ہے کہ یہود و نصاریٰ کے ایمان لانے کی توقع عبث ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''اے محمد ﷺ! یہ کبھی بھی آپ سے راضی نہ ہوں گے، یہاں تک کہ آپ ان کے دین کو قبول کر لیں۔'' اس لئے ان کی خوشنودی کی فکر چھوڑ کر صرف اللہ کی رضا طلب کیجئے اور وہی دین پیش کیجئے جو آپ کو دے کر بھیجا گیا ہے، کیونکہ اس کے سوا کوئی بھی دین حق نہیں ہے۔

یہ آیت اس بات کی کھلی دلیل ہے کہ یہود و نصاریٰ کے پاس ہدایت نہیں بلکہ وہ خواہشات کی پیروی کرتے ہیں اور دوسروں کو بھی اسی طرف بلاتے ہیں۔ اس میں اُمتِ مسلمہ کے لئے سخت تنبیہ ہے کہ اگر قرآن و سنت کا علم آجانے کے باوجود انہوں نے یہود و نصاریٰ کی راہ اختیار کی تو اللہ کے عذاب سے کوئی چیز انہیں بچا نہیں سکتی۔

مالک کو راضی کرنے کی فکر

مؤمن کا اصل فریضہ یہ ہے کہ وہ صرف اپنے مالک و خالق کو راضی رکھنے کی کوشش کرے۔ اگر اللہ کی رضا کسی عمل میں ہے تو اس پر قائم رہے، خواہ دنیا کے سب لوگ ناراض ہو جائیں، اور اگر اللہ اس سے ناخوش ہے تو اس سے باز رہے، چاہے پوری دنیا راضی ہی کیوں نہ ہو جائے۔ ایمان کا تقاضا یہ نہیں کہ بندہ اپنے رب کو ناراض کر کے دوسروں کی خوشنودی چاہے۔

مگر افسوس کہ آج کے دور میں بہت سے مسلمان اپنی زندگی کے اعمال، طرزِ لباس اور ظاہری شکل وصورت میں یہود ونصاریٰ کی تقلید کرتے ہیں۔ وہ غیر مسلموں کے سامنے اپنے آپ کو کمتر سمجھتے ہیں اور ان کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے اسلامی احکام سے غفلت برتتے ہیں۔ اسی مقصد سے داڑھی منڈواتے ہیں، یورپی لباس کو فخر سمجھ کر پہنتے ہیں، عورتوں کو بے پردہ گھماتے ہیں، غیر محرم سے ان کا مصافحہ کراتے ہیں، اور ٹائی پہننے کو وقار کی علامت سمجھتے ہیں۔ ان کے دل میں یہ خوف ہوتا ہے کہ اگر ایسا نہ کیا تو غیر مسلم طعنے دیں گے، نوکری سے نکال دیں گے یا ہمیں حقارت کی نظر سے دیکھیں گے۔

کتنی افسوس کی بات ہے کہ وہ اللہ کے احکام کو پامال کرنے اور رسول اللہ ﷺ کی سنت سے روگردانی پر آمادہ ہوجاتے ہیں، مگر کافروں کو خوش رکھنا اپنی عزت سمجھتے ہیں، even اگر اس کے بدلے میں آخرت کے عذاب کا سامنا ہی کیوں نہ کرنا پڑے۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ کافر کسی حال میں راضی نہیں ہوسکتے، سوائے اس کے کہ مسلمان (نعوذ باللہ) اپنے دینِ اسلام کو چھوڑ کر ان کے مذہب کو اختیار کرلیں۔

ان آیات سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ اگرچہ دنیا کے کفار اپنی مذہبی شناخت میں مختلف ہیں، لیکن کفر کے معاملے میں سب ایک ہیں۔ اس طرح ان کی ملت حقیقتاً ایک ہی ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ دنیا میں صرف دو ملتیں ہیں: ایک ملتِ ایمان اور ایک ملتِ کفر۔ یہاں تک کہ بعض لوگ جو بظاہر اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہیں، مگر ان کا عقیدہ اسلام سے خالی ہوتا ہے۔ وہ بھی دراصل اسلام دشمنی میں یہود ونصاریٰ اور مشرکین کے ساتھ شریک ہوتے ہیں اور مسلمانوں کی حکومتوں کو نقصان پہنچانے میں ان سے کسی طرح پیچھے نہیں رہتے۔

آیت نمبر (۱۲۱) اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَتْلُوْنَهٗ حَقَّ تِلَاوَتِهٖ ؕ اُولٰٓئِكَ يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ ؕ وَمَنْ يَّكْفُرْ بِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ﴿۱۲۱﴾

ترجمہ: ''وہ لوگ جنہیں ہم نے کتاب دی، وہ اس کی تلاوت کرتے ہیں جیسے تلاوت کا حق ہے۔ یہی لوگ اس پر ایمان لاتے ہیں اور جو اس کا انکار کرے، تو وہی نقصان اٹھانے والے ہیں''۔

تفسیر

ایمان والوں کی پہچان

اس آیت میں ایمان والوں کی صفت بیان کی گئی ہے کہ وہ اللہ کی کتاب کی ایسی تلاوت کرتے ہیں جیسا کہ تلاوت کا حق ہے۔

حضرت ابن عباسؓ اور حضرت ابن مسعودؓ نے اس کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ قرآن میں جن چیزوں کو حلال قرار دیا گیا ہے ان پر عمل کیا جائے، اور جن چیزوں کو حرام قرار دیا گیا ہے ان سے اجتناب کیا جائے۔ قرآن کو اسی طرح پڑھا جائے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے نازل فرمایا ہے، اس کے الفاظ میں یا اس کے مفہوم میں کوئی تبدیلی نہ کی جائے۔

حضرت حسن بصریؒ فرماتے ہیں کہ تلاوت کا حق ادا کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اس کے احکام پر عمل کیا جائے، متشابہات پر ایمان رکھا جائے اور جو سوالات سامنے آئیں ان کو اہلِ علم سے دریافت کیا جائے۔

حضرت عمرؓ کا ارشاد ہے کہ جب کوئی قرآن پڑھتے ہوئے رحمت والی آیت پر پہنچے تو اللہ تعالیٰ سے رحمت طلب کرے، اور جب عذاب والی آیت پر گزرے تو اللہ کی پناہ مانگے۔ یہی قرآن کی حقیقی تلاوت ہے۔

یہ آیت دراصل یہود و نصاریٰ کے جھوٹے دعوے کا رد ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ان میں سے صرف وہی لوگ ایمان لائیں گے جنہوں نے اپنی کتاب کی اصل صورت پر عمل کیا، حلال و حرام کو بدلا نہیں اور نہ ہی اللہ کی کتاب میں تحریف کی۔ یہی وہ لوگ ہیں جو محمد ﷺ پر نازل شدہ دینِ حق کو قبول کریں گے۔ باقی یہود و نصاریٰ جنہوں نے اپنی کتابوں کو بدل ڈالا، حلال کو حرام اور حرام کو حلال کر دیا، اور آپ ﷺ سے متعلق پیشین گوئیوں کو چھپا لیا، وہ ہرگز ایمان لانے والے نہیں۔

چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''وَمَنْ يَّكْفُرْ بِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ'' جو لوگ اس دین کے ساتھ کفر کریں گے، وہی دراصل خسارہ اٹھانے والے ہیں۔

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''اس ذات کی قسم! جس کے قبضے میں میری جان ہے، کوئی شخص، خواہ یہودی ہو یا عیسائی، میرے بارے میں سنے اور مجھ پر ایمان نہ لائے تو وہ جہنم میں داخل کیا جائے گا''۔ (صحیح مسلم: ۱۵۳)

❁❁❁

ترجمہ- آیت نمبر ۱۲۲ سے ۱۲۹ تک

يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِيَ الَّتِيْٓ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَاَنِّيْ فَضَّلْتُكُمْ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۲۲﴾ وَاتَّقُوْا يَوْمًا لَّا تَجْزِيْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَيْـًٔا وَّلَا يُقْبَلُ مِنْهَا عَدْلٌ وَّلَا تَنْفَعُهَا شَفَاعَةٌ وَّلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ ﴿۱۲۳﴾ وَاِذِ ابْتَلٰٓى اِبْرٰهٖمَ رَبُّهٗ بِكَلِمٰتٍ فَاَتَمَّهُنَّ ۭ قَالَ اِنِّىْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا ۭ قَالَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِيْ ۭ قَالَ لَا يَنَالُ عَهْدِي الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۲۴﴾ وَاِذْ جَعَلْنَا الْبَيْتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ وَاَمْنًا ۭ وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهٖمَ مُصَلًّى ۭ وَعَهِدْنَآ اِلٰٓى اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ اَنْ طَهِّرَا بَيْتِيَ لِلطَّاۗىِٕفِيْنَ وَالْعٰكِفِيْنَ وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ ﴿۱۲۵﴾ وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا بَلَدًا اٰمِنًا وَّارْزُقْ اَهْلَهٗ مِنَ الثَّمَرٰتِ مَنْ اٰمَنَ مِنْهُمْ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ۭ قَالَ وَمَنْ كَفَرَ فَاُمَتِّعُهٗ قَلِيْلًا ثُمَّ اَضْطَرُّهٗٓ اِلٰى عَذَابِ النَّارِ ۭ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ﴿۱۲۶﴾ وَاِذْ يَرْفَعُ اِبْرٰهٖمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَيْتِ وَاِسْمٰعِيْلُ ۭ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ۭ اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴿۱۲۷﴾ رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَآ اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ ۠ وَاَرِنَا مَنَاسِكَنَا وَتُبْ عَلَيْنَا ۚ اِنَّكَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ﴿۱۲۸﴾ رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيْهِمْ ۭ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿۱۲۹﴾

ترجمہ:

(۱۲۲)۔اے بنی اسرائیل! یاد کرو میری نعمت کو جو میں نے تم پر کی اور یقیناً میں نے تمہیں سب جہانوں پر فضیلت دی۔(۱۲۳)۔اور اس دن سے ڈرو، جب کوئی کسی کے کچھ کام نہ آئے گا، نہ کسی سے فدیہ قبول کیا جائے گا، نہ سفارش فائدہ دے گی اور نہ ان کی مدد کی جائے گی۔(۱۲۴)۔اور جب آزمائش کی ابراہیم (علیہ السلام) کو اس کے رب نے چند باتوں سے، تو اس نے انہیں پورا کر دیا۔فرمایا: میں تجھے لوگوں کا پیشوا بنانے والا ہوں۔عرض کیا: اور میری اولاد میں سے بھی؟ فرمایا: میرا وعدہ ظالموں کو نہیں پہنچتا۔(۱۲۵)۔اور جب ہم نے بیت اللہ کو لوگوں کے لیے بار بار آنے کی جگہ اور امن والا مقام بنایا اور مقامِ ابراہیم کو نماز کی جگہ مقرر کیا اور ہم نے تاکیدی حکم دیا ابراہیم اور اسماعیل کو کہ میرے گھر کو پاک رکھو طواف کرنے والوں، اعتکاف کرنے والوں، رکوع اور سجدہ کرنے والوں کے لیے۔(۱۲۶)۔اور جب کہا ابراہیم نے: اے میرے رب! تو اس جگہ کو امن والا شہر بنا، اور اس کے رہنے والوں کو پھلوں سے رزق

دے، ان کو جو ایمان لائیں اللہ اور آخرت کے دن پر۔ فرمایا: اور جو کفر کرے، میں اسے تھوڑا سا فائدہ دوں گا، پھر اسے زبردستی دوزخ کے عذاب کی طرف لے جاؤں گا اور وہ بہت برا ٹھکانا ہے۔ (۱۲۷)۔ اور جب ابراہیم اور اسماعیل بیت اللہ کی بنیادیں اٹھا رہے تھے، (اور دعا کرتے تھے): اے ہمارے رب! تو قبول فرما ہم سے، یقیناً تو ہی سب کچھ سننے والا، سب کچھ جاننے والا ہے۔ (۱۲۸)۔ اے ہمارے رب! ہمیں اپنا فرمانبردار بنا اور ہماری اولاد میں سے بھی ایک فرمانبردار امت (بنا دے) اور ہمیں سکھا اپنی عبادت کے طریقے، اور قبول فرما ہماری توبہ، یقیناً تو بہت توبہ قبول کرنے والا، بڑا مہربان ہے۔ (۱۲۹)۔ اے ہمارے رب! ان (لوگوں) میں بھیجے ایک رسول انہی میں سے، جو ان پر تیری آیتیں پڑھے اور ان کو کتاب و حکمت سکھائے، اور ان کو پاک کرے، یقیناً تو ہی سب پر غالب، حکمت والا ہے۔

تفسیر- آیت نمبر ۱۲۲ سے ۱۲۹ تک

آیت نمبر (۱۲۲) يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِيَ الَّتِيْٓ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَاَنِّيْ فَضَّلْتُكُمْ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ

ترجمہ: ''اے بنی اسرائیل! یاد کرو میری نعمت کو جو میں نے تم پر کی اور یقیناً میں نے تمہیں سب جہانوں پر فضیلت دی۔''۔

تفسیر یہ آیت سورہ بقرہ کی ۴۸ نمبر آیت میں گذر چکی ہے۔ یہاں پر اس آیت کو دوبارہ ذکر کرنے کا مقصد 'بنی اسرائیل' کو اللہ کے انعامات یاد دلا کر حضرت محمد ﷺ پر ایمان لانے کی بات کہی گئی ہے کہ وہ صرف حسد کی بنیاد پر ان کا انکار نہ کریں اور توریت میں ان کی جو پیشین گوئی بتائی گئی ہے انہیں نہ چھپائیں اور قیامت کے دن سے ڈریں۔

آیت نمبر (۱۲۳) وَاتَّقُوْا يَوْمًا لَّا تَجْزِيْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَيْـًٔا وَّلَا يُقْبَلُ مِنْهَا عَدْلٌ وَّلَا تَنْفَعُهَا شَفَاعَةٌ وَّلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ ﴿۱۲۳﴾

ترجمہ: ''اور اس دن سے ڈرو، جب کوئی کسی کے کچھ کام نہ آئے گا، نہ کسی سے فدیہ قبول کیا جائے گا، نہ سفارش فائدہ دے گی اور نہ ان کی مدد کی جائے گی''۔

تفسیر اس آیت میں 'بنی اسرائیل' کو تنبیہ کی گئی ہے کہ وہ ایمان لائیں اور نیک اعمال بجا لائیں۔ ساتھ ہی انہیں قیامت کے دن کے عذاب سے ڈرایا گیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر انسان اللہ کی بے شمار نعمتوں پر غور کرے کہ اس نے

مجھ پر کس قدر انعامات فرمائے ہیں، پھر اپنے نفس کا محاسبہ کرے کہ میں نے ان انعامات کے شکر کے بدلے میں کیا کیا ہے، اور ساتھ ہی آخرت کی جواب دہی کا بھی خیال دل میں رکھے، تو ایسا شخص کبھی نیک اعمال سے غافل نہیں رہ سکتا۔ لیکن افسوس کہ یہودی ایمان اور اعمالِ صالحہ دونوں سے محروم ہو گئے۔

آیت نمبر (۱۲۴) وَاِذِ ابْتَلٰٓى اِبْرٰهٖمَ رَبُّهٗ بِكَلِمٰتٍ فَاَتَمَّهُنَّ ؕ قَالَ اِنِّىْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا ؕ قَالَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِىْ ؕ قَالَ لَا يَنَالُ عَهْدِى الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۲۴﴾

ترجمہ: ''اور جب آزمائش کی ابراہیم (علیہ السلام) کو اس کے رب نے چند باتوں سے، تو اس نے انہیں پورا کر دیا۔ فرمایا: میں تجھے لوگوں کا پیشوا بنانے والا ہوں۔ عرض کیا: اور میری اولاد میں سے بھی؟ فرمایا: میرا وعدہ ظالموں کو نہیں پہنچتا''۔

تفسیر اس آیت میں حضرت ابراہیمؑ کی آزمائش کا ذکر ہے۔ لفظ کلمات کے بارے میں مفسرین نے لکھا ہے کہ یہ کلمہ کی جمع ہے، اور یہاں اس سے مراد شریعت کے وہ احکام ہیں جو اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیمؑ کو دیے اور جیسے انہوں نے کمالِ اطاعت وفرمانبرداری کے ساتھ پورا کیا۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی عظیم الشان تعریف فرمائی۔

حضرت ابن عباسؓ سے دو قول منقول ہیں: ایک یہ کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیمؑ کو مناسکِ حج کا حکم دیا اور انہوں نے اسے بخوبی ادا کیا۔ دوسرا یہ کہ ان کو طہارت (پاکیزگی) سے متعلق دس احکام دیے گئے، جن میں سے پانچ سر سے متعلق ہیں اور پانچ جسم کے دوسرے اعضا سے جو درج ذیل ہیں:

(۱) مونچھیں ترشوانا۔ (۲) کلی کرنا۔ (۳) ناک میں پانی ڈال کر صاف کرنا۔ (۴) مسواک کرنا۔ (۵) بالوں میں مانگ نکالنا۔ (۶) ناخن کاٹنا۔ (۷) زیرِ ناف بال صاف کرنا۔ (۸) ختنہ کرانا۔ (۹) بغل کے بال صاف کرنا۔ (۱۰) قضائے حاجت کے بعد پانی سے طہارت حاصل کرنا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اللہ کے نبی حضرت ابراہیمؑ نے اسی برس کی عمر میں مقام قدوم پر ختنہ کیا۔
(بخاری: ۳۳۵۶)

حضرت سعید بن مصعب سے روایت ہے کہ حضرت ابراہیمؑ ہی وہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے مہمان نوازی کی، سب سے پہلے اپنی مونچھیں تراشیں اور سب سے پہلے ان کے چہرے پر سفید بال ظاہر ہوئے۔

حضرت ابن عباسؓ کا ایک اور قول یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیمؑ کو تیس چیزوں کا حکم دیا اور انہوں نے سب پر عمل کیا۔ ان میں سے دس 'سورہ برأت' کی آیت اَلتَّآئِبُوْنَ الْعَابِدُوْنَ سے آخر تک مذکور ہیں، دس 'سورہ

مؤمنون' کے آغاز میں، دس 'سورہ معارج' کے پہلے رکوع میں اور دس 'سورہ احزاب' کی آیت اِنَّ الْمُسْلِمِیْنَ وَالْمُسْلِمَاتِ میں۔ان میں شامل ہیں: توبہ، عبادت، حمد وثنا، روزہ رکھنا، رکوع کرنا، سجدہ کرنا، نیکی کا حکم دینا، برائی سے روکنا، اور اللہ کی حدود کی حفاظت کرنا۔

اسی طرح 'سورۂ مؤمنون' میں اللہ تعالیٰ نے یہ احکام دیئے: (۱) نماز میں خشوع اختیار کرنا۔ (۲) لغویات اور فضول باتوں سے اجتناب کرنا۔ (۳) زکوٰۃ ادا کرنا۔ (۴) شرم گاہوں کی حفاظت کرنا۔ (۵) امانتوں کی حفاظت کرنا۔ (۶) عہد و پیمان کی پاسداری کرنا۔ (۷) نمازوں کی پابندی کرنا۔

اسی طرح سورۂ معارج میں درج ذیل ہدایات دی گئی ہیں:

(۱) اپنے مال میں سائل اور محروم کا حصہ مقرر کرنا۔ (۲) رب کے عذاب سے ڈرتے رہنا۔ (۳) گواہی کو سچائی کے ساتھ ادا کرنا۔

اسی طرح سورۂ احزاب میں درج ذیل احکام بیان ہوئے ہیں:

(۱) اسلام کی دعوت دینا۔ (۲) دل سے ایمان لانا۔ (۳) اطاعت وفرمانبرداری اختیار کرنا۔ (۴) قول وعمل میں سچائی اپنانا۔ (۵) اللہ کے احکام کے سامنے جھکنا اور مصیبتوں پر صبر کرنا۔ (۶) خشوع پیدا کرنا۔ (۷) اللہ کی راہ میں مال خرچ کرنا۔ (۸) روزے رکھنا۔ (۹) شرمگاہوں کی حفاظت کرنا۔ (۱۰) کثرت سے اللہ کا ذکر کرنا۔

حضرت ابن عباسؓ کا ایک قول یہ بھی ہے کہ وہ کلمات جن میں اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیمؑ کو آزمایا وہ درج ذیل تھے: (۱) اپنی قوم سے الگ ہو جانا اور اللہ کے لئے تنہا رہنا۔ (۲) نمرود کے سامنے اللہ کی توحید پر دلیرانہ گفتگو کرنا اور جان کا خطرہ ہوتے ہوئے بھی حق بات کہہ دینا۔ (۳) آگ میں ڈالے جانے کے باوجود ثابت قدم رہنا۔ (۴) اپنے وطن کو چھوڑ کر اللہ کی رضا کے لئے ہجرت کرنا اور شام کی سرزمین کی طرف نکل جانا۔ (۵) اللہ کے بندوں کی مہمان نوازی کرنا اور اس کے لئے اپنی جان و مال قربان کرنا۔ (۶) بیٹے کی قربانی کا حکم پانے پر اس کے گلے پر چھری رکھ دینا۔

جب حضرت ابراہیمؑ ان سب آزمائشوں میں پورے اترے تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اَسلِم (فرمانبردار ہو جاؤ) تو انہوں نے جواب دیا: 'میں ربّ العالمین کا فرمانبردار ہوں'۔

حافظ ابن کثیرؒ نے مفسر ابن جریرؒ سے نقل کیا ہے کہ کلمات کی تفسیر میں جو بھی اقوال وارد ہوئے ہیں، ان سب کو ایک جامع مفہوم کے طور پر لینا بہتر ہے، کیونکہ یہ سب حضرت ابراہیمؑ کی زندگی کے مختلف امتحانات اور اطاعت کی عملی صورتیں ہیں۔

حضرت ابراہیمؑ کی امامت

علمائے تفسیر لکھتے ہیں کہ جب اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیمؑ کو اپنے احکام کے ذریعے آزمایا اور انہوں نے پورے خلوص کے ساتھ ان پر عمل کیا، تو بطور انعام انہیں 'امامت' یعنی پیشوائی عطا فرمائی۔ ان آزمائشوں کا مقصد ہی یہ تھا کہ ان کے اعمال واخلاق کی تربیت کامل ہوجائے اور وہ قیادت کے لائق قرار پائیں۔

اللہ تعالیٰ نے انہیں نبوت دی، ان پر صحیفے نازل فرمائے اور ان کی ذریت میں امامت کو جاری فرمایا۔ ان کے بعد جتنے انبیاء کرام آئے، سب انہی کی نسل سے تھے اور سب ملتِ ابراہیمی کی پیروی پر قائم رہے۔ یہاں تک کہ خاتم النبیین حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ بھی انہی کی نسل سے مبعوث ہوئے اور انہیں حکم ملا کہ وہ بھی ملتِ ابراہیمؑ (یعنی دینِ اسلام) کی پیروی کریں۔

یہ اور بات ہے کہ بعد کے انبیاء کی شریعتوں میں بعض احکام ملتِ ابراہیمؑ کے مطابق تھے اور بعض میں تبدیلیاں آئیں، لیکن اصل دین ایک ہی رہا۔

یہ بھی واضح کردیا گیا کہ حضرت ابراہیمؑ کی نسل میں سے اگر کوئی ظالم ہوگا تو وہ اس منصبِ امامت کے لائق نہیں ہوگا۔ مفسرین کے نزدیک یہاں 'عہد' سے مراد 'امامت' ہے اور اس کے ساتھ ساتھ یہ اشارہ بھی ہے کہ نبوت کسی خاندانی وراثت کا نام نہیں، بلکہ یہ اللہ تعالیٰ کا خالص فضل ہے، جسے چاہے عطا کرے اور جب چاہے سلسلۂ نبوت ختم فرمادے۔

آیت نمبر (۱۲۵) وَاِذْ جَعَلْنَا الْبَيْتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ وَاَمْنًا ؕ وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهٖمَ مُصَلًّى ؕ وَعَهِدْنَآ اِلٰٓى اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ اَنْ طَهِّرَا بَيْتِىَ لِلطَّآئِفِيْنَ وَالْعٰكِفِيْنَ وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ ﴿۱۲۵﴾

ترجمہ: ''اور جب ہم نے بیت اللہ کو لوگوں کے لیے بار بار آنے کی جگہ اور امن والا مقام بنایا اور مقامِ ابراہیم کو نماز کی جگہ مقرر کیا اور ہم نے تاکیدی حکم دیا ابراہیم اور اسماعیل کو کہ میرے گھر کو پاک رکھو طواف کرنے والوں، اعتکاف کرنے والوں، رکوع اور سجدہ کرنے والوں کے لیے''۔

تفسیر یہ آیت ''مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهٖمَ مُصَلًّى'' کے تحت امام بخاریؒ نے حضرت عمر فاروقؓ سے روایت نقل کی ہے۔ آپؓ فرماتے ہیں کہ تین مواقع ایسے آئے کہ میرے مشورے پر میرے رب نے موافقت فرمائی۔ انہی میں ایک یہ تھا کہ میں نے عرض کیا: ''یا رسول اللہ ﷺ! اگر مسلمان طواف کے بعد مقامِ ابراہیم کو نماز کی جگہ بنالیں تو بہتر ہے''۔ اسی پر یہ آیت نازل ہوئی: وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهٖمَ مُصَلًّى۔

ابن ابی حاتم کی روایت ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بیت اللہ کا طواف فرمایا تو حضرت عمرؓ نے کہا: ''یہ ہمارے جدّ امجد حضرت ابراہیمؑ کا مقام ہے۔'' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''ہاں۔'' پھر عمرؓ نے عرض کیا: ''کیا بہتر نہ ہوگا کہ اسے نماز کی جگہ قرار دیا جائے؟'' اسی وقت اللہ تعالیٰ نے یہ حکم نازل فرمادیا کہ مقامِ ابراہیم کو مصلیٰ بناؤ۔

حضرت عمرؓ سے ایک اور روایت منقول ہے کہ وہ مقامِ ابراہیم کے پاس سے گزرے اور عرض کیا: 'یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! کیا ہم اپنے پروردگار کے خلیل کی جگہ پر کھڑے نہ ہوں؟' آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''کیوں نہیں۔'' پھر عرض کیا: ''کیا ہم اسے نماز کی جگہ نہ بنالیں؟'' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کچھ دیر خاموش رہے، اسی دوران یہ آیت نازل ہوگئی۔ امام سیوطیؒ فرماتے ہیں کہ یہ حدیثیں اس بات کی دلیل ہیں کہ یہ آیت حجۃ الوداع کے موقع پر نازل ہوئی۔

حضرت ابراہیمؑ نے اپنے وطن سے ہجرت کر کے ملکِ شام کا رخ کیا۔ ان کی ایک بیوی حضرت سارہ تھیں، جن کی اولاد وہیں مقیم رہی۔ دوسری بیوی حضرت ہاجرہ سے حضرت اسمٰعیلؑ پیدا ہوئے، جنہیں اللہ کے حکم سے مکہ کے سنسان اور بے آب و گیاہ میدان میں چھوڑا گیا۔ (اس کا تفصیلی ذکر سورہ ابراہیم کی تفسیر میں آئے گا)۔ جب حضرت اسمٰعیلؑ بڑے ہوئے تو حضرت ابراہیمؑ کو بیٹے کی قربانی کا حکم ہوا اور انہوں نے اس امتحان میں بھی کامیابی حاصل کی۔ پھر دونوں باپ بیٹے کو خانۂ کعبہ تعمیر کرنے کا حکم ملا اور انہوں نے مل کر بیت اللہ کی بنیادیں اٹھائیں، جس کا تذکرہ آگے آئے گا۔

کعبہ، امن اور اجتماع کی جگہ

اس آیت میں کعبہ کو ''اَوَّلَ مَثَابَةً'' فرمایا گیا۔ ''مثابۃ''، ''ثاب یثوب'' سے مأخوذ ہے جس کے معنیٰ ہیں ''بار بار پلٹنے کی جگہ''۔ حضرت ابن عباسؓ اور بہت سے تابعین فرماتے ہیں کہ کعبہ کو یہ نام اس لئے دیا گیا کہ لوگ بار بار اس کی طرف کھنچے چلے آتے ہیں، طواف کرتے ہیں، گھروں کو لوٹ جاتے ہیں، مگر دل پھر بھی بیت اللہ کی حاضری کے لئے تڑپتا ہے۔

حضرت عکرمہ، قتادہ اور عطا خراسانی کے نزدیک ''مثابۃ'' کے معنیٰ ''مجمع'' یعنی اجتماع کی جگہ ہیں، کیونکہ دنیا بھر کے لوگ یہاں جمع ہوتے ہیں۔ پھر فرمایا گیا: ''وَاَمْنًا'' یعنی ہم نے کعبہ کو امن کا گہوارہ بنایا۔ جیسا کہ سورہ آل عمران میں ہے: ''وَمَنْ دَخَلَهٗ كَانَ اٰمِنًا'' (جو اس میں داخل ہوجائے وہ امن میں ہے)۔

حضرت ابراہیمؑ کے زمانے سے ہی کعبہ کا احترام لوگوں کے دلوں میں جاگزین تھا۔ یہاں تک کہ زمانۂ جاہلیت میں مشرکین بھی اس کی حرمت کے قائل تھے۔ عرب میں قبائل کی لڑائیاں عام تھیں، لوٹ مار اور قتل و غارت ایک رواج تھا، مگر اہلِ مکہ اور حرم کو ان حملوں سے محفوظ سمجھا جاتا تھا۔

اللہ تعالیٰ نے سورہ عنکبوت میں اہل مکہ پر یہ انعام یاد دلایا: ''اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّا جَعَلْنَا حَرَمًا اٰمِنًا

وَيُتَخَطَّفُ النَّاسُ مِنْ حَوْلِهِمْ... ''۔(کیا انہوں نے نہیں دیکھا کہ ہم نے حرم کو امن کی جگہ بنایا ہے، جبکہ ان کے گردونواح کے لوگ اچک لئے جاتے ہیں؟)

چونکہ اللہ نے مکہ کو حرم اور امن کی جگہ قرار دیا ہے، اس لئے وہاں خون بہانا اور لڑائی کرنا جائز نہیں۔ حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''کسی کے لئے یہ جائز نہیں کہ وہ مکہ میں ہتھیار لے کر چلے''۔

حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: مجھ سے پہلے کسی کے لئے اس میں قتال حلال نہ کیا گیا تھا، اور میرے لئے بھی یہ صرف دن کے ایک حصے میں حلال کیا گیا۔ مکہ کی حرمت ہمیشہ باقی رہے گی۔ یہاں تک کہ وہاں درخت کاٹنا یا جانور شکار کرنا بھی جائز نہیں، کیونکہ اللہ نے قیامت تک کے لئے اسے حرمت والا بنایا ہے۔ (بخاری: ۱۸۳۳) یہ جو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ میرے لیے مکہ میں قتال تھوڑی دیر کے لیے حلال کیا گیا اس سے مراد فتحِ مکہ کا دن ہے۔

امام اعظم ابوحنیفہؒ فرماتے ہیں: اگر کوئی شخص حرم کے باہر کسی کو قتل کر کے حرم میں پناہ لے لے تو اسے حرم کے اندر قتل نہ کیا جائے۔ البتہ اس سے تعلق توڑ دیا جائے، نہ کوئی اس کے ساتھ خرید وفروخت کرے اور نہ ہی کھانے پینے کا کچھ دیا جائے، یہاں تک کہ وہ مجبور ہو کر حرم سے باہر آجائے، پھر اسے حدودِ حرم سے باہر سزا دی جائے۔ (روح المعانی)

اسی طرح حرمِ مکہ میں جس طرح قتال وخون ریزی حرام ہے، اسی طرح وہاں شکار کرنا، جانوروں کو دوڑانا یا بھگانا بھی منع ہے۔ حرم کی گھاس کاٹنا، درخت یا کانٹے کاٹنا بھی ممنوع ہے۔ اس کی وضاحت بخاری ومسلم کی احادیث میں موجود ہے اور کتبِ فقہ میں اس کی تفصیل بیان کی گئی ہے۔

مقامِ ابراہیم

آیتِ مبارکہ میں ہے: ''وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهٖمَ مُصَلًّى ''(اور مقامِ ابراہیم کو نماز کی جگہ بناؤ)

مفسرین کے نزدیک اس سے مراد وہ پتھر ہے جس پر کھڑے ہو کر حضرت ابراہیمؑ نے کعبہ کی تعمیر فرمائی۔ یہ پتھر ان کے لیے سیڑھی کا کام دیتا تھا۔ تعمیر کے بعد اسے کعبہ کے دروازے کی جانب رکھ دیا گیا، اور وہیں طویل عرصے تک رہا۔ رسول اللہ ﷺ اور حضرت ابوبکر صدیقؓ کے زمانے میں بھی وہ اسی جگہ تھا۔ حضرت عمر فاروقؓ کے دور میں اسے موجودہ مقام پر منتقل کر دیا گیا۔

مقامِ ابراہیم کی تاریخ

روایات میں ہے کہ ایک بار سیلاب میں یہ پتھر بہہ گیا تھا، جسے حضرت عمرؓ نے موجودہ جگہ پر رکھ دیا۔ تمام

صحابہؓ اور امت نے اس جگہ پر اس کا ہونا تسلیم کیا۔ حضرت عمرؓ خلفائے راشدین میں سے ہیں جن کے طریقے کی اتباع کا رسول اللہ ﷺ نے حکم فرمایا: ''اِقْتَدُوْا بِالَّذِیْنَ مِنْ بَعْدِیْ أَبِی بَکْرٍ وَعُمَرَ'' (ترمذی: ۳۶۶۲) (میرے بعد ابوبکر اور عمر کی پیروی کرنا۔)

حضرت عمرؓ نے مقام کو منتقل کرنے میں حکمت یہ دیکھی کہ طواف کرنے والوں اور طواف کے بعد نماز پڑھنے والوں کی کثرت کے باعث اگر پتھر اپنی پہلی جگہ رہتا تو طواف کرنے والوں کا راستہ تنگ ہو جاتا۔

کچھ عرصے تک مقامِ ابراہیم ایک چار دیواری کے اندر بند رہا۔ بعد میں حکومت نے وہ دیوار ہٹا کر اسے شیشے کے اندر محفوظ کر دیا، تاکہ سب کو واضح نظر آئے۔ آج بھی اس میں حضرت ابراہیمؑ کے قدم مبارک کے نشانات نمایاں دکھائی دیتے ہیں۔

صحیح مسلم میں ہے کہ حجۃ الوداع کے موقع پر رسول اللہ ﷺ نے طواف کے بعد مقامِ ابراہیم کی طرف رخ کیا اور یہ آیت تلاوت فرمائی: ''وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهٖمَ مُصَلًّى''۔

پھر آپ ﷺ نے وہاں دو رکعتیں پڑھیں، اس طرح کہ مقامِ ابراہیم آپ ﷺ اور کعبہ کے درمیان تھا۔ ان دو رکعتوں میں آپ نے سورہ ''قُلْ یٰٓاَیُّهَا الْکٰفِرُوْنَ'' اور سورہ ''قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ'' کی تلاوت فرمائی۔

حضرت عمرؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے عرض کیا: یا رسول اللہ! کاش آپ مقامِ ابراہیم کو نماز کی جگہ بنا لیتے۔ اسی پر یہ آیت نازل ہوئی: ''وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهٖمَ مُصَلًّى''۔ (بخاری: ۴۴۸۴)

طواف کے بعد جو دو رکعت نماز واجب ہے، وہ مسجدِ حرام کے کسی بھی حصے میں ادا کی جا سکتی ہے، لیکن افضل یہ ہے کہ مقامِ ابراہیم کے پیچھے پڑھی جائے۔

بیت اللہ کو پاک رکھنے کا حکم

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''وَعَهِدْنَآ اِلٰٓى اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ''۔ (اور ہم نے ابراہیم اور اسماعیل کو حکم دیا کہ میرے گھر کو پاک رکھو طواف کرنے والوں، قیام کرنے والوں، رکوع کرنے والوں اور سجدہ کرنے والوں کے لیے۔)

اس آیت میں کعبہ شریف کو پاک رکھنے کا حکم دیا گیا ہے، اور چونکہ طواف اور نماز دونوں مسجدِ حرام میں ادا ہوتے ہیں، اس لیے اس حکم میں مسجدِ حرام کو پاک رکھنے کی تاکید بھی شامل ہے۔ پاکیزگی میں ظاہری اور باطنی دونوں طرح کی صفائی داخل ہے۔ یعنی یہ گھر شرک، کفر، بت پرستی، گندے کلمات، جھوٹ، فریب اور بدعملی سے پاک ہو، اور ساتھ ہی ظاہری ناپاکی اور گندگی سے بھی صاف رکھا جائے۔

طواف ایک ایسی عبادت ہے جو دنیا کے کسی اور مقام پر نہیں بلکہ صرف مسجدِ حرام ہی میں ادا کی جاسکتی ہے، جو بیت اللہ کے گرد مخصوص ہے۔ اس آیت میں لفظ ''وَالْعٰكِفِيْنَ'' آیا ہے۔ حضرت سعید بن جبیرؒ کے نزدیک اس سے مراد اہلِ مکہ ہیں، جبکہ حضرت عطار حمہ اللہ نے فرمایا کہ اس سے وہ لوگ مراد ہیں جو دوسرے شہروں سے آکر مسجدِ حرام میں قیام کرتے ہیں۔ حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ مسجدِ حرام میں بیٹھنے والا ہر شخص 'عاکفین' میں شمار ہوتا ہے اور اس میں وہ لوگ بھی شامل ہیں جو اعتکاف کرتے ہیں، کیونکہ لفظ 'عکوف' کا اطلاق ان پر بھی ہوتا ہے۔ اور ''وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ'' (رکوع وسجود کرنے والے) سے مراد نماز پڑھنے والے ہیں۔ اس لیے مسجدِ حرام میں جتنا زیادہ طواف اور نماز کا اہتمام کیا جاسکے، کرنا چاہیے، کیونکہ ان دونوں کی فضیلت بے حد عظیم ہے۔

طواف کی فضیلت

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''جو شخص اس گھر کا طواف کرے اور پورے سات چکر مکمل کرے، اسے ایک غلام آزاد کرنے کے برابر ثواب ملتا ہے۔ اور طواف کرنے والے کے ہر قدم پر اللہ تعالیٰ ایک گناہ معاف فرماتے ہیں اور ایک نیکی اس کے نامۂ اعمال میں لکھ دی جاتی ہے''۔ **(ترمذی:۹۵۹)**

مسجدِ حرام میں نماز کی فضیلت

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''میری مسجد (یعنی مسجدِ نبوی) میں ایک نماز، دوسری مساجد کی نمازوں سے ہزار درجہ افضل ہے۔ مگر مسجدِ حرام کا مقام اس سے بھی بلند ہے۔ مسجدِ حرام میں ایک نماز دوسری مساجد کی نمازوں کے مقابلے میں ایک لاکھ نمازوں کے برابر ہے''۔ **(ابن ماجہ:۱۴۰۶)**

آیت نمبر (۱۲۶) وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا بَلَدًا اٰمِنًا وَّارْزُقْ اَهْلَهٗ مِنَ الثَّمَرٰتِ مَنْ اٰمَنَ مِنْهُمْ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ قَالَ وَمَنْ كَفَرَ فَاُمَتِّعُهٗ قَلِيْلًا ثُمَّ اَضْطَرُّهٗۤ اِلٰى عَذَابِ النَّارِ ؕ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ﴿۱۲۶﴾

ترجمہ: ''اور جب کہا ابراہیم نے: اے میرے رب! تو اس جگہ کو امن والا شہر بنا، اور اس کے رہنے والوں کو پھلوں سے رزق دے، ان کو جو ایمان لائیں اللہ اور آخرت کے دن پر۔ فرمایا: اور جو کفر کرے، میں اسے تھوڑا سا فائدہ دوں گا، پھر اسے زبردستی دوزخ کے عذاب کی طرف لے جاؤں گا اور وہ بہت برا ٹھکانا ہے''۔

تفسیر

حضرت ابراہیمؑ کی دعا

حضرت ابراہیمؑ نے اللہ تعالیٰ کے حضور مکہ مکرمہ کے بارے میں عرض کیا کہ اس شہر کو امن وامان والا بنا دیا جائے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی دعا قبول فرمائی اور اسے ''بلدِ امین'' قرار دیا۔ اس کی بعض تفصیلات گزشتہ آیت کی تفسیر میں بیان کی جا چکی ہیں۔

حضرت ابراہیمؑ نے یہ دعا بھی کی کہ اس شہر کے رہنے والوں کو، جو اللہ پر اور روزِ آخرت پر ایمان رکھتے ہوں، انواع واقسام کے پھلوں سے رزق عطا کیا جائے۔ چونکہ اس سے قبل وہ اعلان سن چکے تھے: ''لَا يَنَالُ عَهْدِي الظّٰلِمِيْنَ'' (میرا عہد ظالموں کو نہیں پہنچے گا)، اس لیے اپنی دعا کو اہلِ ایمان کے ساتھ خاص کر دیا۔ مگر اللہ تعالیٰ نے وضاحت فرمائی کہ دنیاوی رزق صرف ایمان والوں کے ساتھ مخصوص نہیں، بلکہ مومن اور کافر دونوں کو دیا جائے گا، البتہ آخرت کا رزق صرف اہلِ ایمان ہی کے لیے ہے۔

کافر دنیا کی زندگی میں جتنا زندہ رہیں گے، اتنے دن اپنا رزق کھاتے رہیں گے۔ لیکن دنیا کی یہ زندگی آخرت کے مقابلے میں نہایت قلیل ہے۔ وہ دنیا میں کھا پی کر فائدہ تو اٹھالیں گے، مگر آخرت میں ان کا کوئی حصہ نہیں ہوگا۔ وہاں ان کے لیے صرف دوزخ ہے اور دوزخ کے عذاب سے کبھی نجات نہ ملے گی، جو بدترین ٹھکانہ ہے۔

حضرت ابراہیمؑ کی نسل میں جب تک اللہ نے چاہا، لوگ ایمان پر قائم رہے، مگر بعد میں اہلِ مکہ نے شرک اختیار کر لیا۔ انہوں نے کعبہ میں لات، عُزّیٰ اور منات جیسے بت رکھ دیے۔ اگر حضرت ابراہیمؑ کی دعا صرف اہلِ ایمان کے لیے خاص قبول ہوتی تو اہلِ مکہ کفر اختیار کرتے ہی پھلوں سے محروم ہو جاتے، لیکن اللہ تعالیٰ نے مومنوں اور کافروں دونوں کو رزق عطا فرمایا۔

مکہ میں دنیا بھر کے پھل

حضرت ابراہیمؑ کی دعا کے نتیجے میں دنیا بھر کے پھل مکہ مکرمہ میں آتے ہیں۔ وہاں کے باشندے اور حجاج و زائرین سب ان سے مستفید ہوتے ہیں۔ قرآنِ کریم میں فرمایا گیا: ''اَوَلَمْ نُمَكِّنْ لَّهُمْ حَرَمًا اٰمِنًا يُّجْبٰٓى اِلَيْهِ ثَمَرٰتُ كُلِّ شَيْءٍ رِّزْقًا مِّنْ لَّدُنَّا وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ''۔ ''کیا ہم نے انہیں ایک امن والے حرم میں جگہ نہیں دی، جہاں ہر قسم کے پھل ہماری طرف سے رزق کے طور پر کھنچے چلے آتے ہیں، مگر ان میں سے اکثر لوگ نہیں جانتے''۔

مکہ معظّمہ سے تقریباً ۹۰ کلومیٹر کے فاصلے پر طائف کا سرسبز علاقہ ہے، جہاں کے پھل ہمیشہ مکہ پہنچتے ہیں۔

اسی طرح دنیا کے ہر خطے سے مختلف پھل اور اجناس مکہ لائے جاتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ شاید ہی کوئی پھل ایسا ہو جو مکہ میں نہ پہنچتا ہو۔ بعض اہلِ علم کے نزدیک قرآن میں مذکور 'ثمرات' میں صرف پھل ہی نہیں بلکہ مشینوں کی پیداوار اور دستکاری کے سامان بھی شامل ہیں۔ اگرچہ مکہ کی زمین میں نہ کھیتی ہے، نہ باغات، نہ صنعتیں اور نہ تجارتی پیداوار، مگر وہاں دنیا بھر کی برکتیں جمع کی جاتی ہیں۔

مدینہ منورہ کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دعا

جس طرح حضرت ابراہیمؑ نے مکہ کے لیے دعا کی تھی، اسی طرح ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مدینہ منورہ کے لیے دعا فرمائی۔

حضرت ابو ہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ اہلِ مدینہ جب سب سے پہلا پھل لاتے تو وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں پیش کرتے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اسے ہاتھ میں لے کر یہ دعا فرماتے:

''اے اللہ! ہمارے پھلوں میں برکت عطا فرما، ہمارے شہر میں برکت عطا فرما، ہمارے صاع اور ہمارے مُد (یعنی پیمانوں) میں برکت عطا فرما۔ اے اللہ! ابراہیمؑ تیرے بندے، تیرے خلیل اور تیرے نبی تھے، اور میں تیرا بندہ اور تیرا نبی ہوں۔ ابراہیمؑ نے مکہ کے لیے دعا کی تھی اور میں تجھ سے مدینہ کے لیے دعا کرتا ہوں، اور جو کچھ ابراہیمؑ نے مکہ کے لیے مانگا، میں اتنی ہی بلکہ اس سے بھی زیادہ مدینہ کے لیے مانگتا ہوں''۔ اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قریب کے کسی بچے کو وہ پھل عطا فرما دیتے۔

حضرت انسؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ دعا بھی فرمائی: ''اے اللہ! مدینہ میں اتنی برکت دے جتنی تو نے مکہ میں دی ہے، بلکہ اس سے دوگنی عطا فرما''۔ **(بخاری، حدیث: ۱۸۸۵)**

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اس دعا کے صدقے آج مدینہ منورہ میں دنیا بھر کے پھل، اجناس اور مصنوعات آتے ہیں اور اہلِ ایمان کھلی آنکھوں ان برکتوں کا مشاہدہ کرتے ہیں۔

آیت نمبر (۱۲۷) وَاِذْ يَرْفَعُ اِبْرٰهٖمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَيْتِ وَاِسْمٰعِيْلُ ؕ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ؕ اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴿۱۲۷﴾

ترجمہ: ''اور جب ابراہیم اور اسماعیل بیت اللہ کی بنیادیں اٹھا رہے تھے، (اور دعا کرتے تھے): اے ہمارے رب! تو قبول فرما ہم سے، یقیناً تو ہی سب کچھ سننے والا، سب کچھ جاننے والا ہے''۔

تفسیر

کعبہ شریف کی تعمیر

کعبہ معظّمہ کی تعمیر سب سے پہلے فرشتوں کے ہاتھوں ہوئی۔ اس کے بعد حضرت آدمؑ نے اس کی تعمیر کی۔ زمانہ گزرنے کے ساتھ جب طوفانِ نوح نے عمارت کو منہدم کر دیا تو صرف بنیاد باقی رہ گئی۔ پھر حضرت ابراہیمؑ کو اللہ تعالیٰ کے حکم سے اس کی تعمیر کا شرف عطا ہوا۔ انہوں نے اپنے بیٹے حضرت اسماعیلؑ کو ساتھ لیا اور دونوں باپ بیٹے نے بنیادوں پر دوبارہ دیواریں اٹھائیں۔

چونکہ صحیح جگہ معلوم نہ تھی، اللہ تعالیٰ نے انہیں وہ مقام دکھا دیا جس کا ذکر سورۃ الحج کی آیت ''وَاِذْ بَوَّاْنَا لِاِبْرٰهِيْمَ مَكَانَ الْبَيْتِ'' میں موجود ہے۔ حضرت ابراہیمؑ کے بنائے ہوئے کعبہ کی حدود میں ''حطیم'' بھی شامل تھا، لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت سے پانچ برس پہلے قریش نے جب کعبہ تعمیر کیا تو مالی تنگی کی وجہ سے کچھ حصہ چھوڑ دیا، جو ''حطیم'' کہلاتا ہے۔ آج بھی یہ چار فٹ چار انچ کی دیوار کی صورت میں موجود ہے، جس پر چھت نہیں۔ اسی حصے پر ''میزابِ رحمت'' کا پانی گرتا ہے۔

حضرت عبداللہ بن زبیرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت عائشہؓ سے فرمایا: اگر تمہاری قوم ابھی ابھی اسلام نہ لائی ہوتی تو میں کعبہ کو توڑ کر اسے ابراہیمی بنیادوں پر دوبارہ تعمیر کرتا، اس کا دروازہ زمین کے برابر کر دیتا اور ''حطیم'' کو بھی اس میں شامل کر دیتا۔ (بخاری، حدیث: ۱۲۶) دوسری روایت میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''میں اس میں دو دروازے بناتا، ایک آمد کے لیے اور دوسرا روانگی کے لیے''۔

کعبہ کی تاریخ

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے قریش کی بنائی ہوئی عمارت کو اسی حال میں رہنے دیا۔ بعد میں حضرت عبداللہ بن زبیرؓ نے کعبہ کو حضرت ابراہیمؑ کی بنیادوں پر دوبارہ تعمیر کیا، ''حطیم'' کو شامل کر لیا اور دو دروازے بنا دیے، جو زمین کے برابر تھے تاکہ زینہ کی ضرورت نہ رہے۔ مگر بعد میں حجاج بن یوسف نے اسے پھر اسی شکل پر لوٹا دیا جس پر قریش نے تعمیر کی تھی۔

خلیفہ ہارون الرشید نے ارادہ کیا کہ دوبارہ ابراہیمی بنیادوں پر تعمیر کرے، مگر امام مالکؒ نے مشورہ دیا کہ اے امیر المؤمنین! اسے بادشاہوں کا کھلونا نہ بنائیے، ورنہ ہر حکمران اپنی مرضی سے گرا اور بنا دیا کرے گا، اس طرح اس کی ہیبت و عظمت دلوں سے اٹھ جائے گی۔ (ذکر نووی فی شرح مسلم، حصہ ۱، ص ۴۲۹)

حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسماعیلؑ کی محنت

بخاری کی روایت ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے اپنے بیٹے اسماعیلؑ سے فرمایا: ''اللہ نے مجھے ایک کام کا حکم دیا

ہے''۔حضرت اسماعیلؑ نے عرض کیا: ''آپ اپنے رب کے حکم کی بجا آوری کیجیے''۔ابراہیمؑ نے کہا: ''کیا تم میری مدد کرو گے؟'' انہوں نے جواب دیا: ''جی ہاں، ضرور''۔

پھر حضرت ابراہیمؑ نے ایک بلند ٹیلے کی طرف اشارہ کیا اور فرمایا: ''اللہ نے مجھے یہاں گھر بنانے کا حکم دیا ہے''۔

اس کے بعد دونوں باپ بیٹے نے بنیادیں اٹھانا شروع کیں۔حضرت اسماعیلؑ پتھر لا کر دیتے اور حضرت ابراہیمؑ دیوار کھڑی کرتے۔جب دیوار بلند ہوگئی تو ''مقامِ ابراہیم'' لائے، جس پر کھڑے ہوکر وہ کام کرتے۔یہ پتھر گویا سیڑھی یا زینے کا کام دیتا تھا۔اسی دوران وہ یہ دعا بار بار دہراتے: ''رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ''۔(اے ہمارے رب! ہم سے یہ عمل قبول فرما، بے شک تو سننے والا، جاننے والا ہے)۔(ابن کثیر، ج۱، ص۱۷۵)

اس سے یہ سبق ملتا ہے کہ بڑے سے بڑا عمل بھی ہو، بندے کو قبولیت کی دعا کرتے رہنا چاہیے۔اسی طرح حضرت ابراہیمؑ نے یہ دعا بھی کی: ''رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَآ اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ''۔(اے ہمارے رب! ہمیں اپنا فرمانبردار بنائے رکھ اور ہماری اولاد میں سے بھی ایک فرمانبردار امت پیدا فرما)

اس سے معلوم ہوا کہ مومن کو ہر وقت اللہ سے ڈرتے رہنا چاہیے، اسلام و ایمان کی نعمت پر شکر ادا کرتے رہنا چاہیے اور اس پر قائم رہنے کے لیے دعا کرتے رہنا چاہیے۔

کعبہ کے تعمیرات کی تاریخ

تاریخی روایات کے مطابق کعبہ کی تعمیر تقریباً دس مرتبہ ہوئی:

(۱) سب سے پہلے فرشتوں نے۔(۲) دوسری بار حضرت آدمؑ نے۔(۳) تیسری بار حضرت شیثؑ نے۔(۴) چوتھی بار حضرت ابراہیمؑ نے۔(۵) پانچویں بار قومِ عمالقہ نے۔(۶) چھٹی بار قبیلہ جرہم نے۔(۷) ساتویں بار قصی بن کلاب نے۔(۸) آٹھویں بار قریش نے۔(۹) نویں بار حضرت عبداللہ بن زبیرؓ نے۔(۱۰) دسویں بار حجاج بن یوسف نے۔

البتہ حضرت ابراہیمؑ اور ان کے بعد کی تعمیرات تو تاریخ اور روایات میں محفوظ ہیں، مگر اس سے پہلے کی تعمیرات کا ذکر قرآن وسنت یا معتبر تاریخ میں واضح نہیں۔

آیت نمبر (۱۲۸) رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَآ اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ ۠ وَاَرِنَا مَنَاسِكَنَا وَتُبْ عَلَيْنَا ۚ اِنَّكَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ﴿۱۲۸﴾

ترجمہ: ''اے ہمارے رب! ہمیں اپنا فرمانبردار بنا اور ہماری اولاد میں سے بھی ایک فرمانبردار

امت (بنادے) اور ہمیں سکھا اپنی عبادت کے طریقے، اور قبول فرما ہماری توبہ، یقیناً تو بہت توبہ قبول کرنے والا، بڑا مہربان ہے''۔

تفسیر یہ واقعہ بیان کرتا ہے کہ جب حضرت ابراہیمؑ کعبہ کی تعمیر مکمل کر چکے تو آپ نے اللہ کے حضور یہ دعا کی:

''اے ہمارے رب! ہمیں اپنی بندگی میں اور زیادہ مضبوطی عطا فرما، ہمیں ہمیشہ اپنے فرماں بردار بندوں میں شامل رکھ، اور ہماری نسل میں بھی ایسی جماعت پیدا فرما جو تیری اطاعت گزار ہو۔ ہمیں ہمارے حج اور عبادات کے طریقے سکھادے اور ہمارے حال پر اپنی خاص رحمت وعنایت فرما، بے شک تو ہی سب سے زیادہ توجہ فرمانے والا اور رحم کرنے والا ہے۔''

اس دعا میں سب سے پہلی درخواست یہ تھی کہ اے پروردگار! ہمیں ہمیشہ اپنے حکم کے تابع اور مسلم بنادے، یعنی ہماری زندگی تیری مرضی کے خلاف کبھی نہ گزرے اور ہمیں ہمیشہ اپنی اطاعت وبندگی کی توفیق دیتا رہ۔ دوسری دعا یہ تھی کہ ہماری نسل میں ایک امت مسلمہ پیدا فرما، ایسی امت جو تیرے حکم کے آگے سر تسلیم خم کرنے والی ہو، جس کا وصف بھی اسلام ہو اور نام بھی مسلمان ہو۔ یہی وہ امت ہے جس میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مبعوث ہوئے۔

اسلام اور مسلم کی وضاحت

مسلم وہ ہے جو اپنے آپ کو اللہ کے حوالے کر دے اور اس کے احکام کے مطابق زندگی گزارے اور اس سپردگی کا نام ہی ''اسلام'' ہے۔ یہی دین آدمؑ سے لے کر خاتم النبیین محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تک سبھی انبیاء کا دین رہا۔

تیسری دعا یہ تھی کہ اے ہمارے رب! ہمیں اپنے گھر کی حاضری کے مناسک یعنی حج وطواف کے طریقے اور آداب سکھادے تاکہ ہماری عبادات میں کوئی کمی یا کوتاہی نہ رہ جائے۔ ساتھ ہی یہ التجا بھی کی کہ ہم انسان ہیں، اگر کوئی خطا ہو جائے تو اپنی مغفرت اور رحمت سے درگزر فرما، کیونکہ تو ہی سب سے بڑا مہربان ہے۔

یہاں قرآن کے الفاظ ''وَأَرِنَا مَنَاسِكَنَا'' آئے ہیں۔ ''مناسک'' منسک کی جمع ہے، جس کے معنیٰ اعمالِ حج کے بھی ہیں اور مقاماتِ حج جیسے عرفات، منیٰ اور مزدلفہ کے بھی۔ ''أَرِنَا'' کے لفظی معنیٰ ہیں ''ہمیں دکھادے'' اور دکھانا نظر کی آنکھ سے بھی ہوتا ہے اور دل کی بصیرت سے بھی۔ اس لئے اللہ نے جبرئیلؑ کے ذریعے حضرت ابراہیمؑ کو نہ صرف مقاماتِ حج دکھائے بلکہ ان کے احکام بھی سکھائے۔

تفسیر ابن کثیر میں ہے کہ جب کعبہ کی تعمیر مکمل ہوئی تو جبرئیلؑ تشریف لائے اور حضرت ابراہیمؑ کا ہاتھ پکڑ کر صفا اور مروہ کی طرف لے گئے اور فرمایا کہ یہ اللہ کی نشانیوں میں سے ہیں۔ پھر انہیں منیٰ، مزدلفہ اور عرفات لے گئے اور حج کے تمام طریقے اور احکام سکھائے۔ جب عرفات پہنچے تو تین بار پوچھا: ''کیا تم نے سب پہچان لیا؟'' حضرت ابراہیمؑ

نے ہر بار کہا: ''جی ہاں، پہچان لیا۔''

یوں جبرئیلؑ نے حضرت ابراہیمؑ کو حج کا طریقہ سکھایا اور پھر حکمِ الٰہی سے انہوں نے حج کا اعلان عام کر دیا، جیسا کہ سورہ حج میں اس کا ذکر موجود ہے۔

آیت نمبر (۱۲۹) رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيْهِمْ ؕ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿۱۲۹﴾

ترجمہ: ''اے ہمارے رب! ان (لوگوں) میں بھیجے ایک رسول انہی میں سے، جو ان پر تیری آیتیں پڑھے اور ان کو کتاب وحکمت سکھائے، اور ان کو پاک کرے، یقیناً تو ہی سب پر غالب، حکمت والا ہے''۔

تفسیر اس آیت میں حضرت ابراہیمؑ کی اُس عظیم دعا کا ذکر ہے جو وہ کعبہ کی تعمیر کے وقت بارگاہِ الٰہی میں کرتے رہے: ''اے ہمارے رب! انہی میں سے ایک رسول مبعوث فرما''۔

یہاں مراد خاتم النبیین حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں، جو مکہ مکرمہ میں پیدا ہوئے، عربی بھی تھے اور حضرت ابراہیمؑ و حضرت اسماعیلؑ دونوں کی نسل سے تعلق رکھتے تھے۔ حضرت ابراہیمؑ کے بعد جتنے بھی انبیاء مبعوث ہوئے، سب بنی اسحاقؑ میں سے تھے، سوائے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے، جو بنی اسماعیل میں سے مبعوث ہوئے۔

مفسر ابن کثیرؒ (حصہ اوّل، ص ۱۸۴) نے 'مسند امام احمد' کے حوالے سے حضرت ابوامامہؓ کی روایت نقل کی ہے۔ وہ بیان کرتے ہیں کہ انہوں نے پوچھا: ''یارسول اللہ! آپ کا آغاز میں ذکر کیسے ہوا؟''۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''میں اپنے باپ ابراہیمؑ کی دعا ہوں، حضرت عیسٰیؑ کی بشارت ہوں اور اپنی والدہ کے اس خواب کی تعبیر ہوں جس میں انہوں نے دیکھا کہ ان کے وجود سے ایک نور نکلا ہے جس نے شام کے محلات کو روشن کر دیا''۔

یہ حدیث مشکوٰۃ (ص ۵۱۳) اور شرح السنہ میں بھی مذکور ہے، جہاں یہ اضافہ بھی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''میں اپنی والدہ کے اُس خواب کا مظہر ہوں جو انہوں نے دورانِ حمل دیکھا کہ ان کے لئے ایک نور روشن ہوا جس نے شام کے محلوں کو منور کر دیا''۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا سب سے پہلا ذکر حضرت ابراہیمؑ کی دعا میں ہوا، پھر حضرت عیسٰیؑ نے بنی اسرائیل کو نام لے کر آپ کی آمد کی خوشخبری دی: ''يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ مُّصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيَّ مِنَ التَّوْرٰىةِ وَمُبَشِّرًا بِرَسُوْلٍ يَّاْتِيْ مِنْۢ بَعْدِي اسْمُهٗٓ اَحْمَدُ'' (الصف:۶)

ترجمہ: ''اے بنی اسرائیل! بے شک میں تمہاری طرف اللہ کا رسول ہوں، تورات کی تصدیق کرنے والا اور اپنے بعد آنے والے اُس رسول کی بشارت دینے والا جس کا نام احمد ہوگا''۔

آخر کار وہی دعا اور بشارت حقیقت میں بدل گئی اور آپ ﷺ کو آخر الزمان نبی اور رسول بنا کر مبعوث فرمایا گیا۔ آپ ہی کو ''محمد'' بھی کہا گیا اور ''احمد'' بھی۔ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ پر نبوت و رسالت کا سلسلہ ختم کر دیا اور آپ کو قیامت تک کے لئے تمام جہانوں کے لئے رسول اور ہادی بنا کر بھیج دیا۔ (ترمذی: ۲۸۴۰)

یہی وہ رسول ہیں جن کے لئے حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسماعیلؑ نے دعا کی تھی:

''یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِكَ وَیُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَیُزَكِّیْهِمْ''

''تیری آیات ان پر تلاوت کرے، انہیں کتاب و حکمت سکھائے اور ان کے نفوس کا تزکیہ کرے''۔ یہی اوصاف سورہ آل عمران اور سورہ جمعہ میں بھی بیان ہوئے ہیں۔

۱۔ تلاوت کتاب

رسول اکرم ﷺ کا پہلا وصف یہ ہے کہ وہ اللہ کی آیات کی تلاوت فرمائیں گے۔ قرآن صرف اللہ کی کتاب ہی نہیں بلکہ اُس کا کلام بھی ہے۔ اس کی آیات کا پڑھنا، پڑھانا، سننا اور سنانا سب تلاوت کے دائرے میں آتا ہے۔ درست تلفظ کے ساتھ قرآن پڑھنا، اس کے الفاظ کو محفوظ رکھنا امت پر فرض کفایہ ہے۔

۲۔ کتاب اور حکمت کی تعلیم

دوسرا وصف یہ ہے کہ آپ ﷺ کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ ﷺ لوگوں کو اللہ کی کتاب کے الفاظ بھی سکھاتے اور اس کے معانی بھی سمجھاتے۔ صرف عربی زبان جاننا قرآن کے مفہوم تک پہنچنے کے لئے کافی نہیں، اس کی اصل تفسیر وہی معتبر ہے جو رسول اللہ ﷺ نے بیان کی اور صحابہ کرامؓ نے سیکھی، پھر تابعین اور سلف صالحین کے ذریعہ امت تک پہنچی۔

مفسر بغوی (معالم التنزیل، حصہ ۱، ص ۱۱۶) کے مطابق 'الکتاب' سے مراد قرآن ہے اور 'الحکمت' کی تفسیر بعض مفسرین نے ''فہمِ قرآن'' کے طور پر کی ہے، بعض نے اسے 'احکامِ قضا' یعنی عدالتی فیصلوں کے علم کے طور پر لیا ہے اور کچھ حضرات نے حکمت کو علم و عمل دونوں کے مجموعے سے تعبیر کیا ہے۔

۳۔ تزکیہ

تیسری صفت 'وَیُزَكِّیْهِمْ' یعنی نفوس کا تزکیہ ہے۔ تزکیہ کا مطلب ہے انسان کو پاک صاف کرنا۔ رسول اللہ

صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا مقصد صرف آیاتِ الٰہی کی تلاوت اور تعلیم دینا ہی نہ تھا بلکہ دلوں کو شرک و کفر کی آلودگی سے پاک کرنا، گناہوں کی گندگی دور کرنا اور اخلاق و اعمال کو سنوارنا بھی تھا۔

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے لوگوں کو توحید کی راہ دکھائی، ایمان و یقین کی روشنی بخشی، شک و شبہات سے بچایا، گناہوں اور بداعمالیوں کے نقصانات بتائے اور نیکیوں کی فضیلت اور ان کے اجر کی وضاحت کی۔ آپ نے حسد، کینہ، بخل، غرور، حرص، لالچ اور دنیا پرستی جیسے امراض کی خرابی بیان کی اور اللہ کی محبت، صلہ رحمی، سخاوت، والدین کی خدمت، یتیموں پر شفقت، تقویٰ، اخلاص، نرمی، حلم اور ضبطِ غصہ جیسی صفات کی تعلیم دی۔

اسی لئے فرمایا: ''میں تو بس اعلیٰ اخلاق کی تکمیل کے لئے بھیجا گیا ہوں''۔ (مؤطا)

تزکیہ صرف زبانی نصیحت سے نہیں ہوتا بلکہ عملی صحبت اور تربیت سے ممکن ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کی ہدایت و اصلاح کے لئے انہی میں سے رسول مبعوث فرمائے تاکہ وہ اپنے عمل اور سیرت کے ذریعے لوگوں کو تربیت دے سکیں۔ ان کی صحبت اختیار کرنے والوں کے دل خیر کی طرف مائل ہوں اور وہ برائیوں سے بچ سکیں۔ اسی لئے کہا گیا ہے کہ جس کی صحبت اختیار کرو، پہلے دیکھ لو کہ وہ سنتِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا پابند ہے یا نہیں اور اس میں آخرت کی فکر کتنی ہے۔ اس کے بغیر حقیقی تربیت حاصل نہیں ہو سکتی۔

❁ ❁ ❁

ترجمہ- آیت نمبر ۱۳۰ سے ۱۳۸ تک

وَمَنْ يَّرْغَبُ عَنْ مِّلَّةِ اِبْرٰهٖمَ اِلَّا مَنْ سَفِهَ نَفْسَهٗ ؕ وَلَقَدِ اصْطَفَيْنٰهُ فِي الدُّنْيَا ۚ وَاِنَّهٗ فِي الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿۱۳۰﴾ اِذْ قَالَ لَهٗ رَبُّهٗٓ اَسْلِمْ ۙ قَالَ اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۳۱﴾ وَوَصّٰى بِهَآ اِبْرٰهٖمُ بَنِيْهِ وَيَعْقُوْبُ ؕ يٰبَنِيَّ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰى لَكُمُ الدِّيْنَ فَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ﴿۱۳۲﴾ اَمْ كُنْتُمْ شُهَدَآءَ اِذْ حَضَرَ يَعْقُوْبَ الْمَوْتُ ۙ اِذْ قَالَ لِبَنِيْهِ مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْۢ بَعْدِيْ ؕ قَالُوْا نَعْبُدُ اِلٰهَكَ وَاِلٰهَ اٰبَآئِكَ اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ اِلٰهًا وَّاحِدًا ۚ وَّنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ﴿۱۳۳﴾ تِلْكَ اُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ ۚ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُمْ مَّا كَسَبْتُمْ ۚ وَلَا تُسْـَٔلُوْنَ عَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۳۴﴾ وَقَالُوْا كُوْنُوْا هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى تَهْتَدُوْا ؕ قُلْ بَلْ مِلَّةَ اِبْرٰهٖمَ حَنِيْفًا ؕ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿۱۳۵﴾ قُوْلُوْٓا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَمَآ اُنْزِلَ اِلٰٓى اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ وَمَآ اُوْتِيَ مُوْسٰى وَعِيْسٰى وَمَآ اُوْتِيَ النَّبِيُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ ۚ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ ۖ وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ﴿۱۳۶﴾ فَاِنْ اٰمَنُوْا بِمِثْلِ مَآ اٰمَنْتُمْ بِهٖ فَقَدِ اهْتَدَوْا ۚ وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا هُمْ فِيْ شِقَاقٍ ۚ فَسَيَكْفِيْكَهُمُ اللّٰهُ ۚ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴿۱۳۷﴾ صِبْغَةَ اللّٰهِ ۚ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبْغَةً ۫ وَّنَحْنُ لَهٗ عٰبِدُوْنَ ﴿۱۳۸﴾

ترجمہ:

(۱۳۰) اور کون ہے جو ابراہیم کے دین سے منہ موڑے سوائے اس کے جو نادان ہو اپنے آپ پر؟ اور ہم نے اسے دنیا میں منتخب کر لیا اور یقیناً وہ آخرت میں بھی نیک لوگوں میں سے ہے۔ (۱۳۱)۔ جب اس سے کہا اس کے رب نے: مسلم ہو جا، تو اس نے کہا: میں نے فرماں برداری اختیار کی رب العالمین کے لیے۔ (۱۳۲)۔ اور اسی (اسلام) کی وصیت کی ابراہیم نے اپنے بیٹوں کو اور یعقوب نے بھی (یہی کہا): اے میرے بیٹو! یقیناً اللہ نے تمہارے لیے یہ دین پسند کیا ہے، سو تم ہرگز نہ مرنا مگر اس حال میں کہ تم مسلم ہو۔ (۱۳۳)۔ کیا تم موجود تھے جب یعقوب کی موت کا وقت آیا؟ جب انہوں نے اپنے بیٹوں سے پوچھا: تم میرے بعد کس کی عبادت کرو گے؟ انہوں نے کہا: ہم عبادت کریں گے آپ کے معبود کی اور آپ کے باپ دادا ابراہیم، اسماعیل اور اسحاق کے معبود واحد کی، اور ہم اسی کے فرمانبردار ہیں۔ (۱۳۴)۔ یہ ایک جماعت تھی جو گزر گئی، ان کے لیے وہ ہے جو انہوں نے کمایا اور تمہارے لیے وہ ہے جو تم نے کمایا اور تم سے ان کے عملوں کے بارے میں سوال نہ ہوگا۔ (۱۳۵)۔ اور وہ کہتے ہیں: یہودی یا نصرانی بن جاؤ تا کہ

ہدایت پاؤ۔ کہہ دیجیے: (نہیں) بلکہ ہم ملتِ ابراہیم پر ہیں، جو صرف اللہ کی طرف جھکنے والے تھے اور وہ مشرکوں میں سے نہ تھے۔(۱۳۶)۔ کہہ دیجیے: ہم ایمان لائے اللہ پر اور اس پر جو نازل کیا گیا ہماری طرف اور جو نازل کیا گیا ابراہیم، اسماعیل، اسحاق، یعقوب اور ان کی اولاد کی طرف اور جو دیا گیا موسیٰ کو اور عیسیٰ کو اور جو دیا گیا نبیوں کو ان کے رب کی طرف سے، ہم ان میں سے کسی کے درمیان فرق نہیں کرتے اور ہم اسی کے فرمانبردار ہیں۔(۱۳۷)۔ پھر اگر وہ ایمان لائیں اسی طرح جیسے تم ایمان لائے ہو، تو وہی ہدایت یافتہ ہیں۔ اور اگر وہ منہ موڑیں، تو وہی مخالفت میں ہیں، سو اللہ آپ کو ان سے (بچانے کے لئے) کافی ہے اور وہی سننے والا، جاننے والا ہے۔(۱۳۸)۔ (ہم نے) اللہ کا رنگ (اختیار کرلیا ہے)، اور اللہ کے رنگ سے کس کا رنگ بہتر ہوسکتا ہے؟ اور ہم اسی کی عبادت کرنے والے ہیں۔

تفسیر- آیت نمبر ۱۳۰ سے ۱۳۸ تک

آیت نمبر (۱۳۰) وَمَنْ يَّرْغَبُ عَنْ مِّلَّةِ اِبْرٰهٖمَ اِلَّا مَنْ سَفِهَ نَفْسَهٗ ؕ وَلَقَدِ اصْطَفَيْنٰهُ فِي الدُّنْيَا ۚ وَاِنَّهٗ فِي الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿۱۳۰﴾

ترجمہ: ''اور کون ہے جو ابراہیم کے دین سے منہ موڑے سوائے اس کے جو نادان ہو اپنے آپ پر؟ اور ہم نے اسے دنیا میں منتخب کرلیا اور یقیناً وہ آخرت میں بھی نیک لوگوں میں سے ہے''۔

تفسیر یہ واقعہ ابن عیینہ نے روایت کیا ہے کہ حضرت عبداللہ بن سلامؓ نے اپنے بھتیجوں سلمہ اور مہاجر کو اسلام کی دعوت دی۔ آپؓ نے ان سے کہا: تم اچھی طرح جانتے ہو کہ اللہ تعالیٰ نے توریت میں یہ اعلان فرما دیا ہے کہ میں اسماعیلؑ کی اولاد میں سے ایک رسول مبعوث کروں گا، جن کا نام احمد ہوگا۔ جو ان پر ایمان لائے گا وہ کامیاب و ہدایت یافتہ ہوگا، اور جو انکار کرے گا وہ اللہ کی لعنت کا مستحق ہوگا۔ اس دعوت پر سلمہؓ نے فوراً اسلام قبول کرلیا، لیکن مہاجر نے ایمان لانے سے انکار کردیا۔ اسی موقع پر یہ آیت کریمہ نازل ہوئی۔

ملتِ ابراہیمی سے صرف وہی شخص منہ موڑ سکتا ہے جو عقل و فہم سے بالکل عاری ہو اور دین کی حقیقت سے ناواقف ہو۔ کیونکہ ملتِ ابراہیمی دراصل فطرتِ سلیمہ پر قائم وہی سیدھا اور خالص دین ہے جسے کوئی سچا دین رد نہیں کرسکتا۔

آگے اس کی عظمت کی دلیل یہ بیان فرمائی گئی کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیمؑ کو اسی ملت کی بدولت دنیا میں عزت و سربلندی عطا فرمائی، انہیں نبوت کے شرف سے نوازا اور آخرت میں بھی اپنی خاص عنایات کا وعدہ فرمایا۔ مقصد یہ ہے کہ اتنے جلیل القدر اور بلند ہمت نبی کی ملت سے روگردانی کرنا کسی بھی صاحبِ عقل کے شایانِ شان نہیں۔ چنانچہ جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسی ملتِ ابراہیمی کی تصدیق و تکمیل فرمائی ہے، تو جو شخص اسلام سے انکار کرتا ہے وہ دراصل

ملتِ ابراہیمی کا بھی انکار کرتا ہے۔

یہاں حضرت ابراہیمؑ اور ان کی ملت کی خصوصیت بیان کرنے کا مقصد یہی ہے کہ یہود و نصاریٰ کو سمجھایا جائے کہ جس پیغمبر کو وہ اپنا پیشوا اور بزرگ مانتے ہیں، ان کی ملت یہی تھی جس کی تجدید اور تکمیل رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کی ہے۔ لہٰذا اگر وہ حضرت ابراہیمؑ کو حقیقی معنوں میں اپنا پیشوا مانتے ہیں تو لازم ہے کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پیروی اختیار کریں اور دینِ اسلام کو قبول کرلیں۔

آیت نمبر (۱۳۱) اِذْ قَالَ لَهٗ رَبُّهٗۤ اَسْلِمْ ۙ قَالَ اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۳۱﴾

ترجمہ: ''جب اس سے کہا اس کے رب نے: مسلم ہو جا، تو اس نے کہا: میں نے فرماں برداری اختیار کی رب العالمین کے لئے''۔

تفسیر

اسلام کے معنیٰ

ارشادِ باری تعالیٰ ہے: اِذْ قَالَ لَهٗ رَبُّهٗۤ اَسْلِمْ ○ قَالَ اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ۔

یعنی جب ان کے رب نے ان سے کہا: ''فرمانبردار ہو جاؤ'' تو انہوں نے عرض کیا: ''میں ربّ العالمین کے حضور سراپا فرمانبردار ہوں۔''

لفظ ''اسلام'' اصل میں مادہ 'س۔ل۔م' سے نکلا ہے۔ جب یہ باب ''افعال'' میں آتا ہے تو اس کے معنیٰ ہوتے ہیں: حکم ماننا، اطاعت کرنا، سامنے جھک جانا، اور ظاہر و باطن سے مکمل طور پر فرماں بردار ہو جانا۔ اس سے بنا ہوا اسمِ فاعل ''مسلم'' ہے، جس کی جمع ''مسلمون'' یا ''مسلمین'' ہے۔

اللہ تعالیٰ پوری کائنات کا خالق و مالک ہے اور تمام مخلوقات اس کے بندے ہیں۔ بندے کے لیے سب سے بڑی سعادت یہی ہے کہ وہ اپنے خالق کی اطاعت کرے اور اس کے سامنے سر جھکا دے۔ حضرت ابراہیمؑ، خلیل اللہ، اور حضرت اسماعیلؑ، ذبیح اللہ، جب کعبہ شریف کی بنیاد رکھ رہے تھے تو ساتھ ساتھ یہ دعا بھی کرتے جاتے تھے: ''رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ'' (اے ہمارے پروردگار! ہمیں اپنے حضور فرمانبرداروں میں شامل فرما)۔

اور اسی کے ساتھ یہ عرض بھی کی: ''وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَا اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ'' (اور ہماری ذریت میں سے بھی ایک ایسی امت پیدا کر جو تیری اطاعت کرنے والی ہو)

چنانچہ جب اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیمؑ کو حکم دیا کہ ''میرے حضور فرمانبردار ہو جاؤ'' تو انہوں نے فوراً جواب دیا: ''میں ربّ العالمین کا فرمانبردار ہوں۔'' گویا وہ پہلے سے مطیع تھے، لیکن اس حکم میں اس بات کی تاکید تھی کہ

فرمانبرداری پر ہمیشہ قائم رہیں۔ حضرت ابراہیمؑ نے اس پر کامل عزم کے ساتھ اقرار کیا اور اعلان کر دیا کہ وہ ہمیشہ ہمیش کے لیے اپنے رب کے اطاعت گزار ہیں۔

یہ الفاظ ''اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِیْنَ'' اس حقیقت کو نمایاں کرتے ہیں کہ چونکہ اللہ ربّ العالمین ہے، اس لیے اس کی اطاعت اور فرماں برداری ہر حال میں لازم ہے۔ جو بھی اس کے حکم کو مان کر جھک جائے، وہ دراصل اپنے مخلوق ہونے کے فرض کو ادا کرتا ہے۔

قرآن کریم میں دوسری جگہ ارشاد ہے: ''قُلْ اِنِّیْٓ اَخَافُ اِنْ عَصَیْتُ رَبِّیْ عَذَابَ یَوْمٍ عَظِیْمٍ''۔ **(الانعام:۱۵)**

''کہہ دو! میں ڈرتا ہوں کہ اگر میں اپنے رب کی نافرمانی کروں تو مجھے ایک عظیم دن کے عذاب کا سامنا کرنا پڑے گا''۔

اسی طرح فرمایا: ''اَفَغَیْرَ دِیْنِ اللّٰہِ یَبْغُوْنَ وَلَہٗٓ اَسْلَمَ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَّ کَرْھًا وَّاِلَیْہِ یُرْجَعُوْنَ''۔ **(آل عمران:۸۳)**

''کیا وہ اللہ کے دین کے علاوہ کوئی اور دین چاہتے ہیں؟ حالانکہ جو بھی آسمانوں اور زمین میں ہیں وہ سب خوشی یا مجبوری کے ساتھ اسی کے حضور جھکے ہوئے ہیں اور سب کو اسی کی طرف لوٹنا ہے''۔

پس ساری مخلوق پر لازم ہے کہ اپنے خالق و مالک کی اطاعت کرے۔ حضرت ابراہیمؑ ہر امتحان میں کامیاب ہوئے اور ہر موقع پر اطاعت ہی کو اپنا شیوہ بنایا۔ یہی دین تمام انبیاء کا دین تھا: دینِ اسلام۔ تمام انبیاء کی دعوت ایک ہی تھی: اللہ کو وحدہٗ لاشریک ماننا، شرک سے بیزاری اختیار کرنا اور اس کے احکام پر عمل کرنا۔ احکام کی تفصیلات میں اختلاف رہا ہوگا، مگر اصولِ دین سب کے ہاں یکساں رہے۔ اسی لیے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''الانبیاء اخوۃ من علات، امھاتھم شتی و دینھم واحد''۔ (تمام انبیاء ایک ہی باپ کی اولاد کی مانند ہیں، ان کی مائیں جدا جدا ہیں لیکن دین ایک ہی ہے)۔ **(بخاری:۳۴۴۳)**

دین کا نام

تمام انبیاء علیہم السلام نے اپنی اپنی زبان میں اسی دین کے لیے مختلف الفاظ استعمال کیے ہوں، مگر چونکہ ہمارے نبی حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ عربی تھے اور آپ پر نازل ہونے والی کتاب بھی عربی زبان میں تھی، اس لیے اس دین کا باقاعدہ نام ''اسلام'' رکھا گیا۔

یہ نام محض ایک لفظ نہیں بلکہ اپنے اندر دو پہلو سمیٹے ہوئے ہے: ایک یہ کہ یہ فرمانبرداری اور اطاعت کے مفہوم کو

ظاہر کرتا ہے۔ دوسرا یہ کہ اپنے حقیقی معنیٰ کے اعتبار سے بتاتا ہے کہ اصل سلامتی اور نجات صرف دینِ اسلام ہی میں ہے۔

حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے جب قیصرِ روم کو اسلام کی دعوت دی تو اپنے مکتوب میں یہ الفاظ تحریر فرمائے: ''اَسْلِمْ تَسْلِمْ يُؤْتِكَ اللهُ اَجْرَكَ مَرَّتَيْنِ'' (اسلام قبول کرو، سلامت رہو گے اور اللہ تعالیٰ تمہیں دوہرا اجر عطا فرمائے گا)۔ (صحیح بخاری: ۱۷۷۳)

حضرت ابراہیمؑ کے ذریعے نام ''مسلمین''

حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت اسماعیل علیہ السلام نے جب امتِ مسلمہ کے لیے دعا کی تو اس کی قبولیت کا جلوہ اس طرح ظاہر ہوا کہ امتِ محمدیہ وجود میں آئی۔ اور اسی امت کے افراد کا نام حضرت ابراہیمؑ نے ''مسلمین'' رکھا۔

دین کا نام ''اسلام''

حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کے دین کا نام ''اسلام'' ہے۔ اس کی دعوت دراصل فرمانبرداری اور اطاعت کی دعوت ہے۔ یہی وہ دین ہے جو اللہ تعالیٰ کے نزدیک معتبر اور مقبول ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا'' (آج میں نے تمہارے لیے تمہارے دین کو کامل کر دیا، تم پر اپنی نعمت پوری کر دی اور تمہارے لیے اسلام کو بطورِ دین پسند کر لیا)۔

مزید فرمایا: ''اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللهِ الْاِسْلَامُ'' (بے شک اللہ کے نزدیک دین صرف اسلام ہے)۔

اور اہلِ ایمان کو یہ حکم دیا: ''يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ''۔ (اے ایمان والو! اللہ سے اس طرح ڈرو جیسا کہ ڈرنے کا حق ہے، اور دیکھو! ہرگز نہ مرنا مگر اس حال میں کہ تم مسلمان ہو)۔

ان آیات سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ مسلمان کا اصل کام یہی ہے کہ وہ اللہ کی اطاعت کرے، اس کے دین پر عمل پیرا ہو، اس کی کتاب کو مضبوطی سے تھامے اور اس کے رسول ﷺ کی فرمانبرداری کرے، کیونکہ رسول اللہ ﷺ کی اطاعت دراصل اللہ تعالیٰ کی اطاعت ہے: ''مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللهَ'' (جس نے رسول کی اطاعت کی اس نے درحقیقت اللہ کی اطاعت کی۔

مگر افسوس کہ بہت سے لوگ اپنے دعوے میں تو مسلمان ہیں لیکن حقیقت میں دل سے مسلمان نہیں۔ کچھ ایسے ہیں جو اپنی عقل کے پیمانے سے اسلام کے احکام کو رد کرتے ہیں، کچھ دشمنانِ اسلام کے پروپیگنڈے سے متأثر

ہوکر اسلام پر اعتراضات کرتے ہیں، اور کچھ اپنے خواہشات کے مطابق ایک نیا اسلام گڑھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ بعض لوگ ایمان کی حقیقت کو بگاڑ کر پیش کرتے ہیں۔ ایسے لوگ اگرچہ مسلمان ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں، مگر حقیقی معنوں میں اسلام والے نہیں۔ وہ دراصل ملتِ ابراہیمیہ سے کٹ کر الگ ہوجاتے ہیں۔

دین اسلام کے علاوہ کوئی دین قابلِ قبول نہیں

بعض ناسمجھ یہ اعتراض کرتے ہیں کہ جب اصل مقصد خالق و مالک کی فرمانبرداری ہے تو پھر دینِ اسلام کو ماننے کی کیا ضرورت ہے؟ جس دین میں کوئی شخص ہو، وہیں رہتے ہوئے اگر اللہ کی اطاعت کرے تو کیا یہ کافی نہیں اور کیا وہ نجات کا مستحق نہ ہوگا؟

یہ سوال دراصل جہالت اور ناسمجھی پر مبنی ہے۔ اس کا سیدھا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمانبرداری کا حق صرف اسی کو دیا ہے جو اس کے بھیجے ہوئے دین کے مطابق اطاعت بجالائے۔ اللہ کی بندگی اپنی مرضی کے راستے پر نہیں، بلکہ اس راستے پر معتبر ہے جو اس کے نبیوں کے ذریعے بتایا گیا ہے۔

انبیائے کرام علیہم السلام اپنے اپنے زمانے میں مبعوث ہوتے رہے۔ ان پر ایمان لانا، ان کی کتابوں اور صحیفوں پر ایمان رکھنا، اور قیامت پر ان تفصیلات کے ساتھ ایمان لانا فرض تھا جو انہوں نے بیان کیں۔ اللہ کے کسی بھی نبی سے ہٹ کر عبادت اور فرمانبرداری، اللہ کے نزدیک معتبر نہیں۔ کسی نبی کا انکار یا اللہ کی کسی کتاب کو جھٹلانا کفر ہے، اور کفر سب سے بڑی نافرمانی ہے۔ اس کے بعد کوئی عبادت، کوئی ریاضت اور کوئی اطاعت کارگر نہیں۔

سب سے آخر میں ''خاتم النبیین''، سیدنا محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مبعوث ہوئے۔ اب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپ پر نازل ہونے والی کتاب پر ایمان لانا ہر انسان پر فرض ہے۔ جو شخص آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی لائی ہوئی ہدایت، آپ کی کتاب، اور آپ کی نبوت و رسالت کا انکار کرے وہ دراصل اللہ کا باغی اور نافرمان ہے۔ ایسے شخص کے لیے نجات کا کوئی راستہ نہیں۔ اللہ تعالیٰ کے نزدیک اب اسلام کے سوا کوئی دین قابلِ قبول نہیں۔

اسلام کے علاوہ جتنے بھی مذاہب آج دنیا میں موجود ہیں، ان میں بیشتر لوگ اللہ کے ساتھ دوسروں کو شریک ٹھہراتے ہیں۔ ایسے مشرکین کو کیسے اللہ کا فرمانبردار مانا جاسکتا ہے؟ پھر ان کے معاشروں میں بے حیائی، سودخوری، رشوت، زناکاری اور طرح طرح کی برائیاں اس کثرت سے پھیلی ہوئی ہیں کہ وہ کسی طرح فرمانبرداری کے دائرے میں نہیں آتیں۔

کیا وہ قوم اللہ کی اطاعت گزار ہوسکتی ہے جس میں زناکاری عام ہو، اور جس کے عقیدے میں اتوار کے دن چرچ جاکر پوپ سے گناہ معاف کرالینا کافی سمجھا جاتا ہو؟ جہاں چھوٹے پوپ کے گناہ بڑے پوپ معاف کردیں اور یہ

سمجھا جائے کہ سب کچھ صاف ہو گیا۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ ایسی قوم اللہ کی فرماں بردار کہلائے؟

انہوں نے حضرت عیسیٰؑ کو جھٹلایا، انجیل میں تحریف کی، اور پھر جب سید المرسلین حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ تشریف لائے تو نہ صرف یہ کہ ایمان نہیں لائے بلکہ آپ کی ذاتِ گرامی پر اعتراضات بھی کیے۔ ایسے سب لوگ حقیقت میں اللہ تعالیٰ کے نافرمان ہیں۔

آیت نمبر (۱۳۲) وَوَصّٰی بِهَآ اِبْرٰهٖمُ بَنِیْهِ وَیَعْقُوْبُ ؕ یٰبَنِیَّ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰی لَكُمُ الدِّیْنَ فَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ﴿۱۳۲﴾

ترجمہ: ''اور اسی (اسلام) کی وصیت کی ابراہیم نے اپنے بیٹوں کو اور یعقوب نے بھی (یہی کہا): اے میرے بیٹو! یقیناً اللہ نے تمہارے لیے یہ دین پسند کیا ہے، سو تم ہرگز نہ مرنا مگر اس حال میں کہ تم مسلم ہو''۔

تفسیر

بیٹوں کو وصیت

حضرت ابراہیم علیہ السلام جب تک زندہ رہے، ملتِ اسلام پر ثابت قدم رہے۔ پھر جب آپ کی وفات کا وقت قریب آیا تو اپنے تمام بیٹوں کو یہی وصیت فرمائی کہ وہ اسی ملت پر قائم رہیں۔ قرآن مجید میں اس کی وضاحت موجود ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے اپنے بیٹوں کو نصیحت کی، جن میں حضرت اسماعیلؑ اور حضرت اسحاقؑ بھی شامل تھے۔ اسی طرح حضرت اسحاقؑ کے فرزند حضرت یعقوبؑ نے بھی اپنے انتقال کے وقت اپنے بیٹوں سے کہا:

''یٰبَنِیَّ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰی لَكُمُ الدِّیْنَ فَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ'' (اے میرے بیٹو! بے شک اللہ نے تمہارے لیے یہی دین پسند فرمایا ہے، لہٰذا تمہیں ہرگز اسلام کے علاوہ کسی حالت میں نہیں مرنا)۔

بعض مفسرین لکھتے ہیں کہ اس آیت کے نزول کا سبب یہ تھا کہ کچھ یہودیوں نے رسول اللہ ﷺ سے کہا: ''کیا آپ کو معلوم نہیں کہ حضرت یعقوبؑ نے اپنی موت کے وقت اپنے بیٹوں کو یہ وصیت کی تھی کہ وہ یہودیت پر قائم رہیں؟'' اس دعوے کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔ گویا قرآن نے ان سے پوچھا: ''تم کیسے کہہ سکتے ہو کہ حضرت یعقوبؑ نے یہودیت کی وصیت کی تھی؟ کیا تم ان کے پاس ان کی وفات کے وقت موجود تھے؟'' حالانکہ حضرت یعقوبؑ کی وفات کے کئی صدیوں بعد حضرت موسیٰؑ کی بعثت ہوئی، جن کے دین کو تم یہودیت کہتے ہو۔ پھر حضرت موسیٰؑ کی وفات کو بھی صدیوں بیت گئیں، تو اس کے باوجود تم یہ کیونکر کہہ سکتے ہو کہ حضرت یعقوبؑ نے یہودیت کی وصیت کی تھی؟ تمہارے اس دعوے کے پاس نہ کوئی دلیل ہے اور نہ کوئی گواہ۔

قرآن نے حقیقت بیان کر دی کہ حضرت یعقوبؑ نے اپنے بیٹوں کو اسلام پر قائم رہنے اور اسی پر مرنے کی وصیت کی تھی۔ اس سے واضح ہوا کہ انہوں نے نہ یہودیت کی وصیت کی اور نہ نصرانیت کی، بلکہ وہی دین بتایا جو اصل دین ہے، اور جس کی طرف آخری نبی حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ قرآن کے ذریعے دعوت دے رہے ہیں۔

اس آیت سے یہ سبق بھی ملا کہ انتقال کے وقت اپنے بیٹوں یا اہلِ خانہ کو سب سے اہم بات کی نصیحت کرنا انبیاء علیہم السلام کی سنت ہے۔ اور یہ بھی واضح ہو گیا کہ سب سے بڑی وصیت اور سب سے اہم نصیحت یہ ہے کہ اولاد کو ایمان اور دینِ اسلام پر قائم رہنے کی تاکید کی جائے، تاکہ وہ اسی حالت میں دنیا سے رخصت ہوں۔

آیت نمبر (۱۳۳) اَمْ كُنْتُمْ شُهَدَآءَ اِذْ حَضَرَ يَعْقُوْبَ الْمَوْتُ ۙ اِذْ قَالَ لِبَنِيْهِ مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْۢ بَعْدِيْ ؕ قَالُوْا نَعْبُدُ اِلٰهَكَ وَاِلٰهَ اٰبَآئِكَ اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ اِلٰهًا وَّاحِدًا ۚ وَّنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ﴿۱۳۳﴾

ترجمہ: ''کیا تم موجود تھے جب یعقوب کی موت کا وقت آیا؟ جب انہوں نے اپنے بیٹوں سے پوچھا: تم میرے بعد کس کی عبادت کرو گے؟ انہوں نے کہا: ہم عبادت کریں گے آپ کے معبود کی اور آپ کے باپ دادا ابراہیم، اسماعیل اور اسحاق کے معبود واحد کی، اور ہم اسی کے فرمانبردار ہیں''۔

تفسیر

حضرت یعقوبؑ کی وفات کے وقت نصیحت

مدینہ کے یہود کا یہ دعویٰ تھا کہ حضرت یعقوب علیہ السلام نے اپنی وفات کے وقت اپنی اولاد کو یہ وصیت کی تھی کہ وہ یہودیت پر قائم رہیں۔ اس دعوے کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے ان سے فرمایا: تمہیں کیسے معلوم کہ حضرت یعقوبؑ نے اپنی موت کے وقت اپنی اولاد کو کیا نصیحت کی تھی؟ کیا تم اس وقت ان کے پاس موجود تھے؟ نہ اس کا ذکر توریت میں ہے اور نہ اس پر کوئی گواہی پیش کی جا سکتی ہے۔ پھر تم یہ بات کہاں سے لے آئے کہ حضرت یعقوبؑ نے اپنی اولاد کو یہودیت کی وصیت کی تھی؟

قرآن واضح طور پر بتاتا ہے کہ اصل واقعہ یہ تھا کہ جب حضرت یعقوبؑ کی وفات کا وقت قریب آیا تو آپ نے اپنے بیٹوں سے سوال کیا: ''میرے بعد تم کس کی عبادت کرو گے؟'' بیٹوں نے جواب دیا: ''ہم اسی ایک اللہ کی عبادت کریں گے جو بے شریک ہے، اور جس کی بندگی ہمارے آبا و اجداد حضرت ابراہیمؑ، حضرت اسماعیلؑ اور حضرت اسحاقؑ ہمیشہ کرتے آئے ہیں، اور ہم زندگی بھر اسی ایک معبود کے فرمانبردار رہیں گے۔''

مفسرین لکھتے ہیں کہ حضرت یعقوبؑ نے یہ وصیت اس لیے کی تھی کہ اس وقت آپ مصر میں مقیم تھے، اور

وہیں آپ کی وفات ہوئی۔ مصر میں بادشاہ کے علاوہ عام لوگ کافر تھے، جو بتوں، ستاروں اور جانوروں مثلاً بیل اور بلی وغیرہ کی پوجا کرتے تھے۔ حضرت یعقوبؑ کو اندیشہ ہوا کہ کہیں ان کی اولاد بھی مصری معاشرت میں رہتے رہتے ان کے عقائد سے متاثر نہ ہو جائے۔ اس خطرے کے پیشِ نظر آپ نے اپنے بیٹوں سے یہ سوال کیا۔ بیٹوں نے پورے یقین کے ساتھ جواب دیا اور والد کو اطمینان دلایا کہ ہم اسی دینِ حق پر قائم رہیں گے جس پر ہمارے آباء واجداد قائم رہے۔

آیت نمبر (۱۳۴) تِلْكَ أُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ ۖ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُمْ مَّا كَسَبْتُمْ ۖ وَلَا تُسْـَٔلُونَ عَمَّا كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿۱۳۴﴾

ترجمہ: ''یہ ایک جماعت تھی جو گزر گئی، ان کے لیے وہ ہے جو انہوں نے کمایا اور تمہارے لیے وہ ہے جو تم نے کمایا اور تم سے ان کے عملوں کے بارے میں سوال نہ ہوگا''۔

نسلی غرور

تفسیر

یہودیوں کو ہمیشہ سے یہ گھمنڈ رہا ہے، اور آج بھی ہے، کہ وہ انبیاء کی اولاد ہیں، اس لیے محض نسلِ انبیاء میں شامل ہونے کے سبب وہ عذاب سے بچ جائیں گے۔ مگر قرآن نے واضح اعلان کر دیا کہ ہر شخص کے اعمال صرف اسی کے ساتھ وابستہ ہیں؛ جو کچھ انہوں نے کیا وہ ان کے لیے ہے، اور جو کچھ تم نے کیا وہ تمہارے لیے ہے۔ کسی کے اعمال کا بوجھ کسی دوسرے پر نہیں ڈالا جائے گا، اور نہ ہی دوسروں کے نیک عمل تمہارے لیے کارآمد ہو سکتے ہیں۔

اللہ کے نزدیک اصل نجات کا ذریعہ ایمان اور عملِ صالح ہے۔ محض نسب اور رشتہ داری پر بھروسہ کرنا خود فریبی ہے۔ یہاں تک کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بھی فرمایا کہ ''میری رشتہ داری کسی کے کچھ کام نہ آئے گی اگر وہ مومن نہ ہوا'' جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی قرابت داری کو نجات کی ضمانت قرار نہ دیا، تو دوسروں کی کیا مجال کہ وہ محض نسب پر بخشش کی امید لگائے بیٹھیں!

صحیح مسلم میں حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''جس کا عمل پیچھے رہ جائے، اس کا نسب اسے آگے نہیں بڑھا سکتا''۔ (مسلم: ۶۸۵۳)

اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ قیامت کے دن ہر شخص اپنے ہی اعمال کے بارے میں جواب دہ ہوگا۔

آیت نمبر (۱۳۵) وَقَالُوا كُونُوا هُودًا أَوْ نَصَارَىٰ تَهْتَدُوا ۗ قُلْ بَلْ مِلَّةَ إِبْرَاهِيمَ حَنِيفًا ۖ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِينَ ﴿۱۳۵﴾

ترجمہ: ''اور وہ کہتے ہیں: یہودی یا نصرانی بن جاؤ تا کہ ہدایت پاؤ۔ کہہ دیجیے: (نہیں) بلکہ ہم ملتِ ابراہیم پر ہیں، جو صرف اللہ کی طرف جھکنے والے تھے اور وہ مشرکوں میں سے نہ تھے''۔

تفسیر ابن ابی حاتم نے سعید یا عکرمہ کے واسطے سے حضرت ابن عباسؓ سے روایت کیا ہے کہ ابن ثریا نے رسول اللہ ﷺ سے کہا: ''اے محمد ﷺ! ہدایت صرف ہمارے پاس ہے، لہٰذا ہماری پیروی کرو تو سیدھے راستے پر آجاؤ گے۔''

اسی طرح نصاریٰ نے بھی آپ ﷺ سے یہی دعویٰ کیا۔ تب ان گمراہوں کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: ''یہ لوگ کہتے ہیں کہ یہودی یا نصرانی بن جاؤ، ہدایت پاجاؤ گے۔''

اللہ نے ان کے جواب میں رسول اللہ ﷺ سے فرمایا: ''آپ کہہ دیجیے کہ ہم نہ تو یہودی ہوں گے اور نہ نصرانی، بلکہ ہم تو ملتِ ابراہیمی پر ہیں، وہی ملت جو خالص ہے اور جس میں کوئی کجی نہیں، اور ابراہیمؑ ہرگز مشرک نہ تھے''۔

اس آیت میں مسلمانوں کو دو باتیں سمجھا دی گئیں:

۱۔ یہود و نصاریٰ سے صاف الفاظ میں کہہ دیا جائے کہ ہم کبھی یہودی یا نصرانی نہ ہوں گے، بلکہ ہم تو ملتِ ابراہیمی پر قائم رہیں گے، یعنی خالص توحید پر مبنی اسلام پر۔

۲۔ تمہارے مذاہب میں شرک داخل ہو گیا ہے اور یہودیت و نصرانیت شرک کی گندگی میں لتھڑ کر باطل اور منسوخ ہو چکی ہیں۔ یہود حضرت عزیرؑ کو اور نصاریٰ حضرت مسیحؑ کو اللہ کا بیٹا کہتے ہیں، حالانکہ ہر نبی نے شرک کو گمراہی قرار دیا۔ آج رسول اللہ ﷺ جس دین پر قائم ہیں وہ توحیدِ خالص ہے، اسی لیے اسے ملتِ ابراہیمی کہا گیا۔

نبی کریم ﷺ کی بعثت سے پہلے عرب کے اکثر لوگ شرک میں مبتلا تھے، صرف چند افراد ہی توحید پر قائم تھے۔ جیسا کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ روایت کرتے ہیں: نزولِ وحی سے پہلے کا واقعہ ہے کہ نبی اکرم ﷺ کی ملاقات وادی بلدخ میں زید بن عمرو بن نفیل سے ہوئی۔ وہاں آپ کو کھانے کی دعوت دی گئی تو آپ ﷺ نے اس میں شریک ہونے سے انکار کر دیا۔ زید نے کہا: ''میں ایسی کوئی چیز نہیں کھاتا جو تم اپنے بتوں کے نام پر ذبح کرتے ہو۔''

زید بن عمرو قریش سے اکثر کہا کرتے تھے: ''جانور کو اللہ نے پیدا کیا، آسمان سے اس کے لیے پانی برسایا اور زمین سے چارہ اگایا، تو پھر تم اسے اللہ کے سوا دوسروں کے نام پر کیوں ذبح کرتے ہو؟''

(صحیح بخاری، مناقب الانصار، باب ۲۴، حدیث: ۳۸۲۶)

آیت نمبر (۱۳۶) قُوْلُوْٓا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَمَآ اُنْزِلَ اِلٰٓى اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ وَمَآ اُوْتِيَ مُوْسٰى وَعِيْسٰى وَمَآ اُوْتِيَ النَّبِيُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ ۚ لَا

نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ﴿۱۳۶﴾

ترجمہ: ''کہہ دیجیے! ہم ایمان لائے اللہ پر اور اس پر جو نازل کیا گیا ہماری طرف اور جو نازل کیا گیا ابراہیم، اسماعیل، اسحاق، یعقوب اور ان کی اولاد کی طرف اور جو دیا گیا موسیٰ کو اور عیسیٰ کو اور جو دیا گیا نبیوں کو ان کے رب کی طرف سے، ہم ان میں سے کسی کے درمیان فرق نہیں کرتے اور ہم اسی کے فرمانبردار ہیں''۔

تفسیر اس آیت میں ملتِ ابراہیمی کی حقیقت اور تفصیل بیان کی گئی ہے اور اہلِ اسلام کو یہ تعلیم دی گئی ہے کہ وہ یہود و نصاریٰ سے کہہ دیں: ''ہم تو اس اللہ پر ایمان لائے ہیں جو ساری کائنات کا خالق و مالک ہے۔ وہ اپنی ذات و صفات میں یکتا ہے، اس کا کوئی شریک، ساجھی یا بیٹا نہیں۔ نفع و نقصان کا اختیار اسی کے ہاتھ میں ہے، وہی حساب لینے والا اور وہی بدلہ دینے والا ہے''۔

ہم نے دل کی گہرائی سے قرآن کو اور ان تمام احکام کو جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ذریعے نازل ہوئے، سچا مانا۔ ہمارا ایمان ان صحیفوں پر بھی ہے جو حضرت ابراہیمؑ پر نازل ہوئے، اسی طرح حضرت اسماعیلؑ، حضرت اسحاقؑ، حضرت یعقوبؑ اور تمام انبیاء پر جو وحی آئی اس پر بھی ہمارا یقین ہے۔ ہم حضرت موسیٰؑ اور حضرت عیسیٰؑ پر بھی ایمان رکھتے ہیں اور اس تورات و انجیل کو بھی مانتے ہیں جو انہیں دی گئی تھی۔

یہ تمام کتابیں آسمانی تھیں اور انسانوں کی ہدایت کے لیے اتاری گئی تھیں۔ یہ سب پیغمبر برحق تھے اور ان پر نازل شدہ تعلیمات بھی حق تھیں۔ ہم صرف انہی پر نہیں بلکہ ہر اس پیغمبر پر ایمان رکھتے ہیں جنہیں اللہ نے مبعوث فرمایا، چاہے ان کے نام و حالات ہمارے علم میں ہوں یا نہ ہوں۔ ہم سب کو اللہ کا سچا پیغمبر مانتے ہیں۔ کسی ایک پیغمبر یا کسی ایک کتاب کا انکار کرنا کفر ہے۔ ہر نبی اپنے زمانے میں حق پر تھا اور اس کی شریعت پر عمل کرنا واجب تھا۔ ہمارا مقصد صرف اللہ کی بندگی اور اس کی اطاعت ہے۔ جس وقت جس نبی کو اللہ نے بھیجا، اس کی شریعت پر عمل فرض ہوا، اور جب آخر میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مبعوث فرمایا اور آپ پر قرآن نازل کیا تو ہم نے دل و جان سے اسی کو اپنا لیا۔

اس آیت میں مسلمانوں کو یہ تعلیم دی گئی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل ہونے والی کتاب پر تفصیل سے ایمان لائیں اور پچھلے تمام انبیاء اور ان کی کتابوں کو بھی مانیں۔ کسی نبی یا کتاب میں فرق نہ کریں، جیسا یہود و نصاریٰ نے کیا کہ بعض کو مانا اور بعض کا انکار کر دیا۔

حضرت امام بخاریؒ نے حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت کیا ہے کہ اہلِ کتاب تورات کو عبرانی زبان میں پڑھتے

اور پھر اس کی تفسیر عربی میں مسلمانوں کو سناتے تھے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''اہلِ کتاب کی نہ تصدیق کرو اور نہ تکذیب، بلکہ کہہ دو کہ ہم اللہ اور اس کی نازل کردہ کتاب پر ایمان لائے ہیں''۔ پھر آپ ﷺ نے پوری آیت تلاوت فرمائی۔

یہ آیت کئی نکات پر مشتمل ہے:

۱۔ اس میں ایمان کی تمام بنیادی چیزیں سمیٹ دی گئی ہیں۔ ایمان کہا جائے تو اس کے اندر ارکانِ اسلام اور اعمالِ صالحہ بھی داخل ہوتے ہیں، اور جب اسلام کہا جائے تو اس میں ایمان بھی شامل ہوتا ہے۔ اگر دونوں ساتھ ذکر ہوں تو ایمان دل کے یقین اور تصدیق کا نام ہے جبکہ اسلام ظاہر کے اعمال کا۔

۲۔ ''قُولُوا آمَنَّا'' یعنی زبان سے کہو کہ ہم ایمان لائے، لیکن ساتھ ہی دل اس کی تصدیق کرے۔ دل کے یقین کے بغیر ثواب و جزا کا سوال ہی نہیں۔ اسی طرح اگر دل کے یقین کی تائید عمل سے نہ ہو تو وہ بھی بے فائدہ ہے۔ ''آمَنَّا'' جمع کے صیغے میں آیا ہے، اس سے امتِ اسلامیہ کو یہ پیغام ملا کہ سب کو مل کر اللہ کی رسی مضبوطی سے تھامے رہنی ہے، یعنی کتاب وسنت پر قائم رہنا چاہئے۔

۳۔ ''آمَنَّا بِاللهِ'' یعنی ہم ایمان لائے اس اللہ پر جو اپنی تمام صفات کے ساتھ یکتا ہے، ہر نقص وعیب سے پاک ہے اور جو اکیلا عبادت کے لائق ہے۔ قرآن وسنت پر ایمان لانے کا مطلب یہ ہے کہ مسلمان ان میں بیان کیے گئے تمام انبیاء کی صفات، قیامت کے دن، غیب کی خبروں اور احکامِ شریعت کو دل سے مانے۔

۴۔ ''وَمَا أُنزِلَ إِلَىٰ إِبْرَاهِيمَ'' اس سے یہ واضح کیا گیا کہ تمام آسمانی کتابوں اور سبھی انبیاء پر ایمان لانا ضروری ہے۔ یہی ایمانِ کامل کی دلیل ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ ان آیات میں دینِ اسلام کے حق ہونے کو ثابت کیا گیا ہے اور یہود و نصاریٰ سمیت پوری انسانیت کو اسلام کی دعوت دی گئی ہے۔

آیت نمبر (۱۳۷) فَإِنْ آمَنُوا بِمِثْلِ مَا آمَنْتُمْ بِهِ فَقَدِ اهْتَدَوْا ۖ وَإِنْ تَوَلَّوْا فَإِنَّمَا هُمْ فِي شِقَاقٍ ۖ فَسَيَكْفِيكَهُمُ اللهُ ۚ وَهُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ﴿۱۳۷﴾

ترجمہ: ''پھر اگر وہ ایمان لائیں اسی طرح جیسے تم ایمان لائے ہو، تو وہی ہدایت یافتہ ہیں۔ اور اگر وہ منہ موڑیں، تو وہی مخالفت میں ہیں، سو اللہ آپ کو ان سے (بچانے کے لئے) کافی ہے اور وہی سننے والا، جاننے والا ہے''۔

تفسیر یہ آیات اس حقیقت کو واضح کرتی ہیں کہ اے مسلمانو! اگر یہ اہل کتاب اسی طرح ایمان قبول کر لیں جیسے تم

ایمان لائے ہو، جس کی تفصیل ابھی گزری ہے، تو وہ بھی سیدھی راہ پا جائیں گے۔ لیکن اگر وہ محض ضد، عناد اور دشمنی میں حق کو ٹھکرائیں گے تو گھبرانے کی ضرورت نہیں، اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول سے وعدہ فرمالیا ہے کہ ان کے شر سے آپ کی حفاظت فرمائے گا۔

چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ کچھ ان میں سے قتل کر دیے گئے، کچھ قید ہوئے، کچھ کو جلاوطن کر دیا گیا اور باقی تتر بتر ہو گئے۔ یہ بھی قرآن کے اعجاز میں سے ایک معجزہ ہے کہ جس طرح خبر دی گئی تھی، ویسا ہی وقوع پذیر ہوا۔

صحیح بخاری میں حضرت ابوسعید خدریؓ کی روایت ہے کہ جب ''بنوقریظہ'' نے حضرت سعد بن معاذؓ کو اپنا حکم (جج) مان لیا تو رسول اللہ ﷺ نے انہیں طلب فرمایا۔ وہ ایک گدھے پر سوار ہو کر حاضر ہوئے۔ جب مسجد کے قریب پہنچے تو نبی کریم ﷺ نے انصار سے فرمایا: ''اپنے سردار کے استقبال کے لیے کھڑے ہو جاؤ۔'' پھر آپ ﷺ نے سعدؓ کو بتایا کہ بنوقریظہ نے آپ کو جج تسلیم کیا ہے۔ انہوں نے فیصلہ سنایا: ''ان کے مردوں کو قتل کر دیا جائے اور عورتوں اور بچوں کو قیدی بنالیا جائے۔'' اس پر آپ ﷺ نے فرمایا: ''تم نے اللہ کے فیصلے کے مطابق فیصلہ کیا ہے''۔ **(بخاری: ۴۱۲۱)**

ایک اور روایت حضرت ابن عمرؓ سے منقول ہے کہ ''بنونضیر'' اور ''بنوقریظہ'' نے مسلمانوں کے خلاف جنگ کی۔ چنانچہ بنونضیر کو جلاوطن کر دیا گیا اور بنوقریظہ کو محض معاف کر دیا گیا، لیکن انہوں نے دوبارہ جنگ چھیڑ دی۔ اس مرتبہ ان کے مرد قتل کر دیے گئے اور عورتیں، بچے اور اموال مسلمانوں میں تقسیم کر دیے گئے۔ البتہ جو لوگ پہلے ہی رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر امان حاصل کر چکے تھے، وہ مسلمان ہو گئے۔ اس کے بعد مدینہ کے باقی یہودیوں کو بھی آپ ﷺ نے جلاوطن کر کے مدینہ کو ان سے پاک کر دیا۔ **(بخاری، رقم: ۴۰۲۸)**

اس طرح ''بنونضیر'' کو جلاوطنی اور جزیہ قبول کرنا پڑا جبکہ ''بنوقریظہ'' اپنے انجام کو پہنچ گئے۔

روایات میں آتا ہے کہ حضرت عثمان غنیؓ کی شہادت کے وقت آپ قرآن مجید کی تلاوت فرما رہے تھے اور مصحف آپ کے سامنے کھلا ہوا تھا۔ قاتلانہ حملے کے دوران آپ کے خون کی بوندیں قرآن کے الفاظ ''فَسَيَكْفِيكَهُمُ اللّٰهُ'' پر جا گریں۔ وہی مصحف آج بھی ترکی میں محفوظ ہے، جس پر خون کے یہ نشانات تا حال موجود ہیں۔

آیت نمبر (۱۳۸) صِبْغَةَ اللّٰهِ ۚ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبْغَةً ۚ وَّنَحْنُ لَهٗ عٰبِدُوْنَ ﴿۱۳۸﴾

ترجمہ: ''(ہم نے) اللہ کا رنگ (اختیار کر لیا ہے)، اور اللہ کے رنگ سے کس کا رنگ بہتر ہو سکتا ہے؟ اور ہم اسی کی عبادت کرنے والے ہیں''۔

تفسیر اس آیت میں ارشاد ہے کہ اے مسلمانو! یہود و نصاریٰ سے کہہ دو کہ ہم نے اللہ کا رنگ اختیار کر لیا ہے، یعنی

دینِ اسلام کے رنگ میں رنگ گئے ہیں۔ اللہ کے رنگ سے بڑھ کر اور کس کا رنگ حسین و کامل ہوسکتا ہے؟ اور ہم اسی کی بندگی وعبادت میں جُتے ہوئے ہیں۔

عیسائی بنانے کا طریقہ

نصاریٰ میں یہ دستور رہا ہے کہ جب کوئی شخص ان کے مذہب میں داخل ہوتا یا ان کے ہاں کوئی بچہ پیدا ہوتا تو اس پر رنگین پانی چھڑکا جاتا یا اسے رنگین پانی میں بٹھایا جاتا۔ یہی رسم آج تک ''بپتسمہ'' (Baptism) کہلاتی ہے، جسے وہ نجات کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔ ان کے نزدیک عیسائیت کا رنگ اسی ظاہری پانی سے عطا کیا جاتا ہے۔ یہی حال یہود کا بھی ہے کہ جب ان کے بچے ایک خاص عمر کو پہنچتے ہیں تو انہیں اپنے مذہب کے رنگ میں رنگنے کی تلقین کرتے ہیں اور دعویٰ کرتے ہیں کہ اب ہم نے اپنے مذہب کا رنگ اس پر چڑھا دیا ہے۔

قرآن کا جواب

قرآن نے ان کے اس عمل کی تردید کرتے ہوئے اعلان فرمایا کہ تمہارا یہ طریقہ اللہ کے نزدیک بے معنیٰ ہے۔ بھلا ظاہری پانی کے چھڑکنے یا غسل دینے سے دل کس طرح رنگین ہوسکتا ہے؟ پانی تو بہہ کر ختم ہوجاتا ہے، جس کا بعد میں کوئی اثر باقی نہیں رہتا۔ اصل رنگ تو اللہ کا رنگ ہے اور وہ ہے ایمان وکلمہ کا رنگ ایسا رنگ جو انسان کے دل و روح کو سنوار دیتا ہے۔ یہی رنگ حقیقی نجات دلانے والا ہے، نہ کہ محض ظاہری پانی میں غسل دینے سے۔

لہٰذا لازم ہے کہ انسان اپنے آپ کو اور اپنی اولاد کو اسلام کے رنگ میں رنگے، اور اس رنگ کو اپنی پوری زندگی پر غالب کردے۔ جس طرح رنگ کپڑے کے ہر دھاگے میں اتر جاتا ہے، اسی طرح اسلام اپنے ماننے والے کی پوری شخصیت کو ڈھانپ لیتا ہے اور اس کی حالت بدل ڈالتا ہے۔

رنگ کا اثر ظاہر ہونا چاہئے

یہ آیت اس حقیقت کی طرف بھی اشارہ کرتی ہے کہ جس طرح رنگ آنکھوں سے نظر آتا ہے، اسی طرح ایمان ودین کا رنگ بھی ایک مسلمان کے اعمال، عادات اور طرزِ زندگی سے جھلکنا چاہیے۔ مسلمان کا باطن ایمان کے نور سے رنگین ہوتا ہے، جس کا اثر اس کے ظاہر پر بھی نمایاں رہتا ہے۔ یہی رنگ اس کے قول وعمل میں اطاعت وتوحید کی خوشبو بکھیر دیتا ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنت

عبداللہ بن ابورافع نے اپنے والد سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''جب بچہ پیدا ہوتو

سب سے پہلے اس کے کان میں اللہ کا نام پہنچاؤ۔'' (سنن ابوداؤد: ۵۷۰۵)

اس لیے نومولود کو نہلا دھلا کر اس کے دائیں کان میں اذان اور بائیں کان میں اقامت کہی جاتی ہے۔ یہ دراصل دینِ فطرت یعنی اسلام کی طرف بلاوا ہے، جو بچے کے پیدا ہوتے ہی اسے اللہ کی بندگی کی راہ پر ڈالتا ہے۔

حقیقی عبادت یہی ہے کہ اللہ کے حکم کی مکمل اطاعت کی جائے بی خواہ وہ نماز، روزہ، حج اور زکوٰۃ کے ذریعے ہو یا بندوں کے حقوق، لین دین، تجارت اور حکومت کے معاملات میں۔ ہر پہلو میں اللہ کے رنگ کو اختیار کرنا اور اپنے ظاہر و باطن کو دین کے رنگ میں ڈھال دینا ہی اصل کامیابی ہے۔

❁❁❁

ترجمہ- آیت نمبر ۱۳۹ سے ۱۴۱ تک

قُلْ اَتُحَآجُّوْنَنَا فِی اللّٰهِ وَهُوَ رَبُّنَا وَرَبُّكُمْ ۚ وَلَنَآ اَعْمَالُنَا وَلَكُمْ اَعْمَالُكُمْ ۚ وَنَحْنُ لَهٗ مُخْلِصُوْنَ ﴿۱۳۹﴾ اَمْ تَقُوْلُوْنَ اِنَّ اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطَ كَانُوْا هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى ؕ قُلْ ءَاَنْتُمْ اَعْلَمُ اَمِ اللّٰهُ ؕ وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ كَتَمَ شَهَادَةً عِنْدَهٗ مِنَ اللّٰهِ ؕ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۴۰﴾ تِلْكَ اُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ ۚ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُمْ مَّا كَسَبْتُمْ ۚ وَلَا تُسْـَٔلُوْنَ عَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۴۱﴾

ترجمہ:

(۱۳۹)۔ کہہ دیجیے: کیا تم ہم سے جھگڑتے ہو اللہ کے بارے میں، حالانکہ وہ ہمارا رب بھی ہے اور تمہارا رب بھی؟ ہمارے لیے ہمارے اعمال ہیں اور تمہارے لیے تمہارے اعمال اور ہم تو اسی کے لیے اخلاص رکھنے والے ہیں۔ (۱۴۰)۔ کیا تم کہتے ہو کہ ابراہیم، اسماعیل، اسحاق، یعقوب اور ان کی اولاد یہودی یا نصرانی تھے؟ کہہ دیجیے: کیا تم زیادہ جانتے ہو یا اللہ؟ اور اس سے بڑا ظالم کون ہے جو چھپائے وہ گواہی جو اللہ کی طرف سے ہے اس کے پاس؟ اور اللہ غافل نہیں ان اعمال سے جو تم کرتے ہو۔ (۱۴۱)۔ وہ ایک جماعت تھی جو گزر گئی، ان کے لیے وہ ہے جو انہوں نے کمایا اور تمہارے لیے وہ ہے جو تم نے کمایا اور تم ان کے اعمال کے بارے میں سوال نہ کیے جاؤ گے۔

تفسیر- آیت نمبر ۱۳۹ سے ۱۴۱ تک

آیت نمبر (۱۳۹) قُلْ اَتُحَآجُّوْنَنَا فِی اللّٰهِ وَهُوَ رَبُّنَا وَرَبُّكُمْ ۚ وَلَنَآ اَعْمَالُنَا وَلَكُمْ اَعْمَالُكُمْ ۚ وَنَحْنُ لَهٗ مُخْلِصُوْنَ ﴿۱۳۹﴾

ترجمہ: ''کہہ دیجیے! کیا تم ہم سے جھگڑتے ہو اللہ کے بارے میں، حالانکہ وہ ہمارا رب بھی ہے اور تمہارا رب بھی؟ ہمارے لیے ہمارے اعمال ہیں اور تمہارے لیے تمہارے اعمال اور ہم تو اسی کے لیے اخلاص رکھنے والے ہیں''۔

تفسیر ان آیات میں ارشاد ہے کہ اے محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! آپ ان منکروں سے فرما دیجیے: کیا تم اب بھی ہم سے اللہ کے بارے میں حجت بازی کرتے ہو کہ وہ ہمیں آخرت میں نہ بخشے گا، حالانکہ وہی ہمارا بھی رب ہے اور تمہارا بھی رب ہے؟ ہر ایک کو اس کے اپنے عمل کا بدلہ ملے گا، ہمیں ہمارے اعمال کا صلہ دیا جائے گا اور تمہیں تمہارے اعمال کا۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی ﷺ کو حکم دیا کہ ان سے صاف کہہ دیجیے: ''تم کیسے لوگ ہو جو اللہ کی توحید، اخلاص اور اس کے احکام پر عمل کے باوجود مجھ سے جھگڑتے ہو، جبکہ وہ ہمارا بھی رب ہے اور تمہارا بھی۔'' پھر حکم دیا کہ ان سے براءت کا اعلان کر دیں اور فرما دیں: ''اگر تم شرک پر اڑے رہو گے تو ہم تم سے بری ہیں۔ ہم تو صرف اور صرف اللہ ہی کی عبادت کرتے ہیں اور اسی کے لئے اپنی بندگی کو خاص کرتے ہیں۔''

عمل اور اخلاص کی اہمیت

ان آیات میں عمل کے ساتھ اخلاص کی عظمت بھی واضح کی گئی ہے۔ نجات اسی عمل سے ہے جو خالصتاً اللہ کی رضا کے لئے ہو۔ حضرت مغیرہ بن شعبہؓ فرماتے ہیں کہ رسول اکرم ﷺ راتوں کو اتنی طویل نماز پڑھتے کہ آپ کے مبارک قدموں پر ورم آ جاتا۔ جب عرض کیا جاتا: ''یا رسول اللہ ﷺ! اتنی مشقت کیوں اٹھاتے ہیں؟'' تو آپ فرماتے: ''کیا میں اللہ کا شکر گزار بندہ نہ بنوں؟''۔ **(صحیح بخاری: ۶۴۷۱)**

● حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ''نیک اعمال اخلاص اور درست طریقے سے کرتے رہو، حد سے تجاوز نہ کرو، درمیانہ روی اختیار کرو اور خوش رہو (اللہ کی رحمت سے کبھی ناامید نہ ہو)۔ یاد رکھو! صرف اعمال کسی کو جنت میں نہیں پہنچا سکتے۔'' صحابہ نے عرض کیا: ''یا رسول اللہ! کیا آپ بھی نہیں؟'' آپ نے فرمایا: ''ہاں، میں بھی نہیں، مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت اور مغفرت سے مجھے ڈھانپ لے۔'' **(صحیح بخاری: ۶۴۶۷)**

● حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اگر میرے پاس اُحد پہاڑ کے برابر سونا بھی ہو تو مجھے یہ پسند ہے کہ تین دن سے زیادہ وہ میرے پاس نہ ٹھہرے۔ ہاں، اگر کسی کا قرض ادا کرنے کے لئے کچھ رکھ لوں تو یہ اور بات ہے''۔ **(صحیح بخاری: ۶۴۴۵)**

● ایک اور موقع پر حضرت عبداللہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''کیا تم میں سے کوئی ایسا ہے جسے اپنے وارث کا مال، اپنے مال سے زیادہ محبوب ہو؟'' سب نے عرض کیا: ''یا رسول اللہ! ایسا کوئی نہیں، ہر شخص کو اپنا مال ہی زیادہ عزیز ہے''۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''تو پھر جان لو کہ آدمی کا مال وہی ہے جو اس نے (اللہ کی راہ میں) آگے بھیج دیا اور جو دنیا میں چھوڑ گیا وہ اس کے وارثوں کا ہے۔'' **(صحیح بخاری: ۶۴۴۲)**

● ایک اور حدیث میں حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا: ''ایک پیاسا کتا کنویں کے گرد چکر لگا رہا تھا، قریب تھا کہ پیاس سے مر جائے۔ بنی اسرائیل کی ایک بدکار عورت نے اسے دیکھا، اپنا جوتا اتارا اور اس میں پانی بھر کر کتے کو پلا دیا۔ اللہ نے اس نیکی کی وجہ سے اس عورت کی مغفرت کر دی۔'' **(صحیح بخاری: ۲۳۶۳)**

آیت نمبر (۱۴۰) اَمۡ تَقُوۡلُوۡنَ اِنَّ اِبۡرٰهٖمَ وَاِسۡمٰعِيۡلَ وَاِسۡحٰقَ وَيَعۡقُوۡبَ وَالۡاَسۡبَاطَ كَانُوۡا هُوۡدًا اَوۡ نَصٰرٰى ؕ قُلۡ ءَاَنۡتُمۡ اَعۡلَمُ اَمِ اللّٰهُ ؕ وَمَنۡ اَظۡلَمُ مِمَّنۡ كَتَمَ شَهَادَةً عِنۡدَهٗ مِنَ اللّٰهِ ؕ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعۡمَلُوۡنَ ﴿۱۴۰﴾

ترجمہ: ''کیا تم کہتے ہو کہ ابراہیم، اسماعیل، اسحاق، یعقوب اور ان کی اولاد یہودی یا نصرانی تھے؟ کہہ دیجیے: کیا تم زیادہ جانتے ہو یا اللہ؟ اور اس سے بڑا ظالم کون ہے جو چھپائے وہ گواہی جو اللہ کی طرف سے ہے اس کے پاس؟ اور اللہ غافل نہیں ان اعمال سے جو تم کرتے ہو''۔

تفسیر اس آیت میں یہ حقیقت بیان کی گئی ہے کہ یہود و نصاریٰ یہ دعویٰ کیا کرتے تھے کہ حضرت ابراہیمؑ اور دوسرے انبیاء کرام، جن کا ذکر اس آیت میں آیا ہے، دراصل یہودی یا نصرانی تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے اس باطل دعوے کا جواب دیتے ہوئے فرمایا: ''بھلا زیادہ علم کس کے پاس ہے، تمہارے پاس یا اللہ کے پاس؟'' پھر اللہ نے واضح اعلان فرمایا کہ وہ بزرگ ہستیاں ہرگز یہود یا نصاریٰ نہ تھیں۔ دوسرے مقام پر حضرت ابراہیمؑ کے بارے میں صاف ارشاد ہوا:

مَا كَانَ اِبۡرٰهِيۡمُ يَهُوۡدِيًّا وَّلَا نَصۡرَانِيًّا وَّلٰكِنۡ كَانَ حَنِيۡفًا مُّسۡلِمًا ؕ وَمَا كَانَ مِنَ الۡمُشۡرِكِيۡنَ ﴿۶۷﴾

ترجمہ: ''نہیں تھے ابراہیمؑ یہودی اور نہ نصرانی اور لیکن تھے وہ سب سے کٹ کر (اللہ کے) فرماں بردار (مسلمان) اور نہیں تھے وہ مشرکوں میں سے۔ (سورہ آل عمران: ۶۷)

اس آیت میں فرمایا گیا ہے کہ اس سے بڑھ کر ظالم اور کون ہوسکتا ہے جو اللہ کی طرف سے پہنچائی گئی گواہی اور نشانیوں کو چھپالے! اے اہلِ کتاب! اللہ تمہارے کرتوتوں سے بے نیاز نہیں ہے۔ جب خود تورات اور انجیل میں خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی آمد کی بشارتیں درج تھیں، تو پھر ان حقائق کو چھپا دینا اور لوگوں کے سامنے ظاہر نہ کرنا نہ صرف ظلم ہے بلکہ بدترین خیانت ہے۔

خاص طور پر ایسے نبی کے بارے میں، جن کی اطاعت اور اتباع میں دنیا و آخرت کی کامیابی ہے، ان کی نشانیوں کو چھپانا دوہرا جرم ہے۔ لیکن یاد رکھو! اللہ تعالیٰ اس تحریف اور تبدیلی سے غافل نہیں جو تم نے اپنی کتابوں میں کی ہے۔ وہ سب کچھ جانتا اور دیکھ رہا ہے۔

آیت نمبر (۱۴۱) تِلۡكَ اُمَّةٌ قَدۡ خَلَتۡ ۚ لَهَا مَا كَسَبَتۡ وَلَكُمۡ مَّا كَسَبۡتُمۡ ۚ وَلَا تُسۡـَٔلُوۡنَ عَمَّا كَانُوۡا يَعۡمَلُوۡنَ ﴿۱۴۱﴾

ترجمہ: ''وہ ایک جماعت تھی جو گزر گئی، ان کے لیے وہ ہے جو انہوں نے کمایا اور تمہارے لیے وہ

ہے جو تم نے کمایا اور تم ان کے اعمال کے بارے میں سوال نہ کیے جاؤ گے''۔

تفسیر اس آیت کی تفسیر آیت نمبر ۱۳۴ میں گزر چکی ہے، یہاں دوبارہ یاددہانی کرائی گئی ہے کہ انسان کے لئے قیامت کے دن اس کے اپنے ہی اعمال کارآمد ہوں گے۔ محض نبی یا رسول کی نسبت اس دن کچھ فائدہ نہ دے گی۔ اس لئے گذشتہ امتوں کے بارے میں بحث وگفتگو میں نہ پڑو، کیونکہ ان کے اعمال کے بارے میں تم سے باز پرس نہیں ہوگی۔

تم سے تو تمہارے اپنے اعمال کے بارے میں سوال ہوگا۔ تم سے پوچھا جائے گا کہ کیا تم خاتم النبیین حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایمان لائے تھے یا نہیں؟ کیا تم نے ان کی شریعت کو اپنایا اور اس پر عمل کیا تھا یا نہیں؟ یہی اصل سوال ہے اور اسی پر انجام کا دارومدار ہے۔

❁❁❁

ترجمہ- آیت نمبر ۱۴۲ سے ۱۴۷ تک

سَيَقُوْلُ السُّفَهَآءُ مِنَ النَّاسِ مَا وَلّٰىهُمْ عَنْ قِبْلَتِهِمُ الَّتِيْ كَانُوْا عَلَيْهَا ۭ قُلْ لِّلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ ۭ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَاۗءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۝ وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَاۗءَ عَلَي النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا ۭ وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِيْ كُنْتَ عَلَيْهَآ اِلَّا لِنَعْلَمَ مَنْ يَّتَّبِعُ الرَّسُوْلَ مِمَّنْ يَّنْقَلِبُ عَلٰي عَقِبَيْهِ ۭ وَاِنْ كَانَتْ لَكَبِيْرَةً اِلَّا عَلَي الَّذِيْنَ هَدَى اللّٰهُ ۭ وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُضِيْعَ اِيْمَانَكُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ بِالنَّاسِ لَرَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ۝ قَدْ نَرٰى تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِي السَّمَاۗءِ ۚ فَلَنُوَلِّيَنَّكَ قِبْلَةً تَرْضٰىهَا ۠ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۭ وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ شَطْرَهٗ ۭ وَاِنَّ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ لَيَعْلَمُوْنَ اَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ ۭ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا يَعْمَلُوْنَ ۝ وَلَىِٕنْ اَتَيْتَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ بِكُلِّ اٰيَةٍ مَّا تَبِعُوْا قِبْلَتَكَ ۚ وَمَآ اَنْتَ بِتَابِعٍ قِبْلَتَهُمْ ۚ وَمَا بَعْضُهُمْ بِتَابِعٍ قِبْلَةَ بَعْضٍ ۭ وَلَىِٕنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَاۗءَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا جَاۗءَكَ مِنَ الْعِلْمِ ۙ اِنَّكَ اِذًا لَّمِنَ الظّٰلِمِيْنَ ۝ اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا يَعْرِفُوْنَ اَبْنَاۗءَهُمْ ۭ وَاِنَّ فَرِيْقًا مِّنْهُمْ لَيَكْتُمُوْنَ الْحَقَّ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ۝ اَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِيْنَ ۝

ترجمہ:

(۱۴۲) عنقریب کہیں گے نادان لوگ: کیا چیز ہے جس نے مسلمانوں کو ان کے قبلے سے پھیر دیا جس پر وہ تھے؟ کہہ دیجیے: مشرق اور مغرب سب اللہ ہی کے ہیں، وہ ہدایت دیتا ہے جسے چاہتا ہے سیدھے راستے کی طرف۔ (۱۴۳)۔ اور اسی طرح ہم نے تمہیں ایک درمیانی (معتدل) اُمت بنایا، تاکہ تم گواہ بنو لوگوں پر اور رسول تم پر گواہ بنیں اور ہم نے وہ قبلہ نہیں بنایا جس پر آپ (پہلے) تھے، مگر یہ دیکھنے کے لیے کہ کون رسول کی پیروی کرتا ہے اور کون پیٹھ پھیر جاتا ہے۔ اور یہ (قبلہ کی تبدیلی) بڑی بھاری تھی، مگر ان پر نہیں جنہیں اللہ نے ہدایت دی۔ اور اللہ تمہارے ایمان کو ضائع کرنے والا نہیں، یقیناً اللہ لوگوں پر بہت مہربان، نہایت رحم والا ہے۔ (۱۴۴)۔ ہم دیکھ رہے ہیں بار بار آپ کے چہرے کا آسمان کی طرف اٹھنا، تو ہم ضرور پھیر دیں گے آپ کو اس قبلے کی طرف جس کو آپ پسند کرتے ہیں۔ سو آپ اپنا رخ مسجدِ حرام کی طرف کیجیے، اور جہاں کہیں بھی ہو تم، اپنا چہرہ اسی طرف پھیرو۔ اور وہ لوگ

جنہیں کتاب دی گئی ہے، وہ خوب جانتے ہیں کہ یہ حق ہے ان کے رب کی طرف سے اور اللہ بے خبر نہیں اس سے جو وہ کرتے ہیں۔(۱۴۵)۔ اور اگر آپ ان لوگوں کے پاس ہر طرح کی نشانی بھی لے آئیں جنہیں کتاب دی گئی، وہ پھر بھی آپ کے قبلے کی پیروی نہیں کریں گے، اور نہ آپ ان کے قبلے کی پیروی کرنے والے ہیں اور نہ ان میں کوئی گروہ دوسرے کے قبلے کی پیروی کرتا ہے۔ اور اگر آپ نے ان کی خواہشات کی پیروی کی، اس کے بعد کہ علم آپ کے پاس آ چکا ہے، تو یقیناً آپ بھی ظالموں میں سے ہو جائیں گے۔(۱۴۶)۔ وہ لوگ جنہیں ہم نے کتاب دی، وہ پہچانتے ہیں اس (رسول) کو جیسے پہچانتے ہیں اپنی اولاد کو۔ مگر ان میں سے ایک گروہ جان بوجھ کر حق کو چھپاتا ہے۔(۱۴۷)۔ یہ حق ہے آپ کے رب کی طرف سے، لہٰذا آپ ہرگز شک کرنے والوں میں سے نہ ہوں۔

تفسیر- آیت نمبر ۱۴۲ سے ۱۴۷ تک

آیت نمبر (۱۴۲) سَيَقُوْلُ السُّفَهَآءُ مِنَ النَّاسِ مَا وَلّٰىهُمْ عَنْ قِبْلَتِهِمُ الَّتِيْ كَانُوْا عَلَيْهَا ؕ قُلْ لِّلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ ؕ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۱۴۲﴾

ترجمہ: ''عنقریب کہیں گے نادان لوگ: کیا چیز ہے جس نے مسلمانوں کو ان کے قبلے سے پھیر دیا جس پر وہ تھے؟ کہہ دیجیے: مشرق اور مغرب سب اللہ ہی کے ہیں، وہ ہدایت دیتا ہے جسے چاہتا ہے سیدھے راستے کی طرف''۔

تفسیر یہ واقعہ قبلہ کی تبدیلی کے بارے میں ہے، جسے قرآن نے ''سَيَقُوْلُ السُّفَهَآءُ'' کے الفاظ میں بیان کیا۔ ابن اسحاق، اسماعیل بن ابی خالد، ابو اسحاق کے واسطے سے حضرت براءؓ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ پہلے بیت المقدس کی طرف رخ کر کے نماز ادا کرتے تھے۔ آپ ﷺ اکثر آسمان کی طرف نظر اٹھایا کرتے، گویا اللہ کے حکم کے منتظر ہوں۔ آخر کار اللہ تعالیٰ نے یہ حکم نازل فرمایا کہ ہم آپ کے چہرے کو بار بار آسمان کی طرف اٹھتے دیکھ رہے ہیں، لہٰذا ہم آپ کو اسی قبلہ کی طرف پھیر دیتے ہیں جو آپ کی خواہش ہے۔ چنانچہ آپ ﷺ کو کعبہ کی طرف متوجہ ہونے کا حکم دیا گیا۔ اس تبدیلی پر بعض صحابہؓ نے کہا: ''جو لوگ ہم سے پہلے انتقال کر گئے ہیں، ان کی نمازوں کا کیا حکم ہوگا اور ہم نے جو بیت المقدس کی طرف رخ کر کے نمازیں ادا کیں، ان کا کیا ہوگا؟'' تو اللہ نے وحی نازل فرمائی کہ وہ تمہارے ایمان (نمازوں) کو ہرگز ضائع نہیں کرے گا۔ مگر ساتھ ہی فرمایا گیا کہ کچھ نادان لوگ اعتراض کریں گے کہ مسلمانوں نے اپنا قبلہ کیوں بدلا۔

قبلہ کی تبدیلی کی حکمت

ابتدائی حکم یہ تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بیت المقدس کی طرف رخ کر کے نماز ادا کریں۔ مکہ مکرمہ میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس طرح نماز پڑھتے کہ رکنِ یمانی اور حجرِ اسود کے درمیان کھڑے ہو کر کعبہ اور بیت المقدس دونوں کو سامنے رکھتے۔ مگر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دلی آرزو یہ تھی کہ قبلہ وہی قرار پائے جو حضرت آدمؑ اور حضرت ابراہیمؑ کا قبلہ تھا۔

مدینہ منورہ کی ہجرت کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سولہ یا سترہ ماہ تک اسی طرح بیت المقدس کی طرف رخ کر کے نمازیں پڑھیں، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے کعبہ کو قبلہ بنانے کا حکم نازل فرمایا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پہلی مرتبہ نمازِ عصر کعبہ کی طرف رخ کر کے ادا کی، جیسا کہ حضرت براءؓ کی روایت میں مذکور ہے (صحیح بخاری: ۴۰)۔

دوسرے دن اہلِ قبا کو فجر کے وقت اس تبدیلی کی خبر ملی۔ وہ لوگ نماز ہی کی حالت میں تھے کہ امام نے انہیں اطلاع دی، تو انہوں نے اسی وقت اپنا رخ بیت المقدس سے موڑ کر کعبہ کی طرف کر لیا۔

اعتراضات اور قرآن کا جواب

یہود، منافقین اور مشرکین نے اس تبدیلی پر طرح طرح کے اعتراضات کیے۔ کسی نے کہا کہ اللہ اپنے ہی احکام کیوں بدلتا ہے، کیا اسے پہلے علم نہ تھا؟ کچھ نے کہا کہ یہ تبدیلی دین میں شک کی علامت ہے۔ بعض نے طعنہ دیا کہ یہ تو محض وطن کی محبت کا نتیجہ ہے کہ مکہ والوں نے اپنے شہر کے کعبہ کو قبلہ بنا لیا۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن میں ان کے اعتراضات کا جواب پہلے ہی دے دیا تھا کہ: ''جلد ہی یہ نادان لوگ کہیں گے کہ مسلمانوں نے اپنا قبلہ کیوں بدلا''۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے فرمایا گیا کہ ان سے کہہ دیجیے: مشرق اور مغرب سب اللہ کے ہیں، وہ جس سمت کو چاہے قبلہ بنا دے اور جسے چاہے ہٹا دے۔ ہم تو اللہ کے حکم کے پابند ہیں، پہلے بیت المقدس کی طرف رخ کرنے کا حکم ملا تو وہاں رخ کیا، اب کعبہ کی طرف حکم آیا تو یہاں رخ کیا۔ اصل عبادت یہی ہے کہ بندہ اپنے رب کے حکم کے سامنے سراپا اطاعت بن جائے۔

ایک حدیث کی روشنی میں

سنن ابن ماجہ کی روایت ہے کہ حضرت عائشہؓ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''اہلِ کتاب مسلمانوں سے تین باتوں میں حسد کرتے ہیں: (۱) جمعہ کے دن کی فضیلت، جو اصل میں اللہ کے نزدیک عبادت کا دن ہے، جبکہ یہود نے سنیچر اور نصاریٰ نے اتوار مقرر کر لیا۔ (۲) دوسرا قبلہ، جو مسلمانوں کو کعبہ کی صورت میں عطا کیا گیا۔ (۳) تیسرا امام کے پیچھے 'آمین' کہنا۔ (سنن ابن ماجہ رقم: ۸۵۶) یہ تینوں خصوصیات صرف مسلمانوں کو حاصل ہوئیں، اہلِ کتاب ان سے محروم رہے''۔

آیت نمبر (۱۴۳) وَ كَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا ؕ وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِيْ كُنْتَ عَلَيْهَآ اِلَّا لِنَعْلَمَ مَنْ يَّتَّبِعُ الرَّسُوْلَ مِمَّنْ يَّنْقَلِبُ عَلٰى عَقِبَيْهِ ؕ وَاِنْ كَانَتْ لَكَبِيْرَةً اِلَّا عَلَى الَّذِيْنَ هَدَى اللّٰهُ ؕ وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُضِيْعَ اِيْمَانَكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ بِالنَّاسِ لَرَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۴۳﴾

ترجمہ: ''اور اسی طرح ہم نے تمہیں ایک درمیانی (معتدل) اُمت بنایا، تاکہ تم گواہ بنو لوگوں پر اور رسول تم پر گواہ بنیں اور ہم نے وہ قبلہ نہیں بنایا جس پر آپ (پہلے) تھے، مگر یہ دیکھنے کے لیے کہ کون رسول کی پیروی کرتا ہے اور کون پیٹھ پھیر جاتا ہے۔ اور یہ (قبلہ کی تبدیلی) بڑی بھاری تھی، مگر ان پر نہیں جنہیں اللہ نے ہدایت دی۔ اور اللہ تمہارے ایمان کو ضائع کرنے والا نہیں، یقیناً اللہ لوگوں پر بہت مہربان، نہایت رحم والا ہے''۔

تفسیر اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے امتِ محمدیہ کو ایک عظیم شرف بخشا ہے کہ اے اُمتِ محمد! ہم نے تمہیں ''امتِ وسط'' بنایا، یعنی ایک ایسی جماعت جو ہر پہلو سے اعتدال اور توازن پر قائم ہے۔ اس اعتدال کا نتیجہ یہ ہے کہ تمہیں دنیا میں عزت و سربلندی نصیب ہوئی اور آخرت میں بھی تمہیں عظیم مرتبہ دیا جائے گا، یہاں تک کہ قیامت کے دن جب ایک طرف انبیاء علیہم السلام ہوں گے اور دوسری طرف ان کی منکر قومیں، اس وقت تمہیں گواہی کے منصب پر فائز کیا جائے گا۔ یہ درحقیقت بہت بڑی عزت اور انعام ہے۔

امتِ وسط کا مفہوم

قرآن نے امتِ محمدیہ کے لیے ''امتِ وسط'' کا لفظ استعمال کیا۔ ''وسط'' کے معنیٰ ہیں اوسط اور معتدل، اور حدیث شریف میں اس کی تفسیر ''عدل'' سے کی گئی ہے، یعنی بہترین امت۔ اس امت کو توازن اور اعتدال کی راہ پر قائم کیا گیا ہے۔ اسی فضیلت کی بنیاد پر قیامت کے دن یہ امتیاز ملے گا کہ جب ہر نبی کی امت اپنے نبی کی ہدایت اور تبلیغ کا انکار کرے گی اور یہ کہے گی کہ نہ ہمارے پاس کوئی کتاب آئی تھی اور نہ ہی کوئی رسول، تب امتِ محمدیہ گواہ کے طور پر پیش کی جائے گی اور شہادت دے گی کہ ہاں! انبیاء نے اپنے فرائض ادا کیے، اللہ کا پیغام پہنچایا اور اپنی قوموں کو حق کی طرف بلایا۔

کفار کا اعتراض اور امت کا جواب

اس وقت کفار اعتراض کریں گے کہ امتِ محمدیہ تو ہمارے زمانے میں موجود ہی نہ تھی، یہ ہمارے حالات اور اعمال پر کیسے گواہی دے سکتی ہے؟ امت کہے گی: ''اگرچہ ہم تمہارے دور میں موجود نہ تھے، مگر ہمیں تمہارے حالات کا

علم ہمارے سچے نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دیا ہے اور اللہ کی کتاب نے ہمیں خبر دی ہے۔ ہم اس رسول اور اس کتاب پر ایمان رکھتے ہیں اور ان کی خبروں کو برحق مانتے ہیں، اس لیے ہماری شہادت سچی اور معتبر ہے''۔

پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان کی شہادت کی تصدیق فرمائیں گے کہ بے شک یہ امت جو کچھ کہہ رہی ہے حق ہے، کیونکہ اس نے یہ سب کچھ اللہ کی کتاب اور میری تعلیم سے جانا ہے۔ اس گواہی کے نتیجے میں کفار کا جرم ثابت ہو جائے گا اور ان کے انکار کی کوئی گنجائش باقی نہ رہے گی۔

قیامت کے دن گواہی

بخاری شریف کی حدیث میں حضرت ابو سعید خدریؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''قیامت کے دن حضرت نوحؑ کو بلایا جائے گا۔ وہ عرض کریں گے: اے میرے رب! میں حاضر ہوں اور تیرا فرمانبردار ہوں''۔ اللہ تعالیٰ ان سے پوچھے گا: ''کیا تم نے ہمارا پیغام اپنی قوم کو پہنچا دیا تھا؟'' وہ عرض کریں گے: ''جی ہاں، اے میرے رب!'' پھر ان کی قوم سے سوال ہوگا: ''کیا نوحؑ نے تم تک ہمارا پیغام نہیں پہنچایا تھا؟'' وہ جواب دیں گے: ''ہمارے پاس تو کوئی ڈرانے والا نہیں آیا''۔ اس پر اللہ تعالیٰ حضرت نوحؑ سے فرمائے گا: ''کیا تمہارے حق میں کوئی گواہ ہے؟'' وہ کہیں گے: ''ہاں، محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ان کی امت''۔

پھر امتِ محمد یہ گواہی دے گی کہ حضرت نوحؑ نے اپنی قوم تک اللہ کا پیغام پہنچا دیا تھا۔ اور تم پر، اے امتِ مسلمہ، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم گواہ ہوں گے۔ یہی اللہ تعالیٰ کے فرمان ''وَ كَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا'' کا مفہوم ہے۔ (صحیح بخاری، التفسیر، باب ۱۳، حدیث ۴۴۸۷)

گواہی کا مقام

علمائے تفسیر نے لکھا ہے کہ اس آیت کے مطابق مسلمانوں کو لوگوں پر گواہ بنایا گیا ہے، اور ان کی شہادت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شہادت کے قائم مقام ہے۔ اس کا ایک دوسرا مفہوم یہ بھی ہے کہ امتِ مسلمہ کو حق کی دعوت پہنچانے اور بھلائی کا حکم دینے کے ساتھ برائی سے روکنے کی ذمہ داری دی گئی ہے، جیسا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اللہ کے دین کی طرف بلانے کی ذمہ داری ادا کی۔

مجاہدؒ اس آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں: ''تمہیں اس لیے گواہ بنایا گیا تاکہ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیے یہود، نصاریٰ، مجوسی اور دیگر اقوام (ہنود وغیرہ) کو دینِ اسلام کی طرف بلاؤ، نیکی کا حکم دو اور برائی سے روکو۔ یہی دعوتِ اسلام کی بنیاد اور اس کی اصل روح ہے''۔

زمین پر اللہ کے گواہ

حضرت انس بن مالک ؓ سے روایت ہے کہ صحابہ کرام ؓ ایک جنازے کے پاس سے گزرے اور اس کی بھلائی بیان کی۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''واجب ہوگئی۔'' پھر ایک اور جنازے کے پاس سے گزرے اور اس کی برائی ذکر کی۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''واجب ہوگئی۔''

حضرت عمر ؓ نے عرض کیا: ''یارسول اللہ! کیا چیز واجب ہوگئی؟'' آپ ﷺ نے فرمایا: ''تم نے اس کے حق میں بھلائی بیان کی تو اس کے لیے جنت واجب ہوگئی، اور جس کے بارے میں برائی بیان کی تو اس کے لیے جہنم واجب ہوگئی۔ تم زمین پر اللہ کے گواہ ہو''۔ **(بخاری: ۱۳۶۷)**

بیت اللہ کی طرف نماز

امام حاکم نے ایک روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے آیت ''وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِيْ...'' تلاوت کی اور فرمایا: ''اے محمد ﷺ! ہم نے آپ کو پہلے بیت المقدس کی طرف نماز پڑھنے کا حکم دیا تھا، پھر کعبہ کی طرف رخ کرنے کا حکم دیا، تاکہ معلوم ہوجائے کہ کون آپ کی فرمانبرداری کرتا ہے اور کون دین سے پھر جاتا ہے۔ بیت المقدس سے کعبہ کی طرف رخ کرلینا مومنوں پر تو آسان تھا لیکن کافروں اور منافقوں پر یہ بات بہت شاق گزری''۔

حضرت براء بن عازب ؓ سے روایت ہے کہ جب نبی کریم ﷺ مدینہ منورہ تشریف لائے تو آپ اپنی والدہ کے رشتہ داروں کے ہاں مقیم ہوئے۔ آپ ﷺ نے پہلے بیت المقدس کی طرف رخ کرکے ۱۶ یا ۱۷ ماہ نماز پڑھی، لیکن آپ کی دلی خواہش تھی کہ بیت اللہ کو قبلہ بنایا جائے۔ پھر پہلی نماز جو آپ ﷺ نے کعبہ کی طرف رخ کرکے ادا کی وہ عصر کی نماز تھی۔ صحابہ ؓ بھی آپ کے ساتھ شامل ہوئے۔ ان میں سے ایک صحابی ؓ دوسرے روز فجر کے وقت ایک مسجد میں پہنچے جہاں لوگ رکوع میں تھے۔ انہوں نے کہا: ''میں اللہ کو گواہ بنا کر کہتا ہوں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ کعبہ کی طرف منہ کرکے نماز ادا کی ہے''۔ یہ سنتے ہی لوگوں نے نماز کے دوران اپنا رخ بیت اللہ کی طرف پھیر لیا۔ **(بخاری: ۳۹۹)**

یہ تبدیلی میں ایک سخت امتحان تھا۔ کچھ لوگ اس آزمائش میں ناکام ہوگئے، کچھ مرتد ہوگئے اور منافقین نے اپنے دل کا نفاق ظاہر کردیا۔ وہ کہنے لگے: ''محمد ﷺ کبھی ادھر پھیرتے ہیں کبھی ادھر''۔ مشرکین نے کہا: ''انہیں اپنے دین میں شک پڑ گیا ہے''۔ حتیٰ کہ کچھ مسلمانوں کے دل میں بھی کھٹکا پیدا ہوا کہ جو نمازیں بیت المقدس کی طرف رخ کرکے ادا کی گئیں ان کا کیا ہوگا؟ اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان کو تسلی دی اور فرمایا: ''اللہ تمہارے ایمان کو ضائع نہیں کرے گا''۔ یہاں ''ایمان'' سے مراد نماز ہے۔

حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ جب قبلہ تبدیل ہوا تو صحابہؓ نے عرض کیا: ''یارسول اللہ! ان لوگوں کا کیا حال ہوگا جو بیت المقدس کی طرف نمازیں پڑھتے رہے اور اب وفات پا گئے؟'' اس پر اللہ تعالیٰ نے آیت نازل فرمائی کہ ''اللہ تمہارے ایمان (نمازوں) کو ہرگز ضائع نہ کرے گا''۔ (بخاری: ۴۰) اس سے نماز کی عظمت اور فضیلت واضح ہوگئی۔

آخر میں فرمایا گیا کہ اللہ ''حکیم'' بھی ہے اور ''حاکم'' بھی، یعنی اس کا ہر حکم حکمت پر مبنی ہے۔ اس نے پہلے بیت المقدس کی طرف رخ کرنے کا حکم دیا اور پھر کعبہ کی طرف اور دونوں ہی اللہ کے حکم سے ادا کیے گئے۔ اس لیے یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ نمازیں ضائع ہو جائیں؟

آیت نمبر (۱۴۴) قَدْ نَرٰى تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِي السَّمَآءِ ۚ فَلَنُوَلِّيَنَّكَ قِبْلَةً تَرْضٰىهَا ۪ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ؕ وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ شَطْرَهٗ ؕ وَاِنَّ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ لَيَعْلَمُوْنَ اَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ ؕ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۴۴﴾

ترجمہ: ''ہم دیکھ رہے ہیں بار بار آپ کے چہرے کا آسمان کی طرف اٹھنا، تو ہم ضرور پھیر دیں گے آپ کو اس قبلے کی طرف جس کو آپ پسند کرتے ہیں۔ سو آپ اپنا رخ مسجدِ حرام کی طرف کیجیے، اور جہاں کہیں بھی ہو تم، اپنا چہرہ اسی طرف پھیرو۔ اور وہ لوگ جنہیں کتاب دی گئی ہے، وہ خوب جانتے ہیں کہ یہ حق ہے ان کے رب کی طرف سے اور اللہ بے خبر نہیں اس سے جو وہ کرتے ہیں''۔

تفسیر بخاری و مسلم میں حضرت براء بن عازبؓ سے روایت ہے کہ جب قبلہ بیت المقدس تھا تو اس کی تبدیلی سے پہلے چند صحابہ کرامؓ کا انتقال ہو گیا اور کچھ جہاد میں شہید ہوئے۔ صحابہؓ کو خیال ہوا کہ ان کی نمازوں کا کیا حکم ہوگا؟ اسی پر یہ آیت نازل ہوئی: ''وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُضِيْعَ اِيْمَانَكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ بِالنَّاسِ لَرَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ''۔ (بخاری: ۴۰)

● ابن جریر نے سند کے ساتھ سدیؒ سے روایت نقل کی ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ نے بیت المقدس کے بجائے کعبہ کی طرف رخ کر کے نماز پڑھنا شروع کیا تو مشرکین نے اہلِ مکہ سے کہا: ''محمد ﷺ اپنے دین میں الجھن میں پڑ گئے ہیں، اسی لیے اپنے قبلے کو چھوڑ کر تمہاری طرف متوجہ ہو گئے ہیں۔ یہ اس بات کی علامت ہے کہ وہ سمجھ چکے ہیں کہ تم ان سے زیادہ سیدھی راہ پر ہو، اور قریب ہے کہ وہ تمہارے دین میں داخل ہو جائیں۔'' اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: ''لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ''۔

یہ آیت تلاوت کے اعتبار سے بعد میں ذکر ہوئی ہے مگر معنوی طور پر پہلے کی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ مدینہ منورہ آنے کے بعد اللہ کے حکم سے بیت المقدس کی طرف رخ کر کے نماز ادا کرتے رہے اور دل میں

یہ آرزو رکھتے تھے کہ کاش قبلہ مسجد حرام ہو جائے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرما کر رسول اللہ ﷺ کی تمنا پوری فرمائی۔

حضرت ابن عباس ؓ سے روایت ہے کہ جب آپ ﷺ بیت المقدس کی طرف رخ کر کے نماز ادا کرتے تو سلام کے بعد بار بار آسمان کی طرف دیکھتے، اس انتظار میں کہ حکم آئے اور قبلہ کعبہ شریف مقرر ہو جائے۔ آخر کار یہ آیت نازل ہوئی اور آپ ﷺ کی آرزو پوری ہوئی۔

اس آیت میں مسجد حرام کا ذکر کر کے اس طرف بھی اشارہ فرمایا گیا ہے کہ کعبہ کی طرف رخ کرنا واجب ہے، لیکن لازمی نہیں کہ صرف عین کعبہ کی جانب رخ کیا جائے۔ اسی لیے فقہاء نے فرمایا ہے کہ کعبہ کی سمت کی طرف رخ ہونا کافی ہے، خواہ تھوڑا سا فرق ہی کیوں نہ ہو۔ مثال کے طور پر ہندو پاک کے خطے میں مشرق و مغرب کے درمیان جو سمت ہے، اسی رخ پر نماز ادا کرنا درست ہے۔

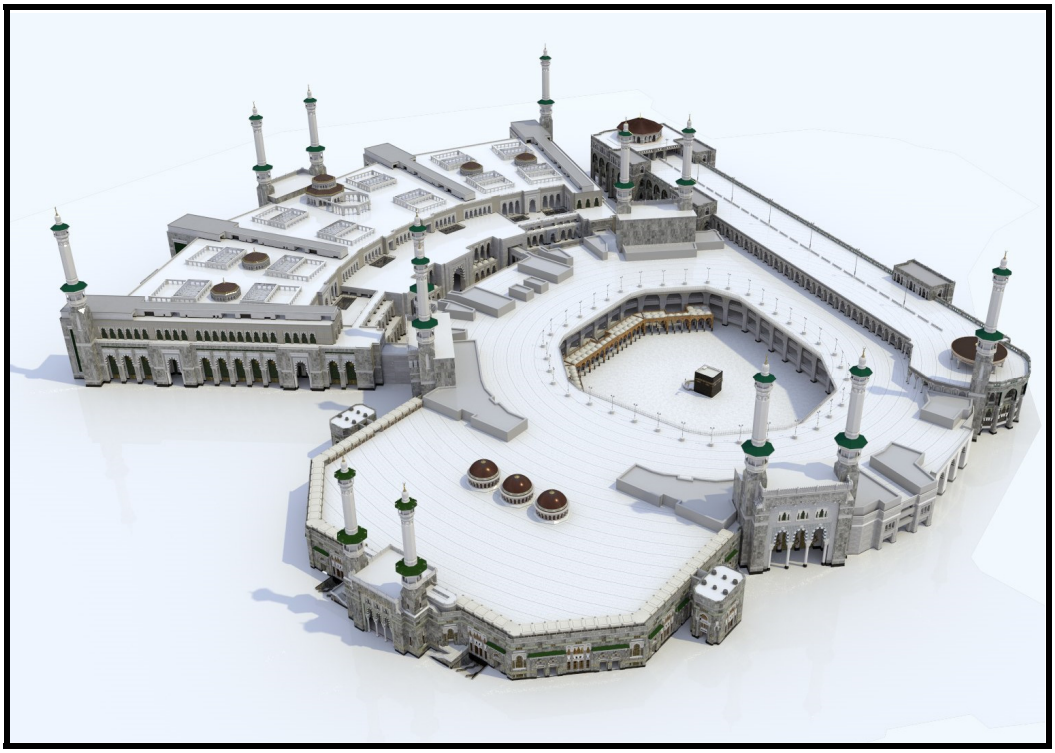
یہ بات دراصل اہلِ مدینہ کے لیے بیان کی گئی تھی، کیونکہ وہاں سے کعبہ شمال کی سمت واقع ہے اور یہ رخ مشرق و مغرب کے درمیان آتا ہے۔ اس میں پوری دنیا کے مسلمانوں کے لیے آسانی رکھ دی گئی کہ جہاں بھی ہوں، اسی جانب رخ کر کے نماز ادا کر سکیں۔

''مسجد حرام'' اس عظیم مسجد کا نام ہے جو کعبہ شریف کے گرد واقع ہے، اور اس پر پوری امت کا اتفاق ہے کہ قبلہ کعبہ ہی ہے۔ چونکہ کعبہ مسجد کے اندر ہے، اس لیے حکم مسجد حرام کی طرف رخ کرنے کا دیا گیا۔ اس میں یہ حکمت بھی ہے کہ ہر دور و نزدیک کے نمازی کے لیے آسانی ہو۔ البتہ جو شخص مسجد حرام کے اندر موجود ہو، اس کے لیے لازم ہے کہ وہ عین کعبہ کی طرف رخ کرے۔ **(تفسیر قرطبی، حصہ ۲، صفحہ ۱۵۹)**

آگے کی آیت میں یہودیوں کے بارے میں بیان کیا گیا ہے کہ ان کی ضد اور اعتراض دراصل حسد پر مبنی ہے۔ وہ جانتے تھے کہ محمد ﷺ ہی وہ نبی ہیں جن کی بشارت ان کی اپنی کتابوں میں موجود ہے اور جو ہرگز باطل کا حکم نہیں دیتے۔ **(روح المعانی)**

یہود اپنے انبیاء کے ذریعے اور اپنی کتابوں کی روشنی میں بخوبی واقف تھے کہ محمد ﷺ کی نبوت برحق ہے، ان کی امت کے اوصاف عظیم ہیں، اور یہ کہ آخری دین اسلام ہوگا جو پوری انسانیت کی ہدایت کے لیے آئے گا۔ وہ یہ بھی جانتے تھے کہ آخری نبی کا قبلہ کعبہ ہوگا۔ مگر حسد نے ان کی آنکھوں پر پردہ ڈال دیا، چنانچہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ کی دیگر صفات کی طرح کعبہ کے قبلہ ہونے کا بھی انکار کر دیا۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے انھیں سخت وعید سنائی اور فرمایا کہ وہ ان کے اعمال و حرکات سے غافل نہیں۔ آخر کار یہ لوگ اپنے کفر اور برے اعمال کی سزا ضرور پائیں گے۔

مسجد حرام کا نقشہ اور درمیان میں بیت اللہ شریف



آیت نمبر (۱۴۵) وَلَئِنْ اَتَيْتَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ بِكُلِّ اٰيَةٍ مَّا تَبِعُوْا قِبْلَتَكَ ۚ وَمَآ اَنْتَ بِتَابِعٍ قِبْلَتَهُمْ ۚ وَمَا بَعْضُهُمْ بِتَابِعٍ قِبْلَةَ بَعْضٍ ؕ وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَآءَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ ۙ اِنَّكَ اِذًا لَّمِنَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۴۵﴾

ترجمہ: ''اور اگر آپ ان لوگوں کے پاس ہر طرح کی نشانی بھی لے آئیں جنہیں کتاب دی گئی، وہ پھر بھی آپ کے قبلے کی پیروی نہیں کریں گے، اور نہ آپ ان کے قبلے کی پیروی کرنے والے ہیں اور نہ ان میں کوئی گروہ دوسرے کے قبلے کی پیروی کرتا ہے۔ اور اگر آپ نے ان کی خواہشات کی پیروی کی، اس کے بعد کہ علم آپ کے پاس آچکا ہے، تو یقیناً آپ بھی ظالموں میں سے ہو جائیں گے''۔

تفسیر اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے یہود و نصاریٰ کے کفر، ضد اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ہر بات میں مخالفت کی حقیقت واضح فرمائی ہے۔ بتایا گیا ہے کہ اگر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے دین کی سچائی کے لیے تمام دلیلیں اور حجتیں ان کے سامنے

پیش کر دیں، تب بھی وہ آپ کی فرمانبرداری نہیں کریں گے اور اپنی نفسانی خواہشات کی غلامی سے آزاد نہیں ہوں گے۔ ان کا انکار کسی شک یا جہالت کی وجہ سے نہیں، بلکہ محض غرور اور تکبر کی بنیاد پر ہے۔

اس کے بعد فرمایا گیا کہ آپ ﷺ کے پاس اللہ کی طرف سے علم اور یقین پہنچا، اور یہ معلوم ہوا کہ یہ لوگ اپنی خواہشات کے پیچھے چلتے ہیں اور حق کو قبول کرنے کا ارادہ نہیں رکھتے۔ لہٰذا اگر آپ ﷺ نے ان کی تقلید کی، تو آپ بھی ان ظالموں میں شمار ہو جائیں گے۔ اس آیت کے ذریعے یہ بھی واضح کیا گیا ہے کہ نفسانی خواہشات کی پیروی سے بچنا لازم ہے اور انبیاءؑ پر گناہ کا امکان نہیں، کیونکہ گناہ اور ظلم کا ارتکاب صرف وہ لوگ کرتے ہیں جو اپنی نفسانی خواہشات کے تابع ہوں۔ انبیاءؑ ہر قسم کے ظلم اور گناہ سے پاک و محفوظ ہیں۔ **(روح المعانی، حصہ ۱، صفحہ ۱۲)**

آیت نمبر (۱۴۶) اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا يَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَهُمْ ؕ وَاِنَّ فَرِيْقًا مِّنْهُمْ لَيَكْتُمُوْنَ الْحَقَّ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۴۶﴾

ترجمہ: ”وہ لوگ جنہیں ہم نے کتاب دی، وہ پہچانتے ہیں اس (رسول) کو جیسے پہچانتے ہیں اپنی اولاد کو۔ مگر ان میں سے ایک گروہ جان بوجھ کر حق کو چھپاتا ہے“۔

تفسیر حضرت عبداللہ بن سلامؓ، جو یہود کے علما میں سے تھے، نے پہلی ہی نظر میں پہچان لیا کہ حضرت محمد ﷺ واقعی اللہ کے رسول ہیں۔ انہوں نے اسلام قبول کیا اور کہا کہ میں رسول اللہ ﷺ کو پہچاننے میں اتنا یقین رکھتا ہوں جتنا اپنے بیٹے کو پہچاننے میں نہیں رکھتا۔ حضرت عمرؓ نے اس پر وضاحت کی کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اپنے بیٹے کے بارے میں اس یقین سے گواہی نہیں دے سکتے، کیونکہ وہ نہیں جانتے کہ عورتیں مردوں کے پیچھے کیا کرتی ہیں اور ممکن ہے کہ ان کی بیوی نے خیانت کی ہو، اور جسے وہ اپنا بیٹا کہہ رہے ہیں، وہ اصل میں ان کا بیٹا نہ ہو۔ (درّ المنثور، حصہ ۱، صفحہ ۱۴۷) یعنی یہاں رسول اللہ ﷺ کو آخری نبی کی پہچان کے سلسلے میں یقین کرنے کی بات کہی گئی ہے۔

آیت نمبر (۱۴۷) اَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِيْنَ ﴿۱۴۷﴾

ترجمہ: ”یہ حق ہے آپ کے رب کی طرف سے، لہٰذا آپ ہرگز شک کرنے والوں میں سے نہ ہوں“۔

تفسیر حضرت محمد ﷺ اور مومنین کے لئے اس میں اور یقین دہانی ہے کہ رسول اللہ ﷺ پر جو قرآن نازل ہوا اور انھیں جو دین دے کر بھیجا گیا ہے وہی حق ہے، جس میں کسی طرح کے کوئی شک کی گنجائش نہیں ہے، اس لئے آپ کی امت حق پر ہے اِس میں کوئی شبہ نہ کرے۔ ❁❁❁

ترجمہ- آیت نمبر ۱۴۸ سے ۱۵۷ تک

وَلِكُلٍّ وِّجْهَةٌ هُوَ مُوَلِّيْهَا فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرٰتِ ۭ اَيْنَ مَا تَكُوْنُوْا يَاْتِ بِكُمُ اللّٰهُ جَمِيْعًا ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۱۴۸﴾ وَمِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۭ وَاِنَّهٗ لَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ ۭ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۴۹﴾ وَمِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۭ وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ شَطْرَهٗ ۙ لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَيْكُمْ حُجَّةٌ ۣ اِلَّا الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْهُمْ فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَاخْشَوْنِيْ ۣ وَلِاُتِمَّ نِعْمَتِيْ عَلَيْكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ﴿۱۵۰﴾ كَمَآ اَرْسَلْنَا فِيْكُمْ رَسُوْلًا مِّنْكُمْ يَتْلُوْا عَلَيْكُمْ اٰيٰتِنَا وَيُزَكِّيْكُمْ وَيُعَلِّمُكُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُعَلِّمُكُمْ مَّا لَمْ تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۵۱﴾ فَاذْكُرُوْنِيْٓ اَذْكُرْكُمْ وَاشْكُرُوْا لِيْ وَلَا تَكْفُرُوْنِ ﴿۱۵۲﴾ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ ﴿۱۵۳﴾ وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ ۭ بَلْ اَحْيَاۗءٌ وَّلٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ ﴿۱۵۴﴾ وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ وَالثَّمَرٰتِ ۭ وَبَشِّرِ الصّٰبِرِيْنَ ﴿۱۵۵﴾ الَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌ ۙ قَالُوْٓا اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ ﴿۱۵۶﴾ اُولٰۗىِٕكَ عَلَيْهِمْ صَلَوٰتٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ ۟ وَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْمُهْتَدُوْنَ ﴿۱۵۷﴾

ترجمہ:

(۱۴۸)۔ ہر ایک کے لیے ایک سمت (رخ) ہے جس کی طرف وہ رخ کرتا ہے، تو نیکیوں میں سبقت کرو۔ جہاں کہیں بھی تم ہو، اللہ تمہیں اکٹھا کرلے گا، بے شک اللہ ہر چیز پر پوری قدرت رکھتا ہے۔(۱۴۹)۔اور جہاں سے بھی آپ نکلیں، تو اپنا چہرہ مسجدِ حرام کی طرف پھیریں اور یقیناً یہ آپ کے رب کی طرف سے حق ہے اور اللہ اس سے بے خبر نہیں جو تم کرتے ہو۔(۱۵۰)۔ اور جہاں سے بھی آپ روانہ ہوں، تو اپنا رخ نماز کے وقت مسجدِ حرام کی طرف ہی کریں، (یعنی) اور تم جہاں کہیں بھی ہو، تو اپنے چہرے اسی کی طرف پھیرو، تاکہ لوگوں کے پاس تمہارے خلاف کوئی دلیل نہ رہے، سوائے ان لوگوں کے جنہوں نے ظلم کیا ان میں سے۔تو ان سے مت ڈرو اور مجھ ہی سے ڈرو اور تاکہ میں اپنی نعمت تم پر مکمل کروں اور تاکہ تم ہدایت پاجاؤ۔(۱۵۱)۔جس طرح ہم نے تم میں تمہیں میں سے ایک رسول بھیجا، جو تمہیں ہماری آیات سناتا ہے، تمہیں پاک کرتا ہے، تمہیں کتاب اور حکمت سکھاتا ہے اور وہ باتیں بھی سکھاتا ہے جو تم

پہلے نہیں جانتے تھے۔(۱۵۲)۔ پس تم مجھے یاد رکھو، میں تمہیں یاد رکھوں گا اور میرے شکر گزار بنو اور ناشکری نہ کرو۔(۱۵۳)۔ اے ایمان والو! صبر اور نماز کے ذریعے مدد حاصل کرو، یقیناً اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔(۱۵۴)۔ اور جو لوگ اللہ کے راستے میں قتل (یعنی شہید) کر دیے جائیں، انہیں مردہ نہ کہو، بلکہ وہ زندہ ہیں، لیکن تمہیں ان کی زندگی کا شعور نہیں۔(۱۵۵)۔ اور ہم ضرور آزمائیں گے تمہیں کسی نہ کسی چیز سے، جیسے خوف، بھوک، اور مال و جان اور پھلوں کے نقصان سے۔ اور خوشخبری دے دو صبر کرنے والوں کو۔(۱۵۶)۔ یہ وہ لوگ ہیں کہ جب ان پر کوئی مصیبت آتی ہے، تو کہتے ہیں: ''یقیناً ہم اللہ ہی کے لیے ہیں اور ہم اسی کی طرف لوٹ کر جانے والے ہیں۔''(۱۵۷)۔ یہی لوگ ہیں جن پر ان کے رب کی طرف سے رحمتیں ہیں اور بخشش ہے اور یہی لوگ ہدایت یافتہ ہیں۔

تفسیر-آیت نمبر ۱۴۸ سے ۱۵۷ تک

آیت نمبر (۱۴۸) وَلِكُلٍّ وِّجْهَةٌ هُوَ مُوَلِّيْهَا فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرٰتِ ۭ اَيْنَ مَا تَكُوْنُوْا يَاْتِ بِكُمُ اللّٰهُ جَمِيْعًا ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۱۴۸﴾

ترجمہ: ''ہر ایک کے لیے ایک سمت (رخ) ہے جس کی طرف وہ رخ کرتا ہے، تو نیکیوں میں سبقت کرو۔ جہاں کہیں بھی تم ہو، اللہ تمہیں اکٹھا کر لے گا، بے شک اللہ ہر چیز پر پوری قدرت رکھتا ہے''۔

تفسیر اس آیت سے واضح ہوتا ہے کہ ہر دین یا ملت کے لیے عبادت کا ایک مخصوص رخ مقرر ہے، جس کی طرف وہ اپنے اعمال اور عبادات میں رخ کرتے ہیں۔ مسلمانوں کے لیے یہ قبلہ کعبہ ہے، اور اس کا مقصد یہ بھی ہے کہ دنیا میں مختلف طریقے اور مذاہب پائے جاتے ہیں، لیکن حقیقی دین صرف اسلام ہے۔

اس آیت میں خیرات سے مراد تمام نیک اعمال ہیں جن کے ذریعے انسان دنیا اور آخرت میں کامیابی اور نجات حاصل کر سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو نصیحت فرماتے ہیں کہ ہر بھلائی اور نیک عمل کی طرف بڑھو، کیونکہ جب انسان کو یقین ہو جائے کہ اللہ تعالیٰ اسے دوبارہ زندہ کرے گا اور اعمال کا پورا بدلہ دے گا، تو وہ آخرت کی تیاری میں دل جمعی اور تیزی دکھائے گا۔

یہ بھی بتایا گیا ہے کہ مسلمانوں کا رخ مختلف شہروں میں مختلف سمتوں کی طرف نظر آتا ہے، لیکن حقیقت میں قبلہ واحد کعبہ ہے۔ پورب، پچھّم، اتّر اور دکّھن میں رہنے والے افراد مختلف سمتوں کی طرف نماز پڑھتے ہیں، مگر ان کا اصل رخ ہمیشہ کعبہ کی طرف ہوتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ تم جہاں کہیں بھی ہو، اللہ تمہارے اعمال کا پورا بدلہ دینے کے لیے تم سب کو جمع کرے گا۔ وہ ہر چیز پر قادر ہے بی زندگی دینا ہو یا موت دینا، یا سب کو جمع کرنا، یہ سب اس کے لیے آسان اور ممکن ہے۔

آیت نمبر (۱۴۹) وَمِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۖ وَإِنَّهُ لَلْحَقُّ مِنْ رَبِّكَ ۗ وَمَا اللَّهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُونَ ﴿۱۴۹﴾

ترجمہ: ''اور جہاں سے بھی آپ نکلیں، تو اپنا چہرہ مسجدِ حرام کی طرف پھیریں اور یقیناً یہ آپ کے رب کی طرف سے حق ہے اور اللہ اس سے بے خبر نہیں جو تم کرتے ہو''۔

تفسیر قبلہ کی تبدیلی کے وقت حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مدینہ منورہ میں مقیم تھے، اور چونکہ قبلہ کی سمت ایک اہم اور عظیم حکم تھی، اس لیے سفر کے دوران ایک الگ ہدایت بھی جاری کی گئی۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ جس طرح تم اپنے قیام گاہ میں نماز کے دوران کعبہ کی طرف رخ کرتے ہو، اسی طرح سفر کے دوران بھی اپنا چہرہ نماز میں مسجدِ حرام یعنی کعبہ کی طرف رکھو۔

اس سے واضح ہو گیا کہ یہ حکم ہر حالت میں نافذ ہے اور یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے، جو تمہارے ہر عمل اور ہر حرکت سے باخبر ہے۔ لہٰذا سفر کے دوران بھی نماز میں قبلہ کی طرف رخ کرنا فرض ہے۔ اس حکم کی وضاحت اس لیے بھی کی گئی تا کہ کسی کو یہ شک نہ رہے کہ یہ ہدایت صرف حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیے مخصوص ہے، بلکہ یہ تمام اہلِ اسلام کے لیے ہے اور ہر مومن کو اس پر عمل کرنا واجب ہے۔

آیت نمبر (۱۵۰) وَمِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۖ وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوا وُجُوهَكُمْ شَطْرَهُ لِئَلَّا يَكُونَ لِلنَّاسِ عَلَيْكُمْ حُجَّةٌ إِلَّا الَّذِينَ ظَلَمُوا مِنْهُمْ فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَاخْشَوْنِي وَلِأُتِمَّ نِعْمَتِي عَلَيْكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ ﴿۱۵۰﴾

ترجمہ: ''اور جہاں سے بھی آپ روانہ ہوں، تو اپنا رخ نماز کے وقت مسجدِ حرام کی طرف ہی کریں، (یعنی) اور تم جہاں کہیں بھی ہو، تو اپنے چہرے اسی کی طرف پھیرو، تا کہ لوگوں کے پاس تمہارے خلاف کوئی دلیل نہ رہے، سوائے ان لوگوں کے جنہوں نے ظلم کیا ان میں سے۔ تو ان سے مت ڈرو اور مجھ ہی سے ڈرو اور تا کہ میں اپنی نعمت تم پر مکمل کروں اور تا کہ تم ہدایت پا جاؤ''۔

تفسیر اسی طرح اللہ تعالیٰ نے تمام مسلمانوں کو ہدایت دی کہ جہاں کہیں بھی ہوں، نماز میں اپنا رخ ہمیشہ مسجدِ حرام یعنی کعبہ کی طرف رکھیں۔ پھر فرمایا گیا کہ قبلہ کی تبدیلی اسی لیے مقرر کی گئی تا کہ دشمن اور مخالف لوگ یہ کہیں کہ اگر محمد

صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم واقعی آخری نبی ہیں تو ان کی علامت یہ ہونی چاہیے کہ وہ ہمیشہ کعبہ کی طرف رخ کریں، حالانکہ وہ بیت المقدس کی طرف نماز پڑھتے ہیں۔ یہ حکمت بھی اللہ کی ایک حکمت کا حصہ ہے کہ قبلہ کو بدلا گیا۔

البتہ جو لوگ بالکل بھی انصاف کے دائرے میں نہیں ہیں، وہ پھر بھی اعتراض کریں گے اور کہیں گے کہ یہ نبی کیسے ہیں جو اپنے سے پہلے کے نبیوں کے خلاف کعبہ کی طرف نماز پڑھتے ہیں۔ مگر ایسے اعتراضات دینِ حق کو نقصان نہیں پہنچا سکتے۔ اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ ان لوگوں کے اعتراض سے نہ گھبراؤ اور ان کی فکر میں مبتلا نہ ہو، بلکہ صرف مجھ سے ڈرو تاکہ ہمارے احکام کی مخالفت نہ ہو۔

اور اس پر عمل کرنے کی توفیق دینے کا مقصد یہ ہے کہ تم پر اللہ کا انعام ہو، تمہیں جنت میں داخل کرے اور دنیا میں راہِ حق یعنی اسلام پر ثابت قدم رکھنے والوں میں شمار کرے۔

آیت نمبر (۱۵۱) كَمَآ اَرْسَلْنَا فِيْكُمْ رَسُوْلًا مِّنْكُمْ يَتْلُوْا عَلَيْكُمْ اٰيٰتِنَا وَيُزَكِّيْكُمْ وَيُعَلِّمُكُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُعَلِّمُكُمْ مَّا لَمْ تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۵۱﴾

ترجمہ: ''جس طرح ہم نے تم میں تمہیں میں سے ایک رسول بھیجا، جو تمہیں ہماری آیات سناتا ہے، تمہیں پاک کرتا ہے، تمہیں کتاب اور حکمت سکھاتا ہے اور وہ باتیں بھی سکھاتا ہے جو تم پہلے نہیں جانتے تھے''۔

تفسیر اس آیت میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ہم نے تمہیں نمازوں میں کعبہ کی طرف رخ کرنے کا حکم دیا تاکہ تم پر اپنی نعمتیں پوری ہوں۔ اسی طرح ہم نے تمہارے درمیان اپنا ایک رسول بھیجا جو تمہیں ہماری آیات کی تلاوت سناتا اور تمہارا تزکیہ کرتا ہے، تاکہ اس کی تعلیمات پر عمل کرنے سے تم ظاہری اور باطنی برائی سے پاک ہو جاؤ۔ وہ تمہیں کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے اور وہ باتیں بتاتا ہے جو تم پہلے نہیں جانتے تھے، جنہیں جاننے کا طریقہ صرف وحی کے ذریعہ ہی ممکن تھا۔ ہم نے اپنا رسول بھیجا اور اس پر وحی نازل کی تاکہ تمہیں مکمل رہنمائی حاصل ہو۔ لہٰذا تم میرا ذکر کرو، میری یاد میں رہو، میری نعمتوں کا شکر ادا کرو اور میری ناشکری نہ کرو۔

آیت نمبر (۱۵۲) فَاذْكُرُوْنِيْٓ اَذْكُرْكُمْ وَاشْكُرُوْا لِيْ وَلَا تَكْفُرُوْنِ ﴿۱۵۲﴾

ترجمہ: ''پس تم مجھے یاد رکھو، میں تمہیں یاد رکھوں گا اور میرے شکر گزار بنو اور ناشکری نہ کرو''۔

تفسیر ان احسانات کا مقصد یہ ہے کہ تم ہمیشہ مجھے یاد کرتے رہو، میں وعدہ کرتا ہوں کہ میں بھی تمہیں یاد رکھوں گا، تم

میرا شکر ادا کرو اور میری نعمتوں کی ناشکری نہ کرو۔

امام احمد اور امام بخاری نے حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میں اپنے بندے کے ساتھ ہوں جب وہ مجھے یاد کرتا ہے۔ اگر وہ مجھے اپنے دل میں یاد کرے تو میں اسے اپنے دل میں یاد کرتا ہوں، اور اگر وہ مجھے مجمع میں یاد کرے تو میں اسے بہتر مجمع میں یاد کرتا ہوں۔'' **(بخاری، رقم: ۷۴۰۵)**

ذکرِ الٰہی صرف تسبیح، تحلیل، تحریم یا تکبیر تک محدود نہیں، بلکہ ہر وہ عمل جو قرآن وسنت کے مطابق ہو اور جس میں اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری شامل ہو، ذکرِ الٰہی ہے۔

امام ابن القیمؒ فرماتے ہیں کہ حضرت محمد ﷺ سب سے زیادہ اللہ تعالیٰ کو یاد کرنے والے تھے۔ ان کی بات چیت، اللہ کے اسماء وصفات اور وعدہ ووعید پر ان کی گفتگو، دعا وسوال، جنت کی رغبت دلانا، جہنم سے ڈرانا، اور خاموشی سب ذکرِ الٰہی کا حصہ تھا۔ وہ ہر وقت، ہر حال، اٹھتے بیٹھتے، سوتے جاگتے اور سفر وحضر میں اللہ کی یاد میں مشغول رہتے تھے۔ **(تفصیل کے لیے دیکھیں: سورہ ابراہیم، آیت نمبر ۷)**

صحابہ کرامؓ جب اکٹھے ہوتے تو ایک شخص قرآن پڑھتا اور باقی لوگ سنتے۔ حضرت عمرؓ حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ سے فرماتے، ''ذکّرنا ربنا'' یعنی ''ہمارے رب کی یاد دلاؤ''، تو وہ قرآن پڑھتے اور حضرت عمرؓ سنتے رہتے۔

اللہ تعالیٰ نے ذکر کی فضیلت بیان کرنے کے بعد شکر کا حکم بھی فرمایا: ''میرا شکر کرو اور میری ناشکری نہ کرو۔'' اس کا مطلب ہے کہ نعمتوں کا انکار کرنا، ان کی حقیر شماری کرنا یا انہیں گناہوں میں خرچ کرنا ناشکری ہے۔ اصل شکر اللہ تعالیٰ کی حمد اور فرمانبرداری میں ہے، جو بندہ اللہ کی حمد نہیں کرتا وہ اس کا شکر ادا نہیں کرتا۔ **(بیہقی ومشکوٰۃ)**

حضرت ابو ہریرہؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میں اپنے بندے کے گمان کے مطابق اس سے سلوک کرتا ہوں۔ جب وہ مجھے یاد کرتا ہے تو میں اس کے ساتھ ہوتا ہوں۔ اگر وہ مجھے دل میں یاد کرے تو میں بھی اسے دل میں یاد کرتا ہوں۔ اگر وہ ایک ہاتھ میرے قریب آتا ہے تو میں دو ہاتھ اس کے قریب آتا ہوں۔ اگر وہ چل کر میرے پاس آتا ہے تو میں دوڑ کر اس کے پاس آتا ہوں۔'' **(بخاری، حدیث نمبر: ۷۴۰۵)**

آیت نمبر (۱۵۳) يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ ۝۱۵۳

ترجمہ: ''اے ایمان والو! صبر اور نماز کے ذریعے مدد حاصل کرو، یقیناً اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے''۔

تفسیر نماز اور صبر کے ذریعہ مدد

اس آیت میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ صبر اور نماز کے ذریعے میری مدد طلب کرو۔ لفظ صبر کے معنیٰ رکنے اور ٹھہر جانے کے ہیں اور شریعت میں اسے تین معنوں میں استعمال کیا گیا ہے:

۱۔ اپنے نفس کو اللہ تعالیٰ کی عبادت اور فرمانبرداری میں مشغول رکھنا۔

۲۔ اپنے نفس کو گناہوں سے روکے رکھنا۔

۳۔ آفت یا تکلیف برداشت کرنا، اللہ تعالیٰ پر راضی رہنا اور دکھ و تکلیف میں صبر کے بدلے ثواب کی امید رکھنا۔

عام لوگ صبر کو زیادہ تر صرف تیسرے معنی کے لیے استعمال کرتے ہیں، جبکہ پہلے دو معنی اکثر ان کے ذہن میں نہیں آتے، حالانکہ یہ تینوں صورتیں صبر کا حصہ ہیں۔ مجموعی طور پر صبر کا مطلب ہے نفس کو قابو میں رکھنا اور ہر اس بات سے رک جانا جو اللہ کی نافرمانی کا سبب بنے۔

حضرت صہیبؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''مومن کا معاملہ عجیب ہے، اس کی ہر حالت میں خیر ہے اور یہ مومن کے سوا کسی کو حاصل نہیں۔ اگر مومن کو خوشی کی حالت نصیب ہو تو اس نے شکر کیا، جو اس کے لیے بہتر ہوا، اور اگر اسے تکلیف پہنچی تو اس نے صبر کیا، یہ بھی اس کے لیے بہتر ہوا''۔ **(مسلم: ۷۵۰۰)**

صبر کے ساتھ نماز کا بھی ذکر فرمایا گیا ہے تاکہ نماز کے ذریعے بھی مدد حاصل کی جا سکے۔ حضرت حذیفہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب کسی مصیبت میں مبتلا ہوتے تو نماز میں مشغول ہو جاتے تھے۔ **(مشکوٰۃ، رقم: ۱۳۲۵)**

پھر اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہوں۔ یہاں معیت سے مراد وہ قربت اور مدد ہے جو اللہ کی محبت اور نصرت کی دلیل ہے، یعنی اللہ تعالیٰ صبر کرنے والوں سے محبت کرتا ہے اور ان کی مدد فرماتا ہے۔ صبر کرنے والوں کے لیے یہ سب سے بڑی فضیلت ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کے ساتھ ہے۔

معیت کی دوسری قسم معیتِ عامہ ہے، یعنی اللہ تعالیٰ اپنے علم و قدرت کے ذریعہ تمام بندوں کے ساتھ ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ **(تفصیل کے لیے دیکھیں: سورہ البقرہ، آیت نمبر ۴۵)**

آیت نمبر (۱۵۴) وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ ؕ بَلْ اَحْيَآءٌ وَّلٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ ﴿۱۵۴﴾

ترجمہ: ''اور جو لوگ اللہ کے راستے میں قتل (یعنی شہید) کر دیے جائیں، انہیں مردہ نہ کہو، بلکہ وہ زندہ ہیں، لیکن تمہیں ان کی زندگی کا شعور نہیں''۔

تفسیر

اللہ کی راہ میں جہاد اور شہید کا مرتبہ

اللہ کی فرمانبرداری کا بلند ترین نمونہ یہ ہے کہ انسان اپنی جان تک قربان کر دے تا کہ اپنے مالک کی رضا حاصل ہو۔

علّامہ واحدی نے اس آیت کے نزول کے بارے میں لکھا ہے کہ یہ بدر کی جنگ میں شہید ہونے والے مسلمانوں کے بارے میں نازل ہوئی۔ ان شہداء میں آٹھ حضرات انصار میں سے اور چھ مہاجرین میں شامل تھے۔ کچھ لوگوں نے ان کے بارے میں کہا کہ وہ مر گئے اور دنیا کی نعمتیں ان سے ختم ہو گئیں، تب یہ آیت نازل ہوئی۔

شہید کا مرتبہ

اللہ کے دین کو پھیلانے اور حق کی راہ میں جو لوگ رکاوٹ بننے والوں کے خلاف جہاد کرتے ہیں، انہیں بعض اوقات جان کی قربانی دینی پڑتی ہے۔ جہاد کے دوران ضروری نہیں کہ تمام کافر ہی قتل ہوں؛ بعض مسلمان بھی اس میں شہید ہو جاتے ہیں، اور ان شہداء کا مرتبہ بے حد بلند ہے۔ ان کی برزخی زندگی (مرنے کے بعد قیامت تک) بھی دیگر انسانوں سے افضل ہے، چنانچہ فرمایا:

''جو لوگ اللہ کی راہ میں قتل کیے جاتے ہیں ان کے بارے میں یہ نہ کہو کہ وہ مردہ ہیں بلکہ وہ زندہ ہیں، لیکن تم محسوس نہیں کر سکتے''۔

سورہ آل عمران، آیات ۱۶۹ تا ۱۷۱ میں بھی بیان ہوا کہ برزخ میں سب سے افضل زندگی نبیوں کی ہے اور ان کے جسم زمین میں نہیں کھائے جاتے: ''إِنَّ اللَّهَ حَرَّمَ عَلَى الْأَرْضِ أَنْ تَأْكُلَ أَجْسَادَ الْأَنْبِيَاءِ''۔ (ابوداؤد، رقم: ۱۰۴۷)

اسی طرح، نبیوں کے دنیاوی احکام بھی کچھ الگ ہیں، جیسے ان کی وراثت تقسیم نہیں ہوتی اور ان کی وفات کے بعد ان کی بیویوں سے نکاح جائز نہیں۔ نبیوں کے بعد شہداء کا مرتبہ سب سے بلند ہے، اور پھر دیگر لوگ آتے ہیں۔ شہید کے لیے قبر میں آرام یا عذاب کا تفصیل حدیثوں میں موجود ہے۔

حضرت مسروق تابعی نے بیان کیا کہ انہوں نے عبداللہ بن مسعودؓ سے اس آیت کے بارے میں معلوم کیا۔ انہوں نے فرمایا: ''ہم نے حضرت محمد ﷺ سے سنا کہ شہیدوں کی روحیں سبز پرندوں کے گھونسلوں میں ہیں اور ان کے لیے عرش کے نیچے قندیلیں لٹکی ہوئی ہیں۔ یہ پرندے جنت میں جہاں چاہیں چلتے پھرتے ہیں اور کھاتے پیتے ہیں، پھر واپس قندیلوں میں آ جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان سے تین بار پوچھا کہ تم کیا خواہش رکھتے ہو؟ انہوں نے کہا کہ ہم کیا چاہیں گے؟ جنت میں تو ہر چیز ہمارے اختیار میں ہے۔ پھر عرض کیا: اے ہمارے رب! ہم چاہتے ہیں کہ ہماری

روحیں دوبارہ جسموں میں واپس آجائیں تاکہ ہم دوبارہ تیرے راستے میں شہید ہوجائیں۔اور چونکہ ان کے علاوہ اور کوئی طلب نہ تھی، اللہ تعالیٰ نے انہیں ان کے حال پر چھوڑ دیا''۔(مسلم،رقم:۴۸۸۵)

یہ آیات اور روایات شہید کی فضیلت، اس کی برزخی زندگی اور اللہ کی راہ میں قربانی کی عظمت کو واضح کرتی ہیں۔

شہید کے گناہ اور برزخی کیفیت

حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاصؓ سے روایت ہے کہ حضرت محمد ﷺ نے فرمایا کہ شہید کا ہر گناہ معاف کر دیا جاتا ہے، البتہ قرض کے معاملے کو استثناء حاصل ہے۔(مسلم:۴۸۸۳)

حدیث میں یہ بھی بیان ہوا ہے کہ جب انسان مرجاتا ہے تو اس کے اعمال ختم ہوجاتے ہیں، مگر مجاہد فی سبیل اللہ کا عمل قیامت تک بڑھتا رہتا ہے۔(ابوداؤد،رقم:۲۵۰۰)

شہید کی کئی قسمیں بیان ہوئی ہیں، اوران میں سے ایک ایسی قسم ہے جس میں شہید کو غسل نہیں دیا جاتا، اس کا خون جسم سے نہیں دھویا جاتا اور صرف نمازِ جنازہ کے بعد دفن کیا جاتا ہے۔اس کے کپڑوں کو بھی بدن سے نہیں اتارا جاتا، بلکہ خون سے بھرے کپڑوں میں دفن کیا جاتا ہے، اور ہتھیار یا پوستین وغیرہ نکال دیے جاتے ہیں۔

شہید کی چار قسمیں

۱۔جو شخص دین و دنیا دونوں لحاظ سے شہید ہو:

اس قسم کے شہید کو غسل اور کفن دینے کی ضرورت نہیں۔صرف نمازِ جنازہ پڑھی جاتی ہے۔

امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک نمازِ جنازہ فرض ہے، جبکہ امام شافعیؒ کے نزدیک نماز جنازہ کی بھی ضرورت نہیں کیونکہ یہ شخص مخلص مجاہد فی سبیل اللہ ہوتا ہے اور ہر لحاظ سے پاک ومغفور ہے۔

۲۔جو شخص صرف آخرت کے لحاظ سے شہید ہو:

دنیاوی احکام اس پر جاری نہیں کیے جاتے جیسے: دریا میں ڈوب کر مرنے والا، کینسر یا کسی سخت بیماری میں ہلاک ہونے والا، یا نفاس کی حالت میں مرنے والی عورت پر دنیوی شہادت کے احکام لاگو نہیں ہوتے، مگر آخرت میں انہیں شہید کا درجہ حاصل ہے۔

۳۔جو شخص صرف دنیاوی لحاظ سے شہید ہو:

جو شخص دنیا کے لحاظ سے شہید سمجھا جاتا ہے، مگر حقیقت میں آخرت کے مرتبے اور اس مخصوص ثواب کا مستحق نہیں ہوتا جیسے غیر مخلص یا ریاکار مجاہد۔

۴۔دونوں لحاظ سے شہید کے احکام نہ ہونے والا شخص:

ایسے افراد پر نہ دنیوی اور نہ آخرت کے لحاظ سے شہادت کے احکام لاگو ہوں گے جیسے حکومتِ اسلامیہ کے خلاف بغاوت میں قتل ہونے والے یا ڈاکہ زنی میں مارے جانے والے پر نہ کفن دیا جائے گا، نہ نمازِ جنازہ پڑھی جائے گی اور نہ مسلمانوں کے قبرستان میں دفن کیا جائے گا تاکہ یہ عمل دوسروں کے لیے عبرت کا سبب بنے۔

برزخی زندگی کی ناقابل فہم کیفیت

آیت کے آخر میں فرمایا: ''وَلٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ''۔

یعنی دنیا میں رہتے ہوئے انسان برزخ میں شہداء کی کیفیت اور حالت کو پوری طرح نہیں سمجھ سکتا۔ دنیا کی زندگی اور برزخ کی زندگی کے حالات مختلف ہیں، جیسے بچہ ماں کے پیٹ میں پیدا ہونے سے پہلے دنیا کی کیفیات کو نہیں جان سکتا۔اس لیے اگرچہ انسان ان حقائق کو پوری طرح محسوس نہیں کرسکتا، مگر جب قرآن وحدیث ان پر روشنی ڈالیں تو ایمان اور یقین لازم ہے۔(**تفصیل کے لیے دیکھیں: سورہ آل عمران، آیات ۱۶۹ تا ۱۷۱**)

آیت نمبر (۱۵۵۔۱۵۷) وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ وَالثَّمَرٰتِ ؕ وَبَشِّرِ الصّٰبِرِيْنَ ۙ﴿۱۵۵﴾ الَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌ ۙ قَالُوْٓا اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ ؕ﴿۱۵۶﴾ اُولٰٓئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوٰتٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ ۟ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُوْنَ ﴿۱۵۷﴾

ترجمہ: ''اور ہم ضرور آزمائیں گے تمہیں کسی نہ کسی چیز سے، جیسے خوف، بھوک، اور مال وجان اور پھلوں کے نقصان سے۔اور خوشخبری دے دو صبر کرنے والوں کو۔ یہ وہ لوگ ہیں کہ جب ان پر کوئی مصیبت آتی ہے، تو کہتے ہیں: ''یقیناً ہم اللہ ہی کے لیے ہیں اور ہم اسی کی طرف لوٹ کر جانے والے ہیں۔ یہی لوگ ہیں جن پر ان کے رب کی طرف سے رحمتیں ہیں اور بخشش ہے اور یہی لوگ ہدایت یافتہ ہیں''۔

تفسیر

دنیا کا امتحان اور مؤمن پر مصائب کی حکمت

اس آیت میں دنیا میں آزمائش وامتحان کا ذکر آیا ہے اور الفاظِ تاکید یعنی لام اور نون ثقیلہ کے ساتھ فرمایا گیا کہ ہم تمہیں ضرور جانچ میں ڈالیں گے۔اس امتحان میں کبھی خوف لاحق ہوگا، کبھی بھوک ستائے گی، مال کم ہوگا، جانیں کم ہوں گی، رشتے دار اور قریبی لوگ فوت ہوجائیں گے، اور پھلوں میں کمی واقع ہوگی۔

یہ تمام حالات دنیا کے مختلف امتحانات کی نشاندہی کرتے ہیں: دشمنوں کا خوف، قحط وآفات، سیلاب وزلزلے،

تجارت میں نقصان، مکانوں کا گر جانا، مال کی چوری یا ضائع ہونا، کارخانوں یا مشینوں کا خراب ہونا، بجلی کا نہ آنا، رشتہ داروں اور احباب کی موت، وبائی امراض، باغات میں پھلوں کی کمی یا آندھی سے گرنا، کھیتوں میں کیڑوں یا ٹڈی دل کے حملے۔

مؤمن بندہ ان تمام مصائب میں صبر کرتا ہے، اللہ کی رضا پر راضی رہتا ہے اور ثواب کی امید رکھتا ہے۔ یہ آزمائشیں کبھی گناہوں کی سزا کے لیے، کبھی کفارہ کے لیے، اور کبھی درجات کی بلندی کے لیے پیش آتی ہیں، جیسا کہ قرآن واحادیث میں واضح بیان ہوا ہے۔

دنیاوی تکلیف اور اس کے اثرات

● حضرت ابوبکرؓ کے حوالے سے ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اے ابوبکر! تم اور تمہارے اصحاب مومنین دنیا میں گناہوں کا بدلہ پائیں گے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ سے اس حال میں ملاقات کریں گے کہ کوئی گناہ باقی نہ رہے گا، جبکہ دیگر لوگوں کے گناہ قیامت کے دن ان پر پوری طرح نازل ہوں گے''۔ **(ابن کثیر)**

● حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ جس کے ساتھ خیر کا ارادہ فرماتے ہیں، اسے تکلیف میں شامل فرماتے ہیں''۔ **(صحیح بخاری، رقم:۵۶۴۵)**

● ایک اور حدیث میں ارشاد ہے: ''جب اللہ تعالیٰ کسی بندے کے لیے کوئی درجہ مقرر کر دیتے ہیں جس میں وہ اپنے عمل سے نہ پہنچ سکتا ہو، تو اللہ تعالیٰ اسے جسم یا مال یا اولاد میں تکلیف دے کر صبر عطا فرماتا ہے، یہاں تک کہ وہ اس مقررہ درجے تک پہنچ جاتا ہے''۔ **(ابوداؤد، رقم:۳۰۹۰)**

● حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے: ''مسلمان کو جو بھی تکلیف، مرض، فکر یا غم پہنچتا ہے، حتیٰ کہ اگر کانٹا بھی لگ جائے، اللہ تعالیٰ اس کے ذریعہ اس کے گناہوں کا کفارہ بنا دیتا ہے''۔ **(صحیح بخاری:۵۶۴۱)**

● حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''بخار کو برا نہ کہو، یہ انسان کی خطاؤں کو ویسے ہی صاف کرتا ہے جیسے بھٹی لوہے کے میل کچیل کو''۔ **(صحیح مسلم:۶۵۷۰)**

● حضرت انسؓ سے روایت ہے:* ''جب اللہ تعالیٰ کسی بندے کے ساتھ خیر کا ارادہ فرماتے ہیں تو اسے دنیا میں سزا دے دیتے ہیں، اور جب برائی کا ارادہ فرماتے ہیں تو گناہوں کی سزا قیامت کے دن دیتے ہیں''۔ **(ترمذی:۲۳۹۶)**

● حضرت ابو ہریرہؓ نے فرمایا: ''مومن مرد اور مومن عورت کو جان، مال اور اولاد میں برابر تکلیف پہنچتی ہے، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ اس سے اس حال میں ملاقات کرے کہ اس کا کوئی گناہ باقی نہ رہا ہو''۔ **(ترمذی:۲۳۹۹)**

● حضرت انسؓ نے بیان کیا: ''اگر کسی مسلمان کے تین بچے بالغ ہونے سے پہلے فوت ہو جائیں، تو اللہ تعالیٰ

اس مسلمان پر رحمت فرماتے ہوئے اسے جنت میں داخل فرماتے ہیں''۔(بخاری:۱۲۴۸)

● حضرت ابوسعید خدریؓ نے بیان کیا کہ ایک مرتبہ عورتیں جمع ہوئیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نصیحت فرمائی:''اگر کسی کے تین بچے فوت ہوگئے تو وہ اس کے لیے دوزخ سے نجات کا سبب بنیں گے۔اگر دو بچے فوت ہوئے تو وہ بھی اسی طرح ہیں''۔(بخاری:۱۰۱)

● سنن ترمذی میں ہے کہ جب کسی بندے کا بچہ فوت ہوتا ہے،تو اللہ تعالیٰ فرشتوں سے فرماتے ہیں:''تم نے میرے بندے کے بچے کو قبض کیا؟'' وہ کہتے ہیں:''ہاں''۔پھر اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:''اس کے دل کے ٹکڑے کو قبض کیا؟'' وہ کہتے ہیں:''ہاں''۔اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:''میرے بندے کے لیے جنت میں ایک گھر بنادو اور اس کا نام بیت الحمد رکھ دو''۔(ترمذی:۱۰۲۱)

● ایک حدیث میں آیا کہ اگر کسی مسلمان کو کوئی تکلیف پہنچی اور بعد میں یاد کرے،حتیٰ کہ کافی وقت گزر جائے،اور''اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رٰجِعُوْنَ'' پڑھے،تو اللہ تعالیٰ اسے وہی اجر عطا فرماتے ہیں جو اُس دن دیا گیا تھا جب مصیبت پہنچی تھی۔(مسند احمد،رقم:۱۷۳۴)

مصیبتوں میں صبر اور اس کی حقیقت

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:''جب تم میں سے کسی کی جوتی کا تسمہ ٹوٹ جائے،تب بھی اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رٰجِعُوْنَ پڑھو،کیونکہ یہ بھی ایک مصیبت ہے''۔(مشکوٰۃ المصابیح،رقم:۱۷۶۰)

● ام المومنین حضرت ام سلمہؓ سے روایت ہے کہ انہیں حضرت ابوسلمہؓ نے حدیث سنائی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:''جو شخص مصیبت کے وقت اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رٰجِعُوْنَ پڑھے،اللہ تعالیٰ اس کی مصیبت کی تلافی فرمائیں گے،اس کی آخرت کو بہتر بنائیں گے اور اسے اس چیز کے بدلے نیک چیز عطا فرمائیں گے''۔(سنن ابن ماجہ،۱۵۹۸)

● حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایک عورت کے پاس سے گزرے جو قبر کے پاس رو رہی تھی۔آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:''اللہ سے ڈرو اور صبر کرو''۔عورت نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو پہچانا نہیں اور کہا:''چھوڑ دو،مجھے تمہاری باتوں سے کیا فرق پڑے گا،تمہیں وہ مصیبت نہیں پہنچی جو مجھے پہنچی ہے''۔بعد میں جب عورت کو معلوم ہوا کہ جس سے اس نے بات کی وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تھے،تو وہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس حاضر ہوئی۔دروازے پر پہنچ کر دیکھا کہ وہاں نہ کوئی دربان تھا،نہ کوئی شاہی شان وشوکت،اس لیے حیرت زدہ ہوگئی اور کہا:''یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم،میں نے آپ کو پہچانا نہیں،اس لیے ایسا جواب دیا''۔آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:''اصلی صبر وہی ہے جو تازہ مصیبت کے وقت

ہو، کیونکہ وقت گزرنے کے بعد صبر خود بخود آجاتا ہے''۔(بخاری: ۱۲۸۳)

صبر کی حقیقت

اس حدیث سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ قرآن وحدیث میں جس صبر کی فضیلت بیان کی گئی ہے، وہی صبر مراد ہے جو عین مصیبت اور تکلیف کے وقت ہو۔ یعنی اچانک کوئی حادثہ پیش آئے، کسی کی موت واقع ہو، مال یا رقم ضائع ہوجائے، اور دل رنجیدہ ہو بی ایسی حالت میں صبر کرنا سب سے بڑی فضیلت رکھتا ہے۔

وقت گزر جانے کے بعد جو صبر ظاہر ہوتا ہے، وہ حقیقی صبر نہیں بلکہ محض راحت کی عکاسی ہے، کیونکہ دل کا رنج کم ہو چکا ہوتا ہے۔ اس وقت مومن اور کافر میں کوئی فرق نہیں رہتا۔

مؤمن کے لیے اجر کا وعدہ صرف اس صبر کے لیے ہے جو دل کے بے چینی، غم، وسوسے، اور نفس کے حرام خواہشات کے باوجود ظاہر کیا جائے۔ یہی حقیقی صبر ہے جو مصیبت کے عین لمحے میں دل و دماغ کی کرب اور بے چینی کے باوجود قائم رہنے سے حاصل ہوتا ہے۔

کسی کے انتقال پر غم ونوحہ کرنا

نوٹ: جیسا کہ زبان سے بُرے الفاظ نکالنا منع ہے اور بے صبری شمار ہوتا ہے، اسی طرح عمل سے کوئی بھی حرکت جو صبر کے خلاف ہو یا غیر مسلموں کے طریقہ کار کی نقل ہو، کرنا بھی ناجائز ہے۔

عام لوگوں کی عادت ہوتی ہے کہ جب کوئی مصیبت یا دکھ پہنچتا ہے، خاص طور پر جب بچہ فوت ہوجائے، تو وہ اپنے چہرے پر طمانچے مارتے ہیں، دیوار یا سر پر ضرب دیتے ہیں، گریبان پھاڑتے ہیں اور جاہلانہ الفاظ بولتے ہیں کہ ''میرا ہی بچہ بچا تھا، مگر اللہ نے اسے موت دے دی''۔ یہ سب نہ صرف جہالت ہے بلکہ اللہ تعالیٰ پر اعتراض کرنا کفر کے مترادف ہے۔

● حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''وہ ہم میں سے نہیں ہے جو چہروں پر طمانچے مارے، گریبان پھاڑے اور جاہلیت کی دہائی دے''۔(بخاری، ۱۲۹۴)

کچھ علاقوں میں لوگ مرنے والے کے غم میں بال منڈوا دیتے ہیں، اور خاص طور پر عورتیں شدید چیختی ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''میں اُس سے بری ہوں جو کسی کی موت پر سر مونڈے، آوازیں بلند کرے اور کپڑے پھاڑے''۔(بخاری، ۱۲۹۷)

عورتوں کی عادت ہوتی ہے کہ رشتہ داروں کی موت پر چیختی اور نوحہ کرتی ہیں، گھر سے باہر تک آواز جاتی ہے،

اور چھ مہینے تک مہمانوں کے سامنے زبردستی رونے کا تاثر پیدا کرتی ہیں۔ میت کو پکار کر کہتی ہیں: ''اے میرے جوان بیٹے! تجھے کیا ہو گیا؟ مجھے کس کے لیے چھوڑا؟''۔

● حدیث میں آیا ہے کہ: ''اللہ کی لعنت ہو نوحہ کرنے والی پر اور اس کے سننے والوں پر''۔ (ابوداؤد، ۳۱۲۸)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نوحہ کرنے والی عورت پر لعنت فرمائی اور اس کے ساتھ نوحہ سننے والوں پر بھی، کیونکہ عام طور پر نوحہ کرنے والی تنہا نہیں ہوتی، بلکہ سننے والے اس عمل کا سبب بنتے ہیں۔

مسلم شریف میں ہے کہ جو عورت نوحہ کرے اور توبہ نہ کرے، قیامت کے دن اس کے بدن میں قطران اور کھجلی کا وجود ہوگا۔ نوٹ: قطران عرب میں درخت کا پانی ہوتا تھا، جس سے کھجلی میں آرام آتا تھا، لیکن قیامت میں یہ قطران اور کھجلی شدید عذاب بن جائیں گی۔ (مسلم: ۹۳۴)

دنیاوی مصیبتوں کی حکمت

بہت سے لوگ دنیا کی تکلیف اور حکمت کو نہیں سمجھتے اور کہتے ہیں کہ مسلمانوں پر دنیا کی مصیبتیں زیادہ ہیں جبکہ کافروں کو خوشیاں دی گئی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں پر جو مصیبتیں آتی ہیں، وہ ان کے گناہوں کی معافی، درجات کی بلندی اور آخرت کے عذاب سے بچاؤ کے لیے ہیں۔

● حضرت عمرؓ سے روایت ہے کہ ایک مرتبہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دیکھا کہ آپ چٹائی پر لیٹے ہیں، بغیر کسی نرم بستر کے، اور چٹائی کی بناوٹ نے آپ کے پہلو میں نشان چھوڑ دیے۔ حضرت عمرؓ نے عرض کیا کہ: ''یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، اللہ تعالیٰ سے دعا کریں کہ آپ کی امت کو دنیا میں فراوانی عطا فرمائے۔ فارس اور روم میں لوگوں کو وسعت دی گئی ہے اور وہ اللہ کی عبادت بھی نہیں کرتے''۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''اے ابن خطاب! کیا تم نہیں جانتے کہ ان کے لیے دنیا اور ہمارے لیے آخرت ہے؟ کیا تم اس پر راضی نہیں ہو؟'' (مسلم: ۱۴۷۹)

یہ تعلیم واضح کرتی ہے کہ دنیاوی مصیبتیں اور کمزوریوں کے پیچھے بھی اللہ کی حکمت اور رحمت پوشیدہ ہے، تاکہ مومن آخرت میں نعمتیں حاصل کرے اور کافر صرف دنیا میں خوشیوں کا مزہ پائیں، لیکن آخرت میں انہیں کوئی حصہ نہ ملے۔

❁❁❁

ترجمہ- آیت نمبر ۱۵۸ سے ۱۶۷ تک

اِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَآىِٕرِ اللّٰهِ ۚ فَمَنْ حَجَّ الْبَيْتَ اَوِ اعْتَمَرَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ اَنْ يَّطَّوَّفَ بِهِمَا ؕ وَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا ۙ فَاِنَّ اللّٰهَ شَاكِرٌ عَلِيْمٌ ﴿۱۵۸﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْتُمُوْنَ مَآ اَنْزَلْنَا مِنَ الْبَيِّنٰتِ وَالْهُدٰى مِنْۢ بَعْدِ مَا بَيَّنّٰهُ لِلنَّاسِ فِى الْكِتٰبِ ۙ اُولٰٓئِكَ يَلْعَنُهُمُ اللّٰهُ وَيَلْعَنُهُمُ اللّٰعِنُوْنَ ﴿۱۵۹﴾ اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا وَاَصْلَحُوْا وَبَيَّنُوْا فَاُولٰٓئِكَ اَتُوْبُ عَلَيْهِمْ ۚ وَاَنَا التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ﴿۱۶۰﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَمَاتُوْا وَهُمْ كُفَّارٌ اُولٰٓئِكَ عَلَيْهِمْ لَعْنَةُ اللّٰهِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ ﴿۱۶۱﴾ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۚ لَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ وَلَا هُمْ يُنْظَرُوْنَ ﴿۱۶۲﴾ وَاِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِيْمُ ﴿۱۶۳﴾ اِنَّ فِىْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَالْفُلْكِ الَّتِىْ تَجْرِىْ فِى الْبَحْرِ بِمَا يَنْفَعُ النَّاسَ وَمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ مَّآءٍ فَاَحْيَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَبَثَّ فِيْهَا مِنْ كُلِّ دَآبَّةٍ ۖ وَّتَصْرِيْفِ الرِّيٰحِ وَالسَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَيْنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ﴿۱۶۴﴾ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّتَّخِذُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَنْدَادًا يُّحِبُّوْنَهُمْ كَحُبِّ اللّٰهِ ؕ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ ؕ وَلَوْ يَرَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْٓا اِذْ يَرَوْنَ الْعَذَابَ ۙ اَنَّ الْقُوَّةَ لِلّٰهِ جَمِيْعًا ۙ وَّاَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعَذَابِ ﴿۱۶۵﴾ اِذْ تَبَرَّاَ الَّذِيْنَ اتُّبِعُوْا مِنَ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْا وَرَاَوُا الْعَذَابَ وَتَقَطَّعَتْ بِهِمُ الْاَسْبَابُ ﴿۱۶۶﴾ وَقَالَ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْا لَوْ اَنَّ لَنَا كَرَّةً فَنَتَبَرَّاَ مِنْهُمْ كَمَا تَبَرَّءُوْا مِنَّا ؕ كَذٰلِكَ يُرِيْهِمُ اللّٰهُ اَعْمَالَهُمْ حَسَرٰتٍ عَلَيْهِمْ ؕ وَمَا هُمْ بِخٰرِجِيْنَ مِنَ النَّارِ ﴿۱۶۷﴾

ترجمہ:

(۱۵۸)۔ بے شک صفا اور مروہ اللہ کی نشانیوں میں سے ہیں، تو جو کوئی بیت اللہ کا حج یا عمرہ کرے، اس پر کوئی گناہ نہیں کہ ان دونوں کے درمیان سعی کرے۔ اور جو کوئی خوشی سے نیکی کرے، تو یقیناً اللہ قدر دان اور سب کچھ جاننے والا ہے۔ (۱۵۹)۔ جو لوگ چھپاتے ہیں ہماری نازل کردہ روشن دلیلوں اور ہدایت کو، اس کے بعد کہ ہم نے ان کو لوگوں کے لیے کتاب میں واضح کر دیا ہے، یہی لوگ ہیں جن پر اللہ لعنت کرتا ہے اور تمام لعنت کرنے والے بھی۔ (۱۶۰)۔ سوائے ان لوگوں کے جنہوں نے توبہ کی اور اصلاح کر لی اور بیان کرنے لگے (جو پہلے چھپاتے تھے)، تو یہی لوگ ہیں جن کی میں توبہ قبول کروں گا اور میں بہت بخشنے والا، نہایت رحم کرنے والا ہوں۔ (۱۶۱)۔ بے شک جن لوگوں نے کفر کیا

اور وہ اسی حالت میں مر گئے کہ کافر ہی تھے، انہی پر اللہ کی، فرشتوں کی اور تمام انسانوں کی لعنت ہے۔(۱۶۲)۔ وہ ہمیشہ لعنت میں رہیں گے، نہ ان سے عذاب ہلکا کیا جائے گا اور نہ انہیں کوئی مہلت دی جائے گی۔(۱۶۳)۔ اور تمہارا معبود ایک ہی معبود ہے، اس کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں، وہ بڑا مہربان، نہایت رحم والا ہے۔(۱۶۴)۔ بے شک آسمانوں اور زمین کی پیدائش میں، دن اور رات کے ایک دوسرے کے پیچھے آنے جانے میں، ان کشتیوں میں جو سمندر میں لوگوں کے فائدے کی چیزیں لے کر چلتی ہیں اور اس پانی میں جو اللہ نے آسمان سے نازل کیا، پھر اس سے زمین کو اس کے مردہ ہونے کے بعد زندہ کیا اور اس میں ہر قسم کے جاندار پھیلائے اور ہواؤں کے چلانے میں اور ان بادلوں میں جو آسمان و زمین کے درمیان تابع کر دیے گئے، یقیناً عقل والوں کے لیے ان سب میں نشانیاں ہیں۔(۱۶۵)۔ اور لوگوں میں سے کچھ ایسے ہیں جو اللہ کے سوا دوسروں کو اس کا شریک بنا لیتے ہیں، ان سے ایسی محبت کرتے ہیں جیسی اللہ سے کرنی چاہیے، حالانکہ ایمان والے تو سب سے بڑھ کر اللہ سے محبت رکھتے ہیں۔ اور کاش! دیکھ سکیں وہ لوگ جنہوں نے ظلم کیا، جب وہ عذاب دیکھیں گے، کہ ساری طاقت اللہ ہی کے لیے ہے اور یہ کہ اللہ سخت عذاب دینے والا ہے۔(۱۶۶)۔ جب وہ لوگ جن کی پیروی کی گئی، اپنے پیروکاروں سے بے زار ہو جائیں گے اور وہ عذاب دیکھیں گے اور ان کے سارے تعلقات ٹوٹ جائیں گے۔(۱۶۷)۔ اور وہ پیروکار کہیں گے: کاش ہمیں ایک بار پھر دنیا میں لوٹنا نصیب ہوتا تو ہم بھی ان سے ایسے ہی بے زار ہو جاتے جیسے وہ ہم سے ہو گئے۔ اسی طرح اللہ ان کے اعمال ان پر حسرت بنا کر دکھائے گا اور وہ آگ سے نکلنے والے نہ ہوں گے۔

تفسیر-آیت نمبر ۱۵۸ سے ۱۶۷ تک

آیت نمبر (۱۵۸) اِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَآىِٕرِ اللّٰهِ ۚ فَمَنْ حَجَّ الْبَيْتَ اَوِ اعْتَمَرَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ اَنْ يَّطَّوَّفَ بِهِمَا ؕ وَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا ۙ فَاِنَّ اللّٰهَ شَاكِرٌ عَلِيْمٌ ﴿۱۵۸﴾

ترجمہ: ”بے شک صفا اور مروہ اللہ کی نشانیوں میں سے ہیں، تو جو کوئی بیت اللہ کا حج یا عمرہ کرے، اس پر کوئی گناہ نہیں کہ ان دونوں کے درمیان سعی کرے۔ اور جو کوئی خوشی سے نیکی کرے، تو یقیناً اللہ قدردان اور سب کچھ جاننے والا ہے“۔

تفسیر فرمانِ الٰہی: اِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ: امام بخاری و مسلم اور دیگر محدثین نے حضرت عروہؒ کے ذریعے حضرت عائشہؓ سے روایت نقل کی ہے کہ حضرت عروہؒ فرماتے ہیں: میں نے حضرت عائشہؓ سے عرض کیا ”آپ اللہ تعالیٰ کے فرمان ”اِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ“ کے بارے میں کیا فرماتی ہیں؟ میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ اگر کوئی شخص ان دونوں کے

درمیان سعی نہ کرے تو اس پر کوئی گناہ نہیں''۔

حضرت عائشہؓ نے فرمایا: ''بھانجے! تم نے غلط سمجھا۔ اگر آیت کا مطلب یہی ہوتا جو تم سمجھتے ہو، تو فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ اَنْ يَّطَّوَّفَ کے بجائے اَن لَا يَطَّوَّفَ ہوتا۔ یہ آیت اس لیے نازل ہوئی تا کہ انصار جو اسلام قبول کرنے سے پہلے منات نامی بت کے لیے احرام باندھتے تھے، ان کے اعمال کی درست رہنمائی ہو''۔

زمانہ جاہلیت میں جب وہ احرام باندھتے، تو صفا و مروہ پہاڑوں پر دوڑنا برا سمجھتے تھے۔ اس بارے میں انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے استفسار کیا اور عرض کیا: ''یا رسول اللہ! ہم جاہلیت میں صفا و مروہ کے درمیان سعی کو برا سمجھتے تھے''۔ اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ یہ دونوں پہاڑ یادگارِ خداوندی ہیں اور حج یا عمرہ کرنے والے شخص پر ان کے درمیان سعی کرنا کوئی گناہ نہیں۔

● امام بخاریؒ نے عاصم بن سلیمان سے روایت نقل کی ہے کہ حضرت انسؓ سے دریافت کیا گیا تو انہوں نے فرمایا: ''ابتدائے اسلام میں ہم اسے جاہلیت کی رسم سمجھتے تھے، لہٰذا سعی چھوڑ دی۔ اسی پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: اِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ۔

● امام حاکم نے حضرت ابن عباسؓ سے روایت نقل کی کہ زمانہ جاہلیت میں شیاطین صفا و مروہ کے درمیان رات کے وقت دوڑتے اور ان کے درمیان بت رکھے جاتے تھے۔ اسلام آنے کے بعد مسلمانوں نے عرض کیا: ''یا رسول اللہ! ہم صفا و مروہ کے درمیان سعی نہیں کریں گے، کیونکہ جاہلیت میں ہم یہ کرتے تھے''۔

اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی تا کہ سعی کو عبادت اور یادگارِ الٰہی کے طور پر معتبر قرار دیا جائے۔

● ابن جریرؒ اور ابن ابی حاتم نے سعید یا عکرمہ کے ذریعے حضرت ابن عباسؓ سے نقل کیا ہے کہ: ''معاذ بن جبلؓ، سعد بن معاذؓ اور خازہ بن زیدؓ نے یہود کے علماء سے توریت کے کچھ احکام کے بارے میں سوال کیا، لیکن یہودیوں نے ان باتوں کو چھپایا۔ اسی پر اللہ تعالیٰ نے یہودیوں کے بارے میں یہ آیت نازل فرمائی: اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْتُمُوْنَ''۔

عاصم بن سلیمانؒ کہتے ہیں کہ میں نے حضرت انس بن مالکؓ سے پوچھا، تو انہوں نے فرمایا: ''ابتدائے اسلام میں ہم سب اسے جاہلیت کی رسم سمجھتے تھے، لہٰذا چھوڑ دیا، تب یہ آیت نازل ہوئی''۔ **(بخاری: ۴۷۸۷)**

فرمانِ الٰہی اور سعی صفا و مروہ

اللہ تعالیٰ نے اپنی آیت میں فرمایا کہ صفا اور مروہ دونوں پہاڑیاں اس کے دین کی علامتیں ہیں، لہٰذا جو کوئی بیت اللہ کے حج یا عمرہ میں حاضر ہو، اس کے لیے ان دونوں کے درمیان سعی کرنا بالکل جائز ہے جس میں کوئی گناہ نہیں۔

اُم سلمیٰؓ روایت کرتی ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا: اگر کسی مسلمان پر کوئی مصیبت آئے

اور وہ کہے: اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رٰجِعُوْنَ۔ اَللّٰھُمَّ أْجُرْنِیْ فِیْ مُصِیْبَتِیْ وَأَخْلِفْ لِیْ خَیْرًا مِّنْھَا (اے اللہ! میری پریشانی کا مجھے ثواب دے اور مجھے اس کا بہتر بدلہ عطا فرما) تو اللہ تعالیٰ اسے اُس مصیبت کے بدلے میں بہتر عطا فرماتے ہیں۔

● اُم سلمیٰؓ کہتی ہیں کہ جب ابوسلمیٰ وفات پا گئے تو میں نے سوچا کہ ابوسلمیٰ سے کون بہتر ہوسکتا ہے، کیونکہ ان کا خاندان مدینہ میں ہجرت کرنے والوں میں سب سے پہلا تھا۔ میں نے یہ الفاظ پڑھ لیے تو اللہ تعالیٰ نے مجھے نعمت کے طور پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم عطا فرما دیے۔ (مسلم:۹۱۸)

حضرت عروہؒ سے روایت ہے کہ میں نے ام المؤمنین حضرت عائشہؓ سے پوچھا، ''کیا آپ نے اللہ کے اس فرمان ''اِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَۃَ'' پر غور فرمایا؟ مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ اگر کوئی ان دونوں پہاڑوں کے درمیان سعی نہ کرے تو کوئی حرج نہیں''۔

حضرت عائشہؓ نے فرمایا: ''بالکل نہیں، اگر ایسا ہوتا جیسا تم کہتے ہو تو آیت یوں ہوتی: فَلَا جُنَاحَ عَلَیْہِ اَنْ یَّطَّوَّفَ بِھِمَا''۔ (بخاری:۱۶۴۳)

شانِ نزول

یہ آیت انصار اور اوس وخزرج کے لوگوں کے لیے نازل ہوئی تھی جو اسلام سے پہلے منات نامی بت کی عبادت کرتے اور مُشلّل مقام پر تلبیہ پڑھتے تھے۔ جو لوگ اس بت کی تلبیہ پڑھتے، وہ صفا ومروہ کے درمیان سعی کو گناہ سمجھتے تھے تو انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے دریافت کیا: ''ہم جاہلیت کے دور میں صفا ومروہ کے درمیان سعی کو گناہ سمجھتے تھے، اب اس کے بارے میں حکم کیا ہے؟''۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔

روایتیں اور وضاحت

امام زہریؒ اور ابوبکر بن عبدالرحمنؒ روایت کرتے ہیں کہ بعض لوگ صفا ومروہ کے درمیان سعی کو جاہلیت کی رسم سمجھتے تھے۔ انصار میں سے بعض نے کہا کہ بیت اللہ کے طواف کا حکم تو دیا گیا، مگر سعی کا نہیں۔ اسی پر یہ آیت نازل ہوئی۔

ایک اور روایت میں ہے کہ صفا ومروہ پر دو بت اساف اور نائلہ رکھے گئے تھے اور لوگ ان کے لیے سعی کرتے تھے۔ اسلام کے بعد یہ بت ہٹا دیے گئے، تو لوگ سعی کرنا بند کر دیے۔ اللہ تعالیٰ نے پھر یہ آیت نازل فرمائی تاکہ واضح ہو کہ سعی عبادت اور یادگارِ الٰہی ہے۔

حضرت ابوبکر بن عبدالرحمنؒ فرماتے ہیں کہ ممکن ہے یہ آیت تمام مذکورہ افراد کے لیے نازل ہوئی ہو۔ صحیح مسلم میں حضرت جابر بن عبداللہؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بیت اللہ کے طواف کے بعد فرمایا: ''صفا ومروہ

کے درمیان سعی کرو، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے تم پر سعی کو واجب قرار دیا ہے''۔ اور حضرت عائشہؓ نے فرمایا کہ یہ سعی رسول اللہ ﷺ کی سنت ہے، لہٰذا کسی کے لیے اسے چھوڑ دینا جائز نہیں۔ (بخاری: ۱۶۴۳)

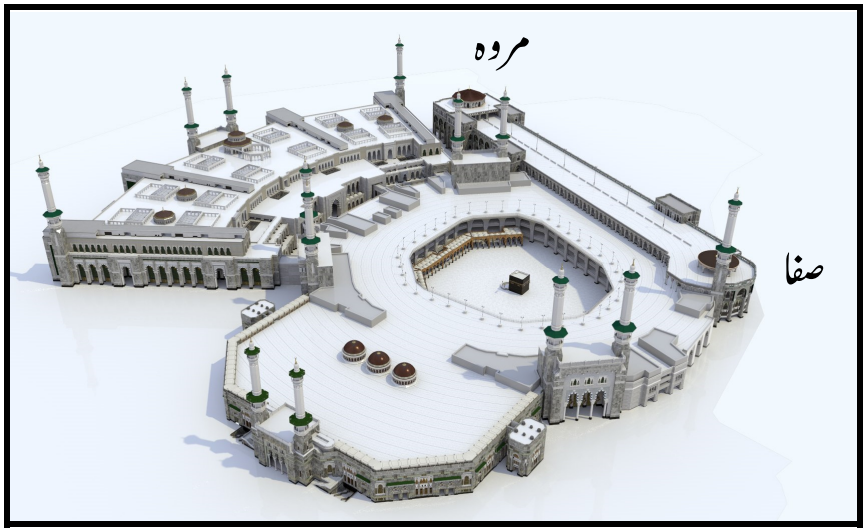
نوٹ: صفا و مروہ کے درمیان سعی حضرت ہاجرہؑ کی مشقت اور صبر کی یادگار ہے۔ جب کھانے اور پانی کا ذخیرہ ختم ہو گیا اور وہ اپنے بچے حضرت اسماعیلؑ کو پیاس کے مارے بلبلاتے دیکھیں، تو شدید پریشانی اور تڑپ کے عالم میں اللہ تعالیٰ کے سامنے عاجزی اور انکساری کے ساتھ دونوں پہاڑیوں کے درمیان دوڑ لگانے لگیں۔ اسی حالت میں اللہ تعالیٰ کی رحمت نے ان پر اپنی کرم کی بارش کی اور زم زم کا چشمہ پھوٹ پڑا، جس سے ان کی پریشانی دور ہو گئی۔

لہٰذا جو لوگ سعی کرتے ہیں، ان کے لیے ضروری ہے کہ وہ دل میں اللہ تعالیٰ کے حضور اپنی عاجزی اور محتاجی کا احساس رکھیں، اپنے گناہوں کی معافی مانگتے رہیں، اور دعا کرتے رہیں کہ اللہ تعالیٰ ان کے دل کو پاکیزہ اور نرم کرے اور ان کی خامیوں اور عیبوں کو دور فرمائے۔

صفا اور مروہ کے دوران سعی کی جگہ







آیت نمبر (۱۵۹) اِنَّ الَّذِیۡنَ یَکۡتُمُوۡنَ مَاۤ اَنۡزَلۡنَا مِنَ الۡبَیِّنٰتِ وَ الۡہُدٰی مِنۡۢ بَعۡدِ مَا بَیَّنّٰہُ لِلنَّاسِ فِی الۡکِتٰبِ ۙ اُولٰٓئِکَ یَلۡعَنُہُمُ اللّٰہُ وَ یَلۡعَنُہُمُ اللّٰعِنُوۡنَ ﴿۱۵۹﴾

ترجمہ: ''جولوگ چھپاتے ہیں ہماری نازل کردہ روشن دلیلوں اور ہدایت کو، اس کے بعد کہ ہم نے ان کولوگوں کے لیے کتاب میں واضح کر دیا ہے، یہی لوگ ہیں جن پر اللہ لعنت کرتا ہے اور تمام لعنت کرنے والے بھی''۔

تفسیر اس آیت میں سخت وعید اُن لوگوں کے لیے بیان کی گئی ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے بھیجی گئی ہدایت اور رہنمائی کی نشانیوں کولوگوں سے چھپاتے ہیں۔ اصل نزول یہود ونصاریٰ کے اُن علماء کے لیے ہوا تھا جنہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سچائی کی واضح علامات کو چھپایا، لیکن اس کا حکم عام ہے۔ ہر وہ شخص جو حق کی نشانیوں کو چھپائے گا، وہ اس وعید کے دائرے میں آئے گا۔ حق کو چھپانا ایسا بڑا گناہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ایسے افراد کو اپنی رحمت اور قربت سے دور کر دیتا ہے اور دنیا کی تمام لعنتیں اُن پر نازل ہوجاتی ہیں۔

آیت نمبر (۱۶۰) اِلَّا الَّذِیۡنَ تَابُوۡا وَ اَصۡلَحُوۡا وَ بَیَّنُوۡا فَاُولٰٓئِکَ اَتُوۡبُ عَلَیۡہِمۡ ۚ وَ اَنَا التَّوَّابُ الرَّحِیۡمُ ﴿۱۶۰﴾

ترجمہ: ''سوائے ان لوگوں کے جنہوں نے توبہ کی اور اصلاح کر لی اور بیان کرنے لگے (جو پہلے چھپاتے تھے)، تو یہی لوگ ہیں جن کی میں توبہ قبول کروں گا اور میں بہت بخشنے والا، نہایت رحم کرنے والا ہوں''۔

تفسیر اس آیت میں کہا گیا ہے کہ جو اپنے گناہوں سے توبہ کرے گا اور اپنی اصلاح کر کے حق کی جو بات چھپائی تھی اسے لوگوں کے سامنے بیان کر دے گا تو اللہ تعالیٰ اس کی توبہ قبول کر لے گا۔

آیت نمبر (۱۶۱) اِنَّ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا وَ مَاتُوۡا وَ ہُمۡ کُفَّارٌ اُولٰٓئِکَ عَلَیۡہِمۡ لَعۡنَۃُ اللّٰہِ وَ الۡمَلٰٓئِکَۃِ وَ النَّاسِ اَجۡمَعِیۡنَ ﴿۱۶۱﴾

ترجمہ: ''بے شک جن لوگوں نے کفر کیا اور وہ اسی حالت میں مر گئے کہ کافر ہی تھے، انہی پر اللہ کی، فرشتوں کی اور تمام انسانوں کی لعنت ہے''۔

تفسیر اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے خبر دی ہے کہ جو اللہ تعالیٰ کا انکار کریگا اور اسی حال میں اس کی موت آجائے گی، تو

اس پر اللہ تعالیٰ، اس کے فرشتوں اور تمام انسانوں کی لعنت ہوگی اور جہنم اس کا ہمیشہ کے لئے ٹھکانہ بن جائے گا نہ عذاب میں کمی کی جائے گی اور نہ اللہ اُس پر رحمت کی نگاہ ڈالے گا۔

آیت نمبر (۱۶۲) خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۚ لَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ وَلَا هُمْ يُنْظَرُوْنَ ﴿۱۶۲﴾

ترجمہ: ''وہ ہمیشہ لعنت میں رہیں گے، نہ ان سے عذاب ہلکا کیا جائے گا اور نہ انہیں کوئی مہلت دی جائے گی''۔

تفسیر اِس آیت میں اللہ تعالیٰ نے خبر دی ہے کہ اس کے علاوہ کوئی معبود نہیں وہ اپنی ذات وصفات میں اکیلا ہے ،کوئی اُس کا شریک نہیں اُس کے علاوہ کوئی خالق (پیدا کرنے والا) نہیں اس لئے عبادت کی تمام صورتیں صرف اللہ تعالیٰ کے ساتھ خاص ہیں۔

آیت نمبر (۱۶۳) وَاِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِيْمُ ﴿۱۶۳﴾

ترجمہ: ''اور تمہارا معبود ایک ہی معبود ہے، اس کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں، وہ بڑا مہربان، نہایت رحم والا ہے''۔

تفسیر اللہ تعالیٰ نے اپنی وحدانیت کی دلیل بیان کرنے کے بعد اس آیت میں تفصیل کے ساتھ کائنات کی نشانیوں کا ذکر فرمایا اور انسان کو غور وفکر کی دعوت دی ہے کہ ذرا ان مظاہرِ کائنات میں نظر دوڑاؤ، کیا یہ سب اللہ تعالیٰ کی قدرت اور قادر مطلق ہونے کی دلیلیں نہیں ہیں؟

آسمان کی بلندیاں اور وسعت، اس میں گردش کرنے والا سورج، چاند اور ستارے، زمین کی ہمواری اور اس کی پستی، پہاڑ، سمندر اور اس کی گہرائیاں، آبادیاں اور انسان کے لیے نفع بخش چیزیں، رات و دن کا بدلنا، موسموں کا اعتدال، گرمی اور سردی، کشتیوں اور جہازوں کا سمندروں میں سامان لے کر چلنا، ہواوں کا چلنا، بارش کے ذریعے مردہ زمین میں زندگی کا آنا، مختلف قسم کے پودے اور کھانے کی چیزیں، زمین میں جانور اور انسان کے لیے ان کی تسخیر، بادلوں کا بارش کے پانی کو لے کر چلنا اور یہ تمام مظاہر دنیا کے ہر گوشے میں اللہ کے حکم سے پہنچتے رہنا بی یہ سب اللہ کے وجود اور قدرت پر واضح دلائل ہیں اور ہر صاحبِ عقل کے لیے ایمان لانے کے لیے کافی اور روشن نشانیاں ہیں۔

آیت نمبر (۱۶۴) اِنَّ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَالْفُلْكِ الَّتِيْ تَجْرِيْ فِي الْبَحْرِ بِمَا يَنْفَعُ النَّاسَ وَمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ مَّآءٍ فَاَحْيَا بِهِ الْاَرْضَ

بَعْدَ مَوْتِهَا وَبَثَّ فِيْهَا مِنْ كُلِّ دَآبَّةٍ ۖ وَّتَصْرِيْفِ الرِّيٰحِ وَالسَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَيْنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ﴿۱۶۴﴾

ترجمہ: ''بے شک آسمانوں اور زمین کی پیدائش میں، دن اور رات کے ایک دوسرے کے پیچھے آنے جانے میں، ان کشتیوں میں جو سمندر میں لوگوں کے فائدے کی چیزیں لے کر چلتی ہیں اور اس پانی میں جو اللہ نے آسمان سے نازل کیا، پھر اس سے زمین کو اس کے مردہ ہونے کے بعد زندہ کیا اور اس میں ہر قسم کے جاندار پھیلائے اور ہواؤں کے چلانے میں اور ان بادلوں میں جو آسمان و زمین کے درمیان تابع کر دیے گئے، یقیناً عقل والوں کے لیے ان سب میں نشانیاں ہیں''۔

تفسیر اللہ تعالیٰ نے اپنے وجود، قدرت، توحید اور رحمت کی روشن نشانیاں اس لیے بیان فرمائی ہیں تا کہ بندے صرف اسی کی عبادت کریں، صرف اسی سے محبت کریں اور عبادت و محبت میں کسی کو شریک نہ ٹھہرائیں۔ لیکن مشرکین کا حال اس کے بالکل برعکس ہے۔ وہ اللہ کے بجائے دوسروں کی عبادت کرتے ہیں اور اپنے معبودوں سے ایسی محبت رکھتے ہیں جیسی اللہ تعالیٰ کے لیے ہونی چاہیے۔ جبکہ سچے ایمان والے، صحیح علم اور شعور کی بنیاد پر، اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہیں بناتے، صرف اسی کی عبادت کرتے ہیں، اسی پر بھروسہ رکھتے ہیں اور اپنی زندگی کے تمام کاموں میں صرف اللہ ہی سے پناہ مانگتے ہیں۔

شرک کی دو قسمیں ہیں: شرک اکبر اور شرک اصغر۔ شرک اکبر وہ ہے جسے اللہ تعالیٰ بغیر توبہ کے معاف نہیں فرماتے، اور اس میں بندہ کسی کو اللہ کا شریک ٹھہرا کر اس سے ویسی ہی محبت کرتا ہے جیسی اللہ تعالیٰ سے کی جانی چاہیے۔ یہ وہ شرک ہے جس میں مشرک اپنے جھوٹے معبودوں کو رب العالمین کے برابر قرار دیتے ہیں اور برابری محبت، تعظیم اور عبادت میں ظاہر ہوتی ہے۔

اکثر مشرکین کا حال یہ ہے کہ وہ اپنے معبودوں سے اللہ تعالیٰ کی نسبت زیادہ محبت کرتے ہیں اور ان کے ذکر سے خوشی محسوس کرتے ہیں۔ اگر کوئی شخص ان کے معبودوں کا ادب و احترام سے نام نہیں لیتا تو وہ اتنے ناراض ہوتے ہیں جتنے کہ اللہ تعالیٰ کے نام کی بے ادبی پر نہیں ہوتے۔ اور اگر کوئی اللہ تعالیٰ کے مقرر کردہ حدود کی خلاف ورزی کرے تو ان کے کانوں پر جوں تک نہیں رینگتی، بلکہ معمولی سی دنیاوی لالچ یا فائدے کے لیے فوراً خوش ہو جاتے ہیں، گویا کچھ ہوا ہی نہیں تھا۔

آیت نمبر (۱۶۵) وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّتَّخِذُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَنْدَادًا يُّحِبُّوْنَهُمْ كَحُبِّ اللّٰهِ ۭ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ ۭ وَلَوْ يَرَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْٓا اِذْ يَرَوْنَ الْعَذَابَ ۙ اَنَّ الْقُوَّةَ لِلّٰهِ

جَمِيْعًا ۙ وَّاَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعَذَابِ ﴿۱۶۵﴾

ترجمہ: ''اور لوگوں میں سے کچھ ایسے ہیں جو اللہ کے سوا دوسروں کو اس کا شریک بنا لیتے ہیں، ان سے ایسی محبت کرتے ہیں جیسی اللہ سے کرنی چاہیے، حالانکہ ایمان والے تو سب سے بڑھ کر اللہ سے محبت رکھتے ہیں۔ اور کاش! دیکھ سکیں وہ لوگ جنہوں نے ظلم کیا، جب وہ عذاب دیکھیں گے، کہ ساری طاقت اللہ ہی کے لیے ہے اور یہ کہ اللہ سخت عذاب دینے والا ہے''۔

تفسیر اس آیت میں مشرکین کے لیے شدید تنبیہ ہے کہ جب وہ ظالموں کے عذاب کو اپنی آنکھوں سے دیکھیں گے اور خود اس کے دائرے میں گرفتار ہوں گے، تب شاید انہیں یہ حقیقت سمجھ آئے کہ اصل بادشاہت صرف اللہ تعالیٰ کی ہے اور آسمان وزمین کے ہر ذرّے پر اس کی ہی حکمرانی ہے۔ **(تفصیل کے لیے دیکھیں: سورہ الزمر، آیت نمبر ۴۵)**

حضرت ابن مسعودؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''جو شخص اس حالت میں وفات پائے کہ اس نے کسی کو اللہ کا شریک سمجھا، وہ دوزخ میں داخل ہوگا'' اور میں، عبداللہ بن مسعودؓ، اس کی تشریح کرتے ہوئے کہتا ہوں: ''اور جو شخص اس حال میں موت پائے کہ اس نے اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہیں ٹھہرایا، وہ جنت میں داخل ہوگا''۔ **(صحیح بخاری، التفسیر، باب ۲۲، حدیث ۴۴۹۷)**

آیت نمبر (۱۶۶) اِذْ تَبَرَّاَ الَّذِيْنَ اتُّبِعُوْا مِنَ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْا وَرَاَوُا الْعَذَابَ وَتَقَطَّعَتْ بِهِمُ الْاَسْبَابُ ﴿۱۶۶﴾

ترجمہ: ''جب وہ لوگ جن کی پیروی کی گئی، اپنے پیروکاروں سے بے زار ہو جائیں گے اور وہ عذاب دیکھیں گے اور ان کے سارے تعلقات ٹوٹ جائیں گے''۔

تفسیر اس آیت میں قیامت کے دن مشرکین کے لیے سخت وعید بیان کی گئی ہے۔ اس دن وہ باطل معبود، جن کی عبادت کی جاتی تھی، عذاب کو اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھیں گے اور اپنی پوجا کرنے والوں سے نفرت و برائت کا اظہار کریں گے۔ اسی طرح تمام رشتے اور تعلقات جو ان کے گرد جمع تھے، منقطع ہو جائیں گے اور کوئی وابستگی باقی نہ رہے گی۔

آیت نمبر (۱۶۷) وَقَالَ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْا لَوْ اَنَّ لَنَا كَرَّةً فَنَتَبَرَّاَ مِنْهُمْ كَمَا تَبَرَّءُوْا مِنَّا ؕ كَذٰلِكَ يُرِيْهِمُ اللّٰهُ اَعْمَالَهُمْ حَسَرٰتٍ عَلَيْهِمْ ؕ وَمَا هُمْ بِخٰرِجِيْنَ مِنَ النَّارِ ﴿۱۶۷﴾

ترجمہ: ''اور وہ پیروکار کہیں گے: کاش ہمیں ایک بار پھر دنیا میں لوٹنا نصیب ہوتا تو ہم بھی ان سے

ایسے ہی بے زار ہو جاتے جیسے وہ ہم سے ہو گئے۔ اسی طرح اللہ ان کے اعمال ان پر حسرت بنا کر دکھائے گا اور وہ آگ سے نکلنے والے نہ ہوں گے''۔

تفسیر جب قیامت کے دن مشرکین یہ دیکھیں گے کہ ان کے باطل معبودان نے ان سے اپنا تعلق ختم کر لیا اور اپنی ناراضگی ظاہر کر دی، تو وہ دنیا میں کیے گئے اعمال پر شدید ندامت محسوس کریں گے اور کہیں گے: ''کاش! اگر ہمیں دوبارہ دنیا میں بھیجا جائے تو ہم بھی انہی سے بیزار ہو جائیں اور صرف اللہ کی عبادت کریں!'' لیکن وہ اپنے اس قول میں جھوٹے ہوں گے، کیونکہ اگر واقعی انہیں دوبارہ دنیا میں بھیجا جاتا تو وہ دوبارہ وہی کام کرتے جو پہلے کرتے رہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے، ان کے برے اعمال ان کے سامنے پیش کیے جائیں گے، جنہیں وہ حسرت بھری نگاہوں سے دیکھیں گے، لیکن اس وقت پچھتانا اور ندامت محسوس کرنا کسی کام نہ آئے گا اور وہ اس حالت سے کبھی نجات نہیں پائیں گے۔

❁❁❁

ترجمہ- آیت نمبر ۱۶۸ سے ۱۷۶ تک

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ كُلُوْا مِمَّا فِي الْاَرْضِ حَلٰلًا طَيِّبًا ۖ وَّلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ ۭ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ﴿۱۶۸﴾ اِنَّمَا يَاْمُرُكُمْ بِالسُّوْۗءِ وَالْفَحْشَاۗءِ وَاَنْ تَقُوْلُوْا عَلَي اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۶۹﴾ وَاِذَا قِيْلَ لَهُمُ اتَّبِعُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا بَلْ نَتَّبِعُ مَآ اَلْفَيْنَا عَلَيْهِ اٰبَاۗءَنَا ۭ اَوَلَوْ كَانَ اٰبَاۗؤُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ شَيْـــًٔا وَّلَا يَهْتَدُوْنَ ﴿۱۷۰﴾ وَمَثَلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا كَمَثَلِ الَّذِيْ يَنْعِقُ بِمَا لَا يَسْمَعُ اِلَّا دُعَاۗءً وَّنِدَاۗءً ۭ صُمٌّۢ بُكْمٌ عُمْيٌ فَهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ ﴿۱۷۱﴾ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ وَاشْكُرُوْا لِلّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ اِيَّاهُ تَعْبُدُوْنَ ﴿۱۷۲﴾ اِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةَ وَالدَّمَ وَلَحْمَ الْخِنْزِيْرِ وَمَآ اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ ۚ فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۷۳﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْتُمُوْنَ مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ الْكِتٰبِ وَيَشْتَرُوْنَ بِهٖ ثَمَنًا قَلِيْلًا ۙ اُولٰۗىِٕكَ مَا يَاْكُلُوْنَ فِيْ بُطُوْنِهِمْ اِلَّا النَّارَ وَلَا يُكَلِّمُهُمُ اللّٰهُ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَلَا يُزَكِّيْهِمْ ۠ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۱۷۴﴾ اُولٰۗىِٕكَ الَّذِيْنَ اشْتَرَوُا الضَّلٰلَةَ بِالْهُدٰى وَالْعَذَابَ بِالْمَغْفِرَةِ ۚ فَمَآ اَصْبَرَهُمْ عَلَي النَّارِ ﴿۱۷۵﴾ ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ نَزَّلَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ ۭ وَاِنَّ الَّذِيْنَ اخْتَلَفُوْا فِي الْكِتٰبِ لَفِيْ شِقَاقٍۢ بَعِيْدٍ ﴿۱۷۶﴾

ترجمہ:

(۱۶۸)۔اے لوگو! جو کچھ زمین میں ہے، حلال اور پاکیزہ چیزیں کھاؤ اور شیطان کے نقش قدم کی پیروی نہ کرو، بے شک وہ تمہارا کھلا دشمن ہے۔(۱۶۹)۔وہ تو تمہیں صرف برائی، بے حیائی اور اللہ کے بارے میں ایسی باتیں کرنے کا حکم دیتا ہے جنہیں تم نہیں جانتے۔(۱۷۰)۔اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اس کی پیروی کرو جو اللہ نے نازل کیا ہے، تو وہ کہتے ہیں: نہیں، بلکہ ہم تو اس کی پیروی کریں گے جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا، چاہے ان کے باپ دادا نہ کچھ سمجھتے ہوں اور نہ ہدایت پر ہوں؟(۱۷۱)۔ان لوگوں کی مثال جنہوں نے کفر کیا، اس شخص جیسی ہے جو کسی کو آواز دیتا ہے جو نہ سنتا ہے، صرف پکار اور آواز ہی سنائی دیتی ہے۔وہ بہرے، گونگے، اندھے ہیں، اس لیے کچھ سمجھتے نہیں۔(۱۷۲)۔اے ایمان والو! ان پاکیزہ چیزوں کو کھاؤ جو ہم نے تمہیں رزق کے طور پر دیں اور اللہ کا شکر ادا کرو اگر تم واقعی صرف اسی کی عبادت کرتے ہو۔(۱۷۳)۔اس نے تم پر صرف مردار، خون، خنزیر کا گوشت اور ہر وہ چیز حرام کی ہے جس پر غیر اللہ کا نام پکارا جائے۔لیکن اگر کوئی مجبور ہو جائے، نہ بغاوت کرے، نہ حد سے بڑھے، تو اس پر کوئی

گناہ نہیں، بے شک اللہ بہت بخشنے والا، نہایت رحم کرنے والا ہے۔(۱۷۴)۔ بے شک جو لوگ چھپاتے ہیں اس کو جو اللہ نے کتاب میں نازل کیا اور اس کے بدلے تھوڑی قیمت لیتے ہیں، وہ اپنے پیٹ میں صرف آگ بھر رہے ہیں اور قیامت کے دن اللہ ان سے بات نہیں کرے گا، نہ انہیں پاک کرے گا اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔(۱۷۵)۔ یہی وہ لوگ ہیں جنہوں نے ہدایت کے بدلے گمراہی خریدی اور بخشش کے بدلے عذاب (خرید) لیا، تو کیسے صبر کریں گے یہ لوگ آگ پر!(۱۷۶)۔ یہ (اس لئے ہے) کہ یقیناً اللہ نے یہ کتاب حق کے ساتھ نازل کی ہے اور بیشک جن لوگوں نے اس کتاب کے بارے میں اختلاف کیا، وہ ضد میں بہت دور جا چکے ہیں۔

تفسیر-آیت نمبر ۱۶۸ سے ۱۷۶ تک

آیت نمبر (۱۶۸) يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ كُلُوْا مِمَّا فِي الْاَرْضِ حَلٰلًا طَيِّبًا ۖ وَّلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ ۭ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ۝۱۶۸

ترجمہ: ''اے لوگو! جو کچھ زمین میں ہے، حلال اور پاکیزہ چیزیں کھاؤ اور شیطان کے نقش قدم کی پیروی نہ کرو، بے شک وہ تمہارا کھلا دشمن ہے''۔

تفسیر پہلے بیان ہو چکا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں اور وہی ہر شے کا خالق ہے، اب یہ واضح کیا جا رہا ہے کہ وہی اکیلا روزی دینے والا ہے اور انسانوں کے لیے زمین پر موجود ہر حلال اور پاکیزہ رزق کو مباح قرار دیا ہے بی یعنی وہ شے جو جسم اور عقل کے لیے نقصان دہ نہ ہو اور لذت بخش ہو۔ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو شیطان کے بہکاوے پر چلنے سے منع فرمایا، کیونکہ جاہلیت کے زمانے میں لوگ شیطان کے اثر میں آ کر مختلف جانوروں کو بتوں سے منسوب کرتے اور ان کا گوشت حرام سمجھ بیٹھتے تھے۔ اس سلسلے کی تفصیل سورہ مائدہ کی آیت نمبر ۱۰۳ میں بیان کی جائے گی۔

آیت نمبر (۱۶۹) اِنَّمَا يَاْمُرُكُمْ بِالسُّوْۗءِ وَالْفَحْشَاۗءِ وَاَنْ تَقُوْلُوْا عَلَي اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ۝۱۶۹

ترجمہ: ''وہ تو تمہیں صرف برائی، بے حیائی اور اللہ کے بارے میں ایسی باتیں کرنے کا حکم دیتا ہے جنہیں تم نہیں جانتے''۔

تفسیر یہاں مقصد شیطان سے نفرت دلانا ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے دوسری جگہ فرمایا ہے، اِنَّ الشَّيْطٰنَ لَكُمْ عَدُوٌّ فَاتَّخِذُوْهُ عَدُوًّا ۭ اِنَّمَا يَدْعُوْا حِزْبَهٗ لِيَكُوْنُوْا مِنْ اَصْحٰبِ السَّعِيْرِ ۝ (سورہ فاطر ۶)

بیشک شیطان تمہارا دشمن ہے سوتم بھی اس کو دشمن ہی سمجھو، وہ تو صرف اپنے گروہ کو اس لئے بلاتا ہے تا کہ وہ دوزخ میں جا پڑے۔

آیت نمبر (۱۷۰) وَاِذَا قِيْلَ لَهُمُ اتَّبِعُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا بَلْ نَتَّبِعُ مَآ اَلْفَيْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا ؕ اَوَلَوْ كَانَ اٰبَآؤُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ شَيْـًٔا وَّلَا يَهْتَدُوْنَ ﴿۱۷۰﴾

ترجمہ: ''اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اس کی پیروی کرو جو اللہ نے نازل کیا ہے، تو وہ کہتے ہیں: نہیں، بلکہ ہم تو اس کی پیروی کریں گے جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا، چاہے ان کے باپ دادا نہ کچھ سمجھتے ہوں اور نہ ہدایت پر ہوں؟''۔

تفسیر اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے کافروں کی مثال جانوروں سے بیان فرمائی ہے، جیسے چرواہا جب اپنے جانوروں کو آواز دیتا ہے تو وہ محض آواز سنتے ہیں لیکن اس کے مفہوم کو سمجھ نہیں پاتے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ اپنی ہدایت کی طرف انسانوں کو بلاتا ہے اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اسے واضح اور کھل کر بیان کرتے ہیں، لیکن وہ کچھ بھی سمجھ نہیں پاتے۔ وہ اس لحاظ سے محروم ہیں کہ ان کی عقل درست طریقے سے کام نہیں کرتی، وہ بہرے ہیں کہ حق کی صدا نہیں سن پاتے، گونگے ہیں کہ حق کے جواب میں کچھ کہہ نہیں سکتے، اور اندھے ہیں کہ ہزاروں دلیلوں کے باوجود حق ان کی آنکھوں سے پوشیدہ ہے۔

آیت نمبر (۱۷۱) وَمَثَلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا كَمَثَلِ الَّذِيْ يَنْعِقُ بِمَا لَا يَسْمَعُ اِلَّا دُعَآءً وَّنِدَآءً ؕ صُمٌّۢ بُكْمٌ عُمْيٌ فَهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ ﴿۱۷۱﴾

ترجمہ: ''ان لوگوں کی مثال جنہوں نے کفر کیا، اس شخص جیسی ہے جو کسی کو آواز دیتا ہے جو نہ سنتا ہے، صرف پکار اور آواز ہی سنائی دیتی ہے۔ وہ بہرے، گونگے، اندھے ہیں، اس لیے کچھ سمجھتے نہیں''۔

تفسیر آیت نمبر ۱۶۸ میں اللہ تعالیٰ نے عام انسانوں کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ حلال اور پاکیزہ روزی کھاؤ۔ تاہم اس خطاب میں خاص توجہ مؤمنین پر ہے، کیونکہ ایمان کی بدولت ہی وہ اللہ کے احکام کے مطابق صحیح طریقے سے روزی حاصل کر کے اس سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے مؤمنین کو پاکیزہ روزی کھانے اور اس پر شکر ادا کرنے کا حکم دیا، جیسا کہ انبیاء علیہ السلام کو بھی حکم دیا گیا: ''اے میرے رسولو! پاکیزہ روزی کھاؤ اور نیک عمل کرو''۔

(سورہ مومنون:۵۱)

یہ حکم مؤمنین کی روحانی اور جسمانی فلاح کے لیے ہے، تا کہ وہ حلال رزق کے ذریعے اللہ کی رضا حاصل کریں

اور اعمال صالحہ میں مشغول رہیں۔

آیت نمبر (۱۷۲) يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ وَاشْكُرُوْا لِلّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ اِيَّاهُ تَعْبُدُوْنَ ﴿۱۷۲﴾

ترجمہ: ''اے ایمان والو! ان پاکیزہ چیزوں کو کھاؤ جو ہم نے تمہیں رزق کے طور پر دیں اور اللہ کا شکر ادا کرو اگر تم واقعی صرف اسی کی عبادت کرتے ہو''۔

تفسیر یہاں مراد وہ حلال اشیاء ہیں جن کی حلت واضح اور یقینی ہو۔ ایک حدیث میں آتا ہے کہ حضرت عامرؓ سے روایت ہے کہ میں نعمان بن بشیرؓ سے سنا وہ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے کہتے ہوئے سنا: ''حلال اور حرام دونوں واضح ہیں، اور ان دونوں کے درمیان کچھ مشتبہ چیزیں ہیں جنہیں اکثر لوگ نہیں جانتے کہ یہ حلال ہیں یا حرام۔ جو شخص ان مشتبہ چیزوں سے بچ جائے، اس نے اپنے دین اور اپنی عزت کو محفوظ کر لیا، اور جو اس میں گرفتار ہو گیا وہ ایسے ہے جیسے چرواہا اپنے جانوروں کو چراگاہ کے قریب چھوڑ دے، جو جلد ہی اس ممنوعہ علاقے میں گھس سکتے ہیں۔ ہر بادشاہ کی زمین میں ایک ممنوعہ حصہ ہوتا ہے، اور اللہ کی زمین میں ممنوعہ حصہ اس کے حرام کردہ احکام ہیں۔ اور جان لو کہ جسم میں گوشت کا ایک حصہ ہے جو درست رہے تو جسم صحت مند رہتا ہے، اور اگر خراب ہو جائے تو پورا جسم بگڑ جاتا ہے، اور وہ حصہ انسان کا دل ہے''۔ **(صحیح بخاری، الایمان، باب ۳۹، حدیث نمبر: ۵۲)**

حرام کھانے کے نقصانات

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''بے شک اللہ پاک ہے اور وہ صرف پاکیزہ (حلال) مال اور عمل کو قبول فرماتا ہے۔'' پھر حلال کھانے کے بارے میں فرمایا:

''اللہ تعالیٰ نے پیغمبروں کو جو حکم دیا وہی مومنین کے لیے بھی ہے: اے رسولوں! پاکیزہ چیزیں کھاؤ اور نیک عمل کرو، اور مومنین کے لیے فرمایا: اے ایمان والو! جو پاک چیزیں ہم نے تمہیں دی ہیں، ان میں سے کھاؤ۔'' اس کے بعد رسول اللہ ﷺ نے ایسے شخص کا ذکر فرمایا جو لمبا سفر کر رہا ہو، جس کے بال بکھرے ہوئے ہوں، جسم پر گرد و غبار ہو اور وہ آسمان کی طرف ہاتھ بلند کر کے کہے ''یارب! یارب!''۔ یہ شخص دعا کر رہا ہے، لیکن اس کا کھانا حرام، پینا حرام اور پہننا حرام ہے۔ تو ایسی حالت میں اس کی دعا کیوں قبول ہوگی؟ **(صحیح مسلم: ۱۰۱۵)**

یہ حدیث ہمیں یہ سبق دیتی ہے کہ مسافر یا پریشان حال شخص کی دعا بھی اس وقت قبول نہیں ہوتی جب اس کی

روزی، لباس یا زندگی کے وسائل حرام ہوں۔ آج بھی اکثر لوگ بارہا دعا کرتے ہیں، لیکن قبولیت نہیں ہوتی۔ اس لیے ہر شخص کو چاہیے کہ اپنی زندگی کا جائزہ لے، دیکھے کہ وہ کتنی حلال چیزیں کھا رہا ہے اور کتنی حرام۔ کپڑا جو پہنتے ہیں، گھر کی چیزیں، رہائش وغیرہ سب حلال ہوں، کیونکہ اگر روزی یا استعمال حرام ہے تو دعا اور اعمال بھی متاثر ہوتے ہیں۔

یہ تعلیم ہمیں یہ باور کراتی ہے کہ حلال اور پاکیزہ ذرائع زندگی کا بنیاد ہیں اور ان پر عمل نہ کرنا نہ صرف روحانی نقصان بلکہ دعا کی قبولیت میں رکاوٹ کا سبب بنتا ہے۔

حرام کمائی کی چند صورتیں

آج کل رشوت لینا دینا ایک عام مسئلہ بن چکا ہے اور سب جانتے ہیں کہ رشوت کا مال ہر حال میں حرام ہے۔ چاہے اس کا نام تحفہ یا ہدیہ رکھ دیا جائے، اصل حقیقت میں یہ حرام ہی رہتا ہے۔ جو لوگ حکومت کے کسی جائز شعبے میں کام کرتے ہیں اور رشوت لیتے ہیں، ان کی تنخواہ بھی حلال نہیں، کیونکہ وہ جس کام کے لیے دفتر میں مقرر کیے گئے تھے، وہ کام انجام نہیں دیتے۔ رشوت کے لیے وہ اپنے عہدہ یا اصول وقواعد کی خلاف ورزی کرتے ہیں، اور اس وجہ سے ان کی کمائی حرام ہے۔

سود، چاہے کم ہو یا زیادہ، کسی فرد سے لیا جائے یا کسی ادارے سے، سب حرام ہے۔ اس کا نام نفع رکھ لیا جائے، تب بھی یہ حرام ہے۔ اسی طرح ہر وہ ملازمت حرام ہے جس میں گناہ کیا جائے یا گناہ میں مدد فراہم کی جائے، کیونکہ گناہ کرنا اور گناہ میں مدد دینا دونوں حرام ہیں۔ اس لیے گناہ کی اجرت بھی حرام ہے اور اس میں حاصل ہونے والا نفع بھی حرام ہے۔

حرام چیزوں کی تجارت بھی ممنوع ہے اور اس میں حاصل ہونے والا نفع بھی حرام ہے، جیسے شراب، خنزیر، مردار گوشت، مورتیاں یا تصاویر کی خرید وفروخت۔ جتنے بھی ٹیکس ہیں ان کا حصول بھی حرام ہے اور ان کی تنخواہ بھی حرام ہے۔

''بیمہ'' کی پالیسی بھی سراسر قمار ہے، خواہ زندگی، اموالِ تجارت، کارخانے یا گاڑیوں کا بیمہ ہو، یہ سب حرام ہیں، اور اس میں حاصل ہونے والا نفع بھی حرام ہے۔ اسی طرح جوا، گھوڑوں کی دوڑ اور دیگر جوا کے طریقے بھی حرام آمدنی کا سبب ہیں۔

غصب، چوری، ڈاکہ زنی یا لوگوں کو اغوا کر کے جو رقم حاصل کی جائے، وہ سب حرام ہے۔ پیری مریدی کے ذریعے جو کچھ دیا جائے، حالانکہ لوگ انہیں اہلِ حق سمجھتے ہیں، وہ بھی حرام ہے۔

اکثر جگہ میراث شریعت کے مطابق تقسیم نہیں ہوتی، اور جو مال کسی وارث کے قبضے میں آجائے وہ اپنے لیے رکھ لیتے ہیں۔ یتیموں کے حقوق اور بہنوں و ماں کا حق بھی ضائع ہو جاتا ہے۔ شرعاً دوسروں کا مال اپنی ملکیت میں لانا حرام ہے، اور جو مال رضا کارانہ طور پر نہ دیا گیا ہو، وہ بھی حرام ہے۔ یہ تو صرف چند مثالیں ہیں؛ حرام کے شعبے بہت

وسیع ہیں، اس لیے ہر شخص کو اپنی آمدنی اور خرچ کے بارے میں سخت احتیاط کرنی چاہیے۔

حرام مال سے صدقہ

کچھ لوگ یہ سوچتے ہیں کہ حرام کمائی میں سے صدقہ کر دیا جائے تو باقی مال حلال ہو جائے گا، لیکن یہ تصور غلط ہے۔ حرام صدقہ کرنا خود ایک گناہ ہے اور قبول بھی نہیں ہوتا۔ جیسا کہ حدیث میں ہے: ''اللہ تعالیٰ صرف پاکیزہ مال کو قبول فرماتے ہیں''۔

اگر صدقہ قبول نہیں ہوگا تو باقی مال کیسے حلال ہو سکتا ہے؟ جو صدقہ دیا گیا وہ بھی وبال بن جائے گا اور جو باقی مال ہے وہ بھی وبال اور آخرت کے عذاب کا ذریعہ ہوگا۔

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جو شخص حرام مال سے کمائے، پھر اس میں سے صدقہ کرے تو وہ قبول نہ ہوگا، اور جو اس میں خرچ کرے تو اس میں برکت نہیں ہوگی، اور جو کچھ اپنے پیچھے چھوڑ جائے گا وہ اس کے لیے دوزخ کا سبب بنے گا۔ بے شک اللہ تعالیٰ برائی کو برائی کے ذریعے نہیں مٹاتے بلکہ برائی کو نیکی کے ذریعے مٹاتے ہیں۔ خبیث، خبیث کو نہیں ہٹاتا۔'' **(رواہ احمد: ۳۶۷۲)**

یہ تعلیم ہمیں واضح کرتی ہے کہ حلال اور پاکیزہ آمدنی ایمان کی بنیاد ہے، اور حرام کمائی نہ صرف آخرت کے عذاب کا سبب ہے بلکہ دنیا میں بھی روحانی نقصان کا ذریعہ بنتی ہے۔

حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جنت میں وہ گوشت داخل نہیں ہوگا جو حرام سے حاصل کیا گیا ہو، اور ہر وہ گوشت جو حرام سے پیدا ہوا ہو، دوزخ کی آگ اس کے لیے زیادہ مستحق ہے۔'' **(مشکوٰۃ: ۲۷۷۲)**

مزید یہ کہ ایک حدیث میں ارشاد فرمایا گیا: حضرت ابن عمرؓ سے منقول ہے کہ ''اگر کسی نے دس درہم کا کپڑا خریدا اور اس میں ایک درہم حرام کا شامل تھا، تو اللہ تعالیٰ اس کی کوئی بھی نماز قبول نہیں فرمائے گا جب تک کہ وہ کپڑا اس کے بدن پر رہے۔'' **(مسند احمد: ۵۷۳۲)**

خلاصہ: یہ تعلیمات ہمیں واضح کرتی ہیں کہ حلال اور پاکیزہ رزق ایمان کی بنیاد ہے، اور حرام سے حاصل شدہ مال یا غذا نہ صرف آخرت میں نقصان کا سبب ہے بلکہ عبادات اور نیک اعمال کی قبولیت میں بھی رکاوٹ بنتی ہے۔

آیت نمبر (۱۷۳) اِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةَ وَالدَّمَ وَلَحْمَ الْخِنْزِيْرِ وَمَآ اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ ۚ فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۷۳﴾

ترجمہ: ''اُس نے تم پر صرف مردار، خون، خنزیر کا گوشت اور ہر وہ چیز حرام کی ہے جس پر غیر اللہ کا

نام پکارا جائے۔لیکن اگر کوئی مجبور ہو جائے، نہ بغاوت کرے، نہ حد سے بڑھے، تو اس پر کوئی گناہ نہیں، بے شک اللہ بہت بخشنے والا، نہایت رحم کرنے والا ہے''۔

تفسیر حرام گوشت

اس آیتِ مبارکہ میں مردہ جانور (جو بغیر ذبح ہوئے مر جائیں)، خون اور خنزیر کے گوشت کو کھانا حرام قرار دیا گیا ہے۔جن جانوروں پر ذبح کے وقت اللہ کے علاوہ کسی اور کا نام لیا جائے، ان کے گوشت کا استعمال عرب کے مشرکوں میں رائج تھا۔اس کے علاوہ وہ حلال رزق بھی کھاتے تھے،لیکن جو چیزیں ان کے معمولات میں شامل تھیں اور شرعاً حرام تھیں، ان کی حرمت واضح طور پر بیان فرمائی گئی۔ان کے علاوہ بھی کچھ اور حرام چیزیں ہیں جن کا ذکر دیگر آیات واحادیث میں آئے گا۔

سور ایک نجس جانور ہے اور اس کی سب سے پسندیدہ غذا گندگی اور کوڑا کرکٹ ہے، جو ہر پاکیزہ فطرت کو ناپسند ہوتی ہے۔اس کا گوشت انسانی صحت کے لیے نقصان دہ ہے۔جدید طب اور تحقیق کے مطابق، سور کا گوشت ہر جگہ خاص طور پر گرم ممالک میں شدید خطرناک اثرات مرتب کرتا ہے، کیونکہ اس سے بعض ایسے کیڑے پیدا ہوتے ہیں جو جان لیوا ہو سکتے ہیں۔سائنس دان یہ بھی کہتے ہیں کہ سور کا مسلسل گوشت کھانے سے انسان کی غیرت میں کمی واقع ہو سکتی ہے۔

یہ تعلیم ہمیں واضح کرتی ہے کہ اللہ کی ہدایات میں حکمت اور انسان کی بھلائی شامل ہے، اور حرام غذا کے نقصانات صرف دنیاوی نہیں بلکہ روحانی اثرات بھی رکھتے ہیں۔

سورۂ مائدہ میں بعض حرام چیزوں کا ذکر ہے،لیکن تفصیل ان شاءاللہ سورۂ مائدہ کی تفسیر میں بیان کی جائے گی۔

یہاں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ''۔

اس کا مفہوم یہ ہے کہ اگر کوئی شخص اتنی شدید بھوک یا مصیبت میں مبتلا ہو کہ اس کی جان کو خطرہ لاحق ہو، اور اس کے پاس صرف حلال رزق موجود نہ ہو، تو وہ اپنی جان بچانے کے لیے حرام چیزوں میں سے اتنی مقدار کھا سکتا ہے جس سے صرف زندگی قائم رہے۔اس سے آگے نہ بڑھے اور نہ ہی لذت کے لیے کھائے۔

مثال کے طور پر، اگر بھوک سے جان پر خطرہ ہو تو شراب یا سور کا گوشت کھانے کی اجازت کو بہانہ بنا کر یہ نہ سوچے کہ اب تو ہر طرح کھانا پینا جائز ہے اور پیٹ بھر کر خنزیر کا گوشت کھا لے۔ایسی صورت میں وہ حد سے تجاوز کرنے والا اور گناہگار ہو جائے گا۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ'' تاکہ یہ واضح ہو کہ صرف اضطرار میں محدود مقدار کھانے کی اجازت معافی کی درجہ میں ہے،لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ حرام چیز حلال ہو گئی۔

آج کل بعض لوگ بلا تکلف شراب پیتے، خنزیر کھاتے اور غیر ذبح شدہ جانوروں کا گوشت استعمال کرتے ہیں اور جب ان سے کہا جائے تو کہتے ہیں کہ ہم مجبور ہیں اور لفظ ''فَمَنِ اضْطُرَّ'' کا سہارا لیتے ہیں، حالانکہ ان کے پاس حلال خوراک کے وسائل موجود ہوتے ہیں جیسے مچھلی، انڈے، دودھ یا انتظام کر کے حلال گوشت بھی مل سکتا ہے۔ ایسے میں حرام کھانا ہرگز جائز نہیں۔

اگر واقعی کوئی شخص شدید مجبوری میں ہو، جس کی جان بچانے کے لیے خوراک کے سوا کوئی چارہ نہ ہو، تو وہ صرف اتنی مقدار کھا سکتا ہے جس سے جان برقرار رہے، مگر پیٹ بھر کر یا روزانہ حرام کھانا ہرگز جائز نہیں۔

کچھ لوگ کہتے ہیں کہ وہ سور کا گوشت ''بسم اللہ'' پڑھ کر کھا لیتے ہیں۔ العیاذ باللہ! بسم اللہ پڑھنے سے حرام حلال نہیں ہوتا بلکہ اس سے ایمان کے لیے خطرہ پیدا ہوتا ہے۔ ایک مسلمان کو ایسے ملک میں رہنے سے پرہیز کرنا چاہیے جہاں حلال خوراک دستیاب نہ ہو اور حرام کھانے پر مجبور ہونا پڑے۔

آیت نمبر (۱۷۴) اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْتُمُوْنَ مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ الْكِتٰبِ وَيَشْتَرُوْنَ بِهٖ ثَمَنًا قَلِيْلًا ۙ اُولٰٓئِكَ مَا يَاْكُلُوْنَ فِيْ بُطُوْنِهِمْ اِلَّا النَّارَ وَلَا يُكَلِّمُهُمُ اللّٰهُ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَلَا يُزَكِّيْهِمْ ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۱۷۴﴾

ترجمہ: ''بے شک جو لوگ چھپاتے ہیں اس کو جو اللہ نے کتاب میں نازل کیا اور اس کے بدلے تھوڑی قیمت لیتے ہیں، وہ اپنے پیٹ میں صرف آگ بھر رہے ہیں اور قیامت کے دن اللہ ان سے بات نہیں کرے گا، نہ انہیں پاک کرے گا اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے''۔

تفسیر حضرت ابن جریرؒ نے عکرمہؓ سے نقل کیا ہے کہ یہ آیت کریمہ ''اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْتُمُوْنَ'' اور سورۂ آلِ عمران کی وہ آیت ''اِنَّ الَّذِيْنَ يَشْتَرُوْنَ'' دونوں بنیادی طور پر یہودیوں کے بارے میں نازل ہوئی ہیں۔ ثعلبی نے بواسطہ کلبی، ابوصالح اور حضرت ابن عباسؓ سے نقل کیا ہے کہ یہ آیتیں خاص طور پر یہود کے علماء اور بزرگوں کے بارے میں ہیں، کیونکہ وہ اپنے غریبوں سے ہدیے اور تحفے لیتے اور امید رکھتے تھے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم انہی میں بھیجے جائیں گے۔ لیکن جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان کے علاوہ دوسروں میں بھیجے گئے تو وہ اپنے زوال اور تحفوں کے ختم ہونے کے خوف میں مبتلا ہوئے۔

چنانچہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اوصاف میں، جو توریت میں مذکور تھے، تبدیلی کی اور اپنی قوم کے سامنے ان کو اس طرح پیش کیا کہ یہ نبی، جو آخر زمانے میں مبعوث ہوں گے، ان صفات کا حامل نہیں۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت کریمہ ''اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْتُمُوْنَ'' نازل فرمائی۔ (تفسیر ابن عباس)

اس آیت میں حق کو چھپانے والوں کے لیے سخت وعید دہرائی گئی ہے تا کہ امت مسلمہ اس سے محفوظ رہے۔ یہود نے حضرت محمد ﷺ کی وہ صفات چھپائیں جو آپ کی رسالت کی دلیل تھیں، تا کہ عربوں میں اپنی برتری قائم رکھیں اور جو تحفے انہیں ملتے تھے، وہ وصول کرتے رہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ یہ لوگ اپنے پیٹوں میں جہنم کی آگ بھر رہے ہیں اور قیامت کے دن اپنے گناہوں کی وجہ سے اللہ کا غضب ان پر نازل ہوگا، اور ان کے لیے دردناک عذاب تیار ہے۔

آیت نمبر (۱۷۵) أُولَٰئِكَ الَّذِينَ اشْتَرَوُا الضَّلَالَةَ بِالْهُدَىٰ وَالْعَذَابَ بِالْمَغْفِرَةِ ۚ فَمَا أَصْبَرَهُمْ عَلَى النَّارِ ﴿۱۷۵﴾

ترجمہ: ''یہی وہ لوگ ہیں جنہوں نے ہدایت کے بدلے گمراہی خریدی اور بخشش کے بدلے عذاب (خرید) لیا، تو کیسے صبر کریں گے یہ لوگ آگ پر''۔

تفسیر اس آیت میں واضح کیا گیا ہے کہ ان کافروں نے ہدایت کے بدلے گمراہی اور اللہ کی مغفرت کے بدلے دوزخ کے عذاب کو قبول کر لیا ہے۔ قیامت کے دن یہ لوگ اس شدت وسختی کے ساتھ دردناک عذاب میں مبتلا ہوں گے کہ دیکھنے والے بھی ان کے صبر اور برداشت پر دنگ رہ جائیں گے اور حیرت کریں گے کہ یہ لوگ اتنے شدید عذاب کو کیسے سہہ رہے ہیں۔

آیت نمبر (۱۷۶) ذَٰلِكَ بِأَنَّ اللَّهَ نَزَّلَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ ۗ وَإِنَّ الَّذِينَ اخْتَلَفُوا فِي الْكِتَابِ لَفِي شِقَاقٍ بَعِيدٍ ﴿۱۷۶﴾

ترجمہ: ''یہ (اس لئے ہے) کہ یقیناً اللہ نے یہ کتاب حق کے ساتھ نازل کی ہے اور بیشک جن لوگوں نے اس کتاب کے بارے میں اختلاف کیا، وہ ضد میں بہت دور جا چکے ہیں''۔

تفسیر اس آیت میں یہ واضح کیا گیا ہے کہ یہ لوگ سخت عذاب کے مستحق ہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ نے کتابیں اس لیے نازل فرمائی تھیں کہ حق کو واضح کیا جائے اور باطل کو مٹایا جائے، مگر ان لوگوں نے اللہ کی کتاب کا مذاق اڑایا اور قرآن کے بارے میں تضحیک آمیز رائے اختیار کی۔ کسی نے کہا کہ یہ جادو ہے، کسی نے کہا کہ یہ کہانیاں ہیں، اور کسی نے کہا کہ یہ ماضی کے قصے ہیں۔ اس طرح وہ حق سے دور ہو کر عذاب کے حقدار بن گئے۔

❁❁❁

ترجمہ-آیت نمبر ۱۷۷ سے ۱۸۲ تک

لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ ۚ وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ ۙ وَالسَّآئِلِيْنَ وَفِي الرِّقَابِ ۚ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ ۚ وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا عٰهَدُوْا ۚ وَالصّٰبِرِيْنَ فِي الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِيْنَ الْبَاْسِ ؕ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا ؕ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ ﴿۱۷۷﴾ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِي الْقَتْلَى ؕ اَلْحُرُّ بِالْحُرِّ وَالْعَبْدُ بِالْعَبْدِ وَالْاُنْثٰى بِالْاُنْثٰى ؕ فَمَنْ عُفِيَ لَهٗ مِنْ اَخِيْهِ شَيْءٌ فَاتِّبَاعٌ ۢ بِالْمَعْرُوْفِ وَاَدَآءٌ اِلَيْهِ بِاِحْسَانٍ ؕ ذٰلِكَ تَخْفِيْفٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَرَحْمَةٌ ؕ فَمَنِ اعْتَدٰى بَعْدَ ذٰلِكَ فَلَهٗ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۱۷۸﴾ وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ يّٰٓاُولِي الْاَلْبَابِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴿۱۷۹﴾ كُتِبَ عَلَيْكُمْ اِذَا حَضَرَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ اِنْ تَرَكَ خَيْرَا ۖ الْوَصِيَّةُ لِلْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ بِالْمَعْرُوْفِ ۚ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِيْنَ ﴿۱۸۰﴾ فَمَنْۢ بَدَّلَهٗ بَعْدَ مَا سَمِعَهٗ فَاِنَّمَآ اِثْمُهٗ عَلَى الَّذِيْنَ يُبَدِّلُوْنَهٗ ؕ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۱۸۱﴾

ترجمہ:

(۱۷۷)۔نیکی صرف یہ نہیں کہ تم اپنے چہرے مشرق یا مغرب کی طرف پھیر لو، بلکہ نیکی یہ ہے کہ جو کوئی اللہ پر، یومِ آخرت پر، فرشتوں پر، کتاب پر اور نبیوں پر ایمان لائے۔(تو اس کو چاہئے کہ) وہ اللہ کی محبت میں اپنا مال رشتہ داروں، یتیموں، مسکینوں، مسافروں، مانگنے والوں اور غلاموں کی آزادی پر خرچ کرے۔اور نماز قائم کرے، زکوٰۃ دے، اور جب وعدہ کرے تو اسے پورا کرے۔نیز تنگی، تکلیف اور لڑائی کے وقت صبر کرنے والے ہوں تو یہی وہ لوگ ہیں جو سچ بولنے والے ہیں اور یہی متقی (اللہ سے ڈرنے والے) ہیں۔(۱۷۸)۔اے ایمان والو! تم پر قتل کے بدلے میں قصاص فرض کر دیا گیا ہے: آزاد کے بدلے آزاد، غلام کے بدلے غلام اور عورت کے بدلے عورت۔پھر اگر کسی کو اپنے بھائی کی طرف سے کچھ معافی مل جائے، تو چاہیے کہ اچھے طریقے سے اس کی پیروی کرے اور نرمی سے اس کو (دیت) ادا کرے۔یہ تمہارے رب کی طرف سے رعایت اور رحمت ہے، پھر جو اس کے بعد زیادتی کرے، تو اس کے لیے دردناک عذاب ہے۔(۱۷۹)۔اور اے عقل والو! قصاص میں تمہارے لیے زندگی ہے تاکہ تم بچو (قتال سے)۔(۱۸۰)۔تم پر فرض کیا گیا ہے کہ جب تم میں سے کسی کو موت کا وقت آئے اور وہ مال چھوڑ رہا ہو، تو والدین اور

قریبی رشتہ داروں کے لیے معروف طریقے سے (شریعت کے مطابق) وصیت کرے، یہ پرہیزگاروں پر ایک حق ہے۔(۱۸۱)۔ پھر جو کوئی اس وصیت کو سننے کے بعد بدل دے، تو اس کا گناہ ان لوگوں پر ہوگا جو اسے بدلیں گے، یقیناً اللہ سب کچھ سنتا اور جانتا ہے۔(۱۸۲)۔ ہاں، جو شخص وصیت کرنے والے کی جانب سے کسی زیادتی یا گناہ کا اندیشہ محسوس کرے اور فریقین کے درمیان صلح کرا دے، تو اس پر کوئی گناہ نہیں۔ بے شک اللہ بہت معاف کرنے والا، نہایت رحم والا ہے۔

تفسیر-آیت نمبر ۱۷۷ سے ۱۸۲ تک

آیت نمبر (۱۷۷) لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ ۚ وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ ۙ وَالسَّآئِلِيْنَ وَفِي الرِّقَابِ ۚ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ ۚ وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا عٰهَدُوْا ۚ وَالصّٰبِرِيْنَ فِي الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِيْنَ الْبَاْسِ ؕ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا ؕ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ ﴿۱۷۷﴾

ترجمہ: ''نیکی صرف یہ نہیں کہ تم اپنے چہرے مشرق یا مغرب کی طرف پھیر لو، بلکہ نیکی یہ ہے کہ جو کوئی اللہ پر، یوم آخرت پر، فرشتوں پر، کتاب پر اور نبیوں پر ایمان لائے۔ (تو اس کو چاہئے کہ) وہ اللہ کی محبت میں اپنا مال رشتہ داروں، یتیموں، مسکینوں، مسافروں، مانگنے والوں اور غلاموں کی آزادی پر خرچ کرے۔ اور نماز قائم کرے، زکوٰۃ دے، اور جب وعدہ کرے تو اسے پورا کرے۔ نیز تنگی، تکلیف اور لڑائی کے وقت صبر کرنے والے ہوں تو یہی وہ لوگ ہیں جو سچ بولنے والے ہیں اور یہی متقی (اللہ سے ڈرنے والے) ہیں''۔

تفسیر عبدالرزاق نے معمر کے ذریعے قتادہ سے روایت کی ہے کہ یہودی مغرب کی طرف اور نصاریٰ مشرق کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتے تھے۔ اسی کے جواب میں یہ آیت کریمہ نازل ہوئی: لَيْسَ الْبِرَّ، یعنی نیکی یہ نہیں کہ کسی جانب منہ کر لیا جائے۔ ابن ابی حاتم نے بھی ابوالعالیہ کے ذریعے اسی روایت کی تصدیق کی ہے۔

ابن جریر اور ابن منذر قتادہ سے روایت کرتے ہیں کہ ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نیکی کے بارے میں سوال کیا، تو اس پر یہ آیت کریمہ تلاوت ہوئی۔ یہ واقعہ فرائض کی واجب احکام کے نزول سے قبل کا ہے، جب انسان صرف اس بات کی گواہی دیتا کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اللہ کے بندے اور رسول ہیں، تو

اس شخص کے لیے مغفرت کی امید ہوتی تھی۔

مفسرین نے ذکر کیا ہے کہ یہ آیت یہود و نصاریٰ کے جواب میں نازل ہوئی، کیونکہ قبلہ کی تبدیلی کے بعد وہ اسلام اور نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں طرح طرح کی باتیں کرنے لگے تھے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ یہ آیت مسلمانوں کی خوشی کے اظہار کے بعد نازل ہوئی، تاکہ یہ واضح ہو جائے کہ نیکی یہ نہیں کہ آدمی مشرق یا مغرب کی طرف اپنا رخ کر لے، بلکہ اصل نیکی وہ ہے جو اللہ پر ایمان لائے، آخرت کے دن پر یقین رکھے، ان تمام تفصیلات پر ایمان لائے جن کی خبر اللہ اور اس کے رسول نے دی، تمام کتابوں پر ایمان رکھے جو اللہ نے اپنے رسولوں پر نازل کیں، اور قرآن مجید اور تمام نبیوں پر ایمان لائے، جو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل ہوا۔

مال کے خرچ کرنے کے سلسلے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ نیکی وہ ہے جو اپنا بہترین مال رشتہ داروں، یتیموں، مسکینوں، مسافروں، مانگنے والوں اور غلاموں کو آزاد کرانے میں صرف کرے۔ نیز وہ جو نماز قائم رکھے، زکوٰۃ ادا کرے، اللہ اور بندوں کے ساتھ کیے ہوئے وعدوں کی پابندی کرے، اور تکلیف و مصیبت کے وقت دشمنان اسلام کے مقابلے میں صبر کا دامن تھامے، یہی لوگ اپنے ایمان میں سچے ہیں۔ ان کے قول و فعل نے ایمان کی سچائی کی تصدیق کی اور ثابت کیا کہ ایمان رکھنے والے پر خوف و خطر کی حالت بھی اثر نہیں ڈال سکتی۔

یہ لوگ حقیقت میں پرہیزگار ہیں، کیونکہ انہوں نے حرام سے دور رہ کر نیک کاموں کو اپنا لیا۔ یہاں جس مال کے خرچ کا ذکر ہوا وہ زکوٰۃ کے علاوہ ہے، کیونکہ زکوٰۃ کی ادائیگی کا حکم بعد میں آتا ہے۔ یہ خرچ دراصل شریعت کے مقرر کردہ فرضات سے باہر کے حقوق العباد میں نیکی کے لیے ہے۔ بعد میں حقوق اللہ یعنی عبادت کا ذکر آتا ہے، جس میں جسمانی فرائض میں نماز اور مالی عبادت میں زکوٰۃ شامل ہے۔

آیت نمبر (۱۷۸) يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِي الْقَتْلٰى ؕ اَلْحُرُّ بِالْحُرِّ وَالْعَبْدُ بِالْعَبْدِ وَالْاُنْثٰى بِالْاُنْثٰى ؕ فَمَنْ عُفِيَ لَهٗ مِنْ اَخِيْهِ شَيْءٌ فَاتِّبَاعٌ بِالْمَعْرُوْفِ وَاَدَآءٌ اِلَيْهِ بِاِحْسَانٍ ؕ ذٰلِكَ تَخْفِيْفٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَرَحْمَةٌ ؕ فَمَنِ اعْتَدٰى بَعْدَ ذٰلِكَ فَلَهٗ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۱۷۸﴾

ترجمہ: ''اے ایمان والو! تم پر قتل کے بدلے میں قصاص فرض کر دیا گیا ہے: آزاد کے بدلے آزاد، غلام کے بدلے غلام اور عورت کے بدلے عورت۔ پھر اگر کسی کو اپنے بھائی کی طرف سے کچھ معافی مل جائے، تو چاہیے کہ اچھے طریقے سے اس کی پیروی کرے اور نرمی سے اس کو (دیت) ادا

کرے۔ یہ تمہارے رب کی طرف سے رعایت اور رحمت ہے، پھر جو اس کے بعد زیادتی کرے، تو اس کے لیے دردناک عذاب ہے''۔

تفسیر قِصاص (خون کے بدلے) میں انصاف کا حکم

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے مؤمنوں کو حکم دیا ہے کہ وہ قصاص یعنی خون کے بدلے انصاف کے ساتھ عمل کریں۔ آزاد کو آزاد کے بدلے، غلام کو غلام کے بدلے، اور عورت کو عورت کے بدلے قتل کیا جائے۔ اللہ کے مقرر کردہ احکام کو اپنی خواہش کے مطابق نہ بدلا جائے۔

لفظ قصاص کے معنی "مماثلت" یعنی برابری کے ہیں۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ جتنا ظلم یا زیادتی کسی نے کسی پر کی ہے، اتنا ہی بدلہ اس سے لیا جائے، اس سے زیادہ نہیں۔ شریعت میں قتل یا زخم کی سزا میں یہی برابری لازم ہے۔ یوں قصاص کا مفہوم یہ ہے کہ انسان کے ساتھ وہی سلوک کیا جائے جو اس نے دوسرے کے ساتھ کیا ہو۔

یہود کی تعلیم میں صرف قتل پر سزا تھی اور معافی کا قانون نہیں تھا، جبکہ عیسائی مذہب میں صرف معافی کا قانون تھا اور بدلے کا کوئی اصول نہ تھا۔ عرب میں جاہلیت کے زمانے میں قصاص اور معافی دونوں رائج تھیں، لیکن اس میں بہت ظلم ہوتا تھا۔ مثال کے طور پر، اگر قاتل معمولی آدمی اور مقتول بڑا خاندان کا فرد ہوتا، تو کئی افراد مار دیے جاتے یا زخم کے بدلے مال (دیت) دوگنا یا تین گنا وصول کیا جاتا تھا۔

قتل کے بدلے قتل

مفسرین نے بیان کیا ہے کہ یہ آیت بنو قریظہ اور بنو نظیر کے قصاص و دیت کے معاملے کے تناظر میں نازل ہوئی۔ جاہلیت میں جنگ کے بعد فاتح قبائل معمولی فدیہ کے بدلے مقتول کا قصاص نہیں کرتے تھے، جس سے ظلم پیدا ہوتا تھا۔ اس کے خلاف اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو قصاص میں انصاف کا حکم دیا: آزاد کے بدلے آزاد، عورت کے بدلے عورت۔

اگر مقتول کے ولی قاتل کو معاف کر دیں یا دیت لینے پر راضی ہوں تو قصاص ختم ہو جائے گا اور دیت واجب ہوگی۔ مقتول کے وارثوں کو چاہئے کہ قاتل پر طاقت سے زیادہ بوجھ نہ ڈالیں، اور قاتل کو چاہئے کہ دیت دینے میں تاخیر نہ کرے اور وارثوں کو ذہنی تکلیف نہ پہنچائے۔ اگر معافی یا دیت کے بعد بھی قاتل کو قتل کیا جائے تو دنیا و آخرت میں اس کے لیے سزا طے ہوگی۔

ایک کے بدلے صرف ایک کا قتل

آیت میں دو اہم اصول بیان کیے گئے ہیں:

(۱) قصاص میں برابری لازم ہے۔ جاہلیت کی طرح ایک کے بدلے دو یا چار افراد کو قتل نہ کیا جائے۔ نہ غلام اور نہ امیر کے درمیان فرق کیا جائے۔ جان کے لحاظ سے سب برابر ہیں۔

(۲) مقتولین میں صرف جان کی برابری ہے، قتل کے طریقے میں نہیں۔ یعنی جس نے کسی کو آگ میں جلایا، اسے بھی آگ میں جلا کر مارنا لازم نہیں، یا کسی کو پانی میں ڈبو کر مارا تو قاتل کو بھی پانی میں ڈبو کر مارنا ضروری نہیں۔ اسی طرح، جادو سے قتل کرنے والے کو بھی جادو سے قتل کرنا فرض نہیں۔

قِصاص کا اختیار

قِصاص صرف حاکم کے اختیار میں ہے، ہر شخص خود اس پر عمل نہ کرے، ورنہ فساد و فتنہ بڑھ جائے گا۔ قصاص اس صورت میں نافذ ہوتا ہے جب قتل جان بوجھ کر اور ارادے سے کیا گیا ہو۔ اگر قتل غلطی یا حادثے سے ہوا ہو تو قصاص نہیں ہوتا بلکہ خون بہانے کے بدلے دیت دینا لازم ہے۔ اس طرح اللہ تعالیٰ نے قصاص کے نظام میں انصاف اور برابری قائم کرنے کا حکم دیا، تاکہ ظلم و زیادتی کا مناسب بدلہ لیا جائے اور معاشرتی امن قائم رہے۔

دیت (خون بہا) کا نظام

دیت، یعنی خون بہا، شریعت میں مخصوص طور پر مقرر کی گئی ہے۔ اگر یہ اونٹوں کے ذریعے دی جائے تو تعداد ایک سو اونٹ ہوگی، اور ان کی عمر و معیار کے حوالے سے تفصیل فقہ کی کتابوں میں بیان کی گئی ہے۔ اگر دیت سونے میں ادا کی جائے تو ایک ہزار دینار اور اگر چاندی میں دی جائے تو دس ہزار درہم کے برابر ہوگی۔

درہم آج کے وزن کے مطابق تقریباً ساڑھے تین ماشہ چاندی کے برابر ہوتا ہے، اس طرح پوری دیت کی مقدار تقریباً ۲۹۱۶ تولہ آٹھ ماشہ چاندی ہوگی، یعنی تقریباً ۳۶ کلو ۲۰ گرام۔ اگر دیت کا بدلہ مقررہ اونٹ، دینار یا درہم کی بجائے دیگر کسی چیز، جیسے غلہ، کپڑا، گھوڑا، مکان، دکان، جائداد، یا موٹر گاڑی وغیرہ کے بدلے آپسی رضامندی سے طے ہو جائے، تو قصاص ختم ہو جائے گا اور طے شدہ مال یا اس کی قیمت ادا کرنا واجب ہوگی، چاہے یہ قیمت مقررہ خون بہا سے زیادہ یا کم ہو۔

اگر بدلے میں وہی تین چیزیں یعنی اونٹ، دینار، یا درہم ہوں تو مقدار کی پابندی لازم ہوگی، جیسا کہ شرع نے مقرر کیا ہے۔ آیت میں دو بنیادی اصول بیان کیے گئے ہیں: (۱) قِصاص یعنی قصاص کے ذریعے برابری کے بدلے کا اصول۔ (۲) اگر مقتول کے وارث قاتل کو معاف کر دیں یا کچھ وارث معاف کر دیں یا دیت کے ذریعے قصاص ختم ہو جائے، تو قاتل پر لازم ہے کہ وہ معاوضہ خوشی اور دلجمعی سے ادا کرے۔

یہ حکم اللہ تعالیٰ کی طرف سے امت مسلمہ کے لیے رحمت و احسان ہے۔ پہلی امتوں پر یہ سہولت موجود نہ تھی: یہودیوں پر صرف قِصاص مقرر تھا اور نصاریٰ پر صرف دیت۔ اسلام میں اللہ تعالیٰ نے قصاص کے ساتھ ساتھ معافی اور بدلے کی سہولت بھی مقرر فرمائی تا کہ انسانیت پر مہربانی ہو اور انصاف کے ساتھ ساتھ آسانی بھی فراہم کی جائے۔

آیت نمبر (۱۷۹) وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ يّٰٓاُولِي الْاَلْبَابِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴿۱۷۹﴾

ترجمہ: ''اور اے عقل والو! قصاص میں تمہارے لیے زندگی ہے تا کہ تم بچو (قتال سے)''۔

تفسیر

قِصاص کا قانون اور اس کی اہمیت

ابن ابی حاتم نے سعید بن جبیرؓ سے روایت کی ہے کہ اسلام سے پہلے، یعنی زمانۂ جاہلیت میں دو قبائل کے درمیان ایک معمولی تنازعہ کے سبب لڑائی ہوئی، جس میں نہ صرف مرد بلکہ غلام اور عورتیں بھی قتل اور زخمی ہو گئیں۔ اس وقت بعض قبائل نے ایک دوسرے سے کسی قسم کا مطالبہ نہیں کیا، لیکن جب سب مسلمان ہو گئے تو ہر قبیلہ اپنے افراد اور مال کا بدلہ چاہتا تھا۔ نتیجتاً دونوں قبائل نے قسم کھائی اور اس پر راضی ہوئے کہ ہمارے غلام کے بدلے ان کا آزاد اور ہماری عورت کے بدلے ان کا مرد قتل کیا جائے۔ اس واقعہ پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: ''آزاد، آزاد کے بدلے، غلام، غلام کے بدلے، اور عورت، عورت کے بدلے قتل کی جائے''۔

قِصاص کی رحمت اور حکمت

قصاص کا قانون بظاہر قاتل کی موت کا تقاضا کرتا ہے، لیکن حقیقت میں یہ امت کے لیے زندگی اور سلامتی کا سبب ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ''، یعنی قصاص میں تمہارے لیے زندگی ہے۔ اس قانون کی بدولت ہر فرد اور قبیلہ محتاط رہتا ہے تا کہ کسی کے ساتھ قتل و تشدد نہ ہو، اور اس طرح معاشرت میں امن قائم رہتا ہے۔

ابن کثیر کے مطابق چاروں اماموں اور اکثر علماء کا اتفاق ہے کہ اگر ایک شخص کو متعدد افراد نے قتل کیا تو قصاص میں ان سب کو مقتول کے بدلے سزا دی جائے گی۔ حضرت سعید بن المسیبؒ نے روایت کیا کہ اگر پانچ یا سات افراد نے کسی ایک شخص کو چھپ کر قتل کیا تو حضرت عمرؓ نے ان سب کو ایک شخص کے قصاص کے طور پر قتل کرنے کا حکم دیا اور فرمایا کہ اگر شہر صنعاء کے تمام لوگ مل کر ایک شخص کو قتل کریں تو میں اُن سب کو سزا دیتا۔

یہ واقعہ قصاص کے نظام کی سختی اور عدل کی مکمل وضاحت پیش کرتا ہے، تا کہ قتل و ظلم کی روک تھام ہو اور معاشرہ محفوظ اور منظم رہے۔

قِصاص: انصاف اور اس کی اہمیت

قصاص کا قانون نافذ کرنے اور اس پر عمل کرنے سے بے شمار جانیں بچتی ہیں اور لوگ ایک دوسرے کو قتل کرنے سے باز رہتے ہیں، اسی لیے اللہ تعالیٰ نے اسے ''بڑی زندگی کا ذریعہ'' قرار دیا۔ تاہم، بعض جاہل لوگ قصاص کو ظلم سمجھتے ہیں، حالانکہ وہ ظلم کے حقیقی مفہوم سے بھی نا آشنا ہیں۔ ظلم کرنے والا وہ قاتل ہے جو جان بوجھ کر کسی کی جان لے، اور قتل کے بدلے قاتل کو قتل کرنا عین انصاف ہے۔ اسے ظلم کہنا جہالت اور حماقت ہے۔

یہ لوگ کہتے ہیں کہ قاتل کو قتل نہ کیا جائے بلکہ جیل میں بند کر دیا جائے، مگر وہ یہ نہیں سمجھتے کہ اس سے قاتل کی ہمت اور بڑھ جائے گی۔ اس پر قتل کرنے والے سوچیں گے کہ ''قتل کر دوں، تھوڑی بہت جیل کاٹ لوں گا''۔ ایسے لوگ جو قتل، ڈکیتی اور فساد کے عادی ہوں، جیل کی دیواریں پھاڑ کر یا کھڑکیاں توڑ کر بھی بھاگ جاتے ہیں، اس لیے قصاص ہی سب سے مؤثر اور منصفانہ سزا ہے۔

جن لوگوں کے نزدیک انسان کی جان کی کوئی قیمت نہیں، وہ قصاص کو قبول نہیں کرتے۔ انہیں قاتل پر رحم آتا ہے، مگر عام لوگوں کی جانوں پر رحم نہیں ہوتا۔ سنن ابوداؤد میں ہے کہ جو شخص جان بوجھ کر قتل کرے، اس پر قصاص واجب ہے، اور جو قصاص کے نفاذ میں رکاوٹ ڈالے، اس پر اللہ، فرشتوں اور تمام انسانوں کی لعنت ہے۔

قِصاص یا دیت میں معافی کا اصول

دنیا میں بعض ملکوں کے حکمران قاتل کی درخواست پر اپنے ذاتی یا پارٹی مفاد کے لیے قاتل کو معاف کر دیتے ہیں، مگر یہ شریعت اسلامیہ کے بالکل خلاف ہے۔ اسلام میں مقتول کے وارثین کے پاس حق ہے کہ وہ قاتل کو قصاص کے لیے دیں یا معاف کریں، یا دیت وصول کریں۔ کسی امیر، وزیر، صدر یا بادشاہ کو وارثین کی اجازت کے بغیر قاتل کو معاف کرنے کا اختیار نہیں ہے۔

آیت نمبر (۱۸۰) كُتِبَ عَلَيْكُمْ اِذَا حَضَرَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ اِنْ تَرَكَ خَيْرَا ۖ الْوَصِيَّةُ لِلْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ بِالْمَعْرُوْفِ ۚ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِيْنَ ﴿۱۸۰﴾

ترجمہ: ''تم پر فرض کیا گیا ہے کہ جب تم میں سے کسی کو موت کا وقت آئے اور وہ مال چھوڑ رہا ہو، تو والدین اور قریبی رشتہ داروں کے لیے معروف طریقے سے (شریعت کے مطابق) وصیت کرے، یہ پرہیزگاروں پر ایک حق ہے''۔

تفسیر

مال کی وصیت

اس آیت میں ابتدائی طور پر ماں باپ اور رشتہ داروں کے لیے مال کی وصیت کرنا فرض قرار دیا گیا تھا، تا کہ مرنے والے شخص کے پیچھے رہ جانے والے اہل خانہ اپنے حق وحقوق سے محروم نہ رہ جائیں۔ جب کسی شخص کی موت کے آثار ظاہر ہونے لگیں، تو اسے وصیت کر دینی چاہیے۔ مفسرین کے نزدیک اس حکم کی فرضیت بعد میں منسوخ ہوگئی۔

لفظ ''وصیت'' کے معنٰی ہیں: حکم دینا اور نصیحت کرنا۔ شریعت کی روشنی میں اس سے مراد وہ ہدایات ہیں جو مرنے والا اپنے پیچھے رہنے والوں کے لیے کرتا ہے اور جو اس کی موت کے بعد پوری کی جاتی ہیں۔ وصیت کی مختلف اقسام درج ذیل ہیں:

۱۔ واجب وصیت: جیسے کسی کی امانت یا واجب الادا قرض یا زکوٰۃ کی وصیت۔

۲۔ مستحب وصیت: کسی نیک کام کے لیے وصیت کرنا۔

۳۔ مباح وصیت: جائز کام کے لیے وصیت کرنا۔

۴۔ ناجائز وصیت: کوئی حرام یا ناجائز کام کے لیے وصیت کرنا، جس کا پورا کرنا شریعت میں منع ہے۔

۵۔ موقوف وصیت: ایسی وصیت جس کے پورا ہونے کے لیے بعض شرعی شرائط ضروری ہوں، جیسے مرنے والا اپنے ترکہ کے ایک تہائی سے زیادہ کی وصیت کرے، تو اسے وارثوں کی رضامندی سے پورا کیا جائے گا۔

قریبی رشتہ داروں کے لیے وصیت

ابتدائی دور میں، جب وارثوں کے حصے مقرر نہیں تھے، مرنے والے کو اجازت تھی کہ وہ اپنے والدین اور رشتہ داروں کے لیے اپنے مال کا ایک تہائی حصہ وصیت کر دے۔ یہ حصص اس لیے مقرر تھے تا کہ والدین اور قریبی رشتہ دار محروم نہ رہ جائیں اور باقی مال اولاد کے حق میں ہو۔

یعنی: ''تم پر فرض کیا جاتا ہے کہ جب کسی کو موت کے آثار نزدیک معلوم ہونے لگیں، بشرطیکہ کچھ مال بھی ترکہ میں چھوڑا ہو، تو اپنے والدین اور دوسرے رشتہ داروں کے لیے پورے مال سے ایک تہائی مال کی وصیت کر دو، اور یہ وصیت خدا کے خوف والوں پر فرض کی گئی ہے''۔

وصیت کی فرضیت اور منسوخی

اکثر مفسرین کے مطابق، یہ آیت اب منسوخ ہے۔ وصیت کرنے کا حکم والدین اور قریبی رشتہ داروں کے لیے اس وقت تک تھا جب تک آیتِ میراث نازل نہیں ہوئی تھی۔ اس لیے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''ایک مسلمان

کے لیے مناسب نہیں کہ اُس پر تین راتیں گزر جائیں اور اُس کے پاس وصیت نامہ نہ ہو''۔

جب آیتِ میراث نازل ہوئی اور ہر وارث کے حصے اللہ تعالیٰ نے طے کر دیے، تو اس وصیت کی فرضیت ختم ہو گئی۔ اب ہر وارث اپنے شرعی حصے کا حق لے لینے کا حقدار ہے اور کسی قسم کی وصیت اس پر لازم نہیں۔ یوں، میراث کے احکام نے وصیت کے ابتدائی حکم کو منسوخ کر دیا اور ہر وارث کو اس کا مقرّر حصہ بغیر کسی وصیت کے حاصل ہوتا ہے۔ اسلامی شریعت میں قرآن وحدیث کے مطابق میراث کے احکام کو خاص اہمیت حاصل ہے، کیونکہ یہ خاندان میں حقوق کی تقسیم اور عدل وانصاف کو یقینی بناتے ہیں۔

میت کے مال کی تقسیم

ایک اہم مسئلہ یہ بھی سمجھنا ضروری ہے کہ کچھ مخصوص اخراجات ایسے ہیں جو وارثوں میں وراثت کی تقسیم سے پہلے کیے جاتے ہیں۔ ان اخراجات کے بعد جو مال باقی رہتا ہے، اسی میں وراثت جاری ہوتی ہے اور وارثوں کو ان کا حصہ ملتا ہے۔ اگر میت کا چھوڑا ہوا مال ان اخراجات میں ختم ہو جائے تو وارثوں کو کچھ نہیں ملے گا۔ یہ تین بنیادی اخراجات درج ذیل ہیں:

(۱) میت کے کفن ودفن کا خرچ: میت کو اچھی طرح دفن کرنے اور اس کا کفن کرنے کے لیے ضروری سامان پر خرچ کیا جاتا ہے۔

(۲) میت کے واجب القرض قرض کی ادائیگی: میت کے باقی قرض واجب الادا پہلے ادا کیے جائیں۔

(۳) وصیت کی ادائیگی: اگر میت نے کسی جائز مقصد کے لیے وصیت کی ہو تو وہ پوری کی جائے، مگر قرض کی ادائیگی کے بعد اور صرف اُس کے ترکہ کے ایک تہائی حصے تک۔

یہ اصول واضح کرتا ہے کہ قرض اور وصیت میں مال خرچ کرنے کے بعد جو باقی بچتا ہے، اسی میں وارثوں کے حصے کا تعین ہوتا ہے۔

فرض کی وصیت

وصیت میں سب سے پہلے واجب اور فرض چیزیں ادا کی جائیں۔ مثلاً اگر میت پر حج واجب تھا مگر ادا نہیں کیا، یا زکوٰۃ واجب تھی مگر ادا نہیں ہوئی، یا کوئی کفارہ واجب تھا مگر ادا نہیں ہوا، تو یہ سب وصیت سے پہلے ادا کرنا ضروری ہے۔ حتیٰ کہ اگر وصیت میں غیر واجب اور غیر فرض چیزوں کا ذکر پہلے یا بعد میں آیا ہو، تو بھی فرائض اور واجبات کی ادائیگی مقدم ہوگی۔

گناہ کی وصیت

کسی بھی حرام یا گناہ کے کام کے لیے وصیت کرنا شرعاً جائز نہیں۔ اگر کوئی شخص اپنے مال کو گناہوں میں خرچ کرنے یا شرک و بدعت کے کاموں کے لیے وصیت کرے تو وہ وصیت نافذ نہیں ہوگی۔

وصیت کی اہمیت

انسان دنیا میں رہتے ہوئے مختلف لوگوں سے واسطہ رکھتا ہے، کچھ لیتا ہے اور کچھ دیتا ہے۔ اس کے پاس واجب حقوق، قرض، امانتیں، اور دینی فرائض ہوتے ہیں۔ موت کے وقت یہ معلوم نہیں ہوتا کہ کب آئے گی، اس لیے ضروری ہے کہ وصیت ہمیشہ تیار رہے۔ تمام واجب حقوق، قرض، امانتیں اور باقی واجبات کو کسی تحریر یا نوٹ پر درج کر کے رکھنا چاہیے، تاکہ اچانک موت آنے کی صورت میں وارثین ان سب کا حق ادا کر سکیں۔

حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جس مسلمان کے پاس کوئی چیز ہو جس کی وصیت کرنا ضروری ہو، اس کے لیے یہ مناسب نہیں کہ دو راتیں گزر جائیں اور اس کے پاس وصیت لکھی ہوئی نہ ہو''۔ **(بخاری: ۲۷۳۸)**

حضرت جابر بن عبداللہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جس شخص کی وصیت مکمل کر کے موت آتی ہے، وہ صحیح راستے پر، سنت، تقویٰ اور شہادت کی حالت میں اور اللہ کی رضا کے ساتھ مرے گا''۔ **(سنن ابن ماجہ: ۲۷۰۱)**

آیت نمبر (۱۸۱) فَمَنۢ بَدَّلَهٗ بَعْدَ مَا سَمِعَهٗ فَاِنَّمَاۤ اِثْمُهٗ عَلَى الَّذِيْنَ يُبَدِّلُوْنَهٗ ؕ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۱۸۱﴾

ترجمہ: ''پھر جو کوئی اس وصیت کو سننے کے بعد بدل دے، تو اس کا گناہ ان لوگوں پر ہوگا جو اسے بدلیں گے، یقیناً اللہ سب کچھ سنتا اور جانتا ہے''۔

تفسیر جب وصیت کنندہ نے اپنی وصیت کر دی، تو اب وارثوں پر لازم ہے کہ وہ اس وصیت کو بالکل صحیح اور اصل صورت میں پورا کریں۔ اگر وصیت فقراء اور مساکین کے حق میں کی گئی ہے، تو وارثوں کو یہ نہیں معلوم ہوتا کہ میت نے ان کے لیے کچھ مخصوص وصیت رکھی ہے۔ بعض وارث اسے چھپا سکتے ہیں یا اس میں تبدیلی کر سکتے ہیں، اور یہی وہ صورت ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں تنبیہ فرمائی ہے کہ جو کوئی وصیت میں تبدیلی کرے گا، وہ گناہگار ہوگا اور آخرت میں اس کے بارے میں سوال ہوگا۔

نوٹ: اگر کسی پر زکوٰۃ فرض تھی اور اس نے اسے ادا کیے بغیر وفات پائی تو وہ گناہگار ہوگا اور زکوٰۃ روکنے والوں کے حکم

میں داخل ہوگا۔ تاہم، اگر اس نے وصیت کے ذریعے زکوٰۃ کی ادائیگی کا انتظام کر دیا اور وارثوں نے اسے پورا نہ کیا تو میت گناہ سے بری ہو جائے گا، اور اب گناہ وارثوں کے ذمے ہوگا جو وصیت کو بدل دیں گے۔ البتہ، اگر وصیت شریعت کے خلاف کی گئی ہو تو اس صورت میں وصیت کو بدلنا اور شرعی حکم کے مطابق پورا کرنا واجب ہے۔

آیت نمبر (۱۸۲) فَمَنْ خَافَ مِنْ مُّوْصٍ جَنَفًا اَوْ اِثْمًا فَاَصْلَحَ بَيْنَهُمْ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۸۲﴾

ترجمہ: ''ہاں جو شخص وصیت کرنے والے کی جانب سے کسی زیادتی یا گناہ کا اندیشہ محسوس کرے اور فریقین کے درمیان صلح کرا دے، تو اس پر کوئی گناہ نہیں۔ بے شک اللہ بہت معاف کرنے والا، نہایت رحم والا ہے''۔

تفسیر کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ وصیت کرنے والا غلطی سے ایسی وصیت کر بیٹھتا ہے جس میں کسی وارث یا رشتہ دار کے حق میں زیادہ رغبت ظاہر ہو جائے اور انصاف قائم نہ رہے۔ اگر کوئی شخص اس بات کا علم حاصل کر لے کہ ایسی وصیت کی گئی ہے یا ایسی وصیت کرنے کا ارادہ ہے، تو وہ درمیان میں آ کر اصلاح کرے اور وصیت کنندہ کو شریعت کے مطابق صحیح طریقہ دکھائے۔ اسی طرح اگر کوئی حاکم وصیت کو درست کرے تو اس میں کوئی گناہ نہیں۔ جو شخص اس نیک نیتی کے ساتھ وصیت کو درست کرے گا، اللہ تعالیٰ اسے معاف فرما دے گا۔

❁❁❁

ترجمہ-آیت نمبر ۱۸۳ سے ۱۸۷ تک

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴿۱۸۳﴾ اَيَّامًا مَّعْدُوْدٰتٍ ؕ فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيْضًا اَوْ عَلٰى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ ؕ وَعَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِيْنٍ ؕ فَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا فَهُوَ خَيْرٌ لَّهٗ ؕ وَاَنْ تَصُوْمُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۸۴﴾ شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَبَيِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰى وَالْفُرْقَانِ ۚ فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ ؕ وَمَنْ كَانَ مَرِيْضًا اَوْ عَلٰى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ ؕ يُرِيْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ ۫ وَلِتُكْمِلُوا الْعِدَّةَ وَلِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۱۸۵﴾ وَاِذَا سَاَلَكَ عِبَادِيْ عَنِّيْ فَاِنِّيْ قَرِيْبٌ ؕ اُجِيْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ ۙ فَلْيَسْتَجِيْبُوْا لِيْ وَلْيُؤْمِنُوْا بِيْ لَعَلَّهُمْ يَرْشُدُوْنَ ﴿۱۸۶﴾ اُحِلَّ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ اِلٰى نِسَآئِكُمْ ؕ هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَاَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ ؕ عَلِمَ اللّٰهُ اَنَّكُمْ كُنْتُمْ تَخْتَانُوْنَ اَنْفُسَكُمْ فَتَابَ عَلَيْكُمْ وَعَفَا عَنْكُمْ ۚ فَالْئٰنَ بَاشِرُوْهُنَّ وَابْتَغُوْا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ ۪ وَكُلُوْا وَاشْرَبُوْا حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْاَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْاَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ ۪ ثُمَّ اَتِمُّوا الصِّيَامَ اِلَى الَّيْلِ ۚ وَلَا تُبَاشِرُوْهُنَّ وَاَنْتُمْ عٰكِفُوْنَ ۙ فِي الْمَسٰجِدِ ؕ تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ فَلَا تَقْرَبُوْهَا ؕ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ اٰيٰتِهٖ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ ﴿۱۸۷﴾

ترجمہ:

(۱۸۳)۔اے ایمان والو! تم پر روزے فرض کیے گئے ہیں جیسے تم سے پہلے لوگوں پر فرض کیے گئے تھے، تا کہ تم پرہیز گار بن جاؤ۔(۱۸۴)۔یہ چند گنے چنے دن ہیں اور اگر تم میں سے کوئی بیمار ہو یا سفر میں ہو، تو دوسرے دنوں میں گنتی پوری کرے۔اور جو لوگ روزہ رکھنے کی طاقت رکھتے ہیں (لیکن نہ رکھیں)، ان کے لیے ایک مسکین کو کھانا کھلانے کا فدیہ ہے۔پھر جو خوشی سے نیکی کرے، تو یہ اسی کے لیے بہتر ہے۔اور اگر تم روزہ رکھو تو یہ تمہارے لیے بہتر ہے، اگر تم سمجھتے ہو۔(۱۸۵)۔رمضان کا مہینہ وہ ہے جس میں قرآن نازل کیا گیا، جو انسانوں کے لیے ہدایت ہے اور اس میں ہدایت کی روشن نشانیاں اور حق و باطل کو جدا کرنے کا معیار ہے۔تو جو شخص اس مہینے کو پائے، وہ اس میں روزہ

رکھے۔ اور جو بیمار ہو یا سفر میں ہو، تو دوسرے دنوں میں گنتی پوری کرے۔ اللہ تمہارے لیے آسانی چاہتا ہے اور تمہارے لیے تنگی نہیں چاہتا۔ اور تا کہ تم گنتی پوری کرو اور اللہ کی بڑائی بیان کرو اس پر کہ اس نے تمہیں ہدایت دی اور شاید کہ تم شکر گزار بنو۔(۱۸۶)۔ اور جب میرے بندے آپ سے میرے بارے میں پوچھیں (اے محمدؐ)، تو (کہہ دیجئے) میں قریب ہوں، دعا کرنے والے کی دعا قبول کرتا ہوں جب وہ مجھے پکارتا ہے، تو چاہیے کہ وہ میرا حکم مانیں اور مجھ پر ایمان رکھیں، تا کہ وہ ہدایت پائیں۔(۱۸۷)۔ تمہارے لیے روزے کی رات اپنی بیویوں کے ساتھ مباشرت کرنا حلال کر دیا گیا ہے۔ وہ تمہارے لیے لباس ہیں اور تم ان کے لیے لباس ہو۔ اللہ جانتا ہے کہ تم اپنے نفسوں سے خیانت کرتے تھے، تو اس نے تم پر مہربانی کی اور تمہیں معاف کر دیا۔ تو اب ان سے مباشرت کرو اور وہ چیز طلب کرو جو اللہ نے تمہارے لیے لکھ دی ہے اور کھاؤ پیو، یہاں تک کہ صبح کا سفید دھاگا رات کے سیاہ دھاگے سے تم پر ظاہر ہو جائے، پھر روزہ رات تک پورا کرو۔ اور جب تم مسجدوں میں اعتکاف میں ہو، تو ان سے مباشرت نہ کرو۔ یہ اللہ کی مقرر کردہ حدود ہیں، ان کے قریب نہ جاؤ۔ اسی طرح اللہ اپنے احکام لوگوں کے لیے کھول کر بیان کرتا ہے تا کہ وہ بچیں۔

تفسیر-آیت نمبر ۱۸۳ سے ۱۸۷ تک

آیت نمبر(۱۸۳) يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴿۱۸۳﴾

ترجمہ: ''اے ایمان والو! تم پر روزے فرض کیے گئے ہیں جیسے تم سے پہلے لوگوں پر فرض کیے گئے تھے، تا کہ تم پرہیز گار بن جاؤ''۔

تفسیر نماز اور روزہ دونوں جسمانی عبادتیں ہیں، جبکہ زکوٰۃ مالی عبادت ہے اور حج میں بھی جسمانی محنت اور مالی خرچ شامل ہوتا ہے، اس لیے وہ بھی بدنی اور مالی عبادت دونوں کے زمرے میں آتا ہے۔ نماز نبوت کے پانچویں سال میں مکہ معظّمہ میں شبِ معراج کے موقع پر فرض کی گئی، جبکہ رمضان کے روزے ہجرت کے بعد مدینہ منورہ میں سنہ ۲ ہجری میں فرض ہوئے۔ جیسے نماز اور زکوٰۃ پہلی امتوں پر فرض تھیں، اسی طرح روزے بھی اُن پر واجب تھے، جس کا ذکر قرآن میں ''كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ'' میں آیا ہے، تا کہ معلوم ہو کہ روزہ کوئی نئی عبادت نہیں بلکہ پچھلی امتوں پر بھی فرض رہا۔

روزہ کی فرضیت کا دائرہ حضرت آدمؑ سے حضرت عیسیٰؑ تک ہر امت پر محیط رہا، البتہ روزوں کی تعداد اور ان

کے دن مختلف تھے۔ جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مدینہ تشریف لائے، تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہر ماہ تین روزے رکھتے تھے اور یومِ عاشورہ یعنی محرم کی دس تاریخ کو بھی روزہ رکھتے تھے۔ بعد میں اللہ تعالیٰ نے رمضان کے روزے تمام مسلمانوں پر فرض فرما دیے، مگر ابتدائی طور پر یہ اختیار تھا کہ جو چاہے روزے رکھے اور جو طاقت ہونے کے باوجود نہ رکھے، وہ فدیہ (بدلہ) دے دے۔

روزہ میں ابتدا میں تبدیلیاں بھی آئیں۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مدینہ ہجرت کے بعد ہر ماہ تین دن روزے رکھنے کا حکم ہوا۔ بعد میں رمضان کے روزے فرض کیے گئے، اور شروع میں لوگوں کی عادت نہ ہونے کے سبب روزہ رکھنا بھاری محسوس ہوتا تھا، اس لیے اللہ تعالیٰ نے اجازت دی کہ اگر کوئی طاقت ہونے کے باوجود روزہ نہ رکھے تو ہر روزے کے بدلے ایک مسکین کو کھانا کھلا دے۔

بعد میں یہ آیت نازل ہوئی: ''فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ''، یعنی جو شخص ماہ رمضان میں موجود ہو، اس پر روزہ رکھنا واجب ہے۔ ابتدائی روزے میں کھانے پینے اور عورتوں سے صحبت کی اجازت رات سونے سے پہلے تھی، اور اگر کوئی سو جاتا تو روزہ اس کے لیے شروع ہو جاتا تھا، البتہ کھانے پینے اور ہمبستری کی اجازت رات میں ختم ہو جاتی تھی۔

بعد میں آیت ''أُحِلَّ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ'' نازل ہوئی، جس کے بعد مغرب کے بعد سے صبح صادق تک رمضان کی راتوں میں کھانے پینے اور ہمبستری کی اجازت دی گئی۔

آیت نمبر (۱۸۴) اَيَّامًا مَّعْدُوْدٰتٍ ؕ فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيْضًا اَوْ عَلٰى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ ؕ وَعَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِيْنٍ ؕ فَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا فَهُوَ خَيْرٌ لَّهٗ ؕ وَاَنْ تَصُوْمُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۸۴﴾

ترجمہ: ''یہ چند گنے چنے دن ہیں اور اگر تم میں سے کوئی بیمار ہو یا سفر میں ہو، تو دوسرے دنوں میں گنتی پوری کرے۔ اور جو لوگ روزہ رکھنے کی طاقت رکھتے ہیں (لیکن نہ رکھیں)، ان کے لیے ایک مسکین کو کھانا کھلانے کا فدیہ ہے۔ پھر جو خوشی سے نیکی کرے، تو یہ اسی کے لیے بہتر ہے۔ اور اگر تم روزہ رکھو تو یہ تمہارے لیے بہتر ہے، اگر تم سمجھتے ہو''۔

تفسیر یہ آیت وَعَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَ کی وضاحت کرتے ہوئے ابن سعد نے طبقات میں مجاہد سے روایت کی ہے کہ یہ آیت قیس بن سائب کے بارے میں نازل ہوئی، جس میں فرمایا گیا کہ وہ روزہ کھول دیں اور ہر روزے کے بدلے ایک مسکین کو کھانا کھلائیں۔

روزہ میں رعایت

بخاری میں حضرت ابن ابی لیلیٰ سے روایت ہے کہ جب رمضان کے روزے نازل ہوئے تو صحابہ کو روزہ رکھنا بھاری محسوس ہونے لگا۔ ایسے میں جو شخص روزانہ ایک مسکین کو کھانا کھلا سکتا تھا، وہ طاقت ہونے کے باوجود روزہ چھوڑ دیتا تھا، اور ان کو اس کی اجازت دی گئی تھی۔ بعد میں یہ حکم منسوخ ہوا اور سب پر روزے رکھنے کا لازم ہو گیا، جیسا کہ آیت وَاَنْ تَصُوْمُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ میں آیا۔

حضرت ابن عمرؓ نے بھی آیت ''فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِيْنٍ'' تلاوت کی اور فرمایا کہ یہ اجازت اب منسوخ ہو چکی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اب رمضان میں روزہ رکھنے کی طاقت رکھنے والے افراد کے لیے فدیہ دے کر روزہ چھوڑنا جائز نہیں، بلکہ روزہ لازمی ہے اور جو بھی تکلیف ہو اسے صبر و تحمل کے ساتھ برداشت کرنا ہوگا۔

فدیہ کی رعایت

البتہ، جو شخص بالکل بھی روزہ نہیں رکھ سکتا، اس کے لیے فدیہ دینے کی اجازت موجود ہے۔ نیز، آیت فَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا فَهُوَ خَيْرٌ لَّهٗ سے یہ واضح ہوا کہ رمضان کے فرض روزوں کے علاوہ اگر کوئی شخص اپنی خوشی سے نفل روزے رکھے تو یہ اس کے لیے بہتری اور اجر کا سبب ہے۔

روزہ میں ترغیب

وَاَنْ تَصُوْمُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ کا تعلق ان لوگوں سے بھی ہو سکتا ہے جنہیں شروع میں تندرست ہونے کے باوجود روزہ نہ رکھنے اور فدیہ دینے کی اجازت دی گئی تھی۔ علّامہ ابوبکر حسّاسؒ کے مطابق یہ ممکن ہے کہ اس کا تعلق الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ سے بھی ہو اور مسافروں سے بھی، کیونکہ مسافر اور بیمار رمضان میں روزہ چھوڑ کر بعد میں قضا کر سکتے ہیں، مگر ان کے لیے بھی یہ بہتر ہے کہ رمضان میں روزہ رکھیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ سفر کے دوران بھی روزہ نہ رکھنا، روزہ رکھنے سے بہتر نہیں۔

آیت نمبر (۱۸۵) شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَبَيِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰى وَالْفُرْقَانِ ۚ فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ ۭ وَمَنْ كَانَ مَرِيْضًا اَوْ عَلٰي سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ ۭ يُرِيْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ ۡ وَلِتُكْمِلُوا الْعِدَّةَ وَلِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰي مَا هَدٰىكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ۝۱۸۵

ترجمہ: رمضان کا مہینہ وہ ہے جس میں قرآن نازل کیا گیا، جو انسانوں کے لیے ہدایت ہے اور

اس میں ہدایت کی روشن نشانیاں اور حق و باطل کو جدا کرنے کا معیار ہے۔ تو جو شخص اس مہینے کو پائے، وہ اس میں روزہ رکھے۔ اور جو بیمار ہو یا سفر میں ہو، تو دوسرے دنوں میں گنتی پوری کرے۔ اللہ تمہارے لیے آسانی چاہتا ہے اور تمہارے لیے تنگی نہیں چاہتا۔ اور تا کہ تم گنتی پوری کرو اور اللہ کی بڑائی بیان کرو اس پر کہ اس نے تمہیں ہدایت دی اور شاید کہ تم شکر گزار بنو''۔

تفسیر پچھلی آیت میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا تھا کہ روزے کچھ مخصوص دنوں کے لیے رکھے جائیں، یعنی اَیَّامًا مَّعْدُوْدٰتٍ، اور اب اسی آیت میں اللہ تعالیٰ واضح فرماتے ہیں کہ یہ مخصوص دن رمضان کے مہینے کے ہیں۔

رمضان کے روزوں میں سہولت

شروع میں رمضان کے روزوں کی فرضیت نازل ہوئی تو اس میں کچھ آسانیاں رکھی گئی تھیں۔ پہلی یہ کہ جو بیمار ہوں یا جن کے لیے روزہ رکھنا دشوار ہو، یا جو مسافر ہوں، ان کے لیے اختیار تھا کہ روزہ رکھیں یا نہ رکھیں، اور جتنے روزے رمضان میں نہ رکھے جائیں، وہ بعد میں کسی دن کے روزوں سے قضا کیے جاسکتے ہیں۔

دوسری سہولت یہ تھی کہ جو لوگ روزہ رکھنے کی طاقت رکھتے تھے مگر شروع میں روزے کی عادت نہ ہونے کی وجہ سے پورے مہینے مسلسل روزہ رکھنا مشکل تھا، ان کے لیے اجازت دی گئی کہ روزہ نہ رکھیں بلکہ ہر روزے کے بدلے ایک مسکین کو دو وقت کھانا کھلائیں۔ بعد میں جب لوگ روزہ رکھنے کے عادی ہو گئے، یہ رعایت ختم کر دی گئی۔

رمضان کی فضیلت

اسی آیت میں رمضان کی فضیلت بھی بیان کی گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اسی مہینے میں اپنی کتابیں نازل فرمائیں، اور قرآن مجید بھی اسی ماہ میں نازل ہوا، جیسا کہ سورہ قدر میں ذکر ہے کہ شبِ قدر میں پورا قرآن مجید لوحِ محفوظ میں نازل ہوا اور بیت العزت میں رکھا گیا۔ پھر حضرت جبرئیلؑ کے ذریعے اسے مرحلہ وار تقریباً ۲۳ سال کے عرصے میں نازل کیا گیا۔

ایک روایت میں آتا ہے کہ حضرت طلحہ بن عبید اللہؓ سے روایت ہے کہ ایک بدو نبی ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور پوچھا کہ اللہ نے مجھ پر کتنی نمازیں فرض کی ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا پانچ، اور اگر تم چاہو تو نفل نمازیں بھی پڑھ سکتے ہو۔ پھر اس نے پوچھا کہ کتنے روزے فرض ہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا پورے ماہ رمضان کے روزے فرض ہیں، نیز نفلی روزے بھی رکھے جاسکتے ہیں۔ بدو نے کہا کہ میں نہ تو کوئی نفلی عبادت کروں گا اور نہ فرض عبادت میں کمی، تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اگر وہ اپنے قول میں سچا ہے تو مراد کو پہنچ گیا یا جنت میں داخل ہو گیا۔

(صحیح بخاری، الصوم باب ۱، حدیث نمبر: ۱۸۹۱)

قرآن تمام انسانوں کے لیے ہدایت

آیت میں یہ بھی بیان ہے کہ قرآن تمام انسانوں کے لیے ہدایت ہے، یعنی ہر انسان اپنے رب کی مرضی کے مطابق زندگی گزارنے کا راستہ صرف قرآن کے ذریعے جان سکتا ہے۔ اور قرآن میں ہدایت کی صاف دلیلیں اور رہنمائی موجود ہیں، جس سے انسان کو سیدھے راستے پر چلنے کا مکمل علم ملتا ہے۔

الفرقان

تیسری خصوصیت یہ بیان کی گئی کہ ''الفرقان'' حق اور باطل کو پہچاننے والی ہے۔ اس کی ہدایتیں انسان کو سچ اور جھوٹ، صحیح اور غلط، حق اور باطل میں تمیز کرنے کی صلاحیت عطا کرتی ہیں، تاکہ وہ فیصلہ کر سکے کہ کون سا عمل درست اور کون سا غلط ہے۔

رمضان کے روزے

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ'' یعنی عاقل، بالغ مسلمان مرد اور عورت پر رمضان کے روزے فرض کر دیے گئے۔ تاہم مسافر، مریض، حاملہ عورت اور دودھ پلانے والی عورت کے لیے رعایت رکھی گئی کہ وہ روزہ نہ رکھیں اور بعد میں قضا کریں۔ اسی طرح حیض ونفاس والی عورت بھی رمضان میں روزہ نہ رکھے اور بعد میں اسے پورا کرے۔ اس کی تفصیل حدیث اور فقہ کی کتب میں موجود ہے۔

رمضان کا احترام

فقہاء اور علماء نے فرمایا ہے کہ رمضان کے دن بے روزہ دار نابالغ، بالغ یا حیض والی عورت پاک ہونے کے بعد بھی شام تک کھانے پینے سے اجتناب کرے تاکہ رمضان کا احترام برقرار رہے۔ احترام کی دو صورتیں ہیں: ۱۔ روزہ نہ رکھنا اور کھا پینا، ۲۔ روزہ رکھنا۔

جو شخص ایسے علاقے میں پہنچے جہاں رمضان باقی ہے، اسے چاہیے کہ وہ رمضان کا احترام کرے اور روزہ رکھے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ''اللہ تمہارے لیے آسانی چاہتا ہے، تمہارے لیے مشکل نہیں چاہتا''۔

عبادات میں آسانی

نماز میں بھی آسانیاں رکھی گئی ہیں: اگر کھڑے ہو کر نماز نہ پڑھ سکے تو بیٹھ کر یا لیٹ کر پڑھ سکتا ہے، رکوع اور سجدہ نہ ہو سکے تو اشارے یا استطاعت کے مطابق ادا کرے۔ زکوٰۃ میں نصاب مقرر ہے: سال کے اختتام پر کل مال کا

چالیسواں حصہ واجب ہوتا ہے۔ حج بھی ہر شخص پر فرض نہیں، بلکہ جو مکہ تک جانے کی استطاعت رکھتا ہو اور سفر وخرچ برداشت کرسکتا ہو، اسے زندگی میں صرف ایک مرتبہ فرض ہے۔

اسی طرح رمضان کے فرض روزوں کے باوجود مریض، مسافر، بوڑھا، حاملہ اور دودھ پلانے والی عورت کے لیے آسانیاں رکھی گئی ہیں، جیسا کہ اوپر ذکر ہوا۔

تکبیر اور شکر

آگے کی آیت میں فرمایا: ''وَلِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ'' جس کی وضاحت میں حضرت زید بن اسلمؓ فرماتے ہیں کہ یہ عید کے دن کی تکبیروں کے لیے ہے، جبکہ حضرت ابن عباسؓ کے مطابق چاند دیکھتے وقت ''اللہ اکبر'' کہنا مراد ہے۔ اس کے بعد فرمایا گیا کہ تم اللہ کا شکر ادا کرو، کیونکہ آسانیاں اللہ کی نعمت ہیں اور ان نعمتوں کی قدر کرو۔

آیت نمبر (۱۸۶) وَاِذَا سَاَلَكَ عِبَادِيْ عَنِّيْ فَاِنِّيْ قَرِيْبٌ ؕ اُجِيْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ ۙ فَلْيَسْتَجِيْبُوْا لِيْ وَلْيُؤْمِنُوْا بِيْ لَعَلَّهُمْ يَرْشُدُوْنَ ①

ترجمہ: ''اور جب میرے بندے آپ سے میرے بارے میں پوچھیں (اے محمدؐ)، تو (کہہ دیجئے) میں قریب ہوں، دعا کرنے والے کی دعا قبول کرتا ہوں جب وہ مجھے پکارتا ہے، تو چاہیے کہ وہ میرا حکم مانیں اور مجھ پر ایمان رکھیں، تاکہ وہ ہدایت پائیں''۔

تفسیر حضرت معاویہ بن زیدؓ سے روایت ہے کہ ایک اعرابی رسول اللہ ﷺ کے حضور حاضر ہوا اور عرض کیا: ''ہمارا پروردگار قریب ہے کہ ہم اس سے سرگوشی کریں یا دور ہے کہ اُسے بلند آواز سے پکاریں؟''

آپ ﷺ نے خاموشی اختیار فرمائی، جس کے بعد اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: ''جب میرے بندے آپ سے میرے بارے میں دریافت کریں تو آپ فرما دیجئے: میں بہت قریب ہوں۔''

حضرت عبدالرزاق نے حضرت حسنؓ سے روایت کی ہے کہ صحابہ نے رسول اللہ ﷺ سے پوچھا: ''ہمارا پروردگار کہاں ہے؟'' اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ یہ حدیث مرسل ہے اور دیگر ذرائع سے بھی روایت ہوئی ہے۔

ابن عساکرؒ نے حضرت علیؓ سے نقل کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''دعا میں کبھی مایوس نہ ہو، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی ہے کہ مجھ سے مانگو، میں تمہاری دعا قبول کروں گا۔''

ایک شخص نے پوچھا: ''یارسول اللہ ﷺ! کیا ہمارا پروردگار دعا کو سنتا ہے یا اور کوئی صورت ہے؟'' اس پر یہ آیت نازل ہوئی کہ اللہ تعالیٰ ہر بندے کے قریب ہے اور جو بھی اس سے یاد کرے اور شکر ادا کرے، اللہ اس کے قریب ہوتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے ایک اور مقام پر فرمایا: ''وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَیْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِیْدِ''۔ ''ہم انسان سے اس کی گردن کی رگ سے بھی زیادہ قریب ہیں۔'' (سورہ ق:۱۶)

حدیث میں ہے کہ حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ جو شخص میرے کسی دوست سے دشمنی رکھتا ہے، میں اس کے خلاف اعلانِ جنگ کرتا ہوں۔ میرا بندہ جو عبادات کے ذریعہ سے مجھ سے قرب حاصل کرتا ہے، ان میں سب سے زیادہ پسندیدہ وہ عبادت ہے جو میں نے اس پر فرض کی ہے۔ اس کے علاوہ نفلی عبادات کے ذریعے وہ مجھ سے اتنا قریب ہوجاتا ہے کہ میں اس سے محبت کرنے لگتا ہوں، اور میں اُس کا کان بن جاتا ہوں جس سے وہ سنتا ہے، میری آنکھ اُس کی دیکھنے کی آنکھ بن جاتی ہے، میرا ہاتھ اُس کے پکڑنے کا ہاتھ بن جاتا ہے، اور میرا پاؤں اُس کے چلنے کا پاؤں بن جاتا ہے۔ اگر وہ مجھ سے کچھ مانگتا ہے تو میں اسے دیتا ہوں، اور اگر کسی سے میری پناہ چاہتا ہے تو میں اسے پناہ دیتا ہوں۔ میں کسی کام میں جسے کرنا چاہتا ہوں اتنا تردد نہیں کرتا جتنا کہ مؤمن کی جان لینے میں ہوتا ہے، کیونکہ وہ موت کو تکلیف دہ سمجھتا ہے، اور مجھے بھی اسے تکلیف دینا برا لگتا ہے۔'' (صحیح بخاری:۶۵۰۲)

نوٹ: یہ تعلیمات ہمیں بتاتی ہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے قریب ہے، ان کی دعاؤں کو سنتا ہے، اور جو شخص فرائض اور نفلی عبادات کے ذریعے اللہ کے قریب ہوتا ہے، اللہ اس کے ہر کام میں اس کے ساتھ رہتا ہے اور اس کی حفاظت فرماتا ہے۔

دعا کی اہمیت اور روزہ

علمائے تفسیر فرماتے ہیں کہ روزے کے احکام کے درمیان دعا کا ذکر اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ رمضان کے مہینے میں دعا کی بڑی اہمیت ہے۔

● حضرت عبداللہ بن عمرؓ افطار کے وقت اپنے اہل وعیال کے ساتھ دعا کیا کرتے تھے، کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''روزہ دار کی افطار کے وقت دعا رد نہیں ہوتی۔'' (سنن ابن ماجہ:۱۷۵۳)

● ایک اور حدیث میں حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ تین افراد کی دعا رد نہیں کی جاتی: امامِ عادل کی، روزہ دار کی اور مظلوم کی۔ (مسند احمد:۸۰۳۰)

● حضرت ابن جریر اور ابنِ ابی حاتم نے روایت کی ہے کہ ایک شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس آیا اور پوچھا: ''اے اللہ کے رسول! کیا ہمارا رب قریب ہے کہ ہم اُس سے سرگوشی کریں یا دور ہے کہ اُسے بلند آواز سے پکاریں؟'' نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خاموش رہے، یہاں تک کہ یہ آیت نازل ہوئی۔ (تفصیل کے لیے سورہ ''ق'':۱۶ دیکھیں)

اللہ تعالیٰ اپنے بندوں سے قریب ہے، کیونکہ وہ رقیب ہے، ظاہر و پوشیدہ جانتا ہے اور دلوں کے بھید معلوم

کرتا ہے۔ وہ اپنے پکارنے والوں کے قریب ہے اور ان کی پکار سنتا ہے۔ اگر کوئی بندہ اپنے رب کو دل سے پکارتا ہے اور دعا کے دینی اسباب بھی موجود ہوں، یعنی بندہ اللہ کے حکموں کا پابند ہو اور اس پر ایمان و یقین رکھتا ہو، تو اللہ تعالیٰ اس کی دعا قبول فرماتا ہے۔

دعا کی قبولیت کے طریقے

۱۔ حضرت ابو ہریرہؓ کی حدیث میں ہے کہ بندہ اپنے رب کے سب سے زیادہ قریب اس وقت ہوتا ہے جب وہ سجدے میں ہو، اس لیے سجدے میں کثرت سے دعا کی جائے۔ (مسلم: ۴۸۲)

دعا کی قبولیت کے چھ شرائط ہیں: (۱) دعا اللہ تعالیٰ کے اسماء حسنیٰ کے واسطے سے کی جائے۔ (۲) نیت میں اخلاص ہو۔ (۳) دعا کرنے والا اپنی کمزوری اور محتاجی ظاہر کرے۔ (۴) کسی گناہ کی دعا نہ کرے۔ (۵) کسی ایسی چیز کے لیے دعا نہ کرے جس کے ذریعے اللہ کی نافرمانی کی جائے۔ (۶) یقین رکھے کہ اگر اللہ تعالیٰ نے اسے کسی دنیاوی فائدے سے محروم رکھا ہے تو یہ بھی اللہ کی نعمت ہے، بالکل اسی طرح جس طرح وہ نعمت جو اللہ نے اسے دی۔

دعا مصیبتوں کے ٹالنے کا ذریعہ

دعا مصیبتوں کو ٹالنے کا سب سے مضبوط ذریعہ ہے، لیکن کبھی دعا کا اثر نہیں دکھائی دیتا تو اس کی وجوہات مختلف ہوسکتی ہیں جیسے: دعا کسی ناپسندیدہ چیز کے لیے کرنا، دعا کے وقت مکمل توجہ نہ ہونا، دعا کرنے والے کی روزی حرام ہونا، وہ ظالم ہو یا دل پر گناہوں کا پردہ ہو، غفلت یا کھیل و تماشے میں مبتلا ہو کر دعا کرنا۔

دعا والا کبھی ہلاک نہیں ہوتا

دعا کو بار بار اور با اخلاص کرتے رہنا چاہیے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اقوال سے معلوم ہوا کہ دعا کرنے والا کبھی ہلاک نہیں ہوتا۔ (مستدرک حاکم: ۱۸۱۸)

دعا کی قبولیت کے مشہور اوقات

دعا کی قبولیت کے چھ مشہور اوقات ہیں: ۱۔ رات کے آخری تہائی حصے میں۔ ۲۔ اذان کے وقت۔ ۳۔ اذان اور اقامت کے درمیان۔ ۴۔ فرض نمازوں کے بعد۔ ۵۔ جمعہ کے دن امام کے منبر پر جانے کے بعد سے نماز کے اختتام تک۔ ۶۔ جمعہ کے دن عصر کی نماز کے بعد آخری وقت۔

آیت نمبر (۱۸۷) أُحِلَّ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ إِلَىٰ نِسَائِكُمْ ۚ هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ

وَاَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ ؕ عَلِمَ اللّٰهُ اَنَّكُمْ كُنْتُمْ تَخْتَانُوْنَ اَنْفُسَكُمْ فَتَابَ عَلَيْكُمْ وَعَفَا عَنْكُمْ ۚ فَالْـٰٔنَ بَاشِرُوْهُنَّ وَابْتَغُوْا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ ۪ وَكُلُوْا وَاشْرَبُوْا حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْاَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْاَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ ۪ ثُمَّ اَتِمُّوا الصِّيَامَ اِلَى الَّيْلِ ۚ وَلَا تُبَاشِرُوْهُنَّ وَاَنْتُمْ عٰكِفُوْنَ ۙ فِي الْمَسٰجِدِ ؕ تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ فَلَا تَقْرَبُوْهَا ؕ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ اٰيٰتِهٖ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ ﴿۱۸۷﴾

ترجمہ: ''تمہارے لیے روزے کی رات اپنی بیویوں کے ساتھ مباشرت کرنا حلال کر دیا گیا ہے۔ وہ تمہارے لیے لباس ہیں اور تم ان کے لیے لباس ہو۔ اللہ جانتا ہے کہ تم اپنے نفسوں سے خیانت کرتے تھے، تو اس نے تم پر مہربانی کی اور تمہیں معاف کر دیا۔ تو اب ان سے مباشرت کرو اور وہ چیز طلب کرو جو اللہ نے تمہارے لیے لکھ دی ہے اور کھاؤ پیو، یہاں تک کہ صبح کا سفید دھاگا رات کے سیاہ دھاگے سے تم پر ظاہر ہو جائے، پھر روزہ رات تک پورا کرو۔ اور جب تم مسجدوں میں اعتکاف میں ہو، تو ان سے مباشرت نہ کرو۔ یہ اللہ کی مقرر کردہ حدود ہیں، ان کے قریب نہ جاؤ۔ اسی طرح اللہ اپنے احکام لوگوں کے لیے کھول کر بیان کرتا ہے تاکہ وہ بچیں''۔

تفسیر

سونے سے پہلے کھانے اور ہمبستری کی اجازت

ابن جریرؒ نے عطا بن ابی رباحؒ سے روایت نقل کی ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی: ''تمہارا پروردگار فرماتا ہے کہ مجھے پکارو، میں تمہاری دعا قبول کروں گا''، صحابہؓ نے عرض کیا کہ ہمیں معلوم نہیں کہ دعا کس وقت مانگیں۔ اسی سلسلے میں یہ آیت نازل ہوئی۔

امام احمد، ابوداؤد اور امام حاکم نے عبدالرحمٰن بن ابی لیلیٰ کے واسطے سے حضرت معاذ بن جبلؓ سے روایت نقل کی ہے کہ صحابہ کرامؓ رات کو سونے سے پہلے کھاتے پیتے اور بیویوں کے پاس جاتے، اور جب سو جاتے تو تمام امور سے رک جاتے تھے۔ (ابوداؤد)

شروع میں اہلِ کتاب کی طرح مسلمانوں کو بھی روزوں کے دن رات کے وقت سونے سے پہلے کھانے، پینے اور بیویوں سے ہمبستری کی اجازت تھی۔ لیکن اگر سو جانے کے بعد آنکھ کھلی تو کھانے پینے اور ہمبستری کی اجازت نہیں تھی۔ اس وجہ سے صحابہؓ کو بعض اوقات بہت پریشانی ہوئی اور بعض نے کوتاہی کر دی، پھر نادم ہو کر رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر توبہ کی۔ ان کی ندامت پر اللہ تعالیٰ نے رحمت فرمائی اور یہ آیت نازل ہوئی۔

شانِ نزول کی ایک مثال

ایک انصاری صحابی حضرت عمر بن العاصؓ دن بھر روزہ رکھنے اور مزدوری کرنے کے بعد افطار کے وقت گھر پہنچے۔ گھر میں افطار کے لیے کچھ تیار نہ تھا۔ بیوی نے کہا کہ انتظام کر کے کچھ لاتی ہوں۔ لیکن وہ دن بھر کی تھکان کے باعث سو گئے۔ جب بیدار ہوئے تو کھانا حرام ہو چکا تھا۔ اگلے روزے کو جاری رکھنے کی وجہ سے کمزوری نے ان کا حال بگاڑ دیا، اور یہ واقعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تک پہنچا۔

اسی طرح دیگر واقعات میں بھی بعض صحابہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں عرض کیا کہ جذبات کے غلبے میں آ کر انہوں نے بیویوں سے ہمبستری کر لی اور اس پر ندامت کے ساتھ معذرت کی۔

ان واقعات کے بعد اللہ تعالیٰ نے وسعت عطا فرمائی اور پہلا حکم منسوخ کر کے یہ اجازت دی کہ مغرب کے بعد سے صبح صادق تک پوری رات کھانے، پینے اور بیوی کے ساتھ ہمبستری کی جا سکتی ہے، چاہے کوئی سو کر اٹھے یا سونے کے بعد ہی یہ کام کرے۔ یہ آیت صحابہؓ کے لیے آسانی اور وسعت کی علامت ہے، تاکہ رمضان کے روزے کے دوران عبادات اور دینی فرائض کے ساتھ زندگی میں سہولت برقرار رہے۔

سونے کے بعد کھانے کی اجازت

اس آیتِ کریمہ میں لفظ ''اُحِلَّ لَكُمْ'' (تمہارے لیے حلال کر دیا گیا) سے واضح ہوا کہ جو چیز اس آیت کے ذریعہ حلال کی گئی، وہ اس سے پہلے حرام تھی۔ اس آیت نے جس حکم کو منسوخ کیا، یعنی سو جانے کے بعد کھانے پینے اور بیوی سے ہمبستری کی حرمت، وہ کہیں اور قرآن میں بیان نہیں ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعلیمات کے مطابق صحابہ کرامؓ اس حکم پر عمل کرتے تھے۔

اس سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ سنت سے ثابت بعض احکام کو قرآن کے ذریعے منسوخ کیا جا سکتا ہے اور شرعی احکام کے ثبوت کے لیے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد بھی قرآن کے حکم کے مترادف ہے۔

میاں بیوی کو لباس سے تشبیہ

آیت میں میاں بیوی کو ایک دوسرے کا لباس قرار دیا گیا، جو اس قریبی اور محبت بھری رشتہ داری کو ظاہر کرتا ہے جو اللہ تعالیٰ کی اجازت اور حکم سے ان کے لیے مقرر کی گئی ہے۔ یہ لباس کئی معنوں میں ظاہر ہوتا ہے: باہمی قریبی تعلقات، ایک دوسرے کی محتاجی اور جسمانی قربت، ایک دوسرے کے لیے زیب و زینت اور اطمینان و سکون، انتہائی رازدار ہونے کے باوجود پردہ پوشی۔ اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ شریعت اسلامیہ فطری جذبات اور خواہشات کو مٹانا

نہیں چاہتی بلکہ انہیں اللہ کی مرضی اور اس کے حکم کے مطابق ڈھالنا چاہتی ہے۔

مباشرت اور اولاد کی اجازت

اس آیت میں فرمایا ''فَالْئٰنَ بَاشِرُوْهُنَّ'' (اب ان سے ملاقات کرو) اور ساتھ ہی ''وَابْتَغُوْا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ'' (جو اللہ نے تمہارے لیے لکھ دیا، طلب کرو) سے واضح ہوا کہ مباشرت کا مقصد اولاد پیدا کرنا ہے۔ اسلام میں انسانی لذت کے ساتھ ساتھ اس عمل کا بنیادی مقصد نسل کی بقاء اور اولاد کی برتری ہے۔

یہ ہدایت ظاہر کرتی ہے کہ منع حمل اور خاندانی منصوبہ بندی اسلامی تعلیمات کے خلاف ہیں۔ نیز، اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ بغیر سحری کے مسلسل روزہ رکھنا شریعت میں ناپسندیدہ ہے۔

اعتکاف اور حدود

اس آیت میں اعتکاف کا ذکر بھی آیا: اعتکاف فی المساجد، جو خاص مردوں کے لیے مخصوص ہے۔ عورتیں گھر کے کسی گوشے میں اعتکاف کر سکتی ہیں۔ آیت کے آخر میں تنبیہ بھی کی گئی ہے کہ یہ تمام اصول، قوانین، حدود اور بندشیں اللہ نے مقرر فرمائی ہیں، جو حکمت والے اور علم والے ہیں۔ یہ تعلیم واضح کرتی ہے کہ عبادات میں سہولت، حدود اور شرعی قیود اللہ کی دانائی اور حکمت کے مطابق ہیں، تاکہ انسان زندگی میں اعتدال اور اطاعت کے ساتھ دین پر عمل کر سکے۔

❁❁❁

ترجمہ- آیت نمبر ۱۸۸ سے ۱۹۶ تک

وَلَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ وَتُدْلُوْا بِهَآ اِلَى الْحُكَّامِ لِتَاْكُلُوْا فَرِيْقًا مِّنْ اَمْوَالِ النَّاسِ بِالْاِثْمِ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۸۸﴾ يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْاَهِلَّةِ ۭ قُلْ هِىَ مَوَاقِيْتُ لِلنَّاسِ وَالْحَجِّ ۭ وَلَيْسَ الْبِرُّ بِاَنْ تَاْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ ظُهُوْرِهَا وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنِ اتَّقٰى ۚ وَاْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ اَبْوَابِهَا ۠ وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴿۱۸۹﴾ وَقَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوْا ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ ﴿۱۹۰﴾ وَاقْتُلُوْهُمْ حَيْثُ ثَقِفْتُمُوْهُمْ وَاَخْرِجُوْهُمْ مِّنْ حَيْثُ اَخْرَجُوْكُمْ وَالْفِتْنَةُ اَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ ۚ وَلَا تُقٰتِلُوْهُمْ عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ حَتّٰى يُقٰتِلُوْكُمْ فِيْهِ ۚ فَاِنْ قٰتَلُوْكُمْ فَاقْتُلُوْهُمْ ۭ كَذٰلِكَ جَزَاۗءُ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۱۹۱﴾ فَاِنِ انْتَهَوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۹۲﴾ وَقٰتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ لِلّٰهِ ۭ فَاِنِ انْتَهَوْا فَلَا عُدْوَانَ اِلَّا عَلَي الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۹۳﴾ اَلشَّهْرُ الْحَرَامُ بِالشَّهْرِ الْحَرَامِ وَالْحُرُمٰتُ قِصَاصٌ ۭ فَمَنِ اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ فَاعْتَدُوْا عَلَيْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ ۠ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِيْنَ ﴿۱۹۴﴾ وَاَنْفِقُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَلَا تُلْقُوْا بِاَيْدِيْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ ۛ وَاَحْسِنُوْا ۚ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۱۹۵﴾ وَاَتِمُّوا الْحَجَّ وَالْعُمْرَةَ لِلّٰهِ ۭ فَاِنْ اُحْصِرْتُمْ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ ۚ وَلَا تَحْلِقُوْا رُءُوْسَكُمْ حَتّٰى يَبْلُغَ الْهَدْيُ مَحِلَّهٗ ۭ فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيْضًا اَوْ بِهٖٓ اَذًى مِّنْ رَّاْسِهٖ فَفِدْيَةٌ مِّنْ صِيَامٍ اَوْ صَدَقَةٍ اَوْ نُسُكٍ ۚ فَاِذَآ اَمِنْتُمْ ۠ فَمَنْ تَمَتَّعَ بِالْعُمْرَةِ اِلَى الْحَجِّ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ ۚ فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ ثَلٰثَةِ اَيَّامٍ فِي الْحَجِّ وَسَبْعَةٍ اِذَا رَجَعْتُمْ ۭ تِلْكَ عَشَرَةٌ كَامِلَةٌ ۭ ذٰلِكَ لِمَنْ لَّمْ يَكُنْ اَهْلُهٗ حَاضِرِي الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۭ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ﴿۱۹۶﴾

ترجمہ:

(۱۸۸)۔اور تم ایک دوسرے کا مال ناحق طریقے سے نہ کھاؤ اور نہ ہی اسے حاکموں تک پہنچاؤ تا کہ لوگوں کے مال کا کچھ حصہ گناہ کے ساتھ کھا سکو، حالانکہ تم جانتے ہو۔(۱۸۹)۔لوگ آپ سے چاند کے بارے میں پوچھتے ہیں، کہہ دیجئے: وہ وقتوں کا تعین کرنے کے لیے ہیں لوگوں کے لیے اور حج کے لیے بھی۔اور نیکی یہ نہیں کہ تم اپنے گھروں میں پچھواڑوں سے آؤ، بلکہ نیکی وہ ہے جو اللہ سے ڈرے اور اپنے گھروں میں دروازوں سے آؤ اور اللہ سے ڈرتے رہو

تا کہ تم فلاح پاؤ۔(۱۹۰)۔اور تم اللہ کے راستے میں ان لوگوں سے لڑو جو تم سے لڑتے ہیں اور زیادتی نہ کرو، بے شک اللہ زیادتی کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔(۱۹۱)۔اور قتل کرو انہیں جہاں کہیں تمہیں ملیں اور نکالو انہیں وہاں سے جہاں سے انہوں نے تمہیں نکالا اور فتنہ قتل سے بھی زیادہ برا ہے۔اور مسجدِ حرام کے قریب ان سے نہ لڑو جب تک وہ تم سے نہ لڑیں، پھر اگر وہ تم سے لڑیں تو تم بھی ان سے لڑو، یہی سزا ہے کافروں کی۔(۱۹۲)۔پھر اگر وہ باز آ جائیں، تو یقیناً اللہ بہت معاف کرنے والا، رحم کرنے والا ہے۔(۱۹۳)۔اور ان سے لڑو یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے اور دین اللہ ہی کے لیے ہو جائے، پھر اگر وہ باز آ جائیں، تو زیادتی صرف ظالموں پر روا ہے۔(۱۹۴)۔حرمت والے مہینے کا بدلہ حرمت والا مہینہ ہے اور حرمتوں کا بھی بدلہ ہے۔تو جو تم پر زیادتی کرے، تم بھی اس پر ویسی ہی زیادتی کرو جیسی اس نے تم پر کی اور اللہ سے ڈرتے رہو اور جان لو کہ اللہ پرہیزگاروں کے ساتھ ہے۔(۱۹۵)۔اور اللہ کے راستے میں خرچ کرو اور اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو اور احسان کرو، بے شک اللہ نیکی کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔(۱۹۶)۔اور اللہ کے لیے حج اور عمرہ پورا کرو، پھر اگر تم روک دیے جاؤ تو جو قربانی میسر ہو (پیش کرو) اور اپنے سروں کو نہ مونڈو جب تک قربانی اپنی جگہ نہ پہنچ جائے۔پھر اگر کوئی بیمار ہو یا اسے سر میں تکلیف ہو تو فدیہ دے دے: روزے رکھے یا صدقہ دے یا قربانی کرے۔پھر جب تم امن میں آ جاؤ، تو جو کوئی عمرہ کے ساتھ حج کا فائدہ اٹھائے، تو وہ قربانی کرے جو میسر ہو، اور جو نہ پائے، تو وہ تین دن کے روزے حج کے دوران رکھے اور سات دن جب واپس لوٹے، یہ کل دس دن ہوئے۔یہ رعایت اس کے لیے ہے جس کے گھر والے مسجدِ حرام کے قریب نہ ہوں، اور اللہ سے ڈرتے رہو، اور جان لو کہ اللہ سخت سزا دینے والا ہے۔

تفسیر-آیت نمبر ۱۸۸ سے ۱۹۶ تک

آیت نمبر (۱۸۸-۱۸۹) وَلَا تَأْكُلُوٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ وَتُدْلُوْا بِهَآ اِلَى الْحُكَّامِ لِتَاْكُلُوْا فَرِيْقًا مِّنْ اَمْوَالِ النَّاسِ بِالْاِثْمِ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۸۸﴾ يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْاَهِلَّةِ ۭ قُلْ هِىَ مَوَاقِيْتُ لِلنَّاسِ وَالْحَجِّ ۭ وَلَيْسَ الْبِرُّ بِاَنْ تَاْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ ظُهُوْرِهَا وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنِ اتَّقٰى ۚ وَاْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ اَبْوَابِهَا ۠ وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴿۱۸۹﴾

ترجمہ: ''اور تم ایک دوسرے کا مال ناحق طریقے سے نہ کھاؤ اور نہ ہی اسے حاکموں تک پہنچاؤ تا کہ لوگوں کے مال کا کچھ حصہ گناہ کے ساتھ کھا سکو، حالانکہ تم جانتے ہو۔لوگ آپ سے چاند کے

بارے میں پوچھتے ہیں، کہہ دیجئے: وہ وقتوں کا تعین کرنے کے لیے ہیں لوگوں کے لیے اور حج کے لیے بھی۔ اور نیکی یہ نہیں کہ تم اپنے گھروں میں پچھواڑوں سے آؤ، بلکہ نیکی وہ ہے جو اللہ سے ڈرے اور اپنے گھروں میں دروازوں سے آؤ اور اللہ سے ڈرتے رہو تا کہ تم فلاح پاؤ''۔

تفسیر وَلَا تَأْكُلُوٓا

ابنِ ابی حاتم نے حضرت سعید بن زبیرؓ سے روایت نقل کی ہے کہ امرؤالقیس بن عابس اور عبدان بن اشرع حضرمی کے درمیان ایک زمین کے سلسلے میں جھگڑا ہوا۔ امرؤالقیس نے قسم کھانے کا ارادہ کیا، تو اس پر یہ آیتِ کریمہ نازل ہوئی کہ 'ناحق طریقے سے ایک دوسرے کا مال مت کھاؤ'۔

يَسْـَٔلُونَكَ عَنِ ٱلْأَهِلَّةِ

ابنِ ابی حاتم نے عکرمہ کے ذریعہ حضرت ابنِ عباسؓ سے روایت کی ہے کہ لوگوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے چاند کے بارے میں دریافت کیا، تو اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ اسی طرح ابونعیم اور ابنِ عساکر نے تاریخِ دمشق میں نقل کیا کہ صحابہؓ نے پوچھا کہ چاند باریک دھاگے کی طرح شروع ہوتا ہے، پھر بڑھتا ہے، پورا ہوتا ہے، گھومتا ہے اور کم ہوتا رہتا ہے، یہاں تک کہ اپنی اصل حالت پر واپس آجاتا ہے، تو اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

حرام مال حلال نہیں ہوتا

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو باہمی طور پر ایک دوسرے کا مال ناجائز طریقے سے کھانے سے منع فرمایا۔ اس سے یہ واضح ہوا کہ اگر قاضی رشوت لے کر یا ظلم کر کے فیصلہ دے، تو اس کے نتیجے میں حرام مال حلال نہیں بن جاتا۔

حضرت ابنِ عباسؓ فرماتے ہیں کہ یہ آیات اس شخص کے بارے میں ہیں جس کے ذمہ کسی کا مال ہے، اور مال والے کے پاس کوئی دلیل نہ ہو۔ پھر بھی وہ شخص حق پر ہونے کے باوجود انکار کرے اور معاملہ حاکم کے پاس لے جائے تا کہ فیصلہ اس کے حق میں ہو، حالانکہ وہ جانتا ہے کہ یہ گناہ ہے اور حرام کھانے پر تیار ہے۔

حرام مال کی مختلف صورتیں

لوگوں کے مال کو ناجائز طریقے سے کھانے کی کئی صورتیں ہیں، جیسے: کسی کا مال دبانا یا چھپانا، چوری کرنا، امانت میں خیانت کرنا، سود لینا، جوا کھیلنا، خرید و فروخت میں دھوکہ دینا، کسی کام کی اجرت لینا جو ٹھیک سے انجام نہیں دی گئی، عبادت پر اجرت لینا، زکوٰۃ، صدقہ، وقف یا وصیت کے مال کو ناجائز طور پر لینا۔ یہ اور اس نوعیت کے تمام اعمال جو

لوگوں کے مال کو ناحق کھانے کا سبب بنتے ہیں، حرام اور ناجائز ہیں۔

حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''رشوت دینے والا اور لینے والا دونوں لعنتی ہیں''۔ (ابوداؤد: ۳۵۸۰)

وَلَيْسَ الْبِرُّ

امام بخاریؒ نے حضرت براءؓ سے روایت کی ہے کہ زمانۂ جاہلیت میں لوگ احرام باندھ کر اپنے گھروں میں پیچھے کی طرف سے داخل ہوتے تھے۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی کہ اس میں کوئی فضیلت نہیں ہے۔

یہ آیت ہمیں یہ سکھاتی ہے کہ اصل تقویٰ اور نیکی اعمال کی شکل یا ظاہری طریقہ سے نہیں بلکہ قلبی اور شرعی لحاظ سے صحیح عمل سے ثابت ہوتی ہے۔

چاند کے ذریعہ تاریخ

اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ لوگ اپنی زندگی کے اہم اوقات اور فرائض چاند کی مدد سے متعین کرتے ہیں۔ ان میں شامل ہیں: نماز اور روزہ کے اوقات، افطار، حج، مزدوری کی اجرتیں، ماہواری کے دن، عورتوں کی عدت، اور دیگر کئی مدتیں۔ یہ سب امور چاند کی گردش کے مطابق معلوم ہوتے ہیں۔

تاریخ انسانی زندگی کی ایک بنیادی ضرورت ہے۔ دنیا میں زیادہ تر شمسی کیلنڈر استعمال ہوتا ہے، جو حساب پر مبنی ہے اور اس میں غلطی کا امکان موجود ہوتا ہے۔ لیکن اسلام میں ابتدا سے ہی کیلنڈر کا تعین ''رؤیتِ ہلال'' (چاند کو دیکھنا) کے ذریعے کیا گیا، کیونکہ اس میں غلطی کے امکانات نہ ہونے کے برابر ہیں۔ اس کا اشارہ قرآن مجید کی اس سورہ کے علاوہ سورہ یونس آیت ۵ اور سورہ یاسین آیت ۳۹ میں بھی کیا گیا ہے، جس سے اسلامی کیلنڈر کو قمری یعنی چاند کے حساب سے رکھنے کا حکم ملتا ہے۔

سورہ توبہ آیت ۳۶ میں بتایا گیا ہے کہ اسلامی مہینے بارہ ہیں، جن میں سے چار مہینے قابل احترام ہیں۔ یہ حقیقت ظاہر کرتی ہے کہ قمری تاریخ انسانی تاریخ میں ہمیشہ سے رائج رہی ہے، چاہے وہ حضرت آدمؑ کا زمانہ ہو، طوفانِ نوح، حضرت ابراہیمؑ کا آگ میں جلنا، حضرت یوسفؑ اور بنی اسرائیل کا دور، حضرت داؤدؑ و حضرت سلیمانؑ یا حضرت عیسیٰؑ کا زمانہ ہو، سب نے قمری کیلنڈر استعمال کیا۔

عام الفیل کا سال بھی مشہور ہے، لیکن قریش اس وقت کعبہ کی تعمیر اور واقعۂ فیل کی بنیاد پر اپنی تاریخ رکھتے تھے۔ جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہجرت کے بعد مدینہ تشریف لائے تو وہاں کوئی مستقل سال یا کیلنڈر رائج نہیں تھا۔ صحابۂ کرامؓ

نے واقعۂ ہجرت کے بعد ہر ماہ کی تاریخیں شمار کرنا شروع کیں اور سال کے نام اہم تاریخی واقعات کے مطابق رکھے گئے، جیسے:

ہجرت کے سال کا نام: ''سنة الأذن بالرحال''

دوسرے سال کا نام: ''سنة الأمر بالقتال''

تیسرے سال کا نام: ''سنة التمحيص''

یہ سلسلہ کچھ عرصہ قائم رہا، لیکن بعد میں رواج ختم ہوگیا۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ اور حضرت عمر فاروقؓ کے ابتدائی چار سالوں میں مسلمانوں کے درمیان کوئی مستقل سال رائج نہیں تھا۔ تاہم، حضرت عمرؓ کے دور میں حکومت اور مالی معاملات میں تاریخ کی ضرورت شدت سے محسوس ہونے لگی۔ حاکمِ بصرہ حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ نے حضرت عمرؓ کو لکھا کہ خطوط پر تاریخ نہ ہونے کی وجہ سے کام میں دشواری پیش آتی ہے، اور ایک چیک پر صرف ماہ ''شعبان'' لکھا تھا، جس سے سمجھنا مشکل تھا کہ کس شعبان کی بات ہو رہی ہے: پچھلا، موجودہ یا آنے والا؟

اسی وقت ایک نومسلم بادشاہ حضرت ہرمزانؓ فاروقی دربار میں حاضر ہوئے اور بتایا کہ ان کے یہاں جس کیلنڈر کو ''ماہروز'' کہتے ہیں، اس میں مہینہ اور سال دونوں واضح طور پر لکھے جاتے ہیں۔ حضرت عمرؓ کو یہ طریقہ بہت پسند آیا اور فرمایا کہ مسلمانوں کو بھی اپنی تاریخ اسی اصول کے مطابق لکھنی چاہیے۔

اسلامی تاریخ کی شروعات

حضرت عمر فاروقؓ نے اسلامی تاریخ کو منظم کرنے کے لیے ربیع الاول کی ۱۶ ہجری کو مہاجرین وانصار صحابہؓ کی ایک مجلس طلب کی، جس میں متعدد صحابہ کرامؓ نے اپنی رائے اور مشورے دیے۔ اسلامی کیلنڈر کے آغاز کے حوالے سے مختلف آراء پیش ہوئیں: کچھ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ولادت سے، کچھ نے بعثتِ نبوی سے، بعض نے ہجرت نبوی کے واقعہ سے اور کچھ نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات سے اسلامی تاریخ کی ابتدا کرنے کی تجویز دی۔

حضرت علیؓ نے یہ تجویز پیش کی کہ اسلامی تاریخ ''ہجرتِ نبوی'' سے شروع کی جائے۔ یہ رائے حضرت عمرؓ کو بہت پسند آئی اور سب کے اتفاق سے ''سنہ ہجری'' کو منظور کر لیا گیا، کیونکہ ہجرت کا واقعہ اسلامی تاریخ کی شروعات کے لیے سب سے موزوں اور نمایاں واقعہ ہے۔

اس کے بعد یہ طے کیا گیا کہ اسلامی سال کس مہینے سے شروع کیا جائے۔ اس پر بھی مختلف آراء آئیں، لیکن حضرت عثمان غنیؓ نے مشورہ دیا کہ ''محرم'' کے مہینے سے سال کا آغاز کیا جائے، اور یہ رائے حضرت علیؓ کی بھی حمایت میں تھی۔ حضرت عمرؓ نے بھی اسے پسند کیا، کیونکہ ہجرت کی پہلی بنیاد ''بیعتِ عقبہ اولیٰ'' اسی مہینے میں رکھی گئی تھی۔ اس پر

سب کا اتفاق ہو گیا اور حضرت عمرؓ نے حکم جاری فرمایا، جس کے بعد یہ نظام پوری دنیا میں رائج ہو گیا۔

اس طرح اسلامی کیلنڈر دینِ اسلام کا ایک اہم شعار بن گیا، کیونکہ تمام انبیاءؑ کی شریعتوں میں تاریخ کا آغاز رات سے ہوتا اور مہینے ''قمری'' کے حساب سے شمار کیے جاتے تھے۔ اسی لیے اسلامی عبادات میں قمری مہینوں کی اہمیت ہے، حالانکہ دنیاوی معاملات میں شمسی کیلنڈر کا استعمال بھی جائز ہے۔

آیت نمبر (۱۹۰۔۱۹۳) وَقَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوْا ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ ﴿۱۹۰﴾ وَاقْتُلُوْهُمْ حَيْثُ ثَقِفْتُمُوْهُمْ وَاَخْرِجُوْهُمْ مِّنْ حَيْثُ اَخْرَجُوْكُمْ وَالْفِتْنَةُ اَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ ۚ وَلَا تُقٰتِلُوْهُمْ عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ حَتّٰى يُقٰتِلُوْكُمْ فِيْهِ ۚ فَاِنْ قٰتَلُوْكُمْ فَاقْتُلُوْهُمْ ؕ كَذٰلِكَ جَزَآءُ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۱۹۱﴾ فَاِنِ انْتَهَوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۹۲﴾ وَقٰتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ لِلّٰهِ ؕ فَاِنِ انْتَهَوْا فَلَا عُدْوَانَ اِلَّا عَلَى الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۹۳﴾

ترجمہ: ''اور تم اللہ کے راستے میں ان لوگوں سے لڑو جو تم سے لڑتے ہیں اور زیادتی نہ کرو، بے شک اللہ زیادتی کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ اور قتل کرو انہیں جہاں کہیں تمہیں ملیں اور نکالو انہیں وہاں سے جہاں سے انہوں نے تمہیں نکالا اور فتنہ قتل سے بھی زیادہ برا ہے۔ اور مسجدِ حرام کے قریب ان سے نہ لڑو جب تک وہ تم سے نہ لڑیں، پھر اگر وہ تم سے لڑیں تو تم بھی ان سے لڑو، یہی سزا ہے کافروں کی۔ پھر اگر وہ باز آ جائیں، تو یقیناً اللہ بہت معاف کرنے والا، رحم کرنے والا ہے۔ اور ان سے لڑو یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے اور دین اللہ ہی کے لیے ہو جائے، پھر اگر وہ باز آ جائیں، تو زیادتی صرف ظالموں پر روا ہے''۔

تفسیر

اللہ کی راہ میں قتال کرنے کا حکم

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہجرت کے چھٹے سال عمرہ کے لیے اپنے صحابہ کے ساتھ مدینہ منورہ سے روانہ ہوئے۔ جب وہ مکہ کے قریب پہنچے تو مقامِ حدیبیہ پر مشرکینِ مکہ نے انہیں روک دیا اور مکہ میں داخل ہونے کی اجازت نہ دی۔ کئی مشکلات اور گفت وشنید کے بعد اس سال کے لیے کچھ شرطوں پر صلح کر لی گئی، جن میں یہ شرط بھی شامل تھی کہ اس سال عمرہ نہیں کیا جا سکتا، بلکہ اگلے سال عمرہ کے لیے تشریف لائیں گے اور اس دوران مکہ میں تین دن سے زیادہ قیام نہیں کریں گے۔

یہ واقعہ ذیقعدہ کے مہینے میں ہوا۔ اگلے سال آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ماہ ذیقعدہ میں عمرہ کی قضا کے لیے تشریف لائی، لیکن چار مہینوں ذیقعدہ، ذی الحجہ، محرم اور رجب میں جنگ وقتال منع تھا، اور ذیقعدہ کا مہینہ بھی انہی میں شامل تھا۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے روایت ہے کہ یہ آیت اُس وقت نازل ہوئی جب رسول اللہ ﷺ عمرہ کی قضا کے لیے ساتویں ہجری میں اپنے صحابہ کے ساتھ تشریف لے گئے۔ صحابہ کرامؓ کو یہ اندیشہ تھا کہ ممکن ہے قریشِ مکہ صلح کی شرطیں توڑ دیں اور مسجدِ حرام تک نہ پہنچنے دیں، اور اس مہینے میں جنگ پر آمادہ ہو جائیں۔ اگر ایسا ہوتا تو مسلمانوں کو بھی جوابی کارروائی کرنا پڑتی، حالانکہ قتال اس مہینے میں حرام تھا۔ اس خوف وتشویش کے پیش نظر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی اور قتال کی اجازت دی۔

جہاد کا مفہوم

لفظ 'جہاد' کے لغوی معنیٰ ''کوشش کرنا'' ہیں اور شریعت کی اصطلاح میں جہاد کا مطلب ہے ''حق، یعنی اسلام کی نشر واشاعت اور حفاظت کے لیے ہر طرح کی کوشش اور قربانی برداشت کرنا''۔ اس میں جانی، مالی اور دماغی قوتیں شامل ہیں جو اللہ تعالیٰ نے بندوں کو دی ہیں، اور انہیں اس راہ میں خرچ کرنا شامل ہے، یہاں تک کہ اپنی جان، بیوی بچوں اور رشتہ داروں کی حفاظت کے لیے بھی قربانی دینی پڑسکتی ہے۔ جہاد کا مقصد حق کی مخالفت کرنے والوں کی ہر کوشش کو ناکام بنانا اور ان کے حملوں کو روکنا ہے اور اگر ضرورت پڑے تو جنگ کے میدان میں بھرپور تیاری کے ساتھ لڑنا شامل ہے۔

حدیث میں ہے کہ: ''جو شخص اس حال میں دنیا سے رخصت ہوا کہ نہ تو اس نے کبھی جہاد کیا اور نہ اس کے دل میں کبھی اس کا خیال آیا، وہ نفاق کی موت مرا''۔ **(صحیح مسلم، الیمارہ، حدیث: ۱۹۱۰)**

حضرت ابنِ مسعودؓ نے رسول اللہ ﷺ سے پوچھا: 'کون سا عمل سب سے افضل ہے؟' فرمایا: ''نماز کو اس کے مقررہ وقت پر ادا کرنا''۔ انہوں نے پوچھا: 'اس کے بعد؟' فرمایا: ''والدین کے ساتھ حسن سلوک''۔ پھر پوچھا گیا: 'اس کے بعد؟' فرمایا: ''اللہ کی راہ میں جہاد''۔ **(صحیح بخاری، رقم: ۲۷۸۲)**

ظلم وزیادتی کی ممانعت

اللہ تعالیٰ نے یہ بھی واضح فرمایا کہ جو لوگ تم سے قتال کرتے ہیں، ان سے قتال کرو، لیکن زیادتی مت کرو۔ بے شک اللہ تعالیٰ زیادتی کرنے والوں کو پسند نہیں فرماتا۔ اسلام میں ہر عمل، حتیٰ کہ قتال، کے لیے بھی اصول، حدود، آداب اور اخلاق مقرر ہیں۔ انسانی زندگی کی حفاظت اور حق کے قیام کے لیے جہاد جائز ہے، مگر ہر حال میں عدل و انصاف اور حدود کی پاسداری لازمی ہے۔

جہاد میں پابندی اور اصول

حضرت حسن بصریؒ فرماتے ہیں کہ ''لَا تَعْتَدُوْ'' کے عموم میں وہ تمام احکام شامل ہیں جو جنگ کے موقع پر

منع کیے گئے ہیں جیسے:

مثلہ کرنا: یعنی کسی مقتول کے جسم کے حصے کاٹنا یا صورت بگاڑنا۔ مالِ غنیمت میں خیانت کرنا۔ معصوم افراد کا قتل: عورتوں، بچوں اور بوڑھوں کو جو نہ لڑائی میں شامل ہوں، نہ جنگی مشورہ یا فیصلہ دیتے ہوں۔ راہبوں اور عبادت گزاروں کا قتل ممنوع۔ بلاوجہ درخت یا جانور کو نقصان پہنچانا منع ہے۔ (تفسیر ابن کثیر)

مجاہدین کے لیے نصیحت

صحیح مسلم میں ہے کہ حضرت سلیمان بن بریدہ نے اپنے والد سے روایت کی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب کسی لشکر یا فوجی دستے کو کسی امیر کے تحت بھیجتے، تو خاص طور پر ان کو یہ وصیت فرماتے کہ: اللہ تعالیٰ سے ڈر کر اور اللہ کے نام پر جہاد کرو۔ کفار سے لڑو مگر غیر متعلق افراد کو نقصان نہ پہنچاؤ۔ مالِ غنیمت میں خیانت نہ کرو اور غارت گری سے بچو۔ ناک یا کان نہ کاٹو اور بچوں کو قتل نہ کرو۔ (مسلم رقم:۱۷۳۱)

ایک حدیث میں آیا ہے کہ جہاد کے دوران ایک عورت قتل ہوئی، جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو معلوم ہوا، تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ عورتوں اور بچوں کو قتل کرنا منع ہے۔ (جامع ترمذی:۱۵۶۹)

جنگ کے اصول اور حدود

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وَاقْتُلُوْهُمْ حَيْثُ ثَقِفْتُمُوْهُمْ

ترجمہ: ''کہ ان سے وہاں لڑو جہاں بھی تمہیں موقع ملے، چاہے حرم ہی میں کیوں نہ ہو''۔

وَاَخْرِجُوْهُمْ مِّنْ حَيْثُ اَخْرَجُوْكُمْ (اور ان کو وہاں سے نکالو جہاں سے انھوں نے تمہیں نکالا) یعنی تمہیں مکہ معظّمہ چھوڑ کر ہجرت پر مجبور کیا گیا، اس لیے اب تم بھی ان پر وہی کارروائی کر سکتے ہو۔

نوٹ: یہاں ''جہاں پاؤ'' کا مطلب یہ نہیں کہ کسی بھی کافر کو کہیں بھی قتل کیا جائے، بلکہ مقصد یہ ہے کہ اگر کعبہ یا حرم کے پاس بھی دشمن لڑائی شروع کر دے، تو اب تمہیں وہاں بھی اس سے مقابلہ کرنے کی اجازت ہے۔

فتنہ کی شدت

وَالْفِتْنَةُ اَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ (فتنہ قتل سے زیادہ سخت ہے) فتنہ سے مراد شرک اور دین سے دوری ہے۔

صاحب روح المعانی لکھتے ہیں کہ صحابہ کرامؓ کے دلوں میں یہ سوال تھا کہ حرم میں لڑائی کی اجازت کیسے ہوگی، جبکہ حرم کا احترام ضروری ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جواب دیا کہ شرک اور فتنے کی شدت حرم میں قتل سے زیادہ ہے، اس لیے اس میں الجھن محسوس نہ کرو، بلکہ دشمن کی اس سرکشی اور فسق کے خلاف جدوجہد جائز ہے۔

قتال اور اس کی شرائط

اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: وَلَا تُقٰتِلُوْهُمْ عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ حَتّٰى يُقٰتِلُوْكُمْ فِيْهِ فَاِنْ قٰتَلُوْكُمْ فَاقْتُلُوْهُمْ ؕ كَذٰلِكَ جَزَآءُ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۱۹۱﴾

یعنی: اور تم ان سے مسجدِ حرام کے پاس جنگ مت کرو جب تک کہ وہ تم پر حملہ نہ کریں، لیکن اگر وہ لڑیں تو تم بھی ان سے جنگ کرو۔ یہی کافروں کا بدلہ ہے۔

قتال کی ابتدائی ہدایت

یہ آیت مسلمانوں کو واضح کرتی ہے کہ: مسلمانوں کو مسجدِ حرام کے نزدیک خود سے لڑائی کا آغاز نہیں کرنا چاہیے۔

حرم کی حرمت کا احترام: اگر مشرکین حرم کی حرمت کی پرواہ نہ کریں اور لڑائی شروع کریں، تب تم بھی دفاع میں قتال کرو پھر اگر دشمن شرک و کفر سے باز آجائیں اور اسلام قبول کرلیں، تو اللہ تعالیٰ بخشنے والا اور مہربان ہے۔ (فَاِنِ انْتَهَوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ)۔

قتال کا مقصد اور مدت

وَقٰتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ لِلّٰهِ

یعنی: ''کافروں سے لڑو یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے اور دین مکمل طور پر اللہ ہی کے لیے ہوجائے''۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قتال کا مقصد صرف دفاع نہیں، بلکہ شرک و کفر کو مٹانا اور اللہ کے دین کو عالمگیر بنانا ہے۔ شرک بدترین گناہ ہے اور اپنے خالق کے ساتھ بغاوت ہے، لہٰذا جہاد اسی کے خلاف جہد و کوشش کا نام ہے۔

قیام جہاد میں نیت سب سے بنیادی حیثیت رکھتی ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ صرف وہ قتال ''فی سبیل اللہ'' ہے جو اللہ کی راہ میں، دین اللہ کو بلند کرنے کے لیے کیا جائے۔ ایک صحابی نے سوال کیا: ''اگر کوئی شخص مالِ غنیمت کے لیے لڑتا ہے، کوئی شہرت کے لیے اور کوئی لوگ اس کی بہادری کے قائل ہونے کے لیے، تو کون فی سبیل اللہ لڑ رہا ہے؟'' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''جو شخص اس لیے لڑتا ہے کہ اللہ کی بات بلند ہو، وہ فی سبیل اللہ لڑنے والا ہے''۔ **(صحیح بخاری: ۲۸۱۰)**

اس سے یہ واضح ہوا کہ جھگڑا یا لڑائی کا مقصد دنیاوی مفاد، شہرت یا تکبر نہ ہو، بلکہ صرف اللہ کے دین کی سربلندی اور شرک و کفر کے خلاف ہو۔

قتال اور فتنہ ختم کرنے کی ہدایت

سورہ توبہ میں اللہ تعالیٰ نے ادائے جزیہ کے ذریعہ جنگ ختم کرنے کا ذکر فرمایا ہے، مگر یہاں مشرکینِ عرب کا

صریح ذکر نہیں کیا گیا۔ ممکن ہے کہ جزیہ کا قانون بعد میں نازل ہوا ہوتا کہ فتنے اور فساد کو روکنے میں مدد ملے۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: وَقٰتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ لِلّٰهِ۔ یعنی: لڑو یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے اور دین اللہ کے لیے ہو جائے۔

لفظ 'فتنہ' عام ہے، مگر سب سے بڑا فتنہ 'کفر و شرک' ہے۔ اس کے علاوہ فسق و فجور کے فتنے بھی انسانوں کے درمیان اٹھتے رہتے ہیں۔ کبھی مسلمان آپس میں لڑتے ہیں، جس سے بعض اوقات حق اور ناحق کا فیصلہ کرنا مشکل ہو جاتا ہے اور فتنہ بڑھ جاتا ہے۔

حضرت ابنِ عمرؓ کی مثال

صحیح بخاری میں ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی خدمت میں دو آدمی آئے، جو حضرت عبداللہ بن زبیرؓ سے جنگ و جدال کا زمانہ تھا، اور انہوں نے کہا: لوگ ضائع ہو رہے ہیں اور آپ حضرت عمرؓ کے بیٹے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صحابی ہیں، آپ جنگ میں حصہ کیوں نہیں لیتے؟ حضرت ابنِ عمرؓ نے جواب دیا: اللہ تعالیٰ نے مسلمان بھائی کا قتل حرام قرار دیا ہے۔ دوسرے نے کہا: کیا اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا: وَقٰتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ۔ کہ لڑو یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے؟

حضرت ابنِ عمرؓ نے فرمایا: ''ہم نے دشمنانِ دین سے یہاں تک لڑائی کی کہ فتنہ باقی نہ رہا اور دین اللہ کے لیے ہو گیا۔ تم چاہتے ہو کہ ہم اس لڑائی میں اس فتنہ کو پیدا کریں جس کی وجہ سے دین غیر اللہ کے لیے ہو جائے؟ اس لیے میں اس میں حصہ نہیں لیتا''۔ **(صحیح بخاری: ۴۵۱۳)**

یہ واقعہ آج بھی مسلمانوں کے لیے عبرت ہے کہ مسلمانوں میں آپس کی لڑائی اور قتلِ مسلم حرام ہے۔ ایسا کرنے سے دنیا و آخرت میں وبال اور عذاب کے مستحق بن جاتے ہیں، اور دشمنوں کو فائدہ پہنچتا ہے۔

ظلم کرنے والوں کو سزا

فَاِنِ انْتَهَوْا فَلَا عُدْوَانَ اِلَّا عَلَى الظّٰلِمِيْنَ یعنی: اگر کافر یا مشرک ظلم کا راستہ چھوڑ دے اور اسلام قبول کر لے تو ان پر مزید قتل یا زیادتی جائز نہیں۔ اگر ان کو قتل کر دیا جائے تو مسلمان ظالم بن جائیں گے، اور سزا کے مستحق ٹھہریں گے۔ کیونکہ سختی صرف ظالم پر ہوتی ہے، نیک اور توبہ کرنے والے پر نہیں۔

لفظ ''عُدْوَانَ'' کا مطلب ہے زیادتی یا تعدّی۔ جس طرح محاورے میں کہا جاتا ہے کہ اگر فلاں زیادتی کرے تو تم بھی متصلاً اس سے زیادتی نہ کرو۔ اسی طرح، جو لوگ کفر پر قائم رہیں اور ظلم کریں، ان کے خلاف مسلمان

اپنی دفاعی کارروائی کر سکتے ہیں، مگر جو اسلام قبول کر لیں، ان پر زیادتی کرنا جائز نہیں۔

یہ ہدایت ہمیں واضح طور پر بتاتی ہے کہ اسلام میں قتال اور جہاد کا مقصد صرف ظلم، کفر اور شرک کے خاتمے کے لیے ہے، نہ کہ انتقام یا ذاتی فائدے کے لیے۔

جہاد کی آیات اور ان پر اعتراضات

اگر کسی کو جہاد اور لڑائی سے متعلق قرآن کی کسی آیت پر اعتراض ہو، تو اسے چاہیے کہ وہ اس آیت سے پہلے اور بعد کی کچھ آیات کو بھی ساتھ میں ملا کر پڑھے تو اس کا عمومی اعتراض اکثر ختم ہو جاتا ہے اور واضح ہو جاتا ہے کہ قرآن میں جہاں بھی جنگ یا کسی کو سزا دینے کا حکم دیا گیا ہے، یعنی جنگ سے متعلق احکام انصاف اور زمین پر امن قائم کرنے کی ضرورت کے پیشِ نظر ہیں اور یہ بات کسی بھی معاشرے یا ملک میں قابل اعتراض نہیں سمجھی جاتی، بلکہ سبھی کے یہاں حفاظت، امن اور انصاف قائم کرنے کے لیے یہ ضروری سمجھا جاتا ہے۔

دنگے اور فساد

دنگے، فسادات، انتخاب کے وقت بوتھ پر قبضہ، دہشت گردوں کا معاملہ یا کسی ملک کی طرف سے فوجی کارروائی جیسے حالات میں، ہر سماج اور ملک میں ایسے فسادی عناصر کو قابو پانے کے لیے فوری اقدامات دیے جاتے ہیں اور اسے ظلم یا تشدد نہیں کہا جاتا۔ حتیٰ کہ ہمارے ملک میں بھی متعلقہ افسران کو قانونی طور پر یہ حق حاصل ہے۔

قرآن مجید میں جہاں بھی ایسے احکام دیے گئے ہیں، ان کا پس منظر ان حالات تک محدود ہے۔

مثال کے طور پر اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

''وَمَا لَكُمْ لَا تُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَالْمُسْتَضْعَفِينَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَاءِ وَالْوِلْدَانِ الَّذِينَ يَقُولُونَ رَبَّنَا أَخْرِجْنَا مِنْ هَذِهِ الْقَرْيَةِ الظَّالِمِ أَهْلُهَا وَاجْعَلْ لَنَا مِنْ لَدُنْكَ وَلِيًّا وَاجْعَلْ لَنَا مِنْ لَدُنْكَ نَصِيرًا''۔(سورہ نساء:۷۵)

ترجمہ: ''اور تمہیں کیا ہوا ہے کہ اللہ کی راہ میں اُن کمزور مردوں، عورتوں اور بچوں کے لیے جنگ نہیں کرتے، جو دعا کرتے ہیں: اے ہمارے رب! ہمیں اس بستی سے نکال، جس کے لوگ ظالم ہیں، اور ہمارے لیے اپنی طرف سے کوئی دوست پیدا فرما اور ہمارے لیے اپنی مددگار طاقت قائم فرما''۔

یہ آیت اس بات کی وضاحت کرتی ہے کہ جہاد کا مقصد صرف مظلوموں کی مدد اور ظالموں کے ظلم کے خاتمے کے لیے ہے، نہ کہ ذاتی انتقام یا بے جا تشدد کے لیے۔

قرآن مجید میں جنگ کا حکم

قرآن پاک کی جس آیت میں سب سے پہلے جنگ کی اجازت ملی وہ یہی آیت ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

أُذِنَ لِلَّذِيْنَ يُقٰتَلُوْنَ بِأَنَّهُمْ ظُلِمُوْا ؕ وَإِنَّ اللّٰهَ عَلٰى نَصْرِهِمْ لَقَدِيْرُ ۙ﴿۳۹﴾ الَّذِيْنَ أُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ بِغَيْرِ حَقٍّ إِلَّآ أَنْ يَّقُوْلُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ؕ وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِيَعٌ وَّصَلَوٰتٌ وَّمَسٰجِدُ يُذْكَرُ فِيْهَا اسْمُ اللّٰهِ كَثِيْرًا ؕ وَلَيَنْصُرَنَّ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ ؕ إِنَّ اللّٰهَ لَقَوِيٌّ عَزِيْزٌ ﴿۴۰﴾ اَلَّذِيْنَ إِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْأَرْضِ أَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَأَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ ؕ وَلِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْأُمُوْرِ ﴿۴۱﴾ (سورہ حج آیت ۳۹-۴۱)

ترجمہ: اُن لوگوں کو اجازت دی جاتی ہے جن کے خلاف جنگ کی جارہی ہے، کیونکہ ان پر ظلم ہورہا ہے اور اللہ اُن کی مدد کرنے پر قادر ہے، (یہ وہ لوگ ہیں) جو اپنے گھروں سے ناحق نکالے گئے، صرف اس بات پر کہ وہ کہتے ہیں ''ہمارا رب اللہ ہے'' اگر اللہ لوگوں کو ایک دوسرے سے نہ ہٹاتا رہتا، تو خانقاہیں اور گرجا اور یہودی عبادت خانے اور مسجدیں جن میں اللہ کا خوب نام لیا جاتا ہے، سب گرادئے جاتے اور اللہ اس کی ضرور مدد کریگا، جو اس کی مدد کریگا، بے شک اللہ بڑا زبردست، طاقت والا ہے، تو یہ وہ لوگ ہیں کہ اگر زمین پر ہم انہیں حکومت دے دیں تو وہ نماز قائم کریں گے اور زکوٰۃ دیں گے اور بھلی بات کا حکم کریں گے اور برائیوں سے روکیں گے، اور سب معاملوں کا انجام تو اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے۔ (سورہ حج آیت ۳۹-۴۱)

یہ وہ پہلی آیت ہے جو جنگ کی اجازت کے بارے میں نازل ہوئی۔ اس سے پہلے قریشِ مکہ کے مسلمانوں پر ظلم وستم کی تفصیل بیان کی گئی تھی، جنہوں نے مسلمانوں کے لیے حج کرنے پر پابندی لگادی، حالانکہ انہیں اس کا کوئی حق نہیں تھا۔ اب یہاں بالکل صاف لفظوں میں واضح کیا گیا کہ قتال کی اجازت کی وجہ یہ ہے: ''بِأَنَّهُمْ ظُلِمُوا'' یعنی مسلمانوں پر ظلم ہوا ہے۔ اور مظلوم کا حق ہے کہ وہ ظالم کے سامنے اپنا دفاع کرے۔ یہ مسلمان ۱۳ سال تک قریش کے ظلم وتشدد کا نشانہ بنتے رہے، بالآخر ترکِ وطن پر مجبور ہوئے، مگر غربت کے باوجود انہیں چین سے نہ بیٹھنے دیا گیا اور ان کے خلاف جنگ کی سازشیں کی گئیں۔

ان کا جرم صرف یہ تھا کہ وہ کہتے تھے: ''رَبُّنَا اللّٰهُ'' ۔ ہم اپنے عقیدے کے مطابق اپنے پروردگار کو یاد کرنا چاہتے ہیں، اور کسی کو مجبور نہیں کرتے کہ ہمارا دین قبول کرے۔ لیکن دیگر لوگ انہیں مجبور کرنے لگے کہ اپنے ایمان کو چھوڑ دیں۔

مظلوم کا حق اور دفاعی ضرورت

یہ آیت واضح کرتی ہے کہ ''مظلوم کا دفاع انسانی فطرت اور انصاف کا حق ہے''۔ اگر یہ اس حق سے محروم کر دیا جائے تو دنیا میں ظلم واستبداد کا سدِ باب ممکن نہ رہے گا۔ طاقتور گروہ ہمیشہ کمزور گروہوں کے اعتقاد وعمل کی آزادی پامال کر دیں گے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے ایک نظام قائم کیا کہ ظلم وتشدد کے خلاف مدافعت اور دفاع کا راستہ ہمیشہ موجود رہے۔ اگر یہ نہ ہوتا تو دنیا میں عبادت گاہیں انسانی ظلم سے محفوظ نہ رہتیں۔

مسلمانوں کے غلبہ کا مقصد

جب مظلوم مسلمان قدم جمائیں اور انہیں غلبہ وحکومت حاصل ہو تو انہیں چاہیے کہ: نماز قائم کریں، زکوٰۃ ادا کریں، نیکی کا حکم دیں اور برائی سے روکیں، ظلم وجبر کے مقابلے میں عدل وانصاف کی حکومت قائم کریں۔

قرآن نے واضح کر دیا کہ جنگ کا مقصد دوسروں پر چڑھ دوڑنا نہیں، بلکہ مظلوموں اور بے کسوں کی حمایت کرنا ہے اور انہیں ظالموں کے پنجے سے آزاد کرانا ہے۔ اس لیے بار بار فرمایا گیا ہے کہ اللہ کی راہ میں لڑو، یعنی اپنی نفسانی خواہشات کے لیے نہیں بلکہ عدل وانصاف کے قیام کے لیے۔

خلاصۂ بحث

مکہ کے کافروں نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ان کے صحابہ پر انتہا درجے کے ظلم کیے: دہکتے انگاروں پر ننگی پیٹھ لٹایا، بھاری پتھر رکھ کر سزا دی، تپتی ہوئی ریت میں گھسیٹا، لوہے کی گرم چھڑوں سے جسم کو زخمی کیا، عورتوں کے ساتھ گھناؤنا سلوک کیا، حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو قتل کرنے کی ناکام کوششیں کیں، مسلمانوں کو ترکِ وطن پر مجبور کیا، معاشی ظلم وبائیکاٹ کیے، جس میں خاندان کے افراد بھوکوں مرتے اور بچوں کو پیڑوں کے پتے اور سوکھے چمڑے کھانے پر مجبور کیا گیا۔

ان تمام مظالم کا مقصد یہ تھا کہ پیغمبرِ اسلام تبلیغ ودعوت چھوڑ دیں۔ یہ ظلم وستم ۱۳ سال تک جاری رہا، یہاں تک کہ دشمن نے رات کے وقت حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے گھر پر محاصرے کی سازش بھی کی تاکہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو قتل کر سکیں۔

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جان کے دشمن

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اللہ کے رسول تھے اور اللہ خود آپ کے محافظ تھے۔ آپ دشمنوں کے درمیان سے محفوظ نکلے اور مدینہ پہنچ گئے، جہاں کے لوگ پہلے ہی مسلمان ہو چکے تھے اور ان کے سرداروں نے طے کر لیا تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مکہ چھوڑ کر مدینہ آئیں۔

لیکن ظالم دشمن اس پر مطمئن نہ ہوئے بلکہ مدینہ پر حملہ آور ہو گئے۔ ایسی حالت میں ان کافر دشمنوں سے جنگ کی اجازت دی گئی۔ کیا یہ اجازت مناسب نہیں؟ لیکن اس کے باوجود مسلمانوں کو حکم دیا گیا کہ جنگ میں بھی زیادتی نہ کریں۔ یعنی کوئی ایسا عمل نہ کریں جو ظلم پر مبنی ہو، کیونکہ اللہ زیادتی کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔

زیادتی سے مراد

زیادتی سے مراد ہر وہ عمل ہے جو غیر مناسب، غیر اخلاقی اور انصاف کے خلاف ہو۔ مسلمانوں کو حکم دیا گیا کہ وہ ایسے لوگوں سے جنگ نہ کریں جو ان کے مذہب میں خلل نہیں ڈالتے۔ جنگ کے دوران: عورتوں، بچوں، بوڑھوں اور معذوروں پر ہاتھ نہ اٹھایا جائے، کھیتوں اور جانوروں کو نقصان نہ پہنچایا جائے، جسمانی طاقت صرف ضرورت کے مطابق استعمال ہو۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ اسلام سے پہلے اہلِ عرب یہ سب غیر انسانی اعمال کرتے تھے۔

جب دشمن امن کا ارادہ نہ رکھے اور لڑنے پر آمادہ ہو تو ایسے میں مبارزہ ضروری ہو جاتا ہے۔ اس لیے کہا گیا کہ جہاں بھی دشمن سے سامنا ہو یا جہاں سے وہ مسلمانوں کو نکال چکے ہوں، وہاں لڑائی کی اجازت ہے۔

خون بہانا

خون بہانا بذات خود اچھا عمل نہیں۔ لیکن جب دشمن طاقت کے زور پر لوگوں کو سچ کے راستے سے روکے اور اپنا مذہب غیر قانونی طور پر تھوپنے کی کوشش کرے، تو ایسے ظالم دشمنوں کے خلاف لڑنا جائز ہے۔

کعبہ کے آس پاس جنگ عام طور پر گناہ ہے۔ لیکن مکہ کے کافر اپنی طاقت کے گھمنڈ میں کعبہ کی حرمت کا بھی خیال نہیں رکھتے تھے۔ اس لیے مسلمانوں کو ہدایت دی گئی کہ کعبہ کے علاقے میں پہل نہ کریں۔ اگر دشمن لڑنے پر آمادہ ہو تو پھر انہیں جواب دینا جائز ہے۔

منافق، کافر یا ظالم دشمن اگر جنگ ختم کر دیں تو اللہ بڑا معاف کرنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔ اس سے مسلمانوں کو سکھایا گیا کہ عدل و انصاف میں مہربانی اور معافی کی صفت ہونی چاہیے۔ اگر دشمن جنگ ختم کر دے تو مدافعت کے جذبات کے باوجود ہاتھ روکنا چاہیے۔ جنگ کا مقصد صرف ظالموں کو ظلم سے روکنا ہے۔

مسلمانوں کی لڑائی کا مقصد مذہب کے راستے سے رکاوٹ دور کرنا ہے۔ یہ لڑائی صرف تب تک جاری رہے جب تک رکاوٹ موجود ہو، اور جیسے ہی رکاوٹ ختم ہو اور دین اللہ کے لیے قائم ہو جائے، تو لڑائی ختم کر دینی چاہیے۔

نوٹ: غور کریں کہ ایسا قانون کس مذہب یا کتاب میں موجود ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ پیغمبر ﷺ اور صحابہ پر ظلم صرف اس لیے ہوا کیونکہ وہ اللہ کو ایک مانتے اور حضرت محمد ﷺ کو اس کا رسول مانتے تھے۔ وہ اللہ کے حکم کے مطابق

زندگی گزار رہے تھے: جس کی وجہ سے ان پر ظلم کیا گیا تو کیا ایسے ظالموں پر پھولوں کی بارش کرنے کا حکم دینا چاہیے؟

اسلام قبول کرنے پر مجبور

قرآن مجید واضح طور پر فرماتا ہے کہ کسی کو بھی اسلام قبول کرنے پر مجبور نہیں کیا جا سکتا۔ اور نہ ہی اسلام قبول نہ کرنے کی وجہ سے سزائے موت دی جا سکتی ہے۔ اگر کوئی زبردستی اسلام قبول بھی کر لے تو اس کی قبولیت اور ایمان نا قابل قبول ہوگا۔

اللہ تعالیٰ کے نزدیک وہ ایمان قطعی قبول نہیں جو صرف ظاہری طور پر ہو یا زبردستی حاصل کیا جائے، کیونکہ ایمان کی بنیادی شرط دل کی آمادگی اور حقیقی خواہش ہے۔ تلوار یا کسی طاقت کے زور سے ایمان دلانا ممکن نہیں۔ قرآن نے اپنی تعلیمات اور پیغام کو دلائل اور شواہد کے ساتھ اتنی وضاحت سے پیش کیا ہے کہ ہر انسان کو اسے قبول یا رد کرنے کی پوری آزادی حاصل ہے۔

اعتراضات اور وضاحت

یہ بات واضح کرنی ضروری ہے کہ قرآن میں جنگ یا سزا کے احکام ہر فرد کے لیے علیحدہ علیحدہ نہیں دیے گئے بلکہ یہ احکام اسلامی حکومت یا حکمراں جماعت کے لیے مخصوص ہیں۔ ان فیصلوں میں ہمیشہ عدالتی کارروائی اور منصفانہ اصولوں کا لحاظ رکھا گیا ہے۔

افسوس کی بات یہ ہے کہ بعض لوگ اپنے اعتراضات اس طرح پیش کرتے ہیں کہ گویا قرآن نے ہر مسلمان کو شخصی طور پر کسی کو سزائے موت دینے یا کسی فسادی کو قتل کرنے کا اختیار دیا ہے۔ یہ بات حقیقت اور انصاف کے بالکل خلاف ہے۔

ہر زمانے میں حکمرانوں نے اپنے ملک و معاشرہ میں فساد پھیلانے والوں اور منافقوں کے خلاف اقدامات کیے، اور قرآن نے اس معاملے کو واضح کرنے کے لیے لفظ ''فتنہ'' استعمال کیا، جس سے پتہ چلتا ہے کہ لڑائی صرف سب سے بڑے ظالموں کے خلاف تھی۔

قرآن میں جنگ سے متعلق اصول انتہائی قیمتی اور واضح ہیں، جن کا انکار ممکن نہیں۔ یہ اصول صرف حقیقی رب کی طرف سے آ سکتے ہیں۔ اسلامی حکومت کو یہ پابند بنایا گیا ہے کہ جنگ صرف اللہ کے راستے میں کی جا سکتی ہے اور اللہ کے راستے میں لڑائی کا مطلب یہ ہے کہ جنگ اپنے اقتصادی مفاد یا ذاتی مفاد کے لیے نہیں، اپنا وجود قائم کرنے کے لیے نہیں بلکہ صرف سچ، انصاف اور امن و امان کے قیام کے لیے ہو۔ یہ جنگ حقیقی مالک کی رضا اور اس کی ہدایت کے مطابق کی جائے اور معاشرے میں شرعی قانون اور عدالت کے نفاذ کے لیے ہو، تاکہ انصاف اور امن قائم ہو۔

آیت نمبر (۱۹۴) اَلشَّهْرُ الْحَرَامُ بِالشَّهْرِ الْحَرَامِ وَالْحُرُمٰتُ قِصَاصٌ ؕ فَمَنِ اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ فَاعْتَدُوْا عَلَيْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ ۪ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِيْنَ ﴿۱۹۴﴾

ترجمہ: ''حرمت والے مہینے کا بدلہ حرمت والا مہینہ ہے اور حرمتوں کا بھی بدلہ ہے۔ تو جو تم پر زیادتی کرے، تم بھی اس پر ویسی ہی زیادتی کرو جیسی اس نے تم پر کی اور اللہ سے ڈرتے رہو اور جان لو کہ اللہ پرہیزگاروں کے ساتھ ہے''۔

تفسیر

مشرکین کی زیادتی کا جواب

جب نبی کریم ﷺ ساتویں ہجری میں اپنے صحابہؓ کے ساتھ عمرۃ القضاء کے لیے تشریف لے گئے، تو یہ مہینہ ذیقعدہ کا تھا۔ اس وقت مسلمانوں کو مشرکین مکہ کی طرف سے خطرہ لاحق تھا کہ کہیں وہ معاہدے کی خلاف ورزی نہ کریں اور حملہ نہ کر دیں۔ اگر ایسا ہوتا تو حرمت والے مہینے اور حرم میں جنگ کرنی پڑتی، جس سے جگہ اور زمانہ دونوں کی حرمت متاثر ہوتی۔

اللہ تعالیٰ نے اس سلسلے میں پہلی آیت میں ارشاد فرمایا: ''وَلَا تُقٰتِلُوْهُمْ عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ حَتّٰى يُقٰتِلُوْكُمْ فِيْهِ''۔ یعنی حرم میں صرف اسی وقت جنگ کرو جب وہ تم پر حملہ کریں۔

مہینے کی حرمت کے بارے میں فرمایا گیا کہ اگر جنگ کرنا پڑے تو حرمت والے مہینے کو حرمت والے مہینے کے بدلے میں سمجھو۔ یعنی مشرکین اگر مہینے کی حرمت کا احترام کریں تو تم بھی ان کی رعایت کرو اور ان سے جنگ نہ کرو، لیکن اگر وہ بے حرمتی کریں تو تم بھی جوابی کارروائی کر سکتے ہو۔ جیسا کہ فرمایا: ''وَالْحُرُمٰتُ قِصَاصٌ''، یعنی حرمت بدل کی چیز ہے۔ جو لوگ تمہارے ساتھ حرمت کا لحاظ کریں، تم بھی ان کے ساتھ ویسا ہی سلوک کرو۔

پھر اللہ تعالیٰ نے واضح فرمایا: ''فَمَنِ اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ فَاعْتَدُوْا عَلَيْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ''۔ یعنی جو شخص تم پر زیادتی کرے، تم بھی اس پر اتنی ہی زیادتی کرو جتنی اس نے تم پر کی ہے۔

یہ آیت عمرۃ القضاء کے موقع پر نازل ہوئی، جب دشمن کے حملے کا خطرہ تھا۔ اگرچہ یہ مخصوص موقع کے لیے نازل ہوئی، لیکن اس کے الفاظ ایک عمومی قانون کی حیثیت رکھتے ہیں کہ جتنی زیادتی کسی نے کی، اتنا ہی بدلہ لیا جا سکتا ہے۔ اس سے زیادہ کرنا، تمہیں خود زیادتی کرنے والا بنا دے گا۔

اللہ تعالیٰ متقیوں کے ساتھ ہے

آخر میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِيْنَ ﴿۱۹۴﴾''

یعنی بدلے کی کارروائی کرتے وقت بھی گناہ سے بچو اور ہمیشہ اللہ سے ڈرتے رہو۔ جس کام کی اجازت نہیں، اس سے باز رہو اور یہ جان لو کہ تقویٰ اختیار کرنے والوں کا مقام بہت بلند ہے۔ تقویٰ اختیار کرنے والے وہ ہیں جو نفس کے ابھار کے باوجود شرعی حدود کی رعایت کرتے ہیں اور زیادتی سے گریز کرتے ہیں۔ ایسے لوگوں کے ساتھ اللہ تعالیٰ ہے اور دنیا و آخرت میں ان کا بہترین بدلہ اللہ تعالیٰ خود دے گا۔

آیت نمبر (۱۹۵) وَاَنْفِقُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَلَا تُلْقُوْا بِاَیْدِیْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ ۛ وَاَحْسِنُوْا ۛ اِنَّ اللّٰهَ یُحِبُّ الْمُحْسِنِیْنَ ﴿۱۹۵﴾

ترجمہ: ''اور اللہ کے راستے میں خرچ کرو اور اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو اور احسان کرو، بے شک اللہ نیکی کرنے والوں کو پسند کرتا ہے''۔

تفسیر حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ یہ آیت کریمہ صلح حدیبیہ کے واقعے کے بارے میں نازل ہوئی۔ اس واقعے کا خلاصہ یہ ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بیت اللہ میں داخل ہونے سے روکے گئے، تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مشرکینِ مکہ سے صلح کر لی کہ اگلے سال عمرۂ قضا کریں گے۔

جب اگلا سال آیا، تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور صحابۂ کرامؓ نے عمرۂ قضا کی تیاری کی۔ اس موقع پر خدشہ تھا کہ کفار وعدہ پورا نہ کریں اور مسجدِ حرام میں داخلے سے روک دیں یا قتال پر اتر آئیں، کیونکہ صحابہ کرامؓ حج کے مہینوں میں جنگ سے گریز کرتے تھے۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔

ابن جریر نے قتادہ سے نقل کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور صحابہ کرامؓ ذیقعدہ کے مہینے میں احرام باندھ کر قربانی کا جانور ساتھ لے کر روانہ ہوئے، لیکن مقامِ حدیبیہ پر مشرکین نے انہیں روکا۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صلح کر لی اور طے پایا کہ اس سال واپس جائیں اور آئندہ سال عمرہ کریں۔ اگلے سال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم عمرہ کے لیے مکہ مکرمہ میں داخل ہوئے اور تین راتیں وہاں قیام کیا۔ مشرکین کو فخر تھا کہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو واپس کر دیا۔

اللہ تعالیٰ نے اس پورے واقعے کی وضاحت کی اور فرمایا: ''اَلشَّهْرُ الْحَرَامُ بِالشَّهْرِ الْحَرَامِ'' یعنی حرمت والا مہینہ حرمت والے مہینے کے برابر ہے، اور حرمتیں بدلے کی چیزیں ہیں۔

اسی طرح، اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''وَاَنْفِقُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ''۔

امام بخاریؒ نے حضرت حذیفہؓ سے نقل کیا کہ یہ آیت نفقہ کے بارے میں نازل ہوئی۔ امام ابوداؤد اور ترمذی نے بھی اس کو روایت کیا، اور امام حاکم و ابن حبان نے ابوایوبؓ سے روایت کی ہے۔ ان کے بیان کے مطابق، جب

اسلام کو عزت ملی اور مددگار بڑھ گئے، تو کچھ صحابۂ کرام میں خفیہ گفتگو ہوئی کہ ہمارے اموال ضائع ہو رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اس پر اس آیت کے ذریعے حکم دیا کہ اپنے مال کو اس کے راستے میں خرچ کرو اور اپنے آپ کو ہلاکت میں مبتلا نہ کرو۔ (ترمذی:۲۹۷۲)

امام طبرانیؒ نے صحیح سند کے ساتھ نعمان بن بشیر سے روایت نقل کی کہ جب انسان گناہ کر لیتا ہے اور اپنے دل میں سوچتا ہے کہ کیا اللہ تعالیٰ میری مغفرت نہیں کرے گا، تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی کہ اپنے آپ کو ہلاکت میں مت ڈالو۔ اس حدیث کے سلسلے میں امام حاکم نے حضرت براءؓ سے بھی روایت نقل کی ہے۔

ہلاکت میں ڈالنے کی ممانعت

''مستدرک حاکم'' (حصہ ۳، صفحہ ۲۷۵) میں ابوعمران سے روایت ہے کہ انہوں نے بیان کیا کہ ہم قسطنطنیہ میں تھے، اور امیر المؤمنین کی طرف سے مصر میں حضرت عقبہ بن عامر جہنی اور شام میں حضرت فضالہؓ تھے۔ رومیوں کی ایک بڑی فوج مسلمانوں کے سامنے آئی، اور مسلمانوں نے بھی اس کے مقابلے کے لیے صف باندھی۔ ایک مسلمان نے ان پر حملہ کیا اور پھر واپس آیا، تو لوگوں نے کہا کہ اس نے اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈال دیا۔ اس پر حضرت ابوایوب انصاریؓ نے فرمایا کہ لوگ آیت کا مطلب غلط سمجھ رہے ہیں۔ اس کا مقصد یہ نہیں کہ دشمنوں سے قتال نہ کرو اور حملہ نہ کرو۔

کچھ لوگوں نے کہا کہ یہ آیت انصار کے لیے نازل ہوئی، جب اللہ تعالیٰ نے دین اسلام کو غلبہ دیا اور مددگار بڑھ گئے، تو کچھ انصار نے کہا کہ ہمارے مال ضائع ہو گئے، لہٰذا ہم گھروں میں بیٹھ کر اپنی مال و جان کی حفاظت کریں۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے ان کے ارادوں کی تردید فرمائی اور آیت کریمہ: ''وَاَنْفِقُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ'' نازل فرمائی۔ اس سے واضح ہوا کہ مال کی حفاظت کے لیے گھروں میں بیٹھنا اور جہاد چھوڑنا ہلاکت ہے۔

حضرت ابوایوب انصاریؓ موت تک اللہ کی راہ میں جہاد کرتے رہے۔ سنن ترمذی میں اس واقعے کا ذکر کچھ اختلاف کے ساتھ ہے، جس میں کہا گیا کہ اگر ہم اپنے مال میں قیام کرتے اور جو خرابی ہوئی اسے درست کرتے تو اچھا ہوتا، لیکن اللہ تعالیٰ نے اس پر یہ آیت نازل فرمائی، جو واضح کرتی ہے کہ حقیقی ہلاکت مال کی دیکھ بھال کے لیے گھروں میں بیٹھنا اور جہاد چھوڑ دینا ہے۔

جہاد کی اہمیت اور ضرورت

حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''مجھے اللہ کی طرف سے حکم ہوا ہے کہ میں لوگوں کے خلاف جہاد کرتا رہوں یہاں تک کہ وہ گواہی دیں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اللہ کے

رسول ہیں، نماز قائم کریں اور زکوٰۃ دیں۔ اگر وہ ایسا کرنے لگیں تو انہوں نے اپنی جان اور مال مجھ سے بچا لیے، مگر اسلام کا حق ٹلے گا نہیں۔'' (صحیح بخاری، باب الایمان، حدیث: ۲۵)

اس حدیث سے واضح ہوتا ہے کہ اسلام کی بقاء اور مسلمانوں کی عزت کے لیے جہاد اور اللہ کی راہ میں مال خرچ کرنا ضروری ہے۔ جہاد ترک کرنے اور مال و جان کی حفاظت کے لیے پیچھے ہٹنے میں ہلاکت ہے، جبکہ اللہ کی راہ میں ثابت قدم رہنے سے دین اور قوم کی عزت و غلبہ قائم رہتا ہے۔

ہلاکت سے بچنے کی تعلیم

حقیقت میں جہاد ایک بہت بڑی اور اہم عبادت ہے۔ جب سے مسلمانوں نے ''فی سبیل اللہ'' جہاد کرنا چھوڑ دیا، اس کے اثرات کے طور پر معاشرے میں عمومی مشکلات اور عذاب دیکھنے کو مل رہے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''وَلَا تُلْقُوْا بِاَيْدِيْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ ۛ''۔

اس آیت کی ایک تفسیر وہی ہے جو شانِ نزول سے معلوم ہوئی، جیسا کہ حضرت ابو ایوب انصاریؓ نے بیان فرمایا۔ مفسرین نے اس کی متعدد تشریحات کی ہیں۔ الفاظ کے عام مفہوم کے مطابق اس میں شامل ہیں: مال خرچ کرنے میں فضول خرچی کرنا، حلال ذریعہ معاش کو ضائع کرنا، خودکشی کرنا، جان بوجھ کر ایسے اعمال کرنا جو ہلاکت کا سبب ہوں، فرض یا واجب مقامات پر مال خرچ نہ کرنا، گناہوں میں مبتلا رہنا اور توبہ نہ کرنا۔ یہ تمام صورتیں اس آیت کے تحت منع ہیں کیونکہ یہ سب انسان کو ہلاکت کی طرف لے جاتی ہیں۔

صفتِ احسان کا حکم

آیت کے آخر میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ''وَاَحْسِنُوْا ۚ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۱۹۵﴾''۔

لفظ ''وَاَحْسِنُوا'' باب افعال سے امر کا صیغہ ہے، اور ''احسان'' لفظ حسن سے ماخوذ ہے، جس کا مطلب ہے خوبی اور اچھائی۔ احسان کا مفہوم یہ ہے کہ ہر کام کو اچھے طریقے سے انجام دو، اس میں ادب اور ضابطہ کا خیال رکھو تاکہ عمل میں خوبی اور حسن کا عنصر پیدا ہو اور وہ حقیقی احسان کہلائے۔

حدیث جبرئیل میں حضرت محمد ﷺ سے پوچھا گیا: احسان کیا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ''أَنْ تَعْبُدَ اللّٰهَ كَأَنَّكَ تَرَاهُ فَإِنْ لَمْ تَكُنْ تَرَاهُ فَإِنَّهُ يَرَاكَ''۔ یعنی احسان یہ ہے کہ تم اللہ کی عبادت اس طرح کرو جیسے تم اسے دیکھ رہے ہو، اور اگر تم اسے نہیں دیکھ رہے ہو، تو یقین رکھو کہ وہ تمہیں دیکھ رہا ہے۔

احسان صرف عبادات تک محدود نہیں بلکہ ہر عمل میں شامل ہے: حج میں احرام کی خلاف ورزی نہ کرنا، جنگ و

جدال سے پرہیز کرنا، حج کا مقصد صحیح رکھنا، روزے میں غیبت، گالی، یا دیگر برائیوں سے بچنا، انسانی ضروریات کے لیے جانور ذبح کرنے کی اجازت، لیکن اس میں بھی احسان قائم رکھنا

حضرت شداد بن اوس ؓ سے روایت ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: ''بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے ہر کام میں بہترین طریقہ اختیار کرنے کا حکم دیا ہے، پس جب کسی کو قتل کرو تو بہتر طریقے سے کرو، اور جب ذبح کرو تو جانور کو آرام پہنچاتے ہوئے اور چھری تیز رکھ کر ذبح کرو''۔ (صحیح مسلم: ۱۹۵۵)

یعنی ہر کام میں حسنِ انجام اور احسان اختیار کرنا نہ صرف عبادت کا حصہ ہے بلکہ انسان کو اللہ کے قریب اور اعمال کو قبولیت کے قابل بناتا ہے۔

آیت نمبر (۱۹۶) وَاَتِمُّوا الْحَجَّ وَالْعُمْرَةَ لِلّٰهِ ؕ فَاِنْ اُحْصِرْتُمْ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ ۚ وَلَا تَحْلِقُوْا رُءُوْسَكُمْ حَتّٰى يَبْلُغَ الْهَدْيُ مَحِلَّهٗ ؕ فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيْضًا اَوْ بِهٖۤ اَذًى مِّنْ رَّاْسِهٖ فَفِدْيَةٌ مِّنْ صِيَامٍ اَوْ صَدَقَةٍ اَوْ نُسُكٍ ۚ فَاِذَاۤ اَمِنْتُمْ ۪ فَمَنْ تَمَتَّعَ بِالْعُمْرَةِ اِلَى الْحَجِّ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ ۚ فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ ثَلٰثَةِ اَيَّامٍ فِي الْحَجِّ وَسَبْعَةٍ اِذَا رَجَعْتُمْ ؕ تِلْكَ عَشَرَةٌ كَامِلَةٌ ؕ ذٰلِكَ لِمَنْ لَّمْ يَكُنْ اَهْلُهٗ حَاضِرِي الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ؕ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ﴿۱۹۶﴾

ترجمہ: ''اور اللہ کے لیے حج اور عمرہ پورا کرو، پھر اگر تم روک دیے جاؤ تو جو قربانی میسر ہو (پیش کرو) اور اپنے سروں کو نہ مونڈو جب تک قربانی اپنی جگہ نہ پہنچ جائے۔ پھر اگر کوئی بیمار ہو یا اسے سر میں تکلیف ہو تو فدیہ دے دے: روزے رکھے یا صدقہ دے یا قربانی کرے۔ پھر جب تم امن میں آ جاؤ، تو جو کوئی عمرہ کے ساتھ حج کا فائدہ اٹھائے، تو وہ قربانی کرے جو میسر ہو، اور جو نہ پائے، تو وہ تین دن کے روزے حج کے دوران رکھے اور سات دن جب واپس لوٹے، یہ کل دس دن ہوئے۔ یہ رعایت اس کے لیے ہے جس کے گھر والے مسجدِ حرام کے قریب نہ ہوں، اور اللہ سے ڈرتے رہو، اور جان لو کہ اللہ سخت سزا دینے والا ہے''۔

تفسیر

مریض یا معذور شخص کے لیے کفارہ

''فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيْضًا'' امام بخاریؒ نے حضرت کعب بن عجرہ ؓ سے روایت نقل کی ہے کہ ایک مرتبہ اُنہیں رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں لایا گیا، اور اُن کے سر پر جوں (لاؤس) آ گئی تھیں۔ آپ ﷺ نے

فرمایا: میں دیکھ رہا ہوں کہ تم اس تکلیف میں مبتلا ہو، کیا تمہارے پاس کوئی بکری ہے؟ حضرت کعبؓ نے عرض کیا: نہیں، پھر آپ ﷺ نے حکم فرمایا: تو تین روزے روزہ رکھو، یا چھ مسکینوں کو کھانا کھلاؤ، ہر ایک کو آدھا کھانے کا حصہ دو، اور پھر اپنا سر منڈالو۔ حضرت کعبؓ فرماتے ہیں کہ اسی موقع پر یہ آیت نازل ہوئی اور اب یہ تمام مسلمانوں کے لیے حکم بن گئی۔ **(بخاری:۱۸۱۵)**

مقامِ حدیبیہ میں نزول

امام احمدؒ نے حضرت کعبؓ سے روایت نقل کی ہے کہ جب وہ اور دیگر صحابہؓ احرام باندھے حدیبیہ میں تھے، مشرکین نے انہیں روک دیا۔ حضرت کعبؓ کے سر پر جوں اتنی زیادہ تھیں کہ وہ ان کے چہرے پر گر رہی تھیں۔ رسول اللہ ﷺ نے دیکھ کر فرمایا: ''کیا یہ جوں تمہیں تکلیف دے رہی ہیں؟''۔

پھر آپ ﷺ نے سر منڈانے کا حکم دیا اور اسی وقت یہ آیت نازل ہوئی: ''فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيْضًا''۔

واحدی نے حضرت ابن عباسؓ سے روایت نقل کی ہے کہ حدیبیہ میں پڑاؤ کے دوران حضرت کعب بن عجرہؓ جوں جھاڑتے ہوئے آئے اور عرض کیا: ''یا رسول اللہ ﷺ، یہ جوں مجھے کھا رہی ہیں'' تب یہ آیت نازل ہوئی۔

حج وعمرہ ادا نہ کر پانے کا کفارہ

حدیث میں حج اور عمرہ کی بڑی فضیلت بیان ہوئی ہے: اسلام قبول کرتے ہی پچھلے گناہ دھل جاتے ہیں، اور اللہ کی راہ میں ہجرت وحج کا اجر عظیم ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ فرماتے ہیں کہ حج اور عمرہ ہر مسلمان پر واجب ہیں، اور حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں: ''اس آیت میں عمرہ کا ذکر حج کے ضمن میں آیا ہے''۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ایک عمرہ سے دوسرے تک جو گناہ ہوئے، عمرہ ان سب کا کفارہ ہے، اور قبول شدہ حج کا اجر جنت ہے''۔ **(صحیح بخاری:۱۷۷۳)**

یہ آیت ۶ ہجری میں واقعہ حدیبیہ کے دوران نازل ہوئی، جب مسلمانوں کو عمرہ ادا کرنے سے روکا گیا۔ اگر کوئی احرام باندھنے کے بعد بیماری، دشمن کی رکاوٹ، یا موسمی ودیگر مجبوری کی وجہ سے حج یا عمرہ نہ کر سکے، تو اسے ''محصر'' کہا جاتا ہے۔

حضرت کعب بن عجرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جو شخص احرام باندھنے کے بعد کسی وجہ سے حج یا عمرہ پورا نہ کر سکے، تو تین روزے رکھے، یا چھ مسکینوں کو کھانا کھلائے، یا بکری ذبح کرے''۔ **(بخاری:۱۸۱۵)**

اس آیت وحدیث سے یہ معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے ہر عاجز اور بیمار شخص کے لیے آسانی اور کفارہ مقرر فرمایا تاکہ عبادت مکمل ہو اور تکلیف میں بھی رحمت شامل ہو۔

حج وعمرہ میں قربانی اور فدیہ کے احکام

اگر کسی شخص کو دشمن کی رکاوٹ یا بیماری کی وجہ سے حج وعمرہ پورا کرنے سے روکا جائے، تو اس حالت میں اس پر یہ لازم ہے کہ وہ قربانی کے لیے ایک جانور فراہم کرے اور احرام کھولے۔ یعنی جب تک جانور حرم میں نہ پہنچے اور وہاں اس کی قربانی نہ کی جائے، اُس شخص یعنی ''محصّر'' کا سر منڈانا یا احرام کھولنا جائز نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اس عام حکم میں معذور اور مریض افراد کے لیے رعایت بھی مقرر فرمائی ہے۔

فدیہ کی مقدار

اگر کوئی شخص بیماری یا کسی تکلیف، جیسے زخم، درد یا جوں وغیرہ کی وجہ سے سر منڈانے پر مجبور ہو جائے، تو اس کے لیے اجازت ہے کہ وہ سر منڈا کر فدیہ دے: ۱۔ تین روزے روزہ رکھ کر۔ ۲۔ یا چھ مسکینوں کو کھانا کھلائے، ہر ایک مسکین کو آدھا کھانے کا حصہ دے (یہ نصف صاع غلہ صدقۂ فطر کے برابر ہوگا)۔ ۳۔ یا ایک بکری ذبح کر دے۔ اس طرح مریض یا محصّر کے احکام حج وعمرہ مکمل ہوں گے اور شرعی کفارہ ادا ہو جائے گا۔

فقہ حنفی کے مطابق کچھ اہم مسائل

۱۔ جس شخص پر استطاعت ہے، اس پر حج فرض ہے۔ اگر استطاعت نہ رکھنے والا احرام باندھ لے تو اسے مکمل کرنا واجب ہے۔ عمرہ شروع کرنے پر بھی سنت مؤکدہ واجب نہیں، مگر اگر احرام باندھ لیا تو عمرہ پورا کرنا لازم ہو جاتا ہے۔

۲۔ اگر حج وعمرہ کسی عذر کی وجہ سے پورا نہ ہو سکے، جیسے راستے میں بدامنی یا بیماری، تو ایسے شخص کو چاہیے کہ کسی معتبر شخص سے کہے کہ وہ حدودِ حرم میں اس کی طرف سے ایک جانور قربان کرے۔ جب گمان غالب ہو کہ قربانی حدِ حرم میں مکمل ہو گئی، تب سر منڈایا یا بال کاٹے، اور احرام کھل جائے گا۔ اس حج یا عمرہ کو بعد میں قضا کرنا ہوگا۔

۳۔ سر منڈوانے یا تمام بال کاٹنے کا حکم صرف مردوں کے لیے ہے۔ عورتوں کے لیے صرف ایک انگلی کے بال کاٹنا کافی ہے، سر منڈانا حرام ہے۔

۴۔ اگر حج یا عمرہ کے بعد بیماری یا تکلیف کی وجہ سے سر منڈانے کی ضرورت پیش آئے، تو شخص کے لیے تین اختیارات ہیں: سر منڈا کر تین روزے رکھے، یا چھ مسکینوں کو کھانا دے (جس میں ایک مسکین کو صدقۂ فطر کے برابر حصہ دیا جائے)، یا ایک بکری قربان کرے اور مسکینوں میں تقسیم کرے، بشرطیکہ قربانی حدِ حرم میں کی جائے۔

یہ احکام ''محصّر''، یعنی جس نے حج یا عمرہ کا احرام باندھا مگر کسی مجبوری کی وجہ سے پورا نہ کر سکا، یا مریض ہو گیا، یا تکلیف کی وجہ سے سر منڈانا چاہتا ہو، کے لیے مخصوص ہیں۔

حج کی تین بنیادی قسمیں ہیں:

۱۔افراد: اس میں حج کے دنوں میں صرف حج ادا کیا جاتا ہے۔

۲۔تمتع: اس صورت میں پہلے عمرہ کا احرام باندھا جاتا ہے، عمرہ ادا کیا جاتا ہے، پھر دوبارہ حج کا احرام باندھ کر حج ادا کیا جاتا ہے۔

۳۔قران: اس میں عمرہ اور حج دونوں کے لیے ایک ہی احرام باندھا جاتا ہے، پہلے عمرہ ادا کیا جاتا ہے اور پھر اسی احرام سے حج مکمل کیا جاتا ہے۔

افراد، تمتع اور قِران میں قربانی کا حکم

۱۔تمتع اور قران میں ایک جانور ذبح کرنا واجب ہے اور یہ قربانی حدودِ حرم کے اندر انجام دی جائے۔ اگر کسی کے پاس قربانی کی قدرت نہ ہو، تو اسے دس روزے رکھنے ضروری ہیں اور تین روزے دسویں ذی الحجہ سے پہلے مکمل کیے جائیں اور سات روزے حج مکمل کرنے کے بعد رکھے جائیں، چاہے وطن واپس آ کر ہوں یا وہاں اور اگر دسویں ذی الحجہ سے پہلے تین روزے نہیں رکھ سکے، تو قربانی واجب ہو جاتی ہے۔

۲۔افراد حج: ہر شخص کے لیے جائز ہے مگر تمتع اور قران صرف ان افراد کے لیے جائز ہے جو میقات کے حدود سے باہر رہتے ہوں۔ میقات وہ خاص مقامات ہیں جہاں سے مکہ جانے والے افراد پر احرام باندھنا واجب ہے، چاہے حج ہو یا عمرہ۔

اللہ تعالیٰ نے اس آیت کے آخر میں واضح فرمایا کہ اس کے حکموں کی پابندی کرو اور یاد رکھو کہ اگر کوئی خلاف ورزی کرے تو اللہ کا عذاب سخت ہے اور وہ سخت سزا دینے والا ہے۔

❁❁❁

منیٰ میں مسجد خیف



منیٰ میں آگ پروف خیمے



مزدلفہ کی مسجد



عرفات میں مسجد نمرہ



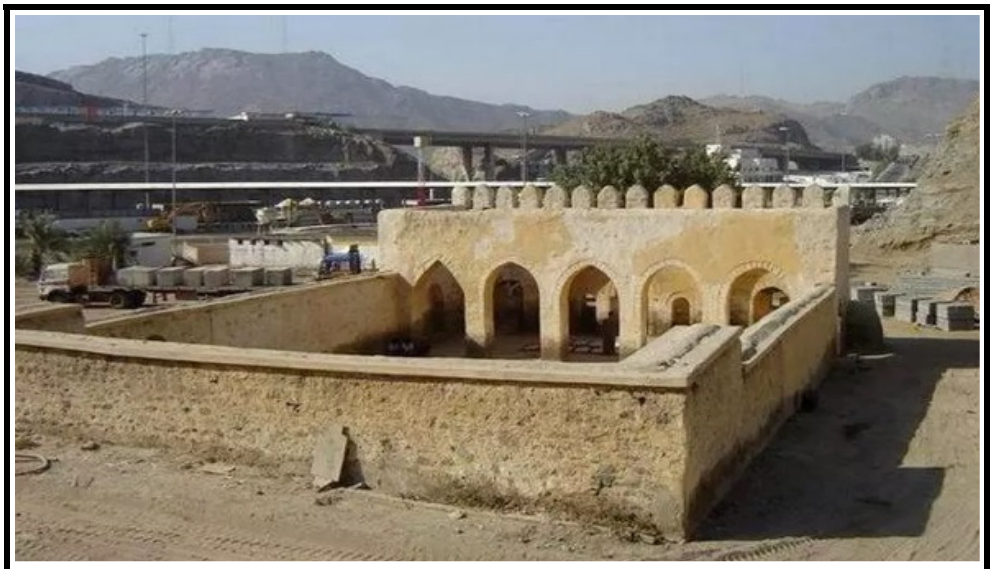
میدان عرفات



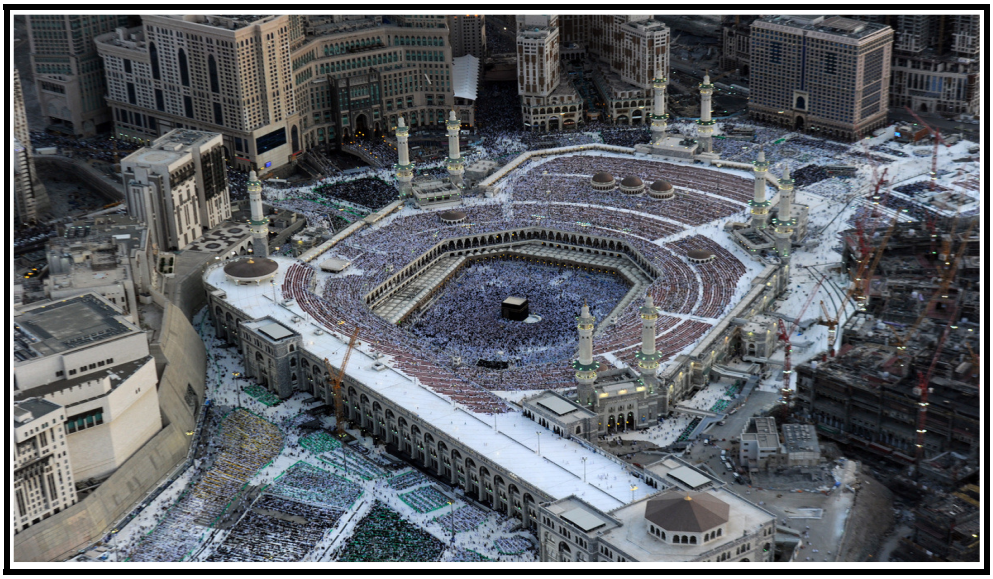
جبلِ رحمت



منیٰ میں مسجد بیعت عقبہ



مسجد حرام



ترجمہ- آیت نمبر ۱۹۷ سے ۲۰۷ تک

اَلْحَجُّ اَشْهُرٌ مَّعْلُوْمٰتٌ ۚ فَمَنْ فَرَضَ فِيْهِنَّ الْحَجَّ فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوْقَ ۙ وَلَا جِدَالَ فِي الْحَجِّ ۭ وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ يَّعْلَمْهُ اللّٰهُ ۭ وَتَزَوَّدُوْا فَاِنَّ خَيْرَ الزَّادِ التَّقْوٰى ۡ وَاتَّقُوْنِ يٰٓاُولِي الْاَلْبَابِ ۝۱۹۷ لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَبْتَغُوْا فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكُمْ ۭ فَاِذَآ اَفَضْتُمْ مِّنْ عَرَفٰتٍ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ عِنْدَ الْمَشْعَرِ الْحَرَامِ ۠ وَاذْكُرُوْهُ كَمَا هَدٰىكُمْ ۚ وَاِنْ كُنْتُمْ مِّنْ قَبْلِهٖ لَمِنَ الضَّاۗلِّيْنَ ۝۱۹۸ ثُمَّ اَفِيْضُوْا مِنْ حَيْثُ اَفَاضَ النَّاسُ وَاسْتَغْفِرُوا اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝۱۹۹ فَاِذَا قَضَيْتُمْ مَّنَاسِكَكُمْ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَذِكْرِكُمْ اٰبَاۗءَكُمْ اَوْ اَشَدَّ ذِكْرًا ۭ فَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا وَمَا لَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ ۝۲۰۰ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّقُوْلُ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِي الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ ۝۲۰۱ اُولٰۗىِٕكَ لَهُمْ نَصِيْبٌ مِّمَّا كَسَبُوْا ۭ وَاللّٰهُ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ۝۲۰۲ وَاذْكُرُوا اللّٰهَ فِيْٓ اَيَّامٍ مَّعْدُوْدٰتٍ ۭ فَمَنْ تَعَجَّلَ فِيْ يَوْمَيْنِ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ ۚ وَمَنْ تَاَخَّرَ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ ۙ لِمَنِ اتَّقٰى ۭ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ اِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ ۝۲۰۳ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُّعْجِبُكَ قَوْلُهٗ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَيُشْهِدُ اللّٰهَ عَلٰي مَا فِيْ قَلْبِهٖ ۙ وَهُوَ اَلَدُّ الْخِصَامِ ۝۲۰۴ وَاِذَا تَوَلّٰى سَعٰى فِي الْاَرْضِ لِيُفْسِدَ فِيْهَا وَيُهْلِكَ الْحَرْثَ وَالنَّسْلَ ۭ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الْفَسَادَ ۝۲۰۵ وَاِذَا قِيْلَ لَهُ اتَّقِ اللّٰهَ اَخَذَتْهُ الْعِزَّةُ بِالْاِثْمِ فَحَسْبُهٗ جَهَنَّمُ ۭ وَلَبِئْسَ الْمِهَادُ ۝۲۰۶ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْرِيْ نَفْسَهُ ابْتِغَاۗءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ ۭ وَاللّٰهُ رَءُوْفٌۢ بِالْعِبَادِ ۝۲۰۷

ترجمہ:

(۱۹۷)۔ حج کے مہینے مقرر ہیں، تو جو ان میں حج کا ارادہ کرے، اس کے لیے جائز نہیں کہ عورت سے مباشرت کرے، گناہ کرے، یا جھگڑا کرے حج کے دوران۔ اور جو تم نیکی کرو، اللہ اسے جانتا ہے۔ اور زادِ راہ لے کر چلو، اور بہترین زادِ راہ تقویٰ ہے، اور مجھ سے ڈرتے رہو اے عقل والو! (۱۹۸)۔ تم پر کوئی گناہ نہیں کہ تم اپنے رب کا فضل تلاش کرو (یعنی تجارت کرو)، پھر جب تم عرفات سے واپس آؤ تو مشعرِ حرام (مزدلفہ) میں اللہ کا ذکر کرو، اور اس طرح ذکر کرو جس طرح اس نے تمہیں ہدایت دی، اگرچہ تم پہلے گمراہوں میں سے تھے۔ (۱۹۹)۔ پھر تم وہیں سے واپس آؤ جہاں سے لوگ واپس آتے ہیں، اور اللہ سے مغفرت مانگو، بے شک اللہ بہت معاف کرنے والا، رحم کرنے والا ہے۔ (۲۰۰)۔ پھر جب تم حج کے مناسک پورے کر چکو، تو اللہ کو یاد کرو جیسے تم اپنے باپ دادا کو یاد کرتے تھے، بلکہ اس سے بھی بڑھ کر۔ کچھ لوگ ایسے بھی ہیں

جو کہتے ہیں: اے ہمارے رب! ہمیں دنیا میں دے، اور ان کے لیے آخرت میں کچھ حصہ نہیں۔(۲۰۱)۔اور ان میں سے کچھ لوگ ایسے ہیں جو (دعا کرتے ہیں:) اے ہمارے رب! ہمیں دنیا میں بھی بھلائی عطا فرما اور آخرت میں بھی بھلائی دے، اور ہمیں آگ کے عذاب سے بچا۔(۲۰۲)۔یہی لوگ ہیں جن کے لیے ان کے اعمال کے مطابق (نیکی کا) حصہ ہے، اور اللہ بہت جلد حساب لینے والا ہے۔(۲۰۳)۔اور اللہ کو یاد کرو مقررہ دنوں میں، پھر جو دو دن میں جلدی کر لے تو اس پر کوئی گناہ نہیں، اور جو تاخیر کرے، اس پر بھی کوئی گناہ نہیں، بشرطیکہ وہ تقویٰ اختیار کرے۔اور اللہ سے ڈرتے رہو اور خوب جان لو کہ تم سب کو اسی کی طرف جمع کیا جائے گا۔(۲۰۴)۔اور کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جن کی باتیں دنیا کی زندگی میں تمہیں خوشنما لگتی ہیں، اور وہ اپنے دل کی باتوں پر اللہ کو گواہ بناتے ہیں، حالانکہ وہ سخت جھگڑالو ہوتے ہیں۔(۲۰۵)۔اور جب وہ پیٹھ پھیر کر جاتا ہے (یعنی اختیار پاتا ہے) تو زمین میں فساد کی کوشش کرتا ہے، کھیتیاں اور نسلیں تباہ کرتا ہے، اور اللہ فساد کو پسند نہیں کرتا۔(۲۰۶)۔اور جب اس سے کہا جاتا ہے کہ ''اللہ سے ڈرو''، تو اس کو اس کا غرور گناہ پر آمادہ کرتا ہے، سو اس کے لیے جہنم کافی ہے، اور یقیناً وہ بہت برا ٹھکانا ہے۔(۲۰۷)۔اور کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو اللہ کی رضا حاصل کرنے کے لیے اپنی جان بیچ دیتے ہیں (یعنی قربان کر دیتے ہیں)، اور اللہ اپنے بندوں پر بہت مہربان ہے۔

تفسیر- آیت نمبر ۱۹۷ سے ۲۰۷ تک

آیت نمبر (۱۹۷) اَلْحَجُّ اَشْهُرٌ مَّعْلُوْمٰتٌ ۚ فَمَنْ فَرَضَ فِيْهِنَّ الْحَجَّ فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوْقَ ۙ وَلَا جِدَالَ فِي الْحَجِّ ۭ وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ يَّعْلَمْهُ اللّٰهُ ۭ وَتَزَوَّدُوْا فَاِنَّ خَيْرَ الزَّادِ التَّقْوٰى ۡ وَاتَّقُوْنِ يٰٓاُولِي الْاَلْبَابِ ۝۱۹۷

ترجمہ: ''حج کے مہینے مقرر ہیں، تو جو ان میں حج کا ارادہ کرے، اس کے لیے جائز نہیں کہ عورت سے مباشرت کرے، گناہ کرے، یا جھگڑا کرے حج کے دوران۔اور جو تم نیکی کرو، اللہ اسے جانتا ہے۔ اور زادِ راہ لے کر چلو، اور بہترین زادِ راہ تقویٰ ہے، اور مجھ سے ڈرتے رہو اے عقل والو!''۔

تفسیر حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں کہ اہلِ یمن حج کے لیے آتے تو زادِ راہ ساتھ نہ لاتے اور کہتے کہ ہم توکل کرنے والے ہیں۔اسی مناسبت سے اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔(بخاری رقم: ۱۵۲۳)

حج کا مہینہ

عرب میں ایامِ جاہلیت سے لے کر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تک یہی مہینے حج کے لیے مقرر رہے ہیں، یعنی یکم شوال

سے دسویں ذی الحجہ تک۔ حج کے احرام کے بعد جس شخص نے اپنا حج مقرر کرلیا، اس کے لیے جائز نہیں کہ وہ کسی غلطی، حکم عدولی یا جھگڑے میں مبتلا ہو۔ بلکہ اسے چاہیے کہ ہر وقت نیک کاموں میں مصروف رہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ ہر اچھے عمل سے آگاہ ہے اور اس کا بدلہ دے گا۔

حالتِ احرام میں پرہیز

۱۔ رفث یعنی عورتوں سے میل ملاپ، بے پردگی، غیر ضروری نظر لگانا، اور عورتوں سے بے حجابی کی گفتگو سب ممنوع ہیں۔ محرم یعنی احرام باندھنے والے کے لیے یہ سب کام حرام ہیں۔

۲۔ فسوق یعنی عام معنوں میں فسوق نافرمانی اور تمام گناہوں پر محیط ہے، مگر حالتِ احرام میں یہ خاص طور پر وہ کام ہیں جو احرام کی وجہ سے ناجائز ہو جاتے ہیں، جنہیں محبوراتِ احرام کہتے ہیں جیسے: ۱۔ بیوی کے ساتھ مباشرت یا اس سے متعلق تمام امور۔ ۲۔ خوشبو کا استعمال۔ ۳۔ بدن سے بال نکالنا یا ناخن کاٹنا۔ ۴۔ جانوروں کا شکار کرنا۔ ۵۔ سلے ہوئے کپڑے پہننا۔ ۶۔ مردوں کے لیے سر اور چہرہ ڈھانکنا منع ہے۔ ۷۔ عورتوں کے لیے چہرہ ڈھانکنا منع ہے، مگر سر ڈھانکنا جائز ہے۔

۳۔ جدال یعنی کسی بھی قسم کے جھگڑے یا بحث و تمحیص سے مکمل اجتناب کرنا، یعنی آپس میں لڑائی جھگڑا، فسوق اور گناہ ہر حال میں ناپسندیدہ ہیں، لیکن حالتِ احرام میں ان کا گناہ اور بھی بڑھ جاتا ہے۔ یہ تینوں چیزیں حج کے دوران سب سے زیادہ سامنے آتی ہیں اور انسان کو محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔

نوٹ: یہ تعلیمات بتاتی ہیں کہ احرام کی حالت میں انسان کو اپنی ہر حرکت میں تقویٰ اور پرہیزگاری اختیار کرنی چاہیے تاکہ حج کا عمل کامل اور مقبول ہو۔

حج کے لیے روانہ ہونے سے پہلے خرچ ساتھ رکھنا ضروری ہے تاکہ کسی کے سامنے ہاتھ پھیلانے کی ضرورت پیش نہ آئے اور عزت و وقار قائم رہے۔

تقویٰ اور اللہ کا خوف

آخر میں ہر معاملے میں اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہنے اور تقویٰ اختیار کرنے کی ہدایت دی گئی ہے۔ یہ حکم بار بار قرآن میں آیا ہے، چاہے وہ حلال و حرام کے مسائل ہوں، نکاح یا طلاق کے امور ہوں، جہاد و قتال کا بیان ہو، وصیت و وراثت کے قوانین ہوں، یتیم و مسکین کے مال و دولت کے احکام ہوں، قصاص کا ذکر ہو، یا روزہ، حج و عمرہ کی تعلیم ہو۔ ہر جگہ مسلمانوں کو اللہ سے ڈرتے رہنے اور پرہیزگاری اختیار کرنے کا درس دیا گیا ہے تاکہ تمام اعمال میں تقویٰ قائم رہے اور اللہ کی رضا حاصل ہو۔

آیت نمبر (۱۹۸) لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَبْتَغُوْا فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكُمْ ؕ فَاِذَآ اَفَضْتُمْ مِّنْ عَرَفٰتٍ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ عِنْدَ الْمَشْعَرِ الْحَرَامِ ۪ وَاذْكُرُوْهُ كَمَا هَدٰىكُمْ ۚ وَاِنْ كُنْتُمْ مِّنْ قَبْلِهٖ لَمِنَ الضَّآلِّيْنَ ﴿۱۹۸﴾

ترجمہ: ''تم پر کوئی گناہ نہیں کہ تم اپنے رب کا فضل تلاش کرو (یعنی تجارت کرو)، پھر جب تم عرفات سے واپس آؤ تو مشعرِ حرام (مزدلفہ) میں اللہ کا ذکر کرو، اور اس طرح ذکر کرو جس طرح اس نے تمہیں ہدایت دی، اگرچہ تم پہلے گمراہوں میں سے تھے''۔

تفسیر

حج میں تجارت

شریعت کے نزول سے پہلے جاہلیت کے زمانے میں عرب مشرکین نے عبادتوں اور حج کے اعمال کو بھی اپنے مفاد کے مطابق بدل رکھا تھا۔ حج کے موسم میں منیٰ میں مختلف جگہوں پر بازار لگائے جاتے اور لوگ اس موقع پر خوب تجارت کیا کرتے تھے۔

حضرت ابنِ عباسؓ فرماتے ہیں کہ زمانۂ جاہلیت میں ''عکاظ، مجنّہ، ذوالمجاز'' کے بازار لگتے تھے، اور لوگ دورانِ حج تجارت کو گناہ سمجھتے تھے، اس پر یہ آیت نازل ہوئی کہ یہ جائز ہے۔

حضرت عبدالرحمٰن بن عوامؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''حج اُس شخص کے لیے مکمل ہوا جو یومِ عرفہ کی رات طلوع فجر سے پہلے پہنچ جائے''۔

حضرت ابوقتادہؓ روایت کرتے ہیں کہ یومِ عرفہ کا روزہ پچھلے اور اگلے ایک سال کے گناہوں کا کفارہ ہے۔

حضرت عائشہؓ بیان کرتی ہیں کہ قریش اور ان کے اتباعی لوگ عرفات کے سوا مزدلفہ میں وقوف کیا کرتے تھے، جبکہ باقی عرب عرفات میں وقوف کرتے تھے۔ جب اسلام پھیلا، تو اللہ تعالیٰ نے نبی ﷺ کو حکم دیا کہ عرفات جائیں اور وہاں قیام کریں، پھر واپس مزدلفہ آئیں اور فرمایا: ''ثُمَّ اَفِيْضُوْا مِنْ حَيْثُ اَفَاضَ النَّاسُ'' یعنی جہاں سے لوگ واپس لوٹیں، تم بھی وہاں سے لوٹیں۔

جب رسول اللہ ﷺ نے پرانی رسوم ختم کیں تو بعض لوگوں کو یہ خیال ہوا کہ حج کے دوران تجارت یا مزدوری کرنا بھی جاہلیت کی پیداوار ہے، اس لیے شاید اسلام میں اس کی اجازت نہ ہو۔ ایک شخص حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے پاس آیا اور سوال کیا کہ ہمارا پیشہ پہلے سے یہ ہے کہ ہم اونٹ کرائے پر چلاتے ہیں، بعض لوگ ہمارے اونٹ حج کے لیے کرائے پر لیتے ہیں اور ہم ان کے ساتھ جاتے ہیں، کیا ایسا کرنے سے ہمارا حج صحیح ہوگا؟

حضرت عبداللہ بن عباس ؓ فرماتے ہیں کہ اس شخص کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حضور پیش کیا گیا، اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ابتدائی طور پر جواب نہیں دیا، یہاں تک کہ یہ حکم نازل ہوا: ''لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَبْتَغُوْا فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكُمْ''۔ (سنن ابوداؤد رقم: ۱۷۳۴) اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ تمہارا حج صحیح ہے۔

اس حکم سے واضح ہوا کہ دورانِ حج کوئی خرید وفروخت، مزدوری یا تجارت کر کے نفع حاصل کرنا جائز ہے اور اس میں کوئی گناہ نہیں۔ البتہ یہ بہتر ہے کہ خاص طور پر وہ پانچ دن جو مناسکِ حج کے لیے مخصوص ہیں، مکمل عبادت وذکرِ الٰہی میں گزارے جائیں اور اس دوران تجارت یا مزدوری سے پرہیز کیا جائے تاکہ اخلاص قائم رہے۔

آیت میں لفظ ''فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكُمْ'' یہ بھی واضح کرتا ہے کہ جو رزق یا نفع انسان کو حاصل ہوتا ہے، وہ صرف اپنی محنت کا نتیجہ نہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ کی فضل ورحمت سے عطا ہوا ہے۔

عرفات اور مزدلفہ میں قیام

جب تم عرفات میں قیام کر کے واپس لوٹنے لگو تو ''مشعر حرام'' کے نزدیک یعنی مزدلفہ میں رات گزارو اور اللہ تعالیٰ کو یاد کرو۔ یاد کرنے کے طریقے میں اپنی رائے شامل نہ کرو بلکہ اسی انداز میں اللہ کو یاد کرو جس طرح تمہیں اللہ تعالیٰ نے بتلایا ہے، کیونکہ حقیقت میں اس سے پہلے تم اس طریقہ سے ناواقف تھے۔

یہاں احکامِ حج کے ضمن میں واضح کیا گیا ہے کہ عرفات سے واپسی میں رات کو مزدلفہ میں قیام اور اللہ کا ذکر کرنا واجب ہے۔ عرفات بیت اللہ سے تقریباً ۲۵ کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے، اور یہ وسیع رقبے پر محیط ہے۔ حجاج کا اس میدان میں ۹ ذی الحجہ کو پہنچنا اور زوالِ آفتاب سے مغرب تک قیام کرنا حج میں فرض ہے اور اس کے فوت ہونے پر نہ کوئی کفارہ ہے اور نہ فدیہ۔

مقامِ عرفات میں ایک پہاڑی بھی ہے جس کا نام جبلِ رحمت ہے اور اس کے نیچے بڑے کالے پتھر ہیں جن کے قریب حجۃ الوداع میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کھڑے ہوتے تھے۔ پورے سال یہ میدان خالی رہتا ہے، مگر ۹ ذی الحجہ کو یہاں حاجیوں کی آمد سے لاکھوں افراد کا اجتماع ہو جاتا ہے۔

حج کے پانچ دن اور عبادت کے احکام

حجاج ۸ ذی الحجہ کی ظہر سے پہلے تک مکہ معظّمہ سے منیٰ پہنچ جاتے ہیں۔ منیٰ بیت اللہ سے چند کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے اور یہ حدودِ حرم میں شامل ہے۔ یہاں پانچ نمازیں ادا کی جاتی ہیں: ۸ ذی الحجہ کی ظہر، عصر، مغرب، عشاء اور ۹ ذی الحجہ کی فجر۔

۹ ذی الحجہ کو طلوعِ آفتاب کے بعد حاجی منیٰ سے عرفات روانہ ہوتے ہیں اور زوال سے قبل عرفات کے میدان میں پہنچ کر سورج غروب ہونے تک قیام کرتے ہیں۔ اس قیام کے دوران حجاج تلاوتِ قرآن، ذکرِ الٰہی، حمد وثنا، تسبیح و تحمید، درود شریف، توبہ، استغفار اور عاجزی کے ساتھ دعاوں میں مشغول رہتے ہیں۔ سورج غروب ہوتے ہی مغرب کی نماز کے لئے عرفات چھوڑنا لازم ہے، کیونکہ عرفات میں مغرب اور عشاء کی نمازیں نہیں پڑھیں جاتیں بلکہ یہ دونوں نمازیں مزدلفہ میں ادا کی جاتی ہیں۔

مزدلفہ، جسے **اَلْمَشْعَرُ الْحَرَام** بھی کہتے ہیں، حدودِ حرم میں ہے اور بیت اللہ سے چند کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔ لفظ مشعر کے معنیٰ ہیں شعار یا علامت اور حرام کے معنیٰ ہیں محترم ومقدس۔ یہاں رات گزارنا اور مغرب وعشاء کی نمازیں ایک ساتھ پڑھنا واجب ہے۔

مزدلفہ کی رات حجاج کے لیے بہت افضل ہے۔ اس رات اللہ تعالیٰ کی یاد، توبہ، استغفار، ذکرِ الٰہی اور دعاوں میں گزاری جاتی ہے۔ صبح صادق کے بعد فجر ادا کر کے حجاج منیٰ کی واپسی کے لیے روانہ ہوتے ہیں۔ آیت میں حکم دیا گیا کہ اللہ تعالیٰ کو اسی طریقے سے یاد کرو جس طرح اسے سکھایا گیا ہے، یعنی اپنی رائے یا قیاس شامل نہ کرو۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ مغرب اور عشاء کی نمازیں اس مقام پر ایک ساتھ ادا کی جائیں۔

عبادت کے آداب

ہر عبادت کے خاص آداب ہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بتائے اور سکھائے۔ اپنی طرف سے عبادت کو تبدیل کرنا یا نئی شکل دینا سخت گناہ ہے۔ دنیا اور شیطان کا سب سے بڑا حملہ یہی ہے کہ انسان کو حقیقی عبادت سے ہٹا کر من گڑھت طریقوں میں الجھا دیا جائے۔

جاہلیت کے زمانے میں لوگ بے شمار رسم ورواج اور غلط عقائد میں الجھے ہوئے تھے اور یہ سمجھتے تھے کہ اپنے بنائے ہوئے مخصوص طریقے اللہ کے قرب کا سبب بن سکتے ہیں۔ مگر قرآن کی اس آیت نے پوری طرح اس غلط فہمی کو دور کیا اور واضح فرمایا کہ تم پہلے اس حقیقت سے ناواقف تھے۔

قرآن کریم نے یہ بھی واضح کیا کہ جب تک انسان اللہ کی دی ہوئی روشنی اور ہدایت سے کام نہ لے، اس کی بھیجی ہوئی وحی پر عمل نہ کرے اور رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بتلائے ہوئے طریقے اپنانے سے گریز کرے، وہ ہمیشہ بھٹکتا رہے گا۔

آیت نمبر (۱۹۹) ثُمَّ اَفِيْضُوْا مِنْ حَيْثُ اَفَاضَ النَّاسُ وَاسْتَغْفِرُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۹۹﴾

ترجمہ: ’’ پھر تم وہیں سے واپس آؤ جہاں سے لوگ واپس آتے ہیں، اور اللہ سے مغفرت مانگو، بے شک اللہ بہت معاف کرنے والا، رحم کرنے والا ہے‘‘۔

تفسیر

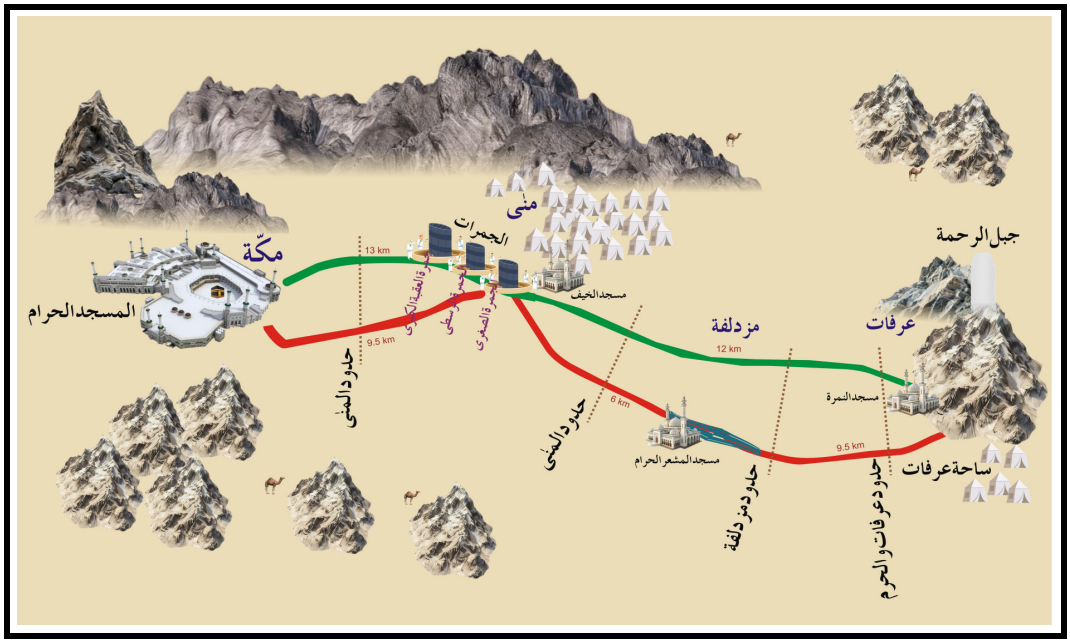
حج کے بعد ذکر کا حکم

اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں حج کی عظیم عبادت کے مکمل ہونے کے بعد اللہ کے ذکر اور شکر کا حکم دیا ہے۔ جب اللہ کی توفیق سے یہ عظیم فریضہ پورا ہو جائے تو اس کا شکر بجالانا واجب ہے۔

زمانۂ جاہلیت میں لوگ مزدلفہ سے منیٰ واپسی کے بعد جمرہ کے مقام پر میلہ لگاتے اور اپنے آباؤ اجداد کی شان میں قصیدے پڑھا کرتے تھے۔ لیکن صحیح بات یہ تھی کہ اس وقت انسان کو اللہ کی یاد میں غرق ہونا چاہیے تھا۔ اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کی اصلاح فرمائی اور انہیں یہ تعلیم دی کہ صرف اللہ ہی کا ذکر اور شکر بجا آئے، کیونکہ عبادت اور شکر کا حقیقی حق صرف اللہ تعالیٰ ہی کو حاصل ہے۔

لہٰذا، کنکری مارنے، قربانی کرنے، بال منڈوانے، طوافِ زیارت اور صفا و مروہ کی سعی مکمل کرنے کے بعد حجاج کو چاہیے کہ وہ منیٰ میں قیام کرتے ہوئے اللہ کے ذکر اور شکر میں مشغول رہیں اور اس عظیم عبادت کی تکمیل پر اللہ کی حمد و ثنا ادا کریں۔

حج کا نقشہ ایک نظر میں



آیت نمبر(۲۰۰) فَاِذَا قَضَيْتُمْ مَّنَاسِكَكُمْ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَذِكْرِكُمْ اٰبَآءَكُمْ اَوْ اَشَدَّ ذِكْرًا ؕ فَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا وَمَا لَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ ﴿۲۰۰﴾

ترجمہ: ''پھر جب تم حج کے مناسک پورے کر چکو، تو اللہ کو یاد کرو جیسے تم اپنے باپ دادا کو یاد کرتے تھے، بلکہ اس سے بھی بڑھ کر۔ کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو کہتے ہیں: اے ہمارے رب! ہمیں دنیا میں دے، اور ان کے لیے آخرت میں کچھ حصہ نہیں''۔

تفسیر حضرت ابن ابی حاتم نے حضرت ابن عباسؓ سے روایت کیا ہے کہ زمانۂ جاہلیت میں لوگ حج کے موقع پر کھڑے ہو کر اپنے آباء واجداد کے کارناموں کا ذکر کیا کرتے تھے۔ ہر شخص یہ بیان کرتا کہ میرا باپ لوگوں کو کھانا کھلاتا تھا، سواری کراتا تھا یا دوسروں کی طرف سے دیے جانے والے مال و دولت کی ادائیگی کرتا تھا۔ اس دوران اللہ تعالیٰ کی ذات اور اس کے احکام کا کوئی ذکر نہ ہوتا۔

اسی حالت کے پیش نظر یہ آیت کریمہ نازل ہوئی کہ جب تم اپنے اعمالِ حج پورے کر لو تو اللہ تعالیٰ کا خوب ذکر کیا کرو، تاکہ عبادت کا مقصد صرف پیش رووں کی تعریف نہ بن جائے بلکہ اللہ کی یاد اور شکر گزاری میں شامل ہو۔

دعا کی قبولیت

استغفار اور کثرتِ ذکر کے بعد اللہ تعالیٰ نے دعا کی طرف بھی توجہ دلائی، کیونکہ ذکر کے بعد دعا کی قبولیت کی امید زیادہ ہوتی ہے۔ اس آیت میں ان لوگوں کی مذمت کی گئی ہے جن کی زندگی کا محور صرف دنیا کی بھلائی اور فائدہ حاصل کرنا ہو، اور ان کی تعریف کی گئی ہے جن کا مقصد آخرت کی کامیابی اور جہنم کی آگ سے نجات حاصل کرنا ہو۔

حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ کچھ اعرابی لوگ عرفات میں اللہ تعالیٰ سے صرف دنیاوی فوائد کی طلب کرتے تھے اور آخرت کو فراموش کر دیتے تھے۔ بعض مفسرین نے کہا کہ مشرکینِ عرب ایسا کرتے تھے، اور بعض نے فرمایا کہ کچھ مسلمان بھی دنیا سنوارنے کی دعا کرتے تھے اور آخرت کو بھلا دیتے تھے۔ یہی سبب تھا کہ یہ آیت نازل ہوئی تاکہ واضح ہو جائے کہ دنیاوی خواہشات کے ساتھ آخرت کی نجات کو نظر انداز کرنے والوں کو آخرت میں کامیابی نصیب نہیں ہوگی، البتہ اگر وہ سچی توبہ کریں تو اللہ تعالیٰ انہیں معاف فرما دے گا۔

آیت نمبر(۲۰۱) وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّقُوْلُ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِي الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ ﴿۲۰۱﴾

ترجمہ: ''اور ان میں سے کچھ لوگ ایسے ہیں جو (دعا کرتے ہیں) اے ہمارے رب! ہمیں دنیا میں بھی بھلائی عطا فرما اور آخرت میں بھی بھلائی دے، اور ہمیں آگ کے عذاب سے بچا''۔

تفسیر ابنِ حاتمؒ نے حضرت ابن عباسؓ سے روایت کی ہے کہ عربوں کی ایک جماعت 'وقوفِ عرفات' کی جگہ پر آتی اور اللہ تعالیٰ سے دعائیں کرتی کہ اے اللہ! اس سال ہمارے لیے بارش، سبزہ و شادابی اور خوبصورتی عطا فرما، لیکن وہ آخرت کی کسی بھی نعمت کا ذکر نہیں کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے بارے میں یہ آیت نازل فرمائی کہ: ''کچھ لوگ صرف دنیا کی طلب رکھتے ہیں، ایسے لوگوں کے لیے آخرت میں کوئی حصہ نہیں''۔ اس کے بعد ایک دوسری جماعت مؤمنوں کی آتی اور وہ اللہ تعالیٰ سے حقیقی دعا مانگتی۔

رَبَّنَآ اٰتِنَا فِی الدُّنۡیَا حَسَنَۃً وَّفِی الۡاٰخِرَۃِ حَسَنَۃً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ ﴿۲۰۱﴾ **(لباب النقول فی اسباب النزول)**

دنیا و آخرت کے لیے دعا

اس دعا میں دنیا اور آخرت کی ہر بھلائی شامل کر دی گئی ہے اور ہر قسم کے شر سے اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگی گئی ہے۔ ''دنیا کی بھلائی'' میں ہر قسم کی دنیاوی نیکی شامل ہے اور ''آخرت کی بھلائی'' میں سب سے اعلیٰ چیز اللہ کی رضا اور جنت میں داخلہ ہے۔ احادیث میں اس دعا کی بے پناہ فضیلت بیان ہوئی ہے۔

● امام بخاریؒ نے حضرت انس بن مالکؓ سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کثرت سے یہ دعا کیا کرتے تھے۔ **(بخاری، رقم: ۶۳۸۹)**

● اسی طرح، سنن ابوداؤد میں ذکر ہے کہ رسول اللہ ﷺ ''رکن یمانی'' اور ''حجر اسود'' کے درمیان یہی دعا کیا کرتے تھے۔ **(ابوداؤد، رقم: ۱۸۹۲)**

● امام احمدؒ اور امام مسلمؒ نے حضرت انس بن مالکؓ سے روایت کیا ہے کہ آپ ﷺ نے ایک مریض کی عیادت کی جو شدید کمزوری اور سوکھن کی حالت میں تھا، اور آپ ﷺ نے اسے یہی دعا کرنے کی نصیحت فرمائی۔ اس نے اسی دعا پر عمل کیا اور اللہ تعالیٰ نے اس کی بیماری دور کر دی۔

آیت نمبر (۲۰۲) اُولٰٓئِکَ لَہُمۡ نَصِیۡبٌ مِّمَّا کَسَبُوۡا ؕ وَاللّٰہُ سَرِیۡعُ الۡحِسَابِ ﴿۲۰۲﴾

ترجمہ: ''یہی لوگ ہیں جن کے لیے ان کے اعمال کے مطابق (نیکی کا) حصہ ہے، اور اللہ بہت جلد حساب لینے والا ہے''۔

تفسیر اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے کہ جو لوگ دنیا و آخرت کی کامیابی کی دعا کرتے ہیں اللہ تعالیٰ اُن کی دعا قبول کرتا ہے اور اگر پوری دعا قبول نہیں ہوتی تو اس کا ایک حصہ ضرور انہیں ملتا ہے۔ آیت میں ''کَسَبُوْا'' سے مراد دعا کرنا ہے۔

آیت نمبر (۲۰۳) وَاذْكُرُوا اللّٰهَ فِيْٓ اَيَّامٍ مَّعْدُوْدٰتٍ ۭ فَمَنْ تَعَجَّلَ فِيْ يَوْمَيْنِ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ ۚ وَمَنْ تَاَخَّرَ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ ۙ لِمَنِ اتَّقٰى ۭ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ اِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ ۝۲۰۳

ترجمہ: ''اور اللہ کو یاد کرو مقررہ دنوں میں، پھر جو دو دن میں جلدی کر لے تو اس پر کوئی گناہ نہیں، اور جو تاخیر کرے، اس پر بھی کوئی گناہ نہیں، بشرطیکہ وہ تقویٰ اختیار کرے۔ اور اللہ سے ڈرتے رہو اور خوب جان لو کہ تم سب کو اسی کی طرف جمع کیا جائے گا''۔

تفسیر

ایام تشریق میں تکبیر کا حکم

اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں مسلمانوں کو ہدایت دی کہ چند دنوں میں اس کا ذکر کریں۔ یہ چند دن، جو ایامِ تشریق کہلاتے ہیں، وہی ہیں جن میں قربانیاں کی جاتی ہیں اور حجاج منیٰ میں قیام کرتے ہیں اور جمرہ کو کنکریاں مارتے ہیں۔ اس سے قبل، مزدلفہ میں ذکر اور عرفات میں دعا و تلاوت کی تاکید فرمائی گئی ہے۔

حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''جمرہ کو کنکریاں مارنا اور صفا و مروہ کی سعی کرنا اللہ کے ذکر کو قائم رکھنے کے لیے شروع کیا گیا۔'' **(سنن ابوداؤد، رقم: ۱۸۸۸)**

تفسیر معالم التنزیل میں بھی لکھا ہے کہ ذکر یعنی تکبیر کہی جائے۔ حضرت عمرؓ اور حضرت عبداللہ بن عمرؓ نمازوں کے بعد، مجلس میں، بستر پر اور راستے میں بھی منیٰ میں تکبیر کہا کرتے تھے۔

فرض نمازوں کے بعد تکبیر تشریق

ایامِ تشریق میں، چاہے انسان منیٰ میں ہو یا اپنے وطن میں، فرض نمازوں کے بعد تکبیر پڑھنا واجب ہے۔ مرد حضرات زور سے اور عورتیں آہستہ آواز میں تکبیر کہیں گی۔ یہ تکبیر نویں ذی الحجہ کی فجر سے تیرھویں ذی الحجہ کی عصر تک پڑھی جائے گی۔

حضرت نبیشہ ہذلیؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ ان دنوں میں روزہ نہ رکھا جائے کیونکہ یہ دن کھانے پینے اور اللہ کے ذکر کے ہیں۔ **(صحیح مسلم، رقم: ۱۱۴۱)**

رمی جمار کا حکم

ذکر کے بعد رمی جمار کے بعض مسائل بیان کیے گئے ہیں۔ دسویں ذی الحجہ کو صرف بڑے جمرہ کی رمی واجب

ہے، جس کا وقت سورج نکلنے کے بعد سے اگلی صبح صادق تک ہے، اور رات میں رمی کرنا صحت مند افراد کے لیے مکروہ ہے۔ گیارہ اور بارہ ذی الحجہ کو کنکریاں مارنے کا وقت زوال آفتاب کے بعد سے اگلی صبح صادق تک ہے، اور رات میں رمی کرنا مکروہ ہے۔ گیارھویں اور بارھویں تاریخ کو تینوں جمرات کی رمی کی جاتی ہے۔ دس، گیارہ اور بارہ ذی الحجہ کو رمی کرنا واجب ہے، اور منیٰ میں تین نشان بنے ہیں جنہیں جمرات کہتے ہیں۔

منیٰ میں تین جمرات ہیں: پہلا جمرہ مسجدِ خَیف کے قریب واقع ہے جسے ''جمرۂ اولیٰ'' یا ''جمرۂ صغریٰ'' کہتے ہیں، دوسرا جمرہ ''جمرۂ وسطیٰ'' کہلاتا ہے، اور تیسرا جمرہ ''جمرۂ کبریٰ''، ''جمرۂ اخریٰ'' یا ''جمرۂ عقبیٰ'' کہلاتا ہے۔ انہی تین جگہوں پر کنکریاں ماری جاتی ہیں۔ یہ عمل حضرت ابراہیمؑ کی سنت ہے، جنہوں نے شیطان کی وسوسوں کو ناکام بنانے کے لیے یہاں کنکریاں ماری تھیں اور یہی رمی آج تک یادگار ہے۔

کنکریاں مارنے کے وقت پڑھا جانے والا کلام یہ ہے: ''بِسْمِ اللّٰهِ، اللّٰهُ اَكْبَر، رَغْمًا لِلشَّيْطَانِ وَ رِضًا لِلرَّحْمٰنِ''۔

یعنی: ''میں اللہ کے نام سے یہ رمی کرتا ہوں، اللہ سب سے بڑا ہے، یہ عمل شیطان کو ذلیل کرنے اور اللہ تعالیٰ کو راضی کرنے کے لیے ہے''۔

گیارہ اور بارہ ذی الحجہ کی رمی کے بعد اگر کوئی شخص چاہے کہ منیٰ چھوڑ دے اور تیرھویں کی رمی نہ کرے، تو اس کی اجازت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''فَمَنْ تَعَجَّلَ فِي يَوْمَيْنِ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ''۔

لیکن افضل یہ ہے کہ حجاج منیٰ میں قیام کریں اور تیرھویں تاریخ کی رمی بھی کریں، جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حجۃ الوداع کے موقع پر کی تھی۔ گیارہ اور بارہ کی رمی کا وقت زوالِ آفتاب کے بعد سے اگلی صبح صادق تک ہے، جبکہ تیرھویں کی رمی صرف غروب آفتاب تک مخصوص ہے۔

فقہا نے بیان کیا ہے کہ اگر بارھویں تاریخ کو منیٰ میں سورج غروب ہو جائے تو تیرھویں کی رمی چھوڑ دینا مکروہ ہے، اور اگر منیٰ میں رہتے ہوئے صبح ہو جائے تو تیرھویں کی رمی واجب ہو جاتی ہے۔ جو شخص گیارہ اور بارہ کی رمی کر کے منیٰ میں ٹھہرتا اور تیرھویں کی رمی کر کے روانہ ہوتا ہے، اس پر بھی کوئی گناہ نہیں۔

صاحبِ روح المعانی لکھتے ہیں کہ لفظ ''فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ'' دونوں مقامات پر اختیار دینے کے لیے استعمال ہوا ہے: دسویں کے بعد دو دن کی رمی کر کے جانے والا بھی، اور تیسرے دن کی رمی کے لیے ٹھہرا ہوا بھی، دونوں کو اختیار حاصل ہے۔ اس سے زمانۂ جاہلیت کے اختلافات کی تردید کی گئی، جب لوگ جلدی کرنے یا دیر کرنے میں گناہ سمجھتے تھے۔

صاحبِ معالم التنزیل نے بعض حضرات کی روایات نقل کرتے ہوئے واضح کیا ہے کہ حج کرنے والے پر

کوئی گناہ باقی نہیں رہتا، بشرطیکہ اس حج میں تقویٰ اختیار کیا گیا ہو۔ حضرت علیؓ اور حضرت ابنِ مسعودؓ کا قول بھی اسی معنیٰ کی تصدیق کرتا ہے: ''إنما جُعلت مغفرة الذنوب لمن اتقى الله تعالى فى حجه'' عنی جو شخص حج میں اللہ تعالیٰ کا تقویٰ اختیار کرے، اس کے گناہ معاف ہو جاتے ہیں۔

لِمَنِ اتَّقٰى کی تفسیر سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ یہ تقویٰ صرف حج تک محدود نہیں، بلکہ باقی عمر میں بھی گناہوں سے بچنے کی ہدایت ہے۔

آیت نمبر (۲۰۴) وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُّعْجِبُكَ قَوْلُهٗ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَيُشْهِدُ اللّٰهَ عَلٰى مَا فِيْ قَلْبِهٖ ۙ وَهُوَ اَلَدُّ الْخِصَامِ ﴿۲۰۴﴾

ترجمہ: ''اور کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جن کی باتیں دنیا کی زندگی میں تمہیں خوشنما لگتی ہیں، اور وہ اپنے دل کی باتوں پر اللہ کو گواہ بناتے ہیں، حالانکہ وہ سخت جھگڑالو ہوتے ہیں''۔

تفسیر حضرت ابنِ جریر نے سدی کے حوالے سے روایت کی ہے کہ یہ آیت 'اخنس بن شریک' کے بارے میں نازل ہوئی تھی، جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس آ کر اپنا مسلمان ہونے کا اعلان کرتا تھا، حالانکہ دل سے کافر تھا۔

اسی طرح، حضرت ابنِ عباسؓ کی روایت کے مطابق یہ آیت منافقین کی ایک جماعت کے بارے میں نازل ہوئی تھی، جنہوں نے حضرت خبیبؓ اور ان کے ساتھیوں کا مذاق اُڑایا۔ بہرحال مشہور قاعدے کے مطابق قرآن وسنت کی تعلیمات ہر دور اور ہر حالت کے لیے صادق ہیں، نہ کہ صرف کسی خاص واقعے کے لیے۔

یہ آیت ہر اُس شخص پر صادق آتی ہے جو اسلام کے عقیدے کو صحیح طور پر قبول نہیں کرتا، لیکن دنیاوی مفادات کے لیے اپنی مسلمان ہونے کی ظاہر سازی کرتا ہے۔

آیت کا مفہوم یہ ہے کہ کچھ منافقین ایسے ہوتے ہیں جو مسلمانوں کو خوش کرنے کے لیے چکنی چپڑی باتیں کرتے ہیں اور اللہ کو اپنے بارے میں گواہ بناتے ہیں، حالانکہ وہ جھوٹ کو سچ ثابت کرنے کی ہر ممکن کوشش کرتے ہیں۔ جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''منافق کی تین نشانیاں ہیں: جب بات کرے تو جھوٹ بولے، جب وعدہ کرے تو دھوکہ دے، اور جب جھگڑا کرے تو گالیاں بکنے لگے''۔ **(بخاری، رقم: ۳۳)**

آیت نمبر (۲۰۵) وَاِذَا تَوَلّٰى سَعٰى فِي الْاَرْضِ لِيُفْسِدَ فِيْهَا وَيُهْلِكَ الْحَرْثَ وَالنَّسْلَ ۭ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الْفَسَادَ ﴿۲۰۵﴾

ترجمہ: ''اور جب وہ پیٹھ پھیر کر جاتا ہے (یعنی اختیار پاتا ہے) تو زمین میں فساد کی کوشش کرتا ہے، کھیتیاں اور نسلیں تباہ کرتا ہے، اور اللہ فساد کو پسند نہیں کرتا''۔

تفسیر یعنی جب مسلمان کسی غیر مسلم کے پاس جاتا ہے تو اس کی سازشیں ظاہر ہو جاتی ہیں اور ایمان کے بارے میں لوگوں کے دلوں میں شک پیدا ہوتا ہے۔ وہ کفر کی مضبوطی کے لیے منصوبے بناتا ہے اور مسلمانوں کی ہر قسم کی تباہی کی فکر میں رہتا ہے، خواہ وہ کھیتی ہو یا جانوروں کی ہلاکت۔

سیدہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ ناپسندیدہ لوگ وہ ہیں جو جھگڑا کرنے والے ہیں''۔ **(بخاری، رقم: ۲۴۵۷)**

آیت نمبر (۲۰۶) وَاِذَا قِيْلَ لَهُ اتَّقِ اللّٰهَ اَخَذَتْهُ الْعِزَّةُ بِالْاِثْمِ فَحَسْبُهٗ جَهَنَّمُ ؕ وَلَبِئْسَ الْمِهَادُ ﴿۲۰۶﴾

ترجمہ: ''اور جب اس سے کہا جاتا ہے کہ اللہ سے ڈرو، تو اس کو اس کا غرور گناہ پر آمادہ کرتا ہے، سو اس کے لیے جہنم کافی ہے، اور یقیناً وہ بہت برا ٹھکانا ہے''۔

تفسیر یعنی جب اس فاجر سے کہا جائے کہ اللہ سے ڈرو اور اپنے افعال و اقوال میں اختلافات سے باز آؤ، تو اس کے غرور کا پٹاخہ پھٹ پڑتا ہے اور وہ نصیحت قبول نہیں کرتا۔ اللہ تعالیٰ نے ایسے لوگوں کا انجام واضح فرمایا ہے: ان کے کفر، نفاق اور غرور کے بدلے جہنم ہی ان کے لیے کافی ہے، جو انتہائی برا ٹھکانہ ہے۔ حاکم نے لکھا ہے کہ سب سے بڑا گناہ یہ ہے کہ کسی سے کہا جائے ''اللہ سے ڈرو'' اور وہ جواب دے کہ ''تم اپنی فکر کرو''۔

آیت نمبر (۲۰۷) وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْرِيْ نَفْسَهُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ رَءُوْفٌۢ بِالْعِبَادِ ﴿۲۰۷﴾

ترجمہ: ''اور کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو اللہ کی رضا حاصل کرنے کے لیے اپنی جان بیچ دیتے ہیں (یعنی قربان کر دیتے ہیں)، اور اللہ اپنے بندوں پر بہت مہربان ہے''۔

تفسیر

مؤمنوں کی صفات

منافقین کی صفات بیان کرنے کے بعد، مؤمن صالحین کی صفات بیان کی جا رہی ہیں تاکہ انسان منافقین کی برائیوں سے بچے اور صالحین کی نیک خصوصیات اپنے اندر پیدا کرے۔

حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ یہ آیت حضرت صہیب رومی کے بارے میں نازل ہوئی تھی۔ جب وہ مکہ سے ہجرت کر رہے تھے، کفارِ قریش نے انہیں گھیر لیا اور کہا کہ اپنا مال ساتھ نہیں لے جا سکتے۔ اگر مال چھوڑ دو تو جا سکتے ہو۔ حضرت صہیبؓ نے اپنی ساری جائداد اہلِ مکہ کے حوالے کر دی اور صرف ایمان لے کر مدینہ کے لیے روانہ ہوئے۔ ان کے مدینہ پہنچنے سے پہلے ہی یہ آیت نازل ہوئی۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انہیں دیکھا تو فرمایا: 'ربیعہ، ربیعہ، ربیعہ، ربیعہ'۔ **(مستدرک حاکم، طبقات ابن سعد)**

یہاں بھی وہی اصول لاگو ہوتا ہے کہ قرآن وسنت کی تعلیمات عام حالات کے لیے ہیں، نہ کہ صرف کسی خاص واقعے کے لیے۔ لہٰذا یہ آیت مجاہد فی سبیل اللہ کے لیے ہے، جو اللہ کی رضا کے لیے اپنی جان و مال کی قربانی پیش کرتا ہے۔

❁❁❁

ترجمہ- آیت نمبر ۲۰۸ سے ۲۱۵ تک

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِي السِّلْمِ كَآفَّةً ۠ وَّلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ ؕ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ﴿۲۰۸﴾ فَاِنْ زَلَلْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْكُمُ الْبَيِّنٰتُ فَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿۲۰۹﴾ هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّاْتِيَهُمُ اللّٰهُ فِيْ ظُلَلٍ مِّنَ الْغَمَامِ وَالْمَلٰٓئِكَةُ وَقُضِيَ الْاَمْرُ ؕ وَاِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ ﴿۲۱۰﴾ سَلْ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ كَمْ اٰتَيْنٰهُمْ مِّنْ اٰيَةٍۭ بَيِّنَةٍ ؕ وَمَنْ يُّبَدِّلْ نِعْمَةَ اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُ فَاِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ﴿۲۱۱﴾ زُيِّنَ لِلَّذِيْنَ كَفَرُوا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا وَيَسْخَرُوْنَ مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۘ وَالَّذِيْنَ اتَّقَوْا فَوْقَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ وَاللّٰهُ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ ﴿۲۱۲﴾ كَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً ۟ فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ ۪ وَاَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيْمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ ؕ وَمَا اخْتَلَفَ فِيْهِ اِلَّا الَّذِيْنَ اُوْتُوْهُ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ بَغْيًۢا بَيْنَهُمْ ۚ فَهَدَى اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ مِنَ الْحَقِّ بِاِذْنِهٖ ؕ وَاللّٰهُ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۲۱۳﴾ اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَاْتِكُمْ مَّثَلُ الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ ؕ مَسَّتْهُمُ الْبَاْسَآءُ وَالضَّرَّآءُ وَزُلْزِلُوْا حَتّٰى يَقُوْلَ الرَّسُوْلُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ مَتٰى نَصْرُ اللّٰهِ ؕ اَلَآ اِنَّ نَصْرَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ ﴿۲۱۴﴾ يَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ ۬ ؕ قُلْ مَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ خَيْرٍ فَلِلْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ؕ وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ ﴿۲۱۵﴾

ترجمہ:

(۲۰۸)۔اے ایمان والو! اسلام میں پورے کے پورے داخل ہو جاؤ اور شیطان کے نقش قدم پر نہ چلو، بے شک وہ تمہارا کھلا دشمن ہے۔(۲۰۹)۔ پھر اگر تم (ان سب دلائل کے بعد بھی) پھسل جاؤ، حالانکہ تمہارے پاس واضح دلائل آ چکے ہیں، تو جان لو کہ اللہ زبردست اور بڑی حکمت والا ہے۔(۲۱۰)۔کیا یہ لوگ اس انتظار میں ہیں کہ اللہ خود بادلوں کے سائے میں فرشتوں کے ساتھ ان کے سامنے آ جائے اور فیصلہ ہو جائے؟ حالانکہ سب معاملات اللہ ہی کی طرف لوٹائے جاتے ہیں۔(۲۱۱)۔ بنی اسرائیل سے پوچھو، ہم نے انہیں کتنی ہی واضح نشانیاں دیں، اور جو کوئی اللہ کی نعمت کو بدل دے، بعد اس کے کہ وہ اس کے پاس آ چکی ہو، تو یقیناً اللہ سخت سزا دینے والا

ہے۔(۲۱۲)۔جنہوں نے کفر کیا ان کے لیے دنیاوی زندگی کو خوشنما بنا دیا گیا ہے، اور وہ ایمان والوں کا مذاق اڑاتے ہیں، حالانکہ پرہیزگار لوگ قیامت کے دن ان سے بلند ہوں گے، اور اللہ جسے چاہے بے حساب رزق دیتا ہے۔(۲۱۳)۔(پہلے) سب انسان ایک ہی امت تھے، پھر اللہ نے نبی بھیجے خوشخبری دینے والے اور ڈرانے والے، اور ان کے ساتھ سچی کتاب نازل کی، تاکہ وہ لوگوں کے درمیان ان باتوں میں فیصلہ کرے جن میں وہ اختلاف کرتے تھے۔اور اس کتاب میں اختلاف صرف ان لوگوں نے کیا جنہیں وہ دی گئی تھی، باوجود اس کے کہ ان کے پاس واضح احکام آ چکے تھے، اور یہ اختلاف محض آپس کی ضد کی وجہ سے تھا۔پھر اللہ نے اپنے حکم سے ان لوگوں کو ہدایت دی جو ایمان لائے، ان باتوں میں جن میں دوسرے اختلاف کر رہے تھے، اور اللہ جسے چاہتا ہے سیدھے راستے کی طرف ہدایت دیتا ہے۔(۲۱۴)۔کیا تم نے یہ گمان کیا ہے کہ جنت میں داخل ہو جاؤ گے، حالانکہ ابھی تم پر وہ حالات نہیں آئے جیسے تم سے پہلے لوگوں پر آئے تھے؟ انہیں سختیاں اور مصیبتیں پہنچیں اور وہ جھنجھوڑ دیے گئے، یہاں تک کہ رسول اور ایمان والے بھی کہنے لگے: "کب آئے گی اللہ کی مدد؟" سن لو! بے شک اللہ کی مدد قریب ہے۔(۲۱۵)۔وہ آپ سے پوچھتے ہیں کہ کیا خرچ کریں؟ کہہ دیجیے: جو کچھ بھی تم خرچ کرو وہ والدین، رشتہ داروں، یتیموں، مسکینوں اور مسافروں کے لیے ہونا چاہیے، اور جو بھی نیکی تم کرو گے تو یقیناً اللہ اسے خوب جاننے والا ہے۔

تفسیر-آیت نمبر ۲۰۸ سے ۲۱۵ تک

آیت نمبر (۲۰۸-۲۰۹) يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِي السِّلْمِ كَاۗفَّةً ۠ وَلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ ۭ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ۝ فَاِنْ زَلَلْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا جَاۗءَتْكُمُ الْبَيِّنٰتُ فَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ۝

ترجمہ: ''اے ایمان والو! اسلام میں پورے کے پورے داخل ہو جاؤ اور شیطان کے نقش قدم پر نہ چلو، بے شک وہ تمہارا کھلا دشمن ہے۔پھر اگر تم (ان سب دلائل کے بعد بھی) پھسل جاؤ، حالانکہ تمہارے پاس واضح دلائل آ چکے ہیں، تو جان لو کہ اللہ زبردست اور بڑی حکمت والا ہے''۔

تفسیر اسلام میں پورے پورے داخل ہونے کا حکم

ابنِ جریر نے حضرت عکرمہؓ سے نقل کیا ہے کہ حضرت عبداللہ بن سلامؓ، ثعلبہؓ، ابنِ یامینؓ، اسد بن کعبؓ،

سعید بن عمرؓ اور قیس بن زیدؓ جو اہلِ کتاب میں سے تھے، نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے عرض کیا کہ: ''یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، ہم سنیچر کے دن کی تعظیم کرتے ہیں، ہمیں اس کی اجازت دیجئے۔ نیز توریت بھی اللہ کی کتاب ہے، ہمیں اس پر عمل کرنے کی اجازت دیجئے''۔

اس پر یہ آیت کریمہ نازل ہوئی: ''اے ایمان والو! اسلام میں پورے پورے داخل ہو جاؤ!''۔

آیت کے شانِ نزول کے مطابق کچھ صحابہؓ جو پہلے یہودی تھے، سنیچر کے دن کی تعظیم کو باقی رکھنا چاہتے تھے، جیسا کہ حضرت موسیٰؑ کی شریعت میں تھا، اور اونٹ کا گوشت کھانے سے پرہیز کرنا چاہتے تھے، کیونکہ وہ یہودیت کے زمانے میں اسے نہیں کھاتے تھے۔ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کہا کہ وہ توریت کو تہجد کی نماز میں پڑھا کریں۔

اللہ تعالیٰ نے ان پر یہ حکم نازل فرمایا کہ اسلام میں مکمل طور پر داخل ہو جاؤ، کیونکہ قرآن مجید کے نزول کے بعد اب پچھلی شریعت کی کوئی باقیات نہیں رہیں۔

حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''بلاشبہ میں تمہارے پاس خوب روشن اور واضح شریعت لے کر آیا ہوں، اگر موسیٰؑ بھی زندہ ہوتے تو ان کے لیے بھی اس کے سوا کوئی گنجائش نہ ہوتی کہ وہ میری اتباع کریں''۔ **(معالم التنزیل، حصہ ۱، صفحہ ۱۸۳)**

حضرت جابرؓ کی روایت مسند احمد اور **شعب الایمان للبیھقی** میں بھی ہے۔ **(مشکوٰۃ صفحہ ۳۰)**

ہر شخص اسلام کے احکام کا پابند ہے

اس آیت میں مسلمانوں کو حکم دیا گیا ہے کہ اسلام میں پورے پورے داخل ہو جاؤ، یعنی اسلام کے تمام احکام کو مکمل طور پر قبول کرو اور ان پر عمل کرو۔ چاہے حاکم ہو یا محکوم، بڑا ہو یا چھوٹا، شہری ہو یا دیہاتی، تاجر ہو یا کاریگر، کارخانہ دار، مزدور یا کسان، سب کو اسلام پر پورے طور پر عمل کرنا ضروری ہے۔ کسی کو یہ دیکھ کر عمل کرنا نہیں چاہیے کہ دوسرے کیسے عمل کرتے ہیں، بلکہ ہر شخص اپنی ذمہ داری کو سامنے رکھے۔

بدقسمتی سے، بہت سے لوگ اسلام کو صرف نماز، روزہ اور چند مخصوص اعمال تک محدود رکھتے ہیں، اور زندگی کے دیگر شعبوں بی معاشرت، تجارت، سیاست اور روزمرہ کے معاملات بی میں اسلام کے احکام کی پرواہ نہیں کرتے۔ وہ جیسا چاہیں تجارت کرتے، جو کچھ بھی مل جائے خرید یا فروخت کر دیتے، اور جہاں چاہیں ملازمت اختیار کر لیتے ہیں، حرام وحلال کا خیال نہیں رکھتے، شادی بیاہ اور دیگر معاملات میں غیر شرعی طریقے اپناتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ خوشیوں کے موقع پر شرعی پابندیوں کی کوئی اہمیت نہیں۔

اگر کوئی انہیں بتائے کہ ان کی ملازمت حرام ہے یا تجارت میں سود شامل ہے، تو وہ اعتراض کرتے ہیں کہ مولوی ترقی سے روکتے ہیں۔ حالانکہ ہمارا دین جامع، کامل اور مکمل ہے، جو انسانی زندگی کے ہر شعبے پر حاوی ہے۔

اسلام کے احکام زندگی کے ہر شعبے کی تفصیل بیان کرتے ہیں، اور کچھ احکام پر عمل کرنا اور کچھ چھوڑ دینا بالکل درست نہیں۔ جیسے سورہ بقرہ کے رکوع نمبر ۱۰ میں یہودیوں سے فرمایا گیا: ''کیا کتاب کے کچھ حصہ پر ایمان لاتے ہو اور کچھ حصہ کے منکر ہوتے ہو؟'' بہت سے لوگ صرف دعوے کے مسلمان ہیں، اسلام کے فرائض پر مکمل عمل نہیں کرتے اور اپنی دینداری کو چند اعمال جیسے نماز یا روزہ تک محدود رکھتے ہیں۔ اگر انہیں ہدایت دی جائے کہ حرام ملازمت چھوڑ دو یا سود کا لین دین ترک کرو، تو وہ آمادہ نہیں ہوتے اور کہتے ہیں کہ روزی کا معاملہ ہے، گویا روزی کمانے میں وہ مکمل آزاد ہیں۔

مسلم حکومتیں

اسلام پر پورے پورے عمل نہ کرنا، کچھ احکام کو قبول کرنا اور کچھ چھوڑ دینا، یہ سب شیطانی حرکات ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اسلام میں مکمل داخل ہونے کا حکم دینے کے بعد یہی بات واضح فرمائی ہے۔

''وَّلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ'' — شیطان کے نقش قدم پر نہ چلو، اور ساتھ ہی فرمایا: ''اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ'' کہ شیطان تمہارا کھلا دشمن ہے۔

بہت عجیب بات ہے کہ لوگ شیطان کو برا بھی کہتے ہیں اور اس پر لعنت بھی بھیجتے ہیں، لیکن اس کے بتائے ہوئے طریقوں کو اختیار کر لیتے ہیں۔

پھر اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''فَاِنْ زَلَلْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْكُمُ الْبَيِّنٰتُ فَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ'' — اگر تم واضح دلیلیں پہنچنے کے بعد بھی لغزش کر بیٹھو، تو جان لو کہ اللہ تعالیٰ زبردست اور حکمت والا ہے۔

اس آیت میں واضح کیا گیا ہے کہ جب انسان کے پاس اسلام میں داخل ہونے کے لیے واضح اور روشن دلائل موجود ہوں، پھر بھی اگر وہ ان سے غفلت برتے یا راستہ چھوڑ دے، تو یہ معمولی بات نہیں۔ یہ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی ہے اور وہ غالب ہے۔ اس کے عذاب اور انتقام سے کوئی بچ نہیں سکتا۔ اللہ تعالیٰ حکیم بھی ہے اور اپنی حکمت کے مطابق سزا میں جلدی نہ کرے، تو اس سے دھوکہ نہ کھاؤ اور یہ نہ سمجھو کہ تم بچ جاؤ گے یا بدلہ نہیں ملے گا۔

آیت نمبر (۲۱۰) هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّاْتِيَهُمُ اللّٰهُ فِيْ ظُلَلٍ مِّنَ الْغَمَامِ وَالْمَلٰٓئِكَةُ وَقُضِيَ الْاَمْرُ ۭ وَاِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ ﴿۲۱۰﴾

ترجمہ: ''کیا یہ لوگ اس انتظار میں ہیں کہ اللہ خود بادلوں کے سائے میں فرشتوں کے ساتھ ان

کے سامنے آجائے اور فیصلہ ہوجائے؟ حالانکہ سب معاملات اللہ ہی کی طرف لوٹائے جاتے ہیں''۔

تفسیر

حق قبول نہ کرنے پر وعید

جولوگ کھلی اور واضح دلائل کے باوجود بھی دینِ اسلام قبول نہیں کرتے، ان کے لیے کیا انتظار ہے؟ ان کے اعمال اور رہن سہن سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بس اِسی لمحے کے منتظر ہیں کہ اللہ اور اس کے فرشتے بادلوں کے سایوں میں نمودار ہوں اور ان کے کفر کی سزا دے دیں، اور تمام فیصلہ مکمل ہوجائے۔ اس کے بعد اسلام قبول کرنے کا کوئی موقع باقی نہیں رہتا، کیونکہ جب عذاب سامنے آجائے تو وہ شخص ہدایت کے لیے دستیاب نہیں رہتا۔

پھر اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ تمام معاملات کا فیصلہ اسی کی طرف لوٹایا جائے گا۔ وہ حاکم ہے روزِ جزا کا، جس دن کوئی بھی اختیار کرنے والا موجود نہیں ہوگا۔ اللہ تعالیٰ حق کے ساتھ فیصلہ کرے گا اور اہلِ کفر کے بارے میں ہمیشہ عذاب ہی کا فیصلہ ہوگا۔ لہٰذا ہر شخص کو چاہیے کہ وہ اپنے انجام کے بارے میں غور وفکر کرے اور اپنے اعمال کا حساب سمجھے۔

آیت نمبر (۲۱۱) سَلۡ بَنِیۡۤ اِسۡرَآءِیۡلَ کَمۡ اٰتَیۡنٰہُمۡ مِّنۡ اٰیَۃٍۭ بَیِّنَۃٍ ؕ وَمَنۡ یُّبَدِّلۡ نِعۡمَۃَ اللّٰہِ مِنۡۢ بَعۡدِ مَا جَآءَتۡہُ فَاِنَّ اللّٰہَ شَدِیۡدُ الۡعِقَابِ ﴿۲۱۱﴾

ترجمہ: ''بنی اسرائیل سے پوچھو، ہم نے انہیں کتنی ہی واضح نشانیاں دیں، اور جو کوئی اللہ کی نعمت کو بدل دے، بعد اس کے کہ وہ اس کے پاس آچکی ہو، تو یقیناً اللہ سخت سزا دینے والا ہے''۔

تفسیر اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کی سرکشی اور کفر کی وجہ سے ان پر طنز فرمایا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی ہدایت کے لیے انبیاء اور رسول بھیجے، اور ان کے سامنے روشن اور واضح نشانیاں بھیجی تاکہ وہ انہیں دیکھ کر ایمان لے آئیں۔

ان نشانیوں میں یدِ بیضا (سفید ہاتھ)، موسیٰؑ کی عصا، سمندر کا پھٹنا، پتھروں سے چشموں کا جاری ہونا، میدانِ تیہ میں بادل کا سایہ، من وسلویٰ اور اس قسم کی اور بھی کئی واضح دلائل شامل تھیں، جو انہیں راہِ راست پر لانے کے لیے بھیجی گئیں۔ لیکن ان سب کے باوجود بھی وہ ایمان نہ لائے، اور ایمان کے بدلے کفر کو اختیار کیا۔ نتیجتاً وہ جہنم کے عذاب کے حقدار ہوگئے۔

آیت نمبر (۲۱۲) زُیِّنَ لِلَّذِیۡنَ کَفَرُوا الۡحَیٰوۃُ الدُّنۡیَا وَیَسۡخَرُوۡنَ مِنَ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا ۘ وَالَّذِیۡنَ اتَّقَوۡا فَوۡقَہُمۡ یَوۡمَ الۡقِیٰمَۃِ ؕ وَاللّٰہُ یَرۡزُقُ مَنۡ یَّشَآءُ بِغَیۡرِ حِسَابٍ ﴿۲۱۲﴾

ترجمہ: ''جنہوں نے کفر کیا ان کے لیے دنیاوی زندگی کو خوشنما بنا دیا گیا ہے، اور وہ ایمان والوں کا

مذاق اڑاتے ہیں، حالانکہ پرہیزگار لوگ قیامت کے دن ان سے بلند ہوں گے، اور اللہ جسے چاہے بے حساب رزق دیتا ہے''۔

تفسیر کافروں کی دنیاوی زندگی

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ کافروں کے لیے دنیا کی زندگی کو خوشنما اور دلکش بنا دیا گیا ہے، جس پر وہ خوش اور مطمئن ہیں۔ وہ دولت جمع کرتے ہیں لیکن اسے اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے، اور مسلمانوں کا مذاق اُڑاتے ہیں کہ وہ فقیر اور محتاج ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ دنیاوی مال ومتاع ہی حقیقی سعادت ہے اور جو اس سے محروم ہے وہ شقی اور بدبخت ہے۔

لیکن اہلِ ایمان دنیا سے پرہیز کرتے ہیں اور جو مال حاصل کرتے ہیں اسے اللہ کی راہ میں خرچ کرتے رہتے ہیں۔ اس لیے قیامت کے دن ان کا مقام جنت ہوگا اور کفار کا ٹھکانہ جہنم۔ اہلِ ایمان علیّین میں ہوں گے اور کفار اسفل السافلین میں۔

چاہے دنیوی رزق ہو یا آخرت کی نعمتیں، اللہ کی مرضی کے بغیر کسی کو کچھ بھی نہیں مل سکتا، کیونکہ کائنات اور اس کا ہر ذرہ اُس کے قبضے میں ہے۔ اللہ جسے چاہتا ہے بے حساب رزق عطا فرماتا ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ جسے چاہتا ہے بے حساب رزق دیتا ہے''۔

آیت نمبر (۲۱۳) كَانَ النَّاسُ أُمَّةً وَّاحِدَةً ۟ فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ ۪ وَاَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيْمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ ؕ وَمَا اخْتَلَفَ فِيْهِ اِلَّا الَّذِيْنَ اُوْتُوْهُ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ بَغْيًۢا بَيْنَهُمْ ۚ فَهَدَى اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ مِنَ الْحَقِّ بِاِذْنِهٖ ؕ وَاللّٰهُ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۲۱۳﴾

ترجمہ: ''(پہلے) سب انسان ایک ہی امت تھے، پھر اللہ نے نبی بھیجے خوشخبری دینے والے اور ڈرانے والے، اور ان کے ساتھ سچی کتاب نازل کی، تاکہ وہ لوگوں کے درمیان ان باتوں میں فیصلہ کرے جن میں وہ اختلاف کرتے تھے۔ اور اس کتاب میں اختلاف صرف ان لوگوں نے کیا جنہیں وہ دی گئی تھی، باوجود اس کے کہ ان کے پاس واضح احکام آچکے تھے، اور یہ اختلاف محض آپس کی ضد کی وجہ سے تھا۔ پھر اللہ نے اپنے حکم سے ان لوگوں کو ہدایت دی جو ایمان لائے، ان باتوں میں جن میں دوسرے اختلاف کررہے تھے، اور اللہ جسے چاہتا ہے سیدھے راستے کی طرف ہدایت دیتا ہے''۔

تفسیر حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ حضرت آدم اور حضرت نوحؑ کے درمیان دس صدیوں کا فاصلہ ہے۔ اس پوری

مدت میں لوگ ایک ہی شریعت پر قائم رہے۔ پھر زمانے کے ساتھ عقائد میں تبدیلی آئی، تو اللہ تعالیٰ نے انہیں راہِ راست پر لانے کے لیے انبیاء کرام بھیجے۔ انبیاء نے اللہ کی بندگی کرنے والوں کو دنیا و آخرت کی کامیابی اور جنت کی خوشخبری دی، اور اس کی نافرمانی کرنے والوں کو دنیا و آخرت کی ناکامی، محرومی، ذلت و رسوائی اور جہنم سے ڈرایا۔ انبیاء کے ساتھ کتابیں بھیجی گئیں، جن میں سچی خبریں اور احکامات شامل تھے، اور یہ اصولی اختلافات کے حل کے لیے بھی معیار قرار پاتی تھیں۔

یہود و نصاریٰ کا اختلاف

یہود و نصاریٰ نے اللہ کی کتابوں میں سب کچھ جانتے ہوئے بھی اختلاف کیا، اور اس کی وجہ ان کے آپس کے حسد اور مخالفت کے جذبات تھے۔ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو اپنے فضل و کرم سے حق کی طرف ہدایت دی، اور وہ تمام آسمانی کتابوں اور پھر قرآن پر ایمان لائے۔ اس کے ساتھ انہوں نے وہ توازن اختیار کیا جس میں یہود و نصاریٰ اختلاف کر چکے تھے، اور اللہ جسے چاہتا ہے سیدھی راہ کی طرف ہدایت دیتا ہے۔

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''ہم مسلمان زمانے کے اعتبار سے آخر میں آئے ہیں، لیکن قیامت کے دن ہم سب سے پہلے جنت میں داخل ہوں گے، حالانکہ اہلِ کتاب کو ہم سے پہلے کتاب ملی اور ہمیں بعد میں۔ اللہ نے ہم کو اپنے فضل و کرم سے ہدایت دی، لوگوں نے جمعہ کے دن کے بارے میں اختلاف کیا، تو اللہ نے ہمیں ہدایت دی اور ہم نے جمعہ کا دن اختیار کر لیا۔ یوں یہود نے ہفتہ اور نصاریٰ نے اتوار کا دن اختیار کیا، اور لوگ ہمارے تابع بن گئے''۔ (مسلم:۸۵۶)

حضرت ثوبانؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا: ''میں خاتم النبیین ہوں، میرے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا۔ میری امت کا ایک گروہ ہمیشہ حق پر قائم رہے گا اور ان کا کوئی مخالف انہیں نقصان نہیں پہنچا سکے گا، یہاں تک کہ اللہ کا حکم آئے گا''۔ (مسلم:۱۹۲۰)

آیت نمبر (۲۱۴) اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَاْتِكُمْ مَّثَلُ الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ ؕ مَسَّتْهُمُ الْبَاْسَآءُ وَالضَّرَّآءُ وَزُلْزِلُوْا حَتّٰى يَقُوْلَ الرَّسُوْلُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ مَتٰى نَصْرُ اللّٰهِ ؕ اَلَآ اِنَّ نَصْرَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ ﴿۲۱۴﴾

ترجمہ: ''کیا تم نے یہ گمان کیا ہے کہ جنت میں داخل ہو جاؤ گے، حالانکہ ابھی تم پر وہ حالات نہیں آئے جیسے تم سے پہلے لوگوں پر آئے تھے؟ انہیں سختیاں اور مصیبتیں پہنچیں اور وہ جھنجھوڑ دیے گئے، یہاں تک کہ رسول اور ایمان والے بھی کہنے لگے: کب آئے گی اللہ کی مدد؟ سن لو! بے شک اللہ کی مدد قریب ہے''۔

تفسیر

مؤمنوں کی آزمائش

حضرت عبدالرزاق، معمر اور قتادہؒ کے مطابق یہ آیت کریمہ غزوۂ احزاب کے موقع پر نازل ہوئی، جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو سخت مشکلات اور پریشانیوں کا سامنا تھا۔

''یَسْئَلُوْنَکَ مَاذَا یُنْفِقُوْنَ''۔ مسلمان رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے دریافت کرنے لگے کہ ہم اپنے مال کہاں اور کس طرح خرچ کریں۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی تا کہ مؤمنین کو مال کے صحیح استعمال کی ہدایت دی جا سکے۔

اللہ تعالیٰ نے واضح فرمایا کہ وہ اپنے مؤمن بندوں کا امتحان لیتا ہے اور جس کا ایمان زیادہ مضبوط ہوگا، اس کی آزمائش بھی اسی درجہ کی ہوگی۔ یہ سنت گزشتہ انبیاء اور مؤمنین کے ساتھ ہمیشہ قائم رہی ہے اور یہ سنت کبھی نہیں بدلتی۔ جو شخص اللہ کے دین پر چلتا ہے، اس کی آزمائش لازمی ہے۔ جو صبر کے ساتھ ثابت قدم رہیں گے، اللہ تعالیٰ انہیں عزت عطا فرمائے گا اور جو آزمائش میں کمزور پڑ جائیں اور دنیاوی پریشانیوں کو عذابِ آخرت سمجھیں گے، انہیں قیامت کے دن محرومی اور ناکامی کا سامنا کرنا پڑے گا۔

اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو مخاطب فرمایا کہ تم نے کیسے یہ سمجھ لیا کہ بغیر آزمائش کے جنت میں داخل ہو جاؤ گے؟ ابھی تک تمہاری وہ آزمائش نہیں ہوئی جو پچھلے انبیاء اور مؤمنین پر آئی تھی۔ ان پر جو مصیبتیں آئیں، ان کی شدت سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ حتیٰ کہ انبیاء اور ان پر ایمان لانے والے بھی دعا کرتے کہ اے اللہ! اپنی مدد بھیج دے۔ اور جب آزمائش مکمل ہوئی تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ یہاں، اب اللہ کی مدد میرے مؤمن اور صالح بندوں کے قریب ہے، کیونکہ اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔ اللہ یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ عمل میں کون سچا ہے۔

حضرت خبابؓ سے روایت ہے بخاری میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کعبہ کے سائے میں ایک چادر پر ٹیک لگائے بیٹھے تھے اور مشرکین کی زیادتیاں حد سے تجاوز کر چکی تھیں۔ صحابہ نے کہا: ''اب تو ہمارے لیے اللہ کی مدد مانگئے، دعا کیجیے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''پہلے زمانے میں مسلمان پکڑے جاتے اور گڑھے میں دفن کر دیے جاتے، مگر یہ عذاب انہیں دین سے نہیں پھیرتا تھا۔ اللہ کی قسم، اللہ تعالیٰ یہ دین مکمل کرے گا، یہاں تک کہ ایک سوار صنعاء سے حضرموت تک جائے گا اور اسے اللہ کے علاوہ کسی کا خوف نہ ہو، یا چرواہا اپنی بھیڑ یا سے نہ ڈرے، مگر تم لوگ جلدی میں ہو''۔ **(بخاری: ۳۶۱۲)**

اسی طرح ایک دوسری روایت میں حضرت خبابؓ فرماتے ہیں: ایک بار آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کعبہ کے سائے میں چادر کے ساتھ ٹیک لگائے بیٹھے تھے، میں نے کہا: آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اللہ سے دعا کیوں نہیں کرتے؟ یہ سنتے ہی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تکیہ چھوڑ کر سیدھے بیٹھ گئے، چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا اور فرمایا: تم سے پہلے ایسے لوگ گزرے جن کے گوشت اور پٹھوں

میں ہڈیوں تک کنگھیاں داخل ہو جاتی تھیں، مگر وہ اپنے دین سے نہیں پھرتے تھے۔ انہیں آری کے ذریعے ٹکڑے کیا جاتا، لیکن وہ اپنے دین پر قائم رہے۔ اور اللہ اس کام کو ضرور مکمل کرے گا، یہاں تک کہ ایک شخص سوار ہو کر صنعاء سے حضر موت تک پہنچے اور اسے اللہ کے سوا کسی چیز کا خوف نہ ہو۔ (بخاری: ۳۸۵۲)

آیت نمبر (۲۱۵) يَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ ۙ قُلْ مَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ خَيْرٍ فَلِلْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ۭ وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ ﴿۲۱۵﴾

ترجمہ: ''وہ آپ سے پوچھتے ہیں کہ کیا خرچ کریں؟ کہہ دیجیے: جو کچھ بھی تم خرچ کرو وہ والدین، رشتہ داروں، یتیموں، مسکینوں اور مسافروں کے لیے ہونا چاہیے، اور جو بھی نیکی تم کرو گے تو یقیناً اللہ اسے خوب جاننے والا ہے''۔

تفسیر

اللہ کی راہ میں خرچ

لوگوں نے نبی کریم ﷺ سے دریافت کیا کہ ہم اپنے مال میں سے اللہ کی راہ میں کیا خرچ کریں؟ اللہ تعالیٰ نے انہیں رہنمائی فرمائی کہ وہ کوئی بھی حلال مال اللہ کی راہ میں خرچ کر سکتے ہیں، خواہ وہ تھوڑا ہو یا زیادہ۔ اس کے بعد آپ ﷺ نے انہیں یہ بھی سمجھایا کہ اس سوال سے زیادہ اہم یہ جاننا ہے کہ مال کن لوگوں پر خرچ کیا جائے۔ لہٰذا انہیں سکھایا گیا کہ انسان کی نیکی اور حسنِ سلوک کے سب سے زیادہ حقدار اس کے والدین ہیں۔ والدین پر خرچ کرنا اور ان کے ساتھ حسنِ سلوک سب سے بڑی نیکی ہے، اور اگر ضرورت مند ہونے کے باوجود ان پر خرچ نہ کیا جائے تو یہ سب سے بڑی نافرمانی ہے۔

مسند احمد میں روایت ہے کہ بنو یربوع کے ایک صحابیؓ سے مروی ہے کہ ایک مرتبہ میں نبی ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا، نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''اپنے ماں اور باپ پر خرچ کرو، اپنی بہن اور بھائی پر خرچ کرو، پھر قریبی رشتہ داروں پر۔ والدین کے بعد دیگر رشتہ دار، یتیم، مسکین اور فقیروں پر خرچ کرو، نیز ان مسافروں پر جو راستے میں کھانا پینا ختم ہو جانے کے سبب اپنی منزل تک پہنچنے کے لیے محتاج ہوں''۔ (مسند احمد: ۱۶۷۳۰)

اس تفصیل کے بعد اللہ تعالیٰ نے بڑی اہم وجہ بیان فرمائی: اے مسلمانوں! تم جو بھی نیکی کرو، خواہ یہ اوپر بیان کیے گئے لوگوں کے لیے ہو یا کسی اور کے لیے، اللہ اسے جانتا ہے اور بہترین بدلہ عطا کرے گا، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''فَاسْتَجَابَ لَهُمْ رَبُّهُمْ اَنِّىْ لَآ اُضِيْعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنْكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى''۔ (کہ مرد ہو یا عورت) میں کسی کی محنت ضائع نہیں کرتا۔ (سورہ آلِ عمران: ۱۹۵)

❁❁❁

ترجمہ- آیت نمبر ۲۱۶ سے ۲۲۱ تک

كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ وَهُوَ كُرْهٌ لَّكُمْ ۚ وَعَسٰٓى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْـًٔا وَّهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۚ وَعَسٰٓى اَنْ تُحِبُّوْا شَيْـًٔا وَّهُوَ شَرٌّ لَّكُمْ ۭ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۲۱۶﴾ يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الشَّهْرِ الْحَرَامِ قِتَالٍ فِيْهِ ۭ قُلْ قِتَالٌ فِيْهِ كَبِيْرٌ ۭ وَصَدٌّ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَكُفْرٌۢ بِهٖ وَالْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۡ وَاِخْرَاجُ اَهْلِهٖ مِنْهُ اَكْبَرُ عِنْدَ اللّٰهِ ۚ وَالْفِتْنَةُ اَكْبَرُ مِنَ الْقَتْلِ ۭ وَلَا يَزَالُوْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ حَتّٰى يَرُدُّوْكُمْ عَنْ دِيْنِكُمْ اِنِ اسْتَطَاعُوْا ۭ وَمَنْ يَّرْتَدِدْ مِنْكُمْ عَنْ دِيْنِهٖ فَيَمُتْ وَهُوَ كَافِرٌ فَاُولٰۗىِٕكَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ۚ وَاُولٰۗىِٕكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۲۱۷﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۙ اُولٰۗىِٕكَ يَرْجُوْنَ رَحْمَتَ اللّٰهِ ۭ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۲۱۸﴾ يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ ۭ قُلْ فِيْهِمَآ اِثْمٌ كَبِيْرٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ ۡ وَاِثْمُهُمَآ اَكْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا ۭ وَيَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ ۡ قُلِ الْعَفْوَ ۭ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُوْنَ ﴿۲۱۹﴾ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ۭ وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْيَتٰمٰى ۭ قُلْ اِصْلَاحٌ لَّهُمْ خَيْرٌ ۭ وَاِنْ تُخَالِطُوْهُمْ فَاِخْوَانُكُمْ ۭ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ الْمُفْسِدَ مِنَ الْمُصْلِحِ ۭ وَلَوْ شَاۗءَ اللّٰهُ لَاَعْنَتَكُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿۲۲۰﴾ وَلَا تَنْكِحُوا الْمُشْرِكٰتِ حَتّٰى يُؤْمِنَّ ۭ وَلَاَمَةٌ مُّؤْمِنَةٌ خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكَةٍ وَّلَوْ اَعْجَبَتْكُمْ ۚ وَلَا تُنْكِحُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَتّٰى يُؤْمِنُوْا ۭ وَلَعَبْدٌ مُّؤْمِنٌ خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكٍ وَّلَوْ اَعْجَبَكُمْ ۭ اُولٰۗىِٕكَ يَدْعُوْنَ اِلَى النَّارِ ۚۖ وَاللّٰهُ يَدْعُوْٓا اِلَى الْجَنَّةِ وَالْمَغْفِرَةِ بِاِذْنِهٖ ۚ وَيُبَيِّنُ اٰيٰتِهٖ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ ﴿۲۲۱﴾

ترجمہ:

(۲۱۶)۔تم پر جنگ فرض کی گئی ہے، حالانکہ وہ تمہیں ناگوار ہے، اور ہوسکتا ہے کہ تم کسی چیز کو ناپسند کرو، حالانکہ وہ تمہارے لیے بہتر ہو، اور ہوسکتا ہے کہ تم کسی چیز کو پسند کرو، حالانکہ وہ تمہارے لیے بُری ہو، اور اللہ جانتا ہے، تم نہیں جانتے۔(۲۱۷)۔وہ آپ سے حرمت والے مہینے میں لڑائی کے بارے میں پوچھتے ہیں، کہہ دیجیے: اس مہینے میں لڑائی کرنا بہت بڑا گناہ ہے، لیکن اللہ کے راستے سے روکنا، کفر کرنا، مسجدِ حرام سے روکنا، اور وہاں کے رہنے والوں کو نکال دینا، اللہ کے نزدیک اس سے بھی بڑا گناہ ہے۔اور فتنہ (یعنی دین سے روکنا) قتل سے بھی بڑا گناہ ہے۔اور وہ تم

سے برابر لڑتے رہیں گے تاکہ تمہیں تمہارے دین سے پھیر دیں اگر ان میں طاقت ہو۔ اور تم میں سے جو کوئی اپنے دین سے پھر جائے، پھر وہ کافر ہی مرے، تو ان لوگوں کے اعمال دنیا اور آخرت میں ضائع ہو گئے، اور یہی لوگ دوزخی ہیں، وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔(۲۱۸)۔ بے شک وہ لوگ جو ایمان لائے، اور جنہوں نے ہجرت کی، اور اللہ کی راہ میں جہاد کیا، یہی وہ لوگ ہیں جو اللہ کی رحمت کے امیدوار ہیں، اور اللہ بہت بخشنے والا، نہایت رحم کرنے والا ہے۔(۲۱۹)۔ وہ آپ سے شراب اور جوئے کے بارے میں پوچھتے ہیں، کہہ دیجیے: ان دونوں میں بڑا گناہ ہے اور کچھ فائدے بھی ہیں لوگوں کے لیے، لیکن ان کا گناہ ان کے فائدے سے زیادہ ہے۔ اور وہ آپ سے پوچھتے ہیں کہ کیا خرچ کریں؟ کہہ دیجیے: جو کچھ زائد ہو۔ اسی طرح اللہ تمہارے لیے آیات بیان کرتا ہے تاکہ تم غور و فکر کرو۔(۲۲۰)۔ دنیا اور آخرت کے بارے میں۔ اور وہ آپ سے یتیموں کے بارے میں پوچھتے ہیں، کہہ دیجیے: ان کی اصلاح کرنا بہتر ہے، اور اگر تم ان کے ساتھ مل کر رہو (یعنی ان کے معاملات میں شریک ہو جاؤ) تو وہ تمہارے بھائی ہیں، اور اللہ جانتا ہے کہ فساد کرنے والا کون ہے اور اصلاح کرنے والا کون ہے۔ اور اگر اللہ چاہتا تو تمہیں مشکل میں ڈال دیتا، یقیناً اللہ زبردست، بڑی حکمت والا ہے۔(۲۲۱)۔ مشرک عورتوں سے نکاح نہ کرو جب تک کہ وہ ایمان نہ لے آئیں، اور بے شک ایک مومن لونڈی مشرکہ عورت سے بہتر ہے، اگرچہ وہ تمہیں کتنی ہی اچھی لگے۔ اور مومن عورتوں کا نکاح بھی مشرک مردوں سے نہ کرو جب تک کہ وہ ایمان نہ لے آئیں، بے شک ایک مومن غلام مشرک مرد سے بہتر ہے اگرچہ وہ تمہیں اچھا لگے۔ یہ مشرک لوگ دوزخ کی طرف بلاتے ہیں، اور اللہ اپنے حکم سے جنت اور مغفرت کی طرف بلاتا ہے، اور وہ لوگوں کے لیے اپنی آیات کھول کھول کر بیان کرتا ہے تاکہ وہ نصیحت حاصل کریں۔

تفسیر- آیت نمبر ۲۱۶ سے ۲۲۱ تک

آیت نمبر (۲۱۶) كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ وَهُوَ كُرْهٌ لَّكُمْ ۚ وَعَسٰٓى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْـًٔا وَّهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۚ وَعَسٰٓى اَنْ تُحِبُّوْا شَيْـًٔا وَّهُوَ شَرٌّ لَّكُمْ ۭ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ۝۲۱۶

ترجمہ: ''تم پر جنگ فرض کی گئی ہے، حالانکہ وہ تمہیں ناگوار ہے، اور ہوسکتا ہے کہ تم کسی چیز کو ناپسند کرو، حالانکہ وہ تمہارے لیے بہتر ہو، اور ہوسکتا ہے کہ تم کسی چیز کو پسند کرو، حالانکہ وہ تمہارے لیے بُری ہو، اور اللہ جانتا ہے، تم نہیں جانتے''۔

تفسیر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب مکہ میں تھے تو دشمن کے خلاف دفاعی جنگ کی بھی اجازت نہیں تھی اور صبر و بردباری کا حکم تھا۔ تاہم ہجرت کے بعد مدینہ میں ان پر یہودی اور مشرکین کی جانب سے ہونے والے حملوں کے جواب میں

دفاع کی اجازت دی گئی، یعنی جو کفار اہلِ اسلام سے لڑیں، ان سے مسلمانوں کو بھی لڑنے کی اجازت تھی۔ اس کے باوجود جب کفار اپنی زیادتیوں اور ظلم سے باز نہ آئے، تو عام طور پر ان سے قتال کی اجازت دی گئی اور جہاد فرض قرار پایا۔

جہاد کی فرضیت کے بارے میں فرمایا گیا: ''كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ'' یعنی تم پر قتال فرض کیا گیا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جہاد ہر مسلمان پر فرض ہے، لیکن رسول کریم ﷺ کی تعلیم سے واضح ہوا کہ یہ فرضِ کفایہ ہے، نہ کہ ہر فرد پر فرضِ عین۔ یعنی اگر مسلمانوں کی ایک جماعت اس فرض کو ادا کر دے، تو باقی مسلمان بری سمجھے جائیں گے۔ تاہم اگر کسی وقت دنیا میں کوئی جماعت بھی یہ فرض ادا نہ کرے، تو تمام مسلمان اس گناہ میں شریک ہوں گے۔

مفتی محمد شفیع صاحبؒ نے اپنی تفسیر ''معارف القرآن'' میں تحقیق کرتے ہوئے لکھا ہے کہ حدیث میں رسول کریم ﷺ کے ارشاد ''الجهاد ماضٍ إلىٰ يوم القيامة'' کا مطلب یہ ہے کہ قیامت تک ایسی جماعت موجود رہنی چاہیے جو فریضۂ جہاد کو ادا کرتی رہے۔

تمام مسلمانوں کی شرکت ضروری نہیں

وَمَا كَانَ الْمُؤْمِنُونَ لِيَنْفِرُوا كَافَّةً ۚ فَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَائِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوا فِي الدِّينِ ۔ (سورہ توبہ۔ ۱۲۲)

مسلمانوں کو یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ سب کے سب ایک ساتھ جہاد کے لیے نکل جائیں۔ بہتر یہی ہے کہ ہر بڑی جماعت میں سے ایک چھوٹی جماعت جائے تاکہ باقی لوگ دین کی تعلیم اور سمجھ میں مشغول رہیں۔ یہی بات قرآن کریم نے واضح کی ہے کہ کچھ مسلمان جہاد میں مصروف ہوں اور کچھ دینی تعلیم میں اور یہ صرف اسی صورت میں ممکن ہے جب جہاد فرضِ کفایہ ہو نہ کہ فرضِ عین۔

ماں باپ کی خدمت

صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں روایت ہے کہ ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ سے جہاد کی اجازت طلب کی۔ آپ ﷺ نے دریافت فرمایا: ''کیا تمہارے والدین زندہ ہیں؟'' اس نے عرض کیا: ''جی ہاں''۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''پھر جاؤ، ماں باپ کی خدمت کرو اور اس کے بدلے جہاد کا ثواب حاصل کرو''۔ (بخاری: ۵۹۷۲)

یہ بیان اس بات کی تصدیق کرتا ہے کہ جب مسلمانوں کی ایک جماعت فریضۂ جہاد کو ادا کر رہی ہو، تو باقی لوگ دیگر دینی امور اور عبادات میں مشغول رہ سکتے ہیں۔ تاہم اگر کسی وقت مسلمانوں کا امیر ضرورت محسوس کرے اور سب کو جہاد میں شرکت کی دعوت دے، تو یہ فرضِ عین ہو جاتا ہے، جیسا کہ سورۂ توبہ میں ارشاد ہے: ''اے ایمان والو!

تمہیں کیا ہوا کہ جب تم سے کہا جاتا ہے کہ اللہ کی راہ میں نکل جاؤ تو زمین پر پڑ جاتے ہو؟''۔

فرض ادا کرنے کی تاکید

جس شخص پر کسی کا قرض یا ذمہ داری ہو، وہ فرضِ کفایہ میں حصہ لینے سے پہلے اپنا قرض ادا کرے۔ البتہ اگر کسی موقع پر عام حکم یا کفار کے حملے کے سبب جہاد فرضِ عین ہو جائے، تو والدین، شوہر یا قرض خواہ کی اجازت شرط نہیں رہے گی۔

جہاد کو ناپسند کرنا

جہاد میں مادی اور ظاہری نقصانات کی وجہ سے کبھی کبھی انسان اسے ناپسند کرتا ہے، مگر اس کا انجام اور اثر خیر و برکت کا ذریعہ ہوتا ہے۔ جیسے جہاد میں ظاہری طور پر خونریزی اور مال و جان کا نقصان نظر آتا ہے، لیکن اس کے نتیجے میں غازیوں اور شہیدوں کے اعلیٰ درجات حاصل ہوتے ہیں، جو آخرت میں کامیابی اور سعادت کا سبب بنتے ہیں۔

اسی طرح ممکن ہے کہ انسان کسی چیز کے ظاہری فائدے کی وجہ سے اسے پسند کر لے، حالانکہ حقیقت میں وہ چیز اس کے حق میں نقصان دہ ہو۔ مثلاً جہاد میں شرکت سے گریز کر کے آرام و سکون حاصل کرنے کو پسند کرنا، تاکہ مال و جان محفوظ رہیں، مگر دراصل جہاد کو ترک کرنے میں تمہارا سراسر نقصان ہے اور آخرت کا خسارہ ہے۔ اس طرح تم کافروں کے ہاتھوں ذلیل ہو جاؤ گے، وہ تمہیں تباہ کر دیں گے، تمہارا مال لوٹیں گے، عورتوں اور بچوں کو غلام بنالیں گے، تمہارے شہر پر قبضہ کریں گے اور دین و دنیا سے تمہیں مٹا دیں گے۔

یاد رکھو کہ تمام مصلحتیں، اسباب اور مستحبات کی ترتیب اللہ تعالیٰ ہی جانتے ہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا علم کامل ہے اور ہر چیز پر حاوی ہے۔ انسان کا علم ناقص اور محدود ہے، لہٰذا جو حکم اللہ تعالیٰ نے دیا ہے، وہ یقیناً مسلمانوں کی بھلائی اور بہتری کے لیے ہے۔ اس لیے ہر حکم کو مصلحت سمجھ کر قبول کرنا چاہیے۔

خلاصہ یہ کہ جہاد و قتال میں اگرچہ بظاہر جان و مال کا نقصان دکھائی دیتا ہے، مگر حقائق اور نتائج سامنے آنے پر معلوم ہوگا کہ یہ نقصان ہرگز نقصان نہیں تھا، بلکہ سراسر نفع اور دائمی راحت کا وسیلہ تھا۔

آیت نمبر (۲۱۷) يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الشَّهْرِ الْحَرَامِ قِتَالٍ فِيْهِ ؕ قُلْ قِتَالٌ فِيْهِ كَبِيْرٌ ؕ وَصَدٌّ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَ كُفْرٌۢ بِهٖ وَالْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۫ وَاِخْرَاجُ اَهْلِهٖ مِنْهُ اَكْبَرُ عِنْدَ اللّٰهِ ۚ وَالْفِتْنَةُ اَكْبَرُ مِنَ الْقَتْلِ ؕ وَلَا يَزَالُوْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ حَتّٰى يَرُدُّوْكُمْ عَنْ دِيْنِكُمْ اِنِ اسْتَطَاعُوْا ؕ وَمَنْ يَّرْتَدِدْ مِنْكُمْ عَنْ دِيْنِهٖ فَيَمُتْ وَهُوَ كَافِرٌ فَاُولٰٓئِكَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ

فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ۚ وَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۲۱۷﴾

ترجمہ: ''وہ آپ سے حرمت والے مہینے میں لڑائی کے بارے میں پوچھتے ہیں، کہہ دیجیے: اس مہینے میں لڑائی کرنا بہت بڑا گناہ ہے، لیکن اللہ کے راستے سے روکنا، کفر کرنا، مسجدِ حرام سے روکنا، اور وہاں کے رہنے والوں کو نکال دینا، اللہ کے نزدیک اس سے بھی بڑا گناہ ہے۔ اور فتنہ (یعنی دین سے روکنا) قتل سے بھی بڑا گناہ ہے۔ اور وہ تم سے برابر لڑتے رہیں گے تاکہ تمہیں تمہارے دین سے پھیر دیں اگر ان میں طاقت ہو۔ اور تم میں سے جو کوئی اپنے دین سے پھر جائے، پھر وہ کافر ہی مرے، تو ان لوگوں کے اعمال دنیا اور آخرت میں ضائع ہو گئے، اور یہی لوگ دوزخی ہیں، وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے''۔

تفسیر ابن جریر، ابن ابی حاتم اور طبرانی (کبیر) میں، نیز امام بیہقی نے اپنی سنن میں حضرت جندب بن عبداللہؓ سے روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک لشکر روانہ فرمایا اور اس پر حضرت عبداللہ بن جحشؓ کو امیر مقرر کیا۔ اس لشکر کو ابن حضرمی نامی دشمن نے قتل کر دیا، اور مسلمانوں کو اس بات کا علم نہ تھا کہ یہ واقعہ مہینہ رجب میں پیش آیا یا جمادی الاخر میں۔

مشرکین نے مسلمانوں پر الزام لگایا کہ انہوں نے حرام مہینے میں قتال کیا ہے۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی کہ آپ ﷺ سے شہرِ حرام میں قتال کرنے کے بارے میں دریافت کیا جا رہا ہے۔ بعد میں کچھ حضرات نے کہا کہ اگر ان لوگوں کو اس میں گناہ نہیں ہوگا تو ان کا کوئی ثواب بھی نہیں ملے گا۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے آیت نازل فرمائی: ''اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا''۔

ابن منذر نے عثمان بن عطا کے واسطے سے حضرت ابن عباسؓ سے نقل کیا ہے کہ اس کا تعلق سورۂ مائدہ میں آنے والے سوال ''يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْخَمْرِ'' سے بھی ہے۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ''وَيَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ''۔ ابن ابی حاتم نے سعید یا عکرمہ کے واسطے سے حضرت ابن عباسؓ سے نقل کیا ہے کہ جب فی سبیل اللہ خرچ کرنے کا حکم دیا گیا، تو صحابۂ کرامؓ کی ایک جماعت رسول اللہ ﷺ کے خدمت میں حاضر ہوئی اور عرض کیا کہ ہمیں معلوم نہیں کس قسم کے خرچ کا حکم ہمارے مال پر ہے، ہم کیا خرچ کریں؟ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

ابن ابی حاتم نے یحییٰ سے بھی نقل کیا ہے کہ حضرت معاذؓ اور ثعلبہؓ نے رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا: ہمارے پاس غلام اور گھر والے دونوں ہیں، تو ہم اپنے مال میں سے کیا خرچ کریں؟ اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔ (تفسیر ابن عباسؓ)

جہاد سے متعلق یہ خاص واقعہ اس آیت کے نزول کا سبب بنا۔ حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جنگ بدر سے دو مہینہ قبل، جمادی الاخر دو ہجری میں، اپنے پھوپھی زاد بھائی حضرت عبداللہ بن جحشؓ کی قیادت میں آٹھ یا بارہ مہاجرین کی ایک جماعت کو مدینہ سے کافروں کے مقابلے کے لیے روانہ کیا، جن میں صرف مہاجرین شامل تھے۔ حضرت عبداللہ بن جحشؓ کو ایک خط بھی دیا گیا اور فرمایا کہ دو دن کا سفر طے کرنے کے بعد خط کھولیں اور ساتھیوں کو پڑھ کر سنائیں، مگر کسی پر زبردستی نہ کریں۔ حضرت عبداللہ بن جحشؓ نے طے شدہ سفر کے بعد ایک منزل پر پڑاؤ کیا۔

حضرت عبداللہ بن جحشؓ نے حکم نامہ پڑھتے ہی پورے دل و جان سے کہا: ''سَمِعْنَا وَ اَطَعْنَا'' اور خط اپنے ساتھیوں کو سنایا۔ ساتھ ہی فرمایا کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مجھے یہ ہدایت دی تھی کہ کسی پر زبردستی نہ کرنا۔ اس کے بعد فرمایا کہ جو بھی شہادت کا جذبہ رکھتا ہو، وہ میرے ساتھ چلے، اور جو چاہے واپس لوٹ جائے۔

یہ بات سن کر تمام صحابۂ کرامؓ دل و جان سے راضی ہو گئے اور ایک بھی شخص واپس جانے کے لیے تیار نہ ہوا۔ جب یہ لشکر مکہ مکرمہ اور طائف کے درمیان مقام نخلہ پہنچا اور ٹھہرنے ہی والا تھا کہ قریش کا ایک قافلہ نمودار ہوا، جو طائف کے تجارتی سامان جیسے زیتون کا تیل، کشمش اور چمڑے وغیرہ لے کر آ رہا تھا۔ مسلمانوں نے اس پر حملہ کیا، جس میں ایک شخص ہلاک ہوا اور دو کو گرفتار کر لیا گیا۔

صحابۂ کرامؓ نے قیدیوں اور مال و اسباب کے ساتھ اونٹوں کو لے کر مدینہ منورہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں پیش کیا۔ اس قافلہ پر حملے کا واقعہ ماہِ رجب کی پہلی تاریخ کو ہوا، لیکن صحابہؓ اسے جمادی الثانی کی تیسویں تاریخ سمجھ بیٹھے تھے، جبکہ دراصل چاند ۲۹ کا ہو چکا تھا، اور مجاہدین کو اس کا علم نہ تھا۔

حضرت ابراہیمؑ کے زمانے سے عرب میں رواج رہا تھا کہ چار مہینے بی ذی قعدہ، ذی الحجہ، محرم اور رجب بی حرمت کے مہینے سمجھے جاتے تھے، جن میں قتل و قتال یا جنگ و جدل جائز نہ تھا۔ اس روایتی عقیدے کی بنیاد پر کفار نے مسلمانوں کے اس واقعہ پر طنز کیا اور کہا کہ انہوں نے حرام مہینے یعنی رجب میں قتل و قتال کر کے بڑا گناہ کیا۔ بعض روایتوں میں تو ذکر ہے کہ کچھ کفار قریش نے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس جا کر اعتراض بھی کیا۔ اسی مناسبت سے اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔

حرمت کے چار مہینے

اس آیت سے ''أَشْهُرِ حُرُم'' یعنی چار مہینوں میں قتال کی ممانعت ثابت ہوتی ہے: ۱۔ ذی قعدہ ۲۔ ذی الحجہ ۳۔ محرم ۴۔ رجب

اکثر مفسرین وفقہاء کا کہنا ہے کہ یہ حکم اب منسوخ ہو چکا ہے اور اب کسی مہینے میں قتال منع نہیں، جبکہ کچھ مفسرین کے نزدیک یہ حکم ابھی بھی موجود ہے اور حرمت برقرار ہے۔ اس موضوع پر قرآن کی دیگر آیات اور احادیث کی روشنی میں، اور مفسرین کے قول کو پیش کرتے ہوئے، حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ نے اپنی تفسیر میں خلاصہ کچھ یوں کیا ہے:

قتال کی شروعات تو ان مہینوں میں ہمیشہ کے لیے حرام ہے، مگر جب کفار خود ان مہینوں میں حملہ کریں تو مسلمانوں کو مدافعانہ قتال کی اجازت ہے۔ جیسا کہ حضرت جابر بن عبداللہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ کسی حرمت والے مہینے میں قتال نہ کرتے جب تک کفار قتال کا آغاز نہ کرتے۔

اس آیت میں ارشاد ہوا کہ ماہِ حرام میں جنگ کرنا برا ہے، لیکن اس کے مقابلے میں وہ اعمال زیادہ بری اور سخت گناہ ہیں جو کفار کرتے ہیں، مگر اپنی برائی پر غور نہیں کرتے اور مسلمانوں کی ایک انجانے غلطی پر طعن وتشنیع کرتے ہیں۔

یہ آیات پانچ بڑے گناہوں کی طرف اشارہ کرتی ہیں:

۱۔ صَدٌّ وا عَنْ سَبِيلِ اللهِ: اللہ کی راہ سے روکنا، یعنی لوگوں کو دینِ حق قبول کرنے سے روکنا اور جو قبول کرلیں انہیں سخت تکلیف پہنچانا۔ جیسے مکہ کے کفار نے اہلِ اسلام کو ہجرت پر مجبور کیا۔

۲۔ كُفْرٌ بِهٖ: اللہ تعالیٰ کی ہستی اور صفات کا انکار کرنا۔

۳۔ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ: خانۂ کعبہ، اللہ کا گھر، جو عبادت کے لیے بنایا گیا، مگر کفار نے مسلمانوں کو اس میں داخل ہونے اور عبادت کرنے سے روکا۔

۴۔ اِخْرَاجُ أَهْلِهٖ مِنْهُ: مسلمانوں کو ان کے گھروں سے نکال دینا، یعنی اہلِ اسلام پر اتنی سختیاں اور ظلم و زیادتی کہ ان کو ہجرت پر مجبور کرنا۔

۵۔ وَلَا يَزَالُوْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ: کفار تم سے ہمیشہ لڑتے رہیں گے، یہاں تک کہ تمہیں تمہارے دین سے دور کردیں، یعنی دوبارہ کافر بنانے کی کوشش کریں۔

لہٰذا، جو کفار مکہ نے ماہِ رجب میں مسلمانوں کی انجانے میں قتال کرنے پر تنقید کی، اللہ تعالیٰ نے ان کو بتایا کہ پہلے اپنی حالت دیکھو کہ تم خود پانچ بڑے گناہوں میں گرفتار ہو، جو اس انجانے قتال سے کہیں زیادہ سنگین ہیں۔

مرتد (Apostate) کا حکم

آیت کے آخر میں اسلام قبول کرنے کے بعد کفر اور ارتداد اختیار کرنے والوں کے بارے میں حکم دیا گیا ہے تاکہ اہلِ اسلام ہوشیار رہیں۔ اگر کوئی شخص کفار یا مشرکین کے کہنے پر اپنے دینِ حق یعنی اسلام سے پھر جائے، اور بغیر

توبہ کے کفر کی حالت میں وفات پا جائے، تو اس کے تمام اعمال دنیا و آخرت میں ضائع ہو جائیں گے۔

مرتد کے دنیا میں اعمال کے ضائع ہونے سے مراد یہ ہے کہ اسلام کی بدولت جو جان و مال محفوظ تھے، وہ اب محفوظ نہیں رہیں گے۔ مسلمان بیوی اس کے نکاح سے آزاد ہو جائے گی، میراث میں حصہ نہیں ملے گا، اہلِ اسلام اس کی جنازہ کی نماز نہیں پڑھیں گے اور نہ ہی اسے مسلمانوں کے قبرستان میں دفن کیا جائے گا۔

آخرت میں اعمال کا ضائع ہونا یہ ہے کہ اس کے کسی بھی نیک عمل پر ثواب نہیں ملے گا اور ہمیشہ کے لیے جہنم کی سزا ہوگی، یعنی اسے جہنم سے نکلنے کی کوئی امید نہیں۔ اسی لئے اسلام سے پھر جانے والے مرد سزا موت ہے، جبکہ عورت کے لیے عمر قید مقرر ہے، یعنی وہ ہمیشہ قید خانہ میں رہے گی۔

جب صحابۂ کرام کو یقین ہو گیا کہ اس موضوع پر کوئی غلط فہمی نہیں، تو انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ کیا ہمارا یہ سفر جہاد میں شمار ہوگا اور کیا ہمیں اس پر ثواب ملے گا؟ اس پر اگلی آیت نازل ہوئی، جس میں صحابۂ کرام کو خوشخبری دی گئی کہ انہیں اللہ تعالیٰ کی رحمت سے ضرور حصہ ملے گا۔

آیت نمبر (۲۱۸) اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۙ اُولٰٓئِكَ يَرْجُوْنَ رَحْمَتَ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۲۱۸﴾

ترجمہ: ''بے شک وہ لوگ جو ایمان لائے، اور جنہوں نے ہجرت کی، اور اللہ کی راہ میں جہاد کیا، یہی وہ لوگ ہیں جو اللہ کی رحمت کے امیدوار ہیں، اور اللہ بہت بخشنے والا، نہایت رحم کرنے والا ہے''۔

تفسیر

اللہ کی رحمت

پچھلی آیت کے نزول سے مہاجرین صحابۂ کرامؓ کو معلوم ہو گیا کہ حرام مہینہ یعنی ماہِ رجب میں انجانے میں جو ایک مشرک کا قتل ہوا، اس پر انہیں کوئی گناہ نہیں ہوا۔ تاہم، وہ اس بات میں تردد کر رہے تھے کہ کیا اس جہاد کا ثواب بھی ملے گا یا نہیں۔ ان کی بشارت اور تسلی کے لیے یہ آیت نازل ہوئی، جس میں واضح فرمایا گیا کہ جو لوگ ایمان لائے، ہجرت کی اور اللہ کی راہ میں دین کے دشمنوں سے لڑے، جبکہ ان کا مقصد دنیاوی غرض یا ذاتی مفاد نہ تھا، وہ بے شک اللہ کی رحمت کے امیدوار اور اجر و ثواب کے حق دار ہیں۔ اللہ تعالیٰ مخلصین کو اپنی رحمت سے محروم نہیں رکھتے۔

حقیقت میں جو لوگ ایمان لائے اور اللہ کی راہ میں ترکِ وطن یعنی ہجرت کی، وہ رحمتِ خداوندی کے امیدوار ہوتے ہیں۔ اب رہا اس مخصوص جہاد کا ثواب، تو چونکہ آپ کی نیت صرف جہاد تھی، اللہ تعالیٰ کے نزدیک وہ بھی جہاد ہی شمار ہوتا ہے۔ اس صفات کے حامل افراد کو ناامید ہونے کی ضرورت نہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ ان کی غلطیوں کو معاف فرمائے

گا اور ان پر رحم کرے گا۔

اس آیت کے نزول کے بعد وہ مالِ غنیمت جو حضرت عبداللہ بن جحشؓ مدینہ لے آئے تھے، جسے جو ابھی تک وحی کے انتظار میں رکھا گیا تھا، اس میں سے خُمُس یعنی پانچواں حصہ نکال کر باقی مال تقسیم کر دیا گیا۔

آیت کے آخر میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ''، یعنی اللہ مغفرت کرنے والا اور رحم کرنے والا ہے، تاکہ ایمان والوں کو یقین دلایا جائے کہ ان کی غلطیوں کی معافی کے ساتھ ساتھ اس جہاد میں اجر وثواب بھی حاصل ہوگا۔

قابلِ غور بات یہ ہے کہ یہ بشارت ایمان والوں کو انہی ہجرت اور جہاد پر دی گئی ہے جو فی سبیل اللہ ہو، نہ کہ کسی عام ترکِ وطن یا جنگ وقتال پر۔ یعنی قربانی اور مشکلات برداشت کرنے والے لوگ ہر قوم میں مل جائیں گے، مگر اگر ان کی کوششیں اللہ کی راہ میں اور دینِ حق کے لیے نہ ہوں تو اسلام اور دین میں ان کا کوئی حصہ نہیں۔

جہاد کے معنیٰ

جہاد کے معنی لغوی طور پر 'جہد' یعنی کوشش کرنے کے ہیں، اور شریعت میں اس کا مفہوم یہ ہے کہ ''اعلاءِ کلمۃ اللہ'' یعنی اللہ کا بول بالا کرنے کے لیے کوشش کی جائے، حتیٰ کہ جان تک کی قربانی دے دی جائے۔ یہ کوشش اگر قتال کے ذریعے ہو اور مقصد صرف اللہ کی رضا ہو، تو اسے جہاد کہا جاتا ہے۔

لیکن اگر اس کا مقصد صرف مال یا دنیاوی فائدہ حاصل کرنا ہو، یا کسی وطن، قوم یا ذاتی بہادری اور شجاعت کا مظاہرہ ہو، تو اللہ اور اس کے رسول کے نزدیک یہ جہاد شمار نہیں ہوتا۔ جہاد حقیقی وہ ہے جو صرف اللہ کی رضا اور خوشنودی کے لیے کیا جائے، اور ہر دنیاوی یا نفسانی غرض سے پاک ہو۔

حضرت عمر فاروقؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''تمام اعمال کی بنیاد نیتوں پر ہے اور جس شخص نے جس کام کی نیت کی، اسے وہی ملے گا''۔ یعنی جو شخص اللہ اور اس کے رسول کے لیے ہجرت کرے، اس کی ہجرت اللہ اور رسول کے لیے ہوگی۔ لیکن جو شخص دنیاوی منفعت یا کسی عورت کے حصول کے لیے ہجرت کرے، تو اس کی ہجرت اسی مقصد کے لیے شمار ہوگی۔ **(بخاری:۱)**

ایک روایت میں ذکر ہے کہ ایک شخص ام قیس نامی عورت کے لیے مدینہ کی طرف ہجرت کر گیا۔ جب صحابہؓ نے یہ معاملہ حضرت محمد ﷺ کو بتایا، تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ ایسی ہجرت کا کوئی ثواب نہیں، کیونکہ یہ خالص نیت سے نہیں تھی۔ ہجرت دین میں ایک اعلیٰ عبادت ہے، مگر اگر اس میں نیت خالص فی سبیل اللہ نہ ہو تو اس کی حقیقت اور اجر نہیں رہتا۔

اسی طرح، دیگر عبادات اور اعمال کو بھی اسی اصول کے مطابق پرکھنا چاہیے: اگر صرف اللہ کے واسطے ہوں تو صحیح اور مقبول ہیں، ورنہ بے روح اور ثواب سے خالی سمجھی جائیں گی۔

امام شافعیؒ نے فرمایا کہ یہ اصول دین میں ہر جگہ دخل رکھتا ہے: عبادات، معاملات، عادات اور مباحات بغیر صحیح اور خالص نیت کے کوئی عمل یا عبادت اللہ کے نزدیک ثواب نہیں رکھتی۔

جہاد کی تین قسمیں

جو بھی چیز اللہ کی فرمانبرداری کے راستے میں رکاوٹ بنے، اس کا مقابلہ کرنا جہاد کے دائرے میں آتا ہے۔ یہ رکاوٹ تین طریقوں سے ظاہر ہوتی ہے، اس لیے جہاد کی یہ قسمیں ہوجاتی ہیں۔ امام راغبؒ نے ان تین قسموں کی تشریح کے بعد فرمایا کہ قرآن کریم میں ارشاد ہے: ''وَجَاهِدُوْا فِي اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ''۔ یعنی اللہ کی راہ میں پورا جہاد کرو، جو ان تینوں جہادوں کو شامل کرتا ہے۔ لفظ 'جہاد' کے معنیٰ اور اس کے اجر و ثواب کو دیکھتے ہوئے، علماء نے اسے تین بنیادی اقسام میں تقسیم کیا ہے:

۱۔ کھلے طور پر دشمن سے قتال کرنا: یعنی وہ جہاد جس میں دشمن کے سامنے مقابلہ کیا جائے اور جان و مال کی قربانی دے کر اللہ کی راہ میں قتال کیا جائے یہ حقیقی جہاد ہے اور اس کے مستقل احکام ہیں۔

۲۔ شیطان اور اس کے پیدا کردہ خیالات کا مقابلہ کرنا: یعنی وہ جہاد جو دل و دماغ میں شیطان کی وسوسوں اور گمراہ کن خیالات کے خلاف کیا جائے یہ بھی ایک جہد کی قسم ہے۔

۳۔ نفس کی ناجائز خواہشات کا مقابلہ کرنا: یعنی وہ جہاد جس میں انسان اپنی نفسانی خواہشات اور برے عادات پر قابو پانے کی کوشش کرے، یہ بھی ایک جہد کی قسم ہے۔

بعض روایات میں نفس کی خواہشات کے خلاف جدوجہد کو بھی جہاد میں شمار کیا گیا ہے، کیونکہ قرآن کی کئی آیات میں مال خرچ کرنے کو بھی جہاد قرار دیا گیا ہے۔ ایک حدیث میں زبان کے جہاد کو بھی جہاد قرار دیا گیا ہے اور چونکہ قلم کی تحریر زبان کے احکام میں آتی ہے، اس لیے قلمی دفاع کو بھی علماء نے جہاد میں شامل کیا ہے۔

علماء نے حدیث ''انما الاعمال بالنیات'' یعنی اعمال کی بنیاد نیتوں پر ہے کو اسلام کے چار حصوں میں سے ایک قرار دیا ہے، کیونکہ اس پر اسلامی تعلیمات کا ایک بڑا حصہ قائم ہے۔

اس کے مطابق وہ عالم جو دنیاوی شہرت اور نام و نمود کے لیے علم دین کی خدمات انجام دیتا ہے۔ وہ غازی جو جہاد میں شہرت اور انعام کے لیے قربانی دیتا ہے اور شہید ہوجاتا ہے۔ وہ شخص جو نام و نمود کے لیے مال خرچ کرتا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ قیامت کے دن ان سے کہا جائے گا: ''جو مقصد تم نے حاصل کرنا چاہا، وہ تمہیں دنیا میں مل گیا، جیسے علم میں شہرت، جہاد میں غازی یا شہید کا لقب، اور مال خرچ کرنے میں سخی و فیاض کہا جانا۔ اب تمہیں ہم سے کیا چاہیے؟''

یہ حدیث واضح کرتی ہے کہ اعمال کا حقیقی ثواب صرف خالص نیت اور اللہ کی رضا کے لیے ہونے پر ملتا ہے، دنیاوی شہرت یا منفعت کے لیے نہیں۔

آیت نمبر (۲۱۹) يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ ؕ قُلْ فِيْهِمَآ اِثْمٌ كَبِيْرٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ ز وَاِثْمُهُمَآ اَكْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا ؕ وَيَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ ۬ قُلِ الْعَفْوَ ؕ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُوْنَ ﴿۲۱۹﴾

ترجمہ: ''وہ آپ سے شراب اور جوئے کے بارے میں پوچھتے ہیں، کہہ دیجیے: ان دونوں میں بڑا گناہ ہے اور کچھ فائدے بھی ہیں لوگوں کے لیے، لیکن ان کا گناہ ان کے فائدے سے زیادہ ہے۔ اور وہ آپ سے پوچھتے ہیں کہ کیا خرچ کریں؟ کہہ دیجیے: جو کچھ زائد ہو۔ اسی طرح اللہ تمہارے لیے آیات بیان کرتا ہے تاکہ تم غور و فکر کرو''۔

تفسیر

شراب اور جوئے کی ممانعت

اس آیت کے اس حصے میں صحابہ کرامؓ نے خمر اور میسر یعنی شراب اور جوئے کے بارے میں سوال کیا، جس کا جواب اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا۔ لفظ ''خمر'' کے معنیٰ ہیں کسی چیز کو ڈھانپنا۔ جیسے دوپٹہ یا اوڑھنی سر کو ڈھانپتی ہے، اسی طرح شراب کو خمر اس لیے کہا گیا کہ یہ انسانی عقل پر پردہ ڈال دیتی ہے اور حواسِ انسان درست طور پر کام نہیں کرتے۔ لفظ 'میسر' وسیع معنوں میں قمار اور جوئے کے تمام اقسام پر محیط ہے، چاہے وہ کسی بھی شکل یا نام سے ہوں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی آمد سے پہلے عرب میں شراب اور جوئے کا رواج عام تھا۔ اہلِ عرب ان دونوں چیزوں کے شدید دلدادہ تھے، اتنا کہ ہر چھوٹا بڑا شراب پیتا اور جوئے کی مختلف قسمیں کھیلتا۔ پورے عرب میں چند لوگ ہی ایسے ہوں گے جو ان سے محروم رہے ہوں۔ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مدینہ تشریف لائے تو وہاں بھی شراب اور جوئے کا رواج موجود تھا۔ کچھ صحابۂ کرامؓ نے اس کی تباہ کاریوں کو محسوس کیا اور حضرت عمر فاروقؓ، حضرت معاذ بن جبلؓ اور چند انصاری صحابہ نے عرض کیا کہ یہ چیزیں عقل کو نقصان پہنچاتی اور مال کو برباد کرتی ہیں، اس بارے میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا کیا ارشاد ہے؟

پہلا حکم

صحابہؓ کے اس سوال کے جواب میں یہ آیت نازل ہوئی۔ یہ پہلی آیت ہے جس میں مسلمانوں کو شراب اور جوئے سے روکنے کا پہلا حکم دیا گیا۔ اس آیت میں اگرچہ شراب اور جوئے کو صریحاً حرام نہیں کہا گیا، لیکن ان کی نقصانات اور تباہ کاریوں کو بیان کر کے گویا ایک نصیحت دی گئی کہ ان سے اجتناب کیا جائے۔

شراب کے نقصانات

آیت میں واضح کیا گیا ہے کہ یہ دونوں چیزیں بذاتِ خود گناہ نہیں، مگر ان کے استعمال سے دیگر گناہوں کا دروازہ کھل جاتا ہے۔ شراب عقل کو مفلوج کر دیتی ہے، صحت کو نقصان پہنچاتی ہے، انسان کی فطرت کو گندگی اور حرام کی طرف مائل کرتی ہے۔ جبکہ جوئے سے مال کی حرص بڑھتی ہے، جو تمام برائیوں کی جڑ ہے۔ یہ دونوں انسان کی مالی حالت کو تباہ کر دیتے ہیں، اگرچہ بعض اوقات وقتی دنیاوی فوائد بھی ساتھ ہوتے ہیں، جیسے جسمانی راحت، وقتی سکون یا تجارتی نفع۔

اسی طرح جوئے میں کبھی جیت بھی ممکن ہے اور بغیر محنت مال ہاتھ لگ سکتا ہے، مگر ان چند ممکنہ فوائد کے مقابلے میں نقصانات بہت زیادہ ہیں۔ دنیا کی کوئی چیز بھی مکمل طور پر فائدہ یا نقصان سے خالی نہیں، لیکن انسان کو نفع و نقصان کا توازن دیکھنا چاہیے۔ اگر نقصان زیادہ ہو تو اُس چیز کو ترک کرنا ضروری ہے، چاہے اس میں کچھ فائدہ بھی موجود ہو، اور جس چیز میں فائدہ زیادہ ہو تو اسے اختیار کیا جا سکتا ہے، چاہے اس میں کچھ حرج یا نقصان بھی شامل ہو۔

یہ آیت بذاتِ خود شراب اور جوئے کی برائی بیان کرنے کے لیے نازل نہیں ہوئی، بلکہ ان کے ذریعے پیدا ہونے والی دوسری خرابیوں کی نشاندہی تھی، تاکہ مسلمانوں کو ان سے دور رہنے کا مشورہ دیا جائے۔ کچھ صحابہؓ نے اس آیت کے نزول کے فوراً بعد دونوں چیزیں ترک کر دیں، حالانکہ ان پر صریحاً حرام نہیں کہا گیا تھا، کیونکہ ان میں برائی اور گناہ کا ذریعہ واضح ہو چکا تھا۔ مگر بعض صحابہؓ نے خیال کیا کہ چونکہ آیت میں شراب کو حرام نہیں کہا گیا، اس لیے وہ اسے احتیاطاً استعمال کریں گے، بس اس بات کا خیال رکھیں گے کہ اس سے برائی پیدا نہ ہو۔ اسی وجہ سے آیت کے بعد بھی کچھ لوگ شراب استعمال کرتے رہے۔

بعد میں مدینہ میں ایک واقعہ پیش آیا: حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ نے صحابہ کرامؓ میں سے اپنے چند دوستوں کو دعوت دی۔ کھانے کے بعد شراب پی گئی اور نمازِ مغرب کا وقت آ گیا۔ سب نماز کے لیے کھڑے ہوئے اور ایک شخص کو امام بنایا گیا۔ لیکن نشے کی حالت میں امام نے تلاوت شروع کی تو سورۃ ''قُلْ يٰٓاَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ'' غلط پڑھی۔ اس واقعہ کے بعد یہ آیت نازل ہوئی: ''يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْتُمْ سُكٰرٰى''۔ (سورہ نساء، آیت ۴۳)

یعنی: ''اے ایمان والو! تم نشے کی حالت میں نماز کے قریب نہ جاؤ''۔اس حکم کے ذریعے صرف نماز کے وقت شراب کے اثرات کی ممانعت کی گئی۔

اگر چہ نماز کے علاوہ باقی اوقات میں شراب پینے کی صریحاً ممانعت نہیں آئی، لیکن بعض صحابہؓ نے سمجھ لیا کہ جو چیز نماز کو متاثر کرتی ہے، اسے دیگر اوقات میں بھی نہیں اپنانا چاہیے۔تاہم بعض لوگ اب بھی نماز کے علاوہ دیگر اوقات میں شراب پیتے رہے۔

ایک اور واقعہ پیش آیا جب کچھ صحابہؓ کی ایک جگہ دعوت ہوئی۔کھانے کے بعد شراب کا دور چلا اور نشے کی حالت میں شعر وشاعری اور تکرار شروع ہوئی۔اسی دوران ایک انصاری نوجوان نے غصے میں اپنے ساتھی صحابی کے سر پر اونٹ کے جبڑے کی ہڈی ماردی، جس سے زخم ہوگیا۔یہ واقعہ رسول اللہ ﷺ تک پہنچا اور آپ ﷺ نے دعا فرمائی: ''یااللہ! شراب کے بارے میں ہمیں کوئی واضح بیان اور قانون عطا فرما''۔

اسی دعا کے بعد سورہ مائدہ کی وہ آیت نازل ہوئی جس میں شراب کو مکمل طور پر حرام قرار دیا گیا، تاکہ مسلمانوں کے لیے اس معاملے میں کوئی ابہام باقی نہ رہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْاَنْصَابُ وَالْاَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ فَاجْتَنِبُوْهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ۝۹۰ [۵:۹۰] اِنَّمَا يُرِيْدُ الشَّيْطٰنُ اَنْ يُّوْقِعَ بَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَآءَ فِي الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ وَيَصُدَّكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَعَنِ الصَّلٰوةِ ۚ فَهَلْ اَنْتُمْ مُّنْتَهُوْنَ۝۹۱

ترجمہ: ''اے ایمان والو! شراب، جوا، بت اور پانسے تو بس نری گندی باتیں ہیں شیطان کے کاموں میں سے ہیں سو ان سے بچے رہو تا کہ تم کامیاب ہو، شیطان تو بس یہی چاہتا ہے کہ تمہارے درمیان آپس میں دشمنی اور بغض، شراب اور جوئے کے ذریعہ سے ڈال دے اور تمہیں اللہ کی یاد اور نماز سے روک دے تو کیا اب بھی تم باز نہ آؤ گے''۔

شراب کی حرمت

ان آیات میں شراب کی حرمت اور ممانعت واضح طور پر نازل ہوگئی، اور یہ آخری حکم قرار پایا، جس نے پہلے کے تمام جزوی احکام کو منسوخ کر دیا۔ان آیات کے نزول کے ساتھ ہی شراب کے تمام برتن توڑ دیے گئے، مدینہ کی گلیوں میں بہتی شراب رک گئی، اور مسلمانوں نے نہ صرف فوراً توبہ کی بلکہ اس برائی سے سخت بیزاری اور نفرت اختیار کر لی۔

یوں ۳ ہجری میں اسلام میں شراب پر مکمل پابندی عائد ہوگئی، اور عرب معاشرے کی اس ایسی بدترین برائی سے ہمیشہ کے لیے نجات مل گئی، جو پہلے ان کے معاشرتی و اخلاقی زندگی میں گہری جڑیں جما چکی تھی۔ اس کا تفصیلی بیان سورۃ مائدہ کی آیات میں موجود ہے۔ یہاں صحابۂ کرامؓ کے سوالات اور ان کے جوابات کے تناظر میں شراب اور جوئے کے اثرات بیان کیے گئے تھے، جبکہ آگے دیگر مسائل پر بھی رہنمائی دی گئی۔

شراب ایک نشہ آور چیز ہے جو انسان میں نشہ پیدا کرتی ہے۔ اس کے اثرات عقل و جسم دونوں پر پڑتے ہیں، اور یہ صرف فرد کے اخلاق کے لیے ہی خطرناک نہیں بلکہ خاندان، سماج اور قوم کے لیے بھی تباہی کا سبب بنتی ہے۔ اگرچہ شراب کے بعض وقتی فوائد بھی ہیں، جیسے جسمانی توانائی کا بڑھ جانا یا کسی کام کو کرنا آسان لگنا، مگر یہ فائدے وقتی اور فانی ہیں۔ اس کے برعکس، یہ اخلاقی و سماجی اعتبار سے شدید خطرناک ہے۔

(Encyclopaedia of Religion and Ethics) میں بھی شراب کے نقصانات کی متعدد مثالیں دی گئی ہیں، جن سے واضح ہوتا ہے کہ قرآن نے شراب کو حرام قرار دے کر انسان کو عقل، اخلاق، جسمانی صحت اور سماجی زندگی کی تمام خرابیوں اور گندگیوں سے بچانے کی کوشش کی ہے۔

EXTRACTS FROM ENCYCLOPAEDIA OF RELEGION AND ETHICS VOL.1.ALCOHOL

when enough alcohol as taken to produce intoxication, judgement, self control perception, and the other higher faculties are affected first with greater facility in thought and speech, there as in a certain disregard of the environment, a quiet person may become lively and witty unwanted confidences are given and there may be assertiveness and quar-relsomeness, singing, shouting and other noisy demaonstrations indicated the free play of the emotions...such person may suffer from an isane or alcoholic heredity ...An automatic dreamstate, In which complicated, many criminal actions may be performed quite unconciously is sometimes induced by acute alcoholism. (p.300)

Self respect becomes impaired and by selfishness, neglect of wife, children and other dependents loosing of self control and want of truthfulness, the moral detariorations is signalized. (p.300)

It is estimated that in this country (U.K.) alcohol accounts for 100,000 to 120,000deaths per annum. (p.301)

Alcohol is a poison for protoplasm. Large number of psychometric experiments under conditions of the greatest accuracy prove that alcohol in small doses excersise a distinctly paralyzing effect on the working of the brain. (p.299)

The amount of work is increased and more easily performed, but after a brief period extending almost to 2o to 30 minutes ,there comes a prolonged reaction, so that the total effects is distinctly disadvantageous. (p.200)

On the whole experiments show that alcohol does not trengthen the heart but rather the reverse.

(p.300)

There is universal testimony as to the close relationship between excessive drinking and breaches of tha moral law & laws of the state. This is a direct consequence of the higher faculties, Intellectual and moral, and the resulting free play given to the lower inclinations. Alcohol can not only be a direct cause of crime, but it acts powerfully along with other conditions such as hereditary nervous weakness or instability of the brain. (p.301)

علم کیمیا کی بنیاد پر یہ بات واضح ہے کہ (Alcohol) شراب ایک قسم کی (Solvent) ہے جو خاص طور سے موٹاپے کے لئے بہت بہتر (Solvent) کہا جاتا ہے یہ پوشک پدارتھ نہ ہو کر بلکہ بیکٹر یا کے ذریعہ شوگر کو (Digest) کے دوران پیدا ہونے والا دوسرا مادہ ہے (By-Product) ہے اِس بنیاد پر یہ انسانوں کے لئے ایک نقصاندہ چیز ہے 'لیور' اسے فوراً توڑنے لگتا ہے مطلب اس کے ذریعہ پیدا ہونے والے برے اثرات کو ختم کرنے کے لئے اسے توڑ دیتا ہے، جسے (Detoxification) کہتے ہیں، اس کا فائدہ صرف اتنا ہے کہ جسم میں پیدا ہونے والے کچھ (Metabolite) کو گھول دیتا ہے اسکے بے شمار برے اثرات ہیں جس میں سے کچھ مندرجہ ذیل ہیں۔

شراب کے استعمال سے پیدا ہونے والی بیماریاں

- Cirrhosis of Liver: جگر کی وہ مخصوص بیماری جو شراب کے استعمال سے پیدا ہوتی ہے۔
- Oesophageal، سر اور آنتوں کا کینسر: شراب پینے والوں میں ان قسم کے کینسر کے خطرات میں اضافہ ہوتا ہے۔
- Oesophagitis، Gastritis، Pancreatitis، Hepatitis: یہ تمام بیماریاں شراب کے استعمال کے نتیجے میں نمودار ہوسکتی ہیں۔
- Cardiomyopathy، Hypertension، Coronary Atherosclerosis، Angina اور Heart Attack: دل اور خون کی نالیوں سے متعلق خطرات شراب کے استعمال سے نمایاں طور پر بڑھ جاتے ہیں۔
- Peripheral Neuropathy، Cortical Atrophy، Cerebellar Atrophy: یہ مخصوص Syndromes ہیں جو شراب پینے والوں میں پیدا ہوتے ہیں۔
- شراب کے استعمال سے جسم میں Thiamine کی کمی ہوجاتی ہے، جس کے نتیجے میں Wernicke-Korsakoff بیماری پیدا ہوتی ہے، جو یادداشت اور موجودہ و ماضی کے واقعات کو متاثر کرتی ہے، اور دیگر بیماریوں کا سبب بھی بنتی ہے۔
- Beri-Beri، Pellagra اور دیگر غذائی بیماریاں شرابیوں میں عام ہیں۔
- Delirium Tremors: ایک مہلک پیچیدگی جو بار بار انفیکشن یا آپریشن کے بعد شراب پینے والوں میں پیدا ہوتی

ہے۔ یہ بیماری پرہیز کے دوران یا اس کے بعد بھی اثر رکھتی ہے، اور حتی کہ بہتر علاج کے باوجود موت کا سبب بن سکتی ہے۔

● بہت سے Endocrine Disorders شراب کے اثرات کی وجہ سے ہوتے ہیں، جیسے Myxoedema، Hyperthyroidism اور Fluoride Crusting Syndrome وغیرہ۔

● خون سے متعلق متعدد بیماریاں بھی شراب کے استعمال کا نتیجہ ہیں، مثلاً Macrocytic Anemia، Zeive's Jaundice، Hyperlipidemia، Thrombocytopenia وغیرہ۔

● Metronidazole (Metrogyl/Flagyl): عام طور پر استعمال ہونے والی یہ گولی اگر شراب کے ساتھ لی جائے تو Drug Interaction کے نتیجے میں جسم کے مختلف حصوں پر خطرناک اثرات مرتب ہوتے ہیں۔

● شرابیوں کا Immunological Defense System کمزور ہوجاتا ہے، اسی سبب ان میں بار بار انفیکشن عام بات ہے۔

● شراب کے نشے میں اکثر فرد الٹی کرتا ہے، جس سے Cough Reflexes متأثر ہوتے ہیں۔ کبھی کبھار الٹی پھیپھڑوں میں چلی جاتی ہے، جو نمونیا اور Lung Abscess کا سبب بنتی ہے۔ اس کی وجہ سے کبھی کبھار گھٹن پیدا ہوتی ہے، جو جان لیوا ثابت ہوسکتی ہے۔

Extracted From -Books of Medicine -Davidson Kumar & Clark
Books of pathology - Robbins Harsh Mohan
Books of pharmacology -K.D.Tripathi

ہاضماتی نظام پر شراب کے اثرات

شراب کے سب سے پہلے مضر اثرات منہ سے شروع ہوتے ہیں۔ منہ میں موجود لعاب (Saliva) میں کئی قسم کے مائکروفلورا (Microflora) پایا جاتا ہے، جو منہ کے ماحول کی حفاظت اور توازن (Symbiosis) کا کام کرتے ہیں۔ شراب کے مسلسل استعمال سے یہ مائکروفلورا ختم ہونے لگتے ہیں، اور یہی وجہ ہے کہ شرابیوں کے منہ سے بدبو آنے لگتی ہے۔ جب یہ فلورا ختم ہوجاتے ہیں تو مسوڑھوں (Gums) میں مختلف قسم کے انفیکشن پیدا ہوجاتے ہیں، جس سے خون آنا اور زخم بن جانا معمول کی بات ہوجاتی ہے۔

منہ کے بعد اثر گلے اور کھانے کی نالی (Oesophagus) پر پڑتا ہے۔ یہ حصے حساس ہوتے ہیں کیونکہ یہاں میوکس (Mucous Membrane) کی بہت نازک تہہ موجود ہوتی ہے۔ شراب کے استعمال سے یہ تہہ متأثر ہوجاتی ہے، جس کی وجہ سے گلے میں جلن اور تکلیف پیدا ہوتی ہے، اور طویل استعمال کے نتیجے میں یہاں کینسر کا خطرہ بھی بڑھ جاتا ہے۔

شراب کی وجہ سے Gastritis بھی بہت عام ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ شراب چربی (Lipids) کو اپنے اندر

گھول دیتی ہے، جبکہ پیٹ کی اندرونی سطح خود ایک حفاظتی لِپڈ پرت (Protective Layer) سے ڈھکی ہوتی ہے۔ مسلسل شراب پینے سے یہ حفاظتی تہہ متاثر ہو جاتی ہے، اور پیٹ میں موجود Hydrochloric Acid اس کی دیواروں کو زخمی کر دیتا ہے۔ نتیجتاً پیٹ کی کئی بیماریاں پیدا ہوتی ہیں اور ہاضمہ کا عمل شدید متأثر ہوتا ہے۔

مزید برآں، شرابی اندر سے بہت کمزور ہو جاتے ہیں، کیونکہ جسم میں خون بنانے کے لیے ضروری اجزاء جگر (Liver) میں صحیح طریقے سے پیدا نہیں ہوتے۔ باہر سے وہ صحت مند لگ سکتے ہیں، لیکن اندرونی طور پر ان کے جسم کمزور ہو جاتے ہیں، اور ہڈیوں کا گودا (Bone Marrow) کافی کم ہو جاتا ہے۔ اس کی وجہ سے نسوں میں خون نظر آتا ہے۔ چونکہ جگر میں Immunoglobulin بنتا ہے جو جسم کو بیماریوں سے بچاتا ہے، شرابیوں میں اس کی پیداوار کم ہو جاتی ہے، جس سے وہ اکثر انفیکشن کا شکار ہو جاتے ہیں۔ بعض اوقات شرابیوں کا جگر شدید متأثر ہو جاتا ہے اور وہ بے ہوش ہو کر موت کا شکار ہو جاتے ہیں۔

شراب کے اثرات برخون کی گردش (Effect on Blood Circulation)

جگر (Liver) کئی اہم کام انجام دیتا ہے، جن میں سب سے اہم یہ ہے کہ یہ چربی کو توڑتا ہے اور خون میں لِپڈ (Lipids) کی مقدار کو متوازن رکھتا ہے۔ شرابیوں میں جگر یہ اہم کام درست طریقے سے نہیں کر پاتا، جس کی وجہ سے لِپڈ خون کی نالیوں کی دیواروں پر جمع ہو کر سختی پیدا کرتی ہے۔ اس سے Arterial lumen کم ہو جاتا ہے، اور دل پر اضافی بوجھ پڑتا ہے، جس کے نتیجے میں بلڈ پریشر (Hypertension) بڑھ جاتا ہے اور دیگر بیماریوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔

شراب جلد جل جاتی ہے، اس لیے خون کے بہاؤ پر بھی اثر پڑتا ہے۔ اکثر شرابیوں کی موت جگر یا دل کی خرابی، یا Heart Attack کے سبب ہوتی ہے۔ بعض لوگ سوچتے ہیں کہ تھوڑی مقدار پینے سے کیا فرق پڑتا ہے، مگر گردے، جو خون کی صفائی کے آخری مرحلے پر کام کرتے ہیں، انتہائی حساس کیمیائی عمل کرتے ہیں۔ یہ ثابت شدہ بات ہے کہ شراب کی معمولی مقدار بھی اس حساس عمل کو متاثر کر دیتی ہے، جس کی وجہ سے شرابیوں کے گردے اکثر خراب ہو جاتے ہیں۔

شراب کے اثرات براعصابی نظام (Effect on Nervous System)

شراب نسوں (Nerves) میں جا کر اثر ڈالتی ہے، کیونکہ ان کی بیرونی پرت لِپڈ (Lipid) پر مشتمل ہوتی ہے اور شراب آسانی سے اس سے گزر جاتی ہے۔ اس کے نتیجے میں تحریک (Signal Transmission) متأثر ہوتی ہے اور کئی بیماریوں کا سبب بنتی ہے۔ اس کے اثر سے بچے اور جوان سب سے زیادہ متاثر ہوتے ہیں، اور مختلف امراض جیسے Amnesia (یادداشت کا زوال)، Tremor (کپکپی)، Korsakoff Syndrome وغیرہ پیدا ہو جاتے ہیں۔

شراب مردوں میں Infertility کا سبب بن سکتی ہے، جبکہ حاملہ خواتین کے لیے یہ حمل اور بچے کے لیے شدید نقصان دہ ہے، جس کی وجہ سے Foetal Alcohol Syndrome پیدا ہوتا ہے، جو ہسپتالوں میں ایک معروف حقیقت ہے۔

شراب کے سماجی اثرات

یہ بات بالکل واضح ہے کہ شراب پی کر انسان سب سے پہلے خود کو اور پھر دوسروں کو اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہے:

۱۔ شرابی کو بہت جلد غصہ آتا ہے، جس کی وجہ سے وہ سماج میں دوسروں کو متأثر کرتا ہے۔

۲۔ عادی شرابی کو ہر حال میں شراب چاہیے، چاہے اس کے لیے ظلم یا گناہ کیوں نہ کرنا پڑے، جس کی وجہ سے چوری، ڈکیتی اور دیگر جرائم عام ہیں۔

۳۔ شرابی میں سستی، کاہلی اور کمزوری پیدا ہو جاتی ہے، جس سے ان کے کام متأثر ہوتے ہیں۔

۴۔ شراب کی وجہ سے انسان میں ہمدردی ختم ہو جاتی ہے اور پورا سماج اس کے اثر سے متاثر ہوتا ہے۔

۵۔ نشے کی حالت میں شرابی کئی دیگر جرائم کرتا ہے، جیسے گاڑی چلانا، جو خطرناک حادثات کا سبب بنتا ہے اور بعض علاقوں میں معمولی واقعہ بن چکا ہے۔

اسی لیے یہ بات بخوبی سمجھ میں آتی ہے کہ اللہ پاک نے شراب کو حرام کیوں قرار دیا۔ حقیقت میں اس پر پابندی لگا کر اللہ تعالیٰ نے انسانیت پر عظیم رحم کیا ہے۔

قمار یا جوا کے اخلاقی اور اقتصادی نقصانات

۱۔ قمار انسان کو محنت سے دور کرتا ہے: جوا انسان کو نصیب اور صرف خواہشات پر بھروسہ کرنا سکھاتا ہے، جبکہ اصل زندگی میں کامیابی کے لیے محنت، مناسب کوشش اور اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی وسائل پر انحصار ضروری ہے۔ اسلام یہی چاہتا ہے کہ انسان اپنے مقصد کو مناسب ذرائع اور کوشش کے ذریعے حاصل کرے، نہ کہ صرف قسمت پر انحصار کرے۔

۲۔ مال کی ناجائز حصولی: قمار یا جوا لوگوں کے مال کو ناجائز طریقے سے ہتھیانے کے مترادف ہے۔

۳۔ دشمنی اور نفرت پیدا کرتا ہے: جوئے کے کھیل میں ہارنے والا اگرچہ بظاہر خاموش رہتا ہے، مگر اس کی خاموشی میں غصہ اور نفرت چھپی ہوتی ہے، جو تعلقات کو بگاڑ دیتی ہے۔

۴۔ سماجی اور خاندانی نقصان: جواری اپنی جان اور اپنے خاندان کی ذمہ داریوں کی پرواہ نہیں کرتا۔ ایسے لوگ اپنے مفاد کے لیے اپنے دین، عزت اور یہاں تک کہ اپنے ملک کو بھی خطرے میں ڈال سکتے ہیں، اس لیے جوئے کا شوق نہ صرف فرد کے لیے بلکہ پورے سماج کے لیے خطرناک ہے۔

۵۔شراب اور جوا کی ایک جیسی تباہ کاری: قرآن مجید میں شراب اور جوئے کو ایک ساتھ ذکر کر کے اس حقیقت کو واضح کیا گیا ہے کہ یہ دونوں چیزیں فرد، خاندان، ملک اور اخلاقیات کے لیے یکساں نقصان دہ ہیں۔ جواری کا حال شرابی سے بہت ملتا جلتا ہے، اور اکثر ایک کے بغیر دوسرے کا وجود نہیں پایا جاتا۔

EXTRACTS FROM ENCYCLOPAEDIA Of RELIGION AND ETHICS VOL. GAMBLING

On the aryan races gambling has a special hold, A famous hymn of the rigveda (x34) vividly sets forth the woe of the ruined gambler, and the length to which gambling was carried in India is well illustrated by the episode of Nala and Damyanti in the Mahabharata (111 59-61)Where the prince loses all that he has .....Sanskrit Literature abounds in allusions to the evils of play. (p.64)

The vicious tendency of gambling has never been called in question .Lord beaconsfield spoke of it as a vast engine of national demoralisation. (p.166)

The economic aspect needs no discussion .Gambling add nothing to the wealth to the community. (p.166)

Though it is in society that the temptation comes, Gambling itself is anti-social it is as Herbert spencer says, it is a kind of action by which pleasure is obtained at the cost of the paint to another. The happiness of the winner implies the misery of the loser. This kind of action therefore is essentially anti social, it scars the sympathies, cultivates a hard ego ism, and so produsces a general detarioration of character, it is habit intrinsically savage ....in at atmosphere of brotherhood no form of gambling could exist. (p.166)

There are only three ways in which property can be ligitimately acquired by gift, by labour, and by exchange. Gambling stands outside all of these.

Its motive is however carefully disguised covetousness. It is an attempt to get property without paying the price for it, It is violationof law of eqvivallents. It is kind of robbery by mutual agreement s, but it is stilrobbery, just as duelling which is murder by mutual agreement is still treated as murder, It is begotten of convetousness, it leads to idleness, it is moreover an appeal to chance it concentrates attention upon luck and thereby withdraws, attention from worthier objects of life.

یہ سورۂ مبارکہ میں صحابۂ کرامؓ کے سوالات اور ان کے جوابات کا جو سلسلہ چل رہا ہے، اس میں پچھلی آیت میں شراب اور جوئے سے متعلق سوال کا جواب دیا گیا تھا۔ اسی تسلسل میں پہلے بھی صحابۂ کرامؓ نے یہ سوال کیا تھا کہ: ''وَيَسْئَلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ'' ہم اپنے مال میں سے کیا خرچ کریں؟۔ بعینہٖ یہی سوال دوبارہ انہی الفاظ کے ساتھ پیش کیا گیا، مگر پہلے موقع پر اس کا جواب کچھ اور دیا گیا تھا اور اس مرتبہ کچھ اور انداز میں دیا گیا ہے۔ اب یہ بات سمجھنے کی ہے کہ ایک ہی سوال کے دو مختلف جواب دینے میں کیا حکمت پوشیدہ ہے؟ یہ حکمت ان حالات اور پس منظر سے واضح ہو جاتی ہے جن میں یہ آیات نازل ہوئیں۔

پہلے سوال کے موقع پر صحابۂ کرامؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے دریافت کیا تھا کہ ہم اپنے مال میں سے کیا خرچ کریں اور کسے دیں؟ اس سوال کے دو حصے تھے:

۱۔ مال میں سے کتنا اور کیا خرچ کیا جائے؟

۲۔ اس مال کا مصرف کون لوگ ہوں؟

اس کا جواب یہ دیا گیا کہ جو بھی مال اللہ کی راہ میں خرچ کرو، اس کے سب سے زیادہ حق دار تمہارے والدین، رشتہ دار، یتیم، مسکین اور مسافر ہیں۔ اور یہ بھی فرمایا گیا کہ جو کچھ بھی تم خرچ کرو، اللہ تعالیٰ اس سے پوری طرح باخبر ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے کسی خاص مقدار کو لازم قرار نہیں دیا، بلکہ یہ فرمایا کہ اپنی استطاعت اور طاقت کے مطابق خرچ کرو، اور اس کا اجر وثواب اللہ کے ہاں ضرور ملے گا۔

لیکن اس آیت کے نزول کا پس منظر یہ ہے کہ جب قرآن میں عمومی طور پر یہ حکم دیا گیا کہ مسلمان اپنے مال اللہ کی راہ میں خرچ کریں تو کچھ صحابۂ کرامؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا: ''یا رسول اللہ! ہمیں انفاق فی سبیل اللہ کا حکم ملا ہے، براہِ کرم وضاحت فرمایئے کہ ہم کون سا مال اور کس قدر خرچ کریں؟''۔

روایات میں آتا ہے کہ حضرت معاذ بن جبلؓ اور حضرت ثعلبہؓ بارگاہِ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں حاضر ہو کر عرض گزار ہوئے: ''یا رسول اللہ! ہمارے پاس مال و دولت بھی ہے، اہل وعیال بھی ہیں اور غلام بھی۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی راہ میں خرچ کرنے کا حکم دیا ہے، تو ہمیں بتایئے کہ ہم خیر کے کاموں میں کتنا مال خرچ کیا کریں؟''۔

اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: ''**قُلِ الْعَفْوَ**'' یعنی جو کچھ تمہاری ضرورت سے زائد ہو، وہ اللہ کی راہ میں خرچ کرو۔ مفسرین نے اس کی کئی تفسیریں بیان کی ہیں، لیکن خلاصہ یہی ہے کہ خرچ ہمیشہ ایسا ہو جو اپنی ضروریات پوری کرنے کے بعد بچ جائے۔ ایسا خرچ نہ ہو کہ انسان خود دنیاوی تنگی و مشقت میں پڑ جائے یا کسی دوسرے کا حق ادا کرنے سے محروم ہو کر آخرت کی جواب دہی میں مبتلا ہو۔

یہاں واضح ہے کہ سوال زکوٰۃ، صدقۂ فطر یا عشر جیسی واجب عبادات کے بارے میں نہیں تھا کیونکہ ان کی مقدار اور تفصیلات تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے الگ سے بیان فرما دی تھیں۔ بلکہ یہاں سوال عام صدقات اور نفلی خیرات کے متعلق تھا، جس کا جواب یہ دیا گیا کہ ضرورت سے زائد مال اللہ کی راہ میں خرچ کرو۔

اسی مفہوم کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک اور موقع پر اس طرح بیان فرمایا: حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: اے ابنِ آدم! تو خرچ کر، میں تجھ پر خرچ کروں گا''۔ **(بخاری: ۵۳۵۲)**

یہ ارشاد دراصل اس حقیقت کی طرف رہنمائی کرتا ہے کہ اللہ کی راہ میں خرچ کرنا کبھی کمی کا باعث نہیں بنتا، بلکہ

اللہ تعالیٰ اپنے بندے پر اس سے کہیں زیادہ فضل وکرم فرماتا ہے۔

آیت نمبر (۲۲۰) فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ؕ وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْيَتٰمٰى ؕ قُلْ اِصْلَاحٌ لَّهُمْ خَيْرٌ ؕ وَاِنْ تُخَالِطُوْهُمْ فَاِخْوَانُكُمْ ؕ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ الْمُفْسِدَ مِنَ الْمُصْلِحِ ؕ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَاَعْنَتَكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿۲۲۰﴾

ترجمہ: ''دنیا اور آخرت کے بارے میں۔ اور وہ آپ سے یتیموں کے بارے میں پوچھتے ہیں، کہہ دیجیے: ان کی اصلاح کرنا بہتر ہے، اور اگر تم ان کے ساتھ مل کر رہو (یعنی ان کے معاملات میں شریک ہو جاؤ) تو وہ تمہارے بھائی ہیں، اور اللہ جانتا ہے کہ فساد کرنے والا کون ہے اور اصلاح کرنے والا کون ہے۔ اور اگر اللہ چاہتا تو تمہیں مشکل میں ڈال دیتا، یقیناً اللہ زبردست، بڑی حکمت والا ہے''۔

تفسیر امام ابوداؤد اور امام حاکم وغیرہ نے حضرت ابنِ عباسؓ سے روایت کی ہے کہ جب یہ آیات نازل ہوئیں: ''وَلَا تَقْرَبُوْا مَالَ الْيَتِيْمِ'' اور ''اِنَّ الَّذِيْنَ يَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ الْيَتٰمٰى .....'' تو جن کے زیرِ پرورش کوئی یتیم ہوتا، انہوں نے یتیم کے کھانے کو اپنے کھانے سے اور اس کے پینے کو اپنے پینے سے الگ کر دیا۔ حتیٰ کہ اپنے دسترخوان پر یتیم کے لئے زیادہ چیز رکھ دیتے تاکہ کوئی دوسرا نہ کھالے یا ضائع نہ کر دے۔ لیکن یہ طرزِ عمل صحابۂ کرامؓ کے لئے دشوار ہو گیا۔ انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے اس مشکل کا ذکر کیا تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: ''كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُوْنَ ﴿۲۱۹﴾ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ''۔

(یعنی اللہ تعالیٰ اسی طرح اپنے احکام کو تمہارے لئے واضح کرتا ہے تاکہ تمہیں ان کا صحیح علم ہو جائے اور اس علم کے ذریعے تم ہر عمل سے پہلے دنیا و آخرت کے انجام پر غور کرو اور پھر سوچ سمجھ کر ان احکام کے مطابق عمل کرو) اس حکم کی تفصیل یہ ہے:

۱۔ گناہ کے کاموں میں مال خرچ کرنا سراسر ناجائز ہے۔

۲۔ اگر دینی کام فرض یا واجب ہوں جیسے زکوٰۃ وغیرہ، تو ان پر مال خرچ کرنا بھی فرض اور واجب ہے۔

۳۔ اگر دینی کام نفلی ہوں، مثلاً عام صدقہ وخیرات:

اگر اس خرچ سے گھر والوں کا حق ضائع ہوتا ہو تو یہ خرچ ناجائز ہے۔

اگر کسی کا حق ضائع نہیں ہوتا لیکن انسان خود تنگی اور بے صبری میں مبتلا ہو جائے تو بھی ناجائز ہے۔

البتہ اگر نہ کسی کا حق ضائع ہوتا ہو اور نہ خود کو پریشانی لاحق ہوتی ہو تو پھر اس طرح خرچ کرنا جائز ہے۔

۴۔اگر خرچ نہ دینی کام میں ہو اور نہ گناہ میں بلکہ مباحات میں ہو، جیسے پارک وغیرہ میں، تو یہ نیت پر منحصر ہے:
نیت عبادت کی ہو تو ثواب اور اجر ملے گا اور اگر نیت گناہ کی ہو تو گناہ ہوگا۔اور اگر صرف دل خوش کرنے کی نیت ہو تو وہ مباح ہے، نہ اس میں ثواب ہے نہ گناہ۔ یہاں صحابۂ کرامؓ کا سوال خاص طور پر یتیموں کے متعلق تھا، اور اللہ تعالیٰ نے حکمت ورحمت کے ساتھ اس کا جواب عطا فرمایا۔

یتیم کے متعلق حکم

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ''جو لوگ ظلم کے ساتھ یتیموں کا مال کھاتے ہیں، وہ اپنے پیٹ میں آگ بھرتے ہیں''۔(النساء:۱۰) اور فرمایا: ''اور یتیم کے مال کے قریب بھی نہ جاؤ مگر بہتر طریقے سے''۔(الانعام:۱۵۳)
لفظ ''یتامیٰ''، ''یتیم'' کی جمع ہے۔''یتیم'' اس نابالغ بچے یا بچی کو کہتے ہیں جس کے والد یا والدہ یا دونوں کا سایہ سر سے اٹھ گیا ہو۔اگر بچہ باپ کے سائے سے محروم ہو تو اس کی یتیمی اور بھی زیادہ قابلِ رحم بن جاتی ہے۔
ابتدا میں جب یتیموں کے حق کی ادائیگی میں لوگوں سے پوری احتیاط نہیں ہوتی تھی، تو قرآنِ کریم نے نہایت سخت انداز میں حکم دیا: ''وَلَا تَقْرَبُوْا مَالَ الْيَتِيْمِ اِلَّا بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ''۔(بنی اسرائیل:۳۴)
یعنی جو لوگ یتیموں کا مال ناحق کھاتے ہیں، وہ اپنے پیٹ آگ سے بھر رہے ہیں اور عنقریب بھڑکتی ہوئی جہنم میں ڈالے جائیں گے۔ یہ آیات سن کر صحابۂ کرامؓ جو اللہ کے حکم پر اپنی جانیں قربان کرنے والے اور اس کے غضب سے لرزاں رہنے والے تھے، سخت خوف زدہ ہو گئے۔ جو یتیم ان کی پرورش میں ہوتے، انہیں اپنے ساتھ کھلانے پلانے میں شریک رکھتے تھے۔اب یہ اندیشہ ہونے لگا کہ کہیں یتیم کا حصہ کم یا زیادہ نہ ہو جائے، اور اس وعیدِ شدید کا مصداق نہ بن جائیں۔اس خوف نے انہیں مجبور کیا کہ یتیم کے لئے الگ کھانا پکوایا جائے، الگ برتن میں رکھا جائے۔اگر وہ کھانا بچ جاتا تو دوسرے وقت اسی یتیم کو کھلایا جاتا یا ضائع ہو جاتا۔
اس طرح ایک طرف یتیم خود نقصان میں رہنے لگے اور دوسری طرف سرپرست شدید پریشانی میں پڑ گئے۔ آخر کار وہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ اس بارے میں وضاحت فرما دیجیے۔تب یہ آیت نازل ہوئی اور اجازت دی گئی کہ نیک نیتی اور امانت داری کے ساتھ یتیم کے مال کو اپنے مال کے ساتھ ملا لینا درست ہے۔

یتیم کے مال کو مشترک رکھنا

اس آیت سے معلوم ہوا کہ ایسی چیزیں جو خراب ہونے والی ہوں، نیک نیتی سے یتیم کے ساتھ مشترک رکھنا درست ہے۔البتہ دوسرے معاملات میں الگ حساب رکھنا لازم ہے۔ چونکہ اس آیت کے نزول کے وقت مسلمانوں کی

پرورش میں عموماً مسلمان یتیم ہی ہوتے تھے، اس لیے فرمایا گیا: ''فَاِخْوَانُكُمْ'' یعنی وہ تمہارے بھائی ہیں۔لیکن اگر کسی غیر مسلم یتیم کی کفالت کسی مسلمان کے ذمہ ہوتو اس کا بھی یہی حکم ہے۔اس کی تائید دوسری آیات اور احادیث سے ہوتی ہے۔ بلکہ غیر مسلم یتیم کے بارے میں مزید تاکید ہے کہ اس کی مذہبی آزادی پر کوئی قدغن نہ لگائی جائے۔جب وہ بالغ ہوجائے تو اس پر اسلام قبول کرنے کے لئے دباؤ ڈالنا یا جبر کرنا قطعاً جائز نہیں، بلکہ اسے اپنی رائے اور عقیدے کے انتخاب کا پورا حق دیا جائے۔

اس آیت کا مقصد یتیم کی بھلائی، اس کی کامیابی اور خیر خواہی کی تعلیم دینا ہے۔مزید یہ کہ یہاں اس حقیقت کو بھی واضح کر دیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ عالم الغیب ہے۔ وہ نیتوں کے بھید جانتا ہے۔اگر سرپرست نیک نیت ہوتو اللہ تعالیٰ اس کے اخلاص سے واقف ہے، اور اگر بدنیتی کرے تو وہ اس پر بھی پوری طرح مطلع ہے۔

آیت نمبر(۲۲۱) وَلَا تَنْكِحُوا الْمُشْرِكٰتِ حَتّٰى يُؤْمِنَّ ؕ وَلَاَمَةٌ مُّؤْمِنَةٌ خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكَةٍ وَّلَوْ اَعْجَبَتْكُمْ ۚ وَلَا تُنْكِحُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَتّٰى يُؤْمِنُوْا ؕ وَلَعَبْدٌ مُّؤْمِنٌ خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكٍ وَّلَوْ اَعْجَبَكُمْ ؕ اُولٰٓئِكَ يَدْعُوْنَ اِلَى النَّارِ ۖۚ وَاللّٰهُ يَدْعُوْٓا اِلَى الْجَنَّةِ وَالْمَغْفِرَةِ بِاِذْنِهٖ ۚ وَيُبَيِّنُ اٰيٰتِهٖ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ ﴿۲۲۱﴾

ترجمہ: ''مشرک عورتوں سے نکاح نہ کرو جب تک کہ وہ ایمان نہ لے آئیں، اور بے شک ایک مومن لونڈی مشرکہ عورت سے بہتر ہے، اگرچہ وہ تمہیں کتنی ہی اچھی لگے۔اور مومن عورتوں کا نکاح بھی مشرک مردوں سے نہ کرو جب تک کہ وہ ایمان نہ لے آئیں، بے شک ایک مومن غلام مشرک مرد سے بہتر ہے اگرچہ وہ تمہیں اچھا لگے۔ یہ مشرک لوگ دوزخ کی طرف بلاتے ہیں، اور اللہ اپنے حکم سے جنت اور مغفرت کی طرف بلاتا ہے، اور وہ لوگوں کے لیے اپنی آیات کھول کھول کر بیان کرتا ہے تاکہ وہ نصیحت حاصل کریں''۔

تفسیر اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ''وَيَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْمَحِيْضِ ؕ''۔

امام مسلمؒ اور امام ترمذیؒ نے حضرت انسؓ سے روایت کی ہے کہ یہودیوں کا یہ طریقہ تھا کہ جب کسی عورت کو حیض آتا تو نہ وہ اس کے ساتھ کھاتے پیتے اور نہ ہی بستر پر اس کے قریب جاتے۔اس پر صحابۂ کرامؓ نے رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا۔تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی کہ حیض کی حالت میں صرف صحبت ممنوع ہے، اس کے علاوہ باقی سب معاملات جائز ہیں۔(مسلم، حدیث:۳۰۲)

مسلمان مرد اور کافرہ عورت کے نکاح کا حکم

اس آیتِ کریمہ میں ایک نہایت اہم مسئلہ بھی بیان کیا گیا کہ مسلمان مرد کا نکاح کافرہ عورت سے کرنا جائز ہے یا نہیں؟ ابتدائی دور میں مسلمان مردوں اور کافر عورتوں کے درمیان نکاح کی اجازت تھی، اسی طرح مسلمان عورتوں اور کافر مردوں کے ساتھ بھی نکاح کا رواج تھا، مگر اس آیت کے نزول کے بعد یہ حکم منسوخ ہو گیا۔

شانِ نزول کے حوالے سے روایت ہے کہ یہ آیت حضرت عبداللہ بن رواحہؓ کے بارے میں نازل ہوئی۔ ان کی ایک کالی باندی تھی۔ ایک مرتبہ کسی بات پر غصے میں آ کر انہوں نے اسے مار دیا۔ باندی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں شکایت لے کر حاضر ہوئی۔ بعد میں جب حضرت عبداللہ بن رواحہؓ کو اپنی غلطی کا احساس ہوا تو وہ نادم ہوئے اور عرض کیا: یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! میری اس خطا کا کفارہ یہی ہے کہ میں اسے آزاد کر کے نکاح میں لے آؤں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مشورے سے انہوں نے باندی کو آزاد کیا اور نکاح کر لیا۔ لوگوں نے طعنہ دیا کہ ایک کالی باندی سے نکاح کر لیا ہے۔ اس موقع پر یہ آیت نازل ہوئی۔ ممکن ہے کہ یہ اور دیگر واقعات بھی اس آیت کے نزول کا سبب بنے ہوں۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''کافر عورتوں سے نکاح مت کرو جب تک وہ ایمان نہ لے آئیں۔ اور ایک مومنہ عورت، چاہے وہ لونڈی ہی کیوں نہ ہو، ایک آزاد کافر عورت سے ہزار درجے بہتر ہے، چاہے وہ کافر عورت اپنے حسن یا دولت کی وجہ سے تمہیں کتنی ہی اچھی لگے۔ اسی طرح اپنی مسلمان عورتوں کا نکاح کافروں سے مت کرو جب تک وہ ایمان نہ لائیں۔ ایک مومن غلام، کافر آزاد مرد سے کہیں بہتر ہے، چاہے وہ کافر مرد اپنے مال یا جاہ کی وجہ سے کتنا ہی اچھا لگے''۔

ممانعت کی وجہ

کافروں کے ساتھ نکاح سے منع کرنے کی بنیادی وجہ یہ بیان کی گئی کہ کافر اپنے طرزِ زندگی اور دعوت کے ذریعے جہنم کی طرف لے جاتے ہیں، کیونکہ وہ کفر کی ترغیب دیتے ہیں اور کفر کا انجام جہنم کے سوا کچھ نہیں۔ اس کے برعکس اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو جنت اور مغفرت کی طرف بلاتا ہے۔ اسی مقصد کے لئے اللہ تعالیٰ اپنے احکام کھول کھول کر بیان کرتا ہے تاکہ لوگ ان پر غور کریں، نصیحت حاصل کریں اور جنت و مغفرت کے حقدار بن سکیں۔

خلاصۂ حکم

اس آیت کے نزول سے پہلے عرب معاشرے میں مسلمان مردوں کا کافر عورتوں سے اور مسلمان عورتوں کا کافر مردوں سے نکاح عام تھا، مگر اس آیت کے بعد یہ رواج ختم کر دیا گیا اور دو واضح احکام دیے گئے: ۱۔ مسلمان مرد کا

نکاح کافرہ عورت سے نہ کیا جائے۔ ۲۔ مسلمان عورت کا نکاح کافر مرد سے نہ کیا جائے۔

مسلمان مرد کا نکاح کافرہ عورت سے

اس حکم کی وضاحت یہ ہے کہ کسی کافرہ عورت سے مسلمان مرد کا نکاح شرعاً جائز نہیں، لہٰذا ہندو یا آتش پرست عورت کے ساتھ نکاح کرنا حرام ہے۔ البتہ اگر کوئی عورت حقیقی معنوں میں 'کتابیہ' ہو، یعنی یہود یا نصاریٰ میں سے ہو اور اللہ کی نازل کردہ آسمانی کتاب کو مانتی ہو، تو سورۂ مائدہ کی آیت کے مطابق اس سے نکاح جائز ہے: ''وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ'' (یعنی جو پارسا عورتیں اہلِ کتاب میں سے ہیں، وہ بھی تمہارے لئے حلال ہیں)۔

البتہ شرط یہ ہے کہ وہ عورت مرتد نہ ہو، یعنی اسلام قبول کرنے کے بعد دوبارہ یہودیت یا نصرانیت کی طرف نہ لوٹی ہو۔ اگر عورت صحیح معنوں میں کتابیہ ہے تو نکاح درست تو ہے مگر پسندیدہ نہیں۔

حدیث میں دین دار عورت سے نکاح کرنے کی تلقین ہے، اس لیے بد دین عورت سے تعلق قائم کرنا پسندیدہ عمل نہیں۔ اس سلسلے میں ایک نکتہ ذہن نشین رہے کہ آج کل بہت سے ایسے لوگ جو خود کو عیسائی یا یہودی کہتے ہیں، دراصل ان کے عقائد کتابی نہیں ہوتے۔ مثال کے طور پر بعض انگریزوں کو عیسائی سمجھا جاتا ہے، حالانکہ تحقیق سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ نہ اللہ کو مانتے ہیں، نہ حضرت عیسیٰؑ کی نبوت کے معترف ہیں اور نہ انجیل کو آسمانی کتاب مانتے ہیں۔ حقیقت میں وہ دہریہ یا لامذہب ہیں۔ لہٰذا ایسی عورتوں سے نکاح شرعاً ناجائز ہے۔

مسلمان عورت کا نکاح کافر مرد سے

اس دوسرے حکم کی وضاحت یہ ہے کہ مسلمان عورت کا نکاح کسی کافر مرد کے ساتھ، خواہ وہ کتابی ہو یا غیر کتابی، کسی صورت جائز نہیں۔ بلکہ اگر پہلے سے نکاح ہوا ہو اور ایک شریکِ حیات کافر اور دوسرا مسلمان ہو جائے، تو نکاح باقی نہیں رہتا۔ اس کی چند مثالیں ہیں:

۱۔ اگر کوئی مسلمان مرد مرتد ہو جائے اور اس کی بیوی مسلمان ہو تو نکاح فوراً ختم ہو جائے گا۔ عورت عدت گزار کر دوسرے مسلمان مرد سے نکاح کر سکتی ہے۔

۲۔ اگر کوئی کافر عورت اسلام قبول کر لے اور وہ کسی کافر مرد کے نکاح میں ہو لیکن اس کا شوہر مسلمان نہ ہو تو یہ نکاح ختم ہو جائے گا۔

اگر یہ معاملہ ''دارالسلام'' (اسلامی حکومت) میں ہو تو مرد کو اسلام کی دعوت دی جائے گی۔ اگر وہ قبول کر لے تو نکاح برقرار رہے گا، ورنہ ٹوٹ جائے گا۔

لیکن اگر یہ معاملہ ''دارالحرب'' میں ہو تو مرد کو دعوت دینے کی ضرورت نہیں۔ عورت کے اسلام لانے کے بعد جب تین حیض گزر جائیں، یا حیض نہ آنے کی صورت میں تین ماہ مکمل ہو جائیں، یا حمل ہو تو بچے کی ولادت کے بعد، یہ نکاح از خود ختم ہو جائے گا۔

ہر حال میں نکاح ختم ہونے کے بعد عورت پر عدت واجب ہوگی اور عدت پوری کرنے کے بعد وہ کسی دوسرے مسلمان مرد سے نکاح کر سکتی ہے۔

علماء نے یہ بھی لکھا ہے کہ آج کے دور میں مادیت اور سائنس کے غلبے نے یہود و نصاریٰ کو بھی ان کے اصل مذہب سے دور کر دیا ہے۔ اسی طرح بہت سے مسلمان کہلانے والے مغربی تہذیب کے دلدادہ نوجوان دہریہ اور لادین نظریات کے شکار ہو گئے ہیں۔ نہ اللہ اور رسول پر ایمان رکھتے ہیں، نہ شریعت اور آخرت کو مانتے ہیں۔ ایسے لوگوں سے مسلمان عورت کا نکاح ہرگز جائز نہیں۔ بلکہ اگر نکاح کے بعد بھی کسی فریق کے عقائد کفر کی طرف مائل ہو جائیں تو نکاح فوراً ٹوٹ جاتا ہے۔

اسی لیے نہایت ضروری ہے کہ نکاح سے پہلے ایک دوسرے کے عقائد کا اچھی طرح اطمینان کر لیا جائے۔ اگر نکاح کے بعد شوہر کے عقائد میں کفر یا الحاد ثابت ہو جائیں تو دیندار عورت پر لازم ہے کہ فوراً اس سے علیحدگی اختیار کرے، اور اولیاء و سرپرستوں کی ذمہ داری ہے کہ عورت کی اس معاملے میں مدد کریں۔

اس آیت میں کافرہ اور مشرکہ عورتوں سے نکاح کو ممنوع قرار دیا گیا ہے اور مشرک و کافر مردوں سے مسلمان عورت کے نکاح کو صریحاً ناجائز ٹھہرایا گیا ہے۔ ساتھ ہی یہ حقیقت بھی واضح کر دی گئی کہ کوئی کافر خواہ کس قدر حسین و جمیل، دولت مند، عزت و حکومت والا کیوں نہ ہو، وہ اللہ کے ایک غریب مگر ایمان والے بندے کے برابر نہیں ہو سکتا۔

اللہ تعالیٰ نے اس حکم کی وجہ بھی بیان کر دی کہ کافر ہمیشہ انسان کو اللہ کی نافرمانی، سرکشی اور گناہ کی راہ دکھاتا ہے، جس کا انجام جہنم ہے۔ اس کے برعکس اللہ تعالیٰ انسانوں کو ایمان و عمل صالح کی طرف بلاتے ہیں، جنت اور مغفرت کی طرف متوجہ کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ بندے ایسے عقائد و اعمال اختیار کریں جن کے نتیجے میں وہ بخشش کے حقدار بنیں اور جنت میں داخل ہوں۔

آخر میں یہ بھی فرمایا کہ اللہ تعالیٰ اپنے احکام اور قوانین لوگوں پر واضح کرتے ہیں تاکہ وہ ان کی حکمت پر غور کریں، ان سے نصیحت حاصل کریں اور پھر ان پر عمل کرتے ہوئے اسلام و ایمان کی قدر کریں اور یکسر شریعت کے احکام کے پابند بن جائیں۔

❁❁❁

ترجمہ- آیت نمبر ۲۲۲ سے ۲۲۹ تک

وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْمَحِيْضِ ؕ قُلْ هُوَ اَذًى ۙ فَاعْتَزِلُوا النِّسَآءَ فِي الْمَحِيْضِ ۙ وَلَا تَقْرَبُوْهُنَّ حَتّٰى يَطْهُرْنَ ۚ فَاِذَا تَطَهَّرْنَ فَاْتُوْهُنَّ مِنْ حَيْثُ اَمَرَكُمُ اللّٰهُ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ التَّوَّابِيْنَ وَيُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِيْنَ ﴿۲۲۲﴾ نِسَآؤُكُمْ حَرْثٌ لَّكُمْ ۪ فَاْتُوْا حَرْثَكُمْ اَنّٰى شِئْتُمْ ۫ وَقَدِّمُوْا لِاَنْفُسِكُمْ ؕ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ مُّلٰقُوْهُ ؕ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۲۲۳﴾ وَلَا تَجْعَلُوا اللّٰهَ عُرْضَةً لِّاَيْمَانِكُمْ اَنْ تَبَرُّوْا وَتَتَّقُوْا وَتُصْلِحُوْا بَيْنَ النَّاسِ ؕ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۲۲۴﴾ لَا يُؤَاخِذُكُمُ اللّٰهُ بِاللَّغْوِ فِيْٓ اَيْمَانِكُمْ وَلٰكِنْ يُّؤَاخِذُكُمْ بِمَا كَسَبَتْ قُلُوْبُكُمْ ؕ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ ﴿۲۲۵﴾ لِلَّذِيْنَ يُؤْلُوْنَ مِنْ نِّسَآئِهِمْ تَرَبُّصُ اَرْبَعَةِ اَشْهُرٍ ۚ فَاِنْ فَآءُوْ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۲۲۶﴾ وَاِنْ عَزَمُوا الطَّلَاقَ فَاِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۲۲۷﴾ وَالْمُطَلَّقٰتُ يَتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ ثَلٰثَةَ قُرُوْٓءٍ ؕ وَلَا يَحِلُّ لَهُنَّ اَنْ يَّكْتُمْنَ مَا خَلَقَ اللّٰهُ فِيْٓ اَرْحَامِهِنَّ اِنْ كُنَّ يُؤْمِنَّ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ وَبُعُوْلَتُهُنَّ اَحَقُّ بِرَدِّهِنَّ فِيْ ذٰلِكَ اِنْ اَرَادُوْٓا اِصْلَاحًا ؕ وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِيْ عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ۪ وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ ؕ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿۲۲۸﴾ اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ ۪ فَاِمْسَاكٌ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ تَسْرِيْحٌ بِاِحْسَانٍ ؕ وَلَا يَحِلُّ لَكُمْ اَنْ تَاْخُذُوْا مِمَّآ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ شَيْـًٔا اِلَّآ اَنْ يَّخَافَآ اَلَّا يُقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ ؕ فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا يُقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ ۙ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا فِيْمَا افْتَدَتْ بِهٖ ؕ تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ فَلَا تَعْتَدُوْهَا ۚ وَمَنْ يَّتَعَدَّ حُدُوْدَ اللّٰهِ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۲۲۹﴾

ترجمہ:

(۲۲۲)۔ وہ آپ سے حیض (ماہواری) کے بارے میں پوچھتے ہیں۔ آپ فرما دیجیے کہ یہ ایک گندگی (ناپاکی) ہے، اس لیے حیض کے دوران عورتوں سے علیحدہ رہو اور ان سے مباشرت نہ کرو جب تک کہ وہ پاک نہ ہو جائیں، پھر جب وہ پاک ہو جائیں تو ان کے پاس اس طرح آؤ جیسے اللہ نے تمہیں حکم دیا ہے۔ یقیناً اللہ توبہ کرنے والوں کو اور پاک رہنے والوں کو پسند کرتا ہے۔ (۲۲۳)۔ تمہاری عورتیں تمہاری کھیتیاں ہیں، لہٰذا اپنی کھیتی میں جس طرح چاہو آؤ، اور اپنے لیے نیک اعمال آگے بھیجو، اور اللہ سے ڈرتے رہو، اور جان لو کہ تمہیں اللہ سے ملنا ہے، اور ایمان والوں کو خوشخبری دے دو۔ (۲۲۴)۔ اور اللہ کے نام کو اپنی قسموں کے لیے بہانہ نہ بناؤ کہ تم نیکی نہ کرو، اور پرہیزگاری

نہ اختیار کرو، اور لوگوں کے درمیان صلح نہ کراؤ، اور اللہ سب کچھ سننے والا، جاننے والا ہے۔(۲۲۵)۔ اللہ تمہاری بے مقصد قسموں پر مؤاخذہ نہیں کرتا، لیکن وہ ان قسموں پر مؤاخذہ کرتا ہے جو دل سے کی جائیں، اور اللہ بہت معاف کرنے والا، بہت بردبار ہے۔(۲۲۶)۔ وہ لوگ جو اپنی بیویوں کے پاس نہ جانے کی قسم کھا بیٹھتے ہیں، ان کے لیے چار مہینے کی مہلت ہے، پھر اگر رجوع کر لیں تو بے شک اللہ بہت بخشنے والا، نہایت رحم کرنے والا ہے۔(۲۲۷)۔ اور اگر وہ طلاق کا ارادہ کر لیں، تو یقیناً اللہ سب کچھ سننے والا، جاننے والا ہے۔(۲۲۸)۔ طلاق یافتہ عورتیں اپنے آپ کو تین حیض (ماہواری) تک روکے رکھیں، اور انہیں جائز نہیں کہ وہ اس بات کو چھپائیں جو اللہ نے ان کے رحم میں پیدا کیا ہے اگر وہ اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتی ہیں، اور ان کے شوہر اس مدت کے دوران انہیں واپس لینے کے زیادہ حق دار ہیں اگر وہ صلح کا ارادہ رکھتے ہوں۔ اور عورتوں کے بھی ویسے ہی حقوق ہیں جیسے مردوں کے، عرف کے مطابق، اور مردوں کو عورتوں پر ایک درجہ فضیلت حاصل ہے، اور اللہ غالب، حکمت والا ہے۔(۲۲۹)۔ رجعی طلاق دو بار تک ہے، پھر یا تو بھلے طریقے سے روک لینا ہے یا نیکی کے ساتھ رخصت کر دینا ہے، اور تمہیں جائز نہیں کہ تم اس مہر میں سے کچھ واپس لو جو تم نے عورتوں کو دیا ہے، ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ دونوں کو اندیشہ ہو کہ اللہ کی حدود پر قائم نہیں رہ سکیں گے، تو اگر تمہیں یقین ہو کہ اللہ کی حدود قائم نہیں رکھ سکیں گے تو عورت کے لیے فدیہ دے کر علیحدگی اختیار کرنا گناہ نہیں، یہ اللہ کی حدود ہیں، ان سے تجاوز نہ کرو، اور جو اللہ کی حدود سے تجاوز کرے گا وہ ظالم ہے۔

تفسیر-آیت نمبر ۲۲۲ سے ۲۲۹ تک

آیت نمبر(۲۲۲-۲۲۳) وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْمَحِيْضِ ؕ قُلْ هُوَ اَذًى ۙ فَاعْتَزِلُوا النِّسَآءَ فِي الْمَحِيْضِ ۙ وَلَا تَقْرَبُوْهُنَّ حَتّٰى يَطْهُرْنَ ۚ فَاِذَا تَطَهَّرْنَ فَاْتُوْهُنَّ مِنْ حَيْثُ اَمَرَكُمُ اللّٰهُ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ التَّوَّابِيْنَ وَيُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِيْنَ ۝۲۲۲ نِسَآؤُكُمْ حَرْثٌ لَّكُمْ ۠ فَاْتُوْا حَرْثَكُمْ اَنّٰى شِئْتُمْ ۪ وَقَدِّمُوْا لِاَنْفُسِكُمْ ؕ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ مُّلٰقُوْهُ ؕ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝۲۲۳

ترجمہ: ''وہ آپ سے حیض (ماہواری) کے بارے میں پوچھتے ہیں۔ آپ فرما دیجیے کہ یہ ایک گندگی (ناپاکی) ہے، اس لیے حیض کے دوران عورتوں سے علیحدہ رہو اور ان سے مباشرت نہ کرو جب تک کہ وہ پاک نہ ہو جائیں، پھر جب وہ پاک ہو جائیں تو ان کے پاس اس طرح آؤ جیسے اللہ نے تمہیں حکم دیا ہے۔ یقیناً اللہ توبہ کرنے والوں کو اور پاک رہنے والوں کو پسند کرتا ہے۔ تمہاری عورتیں تمہاری کھیتیاں ہیں، لہٰذا اپنی کھیتی میں جس طرح چاہو آؤ، اور اپنے لیے نیک اعمال آگے بھیجو، اور اللہ

سے ڈرتے رہو، اور جان لو کہ تمہیں اللہ سے ملنا ہے، اور ایمان والوں کو خوشخبری دے دو''۔

تفسیر اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''نِسَاؤُكُمْ حَرْثٌ لَّكُمْ''۔

● اس آیت کے حوالے سے امام بخاریؒ، مسلمؒ، ابوداؤد اور ترمذیؒ نے حضرت جابرؓ سے روایت بیان کی ہے کہ یہود یہ عقیدہ رکھتے تھے کہ اگر شوہر اپنی بیوی سے پیٹھ کی طرف سے (لیکن اگلے مقام میں) مباشرت کرے تو بچہ بھینگا پیدا ہوتا ہے۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی کہ تمہاری بیویاں تمہارے لیے کھیت کی مانند ہیں، لہٰذا جس طرح چاہو ان کی شرمگاہ (یعنی اگلے راستے) سے مباشرت کرو۔ **(بخاری: ۴۵۲۸)**

● اسی طرح امام احمدؒ اور ترمذیؒ نے حضرت ابنِ عباسؓ سے روایت نقل کی ہے کہ حضرت عمرؓ نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کرنے لگے: ''یا رسول اللہ ﷺ! میں ہلاک ہو گیا'' آپ ﷺ نے پوچھا: ''کیا ہوا؟'' حضرت عمرؓ نے کہا: ''میں نے رات کو اپنی اہلیہ سے پیچھے کی طرف سے (لیکن اگلے مقام میں) مباشرت کی''۔ آپ ﷺ نے خاموشی اختیار فرمائی، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: ''نِسَاؤُكُمْ حَرْثٌ لَّكُمْ''۔ **(ترمذی: ۲۹۸۰)**

اس آیت کا مفہوم یہ ہے کہ شوہر اپنی کھیتی یعنی بیوی کے اگلے مقام میں، چاہے سامنے سے آئے یا پیچھے کی طرف سے، مباشرت کر سکتا ہے۔ البتہ پچھلے مقام (مخرجِ غائط) میں ہمبستری اور ایامِ حیض میں مباشرت سخت منع ہے۔ حضرت ابوسعید خدریؓ کی روایت میں بھی یہی وضاحت ہے کہ جب ایک شخص نے اپنی بیوی سے پیچھے کی طرف سے (لیکن اگلے مقام میں) مباشرت کی اور لوگوں نے اسے برا جانا تو اس موقع پر یہ آیت نازل ہوئی۔

● امام بخاریؒ نے حضرت عمرؓ سے بھی یہ روایت نقل کی ہے کہ یہ آیت دراصل عورتوں سے ان کی پیٹھ کی طرف سے (لیکن اگلے مقام میں) مباشرت کرنے کے بارے میں نازل ہوئی۔ **(ترمذی: ۲۹۸۰)**

● اسی طرح امام طبرانیؒ نے حضرت ابن عمرؓ سے روایت کیا کہ یہ آیت عورت سے پیچھے کی طرف سے بیٹھ کر اگلے راستے میں مباشرت کی اجازت کے متعلق نازل ہوئی۔ **(ابوداؤد: ۲۱۶۴)**

البتہ اس سے مراد صرف وہ مقام ہے جو کھیتی ہے یعنی شرمگاہ (Vagina)، کیونکہ اولاد اسی سے پیدا ہوتی ہے۔ پچھلا راستہ (Anus) کھیت نہیں ہے، اس لیے اس سے اولاد پیدا نہیں ہوتی اور یہ غیر فطری عمل ہے۔

● حضرت ابنِ عباسؓ فرماتے ہیں: ''اللہ تعالیٰ ابنِ عمرؓ پر رحم کرے، ان سے وہم ہو گیا''۔ حقیقت یہ ہے کہ انصار کے کچھ قبائل یہود کے ساتھ شرک میں شریک تھے اور ان کی بہت سی باتوں میں ان کی پیروی کرتے تھے۔ چونکہ یہودی اپنی بیویوں سے صرف ایک ہی طریقے سے مباشرت کرتے تھے، انصار نے بھی یہی طریقہ اختیار کر لیا تھا۔

قریش کی عادت اس کے برعکس تھی، وہ مختلف انداز میں اپنی بیویوں سے لذت حاصل کرتے تھے۔ جب ایک مہاجر نے مدینہ میں شادی کی تو اس کی انصاری بیوی نے غیر مانوس طریقے سے مباشرت سے انکار کیا۔ یہ بات مشہور ہوگئی اور رسول اللہ ﷺ تک پہنچی۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: ''نِسَاؤُكُمْ حَرْثٌ لَّكُمْ''، یعنی تم جس طرح چاہو اپنی کھیتی میں آسکتے ہو، خواہ سامنے سے ہو یا پشت کی طرف سے، یا پہلو کے بل لیٹ کر بی لیکن ہمیشہ اسی مقام پر جو اولاد پیدا کرنے کی جگہ ہے۔ (ابوداؤد: ۲۱۶۴)

حافظ ابنِ حجر عسقلانیؒ فرماتے ہیں کہ ابنِ عمرؓ نے جو اس آیت کے نزول کا سبب بیان کیا وہ مشہور ہے، لیکن ابنِ عباسؓ کو حضرت ابوسعید خدریؓ کی روایت نہیں پہنچی تھی، اس لیے ان کی بات کچھ مختلف معلوم ہوتی ہے۔

● حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ یہود حیض کے دوران عورتوں سے بالکل الگ تھلگ رہتے، ان کا کھانا الگ کرتے اور ان سے میل جول قطع کر دیتے۔ صحابہ کرامؓ نے نبی کریم ﷺ سے اس بارے میں سوال کیا تو یہ آیت نازل ہوئی۔ (مسلم: ۳۰۲)

حیض کسے کہتے ہیں؟

حیض اس خون کو کہتے ہیں جو عورتوں کو ہر ماہ آتا ہے، جسے ماہواری (Menstruation) کہا جاتا ہے۔ قرآنِ کریم انسانی زندگی کے ہر شعبے کے لیے مکمل رہنمائی فراہم کرتا ہے۔ ظاہر ہے کہ انسان کھانے پینے، سونے جاگنے اور کام کاج کرنے کے ساتھ ساتھ فطری طور پر جنسی خواہش بھی رکھتا ہے اور میاں بیوی کے تعلقات زندگی کا ایک لازمی حصہ ہیں۔ اس لیے قرآن کریم نے اس معاملے میں بھی نہایت معتدل اور متوازن تعلیم دی ہے اور انسان کو راہِ اعتدال کی طرف رہنمائی کی ہے۔

مختلف اقوام کا عمل

یہود و نصاریٰ نے اس معاملے میں اعتدال کو قائم نہ رکھا۔ یہود اس قدر شدت اختیار کرتے کہ اپنی حائضہ عورتوں سے بالکل الگ تھلگ رہتے، نہ ان کے ساتھ کھاتے پیتے، نہ بیٹھتے اُٹھتے اور نہ بات چیت کرتے۔ ان کے ہاتھ کا کھانا پینا ناپاک سمجھتے اور بعض اوقات حیض کے دنوں میں عورت کو گھر سے نکال کر علیحدہ مکان میں بٹھا دیتے، کسی قسم کا تعلق باقی نہ رہنے دیتے۔ مجوسی اور ہندو قوم میں بھی عورت کو ان دنوں میں ناپاک اور اچھوت سمجھا جاتا تھا۔

یہود کے برعکس نصاریٰ نے حد سے زیادہ نرمی برتی۔ وہ نہ صرف عورتوں سے میل جول رکھتے بلکہ حیض کی حالت میں بھی ان کے ساتھ جنسی تعلق قائم کرنے سے گریز نہ کرتے تھے۔

اسلامی حکم

چند صحابہ کرامؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سوال کیا: ''یا رسول اللہ! یہودی اور عیسائی تو حائضہ عورتوں کے ساتھ ایسا رویہ رکھتے ہیں، ہم ان دنوں میں اپنی عورتوں کے ساتھ کیا کریں؟'' اس پر قرآن کی آیت نازل ہوئی اور واضح طور پر حکم بیان کیا گیا کہ حیض کے دنوں میں صرف ''جنسی تعلق قائم کرنا منع ہے'' باقی اُٹھنا بیٹھنا، کھانا پینا اور بات چیت سب جائز ہے۔

حیض کی مدت

قرآن میں حیض کی مدت بیان نہیں کی گئی، لیکن محدثین کے اقوال اور صحابہ کے عمل کی روشنی میں فقہاء نے اس کی حد مقرر کی ہے۔ امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک حیض کی کم سے کم مدت ''تین دن'' اور زیادہ سے زیادہ ''دس دن'' ہے۔

حیض کے دوران دیگر احکام

ان ایام میں صرف ہمبستری ممنوع نہیں بلکہ دیگر احکام بھی حدیث سے ثابت ہیں جیسے: عورت نماز نہیں پڑھ سکتی۔ روزہ نہیں رکھ سکتی۔ مسجد میں داخل نہیں ہوسکتی۔ قرآن کو ہاتھ نہیں لگا سکتی۔ خانہ کعبہ کا طواف نہیں کرسکتی۔

اسی طرح حالت حیض میں ناف سے گھٹنے تک کے حصے کو دیکھنا اور چھونا جائز نہیں۔ اگر ان ایام میں غلطی سے صحبت ہوجائے تو اس گناہ پر ''توبہ کرنا لازم ہے'' اور کچھ صدقہ وخیرات دینا افضل ہے۔ اسی طرح اگر عورت کے حیض کی عادت اور معمول میں فرق آجائے تو پاکی اور مباشرت سے متعلق مسائل کے لیے شریعت کی کتابوں سے رجوع کرنا یا اہلِ علم سے معلوم کرنا ضروری ہے، ورنہ لاعلمی میں گناہ سرزد ہوسکتا ہے۔

آیتِ کریمہ ''فَأْتُوهُنَّ مِنْ حَيْثُ أَمَرَكُمُ اللَّهُ'' (پس اپنی بیویوں کے پاس اس جگہ سے جاؤ جس جگہ سے اللہ نے اجازت دی ہے) کے تحت یہ بات واضح کردی گئی ہے کہ بیوی کے پچھلے راستے (Anal sex) سے مباشرت حرام ہے۔ حدیث میں بھی آیا ہے کہ ''اللہ کی لعنت ہے اُس شخص پر جو عورت سے پچھلے راستے میں مباشرت کرے''۔

حیض اور دبر سے وطی کی ممانعت

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''جس شخص نے حیض کی حالت میں بیوی سے مباشرت کی، یا پیچھے کے راستے (دبر) سے ہمبستری کی، یا کسی کاہن ونجومی کے پاس جا کر اس کی بات کی تصدیق کی تو گویا اُس نے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل کردہ احکام کا انکار کیا''۔ **(ترمذی: ۱۳۵)**

عورت کو کھیت سے تشبیہ

قرآنِ کریم میں ارشاد ہے: ''نِسَاؤُكُمْ حَرْثٌ لَّكُمْ'' (تمہاری عورتیں تمہارے لیے کھیت ہیں)۔اس کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح کھیت میں بیج ڈالنے سے فصل اور پھل حاصل ہوتے ہیں، اسی طرح عورت کے رحم میں بیج ڈالنے سے نسل آگے بڑھتی ہے۔نکاح سے اگرچہ دیگر کئی فوائد بھی حاصل ہوتے ہیں، لیکن اصل مقصد نسلِ انسانی کی بقا اور افزائش ہے۔

جس طرح کسان اپنی کھیتی کو قیمتی سرمایہ سمجھ کر اس کی نگرانی اور حفاظت کرتا ہے اور اچھی پیداوار کے لیے دعا کرتا ہے، اسی طرح شوہر کو بھی اپنی بیوی کو قیمتی امانت سمجھ کر اس کی حفاظت کرنی چاہیے اور نیک وصالح اولاد کی دعا کرنی چاہیے۔

نکاح کا اصل مقصد

اسلام کے نزدیک نکاح کا بنیادی مقصد اولاد کی پیدائش اور اس کی تربیت ہے۔حدیث میں آیا ہے کہ صالح اولاد انسان کے لیے صدقۂ جاریہ ہے جو موت کے بعد بھی اس کے نامۂ اعمال میں ثواب بڑھاتی رہتی ہے۔ایک اور حدیث میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ میں قیامت کے دن اپنی امت کی کثرت پر فخر کروں گا۔اس سے معلوم ہوا کہ نکاح کے ذریعے نسل بڑھانا شریعت کا مطلوب مقصد ہے۔

لہٰذا جو لوگ اولاد کو روکنے یا ختم کرنے کے مختلف طریقے اختیار کرتے ہیں وہ دراصل فطرت کے خلاف چلتے ہیں۔آخر کون سا عقلمند کسان ہے جو کھیت میں بیج تو ڈالے لیکن پیداوار نہ چاہے یا پودا اگنے سے پہلے ہی اُسے اکھیڑ پھینکے؟

خاندانی منصوبہ بندی

جو لوگ خاندانی منصوبہ بندی کے ذریعے بچوں کی پیدائش روکنے کی تدبیریں کرتے ہیں، وہ نکاح کے اصل مقصد کو بھول جاتے ہیں اور اسے صرف جنسی تسکین کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔اگر نکاح کو صرف لذت ہی کا وسیلہ سمجھ لیا جائے تو پھر انسان اور حیوان میں کیا فرق رہ جائے؟ یہ سوچ دراصل یہود و نصاریٰ کی تقلید ہے۔

حضرت جابرؓ سے منقول ہے کہ یہودیوں میں یہ عقیدہ تھا کہ اگر کوئی شخص بیوی کے پاس پیچھے سے آئے تو بچہ بھینگا پیدا ہوتا ہے۔(بخاری:۴۵۲۸)

حضرت عمرؓ کا واقعہ

سیدنا عمر فاروقؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس حاضر ہوئے اور عرض کیا: ''یا رسول اللہ! میں ہلاک ہو گیا۔''

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پوچھا: ''کس بات نے تجھے ہلاک کیا؟'' حضرت عمرؓ نے کہا: ''میں نے آج اپنی بیوی سے ایک مختلف انداز میں تعلق قائم کیا۔'' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خاموشی اختیار فرمائی، یہاں تک کہ یہ آیت نازل ہوئی: ''آگے سے آؤ یا پیچھے سے، لیکن دبر میں اور حیض کی حالت میں ہمبستری نہ کرو''۔ (ترمذی: ۲۹۸۰)

قرآن کا پیغام

اس آیت کے آخر میں دو اہم باتوں کی تاکید کی گئی ہے:

۱۔ ''وَقَدِّمُوا لِأَنْفُسِكُمْ''۔ (اپنے لیے آگے کا سامان کرو) یعنی محض وقتی لذت میں نہ ڈوب جاؤ بلکہ اپنی نیت کو نیک بنا کر اس عمل کو عبادت کا ذریعہ بناؤ۔ صحبت کے وقت اللہ کا نام لو اور نیک اولاد کی دعا کرو تاکہ وہ تمہارے لیے آخرت کی کھیتی بنے، تمہارے لیے دعا کرے اور قیامت کے دن تمہارے کام آئے۔

صحیح حدیث میں ہے کہ اگر شوہر بیوی سے تعلق قائم کرتے وقت یہ دعا پڑھے: ''بِسْمِ اللهِ، اَللّٰهُمَّ جَنِّبْنَا الشَّيْطَانَ وَجَنِّبِ الشَّيْطَانَ مَا رَزَقْتَنَا''۔ (اللہ کے نام کے ساتھ، اے اللہ! ہمیں شیطان سے بچا اور جو اولاد ہمیں عطا ہو اُسے بھی شیطان کے شر سے محفوظ رکھ) تو ایسی اولاد شیطان کے شر سے محفوظ رہتی ہے۔ (بخاری: ۳۲۷۱)

۲۔ ''وَاتَّقُوا اللَّهَ'' (اللہ سے ڈرو) یعنی زندگی کے ہر مرحلے میں اللہ کو یاد رکھو، اس کے حکموں کی پابندی کرو اور سیدھے راستے پر قائم رہو۔

آخر میں اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حکم دیا کہ آپ ان اہلِ ایمان کو خوشخبری سنا دیں جو تقویٰ اختیار کرتے ہیں، اللہ کے سامنے جواب دہی کا یقین رکھتے ہیں اور اس کے احکام کی اطاعت کرتے ہیں کہ ان کے لیے آخرت میں عظیم اجر اور بے حساب انعام واکرام ہے۔

آیت نمبر (۲۲۴) وَلَا تَجْعَلُوا اللّٰهَ عُرْضَةً لِّاَيْمَانِكُمْ اَنْ تَبَرُّوْا وَتَتَّقُوْا وَتُصْلِحُوْا بَيْنَ النَّاسِ ؕ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۲۲۴﴾

ترجمہ: ''اور اللہ کے نام کو اپنی قسموں کے لیے بہانہ نہ بناؤ کہ تم نیکی نہ کرو، اور پرہیزگاری نہ اختیار کرو، اور لوگوں کے درمیان صلح نہ کراؤ، اور اللہ سب کچھ سننے والا، جاننے والا ہے''۔

تفسیر حضرت ابن جریر نے حضرت ابنِ جریجؒ سے روایت نقل کی ہے کہ یہ آیت حضرت ابوبکر صدیقؓ کے بارے میں نازل ہوئی۔ جب انہوں نے ایک قسم کھالی تھی تو اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ وہ تمہارے نیک اعمال کو ترک

کرنے کے بارے میں کھائی جانے والی قسموں کو سنتا ہے۔ اللہ تمہارے دلوں کی نیتوں کو بھی جانتا ہے اور قسموں کے کفارے کی ادائیگی کو بھی۔

رہی وہ لغو قسمیں جو انسان کے منہ سے بے اختیار نکل جاتی ہیں، جیسے خرید وفروخت کے وقت بار بار ''لا واللہ'' اور ''بلی واللہ'' کہنا، تو ان پر کوئی کفارہ لازم نہیں۔ لیکن جو جھوٹی قسمیں دانستہ طور پر دل میں ارادہ کر کے کھائی جائیں، ان پر اللہ تعالیٰ آخرت میں مؤاخذہ فرمائے گا۔ البتہ ان لغو قسموں پر اللہ تعالیٰ معاف فرمانے والا ہے، اور جو لوگ قصداً جھوٹی قسم کھا کر گناہ کرتے ہیں، ان پر وہ گرفت بھی فرما سکتا ہے۔

ایلاء اور قسم

اس مقام پر 'ایلاء' (یعنی بیوی سے دور رہنے کی قسم) اور اسی سے متعلقہ دیگر مسائل، جیسے طلاق، عدت، مہر، رضاعت (بچوں کو دودھ پلانے کی مدت) اور بیوہ کی وصیت وغیرہ کے احکام بیان ہوئے ہیں۔ ان میں سب سے پہلے ان لغو قسموں سے رکنے کا حکم دیا گیا جو جاہلیت کے زمانے کی بُری رسم کے طور پر عربوں میں عام تھیں۔

اس وقت یہ رواج تھا کہ جب لوگ کسی سے ناراض ہوتے تو قسم کھا لیتے کہ ''اللہ کی قسم! ہم اس سے نہ بولیں گے، نہ اس کے پاس جائیں گے، نہ اس سے میل جول رکھیں گے'' یا یہ کہ ''ہم فلاں جھگڑنے والوں کے درمیان صلح نہیں کرائیں گے''۔ یہاں تک کہ قریبی رشتہ داروں کے ساتھ بھی یہی طرزِ عمل اختیار کرتے اور قسم کھا کر نیک سلوک سے گریز کرتے۔

قسم کھانے کے بعد کا عمل

جب کوئی ان سے پوچھتا کہ تم نیکی کا یہ کام کیوں نہیں کرتے؟ تو جواب میں کہتے: ''ہم نے اس کے خلاف قسم کھائی ہے۔'' اس طرح وہ نیک اعمال کو محض قسم کے بہانے سے ترک کر دیتے۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ کا نام لے کر نیک کاموں سے بچنا بھی بہت بڑا گناہ ہے، کیونکہ اللہ رحمن ورحیم ہے، وہ بلند و برتر ذات ہے، اور اس کے نام کو اس طرح کھیل بنانا سخت برا عمل ہے۔

اسی لیے ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے منع فرمایا کہ اپنے رب کے نام کو نیکی، تقویٰ اور لوگوں کے درمیان صلح کرانے کے کاموں کے لیے رکاوٹ نہ بناؤ۔

واقعاتِ نزول

حضرت نعمان بن بشیرؓ نے حضرت عبداللہ بن رواحہؓ کی بہن کو 'طلاقِ رجعی' دی۔ کچھ دن بعد جب انھیں رجوع اور صلح کی خواہش پیدا ہوئی تو حضرت عبداللہ بن رواحہؓ نے قسم کھالی کہ نہ تو نعمان سے بات کروں گا اور نہ ہی ان

کے درمیان صلح ہونے دوں گا۔

ایک اور روایت میں ہے کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ کے ایک خالہ زاد بھائی نے واقعۂ افک میں منافقین کا ساتھ دیا تھا۔ جب اللہ تعالیٰ نے حضرت عائشہ صدیقہؓ کی پاک دامنی قرآن میں بیان فرمادی تو حضرت ابوبکرؓ نے ناراض ہو کر قسم کھالی کہ اب میں اس رشتہ دار کو خرچ نہیں دوں گا، کیونکہ وہ الزام تراشی میں شریک ہوا تھا۔ اس موقع پر یہ آیات نازل ہوئیں اور حضرت ابوبکرؓ نے قسم توڑ کر کفارہ ادا کیا۔

بعض مفسرین نے یہ بھی لکھا ہے کہ ان آیات کا نزول کسی ایک واقعہ سے مخصوص نہیں، بلکہ ایسے بہت سے واقعات کے پس منظر میں ہوا۔ اس زمانے کا عام رواج تھا کہ لوگ اللہ کی قسم کھا بیٹھتے: ''میں فلاں سے نہ ملوں گا''، ''فلاں سے صلح نہ کروں گا'' یا ''فلاں کو خرچ نہ دوں گا''۔ ان سب ہی حالات کے بارے میں یہ احکام نازل ہوئے۔

قسم کے مسائل

۱۔ بلاضرورت بات بات پر قسم کھانا سخت بُری عادت ہے۔ اس میں اللہ کے نام کی بے ادبی اور توہین ہے۔ بہتر یہ ہے کہ سچی بات پر بھی قسم نہ کھائی جائے۔

۲۔ اگر کسی نے کسی بات کے کرنے یا نہ کرنے پر اللہ کی قسم کھالی تو اس کے خلاف عمل درست نہیں۔ اگر خلاف ورزی کرے گا تو قسم توڑنے کا کفارہ ادا کرنا لازم ہوگا۔

۳۔ اگر کسی نے گناہ پر مبنی قسم کھائی، جیسے یہ کہنا کہ ''میں والدین سے کبھی نہ ملوں گا'' تو ایسی قسم کو توڑ دینا واجب ہے۔ اور قسم توڑ کر کفارہ ادا کرنا ضروری ہے۔ اگر نہ توڑی تو گناہگار ہوگا۔ جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''جو شخص نیک کام چھوڑنے پر قسم کھائے تو اس پر لازم ہے کہ نیک کام کرے، قسم توڑے اور کفارہ دے''۔ (مسلم: ۱۶۵۰)

۴۔ قسم توڑنے کا کفارہ یہ ہے کہ: (۱) دس محتاجوں کو دو وقت پیٹ بھر کر کھانا کھلائے، یا (۲) انھیں کچا اناج دے: گیہوں کی صورت میں ہر ایک کو تقریباً دو سیر (صدقۂ فطر کے برابر) اور جو کی صورت میں چار سیر، یا (۳) دس مسکینوں کو ایسا کپڑا پہنائے جو بدن کا بڑا حصہ ڈھانپ سکے۔

۵۔ اگر کوئی شخص اتنا غریب ہے کہ نہ کھانا کھلا سکتا ہے اور نہ کپڑا دے سکتا ہے تو اسے مسلسل تین روزے رکھنے ہوں گے۔ اگر درمیان میں کوئی روزہ ٹوٹ گیا تو کفارہ ادا نہ ہوگا۔

۶۔ کفارہ صرف ان محتاجوں کو دیا جاسکتا ہے جنہیں زکوٰۃ دینا جائز ہے۔

آیت نمبر (۲۲۵) لَا يُؤَاخِذُكُمُ اللّٰهُ بِاللَّغْوِ فِيْٓ اَيْمَانِكُمْ وَلٰكِنْ يُّؤَاخِذُكُمْ بِمَا كَسَبَتْ

قُلُوْبُكُمْ ؕ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ ﴿۲۲۵﴾

ترجمہ: ''اللہ تمہاری بے مقصد قسموں پر مؤاخذہ نہیں کرتا، لیکن وہ ان قسموں پر مؤاخذہ کرتا ہے جو دل سے کی جائیں، اور اللہ بہت معاف کرنے والا، بہت بردبار ہے''۔

تفسیر

بے خیالی کی قسم

اس آیت میں واضح کیا گیا ہے کہ اصل قسم وہ ہے جو دل کے ارادے اور شعوری نیت سے کھائی جائے۔ لیکن جو الفاظ عادتاً یا بے توجہی میں زبان سے نکل جائیں اور دل کو اس کی خبر تک نہ ہو، وہ ''لغو'' یعنی بے کار اور بے معنیٰ قسم ہے۔ ایسی قسم پر اللہ تعالیٰ پکڑ نہیں فرماتے۔

لغو قسم کی وضاحت یہ ہے کہ: اگر کسی گزری ہوئی بات پر جھوٹی قسم زبان سے نکل گئی، لیکن وہ ارادہ کے بغیر تھی، یا ارادہ سے تھی مگر اسے اپنے گمان میں سچ سمجھا تھا، تو اس پر نہ کوئی گناہ ہے اور نہ کفارہ۔ اسی طرح اگر کسی آئندہ بات پر کچھ اور کہنا مقصود تھا مگر بے ارادہ زبان سے قسم کے الفاظ نکل گئے، تو اس پر بھی کوئی مؤاخذہ نہیں۔

البتہ وہ قسم جس پر اللہ تعالیٰ کی گرفت ہوگی، وہ یہ ہے کہ انسان جان بوجھ کر جھوٹ سمجھتے ہوئے قسم کھائے یا مستقبل کے کسی کام کے کرنے یا نہ کرنے کی نیت سے جان بوجھ کر قسم کھائے اور پھر اس کی خلاف ورزی کرے۔

اس سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ بلا ارادہ اور انجانے میں کھائی گئی قسم پر مؤاخذہ نہیں فرماتے۔ لیکن اگر کوئی بات پوری نیت اور شعوری ارادے کے ساتھ کی جائے، خواہ وہ گناہ ہو یا شریعت کے خلاف، تو اس پر لازمی طور پر پکڑ ہوگی۔

نوٹ: آگے چل کر قرآن نے بیوی سے علیحدگی اختیار کرنے کی قسم کا ذکر کیا ہے، جو اُس وقت عربوں میں عام رواج تھا۔ شریعت میں اسے ''ایلاء'' کہا جاتا ہے۔ اس کے مفصل احکام سورۂ مائدہ (آیت ۸) میں بیان ہوئے ہیں۔

آیت نمبر (۲۲۶) لِلَّذِيْنَ يُؤْلُوْنَ مِنْ نِّسَآئِهِمْ تَرَبُّصُ اَرْبَعَةِ اَشْهُرٍ ۚ فَاِنْ فَآءُوْ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۲۲۶﴾

ترجمہ: ''وہ لوگ جو اپنی بیویوں کے پاس نہ جانے کی قسم کھا بیٹھتے ہیں، ان کے لیے چار مہینے کی مہلت ہے، پھر اگر رجوع کر لیں تو بے شک اللہ بہت بخشنے والا، نہایت رحم کرنے والا ہے''۔

تفسیر

'ایلاء' کا طریقہ

ان آیات میں عورتوں سے متعلق ایک خاص معاملے کا ذکر کیا گیا ہے، جسے شریعتِ اسلامیہ میں ''ایلاء'' کہا

جاتا ہے۔ فقہی اصطلاح میں اگر کوئی شوہر یہ قسم کھالے کہ وہ اپنی بیوی کے پاس نہیں جائے گا اور اس سے علیحدہ رہے گا، تو اسے ایلاء کہتے ہیں۔

زمانۂ جاہلیت میں عربوں کا یہ دستور تھا کہ جب کوئی شخص اپنی بیوی سے ناراض ہوتا یا اسے ناپسند کرتا، تو وہ ایلاء کر لیتا یعنی قسم کھالیتا کہ اب وہ اپنی بیوی کے قریب نہیں جائے گا۔ ان کے ہاں اس کی کوئی معیاد مقرر نہ تھی۔ نتیجہ یہ ہوتا کہ شوہر تو بیوی سے ہمیشہ کے لئے تعلق ختم کر دیتا، لیکن عورت نہ تو شوہر کے حق سے آزاد ہو کر کسی دوسرے سے نکاح کر سکتی، اور نہ ہی ازدواجی زندگی گزار سکتی۔ یوں وہ ایک معلق زندگی گزارنے پر مجبور ہو جاتی اور سخت اذیت میں مبتلا رہتی۔ یہ عورتوں کو ستانے کا ایک ظالمانہ طریقہ تھا، جس میں وہ نہ بیوہ شمار ہوتیں اور نہ بیوی کے حقیقی حقوق پا سکتیں۔

اسلام نے اس جاہلانہ رسم کی خرابیوں کو ختم کیا اور ایلاء کے سلسلے میں واضح اصلاح کی۔ قرآن نے اس کے لئے چار ماہ کی معیاد مقرر کر دی تا کہ شوہر کو سوچنے سمجھنے کا موقع ملے اور وہ ٹھنڈے دل سے آخری فیصلہ کر سکے۔ اگر وہ غور وفکر کے بعد اس نتیجے پر پہنچے کہ بیوی سے صلح کر لینی چاہئے اور ازدواجی تعلقات بحال کرنے چاہئیں، تو چار ماہ کے اندر اسے اپنی بیوی کے قریب جانا ہوگا اور قسم کا کفارہ ادا کرنا ہوگا۔ لیکن اگر وہ اس مدت میں تعلق بحال نہ کرے اور علیحدگی ہی کو بہتر سمجھے، تو چار ماہ گزرنے پر عورت پر طلاقِ بائن واقع ہو جائے گی، اور اس طرح وہ نکاح سے آزاد ہو جائے گی۔

آیت نمبر (۲۲۷) وَاِنْ عَزَمُوا الطَّلَاقَ فَاِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۲۲۷﴾

ترجمہ: ''اور اگر وہ طلاق کا ارادہ کر لیں، تو یقیناً اللہ سب کچھ سننے والا، جاننے والا ہے''۔

تفسیر

ایلاء اور طلاق کے احکام

ان آیات میں دو باتوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ پہلی بات ''ایلاء'' کی ہے یعنی شوہر کا اپنی بیوی سے علیحدہ رہنے کی قسم کھالینا، جس کی وضاحت پہلے گزر چکی۔ دوسری بات ** طلاق ** کی ہے، جو شوہر اور بیوی کے باہمی تعلق کو قانونی طور پر ختم کرنے کا نام ہے۔

اسلام سے قبل مختلف قوموں میں طلاق کے عجیب وغریب طریقے رائج تھے۔ یہودیوں کے یہاں طلاق کے سلسلے میں کوئی پابندی یا ذمہ داری نہ تھی۔ شوہر جب چاہتا طلاق نامہ لکھ دیتا اور بیوی سے علیحدہ ہو جاتا، اور بیوی بھی فوراً دوسرے نکاح کی اجازت رکھتی۔ اس کے برعکس نصاریٰ نے اس معاملے میں انتہا درجے کی سختی اختیار کی۔ ان کے نزدیک میاں بیوی میں جدائی کی کوئی صورت نہ تھی سوائے موت کے۔ یہی عقیدہ آج بھی رومن کیتھولک فرقے میں موجود ہے کہ طلاق کسی حال میں جائز نہیں۔ بعد میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے کئی صدیوں بعد جب عیسائیوں میں پروٹسٹنٹ فرقہ

وجود میں آیا تو انہوں نے جدائی کی اجازت دی، لیکن صرف اس صورت میں جب عورت بدکاری کی مرتکب ہو۔

ہندو مذہب میں بھی طلاق کا کوئی تصور نہیں۔ ان غیر متوازن راستوں کے مقابلے میں اسلام نے ایک اعتدال پسند راہ اختیار کی۔ اسلام نے یہ اصول رکھا کہ اگر شوہر پوری دیانتداری سے محسوس کرے کہ بیوی کے ساتھ اس کی زندگی ہم آہنگ نہیں یا وہ اس کی جائز ضرورتیں پوری نہیں کر رہی، تو دونوں کے لئے بہتر یہی ہے کہ بلاوجہ ساری زندگی لڑائی جھگڑے اور تلخیوں میں گزارنے کے بجائے باعزت طور پر علیحدگی اختیار کر لیں، تاکہ دونوں کو سکون مل سکے۔

ایلاء کا حکم

اس آیت میں ایلاء کا حکم یوں بیان ہوا ہے کہ جو لوگ اپنی بیوی کے پاس نہ جانے کی قسم کھا بیٹھتے ہیں، ان کے لئے چار ماہ کی مہلت ہے۔ اگر اس مدت کے اندر وہ اپنی قسم توڑ کر بیوی سے رجوع کر لیں، تو نکاح بدستور قائم رہے گا اور قسم کا کفارہ دینا ہوگا۔ اللہ تعالیٰ اس رجوع اور کفارہ کی بدولت ان پر رحمت فرمائے گا۔ لیکن اگر شوہر نے بیوی سے قطع تعلق ہی کا پختہ ارادہ کر لیا اور چار ماہ تک رجوع نہ کیا، تو مدت پوری ہوتے ہی عورت پر طلاق واقع ہو جائے گی۔ اللہ تعالیٰ ان کی قسم کو بھی سنتے ہیں اور ان کے ارادوں کو بھی جانتے ہیں، اس لئے اس معاملے میں یہی شرعی حکم دیا گیا۔

فقہاء کی تشریح

فقہاء نے ایلاء کی چار صورتیں بیان کی ہیں: (۱) شوہر قسم کھالے کہ بیوی کے پاس نہیں جائے گا، لیکن مدت متعین نہ کرے۔ (۲) چار ماہ کی مدت کی صراحت کر دے۔ (۳) چار ماہ سے زیادہ مدت کی تحدید کر دے۔ (۴) چار ماہ سے کم مدت مقرر کرے۔

پہلی، دوسری اور تیسری صورتیں شریعت کی اصطلاح میں ایلاء کہلاتی ہیں۔ ان کا حکم یہ ہے کہ اگر شوہر چار ماہ کے اندر بیوی کے پاس چلا جائے اور قسم توڑ دے تو کفارہ لازم ہوگا، اور نکاح باقی رہے گا۔ لیکن اگر چار ماہ گزر گئے اور رجوع نہ کیا، تو عورت پر طلاق واقع ہو جائے گی، اور دوبارہ رجوع صرف نئے نکاح کے ذریعے ممکن ہوگا، البتہ حلالہ کی ضرورت نہ ہوگی۔

چوتھی صورت میں، یعنی اگر چار ماہ سے کم کی مدت مقرر کی گئی، تو اس کا حکم یہ ہے کہ اگر شوہر قسم توڑ دے تو کفارہ واجب ہوگا، لیکن اگر اپنی قسم پوری کر لے تب بھی نکاح بدستور باقی رہے گا۔

نوٹ: یہ تو ایلاء کے شرعی احکام کا بیان تھا۔ آگے انہی آیات میں مطلقہ عورت کی عدت اور طلاق کے بعض اہم مسائل ذکر کیے گئے ہیں۔

آیت نمبر (۲۲۸) وَالْمُطَلَّقٰتُ يَتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ ثَلٰثَةَ قُرُوْٓءٍ ؕ وَلَا يَحِلُّ لَهُنَّ اَنْ يَّكْتُمْنَ مَا خَلَقَ اللّٰهُ فِيْٓ اَرْحَامِهِنَّ اِنْ كُنَّ يُؤْمِنَّ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ وَبُعُوْلَتُهُنَّ اَحَقُّ بِرَدِّهِنَّ فِيْ ذٰلِكَ اِنْ اَرَادُوْٓا اِصْلَاحًا ؕ وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِيْ عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ۠ وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ ؕ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿۲۲۸﴾

ترجمہ: ''طلاق یافتہ عورتیں اپنے آپ کو تین حیض (ماہواری) تک روکے رکھیں، اور انہیں جائز نہیں کہ وہ اس بات کو چھپائیں جو اللہ نے ان کے رحم میں پیدا کیا ہے اگر وہ اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتی ہیں، اور ان کے شوہر اس مدت کے دوران انہیں واپس لینے کے زیادہ حق دار ہیں اگر وہ صلح کا ارادہ رکھتے ہوں۔ اور عورتوں کے بھی ویسے ہی حقوق ہیں جیسے مردوں کے، عرف کے مطابق، اور مردوں کو عورتوں پر ایک درجہ فضیلت حاصل ہے، اور اللہ غالب، حکمت والا ہے''۔

تفسیر

مطلقہ عورتوں کی عدت

حضرت اسماء بنت یزید انصاریہؓ سے روایت ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے میں جب کسی عورت کو طلاق دی جاتی تو اس کے لیے کوئی عدت مقرر نہ تھی۔ اس موقع پر اللہ تعالیٰ نے عدت کا حکم نازل فرمایا، یعنی طلاق یافتہ عورتیں تین حیض تک عدت گزاریں۔ **(سنن ابوداؤد، رقم:۲۲۸۱)**

اسی طرح ثعلبہ نے ایک واقعہ نقل کیا ہے کہ حضرت اسماعیل بن عبداللہ غفاریؓ نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے عہد میں اپنی بیوی قتیلہ کو طلاق دے دی۔ اس وقت انہیں معلوم نہ تھا کہ ان کی بیوی حاملہ ہے۔ بعد میں جب اس کا علم ہوا تو انہوں نے رجوع کر لیا۔ اس کے بعد ان کی بیوی نے بچہ جنا لیکن زچگی کے دوران ماں اور بچہ دونوں کا انتقال ہو گیا۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیتِ مبارکہ نازل فرمائی: ''وَالْمُطَلَّقٰتُ'' یعنی جو عورت حاملہ نہ ہو، وہ تین حیض تک عدت گزارے۔

گزشتہ آیات میں ایلاء اور طلاق کا ذکر کیا گیا تھا۔ ایلاء گویا طلاق کا مقدمہ یا تمہید ہے، اور بعض اوقات اس میں رجوع کا امکان باقی رہتا ہے۔ اس لیے اب یہاں مطلقہ عورتوں کے لیے عدت کے احکام اور طلاق کے ساتھ رجوع کے ضابطے بیان فرمائے جا رہے ہیں۔

طلاق کے بعد عدت

زمانۂ جاہلیت میں یہ رواج تھا کہ مرد اپنی بیوی کو طلاق دے کر برسوں کے لیے الگ کر دیتا۔ اس دوران نہ تو

وہ عورت دوسرا نکاح کرسکتی تھی اور نہ ہی شوہر اس کی ضروریات پوری کرتا تھا۔ یوں عورت بیچاری معلق ہوکر ظلم سہتی رہتی۔ اس زمانے میں طلاق کے بعد عورت کے لیے عدت کی کوئی معین مدت مقرر نہ تھی کہ کب وہ دوسرا نکاح کرسکتی ہے۔ اسلام نے جب جاہلیت کی ان رسموں کی اصلاح کی تو مطلقہ عورت کی عدت کے بارے میں واضح احکام دیے اور طے فرمایا کہ طلاق کے بعد عورت کس مدت کے بعد دوسرا نکاح کرسکتی ہے۔

حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ حضرت ثابت بن قیسؓ کی اہلیہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور عرض کیا: ''یارسول اللہ! مجھے ثابت بن قیسؓ کے دین واخلاق پر کوئی اعتراض نہیں، لیکن مجھے اندیشہ ہے کہ میں مسلمان ہوتے ہوئے شوہر کی ناشکری کا گناہ نہ کر بیٹھوں''۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''کیا تم وہ باغ، جو ثابتؓ نے تمہیں مہر میں دیا تھا، واپس کردوگی؟'' انہوں نے جواب دیا: ''جی ہاں''۔ اس پر نبی اکرم ﷺ نے حضرت ثابتؓ سے فرمایا: ''اپنا باغ واپس لے لو اور اپنی بیوی کو طلاق دے دو''۔ **(صحیح بخاری، کتاب الطلاق، حدیث: ۵۲۷۳)**

خلع اور عدت کے احکام

شرعی اصطلاح میں عورت کے اپنی کوشش سے علیحدگی حاصل کرنے کو خلع کہا جاتا ہے۔ جب میاں بیوی کے درمیان نباہ کی صورت باقی نہ رہے تو طلاق یا خلع کے ذریعے علیحدگی اختیار کرنا بہتر ہے۔

اس آیت کے شانِ نزول کے بارے میں روایت ہے کہ اسماء بنتِ یزید انصاریہؓ کو ان کے شوہر نے طلاق دے دی تھی، لیکن اس وقت عدت کی کوئی مدت مقرر نہ تھی۔ انہوں نے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوکر دریافت کیا، تو یہ آیت نازل ہوئی اور اللہ تعالیٰ نے مطلقہ عورتوں کی عدت بیان فرمائی۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ''اور طلاق یافتہ عورتیں اپنے آپ کو نکاح سے روکے رکھیں، تین حیض گزرنے تک۔ (اس مخصوص مدت کو عدت کہا جاتا ہے۔) اور ان عورتوں کے لیے جائز نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے جو کچھ ان کے رحم میں رکھا ہو، خواہ حمل ہو یا حیض، اسے چھپائیں، کیونکہ ایسا کرنے سے عدت کے حساب میں گڑبڑ پیدا ہوگی۔ اگر یہ عورتیں اللہ تعالیٰ اور یومِ آخرت پر ایمان رکھتی ہیں تو ان پر لازم ہے کہ حقیقت نہ چھپائیں۔''

مزید یہ کہ جن عورتوں کو طلاقِ رجعی دی گئی ہو، ان کے شوہر عدت کے اندر بغیر نئے نکاح کے انہیں رجوع کرلینے کا حق رکھتے ہیں، بشرطیکہ رجوع کا مقصد اصلاح اور باہمی تعلق کی بہتری ہو۔ اسلام نے یہ اصول اس لیے رکھا ہے کہ عورتوں کے بھی مردوں پر ویسے ہی حقوق ہیں جیسے مردوں کے عورتوں پر، البتہ مردوں کو ان کے مقابلے میں ایک درجہ فضیلت دی گئی ہے۔ اور اللہ تعالیٰ غالب بھی ہے اور حکیم بھی؛ وہی ہے جو اپنی حکمت و مصلحت کے ساتھ احکام مقرر فرماتا ہے۔

عدت کی قسمیں

اس آیت میں عدت سے متعلق احکام بیان ہوئے ہیں، جن کی کئی صورتیں ہیں جیسے:

۱۔ نابالغ لڑکی کی عدت: وہ چھوٹی بچی جسے ابھی حیض آنا شروع نہ ہوا ہو، اس پر عدت نہیں ہے۔

۲۔ بوڑھی عورت کی عدت: جس کو بڑھاپے کے سبب حیض آنا بند ہو چکا ہو، اگر اسے طلاق ملے تو اس کی عدت کا ذکر سورہ طلاق میں ہے۔

۳۔ حاملہ عورت کی عدت: اگر طلاق ہو جائے یا شوہر کا انتقال ہو جائے تو اس کی عدت وضع حمل ہے، یعنی بچہ پیدا ہونے پر عدت مکمل ہو جاتی ہے۔ اس کا بیان بھی سورہ طلاق میں ہے۔

۴۔ غیر حاملہ بیوہ کی عدت: جو عورت حاملہ نہ ہو اور اس کے شوہر کا انتقال ہو جائے، اس کی عدت چار ماہ اور دس دن ہے۔ اس کا ذکر سورہ بقرہ کے تیسویں رکوع میں ہے۔

۵۔ بالغہ مطلقہ عورت کی عدت: جو نہ حاملہ ہو اور نہ صغیرہ، اور جس سے خلوتِ صحیحہ (تنہائی یا صحبت) ہو چکی ہو، اگر اسے طلاق دی جائے تو اس کی عدت تین حیض ہے۔ یہی عدت اس آیت میں مذکور ہے۔

۶۔ خلوت سے قبل مطلقہ کی عدت: اگر کسی عورت کو صحبت سے پہلے طلاق ملے تو اس پر کوئی عدت نہیں ہے۔ اس کا حکم سورہ احزاب میں ہے۔

۷۔ لونڈی یا باندی کی عدت: اگر وہ مطلقہ ہو اور اسے حیض آتا ہو تو اس کی عدت دو حیض ہے اور اگر حیض نہ آتا ہو تو اس کی عدت ڈیڑھ ماہ ہے۔

اس طرح اس آیت میں عدت کے بارے میں پہلا بنیادی حکم بیان کیا گیا۔ دوسرا حکم یہ دیا گیا کہ عورت پر لازم ہے کہ وہ اپنے حیض یا حمل کی حالت کو ظاہر کرے تاکہ عدت کا حساب درست طور پر کیا جا سکے۔

تیسرا حکم یہ ہے کہ یہاں طلاقِ رجعی کا ذکر ہے، یعنی اگر شوہر ایک یا دو بار طلاق دے اور عدت ختم ہونے سے پہلے رجوع کرنا چاہے تو وہ ایسا کر سکتا ہے۔ اس صورت میں پہلا نکاح ہی قائم رہتا ہے، اور شوہر کو یہ حق عورت کی مرضی کے بغیر بھی حاصل ہے، لیکن اگر تین طلاقیں دے دی جائیں تو پھر رجوع کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی۔

عورتوں کے حقوق مردوں پر

چوتھا حکم یہ ہے کہ جس طرح مردوں کے عورتوں پر حقوق ہیں، اسی طرح عورتوں کے بھی مردوں پر حقوق ہیں۔ دونوں کی ذمہ داریاں لازم و ملزوم ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ بعض پہلوؤں میں مرد کو عورت پر ایک درجہ فضیلت دی گئی

ہے جیسے: عورتوں کے خاص حقوق یہ ہیں:

(۱) مرد اپنی حیثیت کے مطابق بیوی کو کھانا، کپڑا، رہائش اور مہر دے۔

(۲) عورت کے ساتھ حسنِ سلوک کرے اور اسے تنگ نہ کرے۔

مردوں کے خاص حقوق یہ ہیں:

(۱) بیوی جائز کاموں میں شوہر کی اطاعت کرے۔

(۲) شوہر کی اجازت کے بغیر کسی ناپسندیدہ شخص کو گھر میں نہ آنے دے۔

یوں میاں بیوی کے باہمی تعلقات میں دونوں برابر ہیں کہ ایک کا حق دوسرے پر واجب ہے۔ البتہ ذمہ داریوں کے درجے اور دائرے میں فرق رکھا گیا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا خطبہ حجۃ الوداع

صحیح مسلم کی روایت ہے کہ حضرت جابرؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حجۃ الوداع کے خطبے میں فرمایا: ''لوگو! عورتوں کے بارے میں اللہ سے ڈرتے رہو۔ انہیں ناحق تکلیف نہ دو۔ تم نے اللہ کی امانت کے طور پر انہیں اپنی رفاقت میں لیا ہے اور اللہ کے حکم سے ان کی عصمت کو اپنے لیے حلال کیا ہے۔ تمہارا حق ان پر یہ ہے کہ جسے تم ناپسند کرتے ہو وہ تمہارے گھروں میں داخل نہ ہونے دیں۔ اگر وہ ایسا کریں تو انہیں تنبیہ کرو، لیکن ایسا نہ ہو کہ مار کے نشانات ظاہر ہوں۔ اور ان کا حق یہ ہے کہ دستور کے مطابق انہیں کھانا، کپڑا فراہم کرو''۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''میں تمہارے درمیان ایسی چیز چھوڑے جا رہا ہوں کہ اگر اسے مضبوطی سے پکڑے رہو گے اور اس پر عمل کرتے رہو گے تو کبھی گمراہ نہ ہو گے، اور وہ ہے اللہ کی کتاب (قرآن) اور میری سنت''۔ (صحیح مسلم: ۱۲۱۳)

آیت نمبر (۲۲۹) اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ ۪ فَاِمۡسَاكٌۢ بِمَعۡرُوۡفٍ اَوۡ تَسۡرِيۡحٌۢ بِاِحۡسَانٍ ؕ وَلَا يَحِلُّ لَـكُمۡ اَنۡ تَاۡخُذُوۡا مِمَّاۤ اٰتَيۡتُمُوۡهُنَّ شَيۡـئًا اِلَّاۤ اَنۡ يَّخَافَاۤ اَلَّا يُقِيۡمَا حُدُوۡدَ اللّٰهِ ؕ فَاِنۡ خِفۡتُمۡ اَلَّا يُقِيۡمَا حُدُوۡدَ اللّٰهِ ۙ فَلَا جُنَاحَ عَلَيۡهِمَا فِيۡمَا افۡتَدَتۡ بِهٖ ؕ تِلۡكَ حُدُوۡدُ اللّٰهِ فَلَا تَعۡتَدُوۡهَا ۚ وَمَنۡ يَّتَعَدَّ حُدُوۡدَ اللّٰهِ فَاُولٰٓـئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوۡنَ ﴿۲۲۹﴾

ترجمہ: ''رجعی طلاق دو بار تک ہے، پھر یا تو بھلے طریقے سے روک لینا ہے یا نیکی کے ساتھ رخصت کر دینا ہے، اور تمہیں جائز نہیں کہ تم اس مہر میں سے کچھ واپس لو جو تم نے عورتوں کو دیا ہے، ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ دونوں کو اندیشہ ہو کہ اللہ کی حدود پر قائم نہیں رہ سکیں گے، تو اگر تمہیں یقین ہو کہ اللہ کی

حدود قائم نہیں رکھ سکیں گے تو عورت کے لیے فدیہ دے کر علیحدگی اختیار کرنا گناہ نہیں، یہ اللہ کی حدود ہیں، ان سے تجاوز نہ کرو، اور جو اللہ کی حدود سے تجاوز کرے گا وہ ظالم ہے''۔

تفسیر

طلاق کا طریقہ اور اس کی حد

امام ترمذیؒ اور امام حاکمؒ نے حضرت عائشہ صدیقہؓ سے روایت کیا ہے کہ زمانۂ جاہلیت میں شوہر جتنی چاہے طلاقیں دیتا اور جب چاہے عدت کے دوران رجوع کر لیتا تھا۔ عورت بار بار اسی کی زوجیت میں رہتی، چاہے وہ اسے سو مرتبہ یا اس سے بھی زیادہ طلاق دے دیتا۔

ایک شخص نے اپنی بیوی سے کہا: ''اللہ کی قسم! نہ میں تجھے کبھی ایسی طلاق دوں گا کہ تو مجھ سے جدا ہو جائے، اور نہ تجھے سکون سے رہنے دوں گا''۔ بیوی نے حیرت سے پوچھا: ''یہ کیسے ممکن ہے؟'' وہ بولا: ''جب تیری عدت ختم ہونے کو ہوگی تو میں تجھ سے رجوع کر لوں گا اور یہ سلسلہ ہمیشہ جاری رکھوں گا''۔ یہ عورت اپنا حال لے کر رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئی۔ آپ ﷺ نے سن کر خاموشی اختیار فرمائی، تب اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: ''اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ''، عنی وہ طلاق جس میں رجوع کی اجازت ہے، وہ صرف دو مرتبہ تک محدود ہے۔

فرمانِ الٰہی: وَلَا یَحِلُّ لَکُمْ

امام ابوداؤدؒ نے ''ناسخ و منسوخ'' میں حضرت ابنِ عباسؓ سے نقل کیا ہے کہ لوگ اپنی بیویوں کا مال خواہ دیا ہوا ہو یا نہ ہو، سب ہڑپ کر لیتے اور سمجھتے کہ اس پر کوئی گناہ نہیں۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ حکم نازل فرمایا: ''تمہارے لئے یہ حلال نہیں کہ اپنی بیویوں کو دیا ہوا مال واپس لو''۔

عرب میں طلاق کا دستور

عرب معاشرے میں طلاق کی کوئی حد مقرر نہ تھی۔ شوہر جتنی چاہتا طلاقیں دے دیتا اور پھر عدت ختم ہونے سے پہلے رجوع کر لیتا۔ کچھ لوگ عورتوں کو تنگ کرنے کے لیے بار بار ایسا کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے اس ظلم کا دروازہ بند کیا اور رجوع کو دو طلاقوں تک محدود فرما دیا۔

دو طلاق دینے کا صحیح طریقہ

ارشادِ ربانی ہے: ''اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ ۪ فَاِمْسَاكٌۢ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ تَسْرِیْحٌۢ بِاِحْسَانٍ ؕ''

یعنی رجوع کے ساتھ درست طلاق صرف دو مرتبہ ہے۔ پھر اس کے بعد شوہر کے پاس دو ہی راستے ہیں:

۱۔ رجوع کر کے عورت کو بھلائی کے ساتھ اپنے نکاح میں رکھے۔

۲۔ یا حسنِ سلوک کے ساتھ اسے آزاد کر دے کہ اس کی عدت پوری ہو اور وہ جہاں چاہے نکاح کر لے۔

یہاں واضح کر دیا گیا کہ رجوع کا حق صرف دو طلاقوں تک محدود ہے، اور وہ بھی عدت کے دوران۔ عدت ختم ہونے کے بعد رجوع کا حق باقی نہیں رہتا۔ ہاں! اگر دونوں راضی ہوں تو نیا نکاح کیا جا سکتا ہے۔ لیکن تیسری طلاق کے بعد نہ رجوع درست ہے اور نہ نیا نکاح، جب تک کہ عورت دوسرے مرد سے نکاح نہ کرے اور وہ اپنی مرضی سے اسے طلاق نہ دے۔ اس صورت کو شریعت میں حلالہ کہا جاتا ہے۔

زمانۂ جاہلیت کی رسم

جاہلیت کے دور کی ایک ظالمانہ رسم یہ تھی کہ جب شوہر اپنی بیوی کو طلاق دے دیتا تو جو کچھ اسے دیا ہوتا، وہ بھی واپس چھین لیتا۔ اس ظلم سے اللہ تعالیٰ نے منع فرمایا۔

طلاق کا اصل مفہوم

''طلاق'' ایک شرعی اصطلاح ہے جس کا مطلب بیوی کو نکاح کی بندش سے آزاد کر دینا ہے۔ اسلام نے ازدواجی رشتے کو مضبوط بنانے کے لئے بڑی وضاحت کے ساتھ تعلیم دی ہے، لیکن یہ حقیقت بھی پیشِ نظر رکھی کہ بعض حالات میں یہ رشتہ قائم رکھنا فساد اور بگاڑ کا سبب بن سکتا ہے۔ ایسے مواقع پر طلاق کی اجازت دی گئی ہے تاکہ شوہر اور بیوی ظلم اور جبر کی زندگی گزارنے پر مجبور نہ ہوں۔

اگرچہ طلاق کو ضرورت کے وقت جائز رکھا گیا ہے، لیکن اسلام نے اسے ناپسندیدہ بھی قرار دیا ہے۔ جیسا کہ حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''اللہ کے نزدیک حلال چیزوں میں سب سے ناپسندیدہ چیز طلاق ہے''۔ **(سنن ابوداؤد، حدیث: ۲۱۷۸)**

یعنی شریعت کا مقصد یہ ہے کہ شوہر اس حق کو محض شدید ضرورت میں استعمال کرے، نہ کہ معمولی باتوں پر۔ مزید یہ کہ شریعت نے طلاق کے صحیح مفہوم اور اس سے متعلقہ احکام کو بھی واضح فرمایا ہے، جن میں سے بعض آگے آ رہے ہیں۔

اسلام نے جہاں مرد کو طلاق دینے کا حق دیا ہے، وہیں عورت کو بھی علیحدگی حاصل کرنے کے راستے دیے ہیں، جن میں ایک اہم صورت خلع ہے، جس کا حکم اسی آیت میں مذکور ہے۔

یہودیوں کے یہاں طلاق کا طریقہ

حضرت موسیٰؑ کی شریعت میں بھی طلاق کا تصور موجود تھا، مگر اہلِ کتاب نے اس میں زیادتی کی۔ یہودیوں

نے اسے نہایت آسان بنا دیا۔ موجودہ تورات میں یہ حکم درج ہے: ''اگر کوئی شخص کسی عورت سے شادی کرے اور پھر اس میں کوئی عیب پا کر اس سے ناخوش ہو تو وہ اس کے لئے طلاق نامہ لکھ کر اس کے ہاتھ میں دے اور اسے اپنے گھر سے نکال دے۔ جب وہ عورت اس کے گھر سے نکل جائے تو دوسرے شخص کی بیوی ہو سکتی ہے''۔ **(استثناء، باب ۲۴: آیات ۱-۲)**

یہودیوں کے ہاں یہ قاعدہ بھی تھا کہ ایک مرتبہ طلاق دینے کے بعد شوہر اپنی سابقہ بیوی سے دوبارہ نکاح نہیں کر سکتا۔

عیسائیوں کے یہاں طلاق کا حکم

انجیل میں مذکور ہے: ''جسے خدا نے جوڑا ہے، اسے انسان جدا نہ کرے''۔

چنانچہ جب گھر میں نوکروں نے اس بارے میں سوال کیا تو جواب دیا گیا: ''جو کوئی اپنی بیوی کو چھوڑ کر دوسری عورت سے شادی کرتا ہے تو وہ پہلی بیوی کے خلاف زنا کرتا ہے اور اگر بیوی اپنے شوہر کو چھوڑ کر دوسرے سے شادی کرے تو وہ بھی زنا کی مرتکب ہوتی ہے''۔ **(مرقس، باب ۱۰: آیات ۹-۱۲)**

اسی بنیاد پر عیسائیوں نے طلاق کو کلی طور پر حرام قرار دے دیا اور صرف اسی صورت میں جائز رکھا جب بیوی بدکاری میں ملوث ہو۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ زنا کے علاوہ بھی کئی اسباب ایسے ہوتے ہیں جو طلاق کے جواز کے لئے کافی ہیں۔ چنانچہ Encyclopedia of Religion and Ethics کے مصنف نے بھی اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے۔

Although it is evident that adultery affects the marriage relation more closely than any other offence, yet it may fairly be said that there are other things which may make married life so intolerable and the perfect ideal union so impossible that if divorce or separation be allowed at all, the ground for such separation ought not in reason to be confined to the one offende of adultery .....there are offence which make life so intolerable that there can be no restoration of affection, that where the tie of affection has been absolutely destroyed, the real vinculum has been raptured and that therefore ,such offences may rightly be put in the same category as conjugal infidelity in the strict sense of the word. (Encyclopedia of religion and ethics vol 8 p.438)

خلاصہ

یہ بات بالکل واضح ہے کہ بعض جرائم یا ایسے حالات جن میں ازدواجی تعلق قائم رکھنا ناممکن ہو، طلاق دینا ناگزیر ہو جاتا ہے۔ کچھ دیگر اسباب بھی ایسے ہیں جن سے میاں بیوی کے درمیان محبت اور ہم آہنگی ختم ہو جاتی ہے، اور زندگی باہم گزارنا ناقابلِ برداشت ہو جاتا ہے۔ ایسے اسباب کو بھی طلاق دینے کی وجوہات میں شمار کیا جانا چاہئے۔

اسلام کا نظریہ اس معاملے میں عدل و انصاف پر مبنی ہے۔ اس نے ایک طرف طلاق کو ناپسندیدہ قرار دیا، تو دوسری طرف اس کے استعمال کے سلسلے میں واضح حدود اور شرائط مقرر کر دی ہیں تاکہ یہ حق بلاضرورت یا زیادتی کے بغیر

بروئے کار لایا جائے۔

وَلَا يَحِلُّ لَكُمْ اَنْ تَاْخُذُوْا مِمَّآ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ شَيْـًٔا اِلَّآ اَنْ يَّخَافَآ اَلَّا يُقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ ؕ

ترجمہ: ''اور تمہارے لیے یہ جائز نہیں کہ بیویوں کو چھوڑتے وقت ان سے وہ کچھ واپس لو جو تم نے مہر کے طور پر انہیں دیا تھا''۔

البتہ ایک مخصوص صورت میں استثناء ہے، اور وہ یہ کہ میاں بیوی کے تعلقات اس حد تک خراب ہو جائیں کہ اللہ تعالیٰ کے مقرر کردہ شرعی حقوق کی ادائیگی ممکن نہ رہے، یعنی دونوں کے درمیان صلح یا افہام وتفہیم کا کوئی راستہ باقی نہ رہے۔

زمانۂ جاہلیت کی اس بُری رسم سے منع کیا گیا ہے کہ جو کچھ تم نے مہر کے طور پر اپنی بیوی کو دیا ہے، طلاق کے بعد اسے واپس لو۔ البتہ اگر تعلقات اس قدر بگڑ جائیں کہ زندگی مشترکہ برداشت سے باہر ہو اور طلاق ناگزیر ہو، تو اس صورت میں عورت کچھ مال دے کر طلاق حاصل کر سکتی ہے۔

اسلامی شریعت میں اس طلاق کی مخصوص صورت کو خلع کہا جاتا ہے، جس کا مقصد میاں بیوی دونوں کے لیے عزت اور حق کی حفاظت کے ساتھ تعلق ختم کرنا ہے اور اس کے بارے میں آگے تفصیل آئے گی۔

خلع کا طریقہ

فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا يُقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ ۙ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا فِيْمَا افْتَدَتْ بِهٖ ؕ

ترجمہ: ''اگر تم لوگوں کو یعنی میاں بیوی کو یہ خطرہ ہو کہ وہ دونوں اللہ کے قانون کو قائم نہ کر سکیں گے تو دونوں پر کوئی گناہ نہ ہوگا اُس مال کو لینے دینے میں، جس کو دے کر عورت اپنی جان چھڑا لے''۔

حدیث میں مذکور ہے کہ حضرت ثابت بن قیسؓ کی بیوی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں آئیں اور عرض کیا: ''یا رسول اللہ! میں ثابت بن قیس کے دین و اخلاق میں کوئی عیب نہیں پاتی، مگر ہم ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتے۔'' انہوں نے کہا کہ میں نے بہت سے لوگوں کو دیکھا، مگر سب سے زیادہ کالے، چھوٹے قد اور بدصورت ثابت ہی نظر آئے۔

حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''تم وہ باغیچہ واپس دے سکتی ہو جو اس نے تمہیں دیا ہے۔'' انہوں نے کہا: ''جی ہاں، وہ بھی اور کچھ زیادہ دے سکتی ہوں''۔ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ثابت بن قیسؓ کو بلا کر فرمایا: ''تم اس سے وہ باغیچہ واپس لے لو اور اسے طلاق دے دو''۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی اور یہ اسلام میں پہلا خلع تھا۔ **(بخاری رقم: ۵۲۷۳)**

خلع میں عورت سے مال لے کر چھوڑنے کی دو صورتیں:

۱۔ خلع: عورت کہتی ہے کہ ''تم اتنے مال پر مجھ سے خلع کر لو'' اور مرد کہتا ہے: ''مجھے منظور ہے۔'' اس کے کہنے کے

ساتھ ہی طلاق بائن ہوجاتی ہے، چاہے لفظ طلاق نہ کہا جائے، اور مرد پر عورت کو وہ مال دینا واجب ہوجاتا ہے۔

۲۔طلاق علی المال: مرد کہتا ہے: ''تجھے اتنے مال کے بدلے طلاق ہے۔'' اگر عورت منظور نہ کرے تو طلاق نہیں ہوگی اور اگر منظور کرلے تو فوراً طلاق بائن ہوجاتی ہے اور مرد پر مال دینا واجب ہوجاتا ہے۔

خلع سے متعلق مسائل

۱۔اگر نااتفاقی عورت کی وجہ سے ہو اور وہ خود خلع کی درخواست کرے تو عورت گناہگار ہوگی، مرد مال لینے میں گناہگار نہیں، البتہ مہر سے زیادہ مال لینا مکروہ ہے۔

۲۔اگر بگاڑ مرد کی وجہ سے ہو تو مرد مال لینے میں گناہگار ہوگا، مگر عورت مال دینے میں گناہگار نہیں ہوگی۔

۳۔اگر دونوں ایک دوسرے پر الزام لگائیں اور ہر ایک خود کو مظلوم سمجھے، تو مرد کے لیے مہر سے زیادہ مال لینا مکروہ ہے، مگر عورت کے لیے خلع کی درخواست دینا جائز ہے۔

۴۔طلاق علی المال کے لیے بھی یہی اصول ہیں؛ یعنی گناہ یا عدم گناہ کے باوجود طلاق صحیح طور پر مکمل ہوگی۔

۵۔تمام حالتوں میں، چاہے گناہ کے ساتھ ہی کیوں نہ ہو، خلع نافذ اور درست ہوگی۔

طلاق اور خلع کے امور میں باریکیاں بہت ہیں، اس لیے ضروری ہے کہ اگر طلاق کے مسائل پیش آئیں تو شریعت میں مہارت رکھنے والے علماء سے رہنمائی حاصل کی جائے اور ان کے مطابق عمل کیا جائے۔آیت کے آخر میں تاکید اور تنبیہ کے طور پر یہ حکم فرمایا گیا ہے کہ اس معاملے میں رعایت اور احتیاط لازمی ہے۔

تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ فَلَا تَعْتَدُوْهَا ۚ وَمَنْ يَّتَعَدَّ حُدُوْدَ اللّٰهِ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۲۲۹﴾

ترجمہ: ''یہ سب احکام اللہ کے بتائے ہوئے قانون ہیں سو تم ان سے باہر مت نکلنا اور جو شخص اللہ کے قانون سے باہر نکل جائے تو ایسے ہی لوگ اپنا نقصان کرنے والے ہیں''۔

یعنی یہ احکام اللہ تعالیٰ کے مقرر کردہ قوانین ہیں، جن میں کوئی تفریق نہیں نہ غریب اور امیر میں، نہ شریف اور عام انسان میں، نہ عالم اور جاہل میں، نہ بادشاہ اور فقیر میں۔ جو لوگ اللہ کے قوانین سے منہ موڑ لیتے ہیں، وہ درحقیقت اپنے اوپر ظلم کررہے ہوتے ہیں اور آخرت میں بھاری وبال کا سامنا کرنے کے مستحق ٹھہرتے ہیں۔

یہاں سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ اسلام ہر شعبے میں، خاص طور پر گھریلو اور خاندانی معاملات اور سماج کی اصلاح کے لیے رہنمائی فراہم کرتا ہے۔اسلام چاہتا ہے کہ میاں بیوی کے تعلقات اور دنیا کے سماجی نظام نیکی اور تقویٰ کی بنیاد پر قائم ہوں، اور کوئی کسی کے ساتھ ظلم وزیادتی نہ کرے۔لیکن اگر ہم اللہ کے ان احکام کی پرواہ نہیں کرتے، تو نہ صرف آخرت میں بھاری عذاب ہمارا منتظر ہے بلکہ دنیا میں بھی بھلائی اور سکون نصیب نہیں ہوسکتا۔ ❁❁❁

ترجمہ- آیت نمبر ۲۳۰ سے ۲۳۴ تک

فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهٗ مِنْۢ بَعْدُ حَتّٰى تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهٗ ؕ فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَآ اَنْ يَّتَرَاجَعَآ اِنْ ظَنَّآ اَنْ يُّقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ ؕ وَتِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ يُبَيِّنُهَا لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ﴿۲۳۰﴾ وَاِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَبَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَاَمْسِكُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ سَرِّحُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ ۪ وَّلَا تُمْسِكُوْهُنَّ ضِرَارًا لِّتَعْتَدُوْا ۚ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهٗ ؕ وَلَا تَتَّخِذُوْٓا اٰيٰتِ اللّٰهِ هُزُوًا ۠ وَّاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمَآ اَنْزَلَ عَلَيْكُمْ مِّنَ الْكِتٰبِ وَالْحِكْمَةِ يَعِظُكُمْ بِهٖ ؕ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴿۲۳۱﴾ وَاِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَبَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ اَنْ يَّنْكِحْنَ اَزْوَاجَهُنَّ اِذَا تَرَاضَوْا بَيْنَهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ ؕ ذٰلِكَ يُوْعَظُ بِهٖ مَنْ كَانَ مِنْكُمْ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ ذٰلِكُمْ اَزْكٰى لَكُمْ وَاَطْهَرُ ؕ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۲۳۲﴾ وَالْوَالِدٰتُ يُرْضِعْنَ اَوْلَادَهُنَّ حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ لِمَنْ اَرَادَ اَنْ يُّتِمَّ الرَّضَاعَةَ ؕ وَعَلَى الْمَوْلُوْدِ لَهٗ رِزْقُهُنَّ وَكِسْوَتُهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ؕ لَا تُكَلَّفُ نَفْسٌ اِلَّا وُسْعَهَا ۚ لَا تُضَآرَّ وَالِدَةٌۢ بِوَلَدِهَا وَلَا مَوْلُوْدٌ لَّهٗ بِوَلَدِهٖ ۚ وَعَلَى الْوَارِثِ مِثْلُ ذٰلِكَ ۚ فَاِنْ اَرَادَا فِصَالًا عَنْ تَرَاضٍ مِّنْهُمَا وَتَشَاوُرٍ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا ؕ وَاِنْ اَرَدْتُّمْ اَنْ تَسْتَرْضِعُوْٓا اَوْلَادَكُمْ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ اِذَا سَلَّمْتُمْ مَّآ اٰتَيْتُمْ بِالْمَعْرُوْفِ ؕ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴿۲۳۳﴾ وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا يَّتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَّعَشْرًا ۚ فَاِذَا بَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْمَا فَعَلْنَ فِيْٓ اَنْفُسِهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ؕ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ﴿۲۳۴﴾

ترجمہ:

(۲۳۰)۔ پھر اگر شوہر تیسری بار طلاق دے دے تو وہ عورت اس کے لیے حلال نہ ہوگی جب تک کہ وہ کسی اور شوہر سے نکاح نہ کرلے، پھر اگر دوسرا شوہر بھی طلاق دے دے تو ان دونوں پر کوئی گناہ نہیں اور اگر وہ آپس میں رجوع کرنا چاہیں، بشرطیکہ وہ سمجھیں کہ اللہ کی حدود پر قائم رہیں گے، اور یہ اللہ کی مقرر کردہ حدود ہیں، وہ ان کو جاننے والوں کے لیے بیان کرتا ہے۔(۲۳۱)۔ جب تم عورتوں کو طلاق دو، پھر وہ اپنی عدت پوری کرنے کے قریب پہنچ جائیں تو یا انہیں بھلے طریقے سے روک لو یا اچھے طریقے سے چھوڑ دو، اور انہیں ستانے کے لیے نہ روکو تاکہ زیادتی کرو،

اور جو ایسا کرے گا وہ اپنے ہی نفس پر ظلم کرے گا، اور اللہ کی آیات کو مذاق نہ بناؤ، اور یاد کرو اللہ کی نعمت کو جو تم پر ہے، اور اس کتاب وحکمت کو جو اللہ نے تم پر نازل کی ہے، وہ تمہیں نصیحت کرتا ہے، اور اللہ سے ڈرو، اور جان لو کہ اللہ ہر چیز کو جانتا ہے۔(۲۳۲)۔ جب تم عورتوں کو طلاق دو اور وہ اپنی عدت پوری کر لیں، تو انہیں نہ روکو کہ وہ اپنے (پہلے) شوہروں سے نکاح کریں اگر وہ باہمی رضامندی سے نکاح کرنا چاہیں، یہ حکم ان کے لیے ہے جو اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتے ہیں، یہ بات تمہارے لیے زیادہ پاکیزہ اور صاف ہے، اور اللہ جانتا ہے، تم نہیں جانتے۔(۲۳۳)۔ مائیں اپنی اولاد کو دو سال پورے دودھ پلائیں، یہ اس کے لیے ہے جو مکمل رضاعت کرانا چاہے، اور باپ پر ہے ان کا کھانا اور کپڑا دستور کے مطابق، کسی کو اس کی طاقت سے زیادہ تکلیف نہیں دی جاتی، نہ ماں کو نقصان پہنچایا جائے اس کے بچے کی وجہ سے، اور نہ باپ کو، اور وارثوں پر بھی اسی طرح کا حق ہے، پھر اگر وہ دونوں باہمی مشورے اور رضامندی سے دودھ چھڑانا چاہیں تو اس میں کوئی گناہ نہیں، اور اگر تم چاہو کہ کسی اور عورت سے دودھ پلاؤ تو بھی کوئی گناہ نہیں، بشرطیکہ انہیں ان کا حق دستور کے مطابق دے دو، اور اللہ سے ڈرتے رہو، اور جان لو کہ اللہ تمہارے اعمال کو خوب دیکھنے والا ہے۔(۲۳۴)۔ اور تم میں سے جو لوگ وفات پا جائیں اور بیویاں چھوڑ جائیں، وہ بیویاں چار مہینے دس دن تک عدت گزاریں، پھر جب وہ اپنی عدت پوری کر لیں، تو جو کچھ وہ اپنے بارے میں دستور کے مطابق کریں اس میں تم پر کوئی گناہ نہیں، اور اللہ تمہارے تمام اعمال سے باخبر ہے۔

تفسیر-آیت نمبر ۲۳۰ سے ۲۳۴ تک

آیت نمبر(۲۳۰) فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهٗ مِنْۢ بَعْدُ حَتّٰى تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهٗ ؕ فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَآ اَنْ يَّتَرَاجَعَآ اِنْ ظَنَّآ اَنْ يُّقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ ؕ وَتِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ يُبَيِّنُهَا لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ﴿۲۳۰﴾

ترجمہ: ''پھر اگر شوہر تیسری بار طلاق دے دے تو وہ عورت اس کے لیے حلال نہ ہوگی جب تک کہ وہ کسی اور شوہر سے نکاح نہ کر لے، پھر اگر دوسرا شوہر بھی طلاق دے دے تو ان دونوں پر کوئی گناہ نہیں اور اگر وہ آپس میں رجوع کرنا چاہیں، بشرطیکہ وہ سمجھیں کہ اللہ کی حدود پر قائم رہیں گے، اور یہ اللہ کی مقرر کردہ حدود ہیں، وہ ان کو جاننے والوں کے لیے بیان کرتا ہے''۔

تفسیر ابنِ جریر نے عوفی کے ذریعے حضرت ابنِ عباسؓ سے روایت نقل کی ہے کہ پہلے لوگ اپنی بیویوں کو طلاق دیتے، پھر عدت پوری ہونے سے قبل رجوع کر لیتے، اور دوبارہ طلاق دے دیتے، اس طرح عورت کو نقصان پہنچاتے

اور اسے بے یقینی میں لٹکائے رکھتے تھے۔ اس رویے پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔

پچھلی آیت میں مرد کو دو طلاقوں تک عدت کے اندر رجوع کرنے کا حق بیان کیا گیا تھا، یعنی دو طلاق دینے کے بعد مرد چاہے تو رجوع کر کے عورت سے صلح کر لے اور اسے اپنے نکاح میں رکھے، یا عدت کے دوران رجوع نہ کر کے عورت کو مناسب طریقے سے چھوڑ دے تا کہ عدت مکمل ہو جائے اور عورت آزاد ہو کر کسی اور سے نکاح کر سکے۔

اب اس آیت میں تیسری طلاق کے بعد کا حکم بیان کیا گیا ہے، یعنی اگر کسی نے دو طلاقوں کے بعد تیسری بار بھی طلاق دے دی تو اس کا قانونی اور شرعی حکم واضح کر دیا گیا ہے۔

عدت میں طلاق کا حکم

اس آیت میں تین طلاق کے احکام بیان کیے گئے ہیں۔ دو طلاقوں کے بعد اگر طلاق رجعی ہو تو شوہر عدت کے دوران رجوع کر سکتا ہے، لیکن اگر اس نے عدت کے اندر تیسری طلاق بھی دے دی تو اب نہ وہ رجوع کر سکتا ہے اور نہ ہی نکاح کر سکتا ہے۔ البتہ ایک ہی صورت ممکن ہے کہ عورت دوبارہ پہلے شوہر کے نکاح میں آئے، اور وہ یہ کہ عورت اپنی عدت پوری کرے، کسی دوسرے مرد سے نکاح کرے، حقوق ادا کرے اور دوسرے شوہر کے ساتھ رہے۔ اگر دوسرا شوہر بھی طلاق دے دے یا وفات پا جائے تو عورت اپنی عدت مکمل کرنے کے بعد پہلے شوہر کے نکاح میں آ سکتی ہے، اور یہی شرعی اصطلاح میں ''حلالہ'' کہلاتا ہے۔

پہلے شوہر کے ساتھ دوبارہ نکاح کی شرطیں

مطلقہ کو پہلے شوہر کے ساتھ دوبارہ نکاح کے لیے درج ذیل پانچ شرائط پوری کرنا ضروری ہیں:

۱۔ پہلے شوہر کی عدت مکمل کرے۔

۲۔ عدت کے بعد دوسرے شوہر سے شرعی نکاح کرے۔

۳۔ دوسرے شوہر سے ہمبستری (sexual intercourse) ہو۔

۴۔ دوسرا شوہر اسے طلاق دے دے۔

۵۔ دوسرے شوہر کی طلاق کے بعد عدت پوری کرے۔

اگر ان پانچ میں سے کوئی بھی شرط پوری نہ ہوئی تو پہلے شوہر کے ساتھ دوبارہ نکاح جائز نہیں ہوگا۔ نکاح کی اجازت صرف اس صورت میں ہوگی جب پہلے شوہر اور عورت دونوں کو یہ یقین ہو کہ دوبارہ نکاح کے بعد ایک دوسرے کے حقوق میں کمی نہیں آئے گی۔

اس آیت سے واضح ہے کہ تین طلاق کے بعد مرد کو رجعت کا کوئی حق باقی نہیں رہتا، خواہ یہ تین طلاقیں ایک ساتھ دی گئی ہوں یا الگ الگ۔ صحابہ، تابعین اور ائمۂ مجتہدین کا اس پر اجماع ہے کہ تین طلاقیں، چاہے ایک وقت میں یا مختلف اوقات میں دی جائیں، تین الگ طلاقیں شمار ہوں گی۔

فقہی اتفاق

امام ابوحنیفہؒ، امام مالکؒ، امام شافعیؒ، اور امام احمد بن حنبلؒ، اور ان کے بعد امت محمدیہ کے زیادہ تر علماء، فقہا، محدثین اور مفسرین اس بات پر متفق ہیں کہ تین طلاق دینے سے تین طلاقیں واقع ہو جاتی ہیں۔ امام بخاریؒ نے بھی صحیح بخاری میں اس کے لیے مخصوص باب قائم کیا اور ان شبہات کا تفصیلی جواب دیا جو تین طلاق کو ایک طلاق بنانے کی دلیل دیتے ہیں۔ امام قرطبیؒ نے بھی اس پر مفصل بحث کی ہے۔ لہٰذا تین طلاق کے مسئلے میں کتاب وسنت، اجماع صحابہ اور اجماع ائمہ کی پیروی کرنا چاہئے۔

طلاقِ احسن

طلاق کی تعداد کے سلسلے میں قرآن وسنت کی تعلیمات، صحابہ کا عمل اور تابعین کی روایتوں سے جو باتیں ثابت ہوتی ہیں، ان کا خلاصہ یہ ہے کہ جب طلاق دینے کے علاوہ کوئی چارہ نہ بچے تو طلاق کا سب سے بہتر طریقہ یہ ہے کہ ایک طلاق دی جائے، اور وہ بھی حالتِ طہارت (پاکی) میں ہو، یعنی بیوی کے ساتھ کوئی جماع نہ کیا گیا ہو۔ ایک طلاق دے کر عورت کو چھوڑ دیا جائے اور عدت کے ختم ہونے کے بعد نکاح خود بخود ختم ہو جائے۔ فقہاء نے اسی طریقہ کو ''طلاقِ احسن'' کہا ہے اور صحابہ کرامؓ نے بھی یہی طریقہ افضل قرار دیا۔

پچھلی آیت اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ سے بھی یہ اجازت ملتی ہے کہ دو طلاقیں دی جاسکتی ہیں، لیکن لفظ ''مَرَّتٰنِ'' سے اشارہ ملتا ہے کہ یہ دو طلاقیں ایک ہی وقت یا ایک ہی لفظ میں نہ ہوں، بلکہ دو طہروں (پاکی) میں الگ الگ ہوں۔ لہٰذا فقہا اور ائمہ کا اتفاق ہے کہ دو طلاق تک طلاقِ سنت میں داخل ہوتی ہے، جبکہ تیسری طلاق غیر مستحسن (ناپسندیدہ) ہے اور اس میں کسی کا اختلاف نہیں۔

تیسری طلاق کے مکروہ ہونے کا ثبوت حدیث سے بھی ملتا ہے، مگر اگر کسی نے اس کے باوجود تین طلاقیں دے دی ہیں تو اثر وہی ہوگا جو جائز اور مستحسن طلاق کا ہوتا ہے، یعنی تین طلاقیں واقع ہوں گی اور رجعت کا اختیار باقی نہیں رہے گا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کئی مواقع پر یہ فیصلہ نافذ فرمایا، کہ باوجود ناراضگی تین طلاقوں کا اثر برقرار رہے گا اور یہ حقائق حدیث کی کتابوں میں بھی موجود ہیں۔

مخالفین اسلام اور غیر مسلم بعض اوقات اعتراض کرتے ہیں کہ اسلام نے طلاق کے ایسے سلسلے کو جائز ٹھہرادیا جو آپسی تعلقات کے خلاف ہے، تو اس کا جواب یہ ہے کہ طلاق بذات خود مکروہ ہے، اور اسی لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''جائز چیزوں میں طلاق اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ ناپسندیدہ ہے''۔

ایک حدیث میں یہ بھی بیان ہوا ہے کہ جو عورت بغیر کسی شرعی وجہ کے طلاق لے گی، اس پر جنت کی خوشبو حرام ہو جائے گی۔ لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ میاں بیوی کو ہمیشہ ساتھ گزارنا لازم ہے یا کہ ان کے اختلافات کو نظر انداز کیا جائے۔ بعض حالات میں اتنی شدید ضرورت پیش آجاتی ہے کہ اس کا علاج صرف طلاق کے ذریعے ممکن ہوتا ہے۔

اسی لیے شریعتِ اسلامیہ نے یہود کی طرح طلاق کو بے جا آزاد نہیں چھوڑا، بلکہ پہلے فرمایا کہ عورت کی کسی کمی یا عادت پر صبر کیا جائے، نیک سلوک اور احسان کے ساتھ پیش آیا جائے، اور سمجھایا جائے کہ مرد کی اطاعت اور خیر خواہی لازم ہے۔ پھر جب شدید ضرورت یا مجبوری پیش آئے، تب طلاق کی اجازت دی گئی، لیکن اس کے ساتھ ہمیشہ یہ باتیں ذہن میں رکھیں تاکہ صلح، اتفاق اور میل جول کا امکان قائم رہے۔

طلاق دینے کی حالت

۱۔ سب سے پہلے یہ شرط ہے کہ طلاق طہارت کی حالت میں دی جائے، یعنی عورت کے حیض کے دنوں سے پاک ہونے کے دوران۔

۲۔ دوسرا یہ کہ تین طلاقیں ایک ہی وقت یا ایک ہی موقع پر نہ دی جائیں، تاکہ درمیان میں ملاپ یا بات چیت کے ذریعے غصہ ٹھنڈا ہو سکے اور مسئلہ سلجھنے کا امکان پیدا ہو۔

۳۔ تیسرا یہ کہ عدت کے دوران بھی اگر ملاپ ممکن ہو تو رجعت یعنی واپس بیوی بنانا جائز رہے، تاکہ اصلاح کا دروازہ کھلا رہے۔

اسلام نے نہ یہود کی طرح سختی کی ہے اور نہ عیسائیوں کی طرح نرمی اختیار کی، بلکہ اسلام ایک فطری دین ہے جو انسان کی زندگی کے ہر پہلو کا مکمل دستور عمل پیش کرتا ہے۔ یہ دین دنیا و آخرت کی کامیابی کا ضامن ہے اور زندگی کے ہر مسئلے کے حل کے لیے رہنمائی فراہم کرتا ہے۔

اسی لیے اسلام نے انسانی فطرت کو مدنظر رکھتے ہوئے، شدید ضرورت یا مجبوری کی حالت میں طلاق کو جائز قرار دیا ہے۔ بیوی اور شوہر کے تعلقات کی اہمیت کے پیش نظر شریعت نے بعض احکام اور پابندیاں نافذ کی ہیں جو انسانی فطرت کے مطابق ہیں۔

طلاق کے دوران اللہ تعالیٰ بار بار قرآن مجید میں حدودِ الٰہی کی پابندی کی تاکید فرماتے ہیں: ''وَتِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ يُبَيِّنُهَا لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ''

یعنی یہ حدود اللہ تعالیٰ کی مقرر کردہ ہیں اور سمجھدار لوگوں کے لیے صاف صاف بیان کی گئی ہیں، تاکہ وہ ان میں پوشیدہ حکمت و مصلحت پر غور کریں اور ان احکام کے فوائد کو سمجھیں۔

آیت نمبر (۲۳۱) وَاِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَبَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَاَمْسِكُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ سَرِّحُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ ۪ وَّلَا تُمْسِكُوْهُنَّ ضِرَارًا لِّتَعْتَدُوْا ۚ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهٗ ؕ وَلَا تَتَّخِذُوْٓا اٰيٰتِ اللّٰهِ هُزُوًا ۠ وَّاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمَآ اَنْزَلَ عَلَيْكُمْ مِّنَ الْكِتٰبِ وَالْحِكْمَةِ يَعِظُكُمْ بِهٖ ؕ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴿۲۳۱﴾

ترجمہ: ''جب تم عورتوں کو طلاق دو، پھر وہ اپنی عدت پوری کرنے کے قریب پہنچ جائیں تو یا انہیں بھلے طریقے سے روک لو یا اچھے طریقے سے چھوڑ دو، اور انہیں ستانے کے لیے نہ روکو تاکہ زیادتی کرو، اور جو ایسا کرے گا وہ اپنے ہی نفس پر ظلم کرے گا، اور اللہ کی آیات کو مذاق نہ بناؤ، اور یاد کرو اللہ کی نعمت کو جو تم پر ہے، اور اس کتاب و حکمت کو جو اللہ نے تم پر نازل کی ہے، وہ تمہیں نصیحت کرتا ہے، اور اللہ سے ڈرو، اور جان لو کہ اللہ ہر چیز کو جانتا ہے''۔

تفسیر

طلاقِ رجعی

اس آیت میں طلاقِ رجعی کا قانون بیان کیا گیا ہے اور وضاحت کی گئی ہے کہ رجعت کا حق عورت کو تنگ کرنے یا اس پر ظلم کرنے کے لیے استعمال نہیں ہونا چاہیے۔ جاہلیت کے زمانے میں بعض لوگ بیوی کو ستانے کے مقصد سے بار بار طلاق دیتے اور عدت کے قریب رجوع کر کے دوبارہ طلاق دے دیتے، جس سے عورت نہ تو سکون سے زندگی گزار سکتی تھی اور نہ کسی دوسرے مرد سے نکاح کر سکتی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے اس ظلم سے منع فرمایا اور حکم دیا کہ اگر رجعی طلاق دی ہوئی عورت کو واپس لانا چاہتے ہو تو اچھی نیت سے واپس لاؤ۔ عورت کو تکلیف پہنچانے یا ظلم کرنے کے مقصد سے اپنے پاس روکنا جائز نہیں، اور جو شخص ایسا کرے گا وہ دنیا و آخرت میں اپنے اعمال کا بھاری وبال اٹھائے گا۔

جب عورت اپنی عدت گزارنے کے قریب ہو اور عدت ختم نہ ہوئی ہو تو شوہر پر واجب ہے کہ یا تو اسے شریعت کے مطابق رجعت کر کے نکاح میں رکھے یا شریعت کے مطابق آزاد کر دے، لیکن کسی بھی صورت میں مقصد عورت کو نقصان پہنچانا نہ ہو۔

شرافت کے ساتھ طلاق کا حکم

آیت کے اس حصے میں یہ بھی بیان ہوا کہ اگر شوہر ایک یا دو طلاق دے چکا ہو اور تیسری طلاق نہ دی ہو تو رجوع کرنا چاہے تو کر سکتا ہے، اور اگر رجوع نہ کرنا چاہے تو معاملہ اختتام پذیر کر سکتا ہے۔ دونوں صورتوں میں عمل خوبی اور شرافت کے ساتھ ہونا چاہیے۔ یعنی اگر عورت کو واپس لوٹایا جائے تو عزت و احترام کے ساتھ نکاح میں رہنے دیا جائے، اور اگر تعلق ختم کرنا ہو تو گھر سے رخصت کرتے وقت بھی عزت و احترام برقرار رکھا جائے۔ جو لوگ عورت کو ستانے کے لیے دوبارہ اپنے پاس رکھتے ہیں، وہ عورت کے حقوق کو پامال کرتے ہیں اور آخرت میں اس کا بوجھ اٹھائیں گے۔

آیت میں آگے ارشاد ہے کہ: اللہ تعالیٰ کے احکام کو کھیل اور مذاق کی طرح نہ سمجھو۔ جس طرح تم چاہتے ہو عمل کرو یا نہ کرو، ایسا نہیں کہ تم اپنی مرضی سے شریعت کے احکام کو نظر انداز کر سکو۔ اللہ تعالیٰ کی تم پر دی گئی نعمتوں کو یاد کرو، اور خاص طور پر اس کتاب و حکمت کو جو اللہ نے نصیحت و رہنمائی کے لیے نازل فرمائی ہے۔ اللہ سے ڈرتے رہو اور اس پر یقین رکھو کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز سے بخوبی واقف ہے۔

تین اہم احکام

۱۔ پہلا حکم: اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: وَلَا تَتَّخِذُوْٓا اٰيٰتِ اللّٰهِ هُزُوًا ۔ یعنی اللہ کی آیات اور احکام کو کھیل یا مذاق کا ذریعہ نہ بناؤ۔ یہ حکم اس بات کی تنبیہ ہے کہ نکاح، طلاق اور دیگر شرعی احکام کو ہنسی مذاق یا تفریح کے طور پر نہ لیا جائے۔

مفسرین نے اس کی تفسیر بیان کی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے نکاح و طلاق کے لیے حدود، قوانین اور شرائط مقرر فرمائی ہیں، ان احکام کو کھیل تماشہ یا مذاق نہ سمجھو۔ زمانۂ جاہلیت میں بعض لوگ بیوی کو طلاق دیتے یا غلام کو آزاد کرتے اور کہتے تھے کہ یہ صرف مذاق میں ہوا، نیت نہیں تھی، لیکن اللہ تعالیٰ نے اس رویے سے منع فرمایا اور وضاحت کی کہ نیت نہ کرنے کا بہانہ قبول نہیں ہوگا۔ حدیث میں آتا ہے کہ تین چیزیں ایسی ہیں جن میں ہنسی مذاق یا سنجیدگی دونوں میں اثر برابر ہے: ۱۔ طلاق ۲۔ عتاق (غلام یا باندی کی آزادی) ۳۔ نکاح

یعنی اگر کوئی شخص ہنسی مذاق میں بھی گواہوں کے سامنے نکاح کا ایجاب و قبول کر دے، تو نکاح ہو جائے گا، یا اگر طلاق دے دے تو طلاق واقع ہو جائے گی، اور کسی غلام یا باندی کو ہنسی میں آزاد کرنے کا کہنا بھی ان کے لیے نافذ ہوگا۔

یہی وجہ ہے کہ آیت ''وَلَا تَتَّخِذُوْٓا اٰيٰتِ اللّٰهِ هُزُوًا'' ہمیں یہ سبق دیتی ہے کہ اللہ کے احکام کو مذاق یا تفریح کا ذریعہ نہ بنائیں۔ جو شخص اللہ کے احکام کے ساتھ ہنسی مذاق کرے، وہ کافر ہو سکتا ہے۔ عقیدہ صحیح ہو یا نہ ہو، دین کی تحقیر بنیادی طور پر کفر میں داخل ہوتی ہے، اور یہاں ہلکی سی لاپرواہی بھی اس سے مراد لی گئی ہے۔ اس حکم کی روشنی

میں واضح ہے کہ شرعی حدود اور احکام کو ہمیشہ سنجیدگی اور احترام کے ساتھ اختیار کرنا لازم ہے۔

۲۔دوسرا حکم: اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ''وَّاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ''

یعنی اللہ کی وہ بے شمار نعمتیں یاد رکھو جو تم پر ہیں۔تم پہلے گمراہ اور اندھیروں میں تھے، پھر اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مبعوث فرمایا، جس کے ذریعے تمہارے دلوں کو نورِ ہدایت سے منور کیا گیا۔ذلت کے بعد تمہیں عزت ملی، کمزوری کے بعد قوت نصیب ہوئی، بری عادات کی جگہ نیک عادات آئیں، یہ سب اللہ تعالیٰ کی عظیم نعمتیں ہیں۔سب سے بڑھ کر یہ کہ اللہ تعالیٰ نے تم پر یہ قرآن نازل فرمایا، جس میں حکمت اور نصیحت کی باتیں موجود ہیں، تاکہ تم ان پر عمل کرو اور زندگی کی درست رہنمائی حاصل کرو۔لہٰذا تمہیں واجب ہے کہ اللہ کے احکام کی پوری طرح پابندی کرو۔

۳۔تیسرا حکم: اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: وَاتَّقُوا اللّٰهَ

یعنی اللہ سے ڈرتے رہو۔یہ یاد رکھو اور یقین رکھو کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز سے خوب واقف ہیں۔قرآن کریم نے یہ بات حکمت بھرا انداز میں بیان فرمائی ہے تاکہ ہر انسان کے دل میں اللہ کے خوف اور آخرت کا حساب رہے، اور کوئی بھی جان بوجھ کر اللہ کے قوانین کے خلاف سرکشی نہ کرے۔اللہ تعالیٰ ہم سب کو اپنے احکام اور قوانین کی پیروی کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔آمین۔

آیت نمبر (۲۳۲) وَاِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَبَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَاَمْسِكُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ سَرِّحُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ ۪ وَلَا تُمْسِكُوْهُنَّ ضِرَارًا لِّتَعْتَدُوْا ۚ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهٗ ؕ وَلَا تَتَّخِذُوْٓا اٰيٰتِ اللّٰهِ هُزُوًا ۠ وَّاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمَآ اَنْزَلَ عَلَيْكُمْ مِّنَ الْكِتٰبِ وَالْحِكْمَةِ يَعِظُكُمْ بِهٖ ؕ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴿۲۳۱﴾

ترجمہ: ''جب تم عورتوں کو طلاق دو اور وہ اپنی عدت پوری کر لیں، تو انہیں نہ روکو کہ وہ اپنے (پہلے) شوہروں سے نکاح کریں اگر وہ باہمی رضامندی سے نکاح کرنا چاہیں، یہ حکم ان کے لیے ہے جو اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتے ہیں، یہ بات تمہارے لیے زیادہ پاکیزہ اور صاف ہے، اور اللہ جانتا ہے، تم نہیں جانتے''۔

تفسیر یہ احکام نصیحت اور اصلاح کے لیے ہیں اور عورت کے دل سے بدگمانی اور عداوت دور کرنے والے ہیں۔ اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے کہ عورت کو اپنے شوہر سے کس قدر محبت ہے، جبکہ انسان اس قدر آگاہ نہیں ہوتا۔

حضرت معقل بن یسارؓ نقل فرماتے ہیں کہ میری بہن جمیلہ کو اس کے شوہر عاصم بن عدیؓ نے طلاق دی لیکن

رجوع نہیں کیا۔ جب عدت مکمل ہوئی اور دوبارہ نکاح کے لیے پیغام بھیجا تو میں نے غیرت اور غصے کی بنا پر انکار کیا اور قسم کھالی کہ اب نکاح نہ ہونے دوں گا۔ اسی موقع پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی اور میں نے اس حکم کے سامنے سر تسلیم خم کر دیا اور کفارہ ادا کیا۔ (بخاری: ۵۱۳۰)

زمانہ جاہلیت کی رسم

زمانہ جاہلیت میں کچھ لوگ اپنی طلاق شدہ بیویوں کو دوبارہ نکاح کرنے کی اجازت نہیں دیتے تھے کیونکہ وہ اسے بے عزتی سمجھتے اور ظلم کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے اس ظالمانہ سلوک کو روکنے کے لیے یہ آیت نازل فرمائی تا کہ طلاق شدہ عورتیں شرعی اصولوں کے مطابق نئے نکاح میں داخل ہو سکیں۔

خطاب صرف شوہروں تک محدود نہیں بلکہ عورت کے ولی اور قریبی رشتہ داروں تک ہے کہ جب عورت اپنی عدت مکمل کرے اور اپنے شوہر یا کسی دوسرے کے ساتھ رضامندی کے ساتھ نکاح کرنا چاہے تو اسے روکنے کا کوئی حق نہیں، بشرطیکہ: ۱۔ نکاح شرعی اصول کے مطابق ہو، خفیہ یا ناجائز نہ ہو۔ ۲۔ عدت کے دوران نکاح کی نیت نہ ہو۔ ۳۔ عورت کسی غیر متناسب (کفو کے خلاف) مرد سے نکاح نہ کرے۔ ۴۔ مہر سے کم پر نکاح نہ ہو۔ ۵۔ پہلے شوہر نے تین طلاقیں نہ دی ہوں، ورنہ بغیر حلالہ کے نکاح درست نہیں۔

یہ نصیحت ان لوگوں کے لیے ہے جو اللہ اور قیامت پر ایمان رکھتے ہیں۔ نصیحت کو قبول کرنا زیادہ پاکیزگی اور فلاح کا باعث ہے۔ اللہ تعالیٰ مصلحتوں کو بہتر جانتا ہے، اور انسان محدود علم رکھتا ہے، اس لیے اللہ کے احکام کے سامنے اپنی رائے نافذ کرنے سے گریز کرنا واجب ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس آیت کے ذریعے تین اہم نصیحتیں ارشاد فرمائی ہیں:

(۱) ایمان کے مطابق عمل

اللہ اور قیامت پر ایمان رکھنے والوں کے لیے یہ احکام ہیں۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ اللہ پر اور قیامت کے دن پر ایمان رکھنے کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ انسان اللہ کے حکموں، جیسے نکاح اور طلاق، کا پابند ہو۔ جو لوگ ان احکام کی خلاف ورزی کرتے ہیں یا کوتاہی برتتے ہیں، وہ سمجھ لیں کہ ان کے ایمان میں کمی اور کمزوری موجود ہے۔

(۲) صفائی اور اصلاح کا ذریعہ

احکامِ الٰہیہ کی پابندی تمہارے لیے پاکی اور صفائی کا ذریعہ ہے۔ اگر ان پر عمل نہ کیا جائے تو دل گناہوں میں ڈوب جاتا ہے اور فتنہ و فساد جنم لیتا ہے۔ اس لیے جب مرد اور عورت آپس میں مائل ہوں تو ان کا نکاح شرعی اصولوں کے مطابق ہونے دینا بہتر ہے، ورنہ اندرونی تعلقات پیدا ہو کر بدنامی، عزت کی بربادی اور دنیا و آخرت دونوں کے

نقصان کا اندیشہ ہے۔ اگر نکاح سے روکا جائے تو یہ ظلم اور حق تلفی کے زمرے میں آئے گا، اور اگر عورت یا مرد گناہ کا راستہ اختیار کریں تو اس کا بوجھ ان لوگوں پر بھی آئے گا جنہوں نے ان کو نکاح سے روکا۔

(۳) اللہ کی مصلحت اور حکمت

تمہاری اپنی مصلحتوں کا علم تمہیں محدود ہے، اللہ تعالیٰ تمہاری بھلائی اور فائدے سے بخوبی واقف ہے۔ اس لیے اس نے احکام دیے تاکہ تمہاری زندگی درست اور محفوظ رہے۔ اگر تم اللہ کے بتائے ہوئے قانون کی پابندی کرو گے تو تمہارا بھلا اور فائدہ ہوگا، اور اگر ان کے خلاف عمل کرو گے تو اس میں تکلیف، گمراہی اور ہلاکت شامل ہوگی۔

مفسرین لکھتے ہیں کہ قرآن کریم نے یہاں یہ قانون واضح کیا کہ طلاق شدہ عورتوں کو اپنی مرضی سے نکاح سے روکنا جرم ہے۔ اس قانون کی تعمیل کے لیے تین نکات بیان کیے گئے:

۱۔ لفظی طور پر قیامت اور جرائم کی سزا کے خوف سے انسان کو قانون پر عمل کرنے کی ترغیب دی گئی۔

۲۔ لفظی بیان میں قانون کی خلاف ورزی سے پیدا ہونے والے مفاسد اور انسانیت کے نقصانات بتا کر پابندی کے لیے تیار کیا۔

۳۔ یہ ارشاد کہ تمہاری اپنی مصلحت بھی اسی میں ہے کہ اللہ تعالیٰ کے احکام کی پابندی کرو، کیونکہ اس کے خلاف سوچنا تمہاری لاعلمی اور محدود فہم کا نتیجہ ہے۔

یہ قرآن کا خاص انداز ہے کہ ہر قانون کے ساتھ اللہ کا خوف اور آخرت کا حساب یاد دلایا جاتا ہے، جیسے: ''وَاتَّقُوا اللّٰهَ'' یا ''اَنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ''، تاکہ انسان قانون کی تعمیل میں غفلت نہ کرے۔

قرآن کریم پوری انسانیت کے لیے ایک مکمل دستور حیات ہے، جو دنیا اور قیامت تک آنے والی ہر نسل کے لیے زندگی کے تمام شعبوں میں بہترین رہنمائی فراہم کرتا ہے۔ اس میں سزاؤں کا ذکر بھی موجود ہے، لیکن یہ دنیا کی کسی قانون سازی سے مختلف ہے، کیونکہ قرآن کا انداز حکم دینے سے زیادہ نصیحت کرنے والا اور ہدایت دینے والا ہے۔ ہر قانون کے بیان کے ساتھ یہ کوشش کی گئی ہے کہ کوئی انسان قانون کی خلاف ورزی کر کے سزا کا مستحق نہ بنے۔

دنیا کی حکومتیں بس ایک قانون بنا کر پیش کر دیتی ہیں اور جو خلاف کرے وہ سزا پاتا ہے، لیکن قرآن میں انسان صرف دنیاوی سزا کے خوف سے پابند نہیں ہوتا، بلکہ اللہ تعالیٰ کی ناراضگی اور آخرت کی سزا کا خوف اس کی زندگی کا حصہ بن جاتا ہے۔ اس فکر کی بنیاد پر انسان کا ظاہر و باطن، خفیہ و علانیہ سب کچھ اللہ کے سامنے محتاط رہتا ہے، کیونکہ اس کا ایمان ہے کہ اللہ ہر جگہ حاضر و ناظر ہے اور ذرہ ذرہ سے بھی باخبر ہے۔

یہی وجہ ہے کہ قرآن کی تعلیمات پر عمل کرنے والا مسلمان اس پابندی کو اپنی زندگی کا مقصد سمجھتا ہے۔ قرآنی نظام میں ایک طرف قانون کی حدود واضح ہیں اور دوسری طرف سزا و انعام کے ذریعے انسان کے اخلاق و کردار کو بلند کیا گیا ہے، جس سے قانونی حدود اس کے لیے فطری اور ضروری بن جاتی ہیں اور وہ اپنی نفسانی خواہشات کو پس پشت ڈال دیتا ہے۔

دنیا کی تاریخ اور حکومتوں کے تجربات یہ ظاہر کرتے ہیں کہ صرف قانون کے نفاذ سے کسی قوم یا فرد کی اصلاح نہیں ہوئی۔ پولیس اور فوج سے جرائم روکے نہیں جا سکتے جب تک کہ قانون کے ساتھ اللہ کا خوف اور آخرت کا حساب انسان کے دل میں نہ بٹھا ہو۔ حقیقت میں جرائم سے بچانے والی سب سے بڑی قوت خوفِ خدا اور آخرت کا حساب ہے، ورنہ کوئی شخص دوسروں کو جرم سے باز نہیں رکھ سکتا۔

آیت نمبر (۲۳۳) وَالْوَالِدٰتُ يُرْضِعْنَ اَوْلَادَهُنَّ حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ لِمَنْ اَرَادَ اَنْ يُّتِمَّ الرَّضَاعَةَ ؕ وَعَلَى الْمَوْلُوْدِ لَهٗ رِزْقُهُنَّ وَ كِسْوَتُهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ؕ لَا تُكَلَّفُ نَفْسٌ اِلَّا وُسْعَهَا ۚ لَا تُضَآرَّ وَالِدَةٌۢ بِوَلَدِهَا وَلَا مَوْلُوْدٌ لَّهٗ بِوَلَدِهٖ ۚ وَعَلَى الْوَارِثِ مِثْلُ ذٰلِكَ ۚ فَاِنْ اَرَادَا فِصَالًا عَنْ تَرَاضٍ مِّنْهُمَا وَتَشَاوُرٍ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا ؕ وَاِنْ اَرَدْتُّمْ اَنْ تَسْتَرْضِعُوْٓا اَوْلَادَكُمْ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ اِذَا سَلَّمْتُمْ مَّآ اٰتَيْتُمْ بِالْمَعْرُوْفِ ؕ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴿۲۳۳﴾

ترجمہ: ''مائیں اپنی اولاد کو دو سال پورے دودھ پلائیں، یہ اس کے لیے ہے جو مکمل رضاعت کرانا چاہے، اور باپ پر ہے ان کا کھانا اور کپڑا دستور کے مطابق، کسی کو اس کی طاقت سے زیادہ تکلیف نہیں دی جاتی، نہ ماں کو نقصان پہنچایا جائے اس کے بچے کی وجہ سے، اور نہ باپ کو، اور وارثوں پر بھی اسی طرح کا حق ہے، پھر اگر وہ دونوں باہمی مشورے اور رضامندی سے دودھ چھڑانا چاہیں تو اس میں کوئی گناہ نہیں، اور اگر تم چاہو کہ کسی اور عورت سے دودھ پلاؤ تو بھی کوئی گناہ نہیں، بشرطیکہ انہیں ان کا حق دستور کے مطابق دے دو، اور اللہ سے ڈرتے رہو، اور جان لو کہ اللہ تمہارے اعمال کو خوب دیکھنے والا ہے''۔

تفسیر

دودھ پلانے کا حق اور والدین کی ذمہ داریاں

طلاق کے بعد اکثر مرد اور عورت کے درمیان نفرت یا دشمنی پیدا ہو جاتی ہے۔ ایسی حالت میں اگر عورت کی گود میں چھوٹا بچہ بھی ہو، تو بچے کی پرورش اور دودھ پلانے کے مسائل بھی سامنے آ جاتے ہیں اور یہ جھگڑے یا اختلافات کا سبب بن سکتے ہیں۔ بعض اوقات مرد چاہتا ہے کہ بچہ کو ماں سے دور کر کے کسی اور عورت سے دودھ پلایا جائے، جس سے

ماں دُکھ اٹھاتی ہے۔ کبھی عورت اس لیے دودھ پلانے سے انکار کرتی ہے کہ مرد کے پاس کوئی دوسری دودھ پلانے والی عورت موجود نہیں، یا وہ کسی نئے نکاح کی وجہ سے بچے سے بے رخی اختیار کرتی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اس مسئلے میں ایسا معتدل اور آسان قانون مقرر فرمایا ہے جو مرد و عورت دونوں کے لیے مناسب ہو اور کسی پر ظلم یا زیادتی کا راستہ نہ رہے۔

دودھ پلانے کی مدت

ماؤں پر لازم ہے کہ وہ اپنے بچے کو دو سال تک دودھ پلائیں، چاہے وہ نکاح میں ہوں یا طلاق کے بعد ہوں۔ اگر ماں یا والد چاہیں تو دو سال سے کم مدت میں بھی دودھ چھڑایا جا سکتا ہے، اس میں کوئی گناہ نہیں۔ بچے کی پرورش اور اس کا کھانا، کپڑا والد کے ذمہ ہیں، چاہے ماں عدت میں ہوں یا نکاح میں۔

یہ حکم اللہ تعالیٰ کی طرف سے سب کے برداشت اور آسانی کے مطابق ہے۔ نہ ماں کو بچے کی وجہ سے تکلیف دینی چاہیے، نہ والد کو۔ ماں اور والد کو چاہیے کہ اپنے اختلافات اور ضد کو بچے کی پرورش میں رکاوٹ نہ بنائیں۔ اگر والد زندہ نہ ہوں تو بچے کی پرورش اس کے محرم رشتہ داروں پر واجب ہے جو شرعاً بچہ کے وارث ہوں۔

اگر والد اور ماں باہمی رضامندی سے دو سال سے کم میں دودھ چھڑانے کا فیصلہ کریں، تو یہ جائز ہے۔ اگر کسی وجہ سے، جیسے ماں کا دودھ مناسب نہ ہو یا بچے کو نقصان ہو سکتا ہو، والد چاہیں کہ بچہ کسی اور عورت سے دودھ پلے، تب بھی کوئی گناہ نہیں۔

معاوضہ اور حقوق

جو کچھ ماں کو دودھ پلانے کے لیے دیا جانا طے کیا گیا ہے، چاہے وہ پہلے یا بعد میں ہو، اسے ادا کرنا لازم ہے۔ اگر اجرت یا معاوضہ نہ دیا جائے، تو یہ گناہ ہوگا۔

ارشادِ الٰہی: آخر میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں: ''اور اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو اور یقین رکھو کہ اللہ تعالیٰ تمہارے کیے ہوئے اعمال کو خوب دیکھ رہے ہیں''۔

یہ واضح کرتا ہے کہ والدین اور سرپرستوں پر نہ صرف قانونی بلکہ اخلاقی اور دینی ذمہ داری بھی عائد ہوتی ہے، تاکہ بچے کے حقوق ضائع نہ ہوں اور سب عمل اللہ کی رضا کے مطابق ہو۔

دودھ پلانے سے متعلق شرعی احکام

۱۔ اگر ماں کسی وجہ سے معذور نہ ہو تو اس پر لازم ہے کہ وہ بچہ کو دودھ پلائے، چاہے وہ نکاح میں ہو یا عدت

میں۔ایسی ماں کواس کام کے لیے کوئی اجرت لینا جائز نہیں۔

۲۔طلاق کے بعد اگر عدت مکمل ہو چکی ہو،تو مطلقہ عورت پر بغیر اجرت بچہ کو دودھ پلانے کا کوئی واجب فرض نہیں ہے۔

۳۔اگر ماں دودھ پلانے سے انکار کرے،تو اسے معذور سمجھا جائے گا اور اس پر جبر نہیں کیا جائے گا۔البتہ اگر بچہ کسی اور سے دودھ نہ پیے اور صرف ماں کا دودھ پی سکتا ہو،تو ایسی صورت میں ماں کو مجبور کیا جائے گا کہ بچے کو دودھ پلائے۔

۴۔اگر ماں دودھ پلانے پر رضامند ہو اور اس کے دودھ میں کوئی خرابی نہ ہو،تو والد کو جائز نہیں کہ وہ اسے دودھ پلانے سے روکے اور کسی دوسری عورت سے پلائے۔

۵۔اگر ماں دودھ پلانے پر رضامند ہو مگر اس کا دودھ بچے کے لیے نقصان دہ ہو،تو والد کو جائز ہے کہ وہ بچے کو دودھ پلانے کے لیے کسی دوسری عورت کا انتظام کرے۔

۶۔اگر ماں دودھ پلانے کی اجرت طلب کرے جبکہ وہ شوہر کے نکاح میں ہو یا طلاق کے بعد عدت مکمل نہ ہوئی ہو،تو اس صورت میں اجرت لینا جائز نہیں۔

۷۔اگر طلاق کے بعد عدت مکمل ہو جائے اور ماں اجرت مانگے،تو والد کو اسے ادائیگی کرنا پڑے گی۔

۸۔اگر طلاق کے بعد عدت مکمل ہو اور ماں اجرت مانگے،تو والد کے لیے جائز نہیں کہ وہ دوسری عورت سے اتنی ہی اجرت پر دودھ پلوالے تاکہ ماں کو نظر انداز کرے۔اگر دوسری عورت کم اجرت پر راضی ہو،تب بھی ماں کا حق ہے کہ وہ دودھ پلائے اور اضافی اجرت نہ لے۔البتہ ماں درخواست کرے تو اسے یہ اختیار حاصل ہوگا کہ دوسری دودھ پلانے والی کو اس کے پاس رکھا جائے تاکہ بچہ ماں سے جدا نہ ہو۔

بچے کے خرچ سے متعلق شرعی احکام

۹۔والد کی موجودگی میں بچے کی پرورش اور اس کے خرچ کی ذمہ داری مکمل طور پر والد پر عائد ہوتی ہے۔اگر والد وفات پا جائے،تو اس کی تفصیل یہ ہے کہ اگر بچہ خود مال کا مالک ہو تو اس کے خرچ کے لیے وہ مال استعمال ہوگا۔لیکن اگر بچہ مالدار نہ ہو تو اس کے مالدار محرم رشتہ دار جو شرعاً اس کے وارث ہیں،ان پر خرچ کرنا واجب ہوگا۔محرم ہونے کا مطلب یہ ہے کہ ان رشتہ داروں سے نکاح جائز نہیں،اور مرنے کے بعد بھی وہ اس کے مال میں حصہ رکھتے ہیں۔مثال کے طور پر،اگر بچے کی ایک ماں اور ایک دادا ہیں،تو خرچ کی تقسیم کے مطابق ایک تہائی ماں کے ذمہ اور دو تہائی دادا کے ذمہ ہوگا،کیونکہ دونوں محرم اور وارث ہیں۔

۱۰۔ رضاعت یعنی دودھ پلانے کی مدت عام طور پر دو سال ہے، اور بچے کا حق ہے کہ اس مدت تک دودھ پلایا جائے، جب تک کوئی خاص رکاوٹ نہ ہو۔ تاہم، امام ابوحنیفہ کے نزدیک اگر یہ مدت تیس مہینے یعنی ڈھائی سال ہو جائے، تب بھی دودھ پلانے کے احکام نافذ ہوں گے، اور بچہ کی کمزوری یا ضرورت کی وجہ سے دودھ پلانے میں اضافہ ہو تو گناہ نہیں ہوگا۔ اس کا حوالہ سورہ احقاف: ۱۵ ہے۔

علامہ عبدالحق دہلوی اپنی 'تفسیر حقانی' میں بیان کرتے ہیں کہ امام شافعی، علقمہ، شعبی اور ظہری کے نزدیک رضاعت کی مدت دو سال ہے، اور یہی رائے حضرت علی، ابن مسعود اور ابن عباس کی بھی ہے لیکن امام ابوحنیفہ کے نزدیک یہ مدت ڈھائی سال ہے، جس کی دلیل سورہ احقاف کی آیت وَحَمْلُهٗ وَفِصٰلُهٗ ثَلٰثُوْنَ شَهْرًا ہے، اس طرح حمل اور دودھ پلانے کی مدت کل ۳۰ ماہ ہوتی ہے۔

امام ابوحنیفہ کا قول ہے کہ اگر بچے نے ڈھائی سال کے اندر بھی دودھ پیا ہو تو نکاح درست نہیں، لیکن اگر ڈھائی سال کے بعد دودھ پلایا جائے تو اس کا اثر نہیں ہوگا اور نکاح درست ہوگا۔

باقی ائمہ کے نزدیک اس آیت میں حمل اور فصال (دودھ چھڑائی) دونوں کا مجموعی دور بیان کیا گیا ہے، جس سے حمل کی کم از کم مدت چھ ماہ اور رضاعت کی مدت دو سال قرار دی گئی ہے۔ اور سورہ بقرہ کی اس آیت میں دو برس کامل ہیں تو یہ صرف اجرت رضاعت کے لئے ہے۔ احادیث اور آثارِ صحابہ سے بھی یہی رائے معلوم ہوتی ہے کہ اصل رضاعت کی مدت دو سال ہے، اسی طرح نکاح کے لیے جو رشتے نسب کے اعتبار سے حرام ہیں وہ رضاعت کی وجہ سے بھی حرام ہو جاتے ہیں۔

۱۱۔ اگر ماں باپ کی باہمی رضا سے یہ فیصلہ کریں کہ رضاعت کی دو سالہ مدت سے پہلے ہی بچے کو دودھ چھڑا دیا جائے، چاہے وجہ مال کی کمی یا بچے کی بیماری ہو، تو اس میں کوئی گناہ نہیں۔

۱۲۔ جس عورت کو دودھ پلانے کے لیے رکھا جائے، اس سے اجرت یا تنخواہ کا معاملہ پہلے سے مکمل وضاحت اور شفافیت کے ساتھ طے کر لیا جائے تاکہ بعد میں کسی قسم کا جھگڑا یا اختلاف پیدا نہ ہو۔ مقررہ وقت پر طے شدہ اجرت اس کو بخوبی ادا کی جائے، کسی قسم کی تاخیر یا کمی نہ کی جائے۔

اللہ کے علم کا تصور

رضاعت کے احکام بیان کرنے کے بعد قرآن کریم نے اپنے مخصوص اندازِ بیان سے قانون کی پابندی آسان بنانے اور ہر حال میں اس پر عمل کو یقینی بنانے کے لیے اللہ تعالیٰ کے خوف اور علم کا تصور سامنے رکھا۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ''وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ''۔

یعنی یہ سمجھ لو کہ اللہ تعالیٰ تمہارے کھلے اور چھپے اعمال، ظاہر و باطن، اور دلوں کے راز سے مکمل باخبر ہیں۔

تمہاری نیت اور ارادے، چاہے وہ کسی سے مخفی ہوں، اللہ کے علم سے پوشیدہ نہیں رہتے۔
اگر کوئی شخص ان احکام کی خلاف ورزی کرے تو وہ سزا کا مستحق ہوگا اور اللہ تعالیٰ کی نظر سے کوئی چیز مخفی نہیں رہ سکتی۔ (تفصیل کے لیے دیکھیں سورۃ النساء:۱، ۲ اور سورۃ البقرہ: ۲۳۴)

آیت نمبر (۲۳۴) وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا يَّتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَّعَشْرًا ۚ فَاِذَا بَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْمَا فَعَلْنَ فِيْٓ اَنْفُسِهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ۭ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ۲۳۴

ترجمہ: ''اور تم میں سے جو لوگ وفات پا جائیں اور بیویاں چھوڑ جائیں، وہ بیویاں چار مہینے دس دن تک عدت گزاریں، پھر جب وہ اپنی عدت پوری کر لیں، تو جو کچھ وہ اپنے بارے میں دستور کے مطابق کریں اس میں تم پر کوئی گناہ نہیں، اور اللہ تمہارے تمام اعمال سے باخبر ہے''۔

تفسیر

عدتِ وفات کی وضاحت

اس آیت میں بیوہ عورت کی عدت بیان کی گئی ہے اور یہ بتلایا گیا ہے کہ عورت کی عدت تین اقسام کی ہوتی ہے:
۱۔ عدتِ طلاق: اس کا حکم اور مدت پچھلی آیت نمبر ۲۲۸ میں واضح ہو چکا ہے۔
۲۔ عدتِ حاملہ عورت: اگر عورت حاملہ ہو اور اس کا شوہر فوت ہو جائے تو اس کی عدت وضع حمل یعنی بچے کی ولادت تک جاری رہتی ہے۔ اس کی تفصیل سورہ طلاق، آیت نمبر ۲۸ میں ہے۔
۳۔ عدتِ وفات: اگر عورت حاملہ نہ ہو اور اس کا شوہر فوت ہو جائے تو اس کی عدت چار ماہ اور دس دن مقرر ہے۔ اور اگر حاملہ ہو تو بچے کی پیدائش تک عدت جاری رہے گی، چاہے یہ چار ماہ دس دن سے پہلے ہو یا بعد میں، بچے کی پیدائش تک۔
عربوں کے زمانہ جاہلیت میں عدت کی مدت عام طور پر ایک سال مقرر کی جاتی تھی، اور شروع میں بھی یہی حکم تھا تاکہ وارثوں کے حقوق طے ہو سکیں۔ لیکن قرآن مجید کے نزول کے بعد عدت کا وقت واضح کر دیا گیا، جس سے عورت کی عزت و وقار اور وارثوں کے حقوق کی حفاظت ممکن ہوئی۔

بیوہ عورت کی عدت اور نکاح

وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا ۚ وَّصِيَّةً لِّاَزْوَاجِهِمْ مَّتَاعًا اِلَى الْحَوْلِ غَيْرَ اِخْرَاجٍ

''اور جو لوگ تم میں سے وفات پا جائیں اور اپنی بیویوں کو چھوڑ جائیں، وہ اپنی بیویوں کے لیے وصیت کریں

کہ ایک سال تک ان سے فائدہ اٹھایا جائے، یعنی انہیں گھر سے نہ نکالا جائے''۔

یہ ایک سالہ عدت کا حکم اب منسوخ ہو گیا ہے۔ اب بیوہ عورت جو حاملہ نہ ہو، اس کی عدت چار ماہ اور دس دن مقرر کی گئی ہے۔ اس دوران بیوہ عورت کو چاہیے کہ وہ نئے نکاح سے پرہیز کرے، یعنی زیورات، خوشبو اور بناؤ سنگار سے الگ رہے اور بغیر ضرورت گھر سے باہر نہ نکلے۔

اگر عدت کے دوران یہ معلوم ہو جائے کہ عورت حاملہ ہے، تو اس کی عدت بچے کی پیدائش تک جاری رہے گی۔ عدت مکمل ہونے کے بعد اب عورت اپنے ذاتی نکاح کے حق سے آزاد ہے۔ وہ شرعی طریقہ کے مطابق زیورات پہن سکتی ہے، خوشبو استعمال کر سکتی ہے اور نکاح کر سکتی ہے۔ کسی بھی وارث یا قریبی رشتہ دار کو یہ حق نہیں کہ وہ بیوہ کو اس جائز حق سے محروم کرے۔

آیت کے آخر میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں: ''وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ'' یعنی اللہ تعالیٰ ہر عمل، ظاہر و باطن، ہر نیت و فکر سے باخبر ہے۔ اس لیے اس کے احکام کی مخالفت نہ کرو، ورنہ سزا کا خطرہ ہوگا۔

قرآن مجید کے اس حکم کے باوجود بعض جگہ بیوہ عورتوں پر برادری کی رسم و رواج یا خاندان کی ذلت کے خوف کی بنیاد پر ظلم کیا جاتا ہے۔ کچھ بیوائیں جوانی میں شوہر سے محروم ہو جاتی ہیں مگر ان کے وارث انہیں دوبارہ نکاح کرنے کی اجازت نہیں دیتے۔ یہ سراسر جہالت، ظلم اور اللہ کے حکم کی نافرمانی ہے۔

عدت سے متعلق چند شرعی مسائل

۱۔ جو عورت بیوہ ہو جائے، اس کو عدت کے دوران خوشبو لگانا، سنگار کرنا، زیورات یا ریشمی کپڑے پہننا، سرمہ یا تیل لگانا، غیر ضروری دوا یا مہندی استعمال کرنا جائز نہیں۔ البتہ عدت مکمل ہونے کے بعد یہ تمام امور استعمال کر سکتی ہے۔

۲۔ اگر شوہر کی وفات چاند رات کو ہوئی، تو مہینے چاہے ۲۹ دن کے ہوں یا ۳۰ دن کے، وہ پورے کیے جائیں گے۔ اور اگر چاند رات کے بعد وفات ہوئی تو تمام مہینے ۳۰ دن کے حساب سے شمار ہوں گے۔ کل مدت چار ماہ اور دس دن یعنی تقریباً ۱۳۰ دن مکمل ہوں گے، اور جس وقت وفات ہوئی ہو، اسی وقت عدت ختم ہو جائے گی۔

۳۔ شوہر کے انتقال کے وقت عورت کو اسی گھر میں عدت گزارنی چاہئے جہاں وہ رہ رہی تھی۔ باہر نکلنا درست نہیں۔ البتہ اگر عورت غریب ہو اور روزی کمانے کے لیے کام پر جاتی ہے، تو یہ جائز ہے، لیکن رات کو اپنے ہی گھر میں واپس رہنا ضروری ہے۔

۴۔ بیوہ عورت کو پورے گھر میں جہاں چاہے رہنے کی اجازت ہے۔ بعض جگہ غلط طور پر ایک خاص جگہ مقرر

کر دی جاتی ہے کہ وہی رہ سکتی ہے، یہ شرعی طور پر ناجائز پابندی ہے۔

۵۔ اگر عورت کو شوہر کی وفات کا علم بعد میں ہوا، تو عدت کا شمار اس وقت سے نہیں بلکہ خبر ملنے سے پہلے ہی پوری ہو چکی عدت کے حساب سے کیا جائے گا۔ اسی طرح، اگر طلاق کے بعد عورت کو خبر دیر سے ملی تو عدت بھی اس وقت تک مکمل ہو چکی فرض ہوگی۔

۶۔ اگر عورت حاملہ تھی اور شوہر کے مرنے کے چند گھڑی بعد بچہ پیدا ہو گیا، تب بھی عدت ختم ہو جاتی ہے۔

۷۔ بعض گھروں میں پرانا دستور تھا کہ بیوہ عورت شوہر کی وفات کے بعد سال بھر تک عدت میں بیٹھی رہے، یہ سراسر ناجائز اور حرام ہے۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''جو مسلمان عورت اللہ اور قیامت کے دن پر ایمان رکھتی ہو، اُس کے لیے تین دن سے زیادہ سوگ کرنا جائز نہیں، مگر شوہر کے لیے چار ماہ اور دس دن۔'' **(بخاری: ۱۲۸۰)**

۸۔ بیوہ عورت کی عدت کے دوران شوہر کے گھر یا گھرانے کو اس کے لیے روزی، روٹی اور کپڑوں کا انتظام کرنا لازم ہے۔

۹۔ اگر عورت کسی کام یا پڑوسن کے گھر گئی ہو اور اس دوران شوہر فوت ہو جائے، تو فوراً اپنے اصلی گھر واپس آنا اور وہیں عدت گزارنا ضروری ہے۔

۱۰۔ اگر مرد اپنی بیماری میں عورت کو طلاق بائن (تین طلاقیں) دے دے اور طلاق کی عدت پوری نہ ہو پائی، اور پھر مرد فوت ہو جائے، تو عدت کا شمار جو بھی زیادہ مدت لے، وہ عورت پوری کرے گی، طلاق کی عدت یا موت کی عدت، جس میں دن زیادہ ہوں۔

❁❁❁

ترجمہ- آیت نمبر ۲۳۵ سے ۲۴۲ تک

وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْمَا عَرَّضْتُمْ بِهٖ مِنْ خِطْبَةِ النِّسَآءِ اَوْ اَكْنَنْتُمْ فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ ؕ عَلِمَ اللّٰهُ اَنَّكُمْ سَتَذْكُرُوْنَهُنَّ وَلٰكِنْ لَّا تُوَاعِدُوْهُنَّ سِرًّا اِلَّآ اَنْ تَقُوْلُوْا قَوْلًا مَّعْرُوْفًا ۬ وَلَا تَعْزِمُوْا عُقْدَةَ النِّكَاحِ حَتّٰى يَبْلُغَ الْكِتٰبُ اَجَلَهٗ ؕ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ فَاحْذَرُوْهُ ۚ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ ﴿۲۳۵﴾ لَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ اِنْ طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ مَا لَمْ تَمَسُّوْهُنَّ اَوْ تَفْرِضُوْا لَهُنَّ فَرِيْضَةً ۖ وَّمَتِّعُوْهُنَّ ۚ عَلَى الْمُوْسِعِ قَدَرُهٗ وَعَلَى الْمُقْتِرِ قَدَرُهٗ ۚ مَتَاعًۢا بِالْمَعْرُوْفِ ۚ حَقًّا عَلَى الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۲۳۶﴾ وَاِنْ طَلَّقْتُمُوْهُنَّ مِنْ قَبْلِ اَنْ تَمَسُّوْهُنَّ وَقَدْ فَرَضْتُمْ لَهُنَّ فَرِيْضَةً فَنِصْفُ مَا فَرَضْتُمْ اِلَّآ اَنْ يَّعْفُوْنَ اَوْ يَعْفُوَا الَّذِيْ بِيَدِهٖ عُقْدَةُ النِّكَاحِ ؕ وَاَنْ تَعْفُوْٓا اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى ؕ وَلَا تَنْسَوُا الْفَضْلَ بَيْنَكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴿۲۳۷﴾ حٰفِظُوْا عَلَى الصَّلَوٰتِ وَالصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى ۚ وَقُوْمُوْا لِلّٰهِ قٰنِتِيْنَ ﴿۲۳۸﴾ فَاِنْ خِفْتُمْ فَرِجَالًا اَوْ رُكْبَانًا ۚ فَاِذَآ اَمِنْتُمْ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَمَا عَلَّمَكُمْ مَّا لَمْ تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ ﴿۲۳۹﴾ وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا ۖ وَّصِيَّةً لِّاَزْوَاجِهِمْ مَّتَاعًا اِلَى الْحَوْلِ غَيْرَ اِخْرَاجٍ ۚ فَاِنْ خَرَجْنَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْ مَا فَعَلْنَ فِيْٓ اَنْفُسِهِنَّ مِنْ مَّعْرُوْفٍ ؕ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿۲۴۰﴾ وَلِلْمُطَلَّقٰتِ مَتَاعٌۢ بِالْمَعْرُوْفِ ؕ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِيْنَ ﴿۲۴۱﴾ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ﴿۲۴۲﴾

ترجمہ:

(۲۳۵)۔تم پر کوئی گناہ نہیں کہ نکاح کا پیغام کنایہ (اشارے) میں دو یا اپنے دل میں چھپائے رکھو، اللہ جانتا ہے کہ تم ان کے بارے میں ضرور سوچو گے، لیکن خفیہ وعدہ نہ کرو، سوائے اس کے کہ معروف طریقے سے کوئی بات کرو، اور عقد نکاح کا پختہ ارادہ نہ کرو جب تک کہ عدت پوری نہ ہو جائے، اور جان لو کہ اللہ جانتا ہے جو کچھ تمہارے دلوں میں ہے، پس اس سے ڈرو، اور جان لو کہ اللہ بہت بخشنے والا، بردبار ہے۔(۲۳۶)۔اگر تم عورتوں کو طلاق دو قبل اس کے کہ انہیں ہاتھ لگاؤ یا ان کے لیے مہر مقرر کرو، تو تم پر کوئی گناہ نہیں، البتہ انہیں کچھ فائدہ دو، خوشحال اپنی حیثیت کے مطابق اور تنگدست اپنی حیثیت کے مطابق، یہ معروف طریقے سے دینا نیک لوگوں پر لازم ہے۔(۲۳۷)۔اور اگر تم عورتوں کو اس سے پہلے طلاق دو کہ انہیں چھوؤ، جبکہ تم ان کے لیے مہر مقرر کر چکے ہو، تو آدھا مہر دینا ہوگا، مگر یہ کہ وہ عورت معاف کر

دے یا وہ شخص معاف کر دے جس کے ہاتھ میں نکاح کا بندھن ہے، اور اگر تم معاف کر دو تو یہ تقویٰ کے زیادہ قریب ہے، اور ایک دوسرے پر احسان کرنا نہ بھولو، یقیناً اللہ تمہارے اعمال کو دیکھ رہا ہے۔(۲۳۸)۔ سب نمازوں کی حفاظت کرو، خصوصاً درمیانی نماز کی، اور اللہ کے سامنے عاجزی سے کھڑے ہو جاؤ۔(۲۳۹)۔ اگر خوف کی حالت ہو تو پیدل یا سواری پر نماز پڑھ لو، پھر جب امن حاصل ہو جائے تو اللہ کو یاد کرو، جیسے اس نے تمہیں سکھایا، جو تم پہلے نہیں جانتے تھے۔(۲۴۰)۔ اور جو لوگ تم میں سے فوت ہو جائیں اور بیویاں چھوڑ جائیں، وہ اپنی بیویوں کے لیے ایک سال تک نان ونفقہ کی وصیت کریں، بغیر نکالے جانے کے، پھر اگر وہ خود نکل جائیں تو جو کچھ وہ دستور کے مطابق کریں اس میں تم پر کوئی گناہ نہیں، اور اللہ غالب، حکمت والا ہے۔(۲۴۱)۔ اور طلاق یافتہ عورتوں کو بھی کچھ نہ کچھ (مال) دینا چاہیے دستور کے مطابق، یہ حق ہے ان پر جو اللہ سے ڈرتے ہیں۔(۲۴۲)۔ اسی طرح اللہ اپنی آیتیں (احکام) تمہارے لیے بیان کرتا ہے تا کہ تم عقل سے کام لو۔

تفسیر-آیت نمبر ۲۳۵ سے ۲۴۲ تک

آیت نمبر(۲۳۵) وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيمَا عَرَّضْتُمْ بِهٖ مِنْ خِطْبَةِ النِّسَآءِ اَوْ اَكْنَنْتُمْ فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ ؕ عَلِمَ اللّٰهُ اَنَّكُمْ سَتَذْكُرُوْنَهُنَّ وَلٰكِنْ لَّا تُوَاعِدُوْهُنَّ سِرًّا اِلَّآ اَنْ تَقُوْلُوْا قَوْلًا مَّعْرُوْفًا ۬ؕ وَلَا تَعْزِمُوْا عُقْدَةَ النِّكَاحِ حَتّٰى يَبْلُغَ الْكِتٰبُ اَجَلَهٗ ؕ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ فَاحْذَرُوْهُ ۚ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ ﴿۲۳۵﴾

ترجمہ: ''تم پر کوئی گناہ نہیں کہ نکاح کا پیغام کنایہ (اشارے) میں دو یا اپنے دل میں چھپائے رکھو، اللہ جانتا ہے کہ تم ان کے بارے میں ضرور سوچو گے، لیکن خفیہ وعدہ نہ کرو، سوائے اس کے کہ معروف طریقے سے کوئی بات کرو، اور عقد نکاح کا پختہ ارادہ نہ کرو جب تک کہ عدت پوری نہ ہو جائے، اور جان لو کہ اللہ جانتا ہے جو کچھ تمہارے دلوں میں ہے، پس اس سے ڈرو، اور جان لو کہ اللہ بہت بخشنے والا، بردبار ہے''۔

تفسیر

نکاح کے پیغام کے بارے میں شرعی احکام

اس آیت میں عدت کے دوران بیوہ عورتوں سے نکاح یا نکاح کے وعدے سے متعلق احکام واضح کیے گئے ہیں۔ حکم یہ ہے کہ عدت کے دوران عورت سے صریح نکاح کا پیغام دینا جائز نہیں، البتہ نکاح کا اشارتی انداز اختیار کرنا

جائز ہے۔اس کی وجہ یہ ہے کہ اگر مرد بیوہ عورت کے شوہر کے فوت ہونے کے فوراً بعد نکاح کا پیغام دے تو یہ ایک طرح کی بے مروتی سمجھی جائے گی، گویا وہ عورت کی موت کا انتظار کر رہا تھا۔

اسی طرح، عدت کے دوران عورت سے نکاح کی بات چیت کرنا یہ ظاہر کرتا ہے کہ وہ اپنے پچھلے شوہر کی عزت کا لحاظ نہیں رکھتی اور اس کے مرنے کا انتظار کر رہی تھی۔ انسانی فطرت اور قدرتی جبلت کے تقاضے بھی اس بات کی رعایت کا تقاضا کرتے ہیں، اسی لیے قرآن نے اس موضوع پر جامع احکام بیان فرمائے۔

آیت میں ارشاد ہوتا ہے: ''تم پر کوئی گناہ نہیں ہوگا اگر تم عدت میں بیوہ عورتوں کے لیے نکاح کا پیغام اشارتاً یا پوشیدہ انداز میں دیں، بشرطیکہ صریح وعدہ یا گفتگو نہ ہو۔ اللہ تعالیٰ جانتے ہیں تمہارے دلوں میں کیا ہے، پس اللہ سے ڈرتے رہو اور ناجائز ارادے دل میں مت رکھو۔ اللہ تعالیٰ معاف کرنے والا اور حلیم ہے۔''

عدت کے دوران نکاح کے چار احکام

۱۔ زبان سے صریح پیغام دینا: عدت کے دوران بیوہ عورت کو کھلے الفاظ میں نکاح کا پیغام دینا ناجائز اور حرام ہے۔

۲۔ زبان سے اشارتاً پیغام دینا: عدت کے دوران اشارتی یا کنایہ انداز میں پیغام دینا جائز اور اجازت یافتہ ہے۔

۳۔ دل سے عدت کے دوران نکاح کا ارادہ کرنا: عدت کے دوران یہ ارادہ کرنا کہ ابھی نکاح کر لیں گے، یہ حرام ہے۔

۴۔ دل سے عدت کے بعد نکاح کا ارادہ کرنا: یہ ارادہ کرنا کہ عدت مکمل ہونے کے بعد نکاح کریں گے، جائز ہے۔

بعض علماء کے نزدیک طلاقِ بائن کی عدت میں بھی یہی حکم نافذ ہے۔

آخر میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: ''اور جان لو کہ اللہ تمہارے دلوں میں کیا ہے، اس لیے اس سے ڈرتے رہو۔ یقین رکھو کہ اللہ غفور و حلیم ہے، وہ تمہارے دل کی نیتوں سے بھی واقف ہے۔ لہٰذا عورتوں کے بارے میں کوئی بد نیتی یا ناپسندیدہ ارادہ دل میں نہ رکھو، اور اللہ کے احکام کی مکمل پابندی کرو۔ اللہ کے علم و مشاہدے سے دھوکہ نہ کھاؤ، اور اگر سزا میں دیر ہو تو اس پر دلیر نہ ہو۔''

اس سے واضح ہے کہ عدت کے دوران نکاح کے معاملات میں احتیاط، شرافت اور شرعی حدود کی پاسداری فرض ہے، تاکہ نہ عورت کی عزت متأثر ہو اور نہ مرد کی نیت غلط فہمی کا سبب بنے۔

آیت نمبر (۲۳۶) لَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ اِنْ طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ مَا لَمْ تَمَسُّوْهُنَّ اَوْ تَفْرِضُوْا لَهُنَّ فَرِيْضَةً ۖ وَّمَتِّعُوْهُنَّ ۚ عَلَى الْمُوْسِعِ قَدَرُهٗ وَعَلَى الْمُقْتِرِ قَدَرُهٗ ۚ مَتَاعًا بِالْمَعْرُوْفِ ۚ حَقًّا عَلَى الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۲۳۶﴾

ترجمہ: ''اگر تم عورتوں کو طلاق دو قبل اس کے کہ انہیں ہاتھ لگاؤ یا ان کے لیے مہر مقرر کرو، تو تم پر کوئی گناہ نہیں، البتہ انہیں کچھ فائدہ دو، خوشحال اپنی حیثیت کے مطابق اور تنگدست اپنی حیثیت کے مطابق، یہ معروف طریقے سے دینا نیک لوگوں پر لازم ہے''۔

تفسیر

طلاق شدہ عورتوں کے مہر کے احکام

اس آیت میں طلاق شدہ عورتوں کے مہر کے متعلق تفصیلی احکام بیان کیے گئے ہیں۔ طلاق کی چار مختلف صورتیں اور ان کے مطابق مہر کی ادائیگی درج ذیل ہے:

۱۔ نکاح کے وقت مہر مقرر ہوا اور خلوت کے بعد طلاق دی گئی ہو، ایسی صورت میں شوہر پر واجب ہے کہ پورا مہر ادا کرے جو نکاح کے وقت طے پایا تھا۔

۲۔ نکاح کے وقت مہر مقرر ہوا مگر خلوت سے پہلے طلاق دی گئی ہو، ایسی صورت میں شوہر کو آدھا مہر ادا کرنا ہوگا، جیسا کہ سورہ البقرہ کی آیت نمبر ۲۳۷ میں بیان ہوا ہے۔

۳۔ نکاح کے وقت نہ مہر طے پایا نہ خلوت ہوئی، اور طلاق خلوت سے پہلے دی گئی ہو، اس صورت میں شوہر پر مہر کی ادائیگی واجب نہیں، البتہ اپنی استطاعت کے مطابق عورت کو کم از کم ایک جوڑا کپڑوں کا فائدہ دینا ضروری ہے۔

۴۔ نکاح کے وقت مہر مقرر نہیں ہوا مگر خلوت کے بعد طلاق دی گئی ہو، ایسی صورت میں مہرِ مثل دینا ہوگا، یعنی عورت کے خاندان کی خواتین کو جو مہر مقرر تھا، اسی کے مطابق۔

لفظ مَتِّعُوْهُنَّ کی وضاحت

آیت میں جس لفظ کا استعمال ہوا ہے، ''مَتِّعُوْهُنَّ''، اس کا ترجمہ ہے: ''انہیں فائدہ پہنچاؤ''۔ یہ لفظ متاع سے نکلا ہے، جس کا لغوی مطلب ہے ایسی چیز جس سے تھوڑی مدت کے لیے فائدہ حاصل ہو۔ اسی بنیاد پر علماء اور مفسرین نے طلاق شدہ عورت کے لیے کم از کم تین کپڑوں کا جوڑا مقرر کیا ہے، مگر یہ حکم ہر مرد کے لیے ایک جیسا نہیں بلکہ اس کی مالی استطاعت کے مطابق ہے۔

مہر کی مقدار

اگر نکاح کے وقت مہر مقرر نہ کیا گیا ہو تو حنفیہ کے نزدیک کم از کم مہر کی مقدار دس درہم چاندی کی قیمت ہے، جو تقریباً ۳۰ گرام کے برابر ہے۔

حضرت محمد شفیع صاحبؒ کے مطابق اگر کوئی اس سے کم مہر مقرر کرے، تب بھی حداقل اتنا ہی دینا واجب ہوگا۔

زیادہ مہر دینے کی کوئی حد شریعت نے مقرر نہیں کی، البتہ استطاعت کے مطابق دینا اور سنت کی پیروی کرنا مستحب ہے۔

اہم مسائل

۱۔ اگر عورت کو خلوت سے پہلے طلاق دی جائے اور مہر مقرر نہ ہوا ہو تو شوہر صرف ایک جوڑا کپڑا دینے کا پابند ہے۔

۲۔ اس جوڑے میں مرد کی مالی حیثیت دیکھی جائے گی؛ جو وسعت والا ہو، وہ اپنی استطاعت کے مطابق زیادہ دے سکتا ہے، اور جس کی مالی حالت تنگ ہو، وہ کم سے کم فراہم کرے۔

اس آیت سے واضح ہوتا ہے کہ طلاق کے بعد عورت کے حقوق کا تحفظ اور مالی انصاف برقرار رکھنا بنیادی مقصد ہے، تاکہ نہ عورت کی عزت متاثر ہو اور نہ معاشرتی انصاف کا تقاضا ٹوٹے۔

آیت نمبر (۲۳۷) وَاِنْ طَلَّقْتُمُوْهُنَّ مِنْ قَبْلِ اَنْ تَمَسُّوْهُنَّ وَقَدْ فَرَضْتُمْ لَهُنَّ فَرِيْضَةً فَنِصْفُ مَا فَرَضْتُمْ اِلَّآ اَنْ يَّعْفُوْنَ اَوْ يَعْفُوَا الَّذِيْ بِيَدِهٖ عُقْدَةُ النِّكَاحِ ؕ وَاَنْ تَعْفُوْٓا اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى ؕ وَلَا تَنْسَوُا الْفَضْلَ بَيْنَكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴿۲۳۷﴾

ترجمہ: ''اور اگر تم عورتوں کو اس سے پہلے طلاق دو کہ انہیں چھوؤ، جبکہ تم ان کے لیے مہر مقرر کر چکے ہو، تو آدھا مہر دینا ہوگا، مگر یہ کہ وہ عورت معاف کر دے یا وہ شخص معاف کر دے جس کے ہاتھ میں نکاح کا بندھن ہے، اور اگر تم معاف کر دو تو یہ تقویٰ کے زیادہ قریب ہے، اور ایک دوسرے پر احسان کرنا نہ بھولو، یقیناً اللہ تمہارے اعمال کو دیکھ رہا ہے''۔

تفسیر

مہر کے بارے میں قرآنی حکم اور رعایت

اگر شوہر نے بیوی کو طلاق دی اور اس سے پہلے نکاح کے وقت مہر مقرر کر چکا ہو، لیکن قربت سے قبل طلاق دی جائے تو اس صورت میں مقرر شدہ مہر کا آدھا شوہر کے ذمہ ہوگا اور آدھا معاف سمجھا جائے گا۔ لیکن اس حکم سے دو صورتیں استثناء ہیں جیسے:

۱۔ عورت اپنا آدھا مہر معاف کر دے: ایسی صورت میں شوہر پر آدھا مہر بھی ادا کرنا واجب نہیں۔

۲۔ شوہر اپنی مرضی سے پورا مہر ادا کرے: یعنی اگر شوہر چاہے کہ عورت کو پورا مہر دے دے تو پورا مہر ادا کرنا لازم ہوگا۔

خلاصہ

قرآنی تعلیمات کے مطابق: اپنے حقوق میں رعایت اور معافی دینا ثواب اور تقویٰ کی علامت ہے۔ آپس

میں احسان اور حسن سلوک کو ہر حال میں قائم رکھنا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ ہر عمل سے آگاہ ہیں، اس لیے عورت کے حقوق میں رعایت اور نیکی کو اپنا معمول بنائیں، اسی طرح اگر مہر مقرر ہو اور عورت کو قربت سے پہلے طلاق دی جائے تو مہر کا آدھا ادا کرنا مرد پر لازم ہے۔ البتہ عورت معاف کرے یا مرد پورا مہر دے دے تو یہ اختیاری اور باہمی رضامندی کی بات ہے۔

قرآنی آیات میں جہاں فرمایا گیا حَقًّا عَلَى الْمُحْسِنِيْنَ (یہ نیکی کرنے والوں پر لازم ہے) اور وَلَا تَنْسَوُا الْفَضْلَ بَيْنَكُمْ (آپس میں احسان اور رعایت سے غفلت مت کرو)، اس سے واضح ہوتا ہے کہ طلاق کے موقع پر بھی احترام، مروت، اور حسن اخلاق ضروری ہے۔

ناگواری یا ناخوشگوار حالات میں بھی تقویٰ، معافی، اور احسان کا لحاظ رکھنا قرآنی تعلیمات کا جزوِ لاینفک ہے۔ اس لئے یہ حکم ہمیں سکھاتا ہے کہ طلاق بھی صرف قانونی عمل نہیں بلکہ اخلاقی ذمہ داری کے ساتھ نبھائی جائے، تاکہ عورت کے حقوق کا تحفظ اور معاشرتی نیکی قائم رہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم گرمی کے وقت ظہر کی نماز ادا کیا کرتے تھے، لیکن صحابہ کرام اکثر قیلولہ یا تجارت میں مصروف رہتے تھے۔ اسی وجہ سے نماز کے اہتمام اور صلوٰۃ الوسطیٰ کی تاکید کے لیے یہ آیات نازل ہوئیں۔

حضرت زید بن ارقم رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے میں نماز میں باتیں کی جاتی تھیں، پھر یہ آیت نازل ہوئی اور نماز میں خاموشی اور خشوع کی تعلیم دی گئی۔ **(بخاری: ۱۲۰۰)**

آیت نمبر (۲۳۸) حٰفِظُوْا عَلَى الصَّلَوٰتِ وَالصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى ۚ وَقُوْمُوْا لِلّٰهِ قٰنِتِيْنَ ﴿۲۳۸﴾

ترجمہ: ''سب نمازوں کی حفاظت کرو، خصوصاً درمیانی نماز کی، اور اللہ کے سامنے عاجزی سے کھڑے ہو جاؤ''۔

نماز کی حفاظت

تفسیر یہ آیات نماز کی حفاظت اور اس کے اہمیت کی وضاحت کرتی ہیں جیسے: اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: ''حٰفِظُوْا عَلَى الصَّلَوٰتِ''۔ یعنی تمام نمازوں کو ان کے مقررہ وقتوں پر قائم رکھو، اور نماز کے ارکان، واجبات، سنن اور مستحبات کا مکمل لحاظ رکھو۔

نمازوں میں خاص طور پر درمیانی نماز یعنی صلوٰۃ العصر کی حفاظت پر تاکید کی گئی۔ اس نماز کے ایک طرف دن کی نمازیں (فجر وظہر) اور دوسری طرف رات کی نمازیں (مغرب وعشاء) ہیں۔ عصر کا وقت اکثر مصروفیت، کام اور تجارتی جھنجھٹ کا ہوتا ہے، اس لیے اس نماز کی تاکید خصوصی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''وَقُوْمُوْا لِلّٰهِ قٰنِتِيْنَ''۔یعنی اللہ کے سامنے عاجزی اور خشوع کے ساتھ کھڑے رہو۔اسی حکم سے نماز میں بات چیت روک دی گئی اور صحابہ کرام نماز میں بعض اوقات آپس میں باتیں کیا کرتے تھے، حتیٰ کہ ضرورت کی گفتگو بھی ہو جاتی تھی۔اس آیت کے نزول کے بعد نماز میں کسی بھی قسم کی بات چیت ممنوع قرار پائی اور خاموشی اور خشوع لازم ہوا۔

● حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے کہ صلوٰۃ الوسطیٰ، صلوٰۃ العصر ہے۔(ترمذی:۱۸۱)

● حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ جو شخص صلوٰۃ العصر چھوڑ دے، گویا اس کا جان و مال تباہ ہو گیا ہو۔(بخاری:۵۵۲)

خلاصہ

صلوٰۃ العصر کی خاص اہمیت اور وقت کی مصروفیت کے باوجود اس کی پابندی ضروری ہے۔نماز میں خشوع، عاجزی اور بات چیت سے پرہیز لازم ہے۔یہ تعلیم ہمیں سکھاتی ہے کہ نماز صرف جسمانی عمل نہیں، بلکہ دل و روح کی تسلیم و خشوع کا بھی نام ہے۔

آیت نمبر(۲۳۹) فَاِنْ خِفْتُمْ فَرِجَالًا اَوْ رُكْبَانًا ۚ فَاِذَآ اَمِنْتُمْ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَمَا عَلَّمَكُمْ مَّا لَمْ تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ

ترجمہ: ''اگر خوف کی حالت ہو تو پیدل یا سواری پر نماز پڑھ لو، پھر جب امن حاصل ہو جائے تو اللہ کو یاد کرو، جیسے اس نے تمہیں سکھایا، جو تم پہلے نہیں جانتے تھے''۔

نماز کی اہمیت

تفسیر نماز کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ حتیٰ کہ شدید حالات میں بھی، جب دشمن سے مقابلہ ہو اور جانوں کو خطرہ لاحق ہو، نماز کو ٹالنا جائز نہیں۔ایسے حالات میں نماز کھڑے کھڑے یا سواری پر بیٹھ کر ادا کی جا سکتی ہے۔تاہم اشارے سے نماز اسی وقت صحیح ہوگی جب انسان ایک جگہ کھڑا ہو سکے اور اس میں سجدہ کا اشارہ رکوع سے زیادہ ہو۔

اگر کھڑا ہونا ممکن نہ ہو، اور چلنے، دوڑنے یا بھاگنے جیسی عملِ کثیر (نماز ٹوٹنے والا عمل) کی حالت ہو، تو حنفیہ کے نزدیک نماز مؤخر کر دی جاتی ہے، جیسا کہ صحابہ کرام اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جنگِ احزاب میں کیا۔(بخاری و مسلم)

جب جنگ یا خوف کی حالت نہ ہو اور امن قائم ہو، تو نماز پوری شرائط اور ارکان کے ساتھ ادا کی جائے: قبلہ کی طرف رخ، رکوع، سجدہ، قیام وغیرہ۔صحیح احادیث کی روشنی میں نماز کے رکعات کی تعداد مختلف حالات میں مختلف ہو سکتی ہے۔

ایک حدیث میں نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک گروہ کو دو رکعت نمازِ خوف پڑھائی، جبکہ دوسرا گروہ دشمن کے مقابل رہا۔ پھر پہلا گروہ ہٹ گیا اور دوسرے گروہ کو بھی دو رکعت پڑھائی گئی۔ نتیجتاً نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی چار رکعت نماز ہوئی، جبکہ ہر گروہ کی دو رکعت ادا ہوئیں۔ (صحیح مسلم: ۸۴۳، صلوۃ المسافرین)

نماز کی حفاظت کا مقصد یہ بھی ہے کہ انسان ناپسندیدہ کاموں سے بچا رہے اور اگر ناپسندیدہ کام ہو جائیں تو نماز ان کے اثر کو ختم کر دے۔

نوٹ: اس کے بعد موضوع کو دوبارہ بیوہ اور طلاق یافتہ عورتوں کے ساتھ معاملات کی شرعی تفصیلات کی طرف منتقل کیا جائے گا۔ یہ بیان نماز کی اہمیت، خشوع وخضوع، اور اضطراری حالات میں اس کی ادائیگی کی جامع وضاحت پیش کرتا ہے۔

آیت نمبر (۲۴۰) وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا ۖ وَّصِيَّةً لِّاَزْوَاجِهِمْ مَّتَاعًا اِلَى الْحَوْلِ غَيْرَ اِخْرَاجٍ ۚ فَاِنْ خَرَجْنَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْ مَا فَعَلْنَ فِيْٓ اَنْفُسِهِنَّ مِنْ مَّعْرُوْفٍ ۗ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿۲۴۰﴾

ترجمہ: ''اور جو لوگ تم میں سے فوت ہو جائیں اور بیویاں چھوڑ جائیں، وہ اپنی بیویوں کے لیے ایک سال تک نان ونفقہ کی وصیت کریں، بغیر نکالے جانے کے، پھر اگر وہ خود نکل جائیں تو جو کچھ وہ دستور کے مطابق کریں اس میں تم پر کوئی گناہ نہیں، اور اللہ غالب، حکمت والا ہے''۔

تفسیر

بیوہ عورت کے نفقہ اور عدت کے احکام

اسحٰق بن راہویہ نے اپنی تفسیر میں مقاتل بن حبان سے روایت نقل کی ہے کہ ایک شخص اہلِ طائف میں سے مدینہ منورہ آیا، جس کے اہلِ خانہ میں والدین، اولاد اور بیوی شامل تھیں۔ وہ شخص مدینہ میں انتقال کر گیا۔ اس واقعے کی اطلاع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دی گئی تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کے والدین اور اولاد کو اصول کے مطابق مال دیا، لیکن اس کی بیوی کو کچھ نہیں دیا گیا۔ البتہ اس کے وارثوں کو حکم دیا گیا کہ اس کی بیوی کو شوہر کے مال سے ایک سال تک نفقہ دیا جائے۔ اس واقعے کے پس منظر میں یہ آیت نازل ہوئی۔

زمانۂ جاہلیت میں عربوں میں بیوی کی عدت کا رواج ایک سال کا تھا۔ بعض وارثین بیوہ کو عدت کے دوران گھر سے نکال دیتے اور روزی کا انتظام نہیں کرتے تھے۔ اس عرصے میں بیوہ نہ نیا نکاح کر سکتی تھی اور نہ اس کے پاس رزق کا کوئی ذریعہ ہوتا تھا۔ بعد میں، بیوہ کی عدت کا زمانہ چار ماہ اور دس دن مقرر ہوا، جیسا کہ سورۃ البقرہ کے رکوع ۲۳۴ میں

بیان ہوا: وہ اپنے آپ کو روکیں چار ماہ دس دن۔" اس وقت تک آیتِ میراث نازل نہیں ہوئی تھی، لہٰذا بیوہ کو شوہر کے گھر میں سال بھر تک رہائش، نان ونفقہ اور سکونت کا حق حاصل تھا اور کوئی اسے اس حق سے محروم نہیں کر سکتا تھا۔ چار ماہ دس دن کی عدت کے بعد بیوہ کے پاس یہ اختیار تھا کہ وہ جس جگہ چاہے جائے، اور جس سے چاہے نکاح کرے۔

جب آیتِ میراث نازل ہوئی، تو شوہر کے مال میں بیوی کے لئے حصہ مقرر کیا گیا: اگر شوہر کی اولاد ہو تو آٹھواں حصہ، اگر اولاد نہ ہو تو چوتھائی حصہ اس کے بعد سال بھر کے نان ونفقہ اور رہائش کا حکم منسوخ ہو گیا اور اکثر مفسرین اور فقہا کے نزدیک یہ آیت منسوخ ہے۔ عدت والی آیت اور آیتِ میراث اس کی ناسخ ہیں۔

صحیح بخاری میں روایت ہے کہ حضرت ابن زبیرؓ نے حضرت عثمان غنیؓ سے پوچھا کہ جب یہ آیت منسوخ ہو چکی ہے تو پھر اسے قرآن میں کیوں رکھا گیا؟ حضرت عثمانؓ نے جواب دیا: بھتیجے، جیسا کہ پچھلی آیت میں ہے، یہاں بھی موجود رہے گی، ہم کوئی ردوبدل نہیں کر سکتے۔ **(تفصیل کے لیے دیکھیں: سورۃ البقرہ ۲۳۴ اور سورۃ النساء ۱۲)**

یہ بیان بیوہ عورت کے نفقہ، عدت اور میراث کے احکام کی شرعی وضاحت اور تاریخی پس منظر پیش کرتا ہے، تاکہ سمجھا جا سکے کہ عدت کی مدت اور مالی حقوق کس طرح وقت کے ساتھ واضح اور منظم کیے گئے۔

اس آیت کا ابتدائی حکم تھا کہ جو مرد مرنے کے قریب ہوں، وہ اپنی بیویوں کے لیے وارثوں کو وصیت کریں کہ بیوہ کو سال بھر تک نان ونفقہ (کھانا اور کپڑا) اور سکونت (رہائش) فراہم کیا جائے اور اسے گھر سے فوراً نہ نکالا جائے، جیسا کہ جاہلیت کے زمانے میں ہوتا تھا۔

بعد میں دوسری آیات کے نزول سے یہ حکم منسوخ ہو گیا اور اب بیوہ کے لیے مقرر عدت کا وقت چار ماہ دس دن یا حاملہ ہونے کی صورت میں بچے کی ولادت تک ہے۔ اگر بیوہ اس مدت کے بعد اپنی مرضی سے نکاح کر کے گھر چھوڑنا چاہے، تو اسے کسی بھی طرح کی ممانعت نہیں ہوگی اور مرد کو اس میں کوئی گناہ نہیں۔

پہلی آیت کی تفسیر میں اس مضمون کا واضح بیان موجود ہے: "جو تم میں سے وفات پا جائیں اور بیویاں چھوڑ جائیں، ان پر لازم ہے کہ وہ وصیت کریں کہ اپنی بیویوں کے لیے ایک سال تک نان ونفقہ اور سکونت کی سہولت فراہم کی جائے، تاکہ انہیں گھر سے نہ نکالا جائے۔ اگر وہ عدت مکمل کر کے خود نکل جائیں تو تم پر کوئی گناہ نہیں"۔

یہ حکم رسومِ جاہلیت کو رد کرتا ہے، عورت کے حقوق کا تحفظ کرتا ہے اور اسے مختار (قابل اختیار) بناتا ہے۔

آیت کے آخر میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "وَاللّٰهُ عَزِيزٌ حَكِيمٌ"۔

یعنی اللہ زبردست اور حکمت والے ہیں اور تمام احکام میں انسان کی بھلائی اور مصلحت رکھی گئی ہے، چاہے وہ ہماری سمجھ سے باہر کیوں نہ ہو۔

یہ وضاحت اس بات کو یقینی بناتی ہے کہ بیوہ عورت کے حقوق محفوظ رہیں، اس کے لیے ضروری نفقہ اور رہائش فراہم ہو اور عدت کے اختتام پر وہ اپنی مرضی سے زندگی گزارنے اور نکاح کرنے کی آزادی رکھے۔

آیت نمبر (۲۴۱) وَلِلْمُطَلَّقٰتِ مَتَاعٌۢ بِالْمَعْرُوْفِ ۭ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِيْنَ ۝۲۴۱

ترجمہ: ''اور طلاق یافتہ عورتوں کو بھی کچھ نہ کچھ (مال) دینا چاہیے دستور کے مطابق، یہ حق ہے ان پر جو اللہ سے ڈرتے ہیں''۔

تفسیر طلاق شدہ عورتوں کے حقوق اور ان کے لیے فائدہ پہنچانے کے سلسلے میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ''وَلِلْمُطَلَّقٰتِ مَتَاعٌۢ بِالْمَعْرُوْفِ''

ابن جریر نے ابن زیدؓ سے روایت نقل کی ہے کہ جب یہ آیات نازل ہوئیں، تو ایک شخص نے کہا کہ اگر اس میں بھلائی نظر آئے تو میں بھی ایسا کروں گا، اور اگر نہیں تو نہیں کروں گا۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی کہ طلاق شدہ عورتوں کے لیے کچھ فائدہ پہنچانا فرض ہے۔ **(تفسیر ابن عباس)**

اس آیت میں طلاق شدہ عورتوں کے لیے متاع یعنی انہیں نفع اور سہولت فراہم کرنے کا حکم دیا گیا ہے اور اس سے پہلے اسی رکوع کی آیات میں طلاق شدہ عورتوں کے لیے احکام درج تھے، مگر صرف دو صورتوں کے لیے:

۱۔ وہ عورت جس کا نہ مہر مقرر ہوا تھا اور نہ قربت کی نوبت آئی تھی۔ ایسی صورت میں شوہر پر لازم نہیں کہ مہر دے، مگر کم از کم ایک جوڑا کپڑا یا وہ کچھ دے جو اس کی وسعت کے مطابق ممکن ہو۔

۲۔ وہ عورت جس کا مہر نکاح کے وقت مقرر ہوا مگر خلوت یا قربت نہیں ہوئی تو ایسی صورت میں شوہر پر واجب ہے کہ مقرر شدہ مہر کا آدھا حصہ ادا کرے۔

اب اس آیت میں ایسی طلاق شدہ عورتوں کا ذکر ہے، جن کو خلوت یا قربت کے بعد طلاق دی گئی:

اگر عورت کا مہر پہلے سے مقرر تھا تو شوہر پر واجب ہے کہ پورا مہر ادا کرے اور اگر مہر نکاح کے وقت طے نہیں ہوا تھا تو شوہر پر واجب ہے کہ مہرِ مثل دے، یعنی اس عورت کے خاندان میں رائج مہر کے مطابق ہو۔

اس میں واضح طور پر اس بات کی تعلیم ہے کہ طلاق شدہ عورت کے حقوق کی حفاظت کی جائے اور اسے مالی فائدہ پہنچایا جائے، چاہے اس کے ساتھ قربت ہو یا نہ ہو اور شوہر کی وسعت کے مطابق مکمل عدل اور انصاف کیا جائے۔

آیت نمبر (۲۴۲) كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ۝۲۴۲

ترجمہ: ''اسی طرح اللہ اپنی آیتیں (احکام) تمہارے لیے بیان کرتا ہے تا کہ تم عقل سے کام لو''۔

تفسیر

شریعت کے احکام کی اہمیت

نکاح، طلاق، مہر اور عدت کے متعلق جو احکام پچھلی آیات میں بیان ہوئے ہیں، ان پر غور کرنے سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان میں بہت تاکیدی الفاظ استعمال فرمائے ہیں تا کہ انسان ان کی اہمیت کو سمجھے اور ان کی مکمل پابندی کرے۔ مثلاً ارشاد ہوتا ہے:

''وَاتَّقُوا اللّٰهَ'' اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو۔ ''تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ'' یہ اللہ کے مقرر کردہ قوانین ہیں۔ ''فَلَا تَعْتَدُوْهَا'' لہٰذا ان حدود سے تجاوز نہ کرو۔ ''وَلَا تَتَّخِذُوْٓا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ هُزُوًا'' اللہ کے احکامات کو مذاق یا کھیل نہ سمجھو۔ ''فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهٗ'' جو خلاف ورزی کرے گا، وہ اپنے ہی نقصان میں رہے گا۔ ''فَاحْذَرُوْهُ'' اللہ سے ڈرتے رہو۔ ''وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ'' اللہ تعالیٰ سب کچھ سنتے اور جانتے ہیں۔ ''عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ'' وہ زبردست اور حکمت والے ہیں۔ ''بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٍ'' ہر چیز سے باخبر ہیں۔ ''تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ'' تمہارے کاموں کو خوب دیکھ رہے ہیں۔ ''تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ'' تمہارے سب اعمال سے واقف ہیں۔

یہ ارشادات واضح دلیل ہیں کہ یہ تمام احکام شریعت میں واجب اور لازم ہیں، مشورے یا تجویز نہیں۔ کسی کو بھی یہ اختیار نہیں کہ ان میں تبدیلی کرے یا ان پر عمل نہ کرے۔ اللہ تعالیٰ کے احکام کی پابندی، تقویٰ اور نیک نیتی کے تقاضے ہیں اور یہ انسان کی زندگی میں عدل، انصاف اور اخلاق کی ضمانت فراہم کرتے ہیں۔

❁❁❁

ترجمہ- آیت نمبر ۲۴۳ سے ۲۴۸ تک

اَلَمۡ تَرَ اِلَى الَّذِيۡنَ خَرَجُوۡا مِنۡ دِيَارِهِمۡ وَهُمۡ اُلُوۡفٌ حَذَرَ الۡمَوۡتِ ۪ فَقَالَ لَهُمُ اللّٰهُ مُوۡتُوۡا ۟ ثُمَّ اَحۡيَاهُمۡ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَذُوۡ فَضۡلٍ عَلَى النَّاسِ وَلٰكِنَّ اَكۡثَرَ النَّاسِ لَا يَشۡكُرُوۡنَ ﴿۲۴۳﴾ وَقَاتِلُوۡا فِىۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ وَاعۡلَمُوۡۤا اَنَّ اللّٰهَ سَمِيۡعٌ عَلِيۡمٌ ﴿۲۴۴﴾ مَنۡ ذَا الَّذِىۡ يُقۡرِضُ اللّٰهَ قَرۡضًا حَسَنًا فَيُضٰعِفَهٗ لَهٗۤ اَضۡعَافًا كَثِيۡرَةً ؕ وَاللّٰهُ يَقۡبِضُ وَيَبۡصُۜطُ ۪ وَاِلَيۡهِ تُرۡجَعُوۡنَ ﴿۲۴۵﴾ اَلَمۡ تَرَ اِلَى الۡمَلَاِ مِنۡۢ بَنِىۡۤ اِسۡرَآءِيۡلَ مِنۡۢ بَعۡدِ مُوۡسٰى ۘ اِذۡ قَالُوۡا لِنَبِىٍّ لَّهُمُ ابۡعَثۡ لَنَا مَلِكًا نُّقَاتِلۡ فِىۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ ؕ قَالَ هَلۡ عَسَيۡتُمۡ اِنۡ كُتِبَ عَلَيۡكُمُ الۡقِتَالُ اَلَّا تُقَاتِلُوۡا ؕ قَالُوۡا وَمَا لَنَاۤ اَلَّا نُقَاتِلَ فِىۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ وَقَدۡ اُخۡرِجۡنَا مِنۡ دِيَارِنَا وَاَبۡنَآئِنَا ؕ فَلَمَّا كُتِبَ عَلَيۡهِمُ الۡقِتَالُ تَوَلَّوۡا اِلَّا قَلِيۡلًا مِّنۡهُمۡ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيۡمٌۢ بِالظّٰلِمِيۡنَ ﴿۲۴۶﴾ وَقَالَ لَهُمۡ نَبِيُّهُمۡ اِنَّ اللّٰهَ قَدۡ بَعَثَ لَـكُمۡ طَالُوۡتَ مَلِكًا ؕ قَالُوۡۤا اَنّٰى يَكُوۡنُ لَهُ الۡمُلۡكُ عَلَيۡنَا وَنَحۡنُ اَحَقُّ بِالۡمُلۡكِ مِنۡهُ وَلَمۡ يُؤۡتَ سَعَةً مِّنَ الۡمَالِ ؕ قَالَ اِنَّ اللّٰهَ اصۡطَفٰٮهُ عَلَيۡكُمۡ وَزَادَهٗ بَسۡطَةً فِى الۡعِلۡمِ وَالۡجِسۡمِ ؕ وَاللّٰهُ يُؤۡتِىۡ مُلۡكَهٗ مَنۡ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيۡمٌ ﴿۲۴۷﴾ وَقَالَ لَهُمۡ نَبِيُّهُمۡ اِنَّ اٰيَةَ مُلۡكِهٖۤ اَنۡ يَّاۡتِيَكُمُ التَّابُوۡتُ فِيۡهِ سَكِيۡنَةٌ مِّنۡ رَّبِّكُمۡ وَبَقِيَّةٌ مِّمَّا تَرَكَ اٰلُ مُوۡسٰى وَاٰلُ هٰرُوۡنَ تَحۡمِلُهُ الۡمَلٰٓئِكَةُ ؕ اِنَّ فِىۡ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لَّـكُمۡ اِنۡ كُنۡتُمۡ مُّؤۡمِنِيۡنَ ﴿۲۴۸﴾

ترجمہ:

(۲۴۳)۔کیا تم نے اُن لوگوں کو نہیں دیکھا جو اپنے گھروں سے نکلے تھے ہزاروں کی تعداد میں موت کے ڈر سے؟ تو اللہ نے ان سے فرمایا: مرجاؤ! پھر انہیں زندہ کر دیا۔ بیشک اللہ انسانوں پر بڑا فضل کرنے والا ہے، لیکن اکثر لوگ شکر نہیں کرتے۔(۲۴۴)۔اور (اے مسلمانو!) اللہ کی راہ میں لڑو اور جان لو کہ بے شک اللہ خوب سننے والا، خوب جاننے والا ہے۔(۲۴۵)۔کون ہے جو اللہ کو قرض دے، ایک اچھا قرض، تو اللہ اسے اس کے لیے کئی گنا بڑھا دے؟ اور اللہ ہی ہے جو تنگی بھی دیتا ہے اور کشادگی بھی، اور اسی کی طرف تم لوٹ کر جاؤ گے۔(۲۴۶)۔کیا تم نے اس جماعت کو نہیں دیکھا جو بنی اسرائیل میں سے تھی موسیٰؑ کے بعد؟ جب انہوں نے اپنے نبی سے کہا کہ ہمارے لیے ایک بادشاہ مقرر کریں تا کہ ہم اللہ کی راہ میں لڑیں۔ نبی نے فرمایا: کیا تمہیں اندیشہ نہیں کہ اگر تم پر قتال فرض کر دیا جائے تو تم نہ لڑو؟ کہنے لگے: ہمیں کیا ہوا ہے کہ ہم اللہ کی راہ میں نہ لڑیں، حالانکہ ہم اپنے گھروں سے نکالے گئے اور اپنے بچوں

سے (دور ہوئے)؟ پھر جب ان پر قتال فرض کر دیا گیا تو وہ سب پیٹھ پھیر گئے، سوائے ان میں سے تھوڑے لوگوں کے، اور اللہ ظالموں کو خوب جانتا ہے۔ (۲۴۷)۔ اور ان کے نبی نے ان سے کہا: اللہ نے تمہارے لیے طالوت کو بادشاہ مقرر کیا ہے۔ انہوں نے کہا: اسے ہم پر بادشاہت کیسے مل سکتی ہے جبکہ ہم اس سے زیادہ حق رکھتے ہیں بادشاہت کے، اور اسے مال کی کشادگی بھی نہیں دی گئی؟ نبی نے فرمایا: بے شک اللہ نے اسے تم پر چُن لیا ہے اور اسے علم میں اور جسم میں کشادگی دی ہے، اور اللہ جسے چاہتا ہے اپنا اقتدار دیتا ہے، اور اللہ بڑی وسعت والا، خوب جاننے والا ہے۔ (۲۴۸)۔ اور ان کے نبی نے ان سے کہا: اس کی بادشاہی کی نشانی یہ ہے کہ تمہارے پاس ایک صندوق آئے گا جس میں تمہارے رب کی طرف سے سکون ہے، اور اس میں کچھ باقیات ہوں گی آلِ موسیٰؑ اور آلِ ہارونؑ کی، جنہیں فرشتے اٹھا لائیں گے۔ بے شک اس میں تمہارے لیے ایک بڑی نشانی ہے اگر تم ایمان رکھنے والے ہو۔

تفسیر- آیت نمبر ۲۴۳ سے ۲۴۸ تک

آیت نمبر (۲۴۳) اَلَمۡ تَرَ اِلَى الَّذِيۡنَ خَرَجُوۡا مِنۡ دِيَارِهِمۡ وَهُمۡ اُلُوۡفٌ حَذَرَ الۡمَوۡتِ فَقَالَ لَهُمُ اللّٰهُ مُوۡتُوۡا ثُمَّ اَحۡيَاهُمۡ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَذُوۡ فَضۡلٍ عَلَى النَّاسِ وَلٰكِنَّ اَكۡثَرَ النَّاسِ لَا يَشۡكُرُوۡنَ ﴿۲۴۳﴾

ترجمہ: ''کیا تم نے اُن لوگوں کو نہیں دیکھا جو اپنے گھروں سے نکلے تھے ہزاروں کی تعداد میں موت کے ڈر سے؟ تو اللہ نے ان سے فرمایا: مر جاؤ! پھر انہیں زندہ کر دیا۔ بیشک اللہ انسانوں پر بڑا فضل کرنے والا ہے، لیکن اکثر لوگ شکر نہیں کرتے''۔

تفسیر اس آیت میں بنی اسرائیل کے ایک واقعے کا ذکر کرتے ہوئے مسلمانوں کو جہاد کی ترغیب دی گئی ہے۔ بتایا گیا کہ بنی اسرائیل کے ایک علاقے میں طاعون پھیل گیا، تو وہاں کے لوگ موت کے خوف سے اپنے گھروں اور آبادیوں کو چھوڑ کر بھاگ کھڑے ہوئے، لیکن بھاگنے سے وہ موت سے نہ بچ سکے اور اللہ تعالیٰ نے سب پر موت نازل کر دی۔ بعد ازاں اس زمانے کے نبی کی دعا کے سبب اللہ تعالیٰ نے ان پر کرم فرماتے ہوئے انہیں دوبارہ زندہ کیا۔

یہ بھی ممکن ہے کہ وہ لوگ کسی دشمن کے خوف سے فرار ہوئے ہوں، اس لیے اللہ تعالیٰ نے اس کے بعد جہاد کی ترغیب دی اور یہ بتایا کہ بنی اسرائیل نے اپنے نبی سے درخواست کی کہ وہ ان کے لیے ایک بادشاہ مقرر کریں تاکہ اس کی قیادت میں وہ اس دشمن سے مقابلہ کریں جس نے انہیں اپنے گھروں سے نکال دیا تھا۔

دونوں ہی حالات میں آیت میں واضح پیغام یہ ہے کہ جہاد میں ہچکچاہٹ یا خوف کی وجہ سے فرار اختیار کرنا نہ صرف بے فائدہ ہے بلکہ موت سے بھی نجات نہیں دلا سکتا، اس لیے ایمان والوں پر لازم ہے کہ وہ اللہ کے احکام کے مطابق بہادری اور استقامت کے ساتھ عمل کریں۔

آیت نمبر (۲۴۴) وَقَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۲۴۴﴾

ترجمہ: ''اور (اے مسلمانو!) اللہ کی راہ میں لڑو اور جان لو کہ بے شک اللہ خوب سننے والا، خوب جاننے والا ہے''۔

تفسیر ان دونوں آیتوں میں اللہ تعالیٰ نے مال اور جسم کے ذریعہ جہاد فی سبیل اللہ کی ترغیب دلائی ہے، کیونکہ جہاد میں دونوں کی ضرورت پیش آتی ہے۔ وہی قتال حقیقتاً جہاد فی سبیل اللہ شمار ہوگا جو اللہ کے دین کو بلند کرنے کے مقصد سے کیا جائے۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''جو قتال اللہ کے کلمے کی بلندی کے لیے ہو، وہی فی سبیل اللہ ہوگا''۔
(بخاری: ۲۸۱۰)

آیت نمبر (۲۴۵) مَنْ ذَا الَّذِيْ يُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا فَيُضٰعِفَهٗ لَهٗٓ اَضْعَافًا كَثِيْرَةً ؕ وَاللّٰهُ يَقْبِضُ وَيَبْصُۜطُ ۪ وَاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴿۲۴۵﴾

ترجمہ: ''کون ہے جو اللہ کو قرض دے، ایک اچھا قرض، تو اللہ اسے اس کے لیے کئی گنا بڑھا دے؟ اور اللہ ہی ہے جو تنگی بھی دیتا ہے اور کشادگی بھی، اور اسی کی طرف تم لوٹ کر جاؤ گے''۔

تفسیر اللہ تعالیٰ کے اس قول ''مَنْ ذَا الَّذِيْ يُقْرِضُ اللّٰهَ'' کی تشریح میں ابن حبان نے اپنی صحیح میں اور ابن ابی حاتم نے حضرت ابن عمرؓ سے روایت نقل کی ہے کہ جب یہ آیت ''مَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ أَمْوَالَهُمْ'' نازل ہوئی، جس میں سات سو گنا تک ثواب کی بشارت دی گئی، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دعا کی: ''اے رب! میری امت کو اور زیادہ ثواب عطا فرما''۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی کہ جو شخص اللہ کی راہ میں خلوصِ نیت کے ساتھ خرچ کرے، اللہ تعالیٰ اسے اس سے بڑھا کر اور زیادہ کر دیتا ہے۔

اس آیت میں اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کی ترغیب دی گئی ہے اور ''قرضِ حسنہ'' سے مراد اللہ کی راہ میں خرچ کرنا ہے۔ بعض لوگوں نے اسے اہلِ وعیال، یعنی اپنے گھر والوں پر خرچ کرنے کے معنیٰ میں بھی لیا ہے، کیونکہ وہ بھی نیک اور جائز خرچ کے دائرے میں آتا ہے۔

آیت نمبر (۲۴۶) اَلَمۡ تَرَ اِلَى الۡمَلَاِ مِنۡۢ بَنِىۡۤ اِسۡرَآءِيۡلَ مِنۡۢ بَعۡدِ مُوۡسٰى ۘ اِذۡ قَالُوۡا لِنَبِىٍّ لَّهُمُ ابۡعَثۡ لَنَا مَلِكًا نُّقَاتِلۡ فِىۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ ؕ قَالَ هَلۡ عَسَيۡتُمۡ اِنۡ كُتِبَ عَلَيۡكُمُ الۡقِتَالُ اَلَّا تُقَاتِلُوۡا ؕ قَالُوۡا وَمَا لَنَاۤ اَلَّا نُقَاتِلَ فِىۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ وَقَدۡ اُخۡرِجۡنَا مِنۡ دِيَارِنَا وَاَبۡنَآئِنَا ؕ فَلَمَّا كُتِبَ عَلَيۡهِمُ الۡقِتَالُ تَوَلَّوۡا اِلَّا قَلِيۡلًا مِّنۡهُمۡ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيۡمٌۢ بِالظّٰلِمِيۡنَ ۝

ترجمہ: ''کیا تم نے اس جماعت کو نہیں دیکھا جو بنی اسرائیل میں سے تھی موسیٰؑ کے بعد؟ جب انہوں نے اپنے نبی سے کہا کہ ہمارے لیے ایک بادشاہ مقرر کریں تا کہ ہم اللہ کی راہ میں لڑیں۔ نبی نے فرمایا: کیا تمہیں اندیشہ نہیں کہ اگر تم پر قتال فرض کر دیا جائے تو تم نہ لڑو؟ کہنے لگے: ہمیں کیا ہوا ہے کہ ہم اللہ کی راہ میں نہ لڑیں، حالانکہ ہم اپنے گھروں سے نکالے گئے اور اپنے بچوں سے (دور ہو ئے)؟ پھر جب ان پر قتال فرض کر دیا گیا تو وہ سب پیٹھ پھیر گئے، سوائے ان میں سے تھوڑے لوگوں کے، اور اللہ ظالموں کو خوب جانتا ہے''۔

تفسیر

عمالقہ کا قبضہ

بنی اسرائیل حضرت موسیٰؑ کے بعد ایک مدت تک توحید پر قائم رہے، مگر کچھ عرصہ بعد وہ توحید کی راہ سے بھٹک گئے اور بتوں کی پوجا شروع کر دی۔ تب اللہ تعالیٰ نے ان پر عمالقہ کو مسلط کر دیا، جنہوں نے ان کی زمین پر قبضہ کر لیا، بہت سے لوگوں کو قتل کیا اور کئی کو قید کر لیا۔ اس دوران انہوں نے وہ تابوت بھی چھین لیا جس میں اللہ تعالیٰ کے احکام محفوظ تھے، جو حضرت موسیٰؑ کو کوہِ طور پر عطا ہوئے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ اس میں تورات کا نسخہ، حضرت موسیٰؑ اور حضرت ہارونؑ کے آثار، اور حضرت موسیٰؑ کی لاٹھی بھی موجود تھی۔

بنی اسرائیل جب اپنے دشمنوں سے جنگ کے لیے نکلتے تو اس تابوت کو اپنے آگے رکھتے، جس سے انہیں سکون اور فتح کی امید ملتی تھی۔ لیکن عمالقہ نے تابوت بھی چھین لیا، اور اس کے بعد ذلت و رسوائی ان کی قسمت بن گئی۔ پھر ان میں نبی سمؤلؑ پیدا ہوئے، جنہوں نے لوگوں کو توحید کی طرف بلایا، مگر بنی اسرائیل نے کہا کہ ہمیں ایک بادشاہ مقرر کیا جائے تا کہ اس کی قیادت میں ہم عمالقہ کے خلاف جہاد کریں، اپنی زمین، تابوت اور تورات واپس حاصل کریں۔

طالوت اور جالوت

آیات ۲۴۶ تا ۲۵۱ میں بنی اسرائیل کے اس دور کا ذکر ہے۔ نبی سمؤلؑ نے ایک نوجوان کو ان کا بادشاہ مقرر

کیا جس کا نام طالوت تھا۔ یہ نوجوان اس خاندان سے تعلق نہیں رکھتا تھا جس میں پہلے بادشاہت رہی، مگر اللہ نے اسے جسمانی قوت، حسنِ جمال، علم اور دوراندیشی سے نوازا۔ دوسری جانب، جالوت عمالقہ کی فوج کا ایک مشہور پہلوان اور کمانڈر تھا، جس پر عمالقہ کو بہت ناز تھا۔

اس واقعے کا مقصد مسلمانوں کو جہاد فی سبیل اللہ کی ترغیب دینا ہے۔ طالوت جب جنگ کے لیے روانہ ہوا، تو جن لوگوں نے صبر واستقامت سے کام لیا، اللہ نے انہیں دنیا وآخرت میں عزت دی، اور جنھوں نے بزدلی دکھائی یا فرار اختیار کیا، ان کی دنیا تباہ ہوگئی اور آخرت میں بھی ذلت کا سامنا کرنا پڑا۔ اس واقعے سے یہ سبق بھی ملتا ہے کہ اختلافات ختم ہوں اور سب لوگ ایک قائد کی اطاعت پر راضی ہوجائیں۔ نبی سمؤلؑ نے یہ دیکھ کر کہ شاید یہ صرف زبانی دعویٰ ہو، عزم کیا کہ ہم اپنا وطن واپس لینے کے لیے جہاد فی سبیل اللہ کریں گے۔

آیت نمبر (۲۴۷) وَقَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ اِنَّ اللّٰهَ قَدْ بَعَثَ لَكُمْ طَالُوْتَ مَلِكًا ؕ قَالُوْٓا اَنّٰى يَكُوْنُ لَهُ الْمُلْكُ عَلَيْنَا وَنَحْنُ اَحَقُّ بِالْمُلْكِ مِنْهُ وَلَمْ يُؤْتَ سَعَةً مِّنَ الْمَالِ ؕ قَالَ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰىهُ عَلَيْكُمْ وَزَادَهٗ بَسْطَةً فِي الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ ؕ وَاللّٰهُ يُؤْتِيْ مُلْكَهٗ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ﴿۲۴۷﴾

ترجمہ: ”اور ان کے نبی نے ان سے کہا: اللہ نے تمہارے لیے طالوت کو بادشاہ مقرر کیا ہے۔ انہوں نے کہا: اسے ہم پر بادشاہت کیسے مل سکتی ہے جبکہ ہم اس سے زیادہ حق رکھتے ہیں بادشاہت کے، اور اسے مال کی کشادگی بھی نہیں دی گئی؟ نبی نے فرمایا: بے شک اللہ نے اسے تم پر چُن لیا ہے اور اسے علم میں اور جسم میں کشادگی دی ہے، اور اللہ جسے چاہتا ہے اپنا اقتدار دیتا ہے، اور اللہ بڑی وسعت والا، خوب جاننے والا ہے“۔

تفسیر جب سمؤلؑ نے طالوت کو بنی اسرائیل کا بادشاہ مقرر کیا، تو لوگوں نے تعجب کا اظہار کیا اور کہا کہ خاندان اور معاشرتی حیثیت کے اعتبار سے اس سے زیادہ حقدار افراد بھی موجود ہیں، پھر اسے ہمارا بادشاہ کیوں مقرر کیا گیا؟

اس پر سمؤلؑ نے جواب دیا کہ یہ فیصلہ اللہ تعالیٰ کا ہے۔ اللہ نے طالوت کو بادشاہ مقرر فرمایا کیونکہ وہ علم اور جسمانی قوت میں دوسروں سے ممتاز ہے۔ نیز بادشاہت کے لیے ضروری نہیں کہ مال دولت زیادہ ہو یا وہ پہلے سے شاہی خاندان سے تعلق رکھتا ہو۔ اللہ جسے چاہتا ہے، اسے اپنی مرضی اور حکمت سے حکومت عطا فرماتا ہے۔

آیت نمبر (۲۴۸) وَقَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ اِنَّ اٰيَةَ مُلْكِهٖٓ اَنْ يَّاْتِيَكُمُ التَّابُوْتُ فِيْهِ سَكِيْنَةٌ

مِّنْ رَّبِّكُمْ وَبَقِيَّةٌ مِّمَّا تَرَكَ اٰلُ مُوْسٰى وَاٰلُ هٰرُوْنَ تَحْمِلُهُ الْمَلٰٓئِكَةُ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۲۴۸﴾

ترجمہ: ''اور ان کے نبی نے ان سے کہا: اس کی بادشاہی کی نشانی یہ ہے کہ تمہارے پاس ایک صندوق آئے گا جس میں تمہارے رب کی طرف سے سکون ہے، اور اس میں کچھ باقیات ہوں گی آلِ موسیٰؑ اور آلِ ہارونؑ کی، جنہیں فرشتے اٹھا لائیں گے۔ بے شک اس میں تمہارے لیے ایک بڑی نشانی ہے اگر تم ایمان رکھنے والے ہو''۔

تفسیر پھر انہوں نے کہا کہ دیکھو، طالوت کو اللہ کی طرف سے بادشاہ مقرر کیے جانے کی نشانی یہ ہوگی کہ وہ تمہارا گمشدہ تابوت واپس لے آئے گا۔ بالآخر ایسا ہی ہوا اور وہ تابوت فرشتوں کے ذریعے طالوت کے پاس پہنچ گیا، جس پر لوگوں نے اپنے بادشاہ کو تسلیم کر لیا۔ (تفصیل کے لیے سورہ انعام، آیت ۱۲۱ دیکھیں)

❁❁❁

ترجمہ- آیت نمبر ۲۴۹ سے ۲۵۲ تک

فَلَمَّا فَصَلَ طَالُوْتُ بِالْجُنُوْدِ ۙ قَالَ اِنَّ اللّٰهَ مُبْتَلِيْكُمْ بِنَهَرٍ ۚ فَمَنْ شَرِبَ مِنْهُ فَلَيْسَ مِنِّيْ ۚ وَمَنْ لَّمْ يَطْعَمْهُ فَاِنَّهٗ مِنِّيْٓ اِلَّا مَنِ اغْتَرَفَ غُرْفَةًۢ بِيَدِهٖ ۚ فَشَرِبُوْا مِنْهُ اِلَّا قَلِيْلًا مِّنْهُمْ ۭ فَلَمَّا جَاوَزَهٗ هُوَ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ ۙ قَالُوْا لَا طَاقَةَ لَنَا الْيَوْمَ بِجَالُوْتَ وَجُنُوْدِهٖ ۭ قَالَ الَّذِيْنَ يَظُنُّوْنَ اَنَّهُمْ مُّلٰقُوا اللّٰهِ ۙ كَمْ مِّنْ فِئَةٍ قَلِيْلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيْرَةًۢ بِاِذْنِ اللّٰهِ ۭ وَاللّٰهُ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ وَلَمَّا بَرَزُوْا لِجَالُوْتَ وَجُنُوْدِهٖ قَالُوْا رَبَّنَآ اَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَّثَبِّتْ اَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا عَلَي الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ۝ فَهَزَمُوْهُمْ بِاِذْنِ اللّٰهِ ۙ وَقَتَلَ دَاوٗدُ جَالُوْتَ وَاٰتٰىهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ وَالْحِكْمَةَ وَعَلَّمَهٗ مِمَّا يَشَاۗءُ ۭ وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ ۙ لَّفَسَدَتِ الْاَرْضُ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ ذُوْ فَضْلٍ عَلَي الْعٰلَمِيْنَ ۝ تِلْكَ اٰيٰتُ اللّٰهِ نَتْلُوْهَا عَلَيْكَ بِالْحَقِّ ۭ وَاِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ۝

ترجمہ:

(۲۴۹)۔ پھر جب طالوت لشکروں کے ساتھ روانہ ہوا تو اس نے کہا: بے شک اللہ تمہیں ایک نہر کے ذریعے آزمانے والا ہے، سو جو اس میں سے سیر ہو کر پیئے گا وہ میرا نہیں، اور جو نہ چکھے اس سے، تو یقیناً وہ میرا ہے، سوائے اس کے جو ایک چلو بھرے اپنے ہاتھ سے۔ پھر انہوں نے پی لیا اس سے، سوائے ان میں سے تھوڑے لوگوں کے۔ پھر جب وہ اور وہ لوگ جو اس کے ساتھ ایمان لائے تھے، دریا کے پار ہو گئے، تو وہ کہنے لگے: آج ہم میں طاقت نہیں ہے جالوت اور اس کی فوج سے لڑنے کی۔ کہنے لگے وہ لوگ جو یقین رکھتے تھے کہ وہ اللہ سے ملاقات کرنے والے ہیں: کتنی ہی چھوٹی جماعتیں بڑی جماعتوں پر غالب آچکی ہیں اللہ کے حکم سے، اور اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔(۲۵۰)۔ اور جب وہ جالوت اور اس کے لشکر کے مقابلے میں آئے تو انہوں نے دعا کی: اے ہمارے رب! ہم پر صبر انڈیل دے، اور ہمارے قدم جما دے، اور ہماری مدد فرما اس کافر قوم کے مقابلے میں۔(۲۵۱)۔ تو انہوں نے اللہ کے حکم سے کفار کو شکست دی، اور داؤدؑ نے جالوت کو قتل کیا، پھر اللہ نے انہیں بادشاہی اور حکمت عطا فرمائی اور جو کچھ وہ چاہا، اسے سکھایا۔ اگر اللہ بعض لوگوں کو دوسروں کے ذریعے نہ روکتا، تو زمین فساد سے بھر جاتی، لیکن اللہ تمام جہانوں پر بڑا فضل کرنے والا ہے۔(۲۵۲)۔ یہ اللہ کی آیات ہیں، جو ہم آپ پر سچائی کے ساتھ تلاوت کرتے ہیں، اور بے شک آپ رسولوں میں سے ہیں۔

تفسیر- آیت نمبر ۲۴۹ سے ۲۵۲ تک

آیت نمبر (۲۴۹-۲۵۰) فَلَمَّا فَصَلَ طَالُوْتُ بِالْجُنُوْدِ ۙ قَالَ اِنَّ اللّٰهَ مُبْتَلِيْكُمْ بِنَهَرٍ ۚ فَمَنْ شَرِبَ مِنْهُ فَلَيْسَ مِنِّيْ ۚ وَمَنْ لَّمْ يَطْعَمْهُ فَاِنَّهٗ مِنِّيْٓ اِلَّا مَنِ اغْتَرَفَ غُرْفَةً ۢ بِيَدِهٖ ۚ فَشَرِبُوْا مِنْهُ اِلَّا قَلِيْلًا مِّنْهُمْ ۭ فَلَمَّا جَاوَزَهٗ هُوَ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ ۙ قَالُوْا لَا طَاقَةَ لَنَا الْيَوْمَ بِجَالُوْتَ وَجُنُوْدِهٖ ۭ قَالَ الَّذِيْنَ يَظُنُّوْنَ اَنَّهُمْ مُّلٰقُوا اللّٰهِ ۙ كَمْ مِّنْ فِئَةٍ قَلِيْلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيْرَةًۢ بِاِذْنِ اللّٰهِ ۭ وَاللّٰهُ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ ۝۲۴۹ وَلَمَّا بَرَزُوْا لِجَالُوْتَ وَجُنُوْدِهٖ قَالُوْا رَبَّنَآ اَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَّثَبِّتْ اَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا عَلَي الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ۝۲۵۰

ترجمہ: ''پھر جب طالوت لشکروں کے ساتھ روانہ ہوا تو اس نے کہا: بے شک اللہ تمہیں ایک نہر کے ذریعے آزمانے والا ہے، سو جو اس میں سے سیر ہو کر پیئے گا وہ میرا نہیں، اور جو نہ چکھے اس سے، تو یقیناً وہ میرا ہے، سوائے اس کے جو ایک چلو بھرے اپنے ہاتھ سے۔ پھر انہوں نے پی لیا اس سے، سوائے ان میں سے تھوڑے لوگوں کے۔ پھر جب وہ اور وہ لوگ جو اس کے ساتھ ایمان لائے تھے، دریا کے پار ہو گئے، تو وہ کہنے لگے: آج ہم میں طاقت نہیں ہے جالوت اور اس کی فوج سے لڑنے کی۔ کہنے لگے وہ لوگ جو یقین رکھتے تھے کہ وہ اللہ سے ملاقات کرنے والے ہیں: کتنی ہی چھوٹی جماعتیں بڑی جماعتوں پر غالب آ چکی ہیں اللہ کے حکم سے، اور اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔ اور جب وہ جالوت اور اس کے لشکر کے مقابلے میں آئے تو انہوں نے دعا کی: اے ہمارے رب! ہم پر صبر انڈیل دے، اور ہمارے قدم جما دے، اور ہماری مدد فرما اس کافر قوم کے مقابلے میں''۔

تفسیر جب طالوت کی قیادت میں بنی اسرائیل عمالقہ کے مقابلے کے لیے روانہ ہوئے تو طالوت نے اعلان کیا کہ راستے میں ایک نہر آئے گی، جو اردن اور فلسطین کے درمیان واقع ہے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے تمہارے صبر کا امتحان یہی ہے کہ سخت پیاس کے باوجود اس کا پانی نہ پینا۔ جو پیئے گا وہ ہماری فوج سے الگ سمجھا جائے گا، اور جو ایک چلو سے زیادہ نہ پیئے گا وہ ہمارے ساتھ آگے بڑھنے کا حق دار ہوگا۔ اس آزمائش میں اکثر لوگ ناکام ہوئے، صرف چند ہی صابر ثابت قدم رہے۔

- حضرت براء بن عازبؓ بیان کرتے ہیں کہ ان کی تعداد وہی تھی جو اصحابِ بدر کی تھی۔ (بخاری: ۳۹۵۷)
- حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ جس نے ایک چلو پانی پیا، وہ سیراب ہو گیا، اور جس نے جی بھر کے

پیاوہ پیاسا ہی رہا۔ جب سب اہلِ ایمان نہر پار کر چکے تو ان میں سے کچھ کمزور یقین رکھنے والوں نے کہا: ''آج ہم جالوت اور اس کے لشکر سے جنگ نہیں کر سکتے۔'' لیکن ان اہلِ علم و یقین نے، جنہیں اللہ کے وعدے پر کامل اعتماد تھا، کمزور دلوں کو سنبھالا اور کہا: ''فتح و نصرت اللہ کے حکم سے آتی ہے، یہ تعداد پر موقوف نہیں۔ اکثر ایسا بھی ہوا ہے کہ قلیل جماعت کثیر لشکر پر غالب آ گئی ہے۔''

اس طرح ان کے دلوں کو تقویت ملی، وہ جالوت کے لشکر کے مقابلے میں ڈٹ گئے، اور حضرت داؤدؑ (جو اس وقت نہ نبی تھے نہ بادشاہ بلکہ طالوت کی فوج میں شامل ایک نوجوان مجاہد تھے) نے جالوت کو قتل کر دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بنی اسرائیل کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے روشن اور فیصلہ کن فتح نصیب ہوئی۔

آیت نمبر (۲۵۱) فَهَزَمُوْهُمْ بِاِذْنِ اللّٰهِ ۙ وَقَتَلَ دَاوٗدُ جَالُوْتَ وَاٰتٰىهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ وَالْحِكْمَةَ وَعَلَّمَهٗ مِمَّا يَشَآءُ ؕ وَلَوْ لَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ ۙ لَّفَسَدَتِ الْاَرْضُ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ ذُوْ فَضْلٍ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ﴿۲۵۱﴾

ترجمہ: ''تو انہوں نے اللہ کے حکم سے کفار کو شکست دی، اور داؤدؑ نے جالوت کو قتل کیا، پھر اللہ نے انہیں بادشاہی اور حکمت عطا فرمائی اور جو کچھ وہ چاہا، اسے سکھایا۔ اگر اللہ بعض لوگوں کو دوسروں کے ذریعے نہ روکتا، تو زمین فساد سے بھر جاتی، لیکن اللہ تمام جہانوں پر بڑا فضل کرنے والا ہے''۔

تفسیر اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے جہاد فی سبیل اللہ کی حکمت و افادیت بیان فرمائی کہ اگر وہ مجاہدین کے ہاتھوں کفار و فجار کے شر کو نہ کچلوا دیتا تو وہ روئے زمین پر فساد برپا کرتے۔ لیکن یہ اللہ کا فضل و کرم ہے کہ اس نے جہاد کو واجب قرار دیا، تاکہ اہلِ خیر کو غلبہ عطا ہو اور زمین پر اللہ کے دین کا نفاذ ہو۔

آیت نمبر (۲۵۲) تِلْكَ اٰيٰتُ اللّٰهِ نَتْلُوْهَا عَلَيْكَ بِالْحَقِّ ؕ وَاِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ﴿۲۵۲﴾

ترجمہ: ''یہ اللہ کی آیات ہیں، جو ہم آپ پر سچائی کے ساتھ تلاوت کرتے ہیں، اور بے شک آپ رسولوں میں سے ہیں''۔

تفسیر بنی اسرائیل کے اس واقعے کی تفصیل بیان کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب محمد ﷺ سے فرمایا کہ ہم یہ نشانیاں آپ کے سامنے حق کے ساتھ بیان کر رہے ہیں، جو آپ کی رسالت کی روشن دلیل ہیں۔ اس لیے کہ آپ ﷺ کو وحی کے ذریعے اس واقعے کی خبر دی گئی، حالانکہ اس سے پہلے آپ کو اس کا کوئی علم نہ تھا۔ اس قصے میں امتِ

مسلمہ کے لیے گہری نصیحتیں اور رہنمائیاں پوشیدہ ہیں، جیسے کہ:

۱۔ جہاد فی سبیل اللہ کے بغیر دین، وطن اور جان و مال کی حفاظت پوری طرح ممکن نہیں۔

۲۔ مجاہدین کا انجام ہمیشہ خیر و کامیابی پر منتج ہوتا ہے۔

۳۔ مسلمانوں کی قیادت ان ہی افراد کے سپرد ہونی چاہیے جو واقعی اہل ہوں، اور قیادت کی اہلیت میں سب سے نمایاں اوصاف علم اور قوتِ جسم ہیں۔

۴۔ قائد کی ذمہ داری ہے کہ اپنی فوج پر کڑی نظر رکھے اور جو جنگ کے اہل نہ ہوں انہیں پیچھے ہٹا دے۔

۵۔ اگر دشمن کی کثرت یا کسی اور سبب سے مجاہدین کے دلوں میں مایوسی سر اٹھانے لگے تو ان کی ہمت بڑھائی جائے اور قوتِ ایمانی کو بیدار کر کے انہیں ثابت قدمی پر آمادہ کیا جائے۔

❁❁❁

ترجمہ- آیت نمبر ۲۵۳ سے ۲۵۸ تک

تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ ۘ مِنْهُمْ مَّنْ كَلَّمَ اللّٰهُ وَرَفَعَ بَعْضَهُمْ دَرَجٰتٍ ؕ وَاٰتَيْنَا عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنٰتِ وَاَيَّدْنٰهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ ؕ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا اقْتَتَلَ الَّذِيْنَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ وَلٰكِنِ اخْتَلَفُوْا فَمِنْهُمْ مَّنْ اٰمَنَ وَمِنْهُمْ مَّنْ كَفَرَ ؕ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا اقْتَتَلُوْا ۫ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَفْعَلُ مَا يُرِيْدُ ﴿۲۵۳﴾ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ يَوْمٌ لَّا بَيْعٌ فِيْهِ وَلَا خُلَّةٌ وَّلَا شَفَاعَةٌ ؕ وَالْكٰفِرُوْنَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۲۵۴﴾ اَللّٰهُ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ اَلْحَيُّ الْقَيُّوْمُ ۚ لَا تَاْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّلَا نَوْمٌ ؕ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ؕ مَنْ ذَا الَّذِيْ يَشْفَعُ عِنْدَهٗۤ اِلَّا بِاِذْنِهٖ ؕ يَعْلَمُ مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ ۚ وَلَا يُحِيْطُوْنَ بِشَيْءٍ مِّنْ عِلْمِهٖۤ اِلَّا بِمَا شَآءَ ۚ وَسِعَ كُرْسِيُّهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ ۚ وَلَا يَـُٔوْدُهٗ حِفْظُهُمَا ۚ وَهُوَ الْعَلِيُّ الْعَظِيْمُ ﴿۲۵۵﴾ لَاۤ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ ۙ قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ ۚ فَمَنْ يَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَيُؤْمِنْۢ بِاللّٰهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى ۗ لَا انْفِصَامَ لَهَا ؕ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۲۵۶﴾ اَللّٰهُ وَلِيُّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۙ يُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ؕ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْۤا اَوْلِيٰٓـُٔهُمُ الطَّاغُوْتُ ۙ يُخْرِجُوْنَهُمْ مِّنَ النُّوْرِ اِلَى الظُّلُمٰتِ ؕ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۲۵۷﴾ اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْ حَآجَّ اِبْرٰهٖمَ فِيْ رَبِّهٖۤ اَنْ اٰتٰىهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ ۘ اِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّيَ الَّذِيْ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ ۙ قَالَ اَنَا اُحْيٖ وَاُمِيْتُ ؕ قَالَ اِبْرٰهٖمُ فَاِنَّ اللّٰهَ يَاْتِيْ بِالشَّمْسِ مِنَ الْمَشْرِقِ فَاْتِ بِهَا مِنَ الْمَغْرِبِ فَبُهِتَ الَّذِيْ كَفَرَ ؕ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۲۵۸﴾

ترجمہ:

(۲۵۳)۔ یہ سب رسول وہ ہیں جنہیں ہم نے ایک دوسرے پر فضیلت دی۔ ان میں کچھ ایسے ہیں جن سے اللہ نے براہِ راست کلام کیا، اور بعض کے درجے بلند کیے۔ ہم نے عیسیٰ بن مریمؑ کو کھلی نشانیاں عطا کیں اور روح القدس کے ذریعے ان کی مدد کی۔ اگر اللہ چاہتا تو ان کے بعد والے لوگ، جن کے پاس روشن دلائل آ چکے تھے، آپس میں نہ لڑتے، لیکن انہوں نے اختلاف کیا، تو کچھ ایمان لائے اور کچھ نے انکار کیا۔ اور اگر اللہ چاہتا تو وہ آپس میں نہ لڑتے، مگر اللہ جو چاہتا ہے، کرتا ہے۔ (۲۵۴)۔ اے ایمان والو! خرچ کرو اس مال میں سے جو ہم نے تمہیں دیا ہے، اس دن کے آنے سے پہلے جس میں نہ کوئی خرید وفروخت ہوگی، نہ دوستی کام آئے گی، اور نہ سفارش۔ اور جو انکار کریں، وہی ظالم

ہیں۔(۲۵۵)۔اللہ! (اس) کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ زندہ ہے، ہمیشہ قائم رہنے والا، نہ اسے اونگھ آتی ہے نہ نیند۔ جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے سب اسی کا ہے۔کون ہے جو اس کی اجازت کے بغیر اس کے حضور سفارش کرے؟ وہ جانتا ہے جو کچھ ان کے سامنے ہے اور جو کچھ ان کے پیچھے ہے۔اور وہ اس کے علم میں سے کسی چیز پر احاطہ نہیں کر سکتے، مگر جتنا وہ چاہے۔اس کی کرسی آسمانوں اور زمین پر محیط ہے، اور ان دونوں کی حفاظت اسے تھکاتی نہیں۔ وہی سب سے بلند اور عظمت والا ہے۔(۲۵۶)۔دین میں کوئی زبردستی نہیں۔ہدایت گمراہی سے واضح ہو چکی ہے۔تو جو طاغوت کا انکار کرے اور اللہ پر ایمان لائے، تو اس نے مضبوط کڑا تھام لیا، جو کبھی نہیں ٹوٹے گا۔اور اللہ خوب سننے والا، جاننے والا ہے۔(۲۵۷)۔اللہ ایمان والوں کا دوست ہے، وہ انہیں اندھیروں سے نکال کر روشنی کی طرف لاتا ہے۔اور جنہوں نے کفر کیا، ان کے دوست طاغوت ہیں، وہ انہیں روشنی سے نکال کر اندھیروں میں لے جاتے ہیں۔یہی لوگ دوزخی ہیں، یہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔(۲۵۸)۔کیا تم نے اس شخص کو نہیں دیکھا جو ابراہیمؑ سے اس کے رب کے بارے میں جھگڑا کرنے لگا، اس وجہ سے کہ اللہ نے اسے بادشاہی دے رکھی تھی؟ جب ابراہیمؑ نے کہا: میرا رب وہ ہے جو زندگی دیتا ہے اور موت دیتا ہے۔وہ بولا: میں بھی زندگی دیتا ہوں اور موت دیتا ہوں۔تو ابراہیمؑ نے کہا: اچھا! اللہ سورج کو مشرق سے نکالتا ہے، تو اسے مغرب سے نکال دے۔تو وہ کافر حیران وخاموش ہو گیا۔اور اللہ ظالموں کو ہدایت نہیں دیتا۔

تفسیر-آیت نمبر ۲۵۳ سے ۲۵۸ تک

آیت نمبر (۲۵۳) تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ ۘ مِنْهُمْ مَّنْ كَلَّمَ اللّٰهُ وَرَفَعَ بَعْضَهُمْ دَرَجٰتٍ ؕ وَاٰتَيْنَا عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنٰتِ وَاَيَّدْنٰهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ ؕ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا اقْتَتَلَ الَّذِيْنَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ وَلٰكِنِ اخْتَلَفُوْا فَمِنْهُمْ مَّنْ اٰمَنَ وَمِنْهُمْ مَّنْ كَفَرَ ؕ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا اقْتَتَلُوْا ۫ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَفْعَلُ مَا يُرِيْدُ ﴿۲۵۳﴾

ترجمہ: ”یہ سب رسول وہ ہیں جنہیں ہم نے ایک دوسرے پر فضیلت دی۔ان میں کچھ ایسے ہیں جن سے اللہ نے براہِ راست کلام کیا، اور بعض کے درجے بلند کیے۔ہم نے عیسیٰ بن مریمؑ کو کھلی نشانیاں عطا کیں اور روح القدس کے ذریعے ان کی مدد کی۔اگر اللہ چاہتا تو ان کے بعد والے لوگ، جن کے پاس روشن دلائل آ چکے تھے، آپس میں نہ لڑتے، لیکن انہوں نے اختلاف کیا، تو کچھ ایمان لائے اور کچھ نے انکار کیا۔اور اگر اللہ چاہتا تو وہ آپس میں نہ لڑتے، مگر اللہ جو چاہتا ہے، کرتا ہے“۔

تفسیر اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے واضح فرمایا ہے کہ انبیاء کرام علیہم السلام کے درمیان فضائل وصفات میں تفاوت

رہا ہے۔ بعض انبیاء کو اللہ نے ایسی خصوصیات اور امتیازات عطا فرمائے جو دوسروں کو نصیب نہ ہوئے۔ حضرت ابراہیمؑ کو اللہ نے اپنا خلیل بنایا، حضرت موسیٰؑ سے براہِ راست کلام فرمایا، اور رسول اکرم ﷺ کو تمام انسانوں میں سب سے برتر و افضل مقام عطا فرمایا۔ آپ ﷺ کو بے شمار نشانیاں دی گئیں اور سب سے عظیم معجزہ قرآنِ کریم عطا کیا گیا، جو اکیلا ہی تمام انبیاء پر آپ کی فوقیت کے لیے کافی ہے۔ حضرت عیسیٰ بن مریمؑ کو بھی غیر معمولی معجزات عطا کیے گئے؛ اللہ کے حکم سے وہ اندھوں کو بینائی عطا کرتے، کوڑھ کے مریض کو صحت مند بناتے، مردوں کو زندہ کرتے اور یہاں تک کہ گہوارے ہی میں لوگوں سے بات کر کے اپنی صداقت ظاہر کرتے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی تائید روح القدس کے ذریعے فرمائی، یعنی جبرائیل امین کے واسطے سے یا اس مقدس روح کے ذریعے جو اللہ نے ان میں پھونکی تھی۔

انبیاء کرام کے کمالات، ان کی عظمت و حرمت اور ان کے ہاتھوں ظاہر ہونے والی نشانیوں کو دیکھ کر سب انسانوں کو ایمان لے آنا چاہیے تھا، لیکن حقیقت یہ ہے کہ اکثر لوگ راہِ راست سے بھٹک گئے اور آپس میں ایک دوسرے کو قتل کرنے لگے۔ حالانکہ اللہ چاہتا تو سب کو ایک ہی راہِ ہدایت پر جمع فرما دیتا، مگر اس نے اپنی حکمت کے تحت اس دنیا کو امتحان اور عمل کے میدان سے جوڑ دیا ہے۔

نوٹ: اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کو تمام رسولوں پر فضیلت بخشی ہے۔ آپ ﷺ نے بھی فرمایا: ''میں اولادِ آدم کا سردار ہوں۔'' اس سے یہی بات ظاہر ہوتی ہے۔ البتہ حضرت ابوہریرہؓ کی وہ حدیث کہ ''مجھے دیگر انبیاء پر فضیلت نہ دو'' دراصل آپ ﷺ کی انکساری پر محمول ہے۔ چنانچہ ایک اور روایت میں حضرت ابوہریرہؓ بیان کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ''کسی نبی کو دوسرے نبی پر فضیلت نہ دو''۔ **(بخاری: ۳۴۱۲)**

آیت نمبر (۲۵۴) يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ يَوْمٌ لَّا بَيْعٌ فِيْهِ وَلَا خُلَّةٌ وَّلَا شَفَاعَةٌ ۭ وَالْكٰفِرُوْنَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ۝۲۵۴

ترجمہ: ''اے ایمان والو! خرچ کرو اس مال میں سے جو ہم نے تمہیں دیا ہے، اس دن کے آنے سے پہلے جس میں نہ کوئی خرید و فروخت ہوگی، نہ دوستی کام آئے گی، اور نہ سفارش۔ اور جو انکار کریں، وہی ظالم ہیں''۔

تفسیر اس آیت میں مومنوں کو اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کی ترغیب دی گئی ہے۔ بعض مفسرین نے اس سے مراد زکوٰۃ لی ہے، بعض نے جہاد کے راستے میں خرچ کو مراد قرار دیا ہے، اور بعض کے نزدیک یہ ہر طرح کے فرض اور نفل اخراجات کو شامل ہے۔ آیت میں یہ حقیقت بھی بیان ہوئی ہے کہ بندۂ مؤمن دنیا میں جو کچھ بھی اللہ کی راہ میں خرچ

کرے گا، وہ قیامت کے دن اپنے نامۂ اعمال میں ضرور موجود پائے گا۔ اس دن جب نہ مال کسی کے کام آئے گا، نہ دوست سہارا بن سکے گا اور نہ کوئی سفارش فائدہ دے گی، وہاں کافروں کے لیے سخت گرفت اور عذاب ہوگا۔

آیت نمبر (۲۵۵) اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ اَلْحَيُّ الْقَيُّوْمُ ۚ لَا تَاْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّلَا نَوْمٌ ۭ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۭ مَنْ ذَا الَّذِيْ يَشْفَعُ عِنْدَهٗٓ اِلَّا بِاِذْنِهٖ ۭ يَعْلَمُ مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ ۚ وَلَا يُحِيْطُوْنَ بِشَيْءٍ مِّنْ عِلْمِهٖٓ اِلَّا بِمَا شَاۗءَ ۚ وَسِعَ كُرْسِيُّهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ ۚ وَلَا يَـــُٔـوْدُهٗ حِفْظُهُمَا ۚ وَهُوَ الْعَلِيُّ الْعَظِيْمُ ۝۲۵۵

ترجمہ: ''اللہ! (اس) کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ زندہ ہے، ہمیشہ قائم رہنے والا، نہ اسے اونگھ آتی ہے نہ نیند۔ جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے سب اسی کا ہے۔ کون ہے جو اس کی اجازت کے بغیر اس کے حضور سفارش کرے؟ وہ جانتا ہے جو کچھ ان کے سامنے ہے اور جو کچھ ان کے پیچھے ہے۔ اور وہ اس کے علم میں سے کسی چیز پر احاطہ نہیں کر سکتے، مگر جتنا وہ چاہے۔ اس کی کرسی آسمانوں اور زمین پر محیط ہے، اور ان دونوں کی حفاظت اسے تھکاتی نہیں۔ وہی سب سے بلند اور عظمت والا ہے''۔

تفسیر یہ آیتِ مبارکہ، جسے آیت الکرسی کہا جاتا ہے اور جسے احادیث میں اعظم آیاتِ کتاب اللہ کا لقب دیا گیا ہے، اللہ تعالیٰ کی توحیدِ ذاتی، کمالاتِ صفات اور اس کی عظمت وجلال کا جامع بیان ہے۔ اس میں اللہ تعالیٰ نے اپنی یکتائی اور الوہیت کو نہایت مؤثر انداز میں واضح فرمایا ہے۔

(۱) پہلا لفظ: اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ

یہ کلمہ وہی مفہوم رکھتا ہے جو ''لا الٰہ الا اللہ'' میں بیان ہوا ہے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں۔ اس جملے میں خالص توحید کا اعلان ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کے سوا کوئی ہستی عبادت کے لائق نہیں، کیونکہ وہی سب کا خالق، مالک، رازق، مارنے اور جلانے والا ہے۔ بیماری وصحت، دولت وفقر، عزت وذلت اور ہر طرح کا نفع ونقصان صرف اسی کے قبضۂ قدرت میں ہے۔ زمین وآسمان میں کوئی انسان، فرشتہ یا مخلوق اس کی خدائی میں شریک نہیں، نہ ہی اس کے فیصلوں کو کوئی بدل سکتا ہے اور نہ اس کے کاموں میں کسی کو مداخلت کی اجازت ہے۔

پس وہی لائقِ عبادت ہے، اسی کے حضور جھکنا چاہیے، ہر حاجت ومشکل میں اسی سے فریاد کرنی چاہیے اور چونکہ وہی حقیقی مالک وحاکم ہے لہٰذا اس کے ہر حکم کو دل وجان سے ماننا ضروری ہے۔ جب بندہ تسلیم کر لیتا ہے کہ وہ

صرف اللہ کا بندہ ہے تو اس کے عمل سے بھی یہی ظاہر ہونا چاہیے کہ وہ اللہ کے احکام کے مطابق زندگی گزارتا ہے اور اسی کے لیے جیتا اور مرتا ہے۔

(۲) دوسرا لفظ: اَلْحَیُّ الْقَیُّوْمُ

''الحی'' کے معنٰی ہیں ہمیشہ زندہ رہنے والا۔ یعنی اللہ کی ذات ازل سے ہے اور ابد تک رہے گی، اس پر کبھی موت طاری نہیں ہوئی اور نہ کبھی ہوگی۔ زندگی اس کی ذاتی صفت ہے۔

''القیوم'' کے معنٰی ہیں قائم رکھنے والا اور سہارا دینے والا۔ یعنی اللہ وہ ہستی ہے جو نہ صرف اپنی ذات سے قائم ہے بلکہ تمام مخلوقات کے قائم و دائم رہنے کا سبب بھی وہی ہے۔ ساری کائنات کا نظام اسی کے دستِ قدرت میں ہے۔ یہ صفت اللہ کی خاص صفت ہے، کسی انسان کو ''قیوم'' کہنا درست نہیں۔ البتہ ''عبدالقیوم'' کہنا جائز ہے۔ بعض اہلِ علم کے نزدیک ''الحیّ القیوم'' اسمِ اعظم ہے۔ حضرت علیؓ فرماتے ہیں کہ غزوۂ بدر میں انہوں نے رسول اللہ ﷺ کو سجدے میں بار بار یہ دعا پڑھتے سنا: ''یَا حَیُّ یَا قَیُّوم'' اسی طرح بعض مفسرین نے ذکر کیا ہے کہ حضرت عیسیٰؑ جب اللہ کے حکم سے مردہ کو زندہ کرتے تو ''یَا حَیُّ یَا قَیُّوم'' پڑھ کر دعا کرتے اور فرماتے ''قُمْ بِاِذْنِ اللہ'' تو مردہ زندہ ہو جاتا۔

(۳) تیسرا لفظ: لَا تَاْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّلَا نَوْمٌ

یعنی اللہ کو نہ اونگھ آتی ہے اور نہ نیند۔ خالقِ کائنات ہر طرح کی کمزوری سے پاک ہے۔ اونگھ اور نیند انسان کو غفلت میں ڈال دیتی ہیں اور زندگی میں نقص پیدا کرتی ہیں، لیکن اللہ تعالیٰ ان تمام عیوب سے منزہ ہے۔ وہ ایسا ''حیّ و قیوم'' ہے جسے تھکن، سستی، غفلت، بھول یا کمزوری کا کوئی شائبہ بھی نہیں۔

(۴) چوتھا لفظ: لَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ

یعنی آسمانوں اور زمین بلکہ ساری کائنات کی ہر شے اُسی کی مِلک ہے۔ سب کچھ اُسی نے پیدا کیا ہے اور سب اُسی کے قبضۂ قدرت میں ہے۔ وہی مالک و مختار ہے، جو چاہے اپنی مخلوق میں تصرف فرمائے۔ یہ آیت اللہ تعالیٰ کی صفتِ مالکیت کو ظاہر کرتی ہے کہ وہی حقیقی مالک ہے، جبکہ ساری مخلوق اُس کی محتاج ہے اور وہ اپنی ذات میں سب سے بے نیاز ہے۔

(۵) پانچواں لفظ: مَنْ ذَا الَّذِیْ یَشْفَعُ عِنْدَهٗۤ اِلَّا بِاِذْنِهٖ

یعنی کون ہے جو اُس کے حضور بغیر اجازت کے سفارش کر سکے؟ وہی مالک الملک ہے اور ہر چیز پر اختیار رکھتا ہے۔ اُس کے دربار میں کسی کی یہ جرأت نہیں کہ اُس کی اجازت کے بغیر مجرموں یا گنہگاروں کی سفارش کر سکے۔ انبیاء،

اولیاء اور اللہ کے مقرب بندے بھی اگر شفاعت کریں گے تو صرف اُس کے اذن وحکم سے کریں گے۔ یہی اللہ کی حاکمیت، جلال اور کبریائی کا بیان ہے کہ اُس کی بارگاہ میں بغیر اِذنِ الٰہی زبان کھولنا بھی ناممکن ہے۔

یہی وجہ ہے کہ انبیاء اور فرشتے جب تک اجازت نہ پائیں، شفاعت نہیں کر سکتے۔ پھر اُن بتوں کے بارے میں کفار کا یہ عقیدہ کہ وہ ان کے لیے سفارش کریں گے، کس قدر بے بنیاد اور احمقانہ ہے۔

حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''میں قیامت کے دن عرش کے نیچے سجدہ ریز ہوں گا، اللہ تعالیٰ مجھے جتنی دیر چاہے گا سجدے میں رہنے دے گا، پھر فرمائے گا: اپنا سر اٹھاؤ، کہو تمہاری بات سنی جائے گی، شفاعت کرو تمہاری شفاعت قبول کی جائے گی''۔ **(بخاری: ۶۵۶۵)**

اسی طرح حضرت ابو ہریرہؓ کے سوال پر آپ ﷺ نے فرمایا: ''قیامت کے دن میری شفاعت کے سب سے زیادہ حقدار وہ خوش نصیب ہوں گے جنہوں نے خلوصِ دل کے ساتھ 'لا الٰہ الا اللہ' کہا ہوگا۔'' **(بخاری: ۹۹)**

نوٹ: یہ شفاعت صرف اہلِ توحید کے لیے ہے، مشرکین اس سے محروم رہیں گے۔

(۶) چھٹا لفظ

اللہ تعالیٰ ہر ظاہر و پوشیدہ، گزشتہ و آئندہ اور قریب و بعید سب حالات سے باخبر ہے۔ اُس کے علم میں ماضی، حال اور مستقبل یکساں ہیں۔ ہزاروں برس پہلے جو کچھ ہو چکا، آج جو کچھ رونما ہو رہا ہے اور آئندہ جو کچھ پیش آئے گا، سب اُس کے علمِ محیط میں ہے۔ یہ آیت دراصل اللہ تعالیٰ کے کامل و ہمہ گیر علم کو بیان کرتی ہے کہ اُس سے کوئی چیز چھپی ہوئی نہیں۔

(۷) ساتواں لفظ

انسان اور تمام مخلوقات اللہ کے علم کے کسی حصے پر بھی قابو نہیں پا سکتے، سوائے اس کے کہ جتنا اللہ تعالیٰ خود کسی کو عطا کر دے۔ یعنی علم کا اصل سرچشمہ صرف اللہ کی ذات ہے۔ کوئی مخلوق اس میں شریک نہیں، جیسے مخلوقات کا وجود اللہ کے دیے ہوئے فیض کا نتیجہ ہے، اُسی طرح اُن کا علم بھی اللہ ہی کی بخشش ہے۔ بندے صرف اُتنا ہی جان سکتے ہیں جتنا اللہ اُن پر منکشف فرما دے۔ بعض مفسرین نے اس لفظ کے معنی یہ بھی لکھے ہیں کہ اللہ کی ذات اور اُس کی صفات کا علم انسان یا کسی مخلوق کو اُتنا ہی حاصل ہے جتنا کہ اللہ تعالیٰ نے رسولوں اور فرشتوں کے ذریعے عطا کیا ہے۔ اس حد سے آگے کسی کی رسائی نہیں۔ **(تفصیل کے لئے دیکھیے: سورہ مریم آیت ۶۴، سورہ بقرہ آیت ۳۲)**

(۸) آٹھواں لفظ

وَسِعَ كُرْسِيُّهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ اُس کی کرسی اتنی وسیع ہے کہ تمام آسمان اور زمین اُس میں سمائے

ہوئے ہیں۔ 'کرسی' کی تفسیر میں مفسرین کے مختلف اقوال ہیں۔ حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ اس سے مراد ''علم'' ہے، یعنی اللہ کا علم پوری کائنات کو اپنے احاطے میں لیے ہوئے ہے۔ بعض نے کرسی کے معنی قدرت اور عظمت بیان کیے ہیں، یعنی اُس کی قدرتِ کاملہ اور عظمت ہی آسمانوں اور زمینوں کے نظام کو سنبھالے ہوئے ہے۔ کچھ مفسرین نے اس کا ظاہری مفہوم لیا ہے اور لکھا ہے کہ کرسی ایک مخلوق ہے، جو عرش سے چھوٹی مگر آسمانوں سے بڑی ہے۔

حضرت ابوذرؓ روایت کرتے ہیں کہ جب انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کرسی کے بارے میں پوچھا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''اے ابوذر! ساتوں آسمان اور زمین کرسی کے مقابلے میں ایسے ہیں جیسے ایک چھوٹا سا حلقہ کسی وسیع میدان میں رکھا ہو، اور عرش کرسی کے مقابلے میں ایسے ہے جیسے وہی میدان اس چھوٹے حلقے کے مقابلے میں ہو''۔
(طبری، جلد سوم، ص ۷)

علمائے محققین کا کہنا ہے کہ اللہ تعالیٰ بیٹھنے یا اٹھنے سے پاک ہے، اس لیے کرسی اور عرش جیسے الفاظ بطورِ استعارہ استعمال ہوئے ہیں۔ ان پر ایمان رکھنا لازم ہے مگر اُن کی کیفیت اور حقیقت کا علم صرف اللہ کے پاس ہے۔ نہ اُن کی کیفیت بیان کی جائے اور نہ کسی مخلوق سے تشبیہ دی جائے۔ خلاصہ یہ ہے کہ کرسی اللہ کی عظیم حاکمیت اور بے پایاں ملکیت کی علامت ہے جو انسان کے وہم و گمان سے بھی بلند ہے۔

(۹) نواں لفظ

وَلَا يَـُٔوْدُهٗ حِفْظُهُمَا ۔ آسمانوں اور زمین کی حفاظت اور اُن کے نظام کو قائم رکھنا اللہ کے لئے بالکل آسان ہے۔ اس میں کسی طرح کی مشقت یا دشواری شامل نہیں۔ یعنی یہ لفظ اللہ تعالیٰ کی صفتِ قدرت کو ظاہر کرتا ہے جو ہر قسم کی کمزوری اور نقص سے پاک ہے۔

(۱۰) دسواں اور آخری لفظ

وَهُوَ الْعَلِيُّ الْعَظِيْمُ اور وہی بلند رُتبہ اور عظمت والا ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ اپنی شان، مرتبے اور سلطنت میں ہر شے سے برتر ہے۔ اُس کی حکومت و غلبہ ہر چیز پر قائم ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ کوئی زبان اُس کی عظمت کی مکمل تصویر نہیں کھینچ سکتی، کیونکہ وہ مخلوق کی سمجھ اور ادراک سے کہیں بلند ہے۔

آیت الکرسی کی فضیلت

مسلم شریف میں حضرت اُبی بن کعبؓ سے روایت ہے کہ وہ صحابۂ کرامؓ میں قرآن کے بڑے حافظ اور عالم مانے جاتے تھے۔ اُن کی کنیت ''ابوالمنذر'' تھی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اُن سے فرمایا: ''ابوالمنذر! کیا تم جانتے ہو کہ

کتاب اللہ کی سب سے عظیم آیت کون سی ہے جو تمہارے پاس ہے؟'' حضرت اُبیؓ نے عرض کیا: ''اللہ اور اُس کا رسول ہی بہتر جانتے ہیں۔'' آپ ﷺ نے دوبارہ سوال فرمایا: ''ابوالمنذر! جانتے ہو سب سے بڑی آیت کون سی ہے؟'' اس پر حضرت اُبیؓ نے جواب دیا: ''اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْحَیُّ الْقَیُّوْمُ '' یعنی پوری 'آیت الکرسی'۔ رسول اللہ ﷺ یہ سن کر خوش ہوئے، اُن کے سینے پر ہاتھ مارا اور فرمایا: ''ابوالمنذر! تمہیں علم کی بشارت ہو''۔ **(مسلم: ۱۸۸۵)**

اسی طرح حضرت ابوہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''سورۂ بقرہ میں ایک آیت ہے جو تمام قرآن کی آیتوں کی سردار ہے، اور وہ ہے آیت الکرسی۔ جس گھر میں اسے پڑھا جائے، وہاں سے شیطان بھاگ نکلتا ہے۔'' **(ترمذی: ۲۸۷۷)**

● حضرت عمر فاروقؓ کے دریافت کرنے پر کہ قرآن کی سب سے عظیم آیت کون سی ہے؟ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے جواب دیا: ''مجھے خوب علم ہے، میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے سنا ہے کہ وہ آیت الکرسی ہے''۔

اس مبارک آیت کے دس الفاظ ہیں اور اس کی عظمت واہمیت کی وجہ سے ہر لفظ کی تشریح الگ الگ کی گئی ہے۔

● حضرت ابی امامہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جو شخص ہر فرض نماز کے بعد آیت الکرسی پڑھ لے، اُس کے اور جنت کے درمیان کوئی رکاوٹ باقی نہ رہے گی سوائے موت کے۔'' **(مجمع الزوائد: ۱۶۹۲۲)**

● حضرت ابوذر غفاریؓ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ''سات آسمانوں کی حیثیت کرسی کے مقابلے میں ایسے ہے جیسے کسی وسیع میدان میں ایک چھوٹی سی انگوٹھی رکھی ہو، اور عرش کی عظمت کرسی پر ایسی ہے جیسے وہی میدان اُس انگوٹھی کے مقابلے میں ہو۔'' **(سلسلۃ الاحادیث الصحیحۃ: ۳۱۸۹)**

● حضرت ابوہریرہؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے مجھے رمضان کی زکوٰۃ (صدقۂ فطر) کی نگرانی پر مقرر کیا۔ وہاں ایک شخص آیا اور غلے میں سے مٹھی بھرنے لگا۔ میں نے اُسے پکڑ لیا اور کہا: ''اب تمہیں رسول اللہ ﷺ کے پاس لے جاؤں گا۔'' پھر اُس نے کہا: ''ابوہریرہ! جب تم سونے کے لئے بستر پر جاؤ تو آیت الکرسی پڑھ لیا کرو، اس سے صبح تک تم پر ایک نگہبان مقرر ہو جائے گا جو تمہاری حفاظت کرے گا اور شیطان تمہارے قریب بھی نہ آسکے گا۔'' جب یہ بات رسول اللہ ﷺ کے سامنے بیان کی گئی تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''وہ بڑا جھوٹا ہے، مگر اس بار اُس نے سچ کہا۔ وہ شیطان تھا''۔ **(صحیح بخاری، فضائل القرآن، باب ۱۰، حدیث: ۵۰۱۰)**

خلاصہ یہ ہے کہ آیت الکرسی کے الفاظ میں اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات کے کمالات بیان ہوئے ہیں۔ جب انسان ان پر غور کرتا ہے تو بے اختیار اقرار کرتا ہے کہ تمام عظمت، بلندی اور برتری کا مالک صرف اللہ تعالیٰ ہے۔ اس آیت میں توحید کو اس انداز میں واضح کیا گیا ہے کہ ہر صاحبِ عقل سچائی قبول کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے، اور حق و باطل،

نور وظلمت کے درمیان خطِ امتیاز کھنچ جاتا ہے۔ اس طرح دلیل اور حجت پوری ہو جاتی ہے، اب کسی کے لئے انکار کی گنجائش باقی نہیں رہتی۔ یہی وجہ ہے کہ اگلی آیت میں فرمایا گیا کہ دین میں کوئی جبر وزبردستی نہیں، جو چاہے حق کو قبول کرے اور جو چاہے انکار کرے۔

آیت نمبر (۲۵۶) لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ ۙ قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ ۚ فَمَنْ يَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَيُؤْمِنْۢ بِاللّٰهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى ۗ لَا انْفِصَامَ لَهَا ۭ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ۝۲۵۶

ترجمہ: ''دین میں کوئی زبردستی نہیں۔ ہدایت گمراہی سے واضح ہو چکی ہے۔ تو جو طاغوت کا انکار کرے اور اللہ پر ایمان لائے، تو اس نے مضبوط کڑا تھام لیا، جو کبھی نہیں ٹوٹے گا۔ اور اللہ خوب سننے والا، جاننے والا ہے''۔

تفسیر

اسلام قبول کروانے میں زبردستی نہیں

پچھلی آیت، جو آیت الکرسی کے نام سے مشہور ہے، اس میں اللہ تعالیٰ نے اپنی وحدانیت، قدرت، علم اور عظمت کو اس انداز سے بیان فرمایا کہ ہر صاحبِ عقل انسان توحید باری تعالیٰ کو ماننے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ اس طرح یہ حقیقت واضح ہو گئی کہ اللہ تعالیٰ کی توحید کو تسلیم کرنا، اُس کی اطاعت بجالانا اور اُس کے تمام احکام کو قبول کرنا ہر انسان پر لازم ہے۔ اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ چاہتے تو کفار کو زبردستی ایمان لانے پر مجبور کر سکتے تھے، کیونکہ وہ اُن پر پوری قدرت رکھتے ہیں، اور یہ اُن کا حق بھی تھا، کیوں کہ وہی سب کے خالق، رازق اور مالک ہیں، اور مالک کو اپنے ملک میں تصرف کا پورا اختیار ہے۔

لیکن چونکہ یہ طریقہ اللہ تعالیٰ کی حکمت کے خلاف تھا، اس لئے کفار کو ایمان پر مجبور نہ کیا گیا بلکہ صاف اور واضح اعلان فرما دیا گیا کہ دینِ حق کی قبولیت میں کوئی جبر نہیں۔ ہر ایک کو یہ اختیار دیا گیا ہے کہ چاہے تو اپنے ارادے اور اختیار کو استعمال کرتے ہوئے توحید ورسالت کو قبول کرے اور ہدایت کی راہ اختیار کرے، یا پھر اپنے اختیار کو کفر و شرک میں کھپا کر گمراہی کا راستہ چنے۔ کیونکہ ہدایت اور گمراہی الگ الگ کر کے بالکل نمایاں کر دی گئی ہیں، اس لئے اب کسی دباؤ یا زبردستی کی ضرورت باقی نہیں رہی۔ اگر کوئی شخص اپنی مرضی سے گمراہی اختیار کرتا ہے تو وہ دراصل اپنی بربادی خود مول لیتا ہے۔ ایسے شخص کو روکنے کے لئے کسی جبر یا زبردستی کی ضرورت نہیں، کیونکہ وہ اپنے ہی ہاتھوں اپنی تباہی کا سامان کر رہا ہے۔

مذہب میں جبر کی گنجائش نہیں

آیتِ کریمہ لَآ اِکْرَاہَ فِی الدِّیْنِ کے شانِ نزول کے حوالے سے یہ واقعہ مروی ہے کہ اسلام سے پہلے مدینہ کی مشرکہ عورتیں جب بے اولاد ہوتیں تو یہ منت مانتیں کہ اگر ہمارے یہاں بچہ پیدا ہوا تو اُسے یہودیوں کے سپرد کر دیں گی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ اپنے بت پرستی والے مذہب کو حقیر اور یہود کے اہلِ کتاب ہونے کے مذہب کو بہتر سمجھتی تھیں۔ چنانچہ ان کے بہت سے بچے یہودیوں کے پاس پرورش پاتے۔

جب اسلام مدینہ میں آیا اور یہ لوگ ایمان لا کر انصار کہلائے تو بعض نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں عرض کیا: ''یارسول اللہ! ہم نے اپنی اولاد کو یہودی مذہب اس لئے دیا تھا کہ ہم بت پرست تھے اور وہ اہلِ کتاب تھے، مگر اب جب اللہ نے ہمیں اسلام کی نعمت عطا فرما دی ہے تو ہم اپنی اولاد کو زبردستی مسلمان کریں گے۔'' اسی موقع پر یہ آیت نازل ہوئی کہ ''دین کے معاملے میں کوئی زبردستی نہیں''۔

ایک دوسری روایت میں اس آیت کے نزول کا پس منظر یہ بیان کیا گیا ہے کہ ایک انصاری صحابیؓ کے دو بیٹے عیسائی تھے۔ وہ خود مسلمان ہو گئے تھے لیکن بیٹوں کے عیسائی بنے رہنے پر پریشان تھے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا: ''یارسول اللہ! مجھے اجازت دیجیے کہ میں اپنے لڑکوں کو زبردستی مسلمان کرلوں۔'' اس موقع پر یہ آیت نازل ہوئی اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انہیں اس بات کی اجازت نہ دی۔

اس آیت میں اسلام کو مضبوطی سے تھامنے والے شخص کی مثال ایسے فرد سے دی گئی ہے جو ایک مضبوط رسی کے حلقے کو اچھی طرح پکڑ لے اور گرنے یا ہلاک ہونے سے محفوظ رہے۔ اسی طرح جو شخص اسلام کے حلقے کو مضبوطی سے تھام لیتا ہے وہ ہلاکت اور آخرت کے نقصان سے بچ جاتا ہے۔ اور جس طرح مضبوط رسی تھام لینے کے بعد گرنے کا اندیشہ باقی نہیں رہتا، اسی طرح اسلام کو اختیار کرنے والا بھی کسی ہلاکت سے محفوظ ہو جاتا ہے۔ ہاں، اگر کوئی خود اس رسی کو چھوڑ دے تو پھر خطرہ یقینی ہے۔ یعنی اسلام چھوڑنے والا ہی تباہی کا شکار ہوگا۔

یہ آیت صاف الفاظ میں اعلان کرتی ہے کہ اسلام ہر شخص کو دین کے معاملے میں اختیار دیتا ہے۔ اسلام قبول کرنے کے لئے کسی کو جبر و اکراہ پر مجبور نہیں کرتا، لیکن اپنے ماننے والوں کو تبلیغ و اشاعتِ دین کی ترغیب ضرور دیتا ہے۔ البتہ یہ اجازت نہیں دیتا کہ کسی کو زبردستی اسلام میں داخل کیا جائے۔

تاریخ اسلام اس حقیقت پر گواہ ہے کہ مسلمانوں نے کبھی اپنے پڑوسیوں، محکوم رعایا یا غلاموں کو بھی جبر کے ذریعے اسلام قبول کرنے پر مجبور نہیں کیا۔ حضرت عمر فاروقؓ کا ایک غلام نصرانی تھا۔ آپؓ اسے اسلام کی دعوت تو دیتے، لیکن جب وہ انکار کرتا تو فرماتے: ''تمہاری مرضی ہے، اسلام میں جبر نہیں''۔

البتہ یہاں ایک نکتہ سمجھ لینا ضروری ہے کہ اسلام میں جبر نہ ہونے کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ کوئی شخص اسلام قبول کرنے کے بعد بھی احکامِ اسلام کی پیروی میں آزاد چھوڑ دیا جائے۔ دین قبول کرنے کا اختیار تو ہے، لیکن ایک بار اسلام اپنا لینے کے بعد اس کے تمام احکام کی پابندی لازمی ہے۔ اب یہ اجازت نہیں کہ کوئی حکم مانے اور کسی کو ترک کردے۔

یہ معاملہ ایسا ہی ہے جیسے کسی کمپنی میں ملازمت کرنا لازمی نہیں، لیکن جب کوئی شخص اپنی مرضی سے کسی کمپنی میں ملازمت اختیار کر لیتا ہے تو پھر اُس کے تمام اصول وضوابط کی پابندی بھی لازم ہوتی ہے، ورنہ سزا کا مستحق قرار پاتا ہے۔ اسی طرح دین کی قبولیت میں تو زبردستی نہیں، لیکن قبول کرنے کے بعد اس کے تمام احکام کی بجا آوری واجب ہے۔ اس پابندی کو جبر نہیں کہا جائے گا، بلکہ یہ ایک مضبوط اور بہتر نظام کی علامت ہے۔

اعتراض اور اس کا جواب

بعض کم فہم غیر مسلم اس آیت ''لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ'' پر اعتراض کرتے ہیں کہ جب دین میں جبر نہیں تو اسلام میں جہاد وقتال کی تعلیم کیوں دی گئی ہے؟ لیکن اگر اسلام کے احکام پر غور کیا جائے تو یہ اعتراض سراسر لغو اور بے بنیاد ہے۔ اس لئے کہ اسلام میں جہاد کا مقصد ہرگز لوگوں کو زبردستی مسلمان بنانا نہیں بلکہ ظلم، جبر اور فساد کو روکنا ہے۔ کفار ومشرکین اپنے باطل عقائد دوسروں پر زبردستی مسلط کرتے تھے، اسی جبر کے مقابلے کے لئے جہاد کا حکم دیا گیا، نہ کہ لوگوں کو ایمان پر مجبور کرنے کے لئے۔

قرآن نے جس جبر کے خلاف جنگ کی اجازت دی ہے، وہ خود ایسا عمل کیسے اختیار کر سکتا ہے؟ اسی طرح جہاد کے ساتھ ساتھ جزیہ کی تعلیم اس حقیقت کی واضح دلیل ہے کہ اسلام نے غیر مسلموں کے لئے راستہ تنگ نہیں کیا۔ انہیں یہ آزادی دی گئی کہ اگر وہ اسلام قبول نہ کرنا چاہیں تو جزیہ دے کر اپنی جان، مال اور مذہب کو محفوظ رکھیں۔

اسلام میں قتال کی نوبت بھی یکا یک نہیں آتی بلکہ یہ تیسرے درجے پر ہے۔ پہلے مرحلے میں غیر مسلموں کو اسلام سمجھنے اور آزادی کے ساتھ غور کرنے کا موقع دیا جاتا ہے۔ اگر وہ اسلام نہ اپنائیں تو دوسرے مرحلے میں اسلامی حکومت کے اقتدار کو تسلیم کر کے جزیہ دینے کا اختیار دیا جاتا ہے۔ اور اگر ان دونوں مواقع کو رد کر کے جنگ پر اتر آئیں تو پھر تیسرا مرحلہ قتال کا آتا ہے، جس کی ذمہ داری خود ان پر عائد ہوتی ہے۔

لہٰذا یہ کہنا کہ اسلام تلوار کے زور سے پھیلا، ایک بے حقیقت اور خلافِ اسلام دعویٰ ہے۔ آیتِ کریمہ اور آیاتِ جہاد میں کوئی ٹکراؤ نہیں کیونکہ جہاد کا مقصد لوگوں کو دین میں داخل کرنے پر مجبور کرنا نہیں ہے۔ قرآن خود اعلان کرتا ہے کہ جس کے دل پر مہر لگا دی گئی ہو، اُسے زبردستی ایمان لانے پر مجبور کیا بھی جائے تو کوئی فائدہ نہیں۔

تاریخ بھی گواہ ہے کہ مجاہدینِ اسلام نے جب کوئی خطہ فتح کیا تو وہاں کے لوگوں کو زبردستی مسلمان نہیں بنایا بلکہ انہیں یہ اختیار دیا کہ چاہیں تو اپنے مذہب پر قائم رہیں اور جزیہ دے کر اسلامی حکومت کے تحت پرامن زندگی بسر کریں۔

اس آیت میں صاف اعلان کیا گیا ہے کہ دین میں جبر و اکراہ نہیں، اس لئے کہ حق و باطل اور ہدایت و گمراہی کے درمیان واضح فرق بیان کر دیا گیا ہے۔ اب جو شخص گمراہی کو اختیار کرے گا، اُس کی مذمت کی گئی ہے اور جو ہدایت کو قبول کرے گا، اُس کی مدح و تحسین فرمائی گئی ہے۔

آیت نمبر (۲۵۷) اَللّٰهُ وَلِیُّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا ۙ یُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ؕ وَالَّذِیْنَ كَفَرُوْۤا اَوْلِیٰٓـُٔهُمُ الطَّاغُوْتُ ۙ یُخْرِجُوْنَهُمْ مِّنَ النُّوْرِ اِلَى الظُّلُمٰتِ ؕ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِیْهَا خٰلِدُوْنَ ۝۲۵۷

ترجمہ: ''اللہ ایمان والوں کا دوست ہے، وہ انہیں اندھیروں سے نکال کر روشنی کی طرف لاتا ہے۔ اور جنہوں نے کفر کیا، ان کے دوست طاغوت ہیں، وہ انہیں روشنی سے نکال کر اندھیروں میں لے جاتے ہیں۔ یہی لوگ دوزخی ہیں، یہ اس میں ہمیشہ رہیں گے''۔

تفسیر یہ آیت اپنی ماقبل آیت سے مربوط ہے۔ پچھلی آیت گویا بنیاد ہے اور یہ آیت اُس کا نتیجہ۔ جو لوگ اپنے ایمان میں سچائی کے ساتھ ثابت قدم رہتے ہیں، اعمالِ صالحہ اختیار کرتے ہیں اور ایمان کے منافی تمام افعال سے اجتناب کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ اُنہیں اپنا ولی اور محبوب بنالیتا ہے۔ وہ انہیں کفر، شک اور شبہات کے تاریک غاروں سے نکال کر حق کے روشن اور صاف راستے پر ڈال دیتا ہے۔

اس کے برعکس جو لوگ کفر کو اپناتے ہیں، اُن کے سرپرست اور مددگار شیاطین اور ائمۂ کفر ہوتے ہیں۔ یہ شیاطین کفر و الحاد کو خوشنما بنا کر ان کے سامنے پیش کرتے ہیں اور انہیں صراطِ مستقیم سے ہٹا کر گمراہی و ضلالت کی اندھی وادیوں میں ڈھکیل دیتے ہیں۔

یہاں اللہ تعالیٰ نے خاص حکمت کے ساتھ ''نور'' کو واحد اور ''ظلمات'' کو جمع کے صیغے میں ذکر فرمایا ہے۔ اس لئے کہ حق ہمیشہ ایک رہا ہے اور ہر زمانے میں اس کی صورت ایک ہی ہے، جبکہ باطل اور کفر کی شکلیں متنوع اور گمراہی کے راستے بے شمار ہیں۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِیْ مُسْتَقِیْمًا فَاتَّبِعُوْهُ ۚ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِیْلِهٖ ؕ ذٰلِكُمْ وَصّٰىكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ۝۱۵۳

ترجمہ: ''اور یہ دین میرا راستہ ہے جو مستقیم ہے، سو اس راہ پر چلو اور دوسری راہوں پر مت چلو، کہ وہ راہیں تم کو اللہ کی راہ سے ہٹا دیں گی، اس کا تم کو اللہ تعالیٰ نے تاکیدی حکم دیا ہے تاکہ تم احتیاط رکھو۔'' (سورۃ الانعام ۱۵۳)

آیت نمبر (۲۵۸) اَلَمۡ تَرَ اِلَى الَّذِىۡ حَآجَّ اِبۡرٰهٖمَ فِىۡ رَبِّهٖۤ اَنۡ اٰتٰٮهُ اللّٰهُ الۡمُلۡكَ‌ۘ اِذۡ قَالَ اِبۡرٰهٖمُ رَبِّىَ الَّذِىۡ يُحۡىٖ وَيُمِيۡتُ ۙ قَالَ اَنَا اُحۡىٖ وَاُمِيۡتُ‌ؕ قَالَ اِبۡرٰهٖمُ فَاِنَّ اللّٰهَ يَاۡتِىۡ بِالشَّمۡسِ مِنَ الۡمَشۡرِقِ فَاۡتِ بِهَا مِنَ الۡمَغۡرِبِ فَبُهِتَ الَّذِىۡ كَفَرَ‌ؕ وَاللّٰهُ لَا يَهۡدِى الۡقَوۡمَ الظّٰلِمِيۡنَ ۚ﴿۲۵۸﴾

ترجمہ: ''کیا تم نے اس شخص کو نہیں دیکھا جو ابراہیمؑ سے اس کے رب کے بارے میں جھگڑا کرنے لگا، اس وجہ سے کہ اللہ نے اسے بادشاہی دے رکھی تھی؟ جب ابراہیمؑ نے کہا: میرا رب وہ ہے جو زندگی دیتا ہے اور موت دیتا ہے۔ وہ بولا: میں بھی زندگی دیتا ہوں اور موت دیتا ہوں۔ تو ابراہیمؑ نے کہا: اچھا! اللہ سورج کو مشرق سے نکالتا ہے، تو اسے مغرب سے نکال دے۔ تو وہ کافر حیران و خاموش ہو گیا۔ اور اللہ ظالموں کو ہدایت نہیں دیتا''۔

تفسیر وہ بابل کا بادشاہ ''نمرود بن کنعان'' تھا۔ اس نے حضرت ابراہیمؑ سے استفسار کیا: یہ کون ہے تمہارا رب، جس کی طرف تم ہمیں دعوت دیتے ہو؟ وہ اپنی سرکشی اور کفر پر اس لئے جما رہا کہ طویل مدت تک سلطنت کے نشے نے اُسے غرور میں مبتلا کر دیا تھا اور شیطان نے اس کے دل میں یہ وہم بٹھا دیا تھا کہ وہی ربّ العالمین ہے۔

چنانچہ جب حضرت ابراہیمؑ نے جواب دیا کہ میرا رب وہ ہے جو زندگی عطا کرتا ہے اور موت دیتا ہے، تو اس دل کے اندھے نے غرور سے کہا: میں بھی زندگی دیتا اور موت دیتا ہوں۔

حضرت ابنِ عباسؓ کی روایت ہے کہ نمرود نے اسی مجلس میں دو قیدی منگوائے؛ ایک کو قتل کر دیا اور دوسرے کو آزاد کر دیا۔ اُس نے یہ خیال کیا کہ یہی زندگی دینا اور مار ڈالنا ہے۔ حالانکہ حضرت ابراہیمؑ کا مقصود یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ اپنی قدرت سے انسان کو عدم سے وجود میں لاتا ہے اور پھر ایک مقررہ عمر تک پہنچا کر اُسے موت دیتا ہے۔ جب نمرود اس بات کو نہ سمجھ سکا، تو حضرت ابراہیمؑ نے ایک فیصلہ کُن دلیل دی اور کہا: میرا رب تو وہ ہے جو سورج کو مشرق سے طلوع کرتا ہے، اگر تجھے ربوبیت کا دعویٰ ہے تو تُو اُسے مغرب سے طلوع کر کے دکھا۔ یہ سن کر نمرود مبہوت رہ گیا اور عاجز آ گیا۔

❁❁❁

ترجمہ-آیت نمبر ۲۵۹ سے ۲۶۶ تک

اَوْ كَالَّذِیْ مَرَّ عَلٰی قَرْیَةٍ وَّهِیَ خَاوِیَةٌ عَلٰی عُرُوْشِهَا ۚ قَالَ اَنّٰی یُحْیٖ هٰذِهِ اللّٰهُ بَعْدَ مَوْتِهَا ۚ فَاَمَاتَهُ اللّٰهُ مِائَةَ عَامٍ ثُمَّ بَعَثَهٗ ؕ قَالَ كَمْ لَبِثْتَ ؕ قَالَ لَبِثْتُ یَوْمًا اَوْ بَعْضَ یَوْمٍ ؕ قَالَ بَلْ لَّبِثْتَ مِائَةَ عَامٍ فَانْظُرْ اِلٰی طَعَامِكَ وَشَرَابِكَ لَمْ یَتَسَنَّهْ ۚ وَانْظُرْ اِلٰی حِمَارِكَ وَلِنَجْعَلَكَ اٰیَةً لِّلنَّاسِ وَانْظُرْ اِلَی الْعِظَامِ كَیْفَ نُنْشِزُهَا ثُمَّ نَكْسُوْهَا لَحْمًا ؕ فَلَمَّا تَبَیَّنَ لَهٗ ۙ قَالَ اَعْلَمُ اَنَّ اللّٰهَ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ﴿۲۵۹﴾
وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّ اَرِنِیْ كَیْفَ تُحْیِ الْمَوْتٰی ؕ قَالَ اَوَلَمْ تُؤْمِنْ ؕ قَالَ بَلٰی وَلٰكِنْ لِّیَطْمَىِٕنَّ قَلْبِیْ ؕ قَالَ فَخُذْ اَرْبَعَةً مِّنَ الطَّیْرِ فَصُرْهُنَّ اِلَیْكَ ثُمَّ اجْعَلْ عَلٰی كُلِّ جَبَلٍ مِّنْهُنَّ جُزْءًا ثُمَّ ادْعُهُنَّ یَاْتِیْنَكَ سَعْیًا ؕ وَاعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ عَزِیْزٌ حَكِیْمٌ ﴿۲۶۰﴾ مَثَلُ الَّذِیْنَ یُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ كَمَثَلِ حَبَّةٍ اَنْۢبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ فِیْ كُلِّ سُنْۢبُلَةٍ مِّائَةُ حَبَّةٍ ؕ وَاللّٰهُ یُضٰعِفُ لِمَنْ یَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِیْمٌ ﴿۲۶۱﴾
اَلَّذِیْنَ یُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ ثُمَّ لَا یُتْبِعُوْنَ مَاۤ اَنْفَقُوْا مَنًّا وَّلَاۤ اَذًی ۙ لَّهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَلَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَلَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ ﴿۲۶۲﴾ قَوْلٌ مَّعْرُوْفٌ وَّمَغْفِرَةٌ خَیْرٌ مِّنْ صَدَقَةٍ یَّتْبَعُهَاۤ اَذًی ؕ وَاللّٰهُ غَنِیٌّ حَلِیْمٌ ﴿۲۶۳﴾ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تُبْطِلُوْا صَدَقٰتِكُمْ بِالْمَنِّ وَالْاَذٰی ۙ كَالَّذِیْ یُنْفِقُ مَالَهٗ رِئَآءَ النَّاسِ وَلَا یُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ فَمَثَلُهٗ كَمَثَلِ صَفْوَانٍ عَلَیْهِ تُرَابٌ فَاَصَابَهٗ وَابِلٌ فَتَرَكَهٗ صَلْدًا ؕ لَا یَقْدِرُوْنَ عَلٰی شَیْءٍ مِّمَّا كَسَبُوْا ؕ وَاللّٰهُ لَا یَهْدِی الْقَوْمَ الْكٰفِرِیْنَ ﴿۲۶۴﴾ وَمَثَلُ الَّذِیْنَ یُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ وَتَثْبِیْتًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ كَمَثَلِ جَنَّةٍۭ بِرَبْوَةٍ اَصَابَهَا وَابِلٌ فَاٰتَتْ اُكُلَهَا ضِعْفَیْنِ ۚ فَاِنْ لَّمْ یُصِبْهَا وَابِلٌ فَطَلٌّ ؕ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِیْرٌ ﴿۲۶۵﴾ اَیَوَدُّ اَحَدُكُمْ اَنْ تَكُوْنَ لَهٗ جَنَّةٌ مِّنْ نَّخِیْلٍ وَّاَعْنَابٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۙ لَهٗ فِیْهَا مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ ۙ وَاَصَابَهُ الْكِبَرُ وَلَهٗ ذُرِّیَّةٌ ضُعَفَآءُ ۪ فَاَصَابَهَاۤ اِعْصَارٌ فِیْهِ نَارٌ فَاحْتَرَقَتْ ؕ كَذٰلِكَ یُبَیِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰیٰتِ لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُوْنَ ﴿۲۶۶﴾

ترجمہ:

(۲۵۹)۔کیا تم نے اس شخص کو نہیں دیکھا جو ایک بستی پر گزرا جو اپنی چھتوں سمیت زمین بوس ہو چکی تھی؟ اس نے کہا: اللہ اس کو مرنے کے بعد کیسے زندہ کرے گا؟ تو اللہ نے اسے ایک سو سال کے لیے موت دی، پھر دوبارہ زندہ کیا۔ اللہ نے پوچھا: تم کتنی مدت رہے؟ اس نے کہا: ایک دن یا دن کا کچھ حصہ۔ فرمایا: نہیں، بلکہ تم ایک سو سال پڑے

رہے۔اب اپنے کھانے اور پینے کو دیکھو، وہ خراب نہیں ہوا۔اور اپنے گدھے کو دیکھو (کہ وہ سڑ چکا ہے) تا کہ ہم تمہیں لوگوں کے لیے ایک نشانی بنائیں۔ اب ہڈیوں کو دیکھو کہ ہم کس طرح انہیں اٹھا کر جوڑتے ہیں اور ان پر گوشت چڑھاتے ہیں۔ جب اسے سب کچھ واضح ہو گیا تو کہنے لگا: میں یقین رکھتا ہوں کہ اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔(۲۶۰)۔اور جب ابراہیمؑ نے کہا: اے میرے رب! مجھے دکھا تو مردوں کو کیسے زندہ کرتا ہے؟ فرمایا: کیا تم ایمان نہیں رکھتے؟ عرض کیا: کیوں نہیں، لیکن دل کا اطمینان چاہتا ہوں۔فرمایا: پس چار پرندے پکڑو، پھر انہیں اپنے سے مانوس کرلو، پھر ان کے ٹکڑے کر کے ہر پہاڑ پر ایک ایک رکھ دو، پھر انہیں بلاؤ، وہ تمہارے پاس دوڑتے ہوئے آجائیں گے۔اور جان لو کہ اللہ زبردست، خوب حکمت والا ہے۔(۲۶۱)۔ان لوگوں کی مثال جو اللہ کی راہ میں اپنا مال خرچ کرتے ہیں، اس دانے کی طرح ہے جو سات بالیاں اُگائے اور اس کے ہر بالی میں سو دانے ہوں۔(اسی طرح) اللہ جس کے لیے چاہتا ہے اور بھی بڑھا دیتا ہے۔اور اللہ بڑی وسعت والا، خوب جاننے والا ہے۔(۲۶۲)۔وہ لوگ جو اللہ کی راہ میں اپنا مال خرچ کرتے ہیں، پھر خرچ کے بعد نہ احسان جتاتے ہیں اور نہ تکلیف دیتے ہیں، ان کا اجر ان کے رب کے پاس ہے، اور ان کے لیے نہ کوئی خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔(۲۶۳)۔نرم بات کہنا اور درگزر کرنا اس صدقے سے بہتر ہے جس کے پیچھے ایذا پہنچے۔اور اللہ بے نیاز، حلم والا ہے۔(۲۶۴)۔اے ایمان والو! اپنے صدقات کو احسان جتا کر اور تکلیف دے کر برباد نہ کرو، جیسے وہ شخص جو دکھاوے کے لیے مال خرچ کرتا ہے اور اللہ اور آخرت پر ایمان نہیں رکھتا۔اس کی مثال اس چٹان کی سی ہے جس پر تھوڑی سی مٹی ہو، پھر اس پر زور کی بارش پڑے اور وہ اسے بالکل صاف چٹان بنا دے۔ ایسے لوگ اپنی کمائی میں سے کچھ بھی حاصل نہیں کر سکیں گے۔ اور اللہ کافروں کو ہدایت نہیں دیتا۔(۲۶۵)۔اور جو لوگ اللہ کی رضا کے لیے اور اپنے دلوں کو مضبوط کرنے کے لیے مال خرچ کرتے ہیں، ان کی مثال اس باغ کی طرح ہے جو کسی اونچے مقام پر ہو۔اگر اسے تیز بارش ملے تو دوگنا پھل دیتا ہے، اور اگر تیز بارش نہ ہو تو ہلکی بوندا باندی بھی کافی ہو جاتی ہے۔اور اللہ تمہارے اعمال کو خوب دیکھ رہا ہے۔(۲۶۶)۔کیا تم میں سے کوئی یہ پسند کرے گا کہ اس کا ایک باغ ہو، جس میں کھجوریں اور انگور ہوں، اور اس کے نیچے نہریں بہتی ہوں، اور اس میں ہر قسم کے پھل ہوں، اور وہ خود بڑھاپے کو پہنچ چکا ہو اور اس کے بچے کمزور ہوں، پھر اس باغ پر آگ والا بگولا آ کر گر جائے اور وہ جل جائے؟ اسی طرح اللہ تمہارے لیے اپنی آیات کھول کر بیان کرتا ہے تا کہ تم غور و فکر کرو۔

تفسیر-آیت نمبر ۲۵۹ سے ۲۶۶ تک

آیت نمبر (۲۵۹) اَوۡ كَالَّذِىۡ مَرَّ عَلٰى قَرۡيَةٍ وَّهِىَ خَاوِيَةٌ عَلٰى عُرُوۡشِهَا ۚ قَالَ اَنّٰى يُحۡىٖ هٰذِهِ

اللّٰهُ بَعْدَ مَوْتِهَا ۚ فَاَمَاتَهُ اللّٰهُ مِائَةَ عَامٍ ثُمَّ بَعَثَهٗ ؕ قَالَ كَمْ لَبِثْتَ ؕ قَالَ لَبِثْتُ يَوْمًا اَوْ بَعْضَ يَوْمٍ ؕ قَالَ بَلْ لَّبِثْتَ مِائَةَ عَامٍ فَانْظُرْ اِلٰى طَعَامِكَ وَشَرَابِكَ لَمْ يَتَسَنَّهْ ۚ وَانْظُرْ اِلٰى حِمَارِكَ وَلِنَجْعَلَكَ اٰيَةً لِّلنَّاسِ وَانْظُرْ اِلَى الْعِظَامِ كَيْفَ نُنْشِزُهَا ثُمَّ نَكْسُوْهَا لَحْمًا ؕ فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهٗ ۙ قَالَ اَعْلَمُ اَنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَىْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۲۵۹﴾

ترجمہ: ''کیا تم نے اس شخص کو نہیں دیکھا جو ایک بستی پر گزرا جو اپنی چھتوں سمیت زمین بوس ہو چکی تھی؟ اس نے کہا: اللہ اس کو مرنے کے بعد کیسے زندہ کرے گا؟ تو اللہ نے اسے ایک سو سال کے لیے موت دی، پھر دوبارہ زندہ کیا۔ اللہ نے پوچھا: تم کتنی مدت رہے؟ اس نے کہا: ایک دن یا دن کا کچھ حصہ۔ فرمایا: نہیں، بلکہ تم ایک سو سال پڑے رہے۔ اب اپنے کھانے اور پینے کو دیکھو، وہ خراب نہیں ہوا۔ اور اپنے گدھے کو دیکھو (کہ وہ سڑ چکا ہے) تاکہ ہم تمہیں لوگوں کے لیے ایک نشانی بنائیں۔ اب ہڈیوں کو دیکھو کہ ہم کس طرح انہیں اٹھا کر جوڑتے ہیں اور ان پر گوشت چڑھاتے ہیں۔ جب اسے سب کچھ واضح ہو گیا تو کہنے لگا: میں یقین رکھتا ہوں کہ اللہ ہر چیز پر قادر ہے''۔

تفسیر

مرنے کے بعد دوبارہ زندہ ہونا

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے موت کے بعد دوبارہ زندہ کیے جانے کی ایک عظیم دلیل اور زبردست ثبوت پیش فرمایا ہے، جسے ہر انسان قیامت سے پہلے اسی دنیا میں سمجھ سکتا ہے۔ اور جس شخص کے ساتھ یہ واقعہ پیش آیا، اس کی شخصیت کے بارے میں مختلف اقوال ملتے ہیں۔ بعض نے کہا وہ عزیرؑ تھے، کسی نے کہا حضرت خضرؑ تھے، اور مجاہد کا قول ہے کہ وہ بنی اسرائیل کا ایک عام شخص تھا۔ کیونکہ واقعے کے قرائن بتاتے ہیں کہ وہ اللہ کی اس قدرت میں شک رکھتا تھا کہ مردوں کو کس طرح دوبارہ زندہ کیا جائے گا۔ اس لئے غالب بات یہی ہے کہ وہ کوئی نبی نہ تھا بلکہ ایک عام انسان تھا جو قیامت کے بعد کی زندگی پر شبہ میں مبتلا تھا۔

یہ شخص ایک ایسی اجڑی ہوئی بستی کے قریب سے گزرا جو مکمل طور پر ویران ہو چکی تھی اور اس کے رہنے والے سب ہلاک ہو گئے تھے۔ اس کے ذہن میں یہ خیال آیا کہ ان مردوں کو اللہ کس طرح دوبارہ زندہ کرے گا؟ اللہ تعالیٰ نے اس پر اور دوسروں کے لئے نشانِ عبرت بنانے کی خاطر اُسے ایک سو سال کے لئے موت دے دی۔ اس کا گدھا بھی مر گیا، لیکن اس کے پاس کھانے پینے کی جو چیزیں تھیں وہ بالکل تازہ رہیں اور ان میں ذرا بھی تبدیلی نہ آئی۔

جب اللہ تعالیٰ نے اُسے دوبارہ زندہ کیا تو پوچھا: تم کتنے دن اس حال میں رہے؟ اُس نے کہا: شاید ایک دن

یا اس سے بھی کم۔ اللہ تعالیٰ نے انبیاء کے ذریعے اسے بتا دیا کہ وہ پورے سو سال مردہ رہا ہے۔ پھر فرمایا: ذرا اپنے کھانے پینے کی چیزوں کو دیکھو، وہ جوں کی توں ہیں، اور اپنے گدھے کو دیکھو کہ اس کی ہڈیاں بوسیدہ ہو چکی ہیں۔ پھر اللہ تعالیٰ نے اس کی آنکھوں کے سامنے اُس گدھے کو زندہ کر دیا۔ یہ منظر دیکھ کر وہ بے ساختہ پکار اٹھا: اب مجھے پورا یقین ہو گیا کہ اللہ ہر چیز پر قادر ہے اور یقیناً قیامت کے دن سب کو زندہ فرمائے گا۔

آیت نمبر (۲۶۰) وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّ اَرِنِیْ كَیْفَ تُحْیِ الْمَوْتٰىؕ قَالَ اَوَلَمْ تُؤْمِنْؕ قَالَ بَلٰى وَلٰكِنْ لِّیَطْمَىٕنَّ قَلْبِیْؕ قَالَ فَخُذْ اَرْبَعَةً مِّنَ الطَّیْرِ فَصُرْهُنَّ اِلَیْكَ ثُمَّ اجْعَلْ عَلٰى كُلِّ جَبَلٍ مِّنْهُنَّ جُزْءًا ثُمَّ ادْعُهُنَّ یَاْتِیْنَكَ سَعْیًاؕ وَاعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ عَزِیْزٌ حَكِیْمٌ ﴿۲۶۰﴾

ترجمہ: ''اور جب ابراہیمؑ نے کہا: اے میرے رب! مجھے دکھا تو مردوں کو کیسے زندہ کرتا ہے؟ فرمایا: کیا تم ایمان نہیں رکھتے؟ عرض کیا: کیوں نہیں، لیکن دل کا اطمینان چاہتا ہوں۔ فرمایا: پس چار پرندے پکڑو، پھر انہیں اپنے سے مانوس کر لو، پھر ان کے ٹکڑے کر کے ہر پہاڑ پر ایک ایک رکھ دو، پھر انہیں بلاؤ، وہ تمہارے پاس دوڑتے ہوئے آ جائیں گے۔ اور جان لو کہ اللہ زبردست، خوب حکمت والا ہے''۔

تفسیر یہ مرنے کے بعد زندہ کیے جانے کی ایک عظیم دلیل ہے، جو اللہ تعالیٰ نے اپنے خلیل حضرت ابراہیمؑ کے ہاتھوں ظاہر فرمائی۔ حضرت ابراہیمؑ نے اپنے رب سے عرض کیا: اے پروردگار! میں اپنی آنکھوں سے یہ منظر دیکھنا چاہتا ہوں کہ تو مُردوں کو کس طرح زندہ فرماتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: کیا تم اس حقیقت پر ایمان نہیں رکھتے؟ حضرت ابراہیمؑ نے عرض کیا: اے رب! ایمان تو ہے کہ تو مُردوں کو زندہ کرے گا اور انہیں ان کے اعمال کی جزا دے گا، مگر میں اس حقیقت کو ''عین الیقین'' کے درجے تک پہنچانا چاہتا ہوں تاکہ میرا دل پوری طرح مطمئن ہو جائے۔

اللہ تعالیٰ نے ان کی دعا قبول فرمائی اور فرمایا: چار پرندے لو، انہیں ذبح کر کے اُن کے گوشت کو ایک ساتھ ملا دو اور مختلف پہاڑوں پر رکھ دو، پھر انہیں پکارو، وہ زندہ ہو کر اُڑتے ہوئے تمہارے پاس آ جائیں گے۔ حضرت ابراہیمؑ نے ایسا ہی کیا اور اپنی آنکھوں سے اس حقیقت کو دیکھ لیا کہ مردوں کو زندہ کرنا اللہ تعالیٰ کے لئے کس قدر آسان ہے۔

اہلِ علم کا اس پر اتفاق ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کو اللہ تعالیٰ کی قدرت میں کوئی شک نہ تھا۔ اُن کی طلب کا مقصد یہ نہ تھا کہ وہ ایمان کو ثابت کریں بلکہ یہ تھا کہ قدرتِ الٰہیہ کا مشاہدہ اپنی آنکھوں سے کر کے مزید اطمینانِ قلب حاصل کریں۔ جیسا کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''کوئی خبر آنکھوں سے دیکھ لینے جیسی نہیں ہوتی''۔ (مسند احمد)

اس آیت سے متعلق بعض غیر مسلموں کے اعتراض کا جواب:

اعتراض: بعض لوگوں کا اس آیت پر اعتراض ہے کہ یہ کیسے ممکن ہے کہ چار پرندے لے کر اپنے سے مانوس کرلو، پھر ان کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے پہاڑوں پر رکھ دو اور پھر بلاؤ تو وہ زندہ ہو کر آئیں گے، یہ تو قانون فطرت کے خلاف ہے؟

جواب: اس کا ایک جواب یہ ہے کہ قرآن کے مطابق حضرت ابراہیمؑ نے اللہ سے سوال کیا: ''اے رب! مجھے دکھا کہ تو مردوں کو کیسے زندہ کرے گا؟'' (البقرہ:۲۶۰) تو اللہ نے جواب دیا: ''کیا تم ایمان نہیں رکھتے؟'' فرمایا: ''ایمان رکھتا ہوں مگر دل کے اطمینان کے لیے چاہتا ہوں''۔ اس پر اللہ نے ان کو تمثیل کے ذریعے سمجھایا۔ لفظ ''فَصُرْهُنَّ'' کے معنٰی ہیں: ''اپنے قریب کرلو، مانوس بنالو'' (جیسا کہ مفسرین معالم التنزیل، شاہ عبدالقادرؒ وغیرہ نے کیا ہے)، اس کا مطلب یہ ہے کہ پرندے مانوس کر کے مختلف پہاڑوں پر چھوڑ دو، پھر آواز دو گے تو وہ فوراً لوٹ آئیں گے۔

اس طرح اللہ نے حضرت ابراہیمؑ کو سمجھایا کہ جب چند دن کی انسیت سے پرندے تمہاری آواز پر فوراً آجاتے ہیں، تو وہ اللہ جس نے آسمان و زمین کو بنایا ہے، وہ اپنے حکم سے مرے ہوئے انسانوں کو قیامت کے دن زندہ کر کے اپنی طرف کیوں نہیں بلالے گا؟ لہٰذا یہ آیت معجزہ بھی ہے اور تمثیل بھی۔ اس کا مقصد ''قانون فطرت توڑنا'' نہیں، بلکہ ''اللہ کی قدرت کو سمجھانا'' ہے۔

دوسرا عقلی پہلو یہ نکلتا ہے کہ اگر خالق نے کائنات کو ابتدا میں بغیر کسی مثال کے پیدا کر دیا تو دوبارہ زندہ کرنا اس کے لیے زیادہ آسان ہے۔ یہاں پرندوں کی مثال صرف سمجھانے کے لیے دی گئی ہے تاکہ ابراہیمؑ کو یقین اور دل کا سکون ملے۔ انسانی عقل خود تسلیم کرتی ہے کہ اگر انسان کو اطاعت اور انسیت کے ذریعے اپنے تابع بنایا جا سکتا ہے، تو خالق کی قدرت کے تابع مخلوقات کا دوبارہ زندہ ہونا کوئی بعید نہیں۔

اسی طرح سائنسی پہلو اس کا یہ نکلتا ہے کہ جب Neuroscience Biology: جانوروں اور پرندوں کو ٹریننگ اور conditioning سے اس قابل بنایا جا سکتا ہے کہ وہ آواز سنتے ہی فوراً آجائیں (جیسے falcons,trained pigeons وغیرہ)۔

حضرت ابراہیمؑ کے واقعے میں بھی یہی اصول دکھایا گیا ہے کہ مانوس پرندے اپنے مالک کی آواز پر ہر حال میں لوٹتے ہیں ماڈرن سائنس بھی یہ مانتی ہے کہ جسم کے بکھرے ذرات (molecules,atoms) فنا نہیں ہوتے بلکہ موجود رہتے ہیں۔ قرآن بار بار کہتا ہے کہ اللہ ان کو دوبارہ جمع کر سکتا ہے۔ (سورہ ق:4، یس:78-79)۔ آج ''DNA'' سے یہ حقیقت سامنے ہے کہ مردہ جسم کے ذرات میں بھی ''زندگی کی نشانی'' محفوظ رہتی ہے۔ لہٰذا قرآن کا پیغام سائنسی طور پر یہ ہے کہ: جیسے پرندے آواز پر لوٹ آتے ہیں، ویسے ہی قیامت کے دن اللہ کے حکم سے بکھرے ذرات دوبارہ لوٹ آئیں گے۔

۱۔قانونِ بقائے مادہ (Law of Conservation of Matter):

سائنس کہتی ہے: Matter نہ پیدا کیا جاسکتا ہے نہ فنا کیا جاسکتا ہے، صرف شکل بدلتی ہے۔انسان جب مرجاتا ہے تو اس کا جسم خاک میں مل جاتا ہے، لیکن اس کے اجزاء (molecules, atoms) زمین میں موجود رہتے ہیں۔اگر انسان ان ذرات کو دوبارہ جمع کرلے تو زندگی کی صورت دوبارہ آسکتی ہے۔یہی قرآن کا دعویٰ ہے: ''ہم زمین میں جو کچھ ڈالتے ہیں ہمیں سب معلوم ہے''۔(ق:4) لہٰذا پرندوں کے بکھرنے اور دوبارہ جمع ہونے کا تصور سائنسی اصول کے مطابق ہے۔

۲۔DNA اور Life Code:

آج DNA کو ''زندگی کا کوڈ'' کہا جاتا ہے۔انسان یا پرندے کے جسم کا ایک چھوٹا سا خلیہ (cell) بھی اس کی مکمل پہچان اور زندگی کی programming اپنے اندر رکھتا ہے۔سائنسدان آج extinct جانوروں (جیسے mammoth) کو DNA سے دوبارہ زندہ کرنے کی کوشش کررہے ہیں۔اس سے ثابت ہوتا ہے کہ بکھرے ذرات سے دوبارہ زندگی پیدا کرنا سائنس کے مطابق ممکن ہے۔قرآن کا پیغام بھی یہی ہے کہ اللہ کے حکم سے ذرات اور DNA دوبارہ assemble ہوکر زندہ ہوسکتے ہیں۔

Training اور Conditioning:

سائنسی psychology میں Pavlov's Experiment مشہور ہے: یعنی ایک کتے کو بار بار گھنٹی کے ساتھ کھانا دیا گیا۔کچھ دنوں بعد صرف گھنٹی بجانے پر بھی کتا دوڑتا ہوا آگیا۔اسی طرح trained pigeons اور falcons کو بھی آواز یا whistle پر واپس بلایا جاسکتا ہے۔حضرت ابراہیمؑ کے واقعے میں یہی نکتہ ہے: پرندے مانوس ہوکر آواز پر واپس آگئے۔یہ قانونِ فطرت کے خلاف نہیں بلکہ سائنس کے عین مطابق ہے۔

Electromagnetic Waves کی مثال:

آج ہم دیکھتے ہیں کہ ایک ریموٹ کنٹرول سگنل یا GPS سے دور موجود پرندے یا جانوروں کو واپس بلایا جاسکتا ہے۔پرندوں میں homing instinct (گھر واپسی کی جبلت) ہوتی ہے۔کبوتر ہزاروں میل دور سے بھی اپنے گھر لوٹ آتا ہے۔اگر یہ قدرتی signal اور انسان کا بنایا ہوا system ممکن ہے، تو اللہ کے حکم سے مردے دوبارہ زندہ ہونا کیسے ناممکن ہوسکتا ہے؟

Cloning (ڈولی بھیڑ کی مثال):

1996ء میں سائنسدانوں نے ایک عام بھیڑ کے DNA سے ایک نئی بھیڑ ''ڈولی'' پیدا کی۔مطلب: ایک چھوٹے سے خلیے (cell) سے مکمل جانور دوبارہ زندہ بنایا جاسکتا ہے۔اگر انسان DNA سے زندگی تخلیق کرسکتا ہے تو اللہ

جس نے DNA بنایا، وہ قیامت کے دن بکھرے ذرات کو کیوں جمع نہیں کر سکتا؟

Cryonics اور Revival:

آج کی سائنس میں Cryonics ہے: مرنے والے انسانوں کو ultra-low temperature پر محفوظ کر دیا جاتا ہے تاکہ مستقبل میں دوبارہ زندہ کیا جا سکے۔ یہ تجربات بتاتے ہیں کہ موت کے بعد revival انسان کی سائنس میں بھی ایک سنجیدہ research topic ہے۔ جب انسان اتنی کوششیں کر رہا ہے، تو اللہ کے لیے یہ کیسے ناممکن ہو سکتا ہے جس نے زندگی کو پیدا ہی کیا ہے؟

Modern AI اور Brain Uploading:

کچھ سائنسدان ''brain uploading'' پر کام کر رہے ہیں، جس میں انسانی memory اور consciousness کو computer میں محفوظ کر کے دوبارہ بحال کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ یہ بھی اس بات کی علامت ہے کہ انسان خود زندگی اور شعور کو دوبارہ بنانے کا خواب دیکھ رہا ہے۔ اللہ جس نے اصل consciousness بنایا، اس کے لیے تو دوبارہ زندہ کرنا اور بھی آسان ہے۔

نفسیاتی پہلو سے جواب کی صورت یہ ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے سوال ایمان کی کمی سے نہیں بلکہ اطمینانِ قلب کے لیے کیا۔ یہ انسانی فطرت ہے کہ دل کو یقین بڑھانے کے لیے مثال یا Demonstration چاہیے۔ قرآن نے اس واقعے کو بیان کر کے بتایا کہ سوال کرنا برا نہیں، بلکہ جواب سے دل کا یقین اور ایمان اور زیادہ مضبوط ہو جاتا ہے۔ بنی نوع انسان کی نفسیات بھی یہی ہے کہ مشاہدہ، مثال اور تجربہ یقین کو مزید مستحکم کرتے ہیں۔

خلاصہ

۱۔ یہ واقعہ معجزہ اور تمثیل ہے، مقصد ''قدرتِ الٰہی'' سمجھانا ہے۔ ۲۔ سائنسی طور پر trained birds آواز پر لوٹ آتے ہیں، قرآن نے اسی کو دلیل بنایا۔ ۳۔ قیامت کے دن مردوں کا دوبارہ زندہ ہونا بھی اللہ کے حکم پر اتنا ہی ممکن ہے جیسے مانوس پرندے آواز پر واپس آتے ہیں۔ ۴۔ یہ عقل، فطرت اور نفسیات سب کے مطابق ہے، خلاف نہیں۔

اس طرح یہ آیت قانونِ فطرت کے خلاف نہیں بلکہ قانونِ فطرت کی بہترین مثال ہے۔ جیسے مانوس پرندے اپنے مالک کی آواز پر فوراً لوٹ آتے ہیں، ویسے ہی قیامت کے دن اللہ کے حکم پر مردے دوبارہ زندہ ہو کر اٹھ کھڑے ہوں گے۔

اسی طرح Matter فنا نہیں ہوتا، دوبارہ جمع ہو سکتا ہے Resurrection ممکن۔ DNA میں زندگی کا مکمل کوڈ محفوظ ہے دوبارہ Life ممکن۔ Conditioning اور Training سے پرندے آواز پر واپس آتے ہیں واقعہ منطقی ہے۔ Homing

instinct اور modern remote control systems قرآن کا بیان سائنس سے ہم آہنگ ہے۔

قرآن کا واقعہ سائنس کے بھی خلاف نہیں، بلکہ آج کا DNA، Conditioning اور Conservation of Matter کا قانون اس کی تائید کرتا ہے۔ جس خالق نے ذرے ذرے میں زندگی کا کوڈ رکھا ہے، وہ قیامت کے دن انہیں اکٹھا کر کے دوبارہ زندہ کیوں نہیں کر سکتا؟

قرآن میں پرندوں کی مثال اصل میں یہ سمجھانے کے لیے ہے کہ جیسے مانوس پرندے آواز پر واپس آتے ہیں، ویسے ہی قیامت کے دن بکھرے ذرات اللہ کے حکم پر دوبارہ زندہ ہو جائیں گے۔ آج کا DNA، cloning، revival experiments اور cryonics سب یہی بتا رہے ہیں کہ زندگی دوبارہ بنانا ممکن ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ انسان ابھی کوشش کر رہا ہے، اور اللہ اسے پہلے دن سے کر رہا ہے۔ یعنی آج انسان DNA سے extinct جانور واپس لانے کی کوشش کر رہا ہے، cryonics سے مردوں کو revive کرنا چاہتا ہے، اور brain uploading سے شعور محفوظ کرنا چاہتا ہے۔ جب انسان یہ سوچ سکتا ہے تو خالقِ کائنات کے لیے بکھرے ہوئے ذروں کو دوبارہ زندہ کرنا کیوں ناممکن ہو؟ یہی قرآن کا پیغام ہے!

آیت نمبر (۲۶۱) مَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ كَمَثَلِ حَبَّةٍ اَنْۢبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ فِيْ كُلِّ سُنْۢبُلَةٍ مِّائَةُ حَبَّةٍ ؕ وَاللّٰهُ يُضٰعِفُ لِمَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ﴿۲۶۱﴾

ترجمہ: ''ان لوگوں کی مثال جو اللہ کی راہ میں اپنا مال خرچ کرتے ہیں، اس دانے کی طرح ہے جو سات بالیاں اُگائے اور اس کے ہر بالی میں سو دانے ہوں۔ (اسی طرح) اللہ جس کے لیے چاہتا ہے اور بھی بڑھا دیتا ہے۔ اور اللہ بڑی وسعت والا، خوب جاننے والا ہے''۔

تفسیر اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اپنی راہ میں خرچ کرنے کی ترغیب دی ہے۔ ''فی سبیل اللہ'' سے مراد وہ تمام راستے ہیں جو انسان کو اللہ تک پہنچاتے ہیں۔ خواہ وہ جہاد فی سبیل اللہ ہو، مسلمانوں کے لئے نفع بخش اعمال کی انجام دہی ہو، مفید علوم کی اشاعت ہو یا فقراء و مساکین پر خرچ کرنا ہو، یہ سب اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کے درجے میں آتے ہیں، اور اللہ تعالیٰ ان نیکیوں کو کئی گنا بڑھا دیتا ہے۔

● صحیحین میں حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ابنِ آدم کے نیک عمل کو اللہ تعالیٰ بڑھاتا ہے، ایک نیکی دس گنا سے لے کر سات سو گنا تک بڑھتی ہے۔ (مسلم: ۳۳۷)

● اسی طرح حضرت عبداللہ بن مسعودؓ روایت کرتے ہیں کہ ایک شخص رسول اللہ ﷺ کے پاس ایک اونٹ

لے کر آیا اور عرض کیا کہ میں اسے اللہ کی راہ میں صدقہ کرتا ہوں۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اس کے بدلے قیامت کے دن اللہ تعالیٰ تمہیں سات سو اونٹنیاں عطا فرمائے گا۔ (مسلم: ۴۸۹۷)

● حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: جو شخص حلال کمائی سے ایک کھجور کے برابر بھی صدقہ کرے بی اور اللہ تعالیٰ صرف حلال کمائی کو قبول فرماتا ہے، تو اللہ تعالیٰ اسے اپنے داہنے ہاتھ سے قبول کرتا ہے اور پھر اسے صدقہ کرنے والے کے حق میں اس طرح بڑھاتا ہے، جیسے کوئی شخص اپنے جانور کے بچے کو کھلا پلا کر بڑا کرتا ہے، یہاں تک کہ وہ صدقہ پہاڑ کے برابر ہو جاتا ہے۔ (بخاری: ۱۴۱۰)

آیت نمبر (۲۶۲) اَلَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ثُمَّ لَا يُتْبِعُوْنَ مَآ اَنْفَقُوْا مَنًّا وَّلَآ اَذًى ۙ لَّهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۲۶۲﴾

ترجمہ: ''وہ لوگ جو اللہ کی راہ میں اپنا مال خرچ کرتے ہیں، پھر خرچ کے بعد نہ احسان جتاتے ہیں اور نہ تکلیف دیتے ہیں، ان کا اجر ان کے رب کے پاس ہے، اور ان کے لیے نہ کوئی خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے''۔

تفسیر اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے خوشخبری سنائی ہے کہ اگر کوئی بندہ اپنی دولت صرف اللہ کی رضا کے لئے خرچ کرے، اور دینے کے بعد نہ احسان جتائے، نہ دوسروں کے سامنے ذکر کر کے لینے والے کے دل کو دکھائے، تو ایسے مخلص خرچ کرنے والوں کے لئے اللہ تعالیٰ نے خاص اجر و انعام رکھا ہے۔ قیامت کے دن اُن پر نہ خوف کا سایہ ہوگا اور نہ ہی غم کی کوئی پرچھائی۔

آیت نمبر (۲۶۳) قَوْلٌ مَّعْرُوْفٌ وَّمَغْفِرَةٌ خَيْرٌ مِّنْ صَدَقَةٍ يَّتْبَعُهَآ اَذًى ۗ وَاللّٰهُ غَنِيٌّ حَلِيْمٌ ﴿۲۶۳﴾

ترجمہ: ''نرم بات کہنا اور درگزر کرنا اس صدقے سے بہتر ہے جس کے پیچھے ایذا پہنچے۔ اور اللہ بے نیاز، حلم والا ہے''۔

تفسیر اسی لئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اگر کوئی شخص سائل کو کچھ دینے کی استطاعت نہ رکھتا ہو تو بہتر ہے کہ نرم لہجے میں معذرت کرے، اور اگر سائل کسی بات سے دل آزاری کرے تو صبر و درگزر سے کام لے۔ یہ طرزِ عمل اُس صدقے اور خیرات سے کہیں بڑھ کر ہے جس کے بعد لینے والے کو طعن و ملامت کا نشانہ بنایا جائے، احسان جتلایا جائے یا

دوسروں کے سامنے فخر سے بیان کیا جائے کہ میں نے فلاں کو صدقہ دیا۔

صحیح مسلم کی روایت ہے کہ حضرت ابوذر غفاریؓ بیان کرتے ہیں: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، قیامت کے دن اللہ تعالیٰ تین قسم کے آدمیوں سے نہ بات کرے گا، نہ اُن پر نظرِ کرم فرمائے گا اور نہ ہی انہیں پاکیزگی بخشے گا، بلکہ اُن کے لئے دردناک عذاب ہوگا۔ یہ وہ لوگ ہیں: (۱) صدقہ دے کر احسان جتانے والے، (۲) ٹخنوں سے نیچے کپڑا لٹکانے والے، اور (۳) جھوٹی قسم کھا کر اپنا سامان بیچنے والے۔ (مسلم:۲۹۴)

اسی طرح حضرت ابو ہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اچھی بات کہنا بھی صدقہ ہے''۔ (بخاری:۲۹۸۹)

آیت نمبر (۲۶۴) يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُبْطِلُوْا صَدَقٰتِكُمْ بِالْمَنِّ وَالْاَذٰى ۙ كَالَّذِيْ يُنْفِقُ مَالَهٗ رِئَآءَ النَّاسِ وَلَا يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ فَمَثَلُهٗ كَمَثَلِ صَفْوَانٍ عَلَيْهِ تُرَابٌ فَاَصَابَهٗ وَابِلٌ فَتَرَكَهٗ صَلْدًا ؕ لَا يَقْدِرُوْنَ عَلٰى شَيْءٍ مِّمَّا كَسَبُوْا ؕ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۲۶۴﴾

ترجمہ: ''اے ایمان والو! اپنے صدقات کو احسان جتا کر اور تکلیف دے کر برباد نہ کرو، جیسے وہ شخص جو دکھاوے کے لیے مال خرچ کرتا ہے اور اللہ اور آخرت پر ایمان نہیں رکھتا۔ اس کی مثال اس چٹان کی سی ہے جس پر تھوڑی سی مٹی ہو، پھر اس پر زور کی بارش پڑے اور وہ اسے بالکل صاف چٹان بنا دے۔ ایسے لوگ اپنی کمائی میں سے کچھ بھی حاصل نہیں کر سکیں گے۔ اور اللہ کافروں کو ہدایت نہیں دیتا''۔

تفسیر اس آیت اور اس کے بعد آنے والی آیات میں اللہ تعالیٰ نے مال خرچ کرنے والوں کی تین قسمیں بیان کی ہیں اور پھر ان کی تین مثالیں بھی ذکر فرمائی ہیں۔

پہلی قسم یہ اُن لوگوں کی ہے جو محض دکھاوا کرنے کے لئے خرچ کرتے ہیں۔ نہ اُن کا اللہ پر ایمان ہوتا ہے اور نہ ثواب کی نیت۔ اُن کے دل سخت اور بے حس پتھر کی مانند ہیں، جن پر اوپر سے معمولی سی مٹی جمی ہو۔ دیکھنے والا یہ گمان کرتا ہے کہ بارش برسے گی تو اس مٹی میں سبزہ اگے گا۔ لیکن جب بارش برستی ہے تو مٹی بہہ جاتی ہے اور اندر سے وہی سخت پتھر ظاہر ہو جاتا ہے۔ یہی حال اُس شخص کے دل کا ہے جو ریاکاری کے لئے خرچ کرتا ہے۔ وہ دل ایمان سے خالی، اللہ کی یاد سے بے اثر اور اُس کے خوف سے محروم ہوتا ہے، اس لئے نہ اس میں خشوع پیدا ہوتا ہے اور نہ عاجزی۔

آیت نمبر (۲۶۵) وَمَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ وَتَثْبِيْتًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ كَمَثَلِ جَنَّةٍۢ بِرَبْوَةٍ اَصَابَهَا وَابِلٌ فَاٰتَتْ اُكُلَهَا ضِعْفَيْنِ ۚ فَاِنْ لَّمْ يُصِبْهَا وَابِلٌ فَطَلٌّ ؕ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴿۲۶۵﴾

ترجمہ: ''اور جو لوگ اللہ کی رضا کے لیے اور اپنے دلوں کو مضبوط کرنے کے لیے مال خرچ کرتے ہیں، ان کی مثال اس باغ کی طرح ہے جو کسی اونچے مقام پر ہو۔ اگر اسے تیز بارش ملے تو دوگنا پھل دیتا ہے، اور اگر تیز بارش نہ ہو تو ہلکی بوندا باندی بھی کافی ہو جاتی ہے۔ اور اللہ تمہارے اعمال کو خوب دیکھ رہا ہے''۔

تفسیر دوسری قسم یہ اُن لوگوں کی ہے جو اللہ کی رضا کے لیے سچے دل سے خرچ کرتے ہیں۔ ان کی مثال اُس بلند و بالا باغ کی مانند ہے جو ہوا اور سورج کی کرنوں سے بھرپور فائدہ اٹھاتا ہے اور جہاں پانی بھی وافر مقدار میں موجود ہوتا ہے۔ نتیجتاً یہ باغ سرسبز و شاداب رہتا ہے اور اگر کبھی پانی کافی نہ ہو تو شبنم ہی اُس کی شادابی اور نمو کے لیے کافی ہو جاتی ہے۔ کیونکہ اس باغ کی مٹی اتنی زرخیز اور نرم ہے کہ معمولی سی شبنم بھی درختوں کی بڑھوتری اور لہلہاہٹ کے لیے کافی ہو جاتی ہے۔

آیت نمبر (۲۶۶) اَيَوَدُّ اَحَدُكُمْ اَنْ تَكُوْنَ لَهٗ جَنَّةٌ مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّاَعْنَابٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۙ لَهٗ فِيْهَا مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ ۙ وَاَصَابَهُ الْكِبَرُ وَلَهٗ ذُرِّيَّةٌ ضُعَفَآءُ ۪ فَاَصَابَهَآ اِعْصَارٌ فِيْهِ نَارٌ فَاحْتَرَقَتْ ؕ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُوْنَ ﴿۲۶۶﴾

ترجمہ: ''کیا تم میں سے کوئی یہ پسند کرے گا کہ اس کا ایک باغ ہو، جس میں کھجوریں اور انگور ہوں، اور اس کے نیچے نہریں بہتی ہوں، اور اس میں ہر قسم کے پھل ہوں، اور وہ خود بڑھاپے کو پہنچ چکا ہو اور اس کے بچے کمزور ہوں، پھر اس باغ پر آگ والا بگولا آ کر گر جائے اور وہ جل جائے؟ اسی طرح اللہ تمہارے لیے اپنی آیات کھول کر بیان کرتا ہے تاکہ تم غور و فکر کرو''۔

تفسیر تیسری قسم یہ اُن لوگوں کی ہے جو اللہ کی راہ میں خرچ ضرور کرتے ہیں، مگر خرچ کے بعد احسان جتاتے ہیں، لوگوں کو بتاتے ہیں اور اس طرح محتاج و ضرورتمند کو تکلیف پہنچاتے ہیں، جس کے سبب ان کے اعمال ضائع ہو جاتے ہیں۔ ایسی مثال اُس بوڑھے شخص کی ہے جس کے پاس کھجوروں اور انگوروں کا باغ ہو، جس کے نیچے نہریں بہتی ہوں اور جس میں ہر قسم کے پھل موجود ہوں۔ اچانک ایک سخت آندھی آتی ہے، جس میں آگ کے انگارے ہوں، اور باغ کو

بھسم کر دیتی ہے، اور باغ والا کچھ بھی حاصل نہیں کر پاتا۔

دنیا میں نیک اعمال کرنے والے تینوں قسموں میں سے کسی ایک میں شامل ہوتے ہیں۔ مسلمان کو چاہیے کہ وہ اپنی نیت کا ہمیشہ محاسبہ کرے اور ہر ممکن کوشش کرے کہ اس کا ہر نیک عمل صرف اللہ کی رضا کے لیے ہو، تا کہ آخرت میں ذلت، رسوائی اور نقصان کا سامنا نہ کرنا پڑے۔

حضرت عمرؓ سے روایت ہے کہ ایک مالدار شخص کی مثال ایسی ہے جو اللہ کی اطاعت میں مشغول رہتا ہے، پھر اللہ تعالیٰ شیطان کو اس پر غالب کر دیتا ہے، تو وہ گناہوں میں مگن ہو جاتا ہے اور اس کے نیک اعمال سب ضائع ہو جاتے ہیں۔ **(بخاری رقم: ۴۵۳۸)**

❁❁❁

ترجمہ- آیت نمبر ۲۶۷ سے ۲۷۴ تک

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْفِقُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا كَسَبْتُمْ وَمِمَّآ اَخْرَجْنَا لَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ ۖ وَلَا تَيَمَّمُوا الْخَبِيْثَ مِنْهُ تُنْفِقُوْنَ وَلَسْتُمْ بِاٰخِذِيْهِ اِلَّآ اَنْ تُغْمِضُوْا فِيْهِ ۭ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ حَمِيْدٌ ﴿۲۶۷﴾ اَلشَّيْطٰنُ يَعِدُكُمُ الْفَقْرَ وَيَاْمُرُكُمْ بِالْفَحْشَاۗءِ ۚ وَاللّٰهُ يَعِدُكُمْ مَّغْفِرَةً مِّنْهُ وَفَضْلًا ۭ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ﴿۲۶۸﴾ يُّؤْتِي الْحِكْمَةَ مَنْ يَّشَاۗءُ ۚ وَمَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ اُوْتِيَ خَيْرًا كَثِيْرًا ۭ وَمَا يَذَّكَّرُ اِلَّآ اُولُوا الْاَلْبَابِ ﴿۲۶۹﴾ وَمَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ نَّفَقَةٍ اَوْ نَذَرْتُمْ مِّنْ نَّذْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُهٗ ۭ وَمَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ اَنْصَارٍ ﴿۲۷۰﴾ اِنْ تُبْدُوا الصَّدَقٰتِ فَنِعِمَّا هِيَ ۚ وَاِنْ تُخْفُوْهَا وَتُؤْتُوْهَا الْفُقَرَاۗءَ فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۭ وَيُكَفِّرُ عَنْكُمْ مِّنْ سَيِّاٰتِكُمْ ۭ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ﴿۲۷۱﴾ لَيْسَ عَلَيْكَ هُدٰىهُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَاۗءُ ۭ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ فَلِاَنْفُسِكُمْ ۭ وَمَا تُنْفِقُوْنَ اِلَّا ابْتِغَاۗءَ وَجْهِ اللّٰهِ ۭ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ يُّوَفَّ اِلَيْكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تُظْلَمُوْنَ ﴿۲۷۲﴾ لِلْفُقَرَاۗءِ الَّذِيْنَ اُحْصِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ ضَرْبًا فِي الْاَرْضِ ۡ يَحْسَبُهُمُ الْجَاهِلُ اَغْنِيَاۗءَ مِنَ التَّعَفُّفِ ۚ تَعْرِفُهُمْ بِسِيْمٰهُمْ ۚ لَا يَسْـَٔـلُوْنَ النَّاسَ اِلْحَافًا ۭ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ ﴿۲۷۳﴾ اَلَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ بِالَّيْلِ وَالنَّهَارِ سِرًّا وَّعَلَانِيَةً فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۲۷۴﴾

ترجمہ:

(۲۶۷)۔اے ایمان والو! اپنے مال میں سے بہترین چیزیں خرچ کرو جو تم نے کمائی ہیں، اور وہ چیزیں بھی جو ہم نے زمین سے تمہارے لیے نکالی ہیں۔اور ایسی خراب چیز خرچ کرنے کا ارادہ نہ کرو، جسے اگر تمہیں دی جائے تو تم خود اسے لینا پسند نہ کرو، مگر آنکھ بند کر کے۔اور جان لو کہ اللہ بے نیاز اور ہر تعریف کے لائق ہے۔(۲۶۸)۔شیطان تمہیں مفلسی سے ڈراتا ہے اور فحاشی کا حکم دیتا ہے، جبکہ اللہ تم سے اپنی بخشش اور فضل کا وعدہ کرتا ہے، اور اللہ بڑی وسعت والا، سب کچھ جاننے والا ہے۔(۲۶۹)۔اللہ جسے چاہتا ہے حکمت عطا کرتا ہے، اور جسے حکمت مل گئی، اسے یقیناً بہت بڑی بھلائی مل گئی۔اور نصیحت وہی حاصل کرتے ہیں جو عقل والے ہوتے ہیں۔(۲۷۰)۔تم جو کچھ بھی خرچ کرو یا کوئی نذر مانو، اللہ اسے ضرور جانتا ہے، اور ظالموں کا کوئی مددگار نہیں۔(۲۷۱)۔اگر تم صدقات ظاہر کرو تو یہ بھی اچھا ہے، لیکن اگر انہیں چھپاؤ اور غریبوں کو دو، تو یہ تمہارے لیے زیادہ بہتر ہے، اور اللہ تمہاری کچھ برائیاں دور کر دے

گا۔اور اللہ تمہارے تمام اعمال سے خوب باخبر ہے۔(۲۷۲)۔اے نبی! ان لوگوں کو ہدایت پر لانا تمہاری ذمہ داری نہیں، بلکہ اللہ جسے چاہے ہدایت دیتا ہے۔اور جو مال بھی تم خرچ کرتے ہو، وہ تمہارے ہی فائدے کے لیے ہے۔تم اللہ کی رضا حاصل کرنے کے لیے ہی خرچ کرتے ہو، اور جو کچھ تم خرچ کرو گے، اس کا پورا بدلہ تمہیں دیا جائے گا، اور تم پر کوئی ظلم نہ کیا جائے گا۔(۲۷۳)۔(یہ صدقات) ان فقیروں کے لیے ہیں جو اللہ کی راہ میں روک دیے گئے ہیں، وہ زمین میں چل پھر نہیں سکتے۔ایک ناواقف آدمی انہیں خوشحال سمجھتا ہے کیونکہ وہ مانگتے نہیں۔تم ان کو ان کے چہروں سے پہچان سکتے ہو، وہ لوگوں سے لپٹ کر مانگتے نہیں۔اور جو کچھ بھی تم خرچ کرو گے، تو بے شک اللہ اسے خوب جانتا ہے۔(۲۷۴)۔جو لوگ اپنے مال رات دن، چھپ کر اور کھلے عام خرچ کرتے ہیں، ان کے لیے ان کا اجر ان کے رب کے پاس ہے، اور نہ ان پر کوئی خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔

تفسیر-آیت نمبر ۲۶۷ سے ۲۷۴ تک

آیت نمبر (۲۶۷) يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْفِقُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا كَسَبْتُمْ وَمِمَّآ اَخْرَجْنَا لَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ ۡ وَلَا تَيَمَّمُوا الْخَبِيْثَ مِنْهُ تُنْفِقُوْنَ وَلَسْتُمْ بِاٰخِذِيْهِ اِلَّآ اَنْ تُغْمِضُوْا فِيْهِ ۭ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ حَمِيْدٌ ۝

ترجمہ: ''اے ایمان والو! اپنے مال میں سے بہترین چیزیں خرچ کرو جو تم نے کمائی ہیں، اور وہ چیزیں بھی جو ہم نے زمین سے تمہارے لیے نکالی ہیں۔اور ایسی خراب چیز خرچ کرنے کا ارادہ نہ کرو، جسے اگر تمہیں دی جائے تو تم خود اسے لینا پسند نہ کرو، مگر آنکھ بند کر کے۔اور جان لو کہ اللہ بے نیاز اور ہر تعریف کے لائق ہے''۔

تفسیر اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو ہدایت دی ہے کہ وہ اللہ کی راہ میں اپنا بہترین مال خرچ کریں، چاہے وہ مال تجارت سے حاصل کیا گیا ہو یا کھیتوں کی پیداوار ہو، کیونکہ ایمان کا تقاضا یہی ہے۔اسی لیے اللہ تعالیٰ نے دوسری جگہ فرمایا: ''جب تک تم پسندیدہ چیز کو اللہ کی راہ میں خرچ نہ کرو گے، ہرگز بھلائی نہ پاؤ گے۔''

خراب یا گلا سڑا مال اللہ کی راہ میں دینا جائز نہیں، کیونکہ اللہ پاک وطیب ہے اور صرف عمدہ و اچھا مال قبول فرماتا ہے۔اسی لیے فرمایا کہ خراب مال اللہ کی راہ میں نہ خرچ کیا جائے، حالانکہ اگر کوئی تمہارے قرض کی ادائیگی کے لیے تمہیں مال دے تو تم اسے آسانی سے قبول نہ کرو گے، بلکہ صرف جبراً قبول کرو گے۔

حضرت براء بن عازبؓ سے روایت ہے کہ یہ آیت انصار کے بارے میں نازل ہوئی۔کھجور پکنے کے موسم

میں لوگ مسجد نبوی میں رسی سے کھجور کے گچھے لٹکا دیتے تا کہ غریب مہاجرین کھا سکیں۔ بعض لوگ ان میں خراب یا ردی کھجور ملا دیتے، جس پر اللہ تعالیٰ نے تنبیہ فرمائی کہ ایسا کرنا جائز نہیں۔ **(ترمذی رقم:۲۹۸۷)**

کچھ علماء نے کہا کہ اس سے مراد مالِ حرام ہے، یعنی اللہ کی راہ میں حرام مال نہ خرچ کیا جائے۔ حافظ ابنِ کثیرؒ نے فرمایا کہ یہی قول صحیح ہے۔ **(تفصیل کے لیے دیکھیں: آلِ عمران-۶۲)**

● حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ پاک ہے اور صرف پاک ہی چیز کو قبول فرماتا ہے۔'' **(مسلم رقم:۱۰۱۵)**

● حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ہر روز دو فرشتے زمین پر اُترتے ہیں، ایک کہتا ہے: ''اے اللہ! گن گن کر رکھنے والے کا مال برباد کر دے''۔ **(بخاری رقم:۱۴۴۲)**

● اور فرمایا: ''اے ابنِ آدم! خرچ کر، میں تجھ پر خرچ کروں گا''۔ **(بخاری رقم:۵۳۵۲)**

اس سے واضح ہے کہ اللہ تعالیٰ پاک مال کی قدر فرماتا ہے اور اپنے بندوں کو بہترین چیزیں خرچ کرنے کی ترغیب دیتا ہے، تا کہ ان کے اعمال میں برکت اور افزائش ہو۔

آیت نمبر(۲۶۸) اَلشَّيْطٰنُ يَعِدُكُمُ الْفَقْرَ وَيَاْمُرُكُمْ بِالْفَحْشَآءِ ۚ وَاللّٰهُ يَعِدُكُمْ مَّغْفِرَةً مِّنْهُ وَفَضْلًا ؕ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ﴿۲۶۸﴾

ترجمہ: ''شیطان تمہیں مفلسی سے ڈراتا ہے اور فحاشی کا حکم دیتا ہے، جبکہ اللہ تم سے اپنی بخشش اور فضل کا وعدہ کرتا ہے، اور اللہ بڑی وسعت والا، سب کچھ جاننے والا ہے''۔

تفسیر اس آیتِ کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے یہ حقیقت واضح فرمائی ہے کہ مسلمان دو طرح کے داعیوں کے درمیان رہتا ہے۔ ایک طرف اللہ کا داعی ہے جو اسے بھلائی کی طرف بلاتا، نیکی، ثواب اور خرچ کیے ہوئے مال کے بدل کا وعدہ کرتا ہے، اور دوسری طرف شیطان کا داعی ہے جو اسے کنجوسی پر اکساتا اور محتاجی کے خوف سے ڈراتا ہے۔ جو شخص اللہ کی پکار پر لبیک کہتا اور اپنی روزی میں سے اللہ کی راہ میں خرچ کرتا ہے، اللہ تعالیٰ اسے گناہوں کی مغفرت اور ہر نیکی کے حاصل ہونے کی خوشخبری دیتا ہے۔ جبکہ جو شخص شیطان کی بات مان کر اللہ کی راہ میں خرچ سے باز رہتا ہے، وہ دراصل اپنے لیے جہنم کی راہ ہموار کر لیتا ہے۔

آیت نمبر(۲۶۹) يُؤْتِي الْحِكْمَةَ مَنْ يَّشَآءُ ۚ وَمَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ اُوْتِيَ خَيْرًا كَثِيْرًا ؕ

وَمَا يَذَّكَّرُ اِلَّآ اُولُوا الْاَلْبَابِ﴿۲۶۹﴾

ترجمہ: ''اللہ جسے چاہتا ہے حکمت عطا کرتا ہے، اور جسے حکمت مل گئی، اسے یقیناً بہت بڑی بھلائی مل گئی۔ اور نصیحت وہی حاصل کرتے ہیں جو عقل والے ہوتے ہیں''۔

تفسیر جب صدقات وخیرات اور اللہ کی راہ میں خرچ کیے گئے مال کے اجر وثواب کا ذکر ہو چکا، تو اب اللہ تعالیٰ ایک ایسی نعمت کی طرف اشارہ فرماتے ہیں جو سب سے افضل ہے، اور وہ ہے حکمت۔ اس لیے فرمایا گیا کہ جسے اللہ حکمت عطا فرماتا ہے، اسے بڑی بھلائی سے نوازا گیا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے نزدیک حکمت سے مراد فہمِ قرآن ہے۔

مجاہدؒ کہتے ہیں کہ اس سے مراد فقہ اور قرآن ہے، جبکہ امام مالک کے نزدیک حکمت سے مراد فقہ فی الدین یعنی دین کی سمجھ ہے، اور یہ ایسی دولت ہے جسے اللہ اپنے فضل وکرم سے دلوں میں ڈال دیتا ہے۔ اس آیت میں اشارہ ہے کہ جو شخص شیطان کے فریب میں نہیں آتا اور اللہ کے وعدوں پر یقین رکھتا ہے، اللہ تعالیٰ اسے حکمت کی دولت سے نواز دیتا ہے۔ حکمت کے حصول کا تقاضہ یہ ہے کہ انسان اللہ کی راہ میں اپنے پاکیزہ مال خرچ کرے۔

ث حضرت عبداللہ بن مسعودؓ روایت کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا کہ حسد دو چیزوں میں جائز ہے: ایک وہ شخص جسے اللہ نے مال دیا اور وہ اسے راہِ حق میں خرچ کرتا ہے، اور دوسرا وہ شخص جسے اللہ نے حکمت دی اور وہ اس کے مطابق لوگوں کے درمیان فیصلے کرتا اور انہیں تعلیم دیتا ہے۔

آیت نمبر (۲۷۰) وَمَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ نَّفَقَةٍ اَوْ نَذَرْتُمْ مِّنْ نَّذْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُهٗ ؕ وَمَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ اَنْصَارٍ﴿۲۷۰﴾

ترجمہ: ''تم جو کچھ بھی خرچ کرو یا کوئی نذر مانو، اللہ اسے ضرور جانتا ہے، اور ظالموں کا کوئی مددگار نہیں''۔

تفسیر

اللہ کی راہ میں خرچ کرنا

اللہ کی راہ میں خرچ کرنے والے، چاہے وہ صدقہ ہو، خیرات ہو یا نذرانہ، اللہ تعالیٰ ان سب سے بخوبی واقف ہے۔ اس علم کے اثرات یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ انہیں ان نیک اعمال کا بہترین بدلہ عطا فرمائے گا، اور یقین رکھیں کہ ایک ذرہ برابر عمل بھی ضائع نہیں ہوگا۔ جو لوگ ظالم ہیں، اور دوسروں پر واجب حقوق ادا نہیں کرتے یا حرام اعمال میں ملوث ہیں، اللہ تعالیٰ کا عذاب انہیں ضرور پکڑے گا، اور ان کے لیے کوئی مددگار نہیں ہوگا۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہمیں نذرانہ کرنے سے منع فرمایا، کیونکہ نذر سے تقدیر میں کوئی تبدیلی نہیں آتی۔ البتہ اس کا فائدہ یہ ہے کہ بخیل شخص سے کچھ مال نکالا جاتا ہے اور اس کے دل میں سخاوت کی روح پیدا ہوتی ہے۔ (صحیح مسلم، حدیث: ۱۶۴۰)

آیت نمبر (۲۷۱) اِنْ تُبْدُوا الصَّدَقٰتِ فَنِعِمَّا هِيَ ۚ وَاِنْ تُخْفُوْهَا وَتُؤْتُوْهَا الْفُقَرَآءَ فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۭ وَيُكَفِّرُ عَنْكُمْ مِّنْ سَيِّاٰتِكُمْ ۭ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ﴿۲۷۱﴾

ترجمہ: ''اگر تم صدقات ظاہر کرو تو یہ بھی اچھا ہے، لیکن اگر انہیں چھپاؤ اور غریبوں کو دو، تو یہ تمہارے لیے زیادہ بہتر ہے، اور اللہ تمہاری کچھ برائیاں دور کر دے گا۔ اور اللہ تمہارے تمام اعمال سے خوب باخبر ہے''۔

تفسیر آیت کے اس حصے میں یہ بات واضح کی گئی ہے کہ صدقہ دینے میں اسے چھپانا افضل ہے تاکہ ریاکاری یا دکھاوا پیدا نہ ہو۔ تاہم، اگر صدقہ ظاہر کرنے میں کوئی دینی حکمت یا مصلحت ہو، جیسے یہ نیت کہ لوگ خیر اور نیکی کے کاموں کی پیروی کریں، تو ظاہر کرنا ہی افضل ہوگا۔ اس لیے جمہور مفسرین کا موقف یہ ہے کہ چھپانے کی فضیلت خاص طور پر نفلی صدقے کے لیے ہے، جبکہ فرض صدقات اور زکوٰۃ میں اسے ظاہر کرنا ہی بہتر ہے۔

صحیح احادیث میں حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ قیامت کے دن سات قسم کے لوگوں کو اللہ تعالیٰ اپنے عرش کے سائے میں جگہ عطا فرمائے گا، جس دن دنیا میں کوئی اور سایہ نہیں ہوگا۔ ان میں ایک وہ شخص ہوگا جس نے صدقہ دیتے وقت اسے چھپایا، یہاں تک کہ اُس کے بائیں ہاتھ کو بھی خبر نہ ہو کہ دائیں ہاتھ نے کیا خرچ کیا۔ (بخاری رقم: ۶۶۰)

آیت نمبر (۲۷۲) لَيْسَ عَلَيْكَ هُدٰىهُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ ۭ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ فَلِاَنْفُسِكُمْ ۭ وَمَا تُنْفِقُوْنَ اِلَّا ابْتِغَاۗءَ وَجْهِ اللّٰهِ ۭ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ يُّوَفَّ اِلَيْكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تُظْلَمُوْنَ ﴿۲۷۲﴾

ترجمہ: ''اے نبی! ان لوگوں کو ہدایت پر لانا تمہاری ذمہ داری نہیں، بلکہ اللہ جسے چاہے ہدایت دیتا ہے۔ اور جو مال بھی تم خرچ کرتے ہو، وہ تمہارے ہی فائدے کے لیے ہے۔ تم اللہ کی رضا حاصل کرنے کے لیے ہی خرچ کرتے ہو، اور جو کچھ تم خرچ کرو گے، اس کا پورا بدلہ تمہیں دیا جائے گا، اور تم پر کوئی ظلم نہ کیا جائے گا''۔

تفسیر اس کا مقصد یہ ہے کہ مومنوں کو اللہ کے احکام کی اطاعت کی ترغیب دی جائے اور انہیں یہ سمجھایا جائے کہ لوگوں کو راہِ راست پر چلانا رسول اللہ ﷺ کی ذمہ داری نہیں، یہ تو صرف اللہ تعالیٰ کا کام ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا فریضہ صرف یہ ہے کہ لوگوں کو صحیح راستہ دکھا دیا جائے۔

جو شخص اللہ کی راہ میں خرچ کرے گا، قیامت کے دن اس کا حقیقی فائدہ اسے ہی پہنچے گا۔ اس لیے چاہیے کہ محتاجوں پر اپنا احسان ظاہر نہ کرے اور اپنی نیت صرف اللہ کی رضا کے لیے رکھے۔ اللہ تعالیٰ صدقات اور خیرات کے اجر کو کئی گنا بڑھا دیتا ہے۔ یاد رکھیں، اللہ کسی کی نیکیوں کو کم نہیں کرتا اور نہ کسی کے گناہوں کو بڑھاتا ہے۔

ابتدائی دور میں مسلمان اپنے غیر مسلم رشتہ داروں کے ساتھ حسنِ سلوک کو اہمیت نہیں دیتے تھے۔ جب انہوں نے اس بارے میں رہنمائی طلب کی، تو یہ آیت انہیں اس سلسلے میں اجازت اور وضاحت دی گئی۔

آیت نمبر (۲۷۳) لِلْفُقَرَآءِ الَّذِيْنَ اُحْصِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ ضَرْبًا فِي الْاَرْضِ ۫ يَحْسَبُهُمُ الْجَاهِلُ اَغْنِيَآءَ مِنَ التَّعَفُّفِ ۚ تَعْرِفُهُمْ بِسِيْمٰهُمْ ۚ لَا يَسْـَٔلُوْنَ النَّاسَ اِلْحَافًا ۭ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ ﴿۲۷۳﴾

ترجمہ: ”(یہ صدقات) ان فقیروں کے لیے ہیں جو اللہ کی راہ میں روک دیے گئے ہیں، وہ زمین میں چل پھر نہیں سکتے۔ ایک ناواقف آدمی انہیں خوشحال سمجھتا ہے کیونکہ وہ مانگتے نہیں۔ تم ان کو ان کے چہروں سے پہچان سکتے ہو، وہ لوگوں سے لپٹ کر مانگتے نہیں۔ اور جو کچھ بھی تم خرچ کرو گے، تو بے شک اللہ اسے خوب جانتا ہے“۔

تفسیر

لوگوں سے سوال کرنا

اللہ تعالیٰ نے مال داروں کو حکم دیا ہے کہ وہ اپنا مال ان فقیروں اور محتاجوں پر خرچ کریں جنہوں نے اللہ کی راہ میں جہاد یا دن رات بندگی کے لیے اپنی زندگی وقف کر رکھی ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ یہاں مراد ”اصحاب صفہ“ ہیں۔ جبکہ حافظ ابن کثیر نے اس سے مراد وہ تمام مہاجرین بیان کئے ہیں جنہوں نے مدینہ منورہ میں قیام کیا اور تجارت یا مال کمانے کے ذرائع ان سے ختم ہو چکے تھے۔

نوٹ: اس آیت کریمہ میں مؤمنین مہاجرین کی وہ صفت بیان کی گئی ہے کہ وہ اپنی ضرورت کے باوجود ذلت کے ساتھ کسی سے نہ مانگیں۔ اسلام نے شدید ضرورت کے وقت سوال کرنا جائز قرار دیا ہے، لیکن بغیر ضرورت سوال

کرنے کی سخت مذمت کی ہے۔

● حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے بخاری و مسلم میں روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''ایک آدمی ہمیشہ مانگتا رہے گا، یہاں تک کہ قیامت کے دن اس کے چہرے پر گوشت کا ایک ٹکڑا بھی نہ ہوگا''۔ (بخاری: ۱۴۷۴)

● امام مسلم نے حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''جو شخص اپنا مال بڑھانے کے لیے لوگوں سے مانگتا ہے، وہ درحقیقت جہنم کی آگ مانگ رہا ہے''۔ (مسلم: ۲۳۹۹)

● حضرت ثوبانؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: "کون ہے جو مجھے یہ ضمانت دے کہ کبھی کسی سے سوال نہیں کرے گا؟ میں اسے جنت کی ضمانت دیتا ہوں۔ میں نے کہا: میں اس بات کی ضمانت دیتا ہوں۔ (نسائی: ۲۵۹۱)

● حضرت ابو سعید خدریؓ سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''جو شخص سوال سے بچے گا، اللہ بھی اسے بچا لے گا۔ جو دنیا سے بے پرواہ ہوگا، اللہ اسے بے پرواہ کر دے گا۔ جو صبر کے ساتھ کوشش کرے گا، اللہ اسے صبر دے گا، اور صبر سے بہتر کسی کو کوئی نعمت نہیں ملی''۔ (بخاری: ۱۴۶۹)

● حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''مسکین وہ نہیں جو دو کھجوریں یا چند لقمے کھاتا ہے، بلکہ مسکین وہ ہے جو سفید پوشی میں رہتا ہے''۔ (مسلم: ۲۳۹۴)

آیت نمبر (۲۷۴) اَلَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ بِالَّيْلِ وَالنَّهَارِ سِرًّا وَّعَلَانِيَةً فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۲۷۴﴾

ترجمہ: ''جو لوگ اپنے مال رات دن، چھپ کر اور کھلے عام خرچ کرتے ہیں، ان کے لیے ان کا اجر ان کے رب کے پاس ہے، اور نہ ان پر کوئی خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے''۔

تفسیر اس آیت میں اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے مال خرچ کرنے والوں کی تعریف کی گئی ہے اور یہ بات واضح کی گئی ہے کہ چھپ کر صدقہ دینا افضل ہے، چاہے وہ رات ہو یا دن، یا پوشیدہ ہو یا ظاہر۔ اس میں گھر والوں پر خرچ کرنا بھی شامل ہے۔

صحیحین میں روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سعد بن وقاصؓ سے فرمایا: ''رضائے الٰہی کے لیے جو بھی خرچ کرو گے، اللہ کے نزدیک تمہارا مقام بلند ہوگا، یہاں تک کہ وہ لقمہ جو تم اپنی بیوی کے منہ میں ڈالتے ہو، بھی صدقہ ہے''۔ (بخاری رقم: ۵۶)

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: سات قسم کے لوگ ایسے ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اپنے سایہ میں جگہ

دے گا، جس دن دنیا میں کوئی اور سایہ نہ ہوگا: ۱۔ عادل اور انصاف پسند بادشاہ۔ ۲۔ وہ نوجوان جو اللہ کی عبادت میں جوان ہوا۔ ۳۔ ایسا شخص جس کا دل مسجد میں لگا رہتا ہو۔ ۴۔ دو لوگ جو صرف اللہ کی خاطر محبت رکھتے ہوں اور اسی بنیاد پر اکٹھے اور جدا ہوتے ہوں۔ ۵۔ وہ انسان جسے کوئی مالدار یا خوبصورت عورت برے کام کے لیے دعوت دے، لیکن وہ کہے: ''میں اللہ سے ڈرتا ہوں''۔ ۶۔ ایسا شخص جس نے صدقہ دیا اور اسے اس طرح چھپایا کہ اس کے بائیں ہاتھ کو بھی خبر نہ ہوئی کہ دائیں ہاتھ نے کیا صدقہ کیا۔ ۷۔ ایسا شخص جس نے تنہائی میں اللہ کو یاد کیا اور اللہ کے خوف سے اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ (صحیح بخاری حدیث نمبر: ۱۴۲۳)

❁❁❁

ترجمہ- آیت نمبر ۲۷۵ سے ۲۸۲ تک

اَلَّذِيْنَ يَاْكُلُوْنَ الرِّبٰوا لَا يَقُوْمُوْنَ اِلَّا كَمَا يَقُوْمُ الَّذِيْ يَتَخَبَّطُهُ الشَّيْطٰنُ مِنَ الْمَسِّ ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْٓا اِنَّمَا الْبَيْعُ مِثْلُ الرِّبٰوا ۘ وَاَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا ؕ فَمَنْ جَآءَهٗ مَوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ فَانْتَهٰى فَلَهٗ مَا سَلَفَ ؕ وَاَمْرُهٗٓ اِلَى اللّٰهِ ؕ وَمَنْ عَادَ فَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۲۷۵﴾ يَمْحَقُ اللّٰهُ الرِّبٰوا وَيُرْبِي الصَّدَقٰتِ ؕ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ كَفَّارٍ اَثِيْمٍ ﴿۲۷۶﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ لَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۲۷۷﴾ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَذَرُوْا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبٰٓوا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۲۷۸﴾ فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا فَاْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ۚ وَاِنْ تُبْتُمْ فَلَكُمْ رُءُوْسُ اَمْوَالِكُمْ ۚ لَا تَظْلِمُوْنَ وَلَا تُظْلَمُوْنَ ﴿۲۷۹﴾ وَاِنْ كَانَ ذُوْ عُسْرَةٍ فَنَظِرَةٌ اِلٰى مَيْسَرَةٍ ؕ وَاَنْ تَصَدَّقُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۲۸۰﴾ وَاتَّقُوْا يَوْمًا تُرْجَعُوْنَ فِيْهِ اِلَى اللّٰهِ ۫ ثُمَّ تُوَفّٰى كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ﴿۲۸۱﴾ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا تَدَايَنْتُمْ بِدَيْنٍ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى فَاكْتُبُوْهُ ؕ وَلْيَكْتُبْ بَّيْنَكُمْ كَاتِبٌۢ بِالْعَدْلِ ۪ وَلَا يَاْبَ كَاتِبٌ اَنْ يَّكْتُبَ كَمَا عَلَّمَهُ اللّٰهُ فَلْيَكْتُبْ ۚ وَلْيُمْلِلِ الَّذِيْ عَلَيْهِ الْحَقُّ وَلْيَتَّقِ اللّٰهَ رَبَّهٗ وَلَا يَبْخَسْ مِنْهُ شَيْـًٔا ؕ فَاِنْ كَانَ الَّذِيْ عَلَيْهِ الْحَقُّ سَفِيْهًا اَوْ ضَعِيْفًا اَوْ لَا يَسْتَطِيْعُ اَنْ يُّمِلَّ هُوَ فَلْيُمْلِلْ وَلِيُّهٗ بِالْعَدْلِ ؕ وَاسْتَشْهِدُوْا شَهِيْدَيْنِ مِنْ رِّجَالِكُمْ ۚ فَاِنْ لَّمْ يَكُوْنَا رَجُلَيْنِ فَرَجُلٌ وَّامْرَاَتٰنِ مِمَّنْ تَرْضَوْنَ مِنَ الشُّهَدَآءِ اَنْ تَضِلَّ اِحْدٰىهُمَا فَتُذَكِّرَ اِحْدٰىهُمَا الْاُخْرٰى ؕ وَلَا يَاْبَ الشُّهَدَآءُ اِذَا مَا دُعُوْا ؕ وَلَا تَسْـَٔمُوْٓا اَنْ تَكْتُبُوْهُ صَغِيْرًا اَوْ كَبِيْرًا اِلٰٓى اَجَلِهٖ ؕ ذٰلِكُمْ اَقْسَطُ عِنْدَ اللّٰهِ وَاَقْوَمُ لِلشَّهَادَةِ وَاَدْنٰٓى اَلَّا تَرْتَابُوْٓا اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً حَاضِرَةً تُدِيْرُوْنَهَا بَيْنَكُمْ فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَلَّا تَكْتُبُوْهَا ؕ وَاَشْهِدُوْٓا اِذَا تَبَايَعْتُمْ ۪ وَلَا يُضَآرَّ كَاتِبٌ وَّلَا شَهِيْدٌ ؕ وَاِنْ تَفْعَلُوْا فَاِنَّهٗ فُسُوْقٌۢ بِكُمْ ؕ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ؕ وَيُعَلِّمُكُمُ اللّٰهُ ؕ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴿۲۸۲﴾

ترجمہ:

(۲۷۵)۔ جولوگ سود کھاتے ہیں، وہ ایسے اٹھیں گے جیسے کوئی شیطان کے اثر سے پاگل ہو گیا ہو۔ یہ اس لیے کہ وہ کہتے ہیں: "تجارت بھی تو سود ہی کی طرح ہے۔" حالانکہ اللہ نے تجارت کو حلال اور سود کو حرام کیا ہے۔ پس جس کو اس کے رب کی طرف سے نصیحت پہنچی اور وہ باز آ گیا، تو جو کچھ پہلے ہو چکا، وہ اس کا ہے، اور اس کا معاملہ اللہ کے

حوالے ہے۔لیکن جو پھر بھی سود لے،تو ایسے لوگ جہنمی ہیں، وہ ہمیشہ وہیں رہیں گے۔(۲۷۶)۔اللہ سود کو مٹاتا ہے اور صدقات کو بڑھاتا ہے، اور اللہ کسی بھی ناشکرے گناہگار کو پسند نہیں کرتا۔(۲۷۷)۔یقیناً وہ لوگ جو ایمان لائے اور نیک اعمال کیے،اور نماز قائم کی اور زکوٰۃ دی،ان کے لیے ان کے رب کے پاس ان کا اجر ہے،اور ان پر نہ کوئی خوف ہو گا اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔(۲۷۸)۔اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور جو سود باقی رہ گیا ہے، اسے چھوڑ دو اگر تم واقعی ایمان والے ہو۔(۲۷۹)۔اگر تم نے ایسا نہ کیا تو جان لو کہ اللہ اور اس کے رسول سے جنگ کے لیے تیار ہو جاؤ۔لیکن اگر تم توبہ کرلو،تو تمہارا اصل مال تمہیں مل جائے گا، نہ تم کسی پر ظلم کرو اور نہ تم پر ظلم کیا جائے گا۔(۲۸۰)۔اور اگر قرض دار تنگدست ہو، تو اسے آسانی تک مہلت دو، اور اگر تم معاف کر دو تو یہ تمہارے لیے زیادہ بہتر ہے، اگر تم سمجھتے ہو۔(۲۸۱)۔اور ڈرو اُس دن سے، جب تم اللہ کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔پھر ہر شخص کو اس کے اعمال کا پورا پورا بدلہ دیا جائے گا اور کسی پر کوئی ظلم نہیں کیا جائے گا۔(۲۸۲)۔اے ایمان والو! جب تم آپس میں کسی مقررہ مدت کے لیے قرض کا لین دین کرو،تو اسے لکھ لیا کرو۔اور چاہیے کہ تمہارے درمیان کوئی لکھنے والا انصاف کے ساتھ لکھے۔اور جو شخص لکھنا جانتا ہو، اسے انکار نہیں کرنا چاہیے یعنی کہ وہ لکھے، جس طرح اللہ نے اسے سکھایا ہے۔تو اسے لکھ دینا چاہیے، اور لکھوانا اس شخص کو چاہیے جس پر قرض ہے، اور اسے چاہیے کہ وہ اللہ سے ڈرے جو اس کا رب ہے، اور وہ قرض میں سے کچھ بھی کم نہ کرے۔پھر اگر وہ شخص جس پر قرض ہے، کم عقل ہو، یا کمزور ہو، یا خود لکھوانے کی طاقت نہ رکھتا ہو، تو اس کا ولی انصاف کے ساتھ لکھوائے۔اور تم دو گواہ بناؤ اپنے مَردوں میں سے۔اگر دو مَرد نہ ہوں، تو ایک مَرد اور دو عورتیں، ان میں سے جنہیں تم گواہی کے لیے پسند کرتے ہو، تا کہ اگر ان میں سے ایک عورت بھول جائے تو دوسری اسے یاد دلائے۔اور جب گواہوں کو بلایا جائے تو وہ انکار نہ کریں۔اور قرض کے معاملے کو، چاہے وہ چھوٹا ہو یا بڑا، اس کی مقررہ مدت تک، لکھنے میں کوتاہی نہ کرو۔یہ اللہ کے نزدیک زیادہ انصاف والا ہے، اور گواہی کو درست رکھنے والا ہے، اور اس میں شک کی گنجائش کم رہتی ہے۔البتہ اگر تم نے کوئی ایسا کاروبار کیا ہو جو نقد ہو (یعنی ہاتھوں ہاتھ لین دین)، تو اسے نہ لکھنے میں کوئی گناہ نہیں۔اور جب تم سودا کرو تو گواہ بنا لیا کرو، اور نہ لکھنے والے کو نقصان پہنچایا جائے اور نہ گواہ کو۔اگر تم ایسا کرو گے تو یہ کھلی نافرمانی ہوگی۔اور اللہ سے ڈرو، اللہ تمہیں سکھاتا ہے، اور وہ ہر چیز کو خوب جاننے والا ہے۔

تفسیر-آیت نمبر ۲۷۵ سے ۲۸۲ تک

آیت نمبر (۲۷۵) اَلَّذِيْنَ يَاْكُلُوْنَ الرِّبٰوا لَا يَقُوْمُوْنَ اِلَّا كَمَا يَقُوْمُ الَّذِيْ يَتَخَبَّطُهُ الشَّيْطٰنُ مِنَ الْمَسِّ ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْٓا اِنَّمَا الْبَيْعُ مِثْلُ الرِّبٰوا ۘ وَاَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ

وَحَرَّمَ الرِّبٰوا ؕ فَمَنْ جَآءَهٗ مَوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ فَانْتَهٰى فَلَهٗ مَا سَلَفَ ؕ وَاَمْرُهٗۤ اِلَى اللّٰهِ ؕ وَمَنْ عَادَ فَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۲۷۵﴾

ترجمہ: ''جولوگ سود کھاتے ہیں، وہ ایسے اٹھیں گے جیسے کوئی شیطان کے اثر سے پاگل ہو گیا ہو۔ یہ اس لیے کہ وہ کہتے ہیں: "تجارت بھی تو سود ہی کی طرح ہے۔" حالانکہ اللہ نے تجارت کو حلال اور سود کو حرام کیا ہے۔ پس جس کو اس کے رب کی طرف سے نصیحت پہنچی اور وہ باز آ گیا، تو جو کچھ پہلے ہو چکا، وہ اس کا ہے، اور اس کا معاملہ اللہ کے حوالے ہے۔ لیکن جو پھر بھی سود لے، تو ایسے لوگ جہنمی ہیں، وہ ہمیشہ وہیں رہیں گے''۔

تفسیر اس آیت سے قبل اللہ کی راہ میں خرچ کرنے والوں کے لیے اجرِ عظیم کے وعدے اور گناہوں کی معافی کا ذکر ہو چکا ہے، تو اب اللہ تعالیٰ سود اور لوگوں کے مال کو حرام طریقوں سے کھانے والوں کا تذکرہ فرماتے ہیں اور ان کے بُرے انجام کی نشان دہی کرتے ہیں۔ جس طرح لوگ دنیا میں مالِ حرام کے حصول میں پاگل بن گئے تھے، برزخ میں اور قیامت کے دن بھی اپنی قبروں سے اٹھیں گے، گویا شیطانی اثر کی وجہ سے جنون میں مبتلا ہوں، اور یہ سزا انہیں اس لیے دی جائے گی کہ وہ کہتے تھے کہ بیع (خرید و فروخت) ربا کی مانند ہے اور حلال و حرام میں کوئی فرق نہیں، یعنی سود کو حلال قرار دیتے تھے۔

ربا کے حرام ہونے سے پہلے جو سود حاصل کیا گیا، اسے واپس کرنا واجب نہیں، لیکن جو شخص اس کے بعد سود کو حلال سمجھے گا، اس کا ٹھکانہ جہنم ہوگا۔ اس کی سزا اس لیے ہے کہ اس نے قرآنی احکام کا انکار کیا اور اللہ کی حرام کردہ چیز کو حلال قرار دیا۔

سود کی قسمیں

ربا کی دو بڑی اقسام ہیں: ۱۔ ربا النسیۃ ۲۔ ربا الفضل

ربا کے لغوی معنیٰ ہیں ''زیادتی اور اضافہ''۔ شرعاً ربا اس طرح ہے کہ کسی کو ایک سو روپے قرض دیے جائیں اس شرط پر کہ واپسی پر ایک سو پچاس یا ایک سو پچیس روپے دیے جائیں، یہ اضافی پچاس یا پچیس روپے جو مدت کے بدلے ہیں، اسے ربا النسیۃ کہتے ہیں۔

دوسری قسم سود وہ ہے جو چھ چیزوں کے تبادلے میں کمی بیشی، نقد یا اُدھار کی وجہ سے ہوتا ہے، جسے ربا الفضل کہا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر، اگر گیہوں کا تبادلہ گیہوں سے ہو تو ایک برابر ہونا چاہیے اور ہاتھوں ہاتھ لینا چاہیے، لیکن

اگر اس میں کمی بیشی ہو، یا ایک نقد اور دوسرا اُدھار ہو، یا دونوں اُدھار ہوں، تو یہ بھی سود شمار ہوگا۔

نوٹ: سود کی سخت مذمت اور اس کے دینی و دنیوی نقصانات میں بہت سی احادیث وارد ہوئی ہیں۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''سود کے ۷۳ دروازے ہیں، اور اس کا سب سے ہلکا گناہ یہ ہے جیسے کوئی شخص اپنی ماں کے ساتھ زنا کرے''۔ (ابن ماجہ: ۲۲۷۵، مستدرک حاکم: ۲۲۵۹)

یقیناً! میں نے آپ کے متن کو مفہوم برقرار رکھتے ہوئے مؤثر اور ادبی اردو میں ترتیب دیا ہے:

احادیث میں سود کی دو شکلیں

۱۔ ربا الفضل کہتے ہیں کسی چیز کو دوسرے کے مقابلے میں زیادہ دے کر خرید و فروخت کیا جائے۔ فقہا نے اس کے اصول میں بیان کیا ہے کہ ہر وہ دو چیزیں جن میں تین صفات بی ناپ، وزن اور خوراک بی میں سے دو موجود ہوں، اُن کا ایک دوسرے کے مقابلے میں زیادہ بیچنا جائز نہیں۔ اگر دونوں چیزوں میں تینوں صفات ہوں یا دونوں کی جنس مختلف ہو، تو زیادتی سود نہیں ہوگی۔ لیکن اگر دونوں کی جنس ایک ہو اور صرف ایک صفت دونوں میں پائی جائے تو بعض فقہا کے مطابق ایک کو زیادہ کرنا جائز ہے، لیکن بہتر یہی ہے کہ اس صورت میں بھی زیادتی سود شمار کی جائے۔

اس کی دلیل عبادہ بن ثامتؓ کی مرفوع حدیث ہے، جسے امام احمدؒ اور مسلمؒ نے روایت کیا ہے: ''سونا سونے کے بدلے، چاندی چاندی کے بدلے، گیہوں گیہوں کے بدلے، جو جو کے بدلے، اور نمک نمک کے بدلے برابر اور نقد بیچنا جائز ہے''۔ یعنی کسی ایک کو زیادہ کر کے بیچنا جائز نہیں کیونکہ دونوں کی جنس ایک ہے اور صفات میں سے دو یا ایک صفات دونوں میں پائی جاتی ہیں۔

۲۔ دوسری قسم

زمانۂ جاہلیت میں اس کی ایک شکل یہ تھی کہ جب قرض کی مدت پوری ہو جاتی، تو قرض لینے والا کہتا: ''قرض ادا کرو گے یا سود دو گے؟'' اگر قرض دار قرض ادا نہ کرتا تو قرض دینے والا مال کی مقدار بڑھا دیتا اور قرض کی مدت بھی بڑھا دیتا۔ یہ سود کی صورت اتفاقاً حرام تھی۔ رسول اللہ ﷺ نے خرید و فروخت کی بعض قسموں کو صرف اس لیے ناجائز قرار دیا تاکہ سود کے پوشیدہ دروازے بند ہو جائیں۔ علمائے اسلام نے ہر زمانے میں ایسی تمام صورتوں کو منع کیا، جن سے سود کے دروازے کھلنے کا شبہ ہو۔ کیونکہ سود اسلام میں بہت بڑا گناہ اور بدترین اجتماعی جرم ہے۔ مسلمانوں پر واجب ہے کہ وہ سود کی ہر شکل سے بچیں، حتیٰ کہ جس میں سود کا محض شبہ بھی ہو۔

قرآن کی تعلیم یہ ہے کہ لین دین اور تجارت میں کسی کے ساتھ بھی دھوکہ جائز نہیں، چاہے وہ مسلم ہو یا غیر مسلم،

اور سود خوری سب سے برا عمل ہے۔ اسی لیے کسی کافر کا مال بھی سود کی راہ سے ہڑپ کرنا جائز نہیں۔ موجودہ معاشی نظام اور ذریعہ معاش سے متاثر ہو کر کچھ لوگ ربا کو محدود کر کے صرف وہ سود سمجھتے ہیں جو غریب اور محتاجوں کو قرض دینے پر لیا جائے، یہ غلط فہمی ہے۔ تجارتی قرض پر سود نہ لینا نہ تو پہلے زمانے میں رواج تھا اور نہ قرآن نے اس کی مناہی کی، لیکن حقیقت یہ ہے کہ کاروباری قرض کا رواج قدیم زمانے سے چلتا آ رہا ہے۔

جہاں تک قرآن کی تعلیم کا تعلق ہے، قرآن نے بغیر کسی رعایت کے سب کے لیے ربا (سود) کو حرام قرار دیا ہے۔ اس میں ہر قسم کا سود شامل ہے، چاہے وہ محتاجوں سے لیا جائے یا بڑے تاجروں سے، چاہے سود کی شرح معمولی ہو یا زیادہ، اور چاہے وہ Interest کی شکل میں ہو یا Usury کی۔

شیطان کے چھونے سے مراد وہ اثر ہے جو سود خور کے دل و دماغ پر پڑتا ہے۔ اس کے نتیجے میں دولت کی پوجا اور غلامی کا بھوت اس پر سوار ہو جاتا ہے، اور وہ دولت حاصل کرنے کے جنون میں دیوانہ سا ہو جاتا ہے۔ اسے احساس نہیں ہوتا کہ وہ سود کے ذریعے غریبوں کا خون چوس رہا ہے، سماجی ہمدردی کے جذبات کو کچلا جا رہا ہے اور معاشرے کے اقتصادی و معاشرتی حالات کو تباہ و برباد کرنے والے اثرات ڈال رہا ہے۔

جو لوگ مال کے جنون میں ملوث ہو جاتے ہیں، قیامت کے دن جب اٹھیں گے تو وہ سب خون جو انہوں نے چوستے رہے ہیں، ان کے دماغ کو زخمی کر چکا ہوگا۔ وہ دیکھیں گے کہ دنیا میں سود کے چکر میں جو انہوں نے حاصل کیا، وہ آخرت میں انہی کے نقصان کا سبب بن گیا۔ ان کا حال دیوانوں اور پاگلوں جیسا ہوگا۔

سود کو بیع (تجارت) جیسا سمجھنے والے اور اس کے حرام ہونے پر اعتراض کرنے والے صرف موجودہ دور کے ماہرینِ معاشیات نہیں، بلکہ ہمیشہ ایسے ''عقلمند'' بھی موجود رہے ہیں۔ حالانکہ سود اور بیع بالکل مختلف چیزیں ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ پچھلے زمانے میں بھی سود کو معاشرے کے لیے لعنت قرار دینے والے موجود تھے اور آج بھی ہیں۔ اس سلسلے میں ارسطو نے بھی سود کی سخت مخالفت کی اور اسے ناجائز قرار دیا۔

"Money does not Breed." (Ency. of social Sciences Vol. VIII P.131)

یعنی ''روپیہ روپیہ کو نہیں دیتا'' اور موجودہ زمانہ کے سوشلسٹ سود کو غریب اور مزدور طبقے کے حق میں ظلم اور جبر بتاتے ہیں۔

"By interest, then, the socialist claims, the rich are made richer and the poor poorer, and the stability of the social organism is disturbedthe very evil that Melanchthon had feared."

(Ency. of R.E. Vol 12. P. 554)

''یعنی سود کے ذریعے، سوشلسٹ کا دعویٰ ہے کہ امیر مزید امیر ہوتے جاتے ہیں اور غریب مزید غریب، اور اس طرح معاشرتی نظام کا توازن بگڑ جاتا ہے۔ یہ وہ خرابی ہے جس کا خدشہ Melanchthon نے ظاہر کیا تھا''۔

Usury has come to mean exorbitant interest, but the legitimacy of interest is still debated. The early attacks on usury were motivated by the Church's sympathy with the oppressed poor. The latest attacks find their strength in the plea that interest is an unjust tax on the labouring classes.

(Encyclopedia of Religion and Ethics, Vol. 12,p. 554)

یوزری (Usury) کا مطلب ہوا بھاری سود لیکن سود کی مدت اب بھی بحث کا موضوع بنا ہوا ہے۔ پہلے اس پر اعتراض کی وجہ چرچ کے ذریعہ مظلوم غریب کے ساتھ ہمدردی تھا اور اب تازہ اعتراض اس بنیاد پر کیا جارہا ہے کہ سود (Interest) مزدور طبقے پر ایک مکمل ناانصاف ٹیکس ہے۔

Interest is the unpaid wage of the labourer. (Encyclopedia of Religion and Ethics, Vol. 12,p. 554)

''سود مزدور کی عجیب مزدوری ہے''۔

سود کے حرام ٹھہرائے جانے کی وجہ مختصراً درج ذیل میں ہے۔

سود وہ آمدنی ہے جو قرض دینے والا امیر آدمی رقم کے استعمال پر قرض دار سے وصول کرتا ہے۔

"Interest is its primary meaning is the payment for the use of money."

(Encyclopedia of Social Sciences, Vol. VIII, p. 131)

یہ بالکل واضح ہے کہ سودی لین دین کسی بیع یا تجارت (Trade) کے زمرے میں نہیں آتا، کیونکہ اس میں نہ کوئی چیز خریدی جاتی ہے اور نہ بیچی جاتی ہے۔ رقم صرف استعمال کے لیے دی جاتی ہے۔ یہ کرائے (Rent) کا معاملہ بھی نہیں ہے، کیونکہ کرائے کی چیز اصل میں باقی رہتی ہے اور استعمال کے بعد وہی چیز واپس کی جاتی ہے۔ لیکن سودی لین دین میں قرض دار اصل رقم خرچ کر چکا ہوتا ہے اور واپس کرتے وقت وہی اصل رقم نہیں دیتا بلکہ اضافی رقم واپس کرتا ہے، اس لیے اسے کرایہ بھی نہیں کہا جاسکتا۔

اس سے سود کی حقیقت واضح ہو جاتی ہے: یہ نہ خرید و فروخت ہے اور نہ کرایہ، تو پھر منافع کس چیز سے حاصل ہوتا ہے؟ یہی وجہ ہے کہ سود کی بنیاد ہی باطل ہے۔

تجارت میں منافع کے ساتھ نقصان کا امکان بھی ہوتا ہے، اس لیے انسان کو خطرہ مول لینا پڑتا ہے۔ لیکن سود خور کو کوئی خطرہ نہیں ہوتا، کیونکہ موجودہ رقم کے ساتھ منافع پہلے سے طے شدہ ہوتا ہے۔

تجارت میں انسان اپنی ذہنی اور جسمانی محنت لگاتا ہے، لیکن سودی کاروبار میں بغیر کسی محنت کے طے شدہ مدت اور طے شدہ صورت سے منافع حاصل ہوتا ہے۔ اس وجہ سے انسان محنت سے بچ کر آسان طریقہ اختیار کرنے لگتا ہے، جو اخلاقی اور معاشی دونوں اعتبار سے نقصان دہ ہے۔

ایک حقیقت یہ بھی ہے کہ سود خور کے بارے میں قرض دار کی سوچ اچھی نہیں ہوتی۔ سود خور اسے اپنی زیادتی

سمجھتا ہے، جو انسانی فطرت کی نشاندہی کرتا ہے کہ انسان سود سے نفرت کرتا ہے اور اسے برا سمجھتا ہے، جبکہ تاجر کے بہتر منافع کے لیے بیچنے پر کسی کی فکر نہیں ہوتی، چاہے وہ غریب ہی کیوں نہ ہو۔

خلاصہ یہ کہ سود غریب کا خون چوسنے اور امیر طبقے کا غریب سے ناجائز منافع حاصل کرنے کا نام ہے۔ سودی قرض کی وجہ سے تجارت کی قیمتیں بڑھتی ہیں اور یہ بوجھ زیادہ تر غریب طبقے پر پڑتا ہے، کیونکہ تاجر اور صنعت کار سامان کی قیمت طے کرتے وقت سود کا حساب بھی شامل کرتے ہیں اسی طرح سود نہ صرف اخلاقی طور پر ناپسندیدہ ہے بلکہ معاشرتی اور اقتصادی لحاظ سے بھی غریب کے لیے نقصان دہ ہے۔

آیت نمبر (۲۷۶) يَمْحَقُ اللّٰهُ الرِّبٰوا وَيُرْبِي الصَّدَقٰتِ ۭ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ كَفَّارٍ اَثِيْمٍ ﴿۲۷۶﴾

ترجمہ: ''اللہ سود کو مٹاتا ہے اور صدقات کو بڑھاتا ہے، اور اللہ کسی بھی ناشکرے گناہگار کو پسند نہیں کرتا''۔

تفسیر اللہ تعالیٰ سود سے حاصل ہونے والے مال سے برکت چھین لیتے ہیں اور صدقات کو بڑھاتے ہیں۔ کیونکہ روزی کا حقیقی مالک اللہ ہے، اور رزق اسی کی اطاعت اور رضا سے حاصل ہوتا ہے۔ سود خور کا مال بظاہر تو بڑھتا ہے، مگر اس میں برکت نہیں رہتی، دنیا میں اس کا سکون چھین لیا جاتا ہے، اور وہ مختلف قسم کی پریشانیوں اور غم و مسائل میں گھرا رہتا ہے۔ آخرت میں تو آگ کا عذاب اس کا منتظر ہے، جو اس کی بداعمالیوں کا لازمی انجام ہے۔

آیت نمبر (۲۷۷) اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ لَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۲۷۷﴾

ترجمہ: ''یقیناً وہ لوگ جو ایمان لائے اور نیک اعمال کیے، اور نماز قائم کی اور زکوٰۃ دی، ان کے لیے ان کے رب کے پاس ان کا اجر ہے، اور ان پر نہ کوئی خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے''۔

تفسیر ربا (سود) کی آیتوں کے بیچ اس آیت کو لانے کا مقصد یہ بیان کرنا ہے کہ سودی کاروبار سے بچانے کی اہم وجہ ایمان باللہ (اللہ پر ایمان) اور اُس کے حقوق کی ادائیگی ہے۔

آیت نمبر (۲۷۸) يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَذَرُوْا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبٰٓوا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۲۷۸﴾

ترجمہ: ''اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور جو سود باقی رہ گیا ہے، اسے چھوڑ دو اگر تم واقعی ایمان

والے ہو''۔

تفسیر اس آیت میں مسلمانوں کو حکم دیا گیا ہے کہ قرض داروں پر سود کی جو رقم رہ گئی ہے اسے اب نہ لی جائے، ایمان کا یہی تقاضہ ہے کیوں کہ سود اور ایمان دونوں ایک ساتھ جمع نہیں ہو سکتے۔

آیت نمبر (۲۷۹) فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا فَاْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ۚ وَاِنْ تُبْتُمْ فَلَكُمْ رُءُوْسُ اَمْوَالِكُمْ ۚ لَا تَظْلِمُوْنَ وَلَا تُظْلَمُوْنَ ﴿۲۷۹﴾

ترجمہ: ''اگر تم نے ایسا نہ کیا تو جان لو کہ اللہ اور اس کے رسول سے جنگ کے لیے تیار ہو جاؤ۔ لیکن اگر تم توبہ کر لو، تو تمہارا اصل مال تمہیں مل جائے گا، نہ تم کسی پر ظلم کرو اور نہ تم پر ظلم کیا جائے گا''۔

تفسیر سود لینا اللہ اور رسول کے خلاف جنگ ہے اور جس کی جنگ اللہ اور اُس کے رسول سے ہو جائے وہ کب کامیاب ہو پائے گا؟ سودی کاروبار سے توبہ کرنے کے بعد صرف اصل مال لینا جائز ہوگا۔

آیت نمبر (۲۸۰) وَاِنْ كَانَ ذُوْ عُسْرَةٍ فَنَظِرَةٌ اِلٰى مَيْسَرَةٍ ۭ وَاَنْ تَصَدَّقُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۲۸۰﴾

ترجمہ: ''اور اگر قرض دار تنگدست ہو، تو اسے آسانی تک مہلت دو، اور اگر تم معاف کر دو تو یہ تمہارے لیے زیادہ بہتر ہے، اگر تم سمجھتے ہو''۔

تفسیر اور اگر قرضدار غریب ہو اور اس کے پاس قرض کی ادائیگی کے لئے پیسے نہ ہوں تو اُسے مہلت دینی چاہئے۔

آیت نمبر (۲۸۱) وَاتَّقُوْا يَوْمًا تُرْجَعُوْنَ فِيْهِ اِلَى اللّٰهِ ۡ ثُمَّ تُوَفّٰى كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ﴿۲۸۱﴾

ترجمہ: ''اور ڈرو اُس دن سے، جب تم اللہ کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔ پھر ہر شخص کو اس کے اعمال کا پورا پورا بدلہ دیا جائے گا اور کسی پر کوئی ظلم نہیں کیا جائے گا''۔

تفسیر اور اگر قرض دینے والا تنگدست (غریب) قرض دار کو معاف کر دے تو یہ اُس کے لئے بہتر ہے کیوں کہ وہ آخرت میں اس کا اچھا بدلہ پائے گا۔

آیت نمبر (۲۸۲) يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا تَدَايَنْتُمْ بِدَيْنٍ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى فَاكْتُبُوْهُ ۭ

وَلْيَكْتُبْ بَّيْنَكُمْ كَاتِبٌۢ بِالْعَدْلِ ۠ وَلَا يَاْبَ كَاتِبٌ اَنْ يَّكْتُبَ كَمَا عَلَّمَهُ اللّٰهُ فَلْيَكْتُبْ ۚ وَلْيُمْلِلِ الَّذِيْ عَلَيْهِ الْحَقُّ وَلْيَتَّقِ اللّٰهَ رَبَّهٗ وَلَا يَبْخَسْ مِنْهُ شَيْـًٔا ؕ فَاِنْ كَانَ الَّذِيْ عَلَيْهِ الْحَقُّ سَفِيْهًا اَوْ ضَعِيْفًا اَوْ لَا يَسْتَطِيْعُ اَنْ يُّمِلَّ هُوَ فَلْيُمْلِلْ وَلِيُّهٗ بِالْعَدْلِ ؕ وَاسْتَشْهِدُوْا شَهِيْدَيْنِ مِنْ رِّجَالِكُمْ ۚ فَاِنْ لَّمْ يَكُوْنَا رَجُلَيْنِ فَرَجُلٌ وَّامْرَاَتٰنِ مِمَّنْ تَرْضَوْنَ مِنَ الشُّهَدَآءِ اَنْ تَضِلَّ اِحْدٰىهُمَا فَتُذَكِّرَ اِحْدٰىهُمَا الْاُخْرٰى ؕ وَلَا يَاْبَ الشُّهَدَآءُ اِذَا مَا دُعُوْا ؕ وَلَا تَسْـَٔمُوْٓا اَنْ تَكْتُبُوْهُ صَغِيْرًا اَوْ كَبِيْرًا اِلٰٓى اَجَلِهٖ ؕ ذٰلِكُمْ اَقْسَطُ عِنْدَ اللّٰهِ وَاَقْوَمُ لِلشَّهَادَةِ وَاَدْنٰٓى اَلَّا تَرْتَابُوْٓا اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً حَاضِرَةً تُدِيْرُوْنَهَا بَيْنَكُمْ فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَلَّا تَكْتُبُوْهَا ؕ وَاَشْهِدُوْٓا اِذَا تَبَايَعْتُمْ ۠ وَلَا يُضَآرَّ كَاتِبٌ وَّلَا شَهِيْدٌ ؕ وَاِنْ تَفْعَلُوْا فَاِنَّهٗ فُسُوْقٌۢ بِكُمْ ؕ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ؕ وَيُعَلِّمُكُمُ اللّٰهُ ؕ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴿۲۸۲﴾

ترجمہ: ''اے ایمان والو! جب تم آپس میں کسی مقررہ مدت کے لیے قرض کا لین دین کرو، تو اسے لکھ لیا کرو۔ اور چاہیے کہ تمہارے درمیان کوئی لکھنے والا انصاف کے ساتھ لکھے۔ اور جو شخص لکھنا جانتا ہو، اسے انکار نہیں کرنا چاہیے یعنی کہ وہ لکھے، جس طرح اللہ نے اسے سکھایا ہے۔ تو اسے لکھ دینا چاہیے، اور لکھوانا اس شخص کو چاہیے جس پر قرض ہے، اور اسے چاہیے کہ وہ اللہ سے ڈرے جو اس کا رب ہے، اور وہ قرض میں سے کچھ بھی کم نہ کرے۔ پھر اگر وہ شخص جس پر قرض ہے، کم عقل ہو، یا کمزور ہو، یا خود لکھوانے کی طاقت نہ رکھتا ہو، تو اس کا ولی انصاف کے ساتھ لکھوائے۔ اور تم دو گواہ بناؤ اپنے مَردوں میں سے۔ اگر دو مَرد نہ ہوں، تو ایک مَرد اور دو عورتیں، ان میں سے جنہیں تم گواہی کے لیے پسند کرتے ہو، تاکہ اگر ان میں سے ایک عورت بھول جائے تو دوسری اسے یاد دلائے۔ اور جب گواہوں کو بلایا جائے تو وہ انکار نہ کریں۔ اور قرض کے معاملے کو، چاہے وہ چھوٹا ہو یا بڑا، اس کی مقررہ مدت تک، لکھنے میں کوتاہی نہ کرو۔ یہ اللہ کے نزدیک زیادہ انصاف والا ہے، اور گواہی کو درست رکھنے والا ہے، اور اس میں شک کی گنجائش کم رہتی ہے۔ البتہ اگر تم نے کوئی ایسا کاروبار کیا ہو جو نقد ہو (یعنی ہاتھوں ہاتھ لین دین)، تو اسے نہ لکھنے میں کوئی گناہ نہیں۔ اور جب تم سودا کرو تو گواہ بنالیا کرو، اور نہ لکھنے والے کو نقصان پہنچایا جائے اور نہ گواہ کو۔ اگر تم ایسا کرو گے تو یہ کھلی نافرمانی ہوگی۔ اور اللہ سے ڈرو، اللہ تمہیں سکھاتا ہے، اور وہ ہر چیز کو خوب جاننے والا ہے''۔

تفسیر

قرض کا لین دین

سودی کاروبار کے بعد، قرآن کریم میں قرض کے ذریعے لین دین کی وضاحت کی گئی ہے تاکہ لوگ اپنی مالی ضروریات کو جائز اور شریعت کے مطابق پورا کر سکیں۔ یہ قرآن کی سب سے طویل آیت ہے۔ ابنِ جریر طبری نے سعید بن المسیبؒ سے روایت کی ہے کہ یہ آیت عرش سے نازل ہونے والی آخری آیت تھی۔ اس میں اللہ تعالیٰ نے اپنے مؤمن بندوں کو تعلیم دی کہ جب وہ قرض کے لین دین میں ملوث ہوں تو اسے تحریری شکل میں ثبت کریں، کیونکہ قرض کی مقدار، ادائیگی کی مدت اور گواہوں کی تصدیق کا اس سے بہتر کوئی ذریعہ نہیں ہے۔

حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں: ''میں گواہی دیتا ہوں کہ ضمانت پر لیا گیا قرض جس کی مدت معلوم ہو، حلال ہے اور اللہ تعالیٰ نے اس کی اجازت دی ہے''۔ **(بخاری، مسلم)**

قرض کے ذریعے لین دین کو تحریری شکل دینے کا حکم اس لیے دیا گیا ہے تاکہ کوئی اس کا انکار نہ کر سکے یا بھول نہ جائے۔ اس آیت سے درج ذیل نکات واضح ہوتے ہیں:

۱۔ قرض کے ذریعے لین دین جائز ہے۔

۲۔ قرض میں مدت کی شرط لازمی ہے۔

۳۔ اللہ تعالیٰ نے قرض تحریر کرنے کا حکم دیا ہے۔

۴۔ لکھنے والا عدل و انصاف کے ساتھ لکھے اور ذاتی دوستی یا دشمنی سے متاثر نہ ہو۔

۵۔ لکھنے والا انصاف کے قوانین سے واقف اور انصاف کے اہل ہو۔

۶۔ قرضدار کی تحریر پر اعتراف ضروری ہے، اور اگر قرضدار کم عقل، پاگل، گونگا یا کسی وجہ سے حقوق ادا نہ کر سکے تو اس کے وکیل کی بات اس کی جگہ قائم ہوگی۔

۷۔ قرضدار جب تحریر کروائے تو اللہ سے ڈرے اور حقوق یا شرائط میں کمی یا زیادتی نہ کرے۔

۸۔ خرید و فروخت میں گواہ مقرر کرنا ضروری ہے۔

۹۔ گواہ دو مرد یا ایک مرد اور دو عورتیں ہوں۔

۱۰۔ گواہی یقینی بات پر مبنی ہو، شک پر نہیں۔

۱۱۔ گواہ کی ضرورت پڑنے پر انکار نہ کرے۔

۱۲۔ لکھنے والے اور گواہ کو نقصان کا ذریعہ نہ بننا چاہئے، اور قرض دینے والا بھی ان کا نقصان نہ کرے۔

ایک مرد کے مقابلے میں دو عورتوں کی گواہی ضروری قرار دینے میں عورتوں کی بے حرمتی کا پہلو نہیں، بلکہ قرآن کے مطابق یہ اس لیے ہے کہ گواہی کے معاملے میں عورتوں سے غلطی ہونے کا امکان زیادہ ہے۔ عورتیں عام طور پر خرید و فروخت اور تجارتی دنیا سے کم اور گھریلو امور سے زیادہ واقف ہوتی ہیں، اس لیے پیچیدہ تجارتی معاملات میں سخت محنت اور درستگی کی صلاحیت کم ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ عورتوں میں امید و توقع کا پہلو بھی ان کے فیصلہ کرنے کی صلاحیت کو متأثر کرتا ہے۔ موجودہ سائنس کی تحقیقات اور ایجادات بھی اس بات کی تائید کرتی ہیں۔ مولانا عبدالماجد دریابادی نے اپنی انگریزی تفسیر ''سائکولوجی میں منووگیان کے سائنٹسٹ'' کے حوالے سے اس کی مثالیں پیش کی ہیں۔

In women deception is almost psychological. (Havelock Ellis: Man and woman P. 196)

''عورتوں کا فریب عموماً ذہنی (نفسیاتی) سطح پر ہوتا ہے''۔

"We are again forced to admit that a woman in not in a position to judge objectively being influenced by her emotion." (Baver opcit., i.p.289)

عورتوں کی فطری ذہنیت کو مدنظر رکھتے ہوئے، اسلام نے شہادت کے قوانین میں احتیاط کے ساتھ یہ مکمل طریقہ اختیار کیا ہے کہ اگر مردوں میں سے دو گواہ نہ ملیں تو ایک مرد اور دو عورتوں کو گواہ مقرر کیا جائے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ اگر ایک عورت معاملے کو درست طور پر نہ سمجھ پائے یا واقعے کو ٹھیک سے بیان نہ کر سکے، تو دوسری عورت اسے درست کر دے اور حقائق کی صحیح عکاسی ممکن ہو جائے۔

❁❁❁

ترجمہ- آیت نمبر ۲۸۳ سے ۲۸۶ تک

وَاِنۡ كُنۡتُمۡ عَلٰى سَفَرٍ وَّلَمۡ تَجِدُوۡا كَاتِبًا فَرِهٰنٌ مَّقۡبُوۡضَةٌ ؕ فَاِنۡ اَمِنَ بَعۡضُكُمۡ بَعۡضًا فَلۡيُؤَدِّ الَّذِى اؤۡتُمِنَ اَمَانَتَهٗ وَلۡيَتَّقِ اللّٰهَ رَبَّهٗ ؕ وَلَا تَكۡتُمُوا الشَّهَادَةَ ؕ وَمَنۡ يَّكۡتُمۡهَا فَاِنَّهٗۤ اٰثِمٌ قَلۡبُهٗ ؕ وَاللّٰهُ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ عَلِيۡمٌ ﴿۲۸۳﴾ لِلّٰهِ مَا فِى السَّمٰوٰتِ وَمَا فِى الۡاَرۡضِ ؕ وَاِنۡ تُبۡدُوۡا مَا فِىۡۤ اَنۡفُسِكُمۡ اَوۡ تُخۡفُوۡهُ يُحَاسِبۡكُمۡ بِهِ اللّٰهُ ؕ فَيَغۡفِرُ لِمَنۡ يَّشَآءُ وَيُعَذِّبُ مَنۡ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَىۡءٍ قَدِيۡرٌ ﴿۲۸۴﴾ اٰمَنَ الرَّسُوۡلُ بِمَاۤ اُنۡزِلَ اِلَيۡهِ مِنۡ رَّبِّهٖ وَالۡمُؤۡمِنُوۡنَ ؕ كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ ۫ لَا نُفَرِّقُ بَيۡنَ اَحَدٍ مِّنۡ رُّسُلِهٖ ۫ وَقَالُوۡا سَمِعۡنَا وَاَطَعۡنَا ۫ غُفۡرَانَكَ رَبَّنَا وَاِلَيۡكَ الۡمَصِيۡرُ ﴿۲۸۵﴾ لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفۡسًا اِلَّا وُسۡعَهَا ؕ لَهَا مَا كَسَبَتۡ وَعَلَيۡهَا مَا اكۡتَسَبَتۡ ؕ رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذۡنَاۤ اِنۡ نَّسِيۡنَاۤ اَوۡ اَخۡطَاۡنَا ۚ رَبَّنَا وَلَا تَحۡمِلۡ عَلَيۡنَاۤ اِصۡرًا كَمَا حَمَلۡتَهٗ عَلَى الَّذِيۡنَ مِنۡ قَبۡلِنَا ۚ رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلۡنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهٖ ۚ وَاعۡفُ عَنَّا ۟ وَاغۡفِرۡ لَنَا ۟ وَارۡحَمۡنَا ۟ اَنۡتَ مَوۡلٰٮنَا فَانۡصُرۡنَا عَلَى الۡقَوۡمِ الۡكٰفِرِيۡنَ ﴿۲۸۶﴾

ترجمہ:

(۲۸۳)۔اور اگر تم سفر پر ہو اور کوئی لکھنے والا نہ ملے، تو رہن (یعنی گروی) رکھنا کافی ہے۔ پھر اگر تم میں سے کوئی کسی دوسرے پر اعتماد کرے، تو جس پر اعتماد کیا گیا ہے، اسے چاہیے کہ اپنی امانت ادا کرے اور اللہ سے ڈرتا رہے، جو اس کا رب ہے۔ اور گواہی کو نہ چھپاؤ، اور جو شخص گواہی چھپائے گا، تو یقیناً اس کا دل گناہگار ہے، اور اللہ خوب جانتا ہے جو کچھ تم کرتے ہو۔ (۲۸۴)۔ آسمانوں اور زمین میں جو کچھ بھی ہے، سب اللہ ہی کا ہے۔ اور اگر تم اپنے دلوں کی باتیں ظاہر کرو یا چھپاؤ، اللہ تم سے ان کا حساب لے گا۔ پھر وہ جسے چاہے گا معاف کرے گا اور جسے چاہے گا سزا دے گا، اور اللہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔ (۲۸۵)۔ رسول ایمان لائے اُس وحی پر جو اُن پر اُن کے رب کی طرف سے نازل ہوئی، اور مومن بھی ایمان لائے۔ سب ایمان لائے اللہ پر، اُس کے فرشتوں پر، اُس کی کتابوں پر، اور اُس کے رسولوں پر۔ (اور انہوں نے کہا:) "ہم اللہ کے رسولوں میں کسی کے درمیان فرق نہیں کرتے۔ اور انہوں نے کہا: ہم نے سنا اور ہم نے اطاعت کی۔ اے ہمارے رب! ہم تیری بخشش کے طلب گار ہیں، اور تیری ہی طرف لوٹنا ہے۔ (۲۸۶)۔ اللہ کسی جان کو اُس کی طاقت سے بڑھ کر تکلیف نہیں دیتا۔ ہر ایک کے لیے ہے وہ (اجر) جو اس نے کمایا، اور اسی پر ہے وہ (وبال) جو اس نے کیا۔ اے ہمارے رب! اگر ہم سے بھول ہو جائے یا ہم سے غلطی ہو جائے تو

ہمارا مؤاخذہ نہ کرنا۔ اے ہمارے رب! ہم پر ایسا بوجھ نہ ڈال جیسا تُو نے ہم سے پہلے لوگوں پر ڈالا۔ اے ہمارے رب! ہم پر وہ بوجھ نہ ڈال جس کی ہمیں طاقت نہ ہو، اور ہمیں معاف فرما اور ہمیں بخش دے، اور ہم پر رحم فرما۔ تُو ہی ہمارا مالک ہے، پس کافروں کی قوم پر ہماری مدد فرما۔

تفسیر- آیت نمبر ۲۸۳ سے ۲۸۶ تک

آیت نمبر (۲۸۳) وَاِنْ كُنْتُمْ عَلٰى سَفَرٍ وَّلَمْ تَجِدُوْا كَاتِبًا فَرِهٰنٌ مَّقْبُوْضَةٌ ؕ فَاِنْ اَمِنَ بَعْضُكُمْ بَعْضًا فَلْيُؤَدِّ الَّذِى اؤْتُمِنَ اَمَانَتَهٗ وَلْيَتَّقِ اللّٰهَ رَبَّهٗ ؕ وَلَا تَكْتُمُوا الشَّهَادَةَ ؕ وَمَنْ يَّكْتُمْهَا فَاِنَّهٗۤ اٰثِمٌ قَلْبُهٗ ؕ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ عَلِيْمٌ ﴿۲۸۳﴾

ترجمہ: ''اور اگر تم سفر پر ہو اور کوئی لکھنے والا نہ ملے، تو رہن (یعنی گروی) رکھنا کافی ہے۔ پھر اگر تم میں سے کوئی کسی دوسرے پر اعتماد کرے، تو جس پر اعتماد کیا گیا ہے، اسے چاہیے کہ اپنی امانت ادا کرے اور اللہ سے ڈرتا رہے، جو اس کا رب ہے۔ اور گواہی کو نہ چھپاؤ، اور جو شخص گواہی چھپائے گا، تو یقیناً اس کا دل گناہگار ہے، اور اللہ خوب جانتا ہے جو کچھ تم کرتے ہو''۔

تفسیر

گروی یا رہن

اگر کوئی شخص سفر میں ہو اور اسے قرض لینے کی ضرورت پیش آئے اور لکھنے کے لیے کاغذ قلم دستیاب نہ ہو، تو ایسی صورت میں قرض لینے والا اپنی کوئی چیز قرض دینے والے کے پاس گروی رکھ دے۔ گروی اس بات کا ثبوت ہے کہ گروی رکھنے والے کے پاس جو چیز موجود ہے، اس کے بدلے قرض لینے والے کا حق محفوظ ہے۔ اس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ گروی اور ضمانت کے ذریعے لوگوں کے حقوق کی حفاظت ممکن ہے اور جھگڑوں و تنازعات کے دروازے بند ہو جاتے ہیں۔

یہ بھی ضروری ہے کہ گروی ہمیشہ صاحبِ حق کے قبضے میں رہے اور اس کا ذکر تحریر میں آ جائے۔ اگر گروی رکھنے والے اور دینے والے کے درمیان قرض کی مقدار میں اختلاف پیدا ہو جائے تو حق ہمیشہ صاحب حق کے ساتھ تسلیم کیا جائے گا، کیونکہ رہن بطور ضمانت اسی کے پاس موجود ہے۔

رہن کا مطلب ہے ''چیز گروی رکھنا'' اور حدیث میں بھی اس کی اجازت ثابت ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک یہودی سے اناج خریدا اور اپنی زرہ اُس کے پاس گروی رکھی۔

(صحیح بخاری حدیث نمبر: ۲۵۰۹)

اگر گروی رکھی ہوئی چیز سے نفع حاصل ہوتا ہو تو اُس کا حق مالک کو ہے۔ البتہ اگر گروی پر کچھ خرچ ہوتا ہے تو قرض دینے والا اپنا خرچ وصول کر سکتا ہے، اور باقی نفع مالک کو دینا ضروری ہے۔

حضرت نعمان بن بشیرؓ سے روایت ہے کہ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صحابۂ کرامؓ کو نصیحت کرتے ہوئے فرمایا: ''سن لو! جسم میں گوشت کا ایک ٹکڑا ایسا ہے کہ جب وہ درست ہو تو پورا جسم درست رہتا ہے، اور جب وہ بگڑ جائے تو سارا جسم بگڑ جاتا ہے۔ یاد رکھو وہ ٹکڑا انسان کا دل ہے''۔ (صحیح بخاری، رقم:۵۲)

آیت نمبر (۲۸۴) لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ؕ وَاِنْ تُبْدُوْا مَا فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ اَوْ تُخْفُوْهُ يُحَاسِبْكُمْ بِهِ اللّٰهُ ؕ فَيَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۲۸۴﴾

ترجمہ: ''آسمانوں اور زمین میں جو کچھ بھی ہے، سب اللہ ہی کا ہے۔ اور اگر تم اپنے دلوں کی باتیں ظاہر کرو یا چھپاؤ، اللہ تم سے ان کا حساب لے گا۔ پھر وہ جسے چاہے گا معاف کرے گا اور جسے چاہے گا سزا دے گا، اور اللہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے''۔

تفسیر اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت اور علم کا ذکر فرمایا ہے کہ وہ بندوں کے تمام حالات جانتے ہیں، اور ان کے دلوں کی ظاہر و چھپی ہر بات پر نظر رکھتے ہیں۔ وہ جسے چاہیں معاف کر دیں اور جسے چاہیں عذاب دیں۔

امام احمد، مسلم، نسائی وغیرہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کی ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو صحابہ کرامؓ بہت پریشان ہوئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''تم لوگ کہو کہ اے ہمارے رب! ہم نے سنا اور اطاعت و بندگی کے لیے جھک گئے''۔

اس کے بعد اللہ نے اُن کے دلوں کو ایمان سے بھر دیا اور یہ آیت نازل ہوئی: ''لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا''۔ یعنی ہر شخص کو صرف اپنی طاقت اور وسعت کے مطابق ہی ذمہ داری دی جائے گی، اور اس سے پہلے والی آیت منسوخ ہو گئی۔ امام بخاریؒ کے مطابق، آیت: ''وَإِن تُبْدُوا مَا فِيٓ أَنْفُسِكُمْ أَوْ تُخْفُوهُ'' بعد کی آیت کے ذریعے منسوخ ہو چکی۔

اسی سلسلے میں علی ابن مسعود، شعبی، عکرمہ، سعید بن جبیر اور قتادہ کا بھی یہی قول ہے۔ لیکن ابن جریر نے حسن بصریؒ کے قول کو نقل کیا کہ یہ آیت منسوخ نہیں بلکہ محکم حکم میں ہے۔ ابن جریج نے اسی قول کو اپنایا اور دلیل دی کہ ممکن ہے اللہ تعالیٰ حساب لینے کے بعد معاف کر دیں، جیسا کہ صحیحین کی روایت میں بیان ہوا ہے کہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ

اپنے بندے کے کان کے قریب جا کر اس کے گناہوں کا اعتراف کروائیں گے اور کہیں گے: ''میں نے دنیا میں تمہاری پردہ پوشی کی تھی اور آج تمہیں معاف کرتا ہوں''۔

کچھ دیگر علماء جو اس آیت کے منسوخ نہ ہونے کے قائل ہیں، کہتے ہیں کہ یہاں آیت سے مراد پختہ ارادہ اور صاف نیت ہے، یعنی انسان کو صرف اپنے قول و عمل کا جوابدہ ٹھہرایا جائے گا۔

آیت نمبر (۲۸۵) اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ ؕ كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ ۫ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ ۫ وَقَالُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا ۫ غُفْرَانَكَ رَبَّنَا وَاِلَيْكَ الْمَصِيْرُ ﴿۲۸۵﴾

ترجمہ: ''رسول ایمان لائے اُس وحی پر جو اُن پر اُن کے رب کی طرف سے نازل ہوئی، اور مومن بھی ایمان لائے۔ سب ایمان لائے اللہ پر، اُس کے فرشتوں پر، اُس کی کتابوں پر، اور اُس کے رسولوں پر۔ (اور انہوں نے کہا:) ہم اللہ کے رسولوں میں کسی کے درمیان فرق نہیں کرتے۔ اور انہوں نے کہا: ہم نے سنا اور ہم نے اطاعت کی۔ اے ہمارے رب! ہم تیری بخشش کے طلب گار ہیں، اور تیری ہی طرف لوٹنا ہے''۔

تفسیر یہ سورہ بقرہ کی آخری دو آیتیں ہیں۔ ان کی تفسیر و تشریح سے قبل ان کی فضیلت بیان کی جاتی ہے، جیسا کہ صحیح حدیثوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے:

۱۔ صحیح بخاری میں روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''جس شخص نے رات کو یہ دونوں آیتیں پڑھ لیں تو یہ اُس کے لیے کافی ہیں''۔

۲۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ نے دو آیتیں جنت کے خزانے میں سے نازل فرمائی ہیں، جنہیں رحمن تعالیٰ نے تمام مخلوق کی پیدائش سے دو ہزار سال پہلے لکھ دیا تھا۔ جو شخص ان آیات کو عشاء کی نماز کے بعد پڑھے، اس کے لیے یہ تہجد کے برابر ہیں''۔

۳۔ ایک حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''اللہ تعالیٰ نے سورہ بقرہ کو ان دو آیات پر ختم فرمایا ہے جو مجھے اُس خاص خزانے سے عطا کی گئی ہیں جو عرش کے نیچے ہے۔ اس لیے تم خاص طور پر ان آیات کو سیکھو اور اپنی عورتوں اور بچوں کو سکھاؤ''۔

۴۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''ہمارا خیال ہے کہ جو شخص عقل رکھتا ہو، وہ سورہ بقرہ کی ان

دونوں آیات کو پڑھے بغیر نہ سوئے''۔

۵۔سورہ بقرہ کی یہ آخری دو آیات حضرت محمد ﷺ کو معراج میں بلا واسطہ عطا ہوئیں۔حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے کہ معراج میں رسول اللہ ﷺ کو تین چیزیں عطا ہوئیں: پانچ نمازیں، سورہ بقرہ کی آخری دو آیات، اور ہر مؤمن کی بخشش۔

۶۔حضرت عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں: ''جو شخص نمازِ عشاء کے بعد سورہ بقرہ کی آخری دو آیات پڑھے، اسے ساری رات عبادت کا ثواب ملتا ہے''۔(درمنثور)

حدیث کی معتبر اور مستند کتابوں میں ان دونوں آیات کے بے شمار فضائل بیان ہوئے ہیں، جو مؤمن کے لیے روحانی فوائد اور اللہ کی رضا کا ذریعہ ہیں۔

وَاِنۡ تُبۡدُوۡا مَا فِیۡۤ اَنۡفُسِکُمۡ اَوۡ تُخۡفُوۡهُ یُحَاسِبۡکُمۡ بِهِ اللّٰهُ

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ جو کچھ دلوں میں ہے، چاہے اسے ظاہر کرو یا چھپاؤ، ہر حال میں اللہ تعالیٰ اس کا حساب لیں گے۔جب صحابۂ کرامؓ نے اس الفاظ کو سنا تو وہ پریشان ہو گئے اور حضرت محمد ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔انہوں نے عرض کیا: ''یا رسول اللہ ﷺ! یہ حکم بہت مشکل ہے۔جان بوجھ کر گناہ تو بچا جا سکتا ہے، مگر دل میں اچانک آنے والے خیالات اور غیر اختیاری وسوسوں سے بچنا ممکن نہیں۔اگر ہر خیال کا حساب ہوگا تو عذاب سے نجات پانا بہت دشوار ہو جائے گا''۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''تم بنی اسرائیل کی طرح انکار مت کرو اور دل و جان سے اللہ کے حکم کو قبول کر لو''۔

اہلِ کتاب کے انداز میں دعا کرنے کی مثال دیتے ہوئے، آپ ﷺ نے صحابہ کو یہ تعلیم دی کہ کہیں: ''اے ہمارے رب! ہم نے آپ کا حکم سنا اور اطاعت و بندگی کے لیے جھک گئے۔اگر حکم کی تعمیل میں کوئی کمی یا کوتاہی ہوئی تو اسے معاف فرما دیجئے، اور ہم سب کی واپسی صرف آپ کی طرف ہے''۔

صحابۂ کرامؓ نے ادب اور فرمانبرداری کے ساتھ یہی طریقہ اختیار کیا، جس پر اللہ تعالیٰ نے انہیں پسند فرمایا۔اس کے بعد سورہ بقرہ کی آخری دو آیات نازل ہوئیں، جو صحابہ کی تعریف اور ان کے دل میں پیدا شدہ شک و شبہ کا جواب ہیں۔

ان آیات میں واضح ہوا کہ انسان صرف اپنی طاقت اور اختیار کے مطابق ذمہ دار ہے، اور دل میں غیر اختیاری خیالات یا وسوسوں کے لیے کوئی عذاب نہیں۔اس طرح پہلی آیت میں صحابۂ کرامؓ کی تعریف اس طرح بیان ہوئی:

وہ رسول اللہ ﷺ کے ذریعے اللہ کی وحی پر ایمان رکھتے ہیں، چاہے وہ قرآن ہو یا دیگر صحائف۔اسی طرح اللہ کی ذات، صفات اور اس کی یکتائی پر ایمان رکھتے ہیں۔اسی طرح فرشتوں پر ایمان رکھتے ہیں کہ وہ پاک اور اللہ کے

احکام پر مامور ہیں اور پیغمبروں پر ایمان رکھتے ہیں، اور کسی میں فرق نہیں کرتے اور کہتے ہیں: ''ہم نے آپ کا ارشاد سنا اور خوشی سے قبول کیا۔ اے ہمارے پروردگار! ہم آپ کی بخشش چاہتے ہیں اور ہم سب کی واپسی آپ ہی کی طرف ہے''۔

یہاں علماء کا کہنا ہے کہ صحابہ کی تعریف کے لیے رسول اللہ ﷺ کو بھی شامل کیا گیا، تاکہ یہ ظاہر ہو کہ صحابہ کا ایمان کامل ہے کیونکہ ان کا ایمان رسول اللہ ﷺ کے ایمان سے منسلک ہے۔

دوسری بات جس پر صحابہ کی تعریف کی گئی، وہ یہ ہے کہ وہ رسول اللہ ﷺ کے تمام نبیوں کی حیثیت اور حقانیت کو تسلیم کرتے ہیں، جیسا کہ پچھلی امتوں نے نہیں کیا تھا۔ یہود نے حضرت موسیٰؑ کو قبول کیا مگر حضرت عیسیٰؑ کو نہیں، اور نصاریٰ نے حضرت عیسیٰؑ کو قبول کیا مگر حضرت محمد ﷺ کو نہیں۔

تیسری بات جس پر تعریف ہوئی، وہ یہ ہے کہ صحابۂ کرامؓ رسول اللہ ﷺ کے ارشاد کے مطابق عمل کرتے ہیں، کہتے ہیں: ''ہم نے حکم سنا اور خوشی سے قبول کیا۔ ہم آپ کی بخشش چاہتے ہیں اور آپ ہی کی طرف لوٹتے ہیں''۔

آخری آیت میں صحابہ کے دلوں میں پیدا شدہ شک اور شبہ کو دور کیا گیا کہ دل میں غیر اختیاری خیالات اور وسوسے آنے پر بھی بندہ عذاب سے محفوظ ہے، بشرطیکہ وہ اپنے اختیار اور ارادہ سے عمل نہ کرے اور زبان سے بیان نہ کرے۔

آیت نمبر (۲۸۶) لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا ؕ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ ؕ رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَآ اِنْ نَّسِيْنَآ اَوْ اَخْطَاْنَا ۚ رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْ عَلَيْنَآ اِصْرًا كَمَا حَمَلْتَهٗ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِنَا ۚ رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهٖ ۚ وَاعْفُ عَنَّا ۟ وَاغْفِرْ لَنَا ۟ وَارْحَمْنَا ۟ اَنْتَ مَوْلٰىنَا فَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۲۸۶﴾

ترجمہ: ''اللہ کسی جان کو اُس کی طاقت سے بڑھ کر تکلیف نہیں دیتا۔ ہر ایک کے لیے ہے وہ (اجر) جو اس نے کمایا، اور اسی پر ہے وہ (وبال) جو اس نے کیا۔ اے ہمارے رب! اگر ہم سے بھول ہو جائے یا ہم سے غلطی ہو جائے تو ہمارا مؤاخذہ نہ کرنا۔ اے ہمارے رب! ہم پر ایسا بوجھ نہ ڈال جیسا تُو نے ہم سے پہلے لوگوں پر ڈالا۔ اے ہمارے رب! ہم پر وہ بوجھ نہ ڈال جس کی ہمیں طاقت نہ ہو، اور ہمیں معاف فرما اور ہمیں بخش دے، اور ہم پر رحم فرما۔ تُو ہی ہمارا مالک ہے، پس کافروں کی قوم پر ہماری مدد فرما''۔

تفسیر ارشاد ہوتا ہے کہ پچھلی آیت میں جس کا ذکر آیا کہ دل کی چھپی باتوں کا بھی حساب ہوگا، اس سے مراد وہ خیالات نہیں جو بغیر اختیار خود بخود دل میں اُبھریں، بلکہ وہ کام ہیں جو انسان اپنی مرضی اور اختیار سے انجام دیتا ہے۔

کیونکہ اللہ تعالیٰ کسی شخص پر صرف اسی کا فرض عائد فرماتا ہے جو اُس کی طاقت اور استطاعت میں ہو۔ اسی طرح، جو اعمال انسان اپنی طاقت اور اختیار کے مطابق کرے گا، اس کا ثواب بھی اسی کے لیے ہوگا، اور جو اپنے اختیار سے باہر ہوگا، اس پر عذاب نہیں ہوگا۔

اس آیت سے صحابۂ کرامؓ کو اطمینان حاصل ہوا کہ دل میں اچانک آنے والے غیر اختیاری خیالات پر نہ کوئی حساب ہوگا اور نہ عذاب۔ احادیث سے بھی اس کی تصدیق ملتی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ میری امت کی اُن باتوں سے درگزر فرمائے گا جو دل میں خیالات کے طور پر پیدا ہوں، جب تک وہ عمل یا زبان کے ذریعے ظاہر نہ ہوں۔

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو صحابۂ کرامؓ پر بہت بھاری گزری۔ وہ رسول اللہ ﷺ کے پاس آئے، گھٹنوں کے بل بیٹھ گئے اور عرض کیا: ''اے رسول اللہ ﷺ! اللہ تعالیٰ نے یہ آیت ہم پر نازل فرمائی ہے اور ہم اس کی طاقت نہیں رکھتے''۔

آپ ﷺ نے فرمایا: ''کیا تم چاہتے ہو کہ ایسا کہو جیسا اہلِ کتاب نے کہا: ہم نے سنا اور نافرمانی کی؟ بلکہ ایسا کہو: اطاعت و فرمانبرداری کے ساتھ سن لیا اور اللہ کی مدد سے عمل کریں گے''۔ وَقَالُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا ۫ غُفْرَانَكَ رَبَّنَا وَاِلَيْكَ الْمَصِيْرُ بس جب انہوں نے ایسا ہی کیا تو اللہ تعالیٰ نے اُسے منسوخ کر کے یہ آیت نازل فرمائی: لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا ۔ **(بخاری رقم:۳۲۹)**

فضیلت

● حضرت ابو مسعود البدریؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''جس نے رات کو سورہ بقرہ کی آخری دو آیتیں پڑھ لیں، وہ اُس کے لیے رات کی عبادت کے لیے کافی ہیں''۔ **(صحیح بخاری، المغازی، حدیث ۴۰۰۸)**

● حضرت ابو ذرؓ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ''میری امت کی خطا و نسیان یعنی بھول چوک اور مجبوری معاف کر دی گئی ہے''۔ **(ابن ماجہ رقم: ۲۰۴۳)**

خلاصہ یہ ہے کہ غلط عقیدہ، بد اخلاقی، یا گناہ کا پکا ارادہ رکھنے والوں پر عذاب یا سزا ہوگی، لیکن دل میں اچانک آنے والے غیر اختیاری وسوسوں پر نہ پکڑ ہوگی اور نہ گناہ شمار ہوگا۔

سورہ کے اختتام پر مؤمنوں کو ایک خاص دعا سکھائی گئی ہے تاکہ وہ اس طرح اللہ سے دعا کریں: ''اے ہمارے رب! ہماری بھول چوک پر پکڑ نہ ڈال، اور ہم پر ایسا سخت حکم نہ بھیج جیسا تم نے پہلے لوگوں پر بھیجا تھا۔ اے ہمارے رب! ہم پر ایسی تکلیف یا بوجھ نہ ڈال جو ہم برداشت نہ کر سکیں۔ ہم پر درگزر فرما، ہمیں معاف فرما اور ہم پر رحم کر۔ تو ہمارا پالنے والا ہے، پس ہمیں کافروں پر غالب فرما''۔

یعنی سورہ کے اختتام پر اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو یہ دعا سکھائی کہ اپنی غلطیوں اور بھول چوک کو پیش نظر رکھتے ہوئے دعا کریں کہ: ''اے ہمارے رب! تیرا حق ہم سے کہاں ادا ہوسکتا ہے؟ ہماری بھول چوک اور کوتاہیوں پر مؤاخذہ نہ فرما۔ ہمارے سروں پر حکموں کا بوجھ نہ رکھ جو ہماری طاقت سے بڑھ کر ہو، اور ہمیں ایسی مصیبتوں میں مبتلا نہ کر جو ہم برداشت نہ کرسکیں''۔ یہاں پہلے لوگوں سے مراد بنی اسرائیل ہیں، جو اپنی بھول چوک سے بھی گناہ کرتے تو فوراً سزا پاتے۔ حلال چیزیں حرام ہوجاتی تھیں، اور جان بوجھ کر گناہ کرنے کی صورت میں توبہ کا کوئی آسان راستہ نہ تھا، بلکہ جان دے دینا ہی واحد چارہ ہوتا۔

بنی اسرائیل کے لیے احکام بہت سخت تھے: جان بوجھ کر گناہ کی سزا قتل تھی، زکوٰۃ میں چوتھائی مال دینے کا حکم تھا، اور اگر کپڑے پر کہیں نجاست لگ جاتی تو وہ دھونے سے پاک نہ ہوتی بلکہ اس حصہ کو کاٹنے کا حکم دیا جاتا۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمت اور مصلحت کے تحت اپنی سابقہ امتوں کے سرکش اور متکبر لوگوں پر سخت احکام نازل فرمائے تھے۔

دعائے اختتام

آیات کے آخر میں مسلمانوں کو یہ دعا سکھائی گئی کہ: ''اے ہمارے پروردگار! چونکہ ناقابلِ برداشت مصیبتیں بھی ہمارے ہی گناہوں کی وجہ سے ہیں، اس لیے ہم تجھ سے درخواست کرتے ہیں کہ ہمارے گناہوں کو معاف فرما اور ہماری پردہ پوشی فرما۔ دنیا و آخرت کی ذلت سے ہمیں بچا، اور معافی کے بعد ہم پر اپنی مہربانی اور احسان فرما۔ تو ہی ہمارا آقا، ولی اور دوست ہے، اور ہم تیرے غلام، نام لے کر یاد کرنے والے اور تیرے عاشق ہیں۔ بس ہمیں اپنے دشمنوں کے مقابلے میں خاص مدد عطا فرما، اور کافروں کے مقابلے میں ہمیں فتح و نصرت عطا فرما۔ کافروں کی قوم تیرے اور تیرے دین، پیغمبروں اور دوستوں کی دشمن ہے، اور تو ہی اپنے غلاموں کا مددگار ہے، لہٰذا اپنے دوستوں کے دشمنوں کے مقابلے میں ہماری مدد فرما تاکہ ہم بے خوف تیرے عبادت گزار بن سکیں اور تیرے احکام کو بلا کسی رکاوٹ نافذ کرسکیں''۔

حدیث سے ثابت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ سب دعائیں قبول فرمائیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ذریعہ اس کا اظہار کردیا۔ یہ اللہ کا بے انتہا شکر و احسان ہے کہ ہمیں ایسی برگزیدہ امت میں پیدا فرمایا۔

اس طرح سورہ بقرہ کا اختتام معافی، مغفرت اور رحمت کی طلب پر ایمان و تقویٰ کے ساتھ کافروں کی قوم پر فتح و نصرت اور دینی و دنیاوی کامیابی کی درخواست پر ہوا، اور جس طرح سورہ کی ابتدا ایمان کی تحقیق اور متقین کی فضیلت کے ذکر سے ہوئی تھی، اسی طرح اختتام بھی انہی موضوعات پر مشتمل ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمارے دلوں میں قرآن کی تعلیمات پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے اور اس کے پڑھنے اور سننے کو ہم سب کے لیے نجات، مغفرت اور رحمت کا ذریعہ بنائے۔

❁❁❁

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سورہ آلِ عمران کا مختصر تعارف

الحمدللہ، اب ہم قرآن کی تیسری سورہ، سورۂ آلِ عمران، کی تفسیر کی جانب بڑھ رہے ہیں۔ اس سورہ کی تشریح سے قبل اس کے مختلف پہلوؤں کا مختصر تعارف پیش کیا جاتا ہے، جس میں اس کی وجۂ تسمیہ، فضیلت، مقام وسببِ نزول، خلاصۂ مضامین، تعداد آیات ورکوع وغیرہ شامل ہیں۔

ترتیبِ قرآنی کے لحاظ سے یہ سورہ تیسری نمبر پر ہے، مگر نزول کی ترتیب میں اسے ۹۷ نمبر دیا گیا ہے، یعنی اس سے پہلے ۹۶ سورہ نازل ہوچکی تھیں اور تقریباً ۱۷ سورہ اس کے بعد نازل ہوئیں۔ یہ سورہ مدنی ہے اور اس میں ۲۰۰ آیات، ۲۰ رکوعات، ۳۵۴۲ کلمات اور ۱۵۳۲۶ حروف ہیں۔

نام اور اس کے معانی

اس سورہ کا بنیادی نام ''آلِ عمران'' ہے۔ ''عمران'' حضرت موسیٰؑ اور حضرت ہارونؑ کے والد کا نام بھی تھا، اور یہ نام حضرت مریم کے والد کے لیے بھی استعمال ہوا، جن کے درمیان تقریباً ۱۸۰۰ سال کا فاصلہ ہے۔ علماء میں اختلاف ہے کہ سورہ میں کون سے عمران کا ذکر مراد ہے، لیکن اکثر علما کے نزدیک یہاں حضرت مریم کے والد عمران کا حوالہ ہے، کیونکہ سورہ میں آلِ عمران کے خاندان کے بارے میں ۳۳ سے ۶۷ آیات میں حضرت عیسیٰؑ، یحییٰؑ، مریمؑ اور ان کی والدہ کا ذکر ہے۔ لہٰذا اس سورہ کا نام ''آلِ عمران'' رکھا گیا۔

اس سورہ کے دیگر نام بھی ہیں:

زہراء: کیونکہ یہ اہلِ کتاب کے شبہات کو دور کرتی ہے اور حضرت عیسیٰؑ کے بارے میں حقائق بیان کرتی ہے۔

امان: کیونکہ یہ قارئین کو حضرت عیسیٰؑ کی شان میں کسی غلط فہمی سے محفوظ رکھتی ہے۔

کنز: اس لیے کہ یہ عیسوی اسرار کا خزانہ ہے۔

مجادلہ: کیونکہ اس کی ۸۰ سے زائد آیات نجران کے نصاریٰ کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مناظروں سے متعلق ہیں۔

الاستغفار: اس نام کا ماخذ آیتِ ''وَالْمُسْتَغْفِرِينَ بِالْأَسْحَارِ'' ہے۔

طیبہ: کیونکہ اس میں ''طَيِّبِينَ'' یعنی اچھے لوگوں کا ذکر آیا ہے، جیسا کہ آیتِ ''الصّٰبِرِيْنَ وَالصّٰدِقِيْنَ وَالْقٰنِتِيْنَ وَالْمُنْفِقِيْنَ وَالْمُسْتَغْفِرِيْنَ بِالْاَسْحَارِ'' میں بیان ہوا ہے۔

ان ناموں اور ان کے معانی سے سورۂ آلِ عمران کے مرکزی مضامین واضح ہوتے ہیں: ایمان، صبر، صدق، اخلاص، خیرات، استغفار اور اہلِ ایمان کی تربیت۔

اسبابِ نزول

قرطبی لکھتے ہیں کہ یہ سورہ بلا جھجک مدنی ہے اور اس کی دلیل ابتدائی تقریباً ۸۳ آیات ہیں جو نجران کے عیسائی وفد کے متعلق نازل ہوئیں۔ یہ وفد مدینہ منورہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس ۹ ہجری میں حاضر ہوا تھا۔

سورۂ آلِ عمران کے بیشتر حصے اسی دور میں نازل ہوئے جب مسلمان مکہ مکرمہ سے ہجرت کر کے مدینہ منورہ پہنچ چکے تھے، مگر وہاں بھی کفار کے ہاتھوں انہیں متعدد مشکلات کا سامنا تھا۔ سب سے پہلے غزوۂ بدر پیش آیا، جس میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو غیر معمولی فتح عطا فرمائی اور کفارِ قریش کے بڑے سردار مارے گئے۔ اس شکست کا بدلہ لینے کے لیے اگلے سال قریش نے مدینہ منورہ پر حملہ کیا، جس کے نتیجے میں غزوۂ اُحد پیش آیا اور مسلمانوں کو بعض نقصانات اٹھانے پڑے۔ انہی دونوں غزوات کا ذکر اس سورہ میں آیا ہے۔

جہاں سورۂ بقرہ میں یہودیوں کے عقائد و اعمال کی تفصیل بیان ہوئی اور عیسائیوں کا ضمنی ذکر آیا، وہیں سورۂ آلِ عمران میں اصل مخاطب عیسائیوں کا گروہ ہے اور ضمنی طور پر یہودیوں کا بھی تذکرہ ہے۔ عرب کے علاقے نجران میں بڑی تعداد میں عیسائی آباد تھے اور ایک بار ان کا ایک وفد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس آیا۔ اس وفد کے ذکر میں سورۂ آلِ عمران کا تقریباً ابتدائی نصف حصہ انہی دلائل کے جواب اور حضرت عیسیٰؑ کی صحیح حیثیت کو واضح کرنے کے لیے نازل ہوا۔

ابتدائی ۸۳ آیات کے نزول کا واقعہ کچھ یوں ہے: نجران کے عیسائیوں کی ایک جماعت، جس کی تعداد تقریباً ۶۰ افراد تھی، مدینہ منورہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مذہبی بحث و مناظرہ کے لیے آئی۔ نجران یمن کے علاقے میں واقع ایک شہر تھا جو اس وقت عیسائیوں کی بڑی آبادی اور علمی مرکز تھا۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت و رسالت کی خبر جب وہاں پہنچی تو نجران کے عیسائیوں کا ایک وفد مدینہ منورہ پہنچا۔

ان ۶۰ افراد کے جتھے میں ۱۴ افراد خاص طور پر بڑے معزز اور سردار تھے، جن میں تین شخصیات سب سے ممتاز تھیں:

۱۔ امیر و سردار: عبدالمسیح عاقب، جو دولت، سرداری اور بصیرت کے لحاظ سے نمایاں تھے۔

۲۔ اُن کا وزیر و مشیر: ایہم، جو تدبیر و دانشوری میں مشہور تھے۔

۳۔ سب سے بڑا مذہبی عالم اور پادری: ابوحارثہ بن علقمہ، جسے روم کے بادشاہ بڑی عزت دیتے تھے۔

جب یہ وفد مدینہ منورہ پہنچا تو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے حضرت عیسیٰؑ کے سلسلے میں بات چیت شروع ہوئی۔ گفتگو میں یہ تین شخصیات نمایاں تھیں، جو حضرت مسیح کو معبود ماننے کے قائل تھے اور حضرت عیسیٰؑ کو اللہ کا بیٹا قرار دیتے تھے۔ انہوں نے حضرت عیسیٰؑ کی الوہیت کے سلسلے میں جو دلائل پیش کیے، ان پر سورۂ آلِ عمران میں تفصیل سے روشنی ڈالی گئی۔

حضرت عیسیٰؑ سے متعلق نصاریٰ کے دلائل اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا جواب

نصاریٰ نے حضرت عیسیٰؑ کے لیے جو دلائل پیش کیے، وہ درج ذیل تھے:

۱۔ حضرت عیسیٰؑ مُردوں کو زندہ کرتے ہیں۔ ۲۔ بیماروں کو شفا دیتے ہیں۔ ۳۔ غیب کی باتیں بیان کرتے ہیں۔ ۴۔ مٹی کے پرندے بنا کر اُن میں پھونک مارتے ہیں تو وہ زندہ ہو جاتے ہیں۔

اسی طرح انہوں نے حضرت عیسیٰؑ کو اللہ کا بیٹا قرار دینے کے لیے یہ دلائل دیے:

۱۔ حضرت عیسیٰؑ بغیر والد کے پیدا ہوئے، اس سے معلوم ہوا کہ یہ اللہ کے بیٹے ہیں۔ ۲۔ حضرت عیسیٰؑ چند دن کے تھے کہ کلام کرنے لگے، اور ان سے پہلے کسی نے بچپن میں کلام نہیں کیا، یہ بھی اللہ کے بیٹے ہونے کی دلیل تھی۔

مزید یہ کہ مسئلہ تثلیث، یعنی حضرت عیسیٰؑ کو ثلاثہ (تین خداؤں میں سے ایک) ماننے کے لیے یہ دلیل پیش کی گئی کہ قرآن میں جگہ جگہ اللہ فرماتا ہے: ''ہم نے یہ کیا، ہم نے وہ پیدا کیا، ہم نے یہ حکم دیا'' یہ تمام جملے جمع کے صیغے ہیں اور جمع کا پہلا درجہ تین سمجھا گیا۔ اس سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی کہ اللہ تنہا نہیں، بلکہ اس کے ساتھ عیسیٰؑ اور مریمؑ بھی ہیں، ورنہ اللہ فرماتا ''میں نے یہ کیا، میں نے یہ حکم دیا''۔ ان تمام دلائل کے جواب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

۱۔ کیا تمہیں معلوم نہیں کہ بیٹا باپ کے ہمشکل ہوتا ہے؟ اُنہوں نے کہا: کیوں نہیں۔

۲۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: کیا تم نہیں جانتے کہ اللہ تعالیٰ زندہ ہے اور اُس پر موت کا اثر نہیں ہوتا؟ لیکن حضرت عیسیٰؑ کو موت ضرور آئے گی۔ نصاریٰ نے اقرار کیا کہ یہ صحیح ہے۔

یہاں غور طلب بات یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نصاریٰ کے الزام کے جواب میں یہ نہیں فرمایا کہ ''تمہارے عقیدے کے مطابق حضرت عیسیٰؑ کو موت آ چکی ہے''، کیونکہ نصاریٰ کا عقیدہ یہ ہے کہ حضرت عیسیٰؑ کو صلیب پر چڑھا دیا گیا اور وہ مقتول ہو گئے، جو باطل اور حقیقت کے خلاف ہے۔

واقعیت یہ ہے کہ حضرت عیسیٰؑ نہ قتل ہوئے اور نہ صلیب پر لٹکائے گئے، بلکہ اللہ تعالیٰ نے انہیں زندہ آسمان پر اٹھا لیا ہے۔ قیامت کے قریب وہ دجال کو قتل کرنے کے لیے آسمان سے نازل ہوں گے اور پھر کچھ دنوں بعد وفات پائیں گے، اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پڑوس میں ایک مخصوص قبر میں دفن ہوں گے۔ یہی وجہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے

فرمایا کہ حضرت عیسیٰؑ کو موت اور فنا ضرور آئے گی۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: کیا تم نہیں جانتے کہ اللہ تعالیٰ ہی ہر چیز کا مالک، محافظ اور روزی دینے والا ہے؟ انہوں نے اقرار کیا کہ بے شک ایسا ہے۔ پھر آپ ﷺ نے فرمایا: بتاؤ، کیا حضرت عیسیٰؑ بھی کسی چیز کے مالک یا قادر تھے؟ کیا انہوں نے مخلوقات پیدا کیں یا اپنی قدرت سے کسی چیز کو مستقل وجود بخشا؟ انہوں نے کہا: نہیں۔

پھر نبی کریم ﷺ نے وضاحت فرمائی کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰؑ کی شکل وصورت اپنی مرضی سے اُن کی والدہ کے رحم میں بنائی۔ پھر فرمایا: کیا تم نہیں جانتے کہ اللہ تعالیٰ نہ کھاتا ہے، نہ پیتا ہے اور نہ پاخانہ پیشاب کرتا ہے؟ انہوں نے تصدیق کی کہ یہ درست ہے۔

پھر رسول اللہ ﷺ نے بیان کیا کہ حضرت عیسیٰؑ کی والدہ نے انہیں ویسے ہی پیٹ میں رکھا جیسے ہر عورت اپنے بچے کو رکھتی ہے، پھر پیدائش ہوئی، اور وہ بچوں کی طرح غذا لیتے، بڑے ہوئے، کھاتے، پیتے اور پیشاب کرتے تھے۔ انہوں نے اقرار کیا کہ یہ سب درست ہے۔

آخر میں آپ ﷺ نے فرمایا: جب تمہیں یہ تمام باتیں معلوم ہیں، تو پھر بتاؤ کہ ایسے ہونے کے باوجود حضرت عیسیٰؑ اللہ کیسے ہو سکتے ہیں، جیسا کہ تمہارا دعویٰ ہے؟

اس مناظرہ سے نصاریٰ نے حق پہچان لیا مگر جان بوجھ کر انکار کیا اور خاموش ہو گئے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اگر اب بھی میری رسالت میں شک باقی ہے تو آئیں، ہم اور تم اپنی اولاد سمیت میدان میں نکلیں اور اللہ سے دعا کریں کہ جھوٹے پر لعنت ہو۔ نصاریٰ نے کہا کہ ہم مشورہ کر کے جواب دیں گے، مگر مشورہ کے بعد بھی وہ راضی نہ ہوئے اور واپس نجران چلے گئے۔

اسی دوران سورہ آل عمران کی ابتدائی ۸۳ آیات نازل ہوئیں۔ اس واقعے سے درج ذیل نکات حاصل ہوتے ہیں:

۱۔ عیسائیوں کی وہ دلائل جو آج بھی پیش کرتے ہیں، نئی نہیں بلکہ پہلے بھی یہی دعوے کیے جاتے تھے، جیسا کہ نجران کے وفد سے ظاہر ہے۔

۲۔ اہلِ اسلام کے پاس ہمیشہ سے نصاریٰ کے دعووں کا جواب موجود ہے، جیسا کہ حضرت محمد ﷺ کی باتوں سے واضح ہے۔

۳۔ عیسائیوں کو جواب دینے کے لیے یہ ضروری نہیں کہ حضرت عیسیٰؑ کے معجزات یا قدرت کا انکار کیا جائے یا انہیں مردہ بتایا جائے، بلکہ نجران کے وفد کے ساتھ مناظرہ میں بھی تمام معجزات کو قبول کیا گیا اور درست جواب دیا گیا۔

سورہ آل عمران کا خلاصہ

سورہ آلِ عمران مدنی سورت ہے جس میں ۲۰۰ آیات ہیں۔اس کا مرکزی مضمون توحید، رسالت، آخرت، اہلِ کتاب کی اصلاح، مسلمانوں کی تربیت اور اجتماعی زندگی کے اصول بیان ہوئے ہیں۔ یہ سورت مسلمانوں کو فکری، روحانی اور عملی بنیادوں پر مضبوط بنانے کے لیے نازل ہوئی اور ایمان والوں کو اس میں زندگی کے ہر شعبے کے لیے رہنمائی دی گئی ہے۔

۱۔قرآن کی حقانیت: سورہ کی ابتدا اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور بے مثال صفات کے بیان سے ہوئی ہے۔اس میں بتایا گیا ہے کہ قرآن آخری الہامی کتاب ہے جو پچھلی کتابوں کی تصدیق کرتا ہے۔قرآن میں دو طرح کی آیات ہیں:

(۱) محکمات: واضح احکام جن پر عمل فرض ہے۔

(۲) متشابہات: جن کے حقیقی مفہوم کو اللہ ہی جانتا ہے۔

علم میں پختہ لوگ (راسخین فی العلم) اللہ سے ہدایت کی دعا کرتے ہیں اور متشابہات میں الجھنے سے بچتے ہیں، اسی طرح کافروں کو تنبیہ کی گئی ہے کہ قیامت کے دن نہ مال کام آئے گا نہ اولاد، اور اصل کامیابی جنت اور اللہ کی رضا میں ہے۔اللہ کے نزدیک واحد مقبول دین اسلام ہے۔

۲۔اہلِ کتاب کی گمراہیاں: اس میں یہود کی برائیوں، انبیاء کے قتل، تورات میں تحریف، اور باطل عقائد کی مذمت کی گئی۔ان کا یہ خیال کہ وہ صرف چند دن جہنم میں رہیں گے، باطل قرار دیا گیا اور بتایا گیا ہے کہ اللہ ہی حکومت عطا کرتا اور وہی چھینتا بھی ہے۔پھر اہلِ کتاب کو حضرت ابراہیمؑ کے دین کی حقیقت سمجھائی گئی ہے کہ وہ نہ یہودی تھے نہ نصرانی بلکہ خالص موحد اور مسلم تھے پھر انہیں توحید کی دعوت دی گئی اور حقیقت چھپانے پر وعید سنائی گئی پھر یہود کی اسلام کو نقصان پہنچانے کی سازشوں کا ذکر ہوا، جیسے اسلام قبول کر کے مرتد ہو جانا تا کہ لوگ بدگمان ہوں۔پھر یہود کی خیانت، امانت میں بددیانتی اور حرام کو حلال قرار دینے کی روش کی مذمت کی گئی اور قرآن واضح کرتا ہے کہ تمام انبیاء نے صرف اللہ کی عبادت اور اسلام ہی کی دعوت دی۔اسلام کے سوا کوئی دین اللہ کے یہاں قابلِ قبول نہیں۔جو اسلام کے بعد مرتد ہو جائیں ان پر اللہ، فرشتوں اور انسانوں کی لعنت ہے، البتہ توبہ کرنے والوں کے لیے مغفرت ہے۔

۳۔حضرت مریمؑ، حضرت یحییٰؑ اور حضرت عیسیٰؑ کے واقعات: حضرت مریمؑ کی والدہ نے اپنی اولاد کو اللہ کے لیے نذر کیا۔حضرت زکریاؑ کو بڑھاپے میں حضرت یحییٰؑ کی بشارت ملی۔حضرت مریمؑ کو حضرت عیسیٰؑ کی بشارت دی گئی کہ وہ بغیر باپ کے اللہ کے حکم سے پیدا ہوں گے۔وہ بنی اسرائیل کے نبی ہوں گے، آسمانی کتاب پائیں گے اور معجزات

دکھائیں گے۔ یہود نے ان کی جان لینے کی کوشش کی، لیکن اللہ نے انہیں آسمان پر اٹھالیا۔ اسی طرح بتایا گیا کہ حضرت عیسیٰؑ نہ اللہ ہیں نہ اللہ کے بیٹے، بلکہ بندہ اور رسول ہیں، جیسے حضرت آدمؑ کو بغیر ماں باپ کے پیدا کیا گیا۔

۴۔ اہلِ ایمان کے لیے ہدایات: مسلمانوں کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ تقویٰ اختیار کریں اور اسلام پر ثابت قدم رہیں۔ اللہ کی رسی (دین) کو مضبوطی سے پکڑیں۔ اختلاف وانتشار سے بچیں۔ اللہ کی نعمتوں کو یاد کریں اور نیکی کا حکم دیں اور برائی سے روکیں۔

پھر امتِ مسلمہ کو ''امر بالمعروف ونہی عن المنکر'' کی ذمہ داری یاد دلائی گئی۔ انہیں کفار واہلِ کتاب سے دوستی میں احتیاط کا حکم دیا گیا کیونکہ وہ دین کے دشمن ہیں۔ صبر اور تقویٰ کے ساتھ ان کی سازشیں نقصان نہیں پہنچا سکتیں۔

۵۔ جہاد اور نصرتِ الٰہی: غزوۂ بدر میں مسلمان تعداد و وسائل میں کم تھے لیکن تقویٰ واستقامت کے باعث اللہ کی نصرت شاملِ حال ہوئی اور فرشتے مدد کے لیے نازل ہوئے۔ اس سے واضح ہوا کہ فتح وشکست صرف اللہ کے ہاتھ میں ہے۔

غزوۂ اُحد میں بعض مسلمانوں نے یہ خبر سن کر کہ رسول اللہ ﷺ شہید ہو گئے ہیں، کمزوری دکھائی۔ اس میں بتایا گیا کہ رسول اللہ ﷺ معبود نہیں، ان کی وفات سے دین ختم نہیں ہوگا۔ ابتدائی فتح اس وقت شکست میں بدل گئی جب تیر اندازوں نے حکم کی خلاف ورزی کی۔ اس سے سبق دیا گیا کہ اللہ اور رسول ﷺ کی اطاعت اور نظم وضبط ہی کامیابی کی کنجی ہیں اور منافقین کی سوچ رد کی گئی کہ اگر وہ مدینہ میں رہتے تو قتل نہ ہوتے۔ بتایا گیا کہ موت وحیات اللہ کے ہاتھ میں ہے اور شہادت دراصل عزت ومغفرت کا ذریعہ ہے۔

۶۔ ایمان والوں کی صفات اور عملی ہدایات: دنیا کی محبت انسان کو غافل کر دیتی ہے، خاص طور پر سود سے سختی سے روکا گیا پھر اہلِ ایمان کو اللہ اور رسول ﷺ کی اطاعت، صبر، تقویٰ اور توکل کی تلقین کی گئی۔ اس میں متقیوں کے لیے مغفرت اور جنت کی بشارت ہے اور مسلمانوں کو غزوۂ اُحد کی وقتی شکست پر مایوس نہ ہونے کی نصیحت کی گئی۔ پھر کہا گیا ہے کہ اگر وہ ایمان وتقویٰ پر قائم رہیں گے تو ہمیشہ غالب رہیں گے۔ اسی طرح اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کی فضیلت بیان کی گئی اور کنجوسی کرنے والوں کے لیے وعید سنائی گئی۔ پھر جہاد اور قربانی کے لیے تیار رہنے والوں کی تعریف کی گئی جنہوں نے زخموں کے باوجود پھر سے جہاد کی دعوت قبول کی۔

۷۔ عقل وفطرت کی رہنمائی: اس سورہ میں اللہ کی قدرت کی نشانیوں پر غور وفکر کرنے والوں کو ''اولوالالباب'' کہا گیا، جو ہر حال میں اللہ کو یاد کرتے اور دنیا کو بے مقصد نہیں سمجھتے۔ وہ مغفرت اور جہنم سے نجات کی دعا کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ کوئی عمل ضائع نہیں ہوتا۔ جو مال وجان قربان کرتے ہیں وہ جنت میں داخل ہوں گے۔

نصیحت: اس سورہ کے اختتام پر مسلمانوں کو نصیحت کی گئی ہے کہ صبر اور استقامت اختیار کرو اور ہر حال میں اللہ سے

ڈرتے رہو۔ دشمن کے مقابلے میں مضبوط رہو اور دین کی حفاظت میں لگے رہو۔ کامیابی صرف اسی میں ہے کہ ایمان والے اللہ پر بھروسہ کریں، اس کے دین پر قائم رہیں، اور صبر وتقویٰ کے ساتھ زندگی بسر کریں۔

خلاصہ: سورۂ آلِ عمران میں توحید اور دینِ ابراہیمی کی حقیقت کو نہایت وضاحت کے ساتھ آیت نمبر ۶۴ اور ۶۷ میں پیش کیا گیا ہے، جس سے یہ بات عیاں ہوتی ہے کہ حضرت ابراہیمؑ خالص مؤحد تھے اور کسی مخصوص قوم یا مذہب سے وابستہ نہ تھے۔ اہلِ کتاب کی عہد شکنی، انبیاء کے قتل اور مالی خیانت جیسے سنگین جرائم کا ذکر آیت نمبر ۲۱، ۲۲ میں قتلِ انبیاء آیت نمبر ۷۲ میں ایمان لاکر پھر انکار کی سازش، آیت نمبر ۷۵، ۷۷ میں امانت میں خیانت، اور آیت نمبر ۱۸۷ میں کتاب کے پیغام کو چھپانے کے گناہ کے حوالے سے کیا گیا ہے۔ اسی طرح آیت نمبر ۲۴، ۲۵ اور ۷۰، ۷۱ میں اہلِ کتاب کے جھوٹے اطمینانِ آخرت اور حق کو چھپانے کی روش کی سخت تردید کی گئی ہے۔

اس میں حضرت عیسیٰؑ کے بارے میں پھیلائی گئی سازشوں اور عقائدِ باطلہ کا ردّ بھی نہایت جامع انداز میں آیات نمبر ۴۵، ۵۱، ۵۴، ۵۹، ۶۲ میں کیا گیا ہے، جن میں واضح کر دیا گیا کہ وہ اللہ کے بندے اور رسول تھے، نہ کہ خدا یا خدا کے بیٹے۔ مجموعی طور پر سورۂ آلِ عمران اُمتِ مسلمہ کے لیے ایک مکمل دستورِ حیات پیش کرتی ہے، جو اسے توحید، رسالت، آخرت پر ایمان، دشمنوں کی سازشوں سے ہوشیار رہنے، صبر وتقویٰ، اتحاد واتفاق، جہاد، قربانی، اللہ پر توکل اور دینی ذمہ داریوں کی یاد دہانی کراتی ہے، اور نظریاتی وایمانی بنیادوں کے ساتھ ساتھ عملی زندگی کے لیے بھی جامع اصول فراہم کرتی ہے۔

یہ سورت مسلمانوں کو فکری واخلاقی شعور عطا کرتی ہے اور انہیں اس بات کی تلقین کرتی ہے کہ وہ باطل نظریات کے اثر سے محفوظ رہتے ہوئے اپنی دینی شناخت اور ایمانی وابستگی کو مضبوط رکھیں۔ اس میں اہلِ کتاب کی گمراہ کن سازشوں کو بے نقاب کیا گیا ہے اور مسلمانوں کو نصیحت کی گئی ہے کہ وہ غیر ضروری تعلقات سے پرہیز کریں، نیکی کا حکم دینے اور برائی سے روکنے کی ذمہ داری ادا کریں، اور صبر واستقامت کے ساتھ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت میں زندگی گزاریں۔

اس میں غزوات بدر واُحد کے واقعات کے ذریعے یہ تعلیم دی گئی ہے کہ فتح وشکست صرف اللہ کے ہاتھ میں ہے، اور اہلِ ایمان کے لیے اصل کامیابی ایمان کی پختگی، اجتماعی اتحاد، قربانی کے جذبے اور اللہ پر کامل بھروسے میں پوشیدہ ہے۔ آخر میں اہلِ ایمان کو صبر، ثابت قدمی اور تقویٰ کی تلقین کرتے ہوئے یہ پیغام دیا گیا ہے کہ جو لوگ اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھامے رکھیں گے وہ دنیاوی فتنوں سے محفوظ رہیں گے اور آخرت کی ابدی کامیابی حاصل کریں گے۔ اس طرح سورۂ آلِ عمران نہ صرف ایمانی اساس کو مضبوط کرتی ہے بلکہ عملی زندگی کے لیے ایسی رہنمائی فراہم کرتی ہے جو اُمتِ مسلمہ کو عزت، استقامت اور فلاح کی راہ دکھاتی ہے۔

سورہ آلِ عمران کی فضیلت

قرآن کی روشن سورتوں میں سورہ بقرہ اور سورہ آلِ عمران کا ذکر خاص طور پر ملتا ہے۔ اگرچہ قرآن کی تمام سورتیں نورانی اور رہنمائی کرنے والی ہیں، علماء نے لکھا ہے کہ سورہ بقرہ اور آلِ عمران کے مضامین ایک دوسرے سے قریب اور ہم آہنگ ہیں، اسی وجہ سے ان دونوں سورتوں کو ''زہراوین'' یعنی دو روشن سورتیں کہا گیا ہے۔ احادیث میں آیا ہے کہ قیامت کے دن جو شخص سورہ بقرہ اور آلِ عمران پڑھے گا، اسے ایک نور عطا کیا جائے گا۔

● حضرت ابوامامہ باہلی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''قرآن پڑھا کرو کیونکہ قیامت کے دن یہ اصحابِ قرآن کے لیے سفارشی بنے گا۔ البقرہ اور آلِ عمران دو روشن سورتیں ہیں، جو قیامت کے دن پڑھنے والوں کی طرف سے دفاع کریں گی، جیسے دو بازو یا دو سایہ دار درخت، یا جیسے پرندوں کی دو ڈاریں''۔ (مسلم: ۸۰۴)

● حضرت اللہ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک رات وہ حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا کے گھر تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم معمول کے مطابق سوتے رہے، اور رات کے آدھے حصے میں جاگ کر سورہ آلِ عمران کی آخری دس آیات کی تلاوت فرمائی۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مشکیزہ کے پاس کھڑے ہو کر وضو کیا اور کھڑے ہو کر نماز پڑھنے لگے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما بھی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پیچھے کھڑے ہو کر اسی طرح وضو اور نماز ادا کرنے لگے۔ اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کئی رکعتیں نماز تہجد اور وتر پڑھی۔ (بخاری: ۱۸۳)

● ایک اور روایت میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رات کے تیسرا حصہ باقی رہتے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اُٹھ کر آسمان کی طرف نظر کی اور سورہ آلِ عمران کی آیت ۱۹۰ کی تلاوت کی: بیشک آسمانوں اور زمین کی پیدائش اور دن رات کے مختلف ہونے میں عقلمندوں کے لیے نشانیاں ہیں۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم وضو اور مسواک کے بعد گیارہ رکعتیں نماز تہجد ادا فرماتے، اور فجر کی اذان کے بعد دو رکعت سنت پڑھ کر مسجد میں نماز فجر پڑھاتے۔ (بخاری: ۴۵۶۹)

● حضرت حبیب بن ابی ثابت سے روایت ہے کہ ایک رات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جاگے، مسواک کی، وضو کیا اور سورہ آلِ عمران کی آیت ۱۹۰ کی تلاوت فرماتے رہے، یہاں تک کہ سورت ختم ہوئی۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دو رکعتیں نماز پڑھی، طویل قیام، رکوع اور سجدے فرمائے، اور اس عمل کو تین دفعہ کیا۔ اس کے بعد تین رکعت وتر ادا فرمائی، پھر فجر کی اذان کے بعد باہر تشریف لے گئے اور یہ دعا کی: ''اے اللہ! میرے دل، زبان، سماعت، آنکھ، میرے پیچھے، میرے آگے، میرے اوپر اور میرے نیچے نور عنایت فرما، اے اللہ! مجھے نور دے''۔ (مسلم: ۷۶۳)

یہ فضائل اور اعمال ظاہر کرتے ہیں کہ سورہ بقرہ اور آلِ عمران کی تلاوت اور عمل نہ صرف روحانی سکون اور ہدایت فراہم کرتا ہے بلکہ قیامت کے دن قاری کے لیے سفارشی بھی بنے گا۔ ❁❁❁

ترجمہ وتفسیر- سورہ آل عمران

ترجمہ- آیت نمبر ۱ سے ۹ تک

یہ سورہ مدنی ہے۔اس میں ۲۰ رکوع اور ۲۰۰ آیتیں ہیں

الٓمّٓ ① اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۙ الْحَیُّ الْقَیُّوْمُ ② نَزَّلَ عَلَیْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَیْنَ یَدَیْهِ وَاَنْزَلَ التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِیْلَ ③ مِنْ قَبْلُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَاَنْزَلَ الْفُرْقَانَ ؕ اِنَّ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا بِاٰیٰتِ اللّٰهِ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِیْدٌ ؕ وَاللّٰهُ عَزِیْزٌ ذُو انْتِقَامٍ ④ اِنَّ اللّٰهَ لَا یَخْفٰى عَلَیْهِ شَیْءٌ فِی الْاَرْضِ وَلَا فِی السَّمَآءِ ⑤ هُوَ الَّذِیْ یُصَوِّرُكُمْ فِی الْاَرْحَامِ كَیْفَ یَشَآءُ ؕ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ ⑥ هُوَ الَّذِیْۤ اَنْزَلَ عَلَیْكَ الْكِتٰبَ مِنْهُ اٰیٰتٌ مُّحْكَمٰتٌ هُنَّ اُمُّ الْكِتٰبِ وَاُخَرُ مُتَشٰبِهٰتٌ ؕ فَاَمَّا الَّذِیْنَ فِیْ قُلُوْبِهِمْ زَیْغٌ فَیَتَّبِعُوْنَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ ابْتِغَآءَ الْفِتْنَةِ وَابْتِغَآءَ تَاْوِیْلِهٖ ۚ وَمَا یَعْلَمُ تَاْوِیْلَهٗۤ اِلَّا اللّٰهُ ۘ وَالرّٰسِخُوْنَ فِی الْعِلْمِ یَقُوْلُوْنَ اٰمَنَّا بِهٖ ۙ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ رَبِّنَا ۚ وَمَا یَذَّكَّرُ اِلَّاۤ اُولُوا الْاَلْبَابِ ⑦ رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا بَعْدَ اِذْ هَدَیْتَنَا وَهَبْ لَنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً ۚ اِنَّكَ اَنْتَ الْوَهَّابُ ⑧ رَبَّنَاۤ اِنَّكَ جَامِعُ النَّاسِ لِیَوْمٍ لَّا رَیْبَ فِیْهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا یُخْلِفُ الْمِیْعَادَ ⑨

ترجمہ:

(۱)۔ الف، لام، میم۔(۲)۔ اللہ! اس کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ زندہ ہے، ہر چیز کو قائم رکھنے والا ہے۔(۳)۔اس نے آپ پر یہ کتاب (قرآن) حق کے ساتھ نازل کی ہے، جو ان کتابوں کی تصدیق کرتی ہے جو اس سے پہلے آئی تھیں۔اور اس نے ہی تورات اور انجیل نازل کی تھی۔(۴)۔اس سے پہلے، لوگوں کی ہدایت کے لیے۔اور اسی نے فرقان (حق و باطل میں فرق کرنے والی کتاب) بھی نازل کی۔ بے شک جو لوگ اللہ کی آیات کا انکار کرتے ہیں، ان کے لیے سخت ترین عذاب ہے، اور اللہ زبردست ہے اور انتقام لینے والا ہے۔(۵)۔ بے شک اللہ سے زمین اور آسمان میں کوئی چیز چھپی ہوئی نہیں۔(۶)۔ وہی ہے جو تمہیں ماؤں کے پیٹ میں جیسی چاہتا ہے، ویسی شکل وصورت دیتا ہے۔اس کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ غالب ہے، بڑی حکمت والا ہے۔(۷)۔اسی نے آپ پر یہ کتاب نازل کی، جس میں بعض آیتیں صاف اور واضح (محکم) ہیں، یہی اصل کتاب ہیں۔اور کچھ دوسری آیات متشابہ (یعنی مفہوم میں

گہرائی رکھنے والی) ہیں۔جن کے دلوں میں کجی ہوتی ہے وہ متشابہات کے پیچھے پڑتے ہیں تا کہ فتنہ پیدا کریں اوران کی اپنی مرضی کی تاویل کریں، حالانکہ ان کی حقیقی تاویل اللہ ہی جانتا ہے۔اور جو علم میں پختہ ہیں، وہ کہتے ہیں: ہم اس پر ایمان لائے، یہ سب ہمارے رب کی طرف سے ہے۔اور نصیحت صرف عقل والے ہی حاصل کرتے ہیں۔(۸)۔ اے ہمارے رب! ہدایت دینے کے بعد ہمارے دلوں کو ٹیڑھا نہ ہونے دے، اور ہمیں اپنی طرف سے رحمت عطا فرما، بے شک تو ہی بہت عطا کرنے والا ہے۔(۹)۔اے ہمارے رب! تو یقیناً اس دن سب لوگوں کو جمع کرے گا جس کے آنے میں کوئی شک نہیں، بے شک اللہ اپنے وعدے کے خلاف نہیں کرتا۔

تفسیر-آیت نمبر ۱ سے ۹ تک

آیت نمبر(۱) الٓمّٓ ﴿۱﴾ **ترجمہ:** الف۔لام۔میم۔

تفسیر

حروف مقطعات

یہ ''حروف مقطعات'' یعنی الگ الگ حروف ہیں۔پچھلی سورہ بقرہ کے آغاز میں ان کا تفصیلی بیان گذر چکا ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ یہ حروف اللہ تعالیٰ کی خصوصی نشانیوں میں سے ہیں، جن کا علم کسی انسان کو معلوم نہیں۔البتہ ممکن ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ان کا علم بطور ایک الٰہی راز دیا گیا ہو۔اس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ان حروف کی تفسیر میں صراحت نہیں ملتی۔اس لیے ان حروف کے بارے میں یہی عقیدہ رکھنا چاہیے کہ یہ مکمل کلامِ الٰہی ہیں اور اللہ تعالیٰ کے اسرار میں شامل ہیں۔

آیت نمبر(۲) اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۙ اَلْحَیُّ الْقَیُّوْمُ ﴿۲﴾

ترجمہ: ''اللہ! اس کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ زندہ ہے، ہر چیز کو قائم رکھنے والا ہے''۔

تفسیر یعنی اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں، وہ زندہ ہیں اور تمام مخلوقات کے سنبھالنے والے ہیں۔ اس کی تفصیل وتشریح سورہ بقرہ کی آیت الکرسی میں بیان کی گئی ہے۔یہاں اس سورہ کی اس آیت میں خاص طور پر عیسائیوں کے عقائد کا ذکر فرمایا گیا ہے، جو تین بنیادی طور پر درج ذیل تھے:

عیسائیوں کے تین عقائد

۱۔تثلیثیت: یعنی اللہ، عیسیٰ اور روح القدس کو ملا کر خدا قرار دینا۔
۲۔مسیح خدا ہیں، جو انسان کی شکل میں آئے۔

۳۔مسیح خدا کے بیٹے ہیں (معاذ اللہ)۔

آج بھی اکثر عیسائی یہی عقیدہ رکھتے ہیں، چند فرقوں کے علاوہ۔اس آیت نے ان تینوں عقائد کو جھوٹا ثابت کیا۔''اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ'' سے پہلا عقیدہ باطل ثابت ہوا۔

پھر ارشاد''اَلْحَیُّ الْقَیُّوْمُ'' سے دوسرے اور تیسرے عقائد کی بھی نفی کی گئی، کیونکہ حضرت عیسیٰؑ فنا ہونے والے ہیں، لہٰذا وہ قیوم یعنی ہر شے پر قائم اور خود قائم نہیں ہو سکتے۔ایسے میں وہ اللہ کیسے ہو سکتے ہیں؟ اللہ تعالیٰ نے اپنی صفات''حَیٌّ'' اور''قَیُّوْمُ'' بیان کر کے عقلی دلیل کی طرف اشارہ فرمایا کہ جو ذات اپنی حفاظت یا پرورش میں دوسروں پر محتاج ہو، وہ الوہیت کی حقدار کیسے ہو سکتی ہے؟ بندگی اور عبادت اُس کے لیے ممکن ہے جس کو آخری درجہ کی عظمت اور کامل کمال حاصل ہو، اور جو ہر نقص وعیب سے پاک ہو۔

زندگی اور موت میں کسی دوسرے کا محتاج ہونا کمزوری ہے اور یہ ذاتِ الوہیت کے اصول کے خلاف ہے۔ اس آیت میں اسی عقلی دلیل کے ذریعے معبودانِ باطل کی نفی کی گئی اور نصاریٰ کے عقیدے، جیسے کہ عیسیٰ کی الوہیت، بیٹے کی صفت اور مسئلہ تثلیث، کو بالکل رد و باطل قرار دیا گیا۔

آیت نمبر(۳) نَزَّلَ عَلَیْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَیْنَ یَدَیْهِ وَاَنْزَلَ التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِیْلَ ۙ﴿۳﴾

ترجمہ:''اس نے آپ پر یہ کتاب (قرآن) حق کے ساتھ نازل کی ہے، جو ان کتابوں کی تصدیق کرتی ہے جو اس سے پہلے آئی تھیں۔اور اس نے ہی تورات اور انجیل نازل کی تھی''۔

تفسیر یہاں''کتاب'' سے مراد قرآنِ کریم ہے، جس میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں۔قرآن کریم اپنی ذات میں پچھلی کتابوں کی تصدیق کرتا ہے۔''توریت'' عبرانی لفظ ہے، جس کے معنیٰ ہیں''شریعت'' اور''انجیل'' یونانی لفظ ہے، جس کے معنیٰ ہیں''خوشخبری''۔یہ دونوں کتابیں اپنے وقت کی ہدایت کے لیے نازل ہوئیں بی توریت قومِ موسیٰ کے لیے اور انجیل قومِ عیسیٰؑ کے لیے۔تاہم، قرآن کے نزول کے بعد یہ دونوں کتابیں منسوخ ہو گئیں اور امتِ محمدیہ ان منسوخ شدہ شریعتوں کی پابند نہیں۔

''فرقان'' سے مراد تمام آسمانی کتابیں ہیں، کیونکہ یہ حق و باطل کے درمیان تمیز کرتی ہیں، یا بعض علماء کے نزدیک یہ خاص طور پر قرآنِ کریم کے لیے بھی کہا گیا ہے، جو حق و باطل میں تمیز دیتا ہے اور خاص طور پر وہ حق و باطل جس میں یہود و نصاریٰ اختلاف کرتے ہیں۔

''إِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا'' کے ارشاد کا مقصد قرآن کریم پر ایمان لانے کی ترغیب دینا اور انکار کرنے والوں کے لیے اللہ کے عذاب سے خوف پیدا کرنا ہے۔

● حضرت ابوسلمہؓ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ''تم اہلِ کتاب کی نہ تصدیق کرو اور نہ ہی تکذیب کرو۔'' (بخاری رقم:۴۴۸۵)

آیت نمبر(۴) مِنْ قَبْلُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَاَنْزَلَ الْفُرْقَانَ ؕ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيْدٌ ؕ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ ذُو انْتِقَامٍ ۝۴

ترجمہ: ''اس سے پہلے، لوگوں کی ہدایت کے لیے۔ اور اسی نے فرقان (حق و باطل میں فرق کرنے والی کتاب) بھی نازل کی۔ بے شک جو لوگ اللہ کی آیات کا انکار کرتے ہیں، ان کے لیے سخت ترین عذاب ہے، اور اللہ زبردست ہے اور انتقام لینے والا ہے''۔

تفسیر اس سے پہلے لوگوں کی ہدایت کے لئے فرقان (حق و باطل کو الگ الگ کرنے والا) نازل کیا، جن لوگوں نے اللہ کی آیتوں کا انکار کیا، اُن کے لئے سخت عذاب ہے؛ اور اللہ زبردست بدلہ لینے والا ہے۔

آیت نمبر(۵) اِنَّ اللّٰهَ لَا يَخْفٰى عَلَيْهِ شَيْءٌ فِي الْاَرْضِ وَلَا فِي السَّمَآءِ ۝۵

ترجمہ: ''بے شک اللہ سے زمین اور آسمان میں کوئی چیز چھپی ہوئی نہیں''۔

تفسیر اللہ تعالیٰ لوگوں کے ایمان و کفر سے باخبر ہے اور ہر ایک کو اُس کے ایمان یا کفر کا بدلہ ضرور دے گا۔

آیت نمبر(۶) هُوَ الَّذِيْ يُصَوِّرُكُمْ فِي الْاَرْحَامِ كَيْفَ يَشَآءُ ؕ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝۶

ترجمہ: ''وہی ہے جو تمہیں ماؤں کے پیٹ میں جیسی چاہتا ہے، ویسی شکل وصورت دیتا ہے۔ اس کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ غالب ہے، بڑی حکمت والا ہے''۔

تفسیر اللہ تعالیٰ مرد و عورت، خوبصورت یا بدصورت، نیک یا بدبخت، جیسا چاہیں، اپنی رحمت میں پیدا کرتے ہیں۔ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ حضرت عیسیٰ بن مریمؑ بھی دیگر تمام انسانوں کی مانند اللہ کی مخلوق اور بندے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں بھی مریم کے رحم میں جیسا چاہا، ویسا پیدا فرمایا۔ تو پھر وہ ''اللہ'' کیسے ہو سکتے ہیں، جیسا کہ نصاریٰ کا باطل عقیدہ ہے۔

آیت نمبر(۷) هُوَ الَّذِیۡۤ اَنۡزَلَ عَلَیۡكَ الۡكِتٰبَ مِنۡهُ اٰیٰتٌ مُّحۡكَمٰتٌ هُنَّ اُمُّ الۡكِتٰبِ وَاُخَرُ مُتَشٰبِهٰتٌ ؕ فَاَمَّا الَّذِیۡنَ فِیۡ قُلُوۡبِهِمۡ زَیۡغٌ فَیَتَّبِعُوۡنَ مَا تَشَابَهَ مِنۡهُ ابۡتِغَآءَ الۡفِتۡنَةِ وَابۡتِغَآءَ تَاۡوِیۡلِهٖ ۚ وَمَا یَعۡلَمُ تَاۡوِیۡلَهٗۤ اِلَّا اللّٰهُ ۘ وَالرّٰسِخُوۡنَ فِی الۡعِلۡمِ یَقُوۡلُوۡنَ اٰمَنَّا بِهٖ ۙ كُلٌّ مِّنۡ عِنۡدِ رَبِّنَا ۚ وَمَا یَذَّكَّرُ اِلَّاۤ اُولُوا الۡاَلۡبَابِ ۝۷

ترجمہ: ''اسی نے آپ پر یہ کتاب نازل کی، جس میں بعض آیتیں صاف اور واضح (محکم) ہیں، یہی اصل کتاب ہیں۔ اور کچھ دوسری آیات متشابہ (یعنی مفہوم میں گہرائی رکھنے والی) ہیں۔ جن کے دلوں میں کجی ہوتی ہے وہ متشابہات کے پیچھے پڑتے ہیں تاکہ فتنہ پیدا کریں اور ان کی اپنی مرضی کی تاویل کریں، حالانکہ ان کی حقیقی تاویل اللہ ہی جانتا ہے۔ اور جو علم میں پختہ ہیں، وہ کہتے ہیں: ہم اس پر ایمان لائے، یہ سب ہمارے رب کی طرف سے ہے۔ اور نصیحت صرف عقل والے ہی حاصل کرتے ہیں''۔

تفسیر

محکمات اور متشابہات کا مفہوم

اس آیت میں ارشاد فرمایا گیا کہ قرآن مجید میں کچھ آیات محکمات ہیں اور کچھ متشابہات۔ کچھ جگہ پوری کتاب کو محکم قرار دیا گیا ہے، جیسا کہ سورہ ہود میں فرمایا:

''كِتٰبٌ اُحۡكِمَتۡ اٰیٰتُهٗ'' اور کہیں اسے متشابہ قرار دیا گیا، جیسا کہ سورہ زمر میں: ''اَللّٰهُ نَزَّلَ اَحۡسَنَ الۡحَدِیۡثِ كِتٰبًا مُّتَشَابِهًا مَّثَانِیَ''۔

یہاں محکمات اور متشابہات کا مفہوم وہ نہیں جو دیگر سورتوں میں آیا ہے۔ پورا قرآن محکم اس اعتبار سے ہے کہ یہ ہر لحاظ سے حق ہے، اس کے الفاظ اور معانی مضبوط اور ترتیب کے مطابق ہیں، کہیں بھی شک یا تضاد نہیں۔ جہاں قرآن کو متشابہ کہا گیا، وہاں مراد یہ ہے کہ آیات کے معانی اور حسن میں یہ ایک دوسرے سے مشابہت رکھتی ہیں۔

محکمات: وہ آیات ہیں جن کا مفہوم بالکل واضح اور صاف ہے۔ یہ بنیادی اصول ہیں، جن میں اچھائی و برائی کے احکام بالکل واضح ہیں اور ان کے مفہوم میں کوئی دشواری نہیں۔ اگر کوئی آیت سمجھنے میں مشکل ہو، تو اسے محکمات کی روشنی میں سمجھا جاتا ہے۔

متشابہات: وہ آیات ہیں جن میں کہنا والا مقصد واضح نہیں۔ ان کو متشابہات کہا جاتا ہے۔

● حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''جب تم ایسے لوگوں کو دیکھو جو متشابہات کے پیچھے پڑے ہیں تو سمجھ لو کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن میں انہیں ذکر کیا ہے، لہٰذا ان سے بچو''۔ **(بخاری: ۴۵۴۷)**

راسخین فی العلم کا طریقہ

''راسخین فی العلم'' وہ لوگ ہیں جو: آیاتِ محکمات کے خلاف کسی بھی تاویل کو قبول نہیں کرتے۔ متشابہات کا مفہوم وہی تسلیم کرتے ہیں جو اللہ کے نزدیک ہے۔ قرآن کے متشابہات میں فضول کھوج یا ذاتی خواہشات کی بنیاد پر تاویل نہیں کرتے۔ بہت سے لوگ دل کے ٹیڑھا پن کی وجہ سے محکمات کو چھوڑ کر متشابہات کی کھوج میں لگ جاتے ہیں، جس سے فتنے پیدا ہوتے ہیں۔ بعض لوگ جو حدیث کے بھی منکر ہیں، وہ قرآن کے معانی بھی غلط سمجھنے لگتے ہیں۔

مثال کے طور پر: ''اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى''، ''وَجَآءَ رَبُّكَ وَالْمَلَكُ صَفًّا صَفًّا''، ''يَدُ اللّٰهِ فَوْقَ اَيْدِيْهِمْ''۔ راسخین فی العلم ان سب پر ایمان رکھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ جو مطلب اللہ کے نزدیک ہے، وہی ہمارے نزدیک بھی صحیح ہے۔

خلاصہ

قرآن کی تعلیمات کا مرکزی مضمون ''آیاتِ محکمات'' ہیں۔ متشابہات کے بارے میں اپنی محدود فہم کا اعتراف کریں اور اصل مفہوم اللہ کے سپرد کریں۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جب تم ایسے لوگوں کو دیکھو جو متشابہات کی کھوج میں لگے ہیں تو ان سے پرہیز کرو''۔ **(صحیح بخاری: ۴۵۴۷)**

یہی وہ طریقہ ہے جس سے ایمان مضبوط اور فہمِ قرآن محفوظ رہتا ہے۔

''ای ذکرھم فی قولہ تعالیٰ فَاَمَّا الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ زَيْغٌ فَيَتَّبِعُوْنَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ ابْتِغَاءَ الْفِتْنَةِ وَابْتِغَاءَ تَاْوِيْلِهٖ''۔

کچھ علماء نے فرمایا ہے کہ ''متشابہات'' اہلِ علم کی آزمائش کے لیے ہیں، یعنی وہ لوگ جو اجتہاد اور فقہ دین میں دلچسپی رکھتے ہیں، ان کے لیے امتحان یہ ہے کہ وہ متشابہات کے پیچھے نہ بھٹکیں بلکہ بس رک جائیں اور آگے نہ بڑھیں۔ جبکہ جن لوگوں کو علم کا شوق نہیں، ان کے لیے اس کی آزمائش یہ ہے کہ انہیں سمجھایا جائے، علم کی طرف راغب کیا جائے، اور انہیں قرآن کی محکم آیات کو سمجھنے، پڑھنے اور سکھانے کی طرف متوجہ کیا جائے۔

آیت نمبر (۸) رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا بَعْدَ اِذْ هَدَيْتَنَا وَهَبْ لَنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً ۚ اِنَّكَ اَنْتَ الْوَهَّابُ ۸

ترجمہ: ''اے ہمارے رب! ہدایت دینے کے بعد ہمارے دلوں کو ٹیڑھا نہ ہونے دے، اور

ہمیں اپنی طرف سے رحمت عطا فرما، بے شک تو ہی بہت عطا کرنے والا ہے''۔

تفسیر راسخین فی العلم کی دعا

ان آیات میں ان لوگوں کی دعا نقل کی گئی ہے جو علم میں پختگی رکھتے ہیں، وہ یوں دعا کرتے ہیں: ''اے ہمارے رب! آپ نے ہمیں ہدایت عطا فرمائی ہے، پس ہمیں اسی ہدایت پر ثابت قدم رکھیں۔ ہمارے دلوں میں کبھی کجی یا ٹیڑھا پن پیدا نہ ہونے دیں۔ جو لوگ دل کی کجی کی وجہ سے متشابہات کے پیچھے بھٹکتے ہیں، ہمیں ان میں سے نہ کیجئے۔ اور اپنی عظیم رحمت سے ہمیں نوازیں، یہ رحمت ہمیں دنیا میں بھی حاصل ہو اور آخرت میں بھی۔ ہمارا ایمان محکمات پر مضبوط رہے اور متشابہات کے معاملے میں بھی قائم و درست ہو''۔

یہ دعا حقیقت میں نہایت اہمیت کی حامل ہے اور اسے مسلسل کرتے رہنا چاہیے، کیونکہ بہت سے لوگ ہدایت حاصل کرنے کے بعد فتنہ و گمراہی میں مبتلا ہو جاتے ہیں اور ایمان کھو بیٹھتے ہیں۔

صحیح مسلم میں روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''بے شک بنی آدم کے دل سب اللہ کے قبضے میں ہیں، جیسے وہ چاہے پھیر دے''۔ اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہی دعا کی۔

''یَا مُقَلِّبَ الْقُلُوبِ ثَبِّتْ قَلْبِی عَلٰی دِیْنِک'' ''کہ اے دلوں کو الٹ پھیر کرنے والے! میرے دل کو تو اپنے دین پر قائم رکھ''۔ (مسلم: ۶۷۵۰)

آیت نمبر (۹) رَبَّنَآ اِنَّكَ جَامِعُ النَّاسِ لِيَوْمٍ لَّا رَيْبَ فِيْهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُخْلِفُ الْمِيْعَادَ ۝۹

ترجمہ: ''اے ہمارے رب! تو یقیناً اس دن سب لوگوں کو جمع کرے گا جس کے آنے میں کوئی شک نہیں، بے شک اللہ اپنے وعدے کے خلاف نہیں کرتا''۔

تفسیر راسخین فی العلم کی دوسری دعا

راسخین فی العلم کی ایک اور دعا یہ ہے کہ: ''اے ہمارے رب! آپ سب انسانوں کو اس دن میں جمع فرمائیں گے جس میں کوئی شک و شبہ نہیں، کیونکہ آپ نے وعدہ فرمایا ہے اور وہ وعدہ بالکل سچا ہے۔ یقیناً قیامت کا دن آئے گا اور تمام لوگ اسی دن جمع ہوں گے''۔

❁❁❁

ترجمہ- آیت نمبر ۱۰ سے ۱۸ تک

اِنَّ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا لَنۡ تُغۡنِیَ عَنۡہُمۡ اَمۡوَالُہُمۡ وَلَاۤ اَوۡلَادُہُمۡ مِّنَ اللّٰہِ شَیۡئًا ؕ وَاُولٰٓئِکَ ہُمۡ وَقُوۡدُ النَّارِ ﴿۱۰﴾ کَدَاۡبِ اٰلِ فِرۡعَوۡنَ ۙ وَالَّذِیۡنَ مِنۡ قَبۡلِہِمۡ ؕ کَذَّبُوۡا بِاٰیٰتِنَا ۚ فَاَخَذَہُمُ اللّٰہُ بِذُنُوۡبِہِمۡ ؕ وَاللّٰہُ شَدِیۡدُ الۡعِقَابِ ﴿۱۱﴾ قُلۡ لِّلَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا سَتُغۡلَبُوۡنَ وَتُحۡشَرُوۡنَ اِلٰی جَہَنَّمَ ؕ وَبِئۡسَ الۡمِہَادُ ﴿۱۲﴾ قَدۡ کَانَ لَکُمۡ اٰیَۃٌ فِیۡ فِئَتَیۡنِ الۡتَقَتَا ؕ فِئَۃٌ تُقَاتِلُ فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ وَاُخۡرٰی کَافِرَۃٌ یَّرَوۡنَہُمۡ مِّثۡلَیۡہِمۡ رَاۡیَ الۡعَیۡنِ ؕ وَاللّٰہُ یُؤَیِّدُ بِنَصۡرِہٖ مَنۡ یَّشَآءُ ؕ اِنَّ فِیۡ ذٰلِکَ لَعِبۡرَۃً لِّاُولِی الۡاَبۡصَارِ ﴿۱۳﴾ زُیِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّہَوٰتِ مِنَ النِّسَآءِ وَالۡبَنِیۡنَ وَالۡقَنَاطِیۡرِ الۡمُقَنۡطَرَۃِ مِنَ الذَّہَبِ وَالۡفِضَّۃِ وَالۡخَیۡلِ الۡمُسَوَّمَۃِ وَالۡاَنۡعَامِ وَالۡحَرۡثِ ؕ ذٰلِکَ مَتَاعُ الۡحَیٰوۃِ الدُّنۡیَا ۚ وَاللّٰہُ عِنۡدَہٗ حُسۡنُ الۡمَاٰبِ ﴿۱۴﴾ قُلۡ اَؤُنَبِّئُکُمۡ بِخَیۡرٍ مِّنۡ ذٰلِکُمۡ ؕ لِلَّذِیۡنَ اتَّقَوۡا عِنۡدَ رَبِّہِمۡ جَنّٰتٌ تَجۡرِیۡ مِنۡ تَحۡتِہَا الۡاَنۡہٰرُ خٰلِدِیۡنَ فِیۡہَا وَاَزۡوَاجٌ مُّطَہَّرَۃٌ وَّرِضۡوَانٌ مِّنَ اللّٰہِ ؕ وَاللّٰہُ بَصِیۡرٌۢ بِالۡعِبَادِ ﴿۱۵﴾ الَّذِیۡنَ یَقُوۡلُوۡنَ رَبَّنَاۤ اِنَّنَاۤ اٰمَنَّا فَاغۡفِرۡ لَنَا ذُنُوۡبَنَا وَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ﴿۱۶﴾ الصّٰبِرِیۡنَ وَالصّٰدِقِیۡنَ وَالۡقٰنِتِیۡنَ وَالۡمُنۡفِقِیۡنَ وَالۡمُسۡتَغۡفِرِیۡنَ بِالۡاَسۡحَارِ ﴿۱۷﴾ شَہِدَ اللّٰہُ اَنَّہٗ لَاۤ اِلٰہَ اِلَّا ہُوَ ۙ وَالۡمَلٰٓئِکَۃُ وَاُولُوا الۡعِلۡمِ قَآئِمًۢا بِالۡقِسۡطِ ؕ لَاۤ اِلٰہَ اِلَّا ہُوَ الۡعَزِیۡزُ الۡحَکِیۡمُ ﴿۱۸﴾

ترجمہ:

(۱۰)۔جن لوگوں نے کفر کیا، نہ ان کے مال انہیں اللہ کے عذاب سے بچا سکیں گے، اور نہ ان کی اولاد، اور وہی لوگ دوزخ کا ایندھن بنیں گے۔(۱۱)۔ان کا حال بھی فرعون والوں جیسا ہے، اور ان لوگوں جیسا جو ان سے پہلے تھے۔انہوں نے ہماری آیات کو جھٹلایا، تو اللہ نے انہیں ان کے گناہوں کی پاداش میں پکڑ لیا، اور اللہ سخت سزا دینے والا ہے۔(۱۲)۔(اے نبی!) ان کافروں سے کہہ دیجیے: عنقریب تم مغلوب ہو جاؤ گے، اور جہنم کی طرف ہانکے جاؤ گے، اور وہ بہت ہی بُرا ٹھکانا ہے۔(۱۳)۔تمہارے لیے عبرت کی بات ہے ان دو گروہوں میں، جو آپس میں آمنے سامنے ہوئے۔ایک گروہ اللہ کی راہ میں لڑ رہا تھا، اور دوسرا کافر تھا، جو ان (مسلمانوں) کو اپنی آنکھوں سے دوگنا دیکھ رہے تھے۔اور اللہ اپنی مدد سے جسے چاہتا ہے قوت دیتا ہے، اس میں بصیرت والوں کے لیے یقیناً ایک سبق ہے۔(۱۴)۔لوگوں کے لیے دنیا کی خواہشات خوشنما بنا دی گئی ہیں: عورتیں، بیٹے، سونے چاندی کے ڈھیر، نشان دار گھوڑے، مویشی

اور کھیتی۔ یہ سب دنیا کی زندگی کا سامان ہے، اور اللہ کے پاس بہترین ٹھکانا ہے۔(۱۵)۔(اے نبی!) کہہ دیجیے: کیا میں تمہیں ان سب سے بہتر چیز کی خبر دوں؟ ان لوگوں کے لیے جو تقویٰ اختیار کرتے ہیں، ان کے رب کے پاس باغات ہیں، جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں، وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے، ان کے لیے پاکیزہ بیویاں ہوں گی اور اللہ کی رضا حاصل ہوگی۔ اور اللہ اپنے بندوں کو خوب دیکھتا ہے۔(۱۶)۔ یہ وہ لوگ ہیں جو کہتے ہیں: اے ہمارے رب! ہم ایمان لائے، لہٰذا ہمارے گناہوں کو بخش دے اور ہمیں دوزخ کے عذاب سے بچا۔(۱۷)۔ یہ وہ لوگ ہیں جو صبر کرتے ہیں، سچ بولتے ہیں، اطاعت گزار ہیں، اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں، اور سحر کے وقت (یعنی تہجد کے وقت) بخشش مانگتے ہیں۔(۱۸)۔ اللہ نے گواہی دی کہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں، اور فرشتوں اور علم والوں نے بھی (گواہی دی) کہ وہ عدل پر قائم ہے۔ اس کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ غالب ہے، بڑی حکمت والا ہے۔

تفسیر-آیت نمبر ۱۰ سے ۱۸ تک

آیت نمبر(۱۰) اِنَّ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا لَنۡ تُغۡنِیَ عَنۡہُمۡ اَمۡوَالُہُمۡ وَلَاۤ اَوۡلَادُہُمۡ مِّنَ اللّٰہِ شَیۡئًا ؕ وَ اُولٰٓئِکَ ہُمۡ وَقُوۡدُ النَّارِ ﴿۱۰﴾

ترجمہ: ''جن لوگوں نے کفر کیا، نہ ان کے مال انہیں اللہ کے عذاب سے بچا سکیں گے، اور نہ ان کی اولاد، اور وہی لوگ دوزخ کا ایندھن بنیں گے''۔

تفسیر ''حضرت ابن عباسؓ سے روایت: جب رسول اللہ ﷺ بدر کی جنگ سے واپس لوٹے تو آپ نے یہود کو بنو قینقاع کے بازار میں جمع کیا اور فرمایا: اے یہود! اسلام قبول کر لو، اس سے پہلے کہ تم پر بھی اللہ کی طرف سے ویسی ہی پٹائی آئے جیسی قریش پر ہو چکی ہے۔

وہ جواب دینے لگے: ''اے محمد! قریش کے لوگوں کی پٹائی کر کے کسی دھوکے میں نہ رہو، وہ تو جاہل اور اجڈ تھے، لڑائی کرنا جانتے نہ تھے۔ اگر ہم سے مقابلہ ہوگا تو حقیقت سامنے آجائے گی''۔ اسی موقع پر اللہ تعالیٰ نے اس پر یہ آیت نازل فرمائی۔ (ابوداؤد رقم:۳۰۰۱)

مومن و کافر کا حال

قرآن کریم کا عمومی اصول یہ ہے کہ ایمان کے ساتھ کفر، نور کے ساتھ ظلمت، ہدایت کے ساتھ گمراہی کا ذکر کیا گیا ہے، کیونکہ ہر چیز اپنے مخالف سے پہچانی جاتی ہے۔ ظاہری اعتبار سے یہاں سارے کافر بی چاہے وہ اہلِ کتاب

ہوں، یہود و نصاریٰ یا مشرکین، مجوس، بت پرست بی مراد ہیں جن کا انجام یہ بتایا گیا کہ دنیا و آخرت میں اللہ کے عذاب سے کوئی نہیں بچا سکتا، اور جب اللہ کا عذاب آئے گا تو اُن کا مال و اولاد کچھ کام نہ آئے گا۔

جیسے پہلے کے کافروں و مشرکین کو اُن کے کفر و شرک کی وجہ سے سزا ملی، ویسے ہی موجودہ کفار و مشرکین کو بھی سزا دی جائے گی۔ جو اللہ اور اس کے رسول کے دشمن ہیں، وہ اہلِ اسلام کے مقابلے میں شکست کھائیں گے اور دنیا میں سزا پانے کے بعد آخرت میں جہنم کی آگ میں ڈالے جائیں گے۔

کچھ مفسرین کے مطابق اصل خطاب نجران کے نصاریٰ سے ہے، جو عیسائیوں کی سب سے بڑی جماعت تھی اور مدینہ میں رسول اللہ ﷺ کے پاس مذہبی مسائل پر بات چیت کے لیے آئے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان آیات میں اشارہ فرمایا کہ جس مال و دولت کی لالچ میں تم نے اسلام اور ایمان کو چھوڑا، وہ قیامت کے دن کچھ کام نہ آئے گا، اور جن بادشاہوں کی عزت پر تم بھروسہ رکھتے ہو، وہ جلد مسلمانوں کے ہاتھ سے مغلوب ہوں گے۔ یوں دنیا و آخرت دونوں میں تمہیں سزا ملے گی۔

نجران کے عیسائی گروہ کا قصہ

'محمد بن اسحاق' کی سیرت کے مطابق، اس گروہ میں سب سے بڑا پادری اور عالم ابو حارثہ بن علقمہ خچر پر سوار تھا۔ اچانک خچر کو ٹھوکر لگی اور ابو حارثہ گر گیا۔ اس کے بھائی نے بھی خچر سے گر کر کہا، ''ہلاک ہو وہ شخص جس کے پاس ہم جا رہے ہیں!'' ابو حارثہ نے کہا، ''نہیں! ہلاک ہو تم! کیا تم ایسے شخص کے بارے میں غلط بات کہو جو رسولوں میں سے ہے؟''

بے شک رسول اللہ ﷺ وہی نبی ہیں جن کی حضرت عیسیٰؑ نے پیشن گوئی کی تھی، جن کا ذکر توریت میں ہے اور جن کے آنے کا سب انتظار کر رہے تھے۔

ابو حارثہ کے بھائی نے کہا: ''اگر تمہیں اُن کی نبوت و رسالت کے بارے میں اتنا علم و یقین ہے، تو پھر اُن پر ایمان لانے سے کیا چیز روکتی ہے؟''

ابو حارثہ پادری نے جواب دیا: ''ہم ایمان اس لیے نہیں لاتے کیونکہ وہ عیسائی بادشاہ، جو ہمیں بے شمار مال و خزانہ دیتے ہیں اور ہماری عزت و اکرام کرتے ہیں، اگر ہم ایمان لے آئیں اور اسلام قبول کر لیں تو یہ سب ہم سے چھین لیں گے''۔

اس بات چیت کا اثر اُس پادری کے بھائی کے دل پر یہ ہوا کہ اس نے قسم کھائی کہ جب تک مدینہ پہنچ کر ایمان نہ لوں، آرام سے نہ بیٹھوں گا۔ پھر وہ تیز اونٹنی پر سوار ہو کر سب سے پہلے مدینہ منورہ پہنچا اور مسلمان ہو گیا۔

دوسرا گروہ بعد میں مدینہ پہنچا، لیکن مال و دولت کی لالچ اور اعزاز و اکرام کی خواہش کی وجہ سے حق کو قبول کرنے سے انکار کر گیا۔

آیت نمبر (۱۱-۱۲) كَدَاْبِ اٰلِ فِرْعَوْنَ ۙ وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ؕ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا ۚ فَاَخَذَهُمُ اللّٰهُ بِذُنُوْبِهِمْ ؕ وَاللّٰهُ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ۝۱۱ قُلْ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا سَتُغْلَبُوْنَ وَتُحْشَرُوْنَ اِلٰى جَهَنَّمَ ؕ وَبِئْسَ الْمِهَادُ ۝۱۲

ترجمہ: ''ان کا حال بھی فرعون والوں جیسا ہے، اور ان لوگوں جیسا جو ان سے پہلے تھے۔ انہوں نے ہماری آیات کو جھٹلایا، تو اللہ نے انہیں ان کے گناہوں کی پاداش میں پکڑ لیا، اور اللہ سخت سزا دینے والا ہے۔ (اے نبی!) ان کافروں سے کہہ دیجیے: عنقریب تم مغلوب ہو جاؤ گے، اور جہنم کی طرف ہانکے جاؤ گے، اور وہ بہت ہی بُرا ٹھکانا ہے''۔

تفسیر اس آیت سے واضح ہوتا ہے کہ قیامت کے دن کافروں کی وہ مالی، جسمانی اور خاندانی طاقت جو دنیا میں ان کے پاس ہے، اللہ کے عذاب کے مقابلے میں بالکل کارگر نہیں ہوگی۔ مال و اولاد قیامت میں نہ تو اللہ کی رضا کے بغیر کامیابی دلا سکتے ہیں اور نہ ہی عذاب سے بچا سکتے ہیں۔

پیشین گوئی کے طور پر اللہ تعالیٰ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ارشاد فرمایا کہ آپ اُن یہود و نصاریٰ اور مشرکینِ عرب سے کہہ دیں کہ جلد ہی تم مغلوب ہو جاؤ گے۔ یہ اعلان محض جنگ میں شکست تک محدود نہیں بلکہ اس میں جلاوطنی، ذلت یا کسی اور قسم کی مغلوبیت شامل ہے اور یہ پیغام مکمل ہوا۔

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی میں یہ حقیقت سامنے آئی کہ اللہ اور اس کے رسول کے دشمن مغلوب ہوئے، عرب کفر سے پاک ہوئے۔ کچھ یہود و نصاریٰ نے جزیہ دیا، کچھ ہلاک ہوئے اور کچھ کو مدینہ چھوڑ کر ملک شام جلاوطن ہونا پڑا۔

کچھ مفسرین کے مطابق یہاں جو کفار جلدی مغلوب ہونے کا ذکر ہیں، وہ اُس وقت کے یہودِ مدینہ تھے۔ بعد از بدر جب نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم واپس آئے تو یہود کو جمع کر کے فرمایا کہ اسلام قبول کر لو، ورنہ قریش کی طرح تمہیں تکلیف اٹھانی پڑے گی۔ یہود نے گستاخانہ جواب دیا کہ قریش ناتجربہ کار اور جنگ سے ناواقف تھے، اگر ہم سے لڑو گے تو معلوم ہوگا کہ ہم کتنے بہادر ہیں۔

اسی جواب کے پیشِ نظر یہ آیت نازل ہوئی: ''قُلْ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا سَتُغْلَبُوْنَ وَتُحْشَرُوْنَ اِلٰى جَهَنَّمَ ؕ وَبِئْسَ الْمِهَادُ''۔

اللہ تعالیٰ نے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حکم دیا کہ اُن کفار یہودیوں سے کہہ دیں کہ گھبراؤ نہیں، جلد ہی تم مغلوب ہو جاؤ گے۔ تمہیں دنیاوی ذلت اور مغلوبیت کا سامنا کرنا پڑے گا، اور قیامت میں بھی جہنم کی سزا سے بچنا ممکن نہیں ہوگی۔ اس طرح یہ آیت کفر کی شکست اور اللہ کے وعدے کی حقیقت کی تصدیق کرتی ہے۔

آیت نمبر (۱۳) قَدْ كَانَ لَكُمْ اٰيَةٌ فِيْ فِئَتَيْنِ الْتَقَتَا ؕ فِئَةٌ تُقَاتِلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَاُخْرٰى كَافِرَةٌ يَّرَوْنَهُمْ مِّثْلَيْهِمْ رَاْىَ الْعَيْنِ ؕ وَاللّٰهُ يُؤَيِّدُ بِنَصْرِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَعِبْرَةً لِّاُولِي الْاَبْصَارِ ﴿۱۳﴾

ترجمہ: ''تمہارے لیے عبرت کی بات ہے ان دو گروہوں میں، جو آپس میں آمنے سامنے ہوئے۔ ایک گروہ اللہ کی راہ میں لڑ رہا تھا، اور دوسرا کافر تھا، جو ان (مسلمانوں) کو اپنی آنکھوں سے دوگنا دیکھ رہے تھے۔ اور اللہ اپنی مدد سے جسے چاہتا ہے قوت دیتا ہے، اس میں بصیرت والوں کے لیے یقیناً ایک سبق ہے''۔

تفسیر پچھلی آیت میں اللہ تعالیٰ نے پیشین گوئی کی تھی کہ کفار، یعنی اُس وقت کے مشرکین عرب اور یہودِ مدینہ، اپنی قوت، مال و دولت اور شان و شوکت کے باوجود مسلمانوں پر غالب نہیں آئیں گے۔ اس پیشین گوئی سے بعض افراد کے دل میں یہ سوال پیدا ہو سکتا تھا کہ مسلمان غریب و مفلس ہیں، نہ ان کے پاس طاقت ہے، نہ مال و دولت، نہ ہی سامانِ جنگ، پھر یہ کمزور لوگ اتنی بڑی تعداد اور اتنے بڑے دشمن پر کیسے غالب ہو سکتے ہیں؟ اس شبہ کو دور کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے جنگِ بدر کا واقعہ بیان فرمایا، جس میں مسلمانوں کی تعداد بہت کم اور وسائل نہ ہونے کے باوجود، اللہ کی مدد سے وہ کفار پر غالب آئے۔

جنگ بدر کا واقعہ

جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مکہ سے ہجرت کر کے مدینہ تشریف لائے، کفار کا ظلم ختم نہ ہوا۔ مدینہ کے یہود مسلمانوں کے خلاف اکسانے میں لگے رہے اور نئے آنے والے مہاجرین کو بھی مشکل حالات سے دوچار کیا جاتا رہا۔ مسلمانوں نے صبر و تحمل کا دامن پکڑے رکھا یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں جہاد کا حکم دیا۔ اس کے بعد مسلمانوں نے اپنی تدبیروں سے کفر کو شکست دینے اور اسلام کو قوت و غلبہ دینے کی کوششیں شروع کیں۔

مدینہ کے قریب چند کلومیٹر کے فاصلے پر ایک آبادی بدر کے نام سے مشہور تھی، جہاں عظیم الشان غزوۂ بدر ہوا۔ کفار قریش کی طاقت اُن کی شام کی تجارت سے تھی، لہٰذا مسلمانوں نے تجارتی قافلے کو روکنے کی تدبیر اختیار کی۔ ایک

مرتبہ قریش کا بڑا قافلہ شام سے آ رہا تھا۔ جب نبی ﷺ کو خبر ملی تو آپ صحابہ، مہاجرین وانصار کی ایک جماعت کے ساتھ اس کا مقابلہ کرنے کے لیے روانہ ہوئے۔ قافلے کے سردار ابوسفیان نے راستہ بدل دیا اور مکہ میں قریش کو خبر پہنچائی کہ مسلمانوں کے لشکر کا مقابلہ کرنا ہوگا۔

نتیجہ یہ ہوا کہ میدانِ بدر میں ایک طرف تقریباً ایک ہزار افراد پر مشتمل قریشی لشکر تھا، جن کے پاس سات سو اونٹ اور سو گھوڑے تھے، جبکہ دوسری طرف ۳۱۳ بے سروسامان ایمان والوں کا لشکر تھا، جن کے پاس صرف چند اونٹ، تھوڑی سی زرہیں اور چند ڈنڈے تھے۔ ۱۷ رمضان ۲ ہجری کو بدر میں گھمسان کی لڑائی ہوئی۔ رسول اللہ ﷺ سجدے میں سر رکھ کر اللہ سے مدد مانگ رہے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے فرشتوں کی فوج مسلمانوں کی مدد کے لیے بھیجی اور بے سروسامان مسلمان لشکر نے مضبوط دشمن کے مقابلے میں فتح حاصل کی۔

اس فتح کے نتیجے میں کفار کے ۷۰ بڑے سردار مارے گئے اور کئی قیدی بنائے گئے۔ مسلمانوں میں ۱۴ صحابہ شہید ہوئے، جن میں ۶ مہاجرین اور ۸ انصار رضی اللہ عنہم شامل تھے۔ اس واقعے سے واضح ہوا کہ اللہ کی مدد اور فضل کے بغیر طاقت اور دولت کا کوئی فائدہ نہیں، اور ایمان والوں کو غلبہ نصیب ہوتا ہے۔

کامیابی کا راز

کامیابی اور فتح ظاہری طاقت یا اکثریت پر منحصر نہیں۔ اصل فتح اللہ تعالیٰ کی مدد سے ہوتی ہے۔ اللہ جس پر چاہتا ہے اپنی مدد نازل فرماتا ہے اور جب وہ اپنے دین کو غالب کرنا چاہتا ہے تو کفار کی ظاہری طاقت اسے روک نہیں سکتی۔ اس آیت میں مسلمانوں کو ترغیب دی گئی ہے کہ وہ ایمان اور اسلام کی راہ پر استقامت رکھیں اور غیبی قوت پر بھروسہ کریں۔ کفار کے لیے یہ سبق بھی ہے کہ وہ اپنی دنیاوی طاقت پر غرور نہ کریں، کیونکہ خدائی قوت کا کوئی مقابلہ نہیں کرسکتا۔ البتہ اگر مسلمان اپنی ناسمجھی سے اللہ کو ناراض کردیں تو مدد رک سکتی ہے، اور یہ دوسری بات ہے۔

یہ آیت جنگِ بدر میں شریک صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی فضیلت کو بھی ظاہر کرتی ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''فِئَةٌ تُقَاتِلُ فِي سَبِيلِ اللهِ'' یعنی یہ ایک ایسی جماعت تھی جو صرف اللہ کے راستے میں، صرف دینِ اسلام کے لیے لڑ رہی تھی۔ یہ ان کے اخلاص اور ایمان کی نشانی ہے۔

احادیث میں بھی بدر کے صحابۂ کرام کی فضیلت کا ذکر ہے:

- حضرت علیؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ نے اہلِ بدر کی طرف توجہ فرمائی اور فرمایا، جنت تمہارے لیے واجب ہوچکی ہے''۔ **(بخاری رقم: ۳۹۸۳)**
- حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جو شخص بدر کے معرکہ میں شریک ہوا، وہ

جہنم میں نہیں جائے گا''۔(ترمذی رقم:۳۸۶۴)

● بخاری شریف میں حضرت رفاعہ بن رافعؓ سے روایت ہے کہ حضرت جبرئیلؑ نبی ﷺ کے پاس آئے اور پوچھا: آپ ﷺ اہلِ بدر کا کیا مرتبہ سمجھتے ہیں؟ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''ہم انہیں مسلمانوں میں سے بہتر اور افضل سمجھتے ہیں۔'' حضرت جبرئیلؑ نے کہا کہ بدر میں جو فرشتے حاضر تھے، ہم بھی انہیں افضل سمجھتے ہیں''۔

(بخاری رقم:۳۹۹۲)

● مزید یہ کہ حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ جب آدھی یا ایک تہائی رات گذر جاتی ہے تو آسمان دنیا پر نزول فرماتا ہے اور فرماتا ہے: کون مجھ سے دعا کرتا ہے تا کہ میں اس کی دعا قبول کروں؟ کون مجھ سے مانگتا ہے تا کہ میں اسے عطا کروں؟ کون مجھ سے گناہوں کی معافی چاہتا ہے تا کہ میں اسے بخش دوں؟''۔(مسلم رقم:۷۵۸)

یہ سب ہمیں یہ سبق دیتے ہیں کہ کامیابی اور نجات کی اصل چابی اللہ کی مدد، اخلاص اور ایمان کی پابندی میں ہے، اور اللہ کی رضا کے بغیر دنیاوی طاقت بے اثر ہے۔

نصیحت

بدر کے واقعے سے عقل رکھنے والوں کو عبرت حاصل کرنے کی دعوت دی گئی ہے، اور اس میں یہودِ مدینہ کی طرف بھی خصوصی اشارہ کیا گیا ہے: اے یہودِ مدینہ! اس واقعہ بدر سے سبق حاصل کرو اور ابھی موقع ہے کہ انکار سے باز آ جاؤ اور اسلام قبول کر لو۔ جیسا کہ پچھلی آیات میں بیان ہوا، حضرت محمد ﷺ نے غزوۂ بدر سے واپسی پر مدینہ کے یہود کو جمع کیا اور فرمایا کہ اللہ سے ڈرو، اور وہ مصیبت جو قریش پر بدر میں نازل ہوئی، کہیں تم پر بھی نہ آئے۔ تم جانتے ہو کہ میں اللہ کا سچا نبی ہوں اور تم نے اپنی کتابوں میں یہ صفات دیکھی ہیں۔

لیکن یہود نے جواب دیا کہ تم نے قریش کے چند ناتجربہ کار اور جنگ سے ناواقف لوگوں کو مارا، اگر کبھی ہم سے مقابلہ ہوگا تو معلوم ہو جائے گا کہ لڑنے والے کیسے ہوتے ہیں۔

یہ کفار دنیاوی مال و دولت، لذت اور عیش و عشرت کے نشے میں چور ہونے کی وجہ سے حق کو قبول نہیں کرتے۔ اس لیے قرآن انہیں یاد دلاتا ہے کہ دنیاوی دولت و راحت فانی ہے، اور آخرت کی عظیم الشان نعمتیں اہلِ ایمان کے لیے مخصوص ہیں، جو ہمیشہ رہیں گی اور انہیں نصیب ہوں گی۔

آیت نمبر (۱۴) زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوٰتِ مِنَ النِّسَآءِ وَالْبَنِيْنَ وَالْقَنَاطِيْرِ الْمُقَنْطَرَةِ

مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ وَالْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ وَالْاَنْعَامِ وَالْحَرْثِ ؕ ذٰلِكَ مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَاللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الْمَاٰبِ ﴿۱۴﴾

ترجمہ: ''لوگوں کے لیے دنیا کی خواہشات خوشنما بنادی گئی ہیں: عورتیں، بیٹے، سونے چاندی کے ڈھیر، نشان دار گھوڑے، مویشی اور کھیتی۔ یہ سب دنیا کی زندگی کا سامان ہے، اور اللہ کے پاس بہترین ٹھکانا ہے''۔

تفسیر پچھلی آیت میں واقعۂ بدر کا ذکر کرنے کے بعد واضح کیا گیا کہ یہ واقعہ بصیرت رکھنے والوں کے لیے بڑی نصیحت ہے۔ اس میں یہ دکھایا گیا کہ کس طرح ایک کمزور اور بے سروسامان جماعت نے ایک پوری قوت اور شان و شوکت والے گروہ پر غلبہ حاصل کیا، اور اس کی وجہ یہ تھی کہ اللہ تعالیٰ کی مدد اہلِ اسلام کے ساتھ تھی۔ اس سے مخالفینِ اسلام اور دین حق کے انکار کرنے والوں کو سبق ملتا ہے کہ وہ اپنے مال و دولت، دنیاوی عزت اور عیش و عشرت کے غرور کو چھوڑ کر اس جماعت میں شامل ہو جائیں جس کے ساتھ اللہ کی مدد ہے۔ کیونکہ مال و دولت، دنیاوی لذت اور عیش و عشرت سب فانی اور بے کار ہیں، اور آخرت کی عظیم نعمتوں کے مقابلے میں ان کی کوئی قدر نہیں۔ اسی تناظر میں اس آیت میں دنیا کی لذتوں کی حقارت بیان کی گئی ہے، اور نجران کے لوگوں کی طرف اشارہ کیا گیا جو مال و جاہ کی محبت میں حق کو ماننے سے باز رہے، اور نصاریٰ کے سب سے بڑے پادری ابو حارث نے بھی مال و دولت کی محبت کی وجہ سے ایمان اور ہدایت کی حقیقی دولت سے محرومی اختیار کی۔

پسندیدہ چیزیں

آیت میں بیان کیا گیا کہ اکثر لوگوں کو یہ پسندیدہ چیزیں خوشنما اور پرکشش معلوم ہوتی ہیں: عورتیں، بیٹے، سونے چاندی کے خزانوں کے ڈھیر، نشان والے گھوڑے، دیگر مویشی اور کھیتی۔ یہ سب دنیاوی زندگی کے استعمال کی چیزیں ہیں، جبکہ نیک انجام اور حقیقی کامیابی صرف اللہ کے پاس ہے جو موت کے بعد کام آتی ہیں۔

دنیا کی محبت اور اس کے درجے

یہ آیت دنیاوی محبوب چیزوں کی چند اہم مثالیں دے کر یہ سمجھاتی ہے کہ انسان کی فطری خواہشات اور لذتیں دل کو اپنی طرف کھینچتی ہیں، جس کی وجہ سے بہت سے لوگ دنیاوی لذتوں میں اتنے مگن ہو جاتے ہیں کہ اللہ سے غافل ہو جاتے اور آخرت کو بھلا بیٹھتے ہیں۔

سب سے پہلے عورتوں کا ذکر کیا گیا، کیونکہ دنیاوی لذتوں اور شہوتوں کا یہ سب سے بڑا ذریعہ ہے اور مرد دنیا میں عورت سے زیادہ کسی چیز سے محبت نہیں کرتے۔ حدیث شریف میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے: ''میرے بعد

مردوں کے لیے عورتوں سے بڑھ کر کوئی فتنہ نہیں جو نقصان دہ ہو''۔

دوسرے درجے میں بیٹوں کی محبت بیان کی گئی ہے، کیونکہ لوگ چاہتے ہیں کہ ان کے بیٹے وقت پر مددگار ہوں اور ان کے جانشین بنیں۔ تیسرے درجے میں سونے اور چاندی کے خزانوں کی محبت ہے، جنہیں انسان اپنی خواہشات اور لذتیں حاصل کرنے کا ذریعہ سمجھتا ہے۔

چوتھے درجے میں آرام وآسائش اور عیش وعشرت کی محبت ہے، جو زندگی میں سہولت اور دکھاوا فراہم کرتی ہے۔ پانچویں درجے میں خوبصورت اور مضبوط گھوڑوں کی محبت ہے، جو سفر، تفریح اور ظاہری شان وشوکت کے لیے قیمتی سمجھی جاتی ہیں۔

آخر میں چوپاؤں اور دیگر جانوروں کی محبت بیان کی گئی ہے بی جیسے اونٹ، گائے، بھینس، بھیڑ اور بکری بی کیونکہ یہ روزی اور ضروریاتِ زندگی کا ذریعہ ہیں، گوشت اور دودھ فراہم کرتے ہیں، اور ان کی کھال اور چمڑا مختلف چیزیں بنانے میں کام آتا ہے، جیسے شال، کمبل، چادر اور جوتے وغیرہ۔

چھٹے درجے میں کھیتی کی محبت بیان کی گئی ہے، کیونکہ یہ انسان کی زندگی کے لیے بنیادی ذریعہ ہے۔ اگرچہ ضرورت کے لحاظ سے کھیتی اور کاشتکاری سب سے مقدم ہیں، لیکن شہوت ولذت کے لحاظ سے یہ سب سے آخری درجے میں آتی ہیں۔ اسی لیے قرآن میں اسے آخری درجے میں ذکر فرمایا گیا۔ یہ تمام چیزیں انسان کے لیے فطری طور پر پسندیدہ ہیں، اور اکثر لوگ ان کی محبت میں حد سے زیادہ مبتلا ہو جاتے ہیں۔ ظاہری رونق اور دنیاوی سہولیات پر خوش ہو کر اللہ اور آخرت کو بھلا بیٹھتے ہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے یہ محبت فطری طور پر انسان کے دل میں ڈال دی ہے، اور اس میں بے شمار حکمتیں چھپی ہیں۔ سب سے بڑی حکمت یہ ہے کہ انسان کا امتحان لیا جائے: کون ان چیزوں کی محبت میں اتنا مبتلا ہو جاتا ہے کہ آخرت کو بھلا بیٹھے اور اللہ سے غافل ہو جائے اور کون ان چیزوں کی فانی حقیقت کو سمجھ کر انہیں اپنے مالک کو خوش کرنے اور آخرت کی بھلائی کے کام میں لگاتا ہے۔

زندگی کا مقصد

اس بیان کا مقصد یہ واضح کرنا ہے کہ دنیا کو زندگی کا اصل مقصد نہ بنایا جائے، بلکہ اسے اسلامی شریعت کے مطابق استعمال کرتے ہوئے آخرت کی کامیابی کا ذریعہ بنایا جائے۔ دنیا خود فنا ہونے والی ہے اور اس کے تمام وسائل بھی فانی ہیں۔ دنیا سے جدا ہونے کے بعد ان سے تعلق ٹوٹ جاتا ہے، اس لیے ان چیزوں کو صحیح مقام پر رکھ کر آخرت کے لیے سرمایہ بنانا چاہیے۔ اصل ٹھکانہ انسان کا آخرت میں ہے، اور روحانی وجسمانی لذتیں جو اللہ کے پاس ہیں، ان

کے مقابلے میں دنیاوی عیش وآرام کچھ بھی نہیں۔

انسان کو اس فانی اور عارضی چیز پر مرعوب نہیں ہونا چاہیے تاکہ وہ لازوال اور حقیقی نعمتوں سے محروم نہ رہ جائے۔ یہ لازوال اور حقیقی نعمتیں کون حاصل کرسکتا ہے اور ان کے حصول کا طریقہ کیا ہے، یہ اگلی آیات میں بیان فرمایا گیا ہے۔

آیت نمبر(۱۵) قُلْ اَؤُنَبِّئُكُمْ بِخَيْرٍ مِّنْ ذٰلِكُمْ ؕ لِلَّذِيْنَ اتَّقَوْا عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا وَاَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ وَّرِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِالْعِبَادِ ﴿۱۵﴾

ترجمہ: ''(اے نبی!) کہہ دیجیے: کیا میں تمہیں ان سب سے بہتر چیز کی خبر دوں؟ ان لوگوں کے لیے جو تقویٰ اختیار کرتے ہیں، ان کے رب کے پاس باغات ہیں، جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں، وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے، ان کے لیے پاکیزہ بیویاں ہوں گی اور اللہ کی رضا حاصل ہوگی۔ اور اللہ اپنے بندوں کو خوب دیکھتا ہے''۔

تفسیر جنت کی نعمتیں

قیامت کے دن کے ذکر کے بعد اب اس کی تفصیل بیان کی جارہی ہے تاکہ مومنین اُس کی حصول کی طرف رغبت پیدا کریں اور اُس کے لیے کوشش کریں۔ جنت میں نہریں بہتی ہوں گی جن میں شہد، دودھ، شراب اور پانی شامل ہیں اور وہاں ایسی بے مثال نعمتیں ہوں گی جنہیں نہ کسی آنکھ نے دیکھا، نہ کسی کان نے سنا اور نہ ہی کسی انسان کے دل میں اس کا تصور آیا ہوگا۔

''پاکیزہ بیوی'' سے مراد ایسی بیویاں ہیں جو ہر قسم کی نجاست اور ہر گندگی سے پاک ہوں گی۔ اور ''اللہ تعالیٰ کی خوشنودی'' سے مراد وہ رضا ہے جو جنتیوں کے لیے آخری اور کامل سکون ہے، جس کے بعد اللہ کبھی بھی اُن سے ناراض نہیں ہوگا، جیسا کہ صحیح بخاری ومسلم میں روایت ہے۔

حضرت ابوسعید خدریؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ اہل جنت سے پوچھے گا: کیا تم لوگ خوش ہو گئے؟ تو جنتی کہیں گے: ہم کیوں نہ خوش ہوں، تو تُو نے تو ہمیں وہ کچھ دیا جو کسی اور کو نہیں دیا۔ پھر اللہ تعالیٰ فرمائے گا: میں تمہیں اس سے بھی افضل چیز دیتا ہوں، یعنی اپنی رضامندی، ایسی رضامندی جس کے بعد میں کبھی تم سے ناراض نہ ہوں گا''۔

اور اسی دعا میں کہا گیا: ''اے اللہ! میں تجھ سے جنت الفردوس کی طلب کرتا ہوں اور جہنم کی آگ سے پناہ مانگتا ہوں''۔ **(بخاری رقم:۶۵۴۹)**

آیت نمبر(۱۶) اَلَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اِنَّنَآ اٰمَنَّا فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ﴿۱۶﴾

ترجمہ ''یہ وہ لوگ ہیں جو کہتے ہیں: اے ہمارے رب! ہم ایمان لائے، لہٰذا ہمارے گناہوں کو بخش دے اور ہمیں دوزخ کے عذاب سے بچا''۔

تفسیر اس آیت میں اُن پرہیزگاروں کی خصوصیات بیان کی گئی ہیں جو اللہ تعالیٰ کی جنت اور اُس کی بے شمار نعمتوں کے حقیقی وارث بنے۔ یہاں یہ بھی دلیل دی گئی ہے کہ دعا کرنے والا اپنی نیکیوں کو ذکر کر کے اُنہیں وسیلہ بنائے۔ اس کی تصدیق صحیحین کی مشہور روایت ''اصحابِ غار'' سے بھی ہوتی ہے، جس میں بیان ہے کہ وہ تین نوجوان جب غار میں پناہ لیے ہوئے تھے، تو اپنی اپنی نیکیوں کو وسیلہ بناتے ہوئے دعا کی، اور اللہ تعالیٰ نے ان کی حفاظت فرمائی اور غار کے دہانے پر پڑے پتھروں کو ہٹا کر اُن کی جان بچالی۔

آیت نمبر(۱۷) اَلصّٰبِرِيْنَ وَالصّٰدِقِيْنَ وَالْقٰنِتِيْنَ وَالْمُنْفِقِيْنَ وَالْمُسْتَغْفِرِيْنَ بِالْاَسْحَارِ ﴿۱۷﴾

ترجمہ: ''یہ وہ لوگ ہیں جو صبر کرتے ہیں، سچ بولتے ہیں، اطاعت گزار ہیں، اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں، اور سحر کے وقت (یعنی تہجد کے وقت) بخشش مانگتے ہیں''۔

تفسیر اس آیت میں پرہیزگاروں کی صفات بیان کی گئی ہیں اور استغفار کی فضیلت واضح کی گئی ہے۔ صحیحین اور دیگر احادیث کی کتابوں میں متعدد صحابۂ کرام سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

● ''ہر رات جب رات کا ایک تہائی حصہ باقی رہ جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ آسمانِ دنیا کی طرف نزول فرماتا ہے اور فرماتے ہیں: کیا کوئی ایسا ہے جو مانگ رہا ہو جسے میں دوں؟ کیا کوئی دعا کرنے والا ہے جس کی دعا قبول کروں؟ کیا کوئی مغفرت طلب کرنے والا ہے جسے میں معاف کردوں؟'' **(بخاری رقم:۱۱۴۵)**

● مسلم شریف میں ایک اور روایت میں ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے دونوں ہاتھ پھیلاتے ہیں اور فرماتے ہیں: ''کون ایسا ہے جو قرض دے، مگر فقیر اور ظالم نہ ہو؟'' **(مسلم رقم:۷۵۸)**

● ایک اور روایت میں ہے کہ یہ رحمت طلوع فجر تک جاری رہتی ہے۔ **(مسلم رقم:۷۵۸)**

یہ آیات اور احادیث یہ سبق دیتی ہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت اور بخشش سے دعا گو اور تائب بندوں کو کبھی خالی نہیں لوٹاتا۔

آیت نمبر (۱۸) شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۙ وَالْمَلٰٓئِكَةُ وَاُولُوا الْعِلْمِ قَآئِمًۢا بِالْقِسْطِ ؕ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿۱۸﴾

ترجمہ: ''اللہ نے گواہی دی کہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں، اور فرشتوں اور علم والوں نے بھی (گواہی دی) کہ وہ عدل پر قائم ہے۔ اس کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ غالب ہے، بڑی حکمت والا ہے''۔

تفسیر یہ آیت اللہ اور اس کے فرشتوں کی زبانی ایک واضح شہادت ہے، یعنی اللہ کی توحید اور اس بات کی تصدیق کہ عدل وانصاف اور اعتدال اُس کی صفت ہیں۔ اس میں اہلِ علم کی بھی بلند فضیلت بیان کی گئی ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے توحید کی اس شہادت کے لیے انہیں منتخب فرمایا، اور ان کی گواہی کو اپنی اور فرشتوں کی گواہی کے ساتھ جوڑ دیا۔ یہی وجہ ہے کہ اہلِ علم کی گواہی کو مخلوق کے لیے قبول کرنا واجب ہے۔ مفسرین کے نزدیک یہاں اہلِ علم سے مراد وہ لوگ ہیں جو قرآن وسنت کے علم میں مہارت رکھتے ہیں۔

❁❁❁

ترجمہ-آیت نمبر ۱۹ سے ۲۷ تک

اِنَّ الدِّیۡنَ عِنۡدَ اللّٰہِ الۡاِسۡلَامُ ۟ وَمَا اخۡتَلَفَ الَّذِیۡنَ اُوۡتُوا الۡکِتٰبَ اِلَّا مِنۡۢ بَعۡدِ مَا جَآءَہُمُ الۡعِلۡمُ بَغۡیًۢا بَیۡنَہُمۡ ؕ وَمَنۡ یَّکۡفُرۡ بِاٰیٰتِ اللّٰہِ فَاِنَّ اللّٰہَ سَرِیۡعُ الۡحِسَابِ ﴿۱۹﴾ فَاِنۡ حَآجُّوۡکَ فَقُلۡ اَسۡلَمۡتُ وَجۡہِیَ لِلّٰہِ وَمَنِ اتَّبَعَنِ ؕ وَقُلۡ لِّلَّذِیۡنَ اُوۡتُوا الۡکِتٰبَ وَالۡاُمِّیّٖنَ ءَاَسۡلَمۡتُمۡ ؕ فَاِنۡ اَسۡلَمُوۡا فَقَدِ اہۡتَدَوۡا ۚ وَاِنۡ تَوَلَّوۡا فَاِنَّمَا عَلَیۡکَ الۡبَلٰغُ ؕ وَاللّٰہُ بَصِیۡرٌۢ بِالۡعِبَادِ ﴿۲۰﴾ اِنَّ الَّذِیۡنَ یَکۡفُرُوۡنَ بِاٰیٰتِ اللّٰہِ وَیَقۡتُلُوۡنَ النَّبِیّٖنَ بِغَیۡرِ حَقٍّ ۙ وَّیَقۡتُلُوۡنَ الَّذِیۡنَ یَاۡمُرُوۡنَ بِالۡقِسۡطِ مِنَ النَّاسِ ۙ فَبَشِّرۡہُمۡ بِعَذَابٍ اَلِیۡمٍ ﴿۲۱﴾ اُولٰٓئِکَ الَّذِیۡنَ حَبِطَتۡ اَعۡمَالُہُمۡ فِی الدُّنۡیَا وَالۡاٰخِرَۃِ ۫ وَمَا لَہُمۡ مِّنۡ نّٰصِرِیۡنَ ﴿۲۲﴾ اَلَمۡ تَرَ اِلَی الَّذِیۡنَ اُوۡتُوۡا نَصِیۡبًا مِّنَ الۡکِتٰبِ یُدۡعَوۡنَ اِلٰی کِتٰبِ اللّٰہِ لِیَحۡکُمَ بَیۡنَہُمۡ ثُمَّ یَتَوَلّٰی فَرِیۡقٌ مِّنۡہُمۡ وَہُمۡ مُّعۡرِضُوۡنَ ﴿۲۳﴾ ذٰلِکَ بِاَنَّہُمۡ قَالُوۡا لَنۡ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّاۤ اَیَّامًا مَّعۡدُوۡدٰتٍ ۖ وَغَرَّہُمۡ فِیۡ دِیۡنِہِمۡ مَّا کَانُوۡا یَفۡتَرُوۡنَ ﴿۲۴﴾ فَکَیۡفَ اِذَا جَمَعۡنٰہُمۡ لِیَوۡمٍ لَّا رَیۡبَ فِیۡہِ ۟ وَوُفِّیَتۡ کُلُّ نَفۡسٍ مَّا کَسَبَتۡ وَہُمۡ لَا یُظۡلَمُوۡنَ ﴿۲۵﴾ قُلِ اللّٰہُمَّ مٰلِکَ الۡمُلۡکِ تُؤۡتِی الۡمُلۡکَ مَنۡ تَشَآءُ وَتَنۡزِعُ الۡمُلۡکَ مِمَّنۡ تَشَآءُ ۫ وَتُعِزُّ مَنۡ تَشَآءُ وَتُذِلُّ مَنۡ تَشَآءُ ؕ بِیَدِکَ الۡخَیۡرُ ؕ اِنَّکَ عَلٰی کُلِّ شَیۡءٍ قَدِیۡرٌ ﴿۲۶﴾ تُوۡلِجُ الَّیۡلَ فِی النَّہَارِ وَتُوۡلِجُ النَّہَارَ فِی الَّیۡلِ ۫ وَتُخۡرِجُ الۡحَیَّ مِنَ الۡمَیِّتِ وَتُخۡرِجُ الۡمَیِّتَ مِنَ الۡحَیِّ ۫ وَتَرۡزُقُ مَنۡ تَشَآءُ بِغَیۡرِ حِسَابٍ ﴿۲۷﴾

ترجمہ:

(۱۹)۔ بے شک اللہ کے نزدیک دین صرف اسلام ہے۔ اور اہلِ کتاب نے اختلاف نہیں کیا مگر اُس کے بعد کہ ان کے پاس علم آ چکا تھا، محض حسد اور ضد کی وجہ سے۔ اور جو کوئی اللہ کی آیات کا انکار کرے گا، تو اللہ بہت جلد حساب لینے والا ہے۔ (۲۰)۔ پھر اگر وہ آپ سے جھگڑا کریں، تو کہہ دیجیے: میں نے اپنا چہرہ اللہ کے آگے جھکا دیا ہے، اور ان لوگوں نے بھی جو میرے پیروکار ہیں۔ اور اہلِ کتاب اور ان پڑھ لوگوں سے کہہ دیجیے: کیا تم بھی اسلام لاتے ہو؟ اگر وہ اسلام لے آئیں، تو ہدایت پا گئے، اور اگر منہ موڑیں تو آپ کا کام صرف پیغام پہنچا دینا ہے۔ اور اللہ اپنے بندوں کو خوب دیکھنے والا ہے۔ (۲۱)۔ یقیناً جو لوگ اللہ کی آیات کا انکار کرتے ہیں، اور انبیاء کو ناحق قتل کرتے ہیں، اور ان لوگوں کو بھی قتل کرتے ہیں جو لوگوں کو عدل و انصاف کا حکم دیتے ہیں، تو اُنہیں خوشخبری دے دیجئے ایک دردناک عذاب

کی۔(۲۲)۔یہی وہ لوگ ہیں جن کے سب اعمال دنیا وآخرت میں ضائع ہو گئے، اور ان کا کوئی مددگار نہیں۔(۲۳)۔ کیا آپ نے اُن لوگوں کو نہیں دیکھا جنہیں کتاب کا کچھ حصہ دیا گیا تھا؟ جب انہیں اللہ کی کتاب کی طرف بلایا جاتا ہے تاکہ وہ ان کے درمیان فیصلہ کرے، تو ان میں سے ایک گروہ منہ موڑ لیتا ہے، حالانکہ وہ منہ موڑنے والے ہی ہیں۔(۲۴)۔یہ سب اس لیے ہے کہ وہ کہتے ہیں: ہمیں آگ صرف چند گنتی کے دن ہی چھوئے گی۔اور ان کے اس خودساختہ عقیدے نے انہیں دھوکے میں ڈال رکھا ہے جو انہوں نے اپنے دین کے بارے میں گھڑ رکھا ہے۔(۲۵)۔تو پھر اُس دن کیا حال ہوگا جب ہم اُن سب کو جمع کریں گے، جس کے آنے میں کوئی شک نہیں، اور ہر شخص کو اس کے اعمال کا پورا پورا بدلہ دیا جائے گا اور ان پر کوئی ظلم نہیں کیا جائے گا۔(۲۶)۔کہہ دیجئے: اے اللہ! بادشاہی کے مالک! تو جسے چاہے حکومت دیتا ہے اور جس سے چاہے چھین لیتا ہے، تو جسے چاہے عزت دیتا ہے اور جسے چاہے ذلت دیتا ہے۔ساری بھلائیاں تیرے ہی ہاتھ میں ہیں، یقیناً تو ہر چیز پر قادر ہے۔(۲۷)۔تو ہی رات کو دن میں داخل کرتا ہے اور دن کو رات میں داخل کرتا ہے، تو ہی زندہ کو مردہ سے نکالتا ہے اور مردہ کو زندہ سے، اور تو جسے چاہے بے حساب رزق دیتا ہے۔

تفسیر-آیت نمبر ۱۹ سے ۲۷ تک

آیت نمبر (۱۹) اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ ۗ وَمَا اخْتَلَفَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْعِلْمُ بَغْیًۢا بَیْنَهُمْ ؕ وَمَنْ یَّكْفُرْ بِاٰیٰتِ اللّٰهِ فَاِنَّ اللّٰهَ سَرِیْعُ الْحِسَابِ ﴿۱۹﴾

ترجمہ: ''بے شک اللہ کے نزدیک دین صرف اسلام ہے۔اور اہلِ کتاب نے اختلاف نہیں کیا مگر اُس کے بعد کہ ان کے پاس علم آچکا تھا، محض حسد اور ضد کی وجہ سے۔اور جو کوئی اللہ کی آیات کا انکار کرے گا، تو اللہ بہت جلد حساب لینے والا ہے''۔

تفسیر اللہ تعالیٰ کے نزدیک ''اسلام'' کے علاوہ کوئی دین قابلِ قبول نہیں۔تمام نبی اپنی قوموں کے لیے یہی دین لے کر آئے اور ان کے لیے اس کی پیروی لازم تھی، یہاں تک کہ نبی کریم ﷺ تشریف لائے۔آپ ﷺ کے آنے کے بعد اگر کوئی شخص کسی دوسرے دین کی پیروی کرتے ہوئے وفات پائے تو اس کی موت کفر پر ہوگی۔رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اُس کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، اس امت کا کوئی بھی شخص جو میرے بارے میں سنے گا، چاہے وہ یہودی ہو یا نصرانی، اگر اسلام پر ایمان نہ لائے تو وہ جہنمی ہوگا''۔(مسلم رقم:۳۸۶)

● آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ بھی فرمایا: ''میں سرخ وسیاہ تمام انسانوں کی طرف بھیجا گیا ہوں''۔ **(مسلم رقم:۵۲۱)**

● اسی طرح فرمایا: ''ہر نبی ایک خاص قوم کے لیے بھیجا جاتا تھا اور میں تمام انسانوں کے لیے بھیجا گیا ہوں''۔ **(بخاری رقم:۳۳۵)**

اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو پیدا کرنے کے بعد یوں ہی چھوڑا نہیں، بلکہ جس طرح کوئی صنعت کسی شے کو بناتی ہے اور اس کے استعمال کا طریقہ بھی بتاتی ہے، اسی طرح اللہ نے انسان کو پیدا کیا اور اس کے اعضاء کے استعمال کا صحیح طریقہ اور ان پر عمل کرنے کا نظام بتایا۔ یہی اللہ کا مذہب ہے، جسے وہ اپنے نبیوں کے ذریعے ہر زمانے میں لوگوں کو ان کی زبان میں پہنچاتا رہا، جیسا کہ قرآن میں سورہ نحل میں فرمایا: ث ''وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِي كُلِّ أُمَّةٍ رَّسُولًا''۔ **(سورہ نحل، آیت ۳۶)**

اس سے واضح ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر قوم اور ہر خطے میں اپنے رسول بھیجے، تاکہ وہ دینِ اسلام کی تعلیم لوگوں تک پہنچائیں۔

دنیا کے تمام مذاہب کے نام عام طور پر کسی شخصیت یا اس کی پیدائش کی جگہ سے منسلک ہیں۔ مثال کے طور پر: ''عیسائی مذہب'' حضرت عیسیٰؑ سے متعلق ہے، ''بدھ مذہب'' مہاتما بدھ کے نام سے ہے، ''زرتشتی مذہب'' زردشت کے نام سے اور ''یہودی مذہب'' یہودی قبیلے کے نام سے۔ اسی وجہ سے بعض لوگ مسلمانوں کو بھی کسی خاص ذات یا شخص کے پیروکار سمجھ بیٹھتے ہیں، حالانکہ ایسا بالکل نہیں ہے۔

اسلام کی خصوصیت یہ ہے کہ یہ کسی فرد، ذات یا ملک کے نام سے منسلک نہیں، بلکہ یہ تمام انسانوں کے لیے فطری اور قدرتی مذہب ہے۔ اسلام کا مقصد یہ واضح کرتا ہے کہ جو اس کے اصولوں کو نہ مانے اور ان پر عمل نہ کرے، وہ مسلمان نہیں، چاہے وہ کسی نسل، قوم یا ملک کا ہی کیوں نہ ہو۔

اسلام کے لفظی معنیٰ

اسلام عربی زبان کا لفظ ہے جو حروف ''س ل م'' سے مرکب ہے۔ عربی قواعد کے مطابق اس سے مشتق الفاظ ''اسلام'' اور ''تسلیم'' بنے ہیں، جبکہ اسی حروف سے بننے والا لفظ ''سلم'' کا معنیٰ ''امن'' ہے۔ اسی طرح ''سلام'' اور ''سلامت'' کے الفاظ بھی ہماری زبان میں عموماً سلامتی کے مفہوم میں استعمال ہوتے ہیں۔ خود لفظ ''اسلام'' کا بنیادی مطلب ہے اپنے آپ کو اللہ کے لیے مکمل طور پر سپرد کرنا، اس کے سامنے سر جھکانا، اس کے احکام کی اطاعت کرنا اور اس کی عبادت کرنا۔ لہٰذا، اسلام کا لفظی معنیٰ ہے سپردگی (Surrender) یا اپنے آپ کو بلا شرط وضابطہ اللہ کے حوالے کر دینا، یعنی اللہ کی تعلیمات اور احکام کے مطابق زندگی گزارنا۔

اسلام کا اصطلاحی معنٰی

اسلام کا اصطلاحی معنٰی ہے اللہ اور اس کی طرف سے بھیجی گئی تعلیمات کو تسلیم کر لینا اور اپنی پوری زندگی میں اس کے احکام کی پیروی کرتے ہوئے اللہ کا بندہ بن جانا، یعنی صرف اسی کی عبادت کرنا اور اس کے مقرر کردہ قوانین کے مطابق زندگی گزارنا۔ قرآن مجید میں ارشاد ہے:

اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا ؕ

ترجمہ: ''آج کے دن تمہارے مذہب کو میں نے پورا کر دیا اور میں نے تم پر اپنی نعمت پوری کر دی اور میں نے تمہارے لئے اسلام مذہب کو پسند کیا۔''

اوپر کے بیان سے واضح ہوتا ہے کہ اسلام مذہب حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے میں مکمل ہوا، لیکن اس کا بانی کوئی اور ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کوئی نیا مذہب لے کر نہیں آئے بلکہ پہلے آنے والے پیغمبروں پر نازل شدہ کتابوں کی تصدیق کرتے ہوئے قرآن کو انسانیت کی زندگی کے لیے کامیابی کا نسخہ بنایا۔ لہٰذا اسلام کا اصل بانی اللہ تعالیٰ ہیں اور دنیا میں سب سے پہلے اس پر عمل کرنے والے حضرت آدمؑ تھے، اسی طرح حضرت نوحؑ اور حضرت ابراہیمؑ نے جس دین کی دعوت دی، وہ بھی اسلام ہی تھا حضرت موسیٰؑ اور حضرت عیسیٰؑ سب اسی دین کے پیروکار تھے، البتہ سبھی نبی اپنے زمانے کی زبان میں اس دین کے بنیادی عقائد کا تعارف تعارف کراتے رہے، جن کے بنیادی اصول یکساں تھے۔

جب حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مکہ میں پیدا ہوئے، وہاں کی زبان عربی تھی، اس لیے انہوں نے اسی زبان میں لفظ اسلام استعمال کیا اور قرآن میں اسے بیان کیا: ''اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ قف'' ''اللہ کے نزدیک دین صرف اسلام ہے''۔ **(سورہ آل عمران:۱۹)**

پورا جہان اللہ کا ہے اور تمام انسان بھی اللہ کے ہیں۔ اسلام ساری انسانیت کا دین ہے، کیونکہ دنیا کی ہر چیز اللہ کے مقرر کردہ قانون کی پابند ہے۔ سورج، چاند، ستارے، پیڑ پودے، چرند پرند سب اللہ کے قوانین کی پیروی کر رہے ہیں۔ جس کام کے لیے کسی مخلوق کو تعینات کیا گیا ہے، وہ اسے انجام دے رہی ہے۔ اسی طرح اسلام کا مطلب بھی اللہ کی فرمانبرداری کرنا ہے۔

لیکن جن اور انسانوں میں سے بہت سے لوگ اللہ کی نافرمانی کرتے ہیں، یہ بڑا ظلم ہے، کیونکہ اللہ نے انہیں پیدا کیا اور ضروریات زندگی دی، اور پھر وہ خود کو اس کا فرمانبردار نہ مانیں یا کسی اور کی عبادت کریں۔ یہ انصاف کے منافی ہے۔

اللہ تعالیٰ کا پسندیدہ دین

اللہ تعالیٰ نے سورۃ مائدہ کی آیت نمبر ۳ میں جہاں دین کے مکمل ہونے اور اپنی نعمت کو پورا کرنے کی خوشخبری دی، وہاں یہ بھی فرمایا کہ میں نے تمہارے لیے دین کے طور پر اسلام کو پسند فرمایا اور اسے تمہاری رہنمائی اور عمل کے لیے منتخب کیا۔ اسی طرح سورۃ آلِ عمران کی آیت نمبر ۱۹ میں اللہ تعالیٰ نے واضح فرمایا کہ اللہ کے یہاں پسندیدہ دین صرف اسلام ہے۔ چونکہ اللہ کا پسندیدہ دین اسلام ہے، اس لیے اللہ کے یہاں کامیابی، نجات اور قبولیت کا معیار بھی اسی پر ہوگا، جیسا کہ سورۃ آلِ عمران کی آیت ۸۵ میں ذکر کیا گیا ہے کہ اللہ کے نزدیک اسلام کے علاوہ کوئی دین قبول نہیں کیا جائے گا۔

'مسلم' کا مطلب: ''وہ شخص جو اپنے آپ کو بغیر کسی شرط کے اللہ کے حوالے کر دے، اسے 'مسلم' کہتے ہیں''۔ جو اللہ پر ایمان رکھے، حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو آخری رسول تسلیم کرے، اور قرآن کو آخری کتاب مانتے ہوئے اسی کے مطابق زندگی گزارے، وہ 'مسلم' کہلاتا ہے۔

دنیا کی ہر چیز 'مسلم' ہے

'مسلم' کا اصل معنیٰ ہے اپنے پیدا کرنے والے کی فرمانبرداری کرنا۔ اس نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو دنیا کی ہر چیز مسلم ہے۔ پوری کائنات اللہ ہی کی پیدا کردہ ہے، وہی اس دنیا کا رب ہے، اور ہر شے اپنے مقررہ کام میں مشغول ہے۔ اللہ نے ہر چیز کے لیے قوانین مقرر کیے ہیں، جن سے ہٹنا کسی کے بس میں نہیں۔

پانی کے بہنے، بھاپ بن کر اڑنے، اور ٹھنڈ کے اثر سے جم جانے کے قوانین، سورج، چاند اور تاروں کے قوانین، زمین پر پودوں کے اگنے، بڑھنے اور فروغ کے اصول یہ سب اپنی فطری حدود میں ہیں اور ان کے رب کے مقررہ قوانین کے خلاف عمل نہیں کر سکتیں۔ ہر شے اسی قانون کے مطابق اپنے رب کے حکم کی پابند ہے۔

اسی طرح انسان بھی اس دنیا کا ایک حصہ ہے، جسے اللہ نے پیدا کیا۔ اس کی زندگی، نشوونما، بڑھنا، پلنا اور موت بھی اللہ کے مقرر کردہ قانون کے مطابق ہے۔ سانس لینا، دل کی دھڑکن، ہاتھ، پیر، آنکھیں اور کان بھی سب اپنے مقررہ کام کے مطابق عمل کرتے ہیں۔ انسان اپنی مرضی سے ان قوانین کو نہیں بدل سکتا، جیسے سانس لیے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا یا ہوا کے بغیر پانی میں مچھلی کی طرح نہیں جی سکتا۔

یوں انسان بھی اپنی زندگی کے بیشتر امور میں اللہ کے مقررہ قوانین کی پابندی میں ہے اور اس اعتبار سے وہ بھی دنیا کی دیگر مخلوقات کی طرح قدرتی طور پر مسلم ہے۔

انسان اور دیگر مخلوقات میں فرق

اللہ تعالیٰ نے انسان کو عقل عطا کی ہے، سوچنے اور سمجھنے کی طاقت دی ہے، اور اسے اختیار بھی دیا ہے کہ وہ چاہے تو اللہ کے راستے پر چلے یا انکار کرے۔ انسان اپنی عقل وقوت سے اچھے کام بھی کرسکتا ہے اور برے کام بھی۔ آنکھ، کان، ہاتھ اور پیر کے ذریعے وہ بھلے اعمال انجام دے سکتا ہے یا ناپسندیدہ اعمال میں مشغول ہوسکتا ہے۔

زندگی کے اس حصہ میں اللہ نے انسان کو آزادی دی ہے کہ وہ چاہے تو مسلم بن کر رہے یا انکار کرے۔ پیدا ہونے کے بعد انسان تو اسی قانون کے مطابق پیدا ہوتا ہے جو اللہ نے مقرر کیا ہے، یعنی قدرتی طور پر مسلم ہے، لیکن اس کی عملی رضامندی پیدا ہونے کے بعد اُس کی اپنی عقل اور انتخاب سے طے ہوتی ہے۔ اگر والدین اسے اللہ کے حکموں کے مطابق زندگی گزارنے کی تعلیم دیتے ہیں اور وہ اپنی عقل سے فیصلہ کرتا ہے کہ اللہ کے قوانین پر عمل کرے، تو وہ حقیقی طور پر مسلم ہوجاتا ہے۔

اسی طرح وہ لوگ جو والدین کی رہنمائی سے محروم ہیں، مگر بعد میں اپنی آنکھیں کھول کر حق اور باطل کو سمجھتے ہیں اور اپنی عقل سے فیصلہ کرتے ہیں کہ زندگی کا درست راستہ وہ ہے جو اللہ کے بتائے ہوئے اصولوں کے مطابق ہو، وہ بھی مکمل مسلم شمار ہوتے ہیں۔ لیکن جو لوگ اللہ کے راستے کو ترک کرکے اپنی مرضی کے مطابق زندگی گزارتے ہیں، وہ مسلم نہیں ہیں۔

انسان کے لیے سب سے اہم سوال یہ ہے کہ وہ کس راستے پر چلے، کون سا عمل صحیح ہے، اور کس راستے پر چل کر اپنے مالک کو راضی کرسکتا ہے۔ اگر ہر انسان اپنی مرضی کے مطابق فیصلہ کرے، تو ہر ایک الگ رائے قائم کرلے گا۔ اس لیے انسان کو معلوم ہونا چاہیے کہ اللہ کی رضا اور ناپسندیدگی کیا ہے۔

اللہ کی مرضی کا علم اُس کے بھیجے ہوئے علم کے ذریعے حاصل ہوتا ہے۔ آج کی دنیا میں مختلف کتابیں موجود ہیں، مگر تحقیق سے معلوم ہوتا ہے کہ اپنی حقیقی شکل میں صرف قرآن ہی اللہ کی کتاب ہے۔

چنانچہ جو شخص قرآن کے مطابق عمل کرے گا، وہ اپنے رب کی مرضی کے مطابق عمل کرے گا، اور جو اس کے برخلاف چلے گا، وہ اللہ کی رضا کے مخالف ہوگا اور اس کا عمل قبول نہیں ہوگا۔

سب سے پہلے انسان

سب سے پہلے انسان حضرت آدمؑ تھے، جن کا ذکر پرانے صحائف، بائبل اور دیگر مذہبی کتابوں میں بھی ملتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنی ہدایات بتائیں، جنہیں حضرت آدمؑ نے اپنی اولاد تک پہنچایا۔

جب انسان نے زمین پر زندگی شروع کی تو اسے معلوم ہوا کہ میرا رب اللہ ہے اور مجھے اسی کے احکام کے

مطابق زندگی گزارنی ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ انسان نے یہ ہدایات بھولنا شروع کر دیں، تو اللہ تعالیٰ نے حضرت نوحؑ کو بھیجا تا کہ وہ انسانوں کو بھولی ہوئی ہدایات یاد دلائیں اور انہیں روشنی کی طرف واپس لائیں۔ وقت کے ساتھ انسان پھر بھٹکنے لگا، تو اللہ نے اپنی رحمت سے ہمیشہ کچھ خاص بندے بھیجے جو لوگوں کو اپنی مرضی کا راستہ دکھاتے۔ انہیں ہی اللہ کا رسول، پیغمبر یا نبی کہا جاتا ہے۔

اللہ کے رسول اپنے مقررہ وقت پر پیدا ہوتے رہے اور انسانوں کو اللہ کی رضا اور ہدایات کا راستہ دکھاتے رہے۔ جن لوگوں نے ان رسولوں کی بات مانی اور اللہ کو اپنا رب مان کر اس کے حکموں پر عمل کیا، وہ سب مسلمان کہلائے مگر لفظ مسلمان ان کی اپنی زبان میں تھا اس لئے کہ ہر زمانے اور ہر ملک میں اللہ نے اپنے رسول بھیجے تا کہ انسانوں کو سچا راستہ دکھایا جا سکے۔ یہ سب رسول سچے تھے اور جن راستوں کی طرف لوگوں کو بلایا، وہی سچا راستہ تھا، جسے اسلام کہتے ہیں۔

اللہ کے آخری رسول

انسان جب تک اس قابل نہ ہوا کہ وہ اللہ کے بھیجے ہوئے دین کو پوری دنیا میں پہنچا سکے، اللہ تعالیٰ مسلسل اپنے رسول بھیجتا رہا تا کہ لوگوں کو اپنا دین یاد دلایا جا سکے۔

جب انسان اس قابل ہوا کہ اللہ کے رسول کی ہدایات کو پوری دنیا میں پہنچایا جا سکے، تو اللہ تعالیٰ نے اپنے آخری رسول حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بھیجا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اللہ کے دین کو لوگوں کے سامنے پیش کیا اور انہیں وہ تمام باتیں بتائیں جن پر عمل کر کے اللہ کی خوشنودی حاصل کی جا سکتی ہے، اور وہ باتیں بھی بتائیں جن پر عمل اللہ کو پسند نہیں۔

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تقریباً ڈیڑھ ہزار سال قبل عرب کے شہر مکہ میں پیدا ہوئے۔ جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم چالیس سال کے ہوئے، تو اللہ تعالیٰ نے آپ کو اپنا رسول بنایا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس فرشتے آئے، جن میں حضرت جبرئیلؑ شامل ہیں، اور اللہ کی بتائی ہوئی ہدایات آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تک پہنچائیں، جیسے قرآن مجید کہا جاتا ہے۔ یہ تمام ہدایات اللہ کی طرف سے نازل ہوئی ہیں اور کسی انسان کی ذاتی بات نہیں۔ اسی لیے قرآن مجید کو اللہ کی کتاب کہا جاتا ہے۔

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پہلے

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے آنے سے پہلے بھی اللہ کے بہت سے رسول آئے اور انہوں نے انسانوں کو وہی دین سکھایا جسے اسلام کہتے ہیں۔ یہ تمام رسول سچے تھے اور جو دین وہ لائے، وہ بھی سچا تھا، لیکن جب لوگ دین بھول جاتے یا اس میں اپنی مرضی کے مطابق اضافہ یا کمی کر دیتے، تو اللہ تعالیٰ کوئی نیا رسول بھیج دیتے تا کہ دین اسلام کو صحیح شکل میں لوگوں کے سامنے پیش کرے۔

اب بھی دنیا میں کچھ ایسے مذاہب موجود ہیں جو اپنے تعلق اللہ کے کسی رسول سے ظاہر کرتے ہیں، جیسے حضرت موسیٰؑ اور حضرت عیسیٰؑ کے ماننے والے یہودی اور عیسائی۔ تاہم یہ اپنی اصل تعلیم سے ہٹ چکے ہیں۔ اس کی اہم وجوہات درج ذیل ہیں:

۱۔ ان میں سے کسی کے پاس اللہ کی بھیجی ہوئی کتاب اپنی اصل صورت میں موجود نہیں۔ موجود کتابوں میں بہت سی باتیں بڑھا دی گئی ہیں اور بہت سی کم کر دی گئی ہیں۔ لہٰذا اب یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ان کتابوں میں جو کچھ لکھا ہے وہ سب اللہ کی طرف سے نازل کردہ ہے۔

۲۔ جب اللہ نے اپنا دین پوری طرح اور آخری شکل میں بھیج دیا، تو اب کسی کے لیے یہ کہنا درست نہیں کہ وہ اپنی پرانی تعلیم پر عمل کرے اور اُن حکموں کو نہ مانے جو اب اللہ کی طرف سے آئے ہیں۔ اللہ کی مرضی کا راستہ ایک ہی ہو سکتا ہے، اور وہی سیدھا راستہ ہے جو حضرت محمد ﷺ نے دنیا کے تمام انسانوں کے سامنے پیش کیا۔

اللہ نے انسانوں کو سیدھا راستہ دکھانے کے لیے ہمیشہ اپنے رسول بھیجے۔ یہ سب رسول انسان ہی تھے اور ان میں سے کوئی بھی اللہ نہیں تھا۔ اللہ کبھی بھی انسان یا کسی اور شکل میں زمین پر نہیں آیا۔ اللہ واحد ہے، اس کی کوئی شبیہ نہیں اور نہ ہی وہ کسی شکل کو اختیار کرتا ہے۔

اللہ کی طرف سے ایک ہی دین آیا

اللہ کی طرف سے بھیجا گیا دین ہمیشہ سے ایک ہی رہا ہے۔ ہر نبی نے اسی دین کو اپنی زبان میں لوگوں کے سامنے پیش کیا اور سب سے آخر میں حضرت محمد ﷺ نے اسے کامل شکل میں لوگوں کو سکھایا۔ ہر نبی کے ماننے والے مسلم تھے، لیکن اب صرف وہ لوگ مسلم ہیں جو اللہ کے آخری نبی ﷺ اور ان کے بتائے ہوئے دین کو مانتے ہیں۔

یہ بات واضح ہے، مگر بعض لوگ اسے توڑ مروڑ کر پیش کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ سبھی مذاہب سچے ہیں اور آدمی جس مذہب پر چاہے چلے، وہ اللہ تک پہنچ سکتا ہے۔ یہ بات بالکل غلط ہے۔

سینکڑوں مذاہب

آج دنیا میں سینکڑوں مذاہب پائے جاتے ہیں۔ ان مذاہب میں کچھ اخلاقی اصول ایک جیسے ہو سکتے ہیں، جیسے جھوٹ نہ بولنا، چوری نہ کرنا اور نیکی کرنا۔ تاہم اس وقت یہ تمام مذاہب جیسی شکل میں پائے جاتے ہیں، ان کو سچا ماننا بڑی غلطی ہے۔ یہ کہنا کہ ہر مذہب اپنے مقام پر درست ہے اور کسی بھی مذہب پر چل کر انسان اللہ کی رضا حاصل کر سکتا ہے، ہرگز درست نہیں۔

اللہ کی رضا حاصل کرنے اور اسے خوش کرنے کا سچا طریقہ وہی ہے جو اسلام نے بتلایا ہے۔ اسلام کے علاوہ جو بھی راستے یا طریقے ہیں، وہ سب غلط ہیں۔ ہمیں یقین ہے کہ جو شخص کھلے دل اور عقل کے ساتھ غور کرے گا، وہ بھی اسی سچائی کو ماننے پر مجبور ہوگا جو ہم نے بیان کی ہے۔

مذہب میں زبردستی نہیں

اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں واضح فرمایا ہے کہ دین کے معاملے میں کسی پر زبردستی نہیں کی جاسکتی۔ ہر انسان کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنی عقل اور فہم سے فیصلہ کرے اور جس راستے کو درست سمجھے، اس پر چلے۔ اسی طرح دوسروں کے معبودوں کو برا کہنے کا حکم بھی نہیں دیا گیا، جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ''جو لوگ اللہ کو چھوڑ کر دوسروں کو معبود مانتے ہیں اور اُنہیں پکارتے ہیں تم اُن کے دیوتاؤں کو برا نہ کہو''۔ **(سورہ انعام، آیت: ۱۰۸)**

اللہ کی مرضی کا راستہ

مسلمانوں کے لیے سب سے پہلے یہ لازم ہے کہ وہ اپنی زندگی کو اسلام کا نمونہ بنائیں اور ساتھ ہی اللہ کے بندوں کے سامنے دینِ اسلام کو محبت اور نرمی کے ساتھ پیش کریں۔ کیونکہ اسلام تمام انسانوں کے لیے ہے، اس لیے مسلمانوں پر فرض ہے کہ وہ دوسروں کو اللہ کے دین کی ہدایت دیں اور غلط راستوں سے بچائیں۔

تاہم اس کام میں کسی پر زبردستی دین قبول کرانے یا کسی کو اس کے مذہب سے ہٹانے کی کوشش جائز نہیں۔ اسلام نے صریحاً اس سے منع کیا ہے۔ یہ کام صرف اللہ کے اختیار میں ہے کہ وہ ایک دن سب انسانوں کو اپنے سامنے حاضر کرے گا۔ جو لوگ اپنی ہٹ دھرمی یا نادانی کی وجہ سے اللہ کے بھیجے ہوئے سچے دین کو قبول نہیں کریں گے، وہ اسی کے سامنے جواب دہ ہوں گے، کیونکہ اللہ ہر دل کا حال بخوبی جانتا ہے۔

آیت نمبر (۲۰) فَاِنْ حَآجُّوْكَ فَقُلْ اَسْلَمْتُ وَجْهِيَ لِلّٰهِ وَمَنِ اتَّبَعَنِ ؕ وَقُلْ لِّلَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ وَالْاُمِّيّٖنَ ءَاَسْلَمْتُمْ ؕ فَاِنْ اَسْلَمُوْا فَقَدِ اهْتَدَوْا ۚ وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ ؕ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِالْعِبَادِ ﴿۲۰﴾

ترجمہ: ''پھر اگر وہ آپ سے جھگڑا کریں، تو کہہ دیجیے: میں نے اپنا چہرہ اللہ کے آگے جھکا دیا ہے، اور ان لوگوں نے بھی جو میرے پیروکار ہیں۔ اور اہلِ کتاب اور ان پڑھ لوگوں سے کہہ دیجیے: کیا تم بھی اسلام لاتے ہو؟ اگر وہ اسلام لے آئیں، تو ہدایت پا گئے، اور اگر منہ موڑیں تو آپ کا کام صرف پیغام پہنچا دینا ہے۔ اور اللہ اپنے بندوں کو خوب دیکھنے والا ہے''۔

تفسیر اگرچہ اسلام اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سچائی واضح ہو چکی ہے، تب بھی اگر اہلِ کتاب ہٹ دھرمی اور انکار کا راستہ اختیار کریں، تو آپ کہہ دیجئے کہ میں نے اپنی زندگی کے ہر پہلو کو اللہ کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیا ہے، اور یہی حال میری پیروی کرنے والے مسلمانوں کا بھی ہے۔ اہلِ کتاب اور غیر اہلِ کتاب سب سے کہنا کہ اگر تم اسلام قبول کرو گے تو سیدھے راستے، یعنی صراطِ مستقیم پر چلنے والے بنو گے، اور اگر تم منہ موڑو گے تو میرا کام صرف پیغام پہنچانا ہے، حساب وجواب تو تمہیں اللہ کے سامنے دینا ہوگا۔

آیت نمبر (۲۱) اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَيَقْتُلُوْنَ النَّبِيّٖنَ بِغَيْرِ حَقٍّ ۙ وَّيَقْتُلُوْنَ الَّذِيْنَ يَاْمُرُوْنَ بِالْقِسْطِ مِنَ النَّاسِ ۙ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ﴿۲۱﴾

ترجمہ: ''یقیناً جو لوگ اللہ کی آیات کا انکار کرتے ہیں، اور انبیاء کو ناحق قتل کرتے ہیں، اور ان لوگوں کو بھی قتل کرتے ہیں جو لوگوں کو عدل وانصاف کا حکم دیتے ہیں، تو اُنہیں خوشخبری دے دیجئے ایک دردناک عذاب کی''۔

تفسیر یہاں مراد یہود کی قوم ہے، جنہوں نے حضرت زکریاؑ اور اُن کے بیٹے حضرت یحییٰؑ کو قتل کیا اور جنہیں اپنے گمان کے مطابق یہ یقین تھا کہ انہوں نے حضرت عیسیٰؑ کو بھی قتل کیا تھا۔ چونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے میں یہود اپنے باپ دادا کے اعمال سے راضی تھے، اس لیے یہ نسبت انہیں ہی دی گئی۔

امام حاکمؒ نے لکھا ہے کہ اس آیت کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ داعی حق کو، چاہے جان کے خطرے میں کیوں نہ ہو، لوگوں کو بھلائی کی دعوت دیتا رہے گا۔

آیت نمبر (۲۲) اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ۠ وَمَا لَهُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ ﴿۲۲﴾

ترجمہ: ''یہی وہ لوگ ہیں جن کے سب اعمال دنیا وآخرت میں ضائع ہو گئے، اور ان کا کوئی مددگار نہیں''۔

تفسیر دنیا میں ان کے اعمال ضائع ہوئے، جس پر اللہ تعالیٰ نے انہیں مذمت کی اور ذلت ورسوائی کا سامنا کرنا پڑا۔ انہیں قتل کیا گیا، ان کی عورتیں اور بچے قیدی وغلام بنائے گئے، اور ان کے اموال مسلمانوں میں بطور غنیمت تقسیم کر دیے گئے۔ آخرت میں بھی اللہ تعالیٰ انہیں دردناک عذاب سے دوچار کرے گا۔

آیت نمبر (۲۳) اَلَمۡ تَرَ اِلَى الَّذِيۡنَ اُوۡتُوۡا نَصِيۡبًا مِّنَ الۡكِتٰبِ يُدۡعَوۡنَ اِلٰى كِتٰبِ اللّٰهِ لِيَحۡكُمَ بَيۡنَهُمۡ ثُمَّ يَتَوَلّٰى فَرِيۡقٌ مِّنۡهُمۡ وَهُمۡ مُّعۡرِضُوۡنَ ﴿۲۳﴾

ترجمہ: ''کیا آپ نے اُن لوگوں کو نہیں دیکھا جنہیں کتاب کا کچھ حصہ دیا گیا تھا؟ جب انہیں اللہ کی کتاب کی طرف بلایا جاتا ہے تاکہ وہ ان کے درمیان فیصلہ کرے، تو ان میں سے ایک گروہ منہ موڑ لیتا ہے، حالانکہ وہ منہ موڑنے والے ہی ہیں''۔

تفسیر ''کتاب'' سے مراد توریت ہے اور ''اُس کا ایک حصہ دیا گیا'' اس سے مراد یہودی علماء ہیں، جبکہ ''کتابِ اللہ'' سے قرآنِ کریم مراد ہے۔ بعض مفسرین نے ''کتابِ اللہ'' سے توریت کو بھی مراد قرار دیا ہے اور بیان کیا کہ آیت ایک مخصوص واقعے کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ مدینہ کے یہود اپنے دو زانی مرد و عورت کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس لے آئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کے رجم (پتھر مار کر قتل) کا حکم دیا، لیکن انہوں نے انکار کیا اور کہا کہ ہماری کتاب میں صرف منہ کالا کرنے کا ذکر ہے۔ جب توریت منگوائی گئی تو اس میں رجم کا حکم موجود پایا گیا۔ چنانچہ دونوں کو رجم کر دیا گیا، جس پر یہود ناراض ہوئے اور اس آیت کا نزول ہوا۔

نوٹ: جب کسی شخص کو اللہ کی کتاب اور اس میں موجود شریعت سے آگاہ کیا جائے تو اسے قبول کرنا ضروری ہے۔ شادی شدہ زانی پر رجم کا حکم نافذ کرنے کے لیے اس کا مسلمان ہونا شرط نہیں ہے۔

آیت نمبر (۲۴-۲۵) ذٰلِكَ بِاَنَّهُمۡ قَالُوۡا لَنۡ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّاۤ اَيَّامًا مَّعۡدُوۡدٰتٍ‌ۖ وَغَرَّهُمۡ فِىۡ دِيۡنِهِمۡ مَّا كَانُوۡا يَفۡتَرُوۡنَ ﴿۲۴﴾ فَكَيۡفَ اِذَا جَمَعۡنٰهُمۡ لِيَوۡمٍ لَّا رَيۡبَ فِيۡهِ‌ۖ وَوُفِّيَتۡ كُلُّ نَفۡسٍ مَّا كَسَبَتۡ وَهُمۡ لَا يُظۡلَمُوۡنَ ﴿۲۵﴾

ترجمہ: ''یہ سب اس لیے ہے کہ وہ کہتے ہیں: ہمیں آگ صرف چند گنتی کے دن ہی چھوئے گی۔ اور ان کے اس خود ساختہ عقیدے نے انہیں دھوکے میں ڈال رکھا ہے جو انہوں نے اپنے دین کے بارے میں گھڑ رکھا ہے۔ تو پھر اُس دن کیا حال ہوگا جب ہم اُن سب کو جمع کریں گے، جس کے آنے میں کوئی شک نہیں، اور ہر شخص کو اس کے اعمال کا پورا پورا بدلہ دیا جائے گا اور ان پر کوئی ظلم نہیں کیا جائے گا''۔

تفسیر یہودیوں نے قرآن کریم اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا انکار دو وجوہات کی بنا پر کیا۔ ایک یہ کہ ان کے جھوٹے گمان کے مطابق جہنم کی آگ صرف چند دنوں کے لیے انہیں لپیٹ میں لے گی، اور انہوں نے اس پر اپنی من مانی

قانون سازی کر لی تھی۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ اللہ کی آیات کو جھٹلانے کے سبب شیطان نے ان کے برے اعمال کو ان کی نظر میں اچھا اور درست دکھا دیا، جس کی وجہ سے وہ دھوکے میں آ گئے اور سمجھ بیٹھے کہ وہ حق پر ہیں۔

یہ حق سے انکار کرنا اللہ کی طرف سے ایک سزا تھی۔ ایسے لوگوں کو قیامت کے دن حقیقت کا علم ہو جائے گا، کیونکہ اس دن کسی پر بھی ظلم نہیں کیا جائے گا اور انصاف کے مطابق بدلہ دیا جائے گا۔ اس کا تصور انسان اس دنیا میں نہیں کر سکتا۔

آیت نمبر (۲۶) قُلِ اللّٰهُمَّ مٰلِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِي الْمُلْكَ مَنْ تَشَآءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَآءُ ۡ وَتُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ ؕ بِيَدِكَ الْخَيْرُ ؕ اِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۲۶﴾

ترجمہ: ''کہہ دیجئے: اے اللہ! بادشاہی کے مالک! تو جسے چاہے حکومت دیتا ہے اور جس سے چاہے چھین لیتا ہے، تو جسے چاہے عزت دیتا ہے اور جسے چاہے ذلت دیتا ہے۔ ساری بھلائیاں تیرے ہی ہاتھ میں ہیں، یقیناً تو ہر چیز پر قادر ہے''۔

تفسیر

دعا کا طریقہ

اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کو دعا کرنے کا درست طریقہ سکھایا اور تسبیح وتحمید کی تعلیم دی۔ اللہ تعالیٰ ہی مالکِ کل ہے، یعنی ہر شے کا حقیقی مالک اور ربّ العالمین ہے۔ وہ جس طرح چاہے اپنے ملک میں عمل کرتا ہے، جسے چاہے عذاب یا ثواب دیتا ہے، اور کوئی بھی اس کا شریک یا مخالف نہیں ہو سکتا۔ حقیقی بادشاہت صرف اسی کے پاس ہے اور جو بادشاہت دنیا کے کسی اور کے پاس ہے وہ وقتی اور محدود ہے۔ عزت وذلت، تمام بھلائیاں اور اختیار بھی اسی کے ہاتھ میں ہیں۔

حضرت ابن عباسؓ کے مطابق اس آیت میں ''ملک'' سے مراد ''نبوت'' ہے۔ حافظ ابن کثیرؒ لکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ اور امتِ مسلمہ پر احسان کرتے ہوئے نبوت بنی اسرائیل سے حضرت محمد ﷺ کی طرف منتقل کی اور ان کے دین کو تمام ادیان پر غالب کر کے پوری دنیا میں پھیلا دیا، جس پر مسلمانوں کے لیے لازم ہے کہ وہ اس عظیم نعمت کا شکر ادا کرتے رہیں۔

نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''اللہ سے بڑھ کر کوئی غیرت مند نہیں اور اسی وجہ سے اس نے بے حیائی کے کام، جیسے زنا وغیرہ، حرام کیے ہیں۔ اور اللہ ہی وہ ہے جس کی تعریف کی جائے، یعنی اللہ اس بات کو پسند فرماتا ہے کہ اس کی حمد و ستائش کی جائے''۔ **(صحیح بخاری: حدیث نمبر ۷۴۰۳)**

آیت نمبر (۲۷) تُوْلِجُ الَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَتُوْلِجُ النَّهَارَ فِي الَّيْلِ ۡ وَتُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ

وَتُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ وَتَرْزُقُ مَنْ تَشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ ﴿۲۷﴾

ترجمہ: ''تو ہی رات کو دن میں داخل کرتا ہے اور دن کو رات میں داخل کرتا ہے، تو ہی زندہ کو مردہ سے نکالتا ہے اور مردہ کو زندہ سے، اور تو جسے چاہے بے حساب رزق دیتا ہے''۔

تفسیر وہ رات اور دن کو ایک دوسرے میں داخل کرتا ہے یعنی ایک کو دوسرے کے پیچھے لا کر یا کمی و زیادتی کے ذریعے اور زندہ سے مردہ کو اور مردہ کو زندہ سے پیدا کرتا ہے۔ کچھ مفسرین کے مطابق مومن کو کافر اور کافر کو مومن بنا دیتا ہے اور وہ جسے چاہتا ہے بے حساب روزی دیتا ہے۔

❁❁❁

ترجمہ- آیت نمبر ۲۸ سے ۳۷ تک

لَا يَتَّخِذِ الْمُؤْمِنُوْنَ الْكٰفِرِيْنَ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۚ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَلَيْسَ مِنَ اللّٰهِ فِيْ شَيْءٍ اِلَّآ اَنْ تَتَّقُوْا مِنْهُمْ تُقٰىةً ۭ وَيُحَذِّرُكُمُ اللّٰهُ نَفْسَهٗ ۭ وَاِلَى اللّٰهِ الْمَصِيْرُ ۲۸ قُلْ اِنْ تُخْفُوْا مَا فِيْ صُدُوْرِكُمْ اَوْ تُبْدُوْهُ يَعْلَمْهُ اللّٰهُ ۭ وَيَعْلَمُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۭ وَاللّٰهُ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۲۹ يَوْمَ تَجِدُ كُلُّ نَفْسٍ مَّا عَمِلَتْ مِنْ خَيْرٍ مُّحْضَرًا ۚ وَّمَا عَمِلَتْ مِنْ سُوْۗءٍ ۚ تَوَدُّ لَوْ اَنَّ بَيْنَهَا وَبَيْنَهٗٓ اَمَدًۢا بَعِيْدًا ۭ وَيُحَذِّرُكُمُ اللّٰهُ نَفْسَهٗ ۭ وَاللّٰهُ رَءُوْفٌۢ بِالْعِبَادِ ۳۰ قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ ۭ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۳۱ قُلْ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ ۚ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْكٰفِرِيْنَ ۳۲ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰٓى اٰدَمَ وَنُوْحًا وَّاٰلَ اِبْرٰهِيْمَ وَاٰلَ عِمْرٰنَ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ۳۳ ذُرِّيَّةًۢ بَعْضُهَا مِنْۢ بَعْضٍ ۭ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ۳۴ اِذْ قَالَتِ امْرَاَتُ عِمْرٰنَ رَبِّ اِنِّىْ نَذَرْتُ لَكَ مَا فِيْ بَطْنِيْ مُحَرَّرًا فَتَقَبَّلْ مِنِّىْ ۚ اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ۳۵ فَلَمَّا وَضَعَتْهَا قَالَتْ رَبِّ اِنِّىْ وَضَعْتُهَآ اُنْثٰى ۭ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا وَضَعَتْ ۭ وَلَيْسَ الذَّكَرُ كَالْاُنْثٰى ۚ وَاِنِّىْ سَمَّيْتُهَا مَرْيَمَ وَاِنِّىْٓ اُعِيْذُهَا بِكَ وَذُرِّيَّتَهَا مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ۳۶ فَتَقَبَّلَهَا رَبُّهَا بِقَبُوْلٍ حَسَنٍ وَّاَنْۢبَتَهَا نَبَاتًا حَسَنًا ۙ وَّكَفَّلَهَا زَكَرِيَّا ۭ كُلَّمَا دَخَلَ عَلَيْهَا زَكَرِيَّا الْمِحْرَابَ ۙ وَجَدَ عِنْدَهَا رِزْقًا ۚ قَالَ يٰمَرْيَمُ اَنّٰى لَكِ هٰذَا ۭ قَالَتْ هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَاۗءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ ۳۷

ترجمہ:

(۲۸)۔ایمان والے، ایمان والوں کے سوا کسی کافر کو دوست نہ بنائیں اور جو ایسا کرے گا، اللہ سے اس کا کوئی تعلق نہیں، مگر یہ کہ تم ان سے بچاؤ کے طور پر (ظاہری تعلق رکھو)۔اور اللہ تمہیں اپنے ہی بارے میں خبردار کرتا ہے، اور اللہ ہی کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔(۲۹)۔کہہ دیجئے! اگر تم چھپاؤ وہ بات جو تمہارے دلوں میں ہے یا ظاہر کرو، اللہ اسے جانتا ہے، اور وہ جانتا ہے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے، اور اللہ ہر چیز پر پوری قدرت رکھتا ہے۔(۳۰)۔جس دن ہر شخص اپنی نیکیوں اور برائیوں کو اپنے سامنے موجود پائے گا، اُس دن وہ چاہے گا کہ کاش! اس کے اور اس کی برائی کے درمیان بہت دوری ہوتی۔اور اللہ تمہیں اپنی ذات سے ڈراتا ہے، اور اللہ بندوں پر نہایت مہربان ہے۔(۳۱)۔کہہ دیجئے! اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو تو میری پیروی کرو، اللہ تم سے محبت کرے گا اور تمہارے گناہ معاف کر دے گا۔

اور اللہ بہت معاف کرنے والا، نہایت مہربان ہے۔(۳۲)۔ کہہ دیجئے! اللہ اور رسول کی اطاعت کرو، پھر اگر وہ منہ موڑیں تو یقیناً اللہ کافروں کو پسند نہیں کرتا۔(۳۳)۔ بے شک اللہ نے آدم، نوح، آلِ ابراہیم اور آلِ عمران کو تمام جہانوں پر فضیلت دی۔(۳۴)۔ یہ ایک دوسرے کی اولاد ہیں، اور اللہ سب کچھ سننے والا، جاننے والا ہے۔(۳۵)۔ یاد کرو! جب عمران کی بیوی نے کہا: اے میرے رب! میں نے تیرے لیے نذر مانی ہے اُس بچے کی جو میرے پیٹ میں ہے کہ وہ تیرے لیے وقف ہوگا، سوتُو اسے قبول فرما، بے شک تُو خوب سننے والا اور جاننے والا ہے۔(۳۶)۔ پھر جب اس نے بچی کو جنا تو بولی: اے میرے رب! میں نے تو لڑکی کو جنا ہے، حالانکہ اللہ بہتر جانتا تھا جو کچھ اس نے جنا اور لڑکا، لڑکی جیسا نہیں ہوتا، اور میں نے اس کا نام مریم رکھا ہے، اور میں اسے اور اس کی اولاد کو شیطان مردود سے تیری پناہ میں دیتی ہوں۔(۳۷)۔ پس اُس کے رب نے مریم کو خوش دلی سے قبول کیا، اور اسے اچھے طریقے سے پروان چڑھایا، اور اس کا نگراں زکریا کو بنایا۔ جب بھی زکریا اس کے پاس حجرہ میں جاتے تو وہاں کچھ کھانے پینے کی چیزیں پاتے، تو پوچھتے: اے مریم! یہ سب کہاں سے آیا؟ وہ کہتی: یہ اللہ کی طرف سے ہے۔ بے شک اللہ جسے چاہے، بے حساب رزق دیتا ہے۔

تفسیر-آیت نمبر ۲۸ سے ۳۷ تک

آیت نمبر(۲۸) لَا يَتَّخِذِ الْمُؤْمِنُوْنَ الْكٰفِرِيْنَ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۚ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَلَيْسَ مِنَ اللّٰهِ فِيْ شَيْءٍ اِلَّآ اَنْ تَتَّقُوْا مِنْهُمْ تُقٰىةً ۭ وَيُحَذِّرُكُمُ اللّٰهُ نَفْسَهٗ ۭ وَاِلَى اللّٰهِ الْمَصِيْرُ ۝۲۸

ترجمہ: ''ایمان والے، ایمان والوں کے سوا کسی کافر کو دوست نہ بنائیں، اور جو ایسا کرے گا، اللہ سے اس کا کوئی تعلق نہیں، مگر یہ کہ تم ان سے بچاؤ کے طور پر (ظاہری تعلق رکھو)۔ اور اللہ تمہیں اپنے ہی بارے میں خبردار کرتا ہے، اور اللہ ہی کی طرف لوٹ کر جانا ہے''۔

تفسیر

کافروں سے دوستی نہ کریں

اللہ تعالیٰ نے مؤمنوں کو یہ حکم دیا ہے کہ وہ کافروں کو اپنا دوست یا رازدار نہ بنائیں، بلکہ اپنی دوستی اور محبت مؤمنوں کے ساتھ رکھیں، کیونکہ مؤمنوں کا ولی اللہ تعالیٰ ہے اور وہ آپس میں ایک دوسرے کے ولی اور دوست ہیں۔ قرآن کریم میں اس سلسلے میں متعدد آیات موجود ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے لیے محبت اور اس کے لیے بغض وعداوت ایمان کے بنیادی اصولوں میں سے ہیں، اس لیے جو بھی کافروں کو اپنا دوست بنائے گا، خواہ نام کچھ بھی ہو، اللہ تعالیٰ اس سے بَری ہے اور اس

کا اللہ سے کوئی تعلق نہیں۔ البتہ، اگر کسی شکل میں تم اُن کی برائی کو روکنے کے لیے عمل کرو، تو اس میں کوئی حرج نہیں۔

بعض لوگ قرآن وحدیث کے حقیقی معانی کو سمجھے بغیر چند الفاظ پر توجہ دے کر یہ غلط فہمی پھیلاتے ہیں کہ اسلام غیر مسلموں کے خلاف تعصب کرتا ہے۔ خاص طور پر قرآن کی بعض آیات کو پیش کیا جاتا ہے جن میں غیر مسلموں سے دوستی نہ کرنے پر زور دیا گیا ہے، حالانکہ دیگر آیات میں تمام انسانوں کے ساتھ بھلائی اور حسن سلوک کرنے کا بھی حکم دیا گیا ہے۔

امن پسند غیر مسلموں سے تعلقات

قرآن مجید میں جس دوستی سے منع کیا گیا ہے، وہ اُن لوگوں کے لیے ہے جو اللہ اور اس کے رسول سے دشمنی کرتے ہیں اور مسلمانوں کو تکلیف پہنچاتے ہیں۔ امن پسند اور نیک نیت غیر مسلموں کے ساتھ تعلقات قائم کرنا جائز اور مطلوب ہے، جیسا کہ دیگر آیات میں واضح طور پر بیان کیا گیا ہے۔

غیر مسلموں کے ساتھ انصاف کا حکم

لَا يَنْهٰىكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ لَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ وَلَمْ يُخْرِجُوْكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ اَنْ تَبَرُّوْهُمْ وَتُقْسِطُوْٓا اِلَيْهِمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ ۝

ترجمہ: ''اللہ تمہارے ساتھ اچھے اخلاق اور انصاف کرنے سے نہیں روکتا، جنہوں نے دین کے معاملے میں تم سے جنگ نہیں کی، اور نہ تمہیں تمہارے گھروں سے نکالا، اللہ انصاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔'' (سورہ ممتحنہ-۸)

جنگ نہ کرنے والوں سے دوستی

اِنَّمَا يَنْهٰىكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ قٰتَلُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ وَاَخْرَجُوْكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ وَظٰهَرُوْا عَلٰٓى اِخْرَاجِكُمْ اَنْ تَوَلَّوْهُمْ ۚ وَمَنْ يَّتَوَلَّهُمْ فَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ۝

ترجمہ: ''اللہ تو تمہیں صرف انہیں لوگوں سے دوستی کرنے سے روکتا ہے، جنہوں نے دین کے معاملے میں تم سے جنگ کی، اور تم کو تمہارے اپنے گھروں سے نکالا اور تمہارے نکالنے میں اوروں کی مدد کی، اور جو لوگ اُن سے دوستی کریں گے، وہی ظالم ہیں''۔ (سورہ ممتحنہ-۹)

دوستی کا مقصد

قرآن میں جہاد یا غیر مسلموں سے دوستی نہ کرنے کے احکامات اُن مخصوص مشرکین اور غیر مسلموں کے لیے ہیں جو اسلام کے دشمن ہوں، تبلیغ اسلام میں رکاوٹ ڈالیں اور اسلام کو ختم کرنے کی کوشش کریں۔

تمام انسانوں کے بارے میں قرآن کا حکم

کچھ لوگ جھوٹا پروپیگنڈا پھیلاتے ہیں کہ قرآن غیر مسلموں کے ساتھ برداشت نہیں کرتا اور انہیں مار ڈالنے یا ختم کرنے کی تعلیم دیتا ہے، حالانکہ ایسا بالکل بھی نہیں ہے۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کا فرمان واضح ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ لِلّٰهِ شُهَدَآءَ بِالْقِسْطِ ۡ وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓى اَلَّا تَعْدِلُوْا ؕ اِعْدِلُوْا ۟ هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى ۡ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ۝۸

ترجمہ: ''اے ایمان والو! اللہ کے لئے انصاف کی گواہی دینے کے لئے کھڑے ہو جایا کرو اور لوگوں کی دشمنی تم کو اس بات پر تیار نہ کرے کہ انصاف چھوڑ دو؛ انصاف کیا کرو، یہی پرہیزگاری کی بات ہے؛ اور اللہ سے ڈرتے رہو، بے شک جو کچھ تم کرتے ہو، اللہ اُس کی خوب خبر رکھتا ہے''۔ (سورہ مائدہ-۸)

بھلے کاموں میں غیر مسلموں کی مدد کا حکم

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُحِلُّوْا شَعَآئِرَ اللّٰهِ وَلَا الشَّهْرَ الْحَرَامَ وَلَا الْهَدْىَ وَلَا الْقَلَآئِدَ وَلَآ آٰمِّيْنَ الْبَيْتَ الْحَرَامَ يَبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنْ رَّبِّهِمْ وَرِضْوَانًا ؕ وَاِذَا حَلَلْتُمْ فَاصْطَادُوْا ؕ وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ اَنْ صَدُّوْكُمْ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اَنْ تَعْتَدُوْا ۘ وَتَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى ۖ وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ ۖ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ۝۲

ترجمہ: اے ایمان والو! اللہ کی نشانیوں کی بے حرمتی نہ کرنا؛ نہ ادب والے مہینے (یعنی رجب، ذیقعدہ، ذی الحجہ، اور محرم) کی نہ قربانی کے جانوروں کی، اور نہ اُن جانوروں کی جن کی گردنوں میں پٹے پڑے ہوں، اور نہ اُن لوگوں کی جو اپنے رب کے فضل اور اُس کی خوشنودی کی چاہ میں عزت والے گھر (کعبہ) کو جا رہے ہوں، اور جب احرام کی حالت سے باہر ہو جاؤ تو شکار کرو، اور ایسا نہ ہو کہ ایک گروہ کی دشمنی، جس نے تمہارے لئے عزت والے گھر کا راستہ بند کر دیا تھا، تمہیں اس بات پر ابھار دے کہ تم اُن پر زیادتی کرنے لگو؛ اور نیکی اور پرہیزگاری کے کاموں میں ایک دوسرے کی مدد کیا کرو؛ اور گناہ اور ظلم کی باتوں میں مدد نہ کیا کرو، اور اللہ سے ڈرتے رہو، کچھ شک نہیں کہ اللہ کا عذاب بہت سخت ہے۔ (سورہ مائدہ-۲)

ایک انسان کا قتل جیسے تمام انسانوں کو قتل ہے

مِنْ اَجْلِ ذٰلِكَ ۚۛ كَتَبْنَا عَلٰى بَنِىْٓ اِسْرَآءِيْلَ اَنَّهٗ مَنْ قَتَلَ نَفْسًۢا بِغَيْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ فِى الْاَرْضِ فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيْعًا ؕ وَمَنْ اَحْيَاهَا فَكَاَنَّمَآ اَحْيَا النَّاسَ جَمِيْعًا ؕ وَلَقَدْ جَآءَتْهُمْ رُسُلُنَا بِالْبَيِّنٰتِ ۡ ثُمَّ

اِنَّ كَثِيْرًا مِّنْهُمْ بَعْدَ ذٰلِكَ فِي الْاَرْضِ لَمُسْرِفُوْنَ ﴿۳۲﴾

ترجمہ: ''اسی وجہ سے ہم نے بنی اسرائیل کے لئے لکھ دیا تھا کہ جس نے کسی شخص کو، کسی کے خون کا بدلہ لینے یا زمین میں فساد پھیلانے کے علاوہ کسی اور وجہ سے قتل کر ڈالا، تو مانو اُس نے سارے ہی انسانوں کو قتل کر دیا اور جس نے اُسے زندگی دیا، اُس نے مانوں سارے انسانوں کو ہی زندگی دیا، اور اُن لوگوں کے پاس ہمارے رسول کھلی دلیلیں لا چکے ہیں، پھر بھی ان میں بہت سے لوگ زمین میں زیادتی کرنے والے ہی ہیں۔'' (سورہ مائدہ-۳۲)

قرآن نے ہمیشہ کے لیے یہ قانون مقرر کر دیا ہے کہ کسی بھی انسان کو، چاہے اس کا تعلق کسی مذہب یا گروہ سے ہو، بلاوجہ قتل نہیں کیا جا سکتا۔ البتہ ایسے افراد جن کا جرم پورے گواہوں کے ساتھ ثابت ہو جائے، ان کے لیے حدود مقرر ہیں، مثلاً: "کسی قاتل کو سزائے موت دی جا سکتی ہے۔" اسی طرح وہ شخص جو معاشرہ یا ملک کے امن وامان کو برباد کرنے کی کوشش کرے اور زمین میں تباہی پھیلا چکا ہو، اور جسے روکنے کا کوئی دوسرا راستہ نہ ہو، اسے بھی موت کی سزا دی جا سکتی ہے۔

قرآن اس آیت میں یہ بھی واضح کرتا ہے کہ کسی شخص کا بلاوجہ اور ناانصافی سے قتل، دراصل پوری انسانیت کا قتل کرنے کے مترادف ہے، اور اسی طرح کسی شخص کی جان بچانا تمام انسانوں کی جان بچانے کے مترادف ہے۔

قرآن میں بار بار یہ بات کہی گئی ہے کہ انسان کو اس دنیا میں سوچ سمجھ کر اور اپنے اعمال کی آزادی دی گئی ہے تاکہ وہ امتحان دے۔ اس دنیا میں جو بھی راستہ اپنائے گا، موت کے بعد آنے والی ابدی زندگی میں اس کے اعمال کے مطابق انعام یا سزا پائے گا۔ اگر قرآن کسی کو طاقت یا تلوار کے ذریعے اسلام اپنانے پر مجبور کرنے کا حکم دیتا تو اس امتحان کا اصل مقصد ہی ختم ہو جاتا، جس کا ذکر قرآن میں بار بار آیا ہے۔

قرآن کے اخلاقی احکام

اسلامی قانون میں غیر مسلموں کے ساتھ برتاؤ کے معاملے میں اسلام صبر، ہمدردی اور احسان کی تعلیم دیتا ہے۔ قرآن کی ہدایات میں زندگی کے صحیح اور غلط راستوں کی حقیقت کو واضح کرنے کے بعد، صبر، احسان اور ہمدردی کے اصولوں پر عمل کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔

لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ ۣ ''مذہب کے بارے میں کوئی زور زبردستی نہیں ہے۔'' (سورہ بقرہ-۲۵۶)

دیوتاؤں کو برے الفاظ کی ممانعت

مشرک اللہ کے علاوہ جن دیوتاؤں کی پوجا کرتے ہیں انہیں برے الفاظ کہنے سے بھی منع کیا جاتا ہے:

وَلَا تَسُبُّوا الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ

''اور جن لوگوں کو یہ مشرک اللہ کے علاوہ پکارتے ہیں، اُن کو برا نہ کہنا۔'' (سورہ انعام-۱۰۸)

سب سے اہم بات یہ ہے کہ اگرچہ غیر مسلم بعض اوقات مسلمانوں کے خلاف شدید مذہبی دشمنی رکھتے ہیں اور عبادت میں رکاوٹ ڈالنے کی کوشش کرتے ہیں، پھر بھی مسلمانوں کو یہ حکم دیا گیا ہے کہ وہ دشمنی یا ناراضگی کی بنیاد پر انصاف کا راستہ ترک نہ کریں۔ ہر طرح کی مخالفت کے باوجود، نیکی کے کاموں میں دوسروں کی مدد کریں اور برے اعمال میں کسی کے ساتھ شریک نہ ہوں۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُحِلُّوْا شَعَآىِٕرَ اللّٰهِ وَلَا الشَّهْرَ الْحَرَامَ وَلَا الْهَدْيَ وَلَا الْقَلَآىِٕدَ وَلَآ آٰمِّيْنَ الْبَيْتَ الْحَرَامَ يَبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنْ رَّبِّهِمْ وَرِضْوَانًا ؕ وَاِذَا حَلَلْتُمْ فَاصْطَادُوْا ؕ وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ اَنْ صَدُّوْكُمْ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اَنْ تَعْتَدُوْا ۘ وَتَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى ۖ وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ ۖ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ②

''اے ایمان والو! اللہ کی نشانیوں کی بے حرمتی نہ کرنا؛ نہ ادب والے مہینے (رجب، ذی قعدہ، ذی الحجہ اور محرم) کی نہ قربانی کے جانوروں کی، اور نہ اُن جانوروں کی جن کی گردنوں میں پٹے پڑے ہوں، اور نہ اُن لوگوں کی جو اپنے رب کے فضل اور اُس کی خوشنودی کی چاہ میں عزت والے گھر (کعبہ) کو جا رہے ہوں، اور جب احرام کی حالت سے باہر ہو جاؤ تو شکار کرو، اور ایسا نہ ہو کہ ایک گروہ کی دشمنی، جس نے تمہارے لئے عزت والے گھر کا راستہ بند کر دیا تھا، تمہیں اس بات پر ابھار دے کہ تم اُن پر زیادتی کرنے لگو؛ اور نیکی اور پرہیزگاری کے کاموں میں ایک دوسرے کی مدد کیا کرو؛ اور گناہ اور ظلم کی باتوں میں مدد نہ کیا کرو، اللہ سے ڈرتے رہو، کچھ شک نہیں کہ اللہ کا عذاب بہت سخت ہے۔'' (سورہ مائدہ-۲)

غیر مسلموں کی دو قسمیں

غیر مسلموں میں دو قسمیں پائی جاتی ہیں: پہلی وہ لوگ جو مسلمانوں کے ساتھ امن و آشتی کے ساتھ رہتے تھے، دین کی وجہ سے اُنہوں نے مسلمانوں سے نہ جنگ کی اور نہ انہیں اُن کے گھروں سے نکالا۔ ایسے لوگوں کے ساتھ نیکی اور بھلائی کا سلوک کرنا مسلمانوں پر فرض ہے۔

دوسری قسم وہ ہیں جنہوں نے مسلمانوں کے ساتھ دشمنی اور عداوت اختیار کی، جنگیں کیں، مسلمانوں کو اُن کے گھروں سے نکالا اور ہر طرح کی دشمنی میں شامل رہے۔ ایسے لوگوں سے دوستی کرنا ممنوع ہے، جیسا کہ مشرکینِ مکہ کے ساتھ مسلمانوں کے تجربات تھے۔

اسلامی حکومت میں غیر مسلموں کے حقوق

اسلامی معاشرہ دوسرے مذاہب کے ماننے والوں کو ختم نہیں کرنا چاہتا بلکہ نیکی، رحم دلی اور انصاف کی بنیاد پر مسلمانوں اور غیر مسلم شہریوں کے درمیان تعلق قائم کرتا ہے۔ اسلام نے غیر مسلموں کے ساتھ تعلق کی بنیاد نیکی اور انصاف پر رکھی ہے، اور یہ اصول ہر غیر مسلم دارالسلام پر لاگو ہوتا ہے جو مسلمانوں کے ملک میں رہتا ہے۔

غیر مسلموں کا سب سے پہلا حق یہ ہے کہ انہیں اسلامی ملک اور سماج کی مکمل حفاظت حاصل ہو، تاکہ وہ ہر ظلم و ستم سے محفوظ رہیں اور امن وسکون کے ساتھ زندگی گزار سکیں۔

باہری حملوں سے تحفظ بھی اُن کا حق ہے، جس طرح مسلمانوں کے لیے یہ امام یا خلیفہ کی ذمہ داری ہے کہ اپنی شرعی حیثیت اور فوجی طاقت کے مطابق ذمیوں کی حفاظت کرے۔

امام کرافیؒ مالکیؒ اپنی کتاب 'الفرق' میں امام ابن حزم ظاہری کا قول نقل کرتے ہیں:

''اگر اہلِ حرب ہمارے ملک میں کسی ذمی کو پکڑنے آئیں تو ہمارا فرض ہے کہ ہم پوری طاقت کے ساتھ اُن سے جنگ کریں اور اُس ذمی کی حفاظت کے لیے اپنی جان تک قربان کریں، کیونکہ اُس کو دشمن کے سپرد کرنا ذمہ داری کے معاہدے کی خلاف ورزی ہوگی، اور اس پر امت کا اجماع ہے''۔ (الفرق، حصہ ۱۳، صفحات ۱۴-۱۵)

آیت نمبر (۲۹) قُلْ اِنْ تُخْفُوْا مَا فِیْ صُدُوْرِكُمْ اَوْ تُبْدُوْهُ یَعْلَمْهُ اللّٰهُ ؕ وَیَعْلَمُ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ ؕ وَاللّٰهُ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ﴿۲۹﴾

ترجمہ: ''کہہ دیجئے: اگر تم چھپاؤ وہ بات جو تمہارے دلوں میں ہے یا ظاہر کرو، اللہ اسے جانتا ہے، اور وہ جانتا ہے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے، اور اللہ ہر چیز پر پوری قدرت رکھتا ہے''۔

تفسیر اللہ تعالیٰ کی طرف سے بندوں کو تنبیہ یہ ہے کہ وہ ہمیشہ اللہ سے ڈرتے رہیں اور ایسے اعمال سے گریز کریں جن سے اللہ کی ناراضگی ہو اور جن پر اس کی ممانعت ہے۔ بندے کو یہ یقین رکھنا چاہیے کہ اللہ کے سامنے کوئی بات پوشیدہ نہیں رہ سکتی، وہ دلوں کے خفیہ راز جانتا ہے، چاہے انسان انہیں ظاہر کرے یا چھپائے۔ آسمان وزمین کی ہر چیز، زمین و پہاڑ، سمندر اور اُن کا ہر ذرہ بھی اللہ کی نگاہ سے مخفی نہیں۔ جب کچھ بھی اللہ سے چھپا نہیں رہ سکتا، تو پھر کوئی شخص خفیہ طور پر کافروں سے دوستی کرے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو جھٹلائے یا کفر اختیار کرے، تو یہ سب کیسے اللہ کی نظر سے چھپ سکتا ہے؟

آیت نمبر (۳۰) یَوْمَ تَجِدُ كُلُّ نَفْسٍ مَّا عَمِلَتْ مِنْ خَیْرٍ مُّحْضَرًا ۚ وَّمَا عَمِلَتْ مِنْ سُوْٓءٍ ۚ

تَوَدُّ لَوْ اَنَّ بَيْنَهَا وَبَيْنَهٗۤ اَمَدًۢا بَعِيْدًا ؕ وَيُحَذِّرُكُمُ اللّٰهُ نَفْسَهٗ ؕ وَاللّٰهُ رَءُوْفٌۢ بِالْعِبَادِ ﴿۳۰﴾

ترجمہ: ''جس دن ہر شخص اپنی نیکیوں اور برائیوں کو اپنے سامنے موجود پائے گا، اُس دن وہ چاہے گا کہ کاش! اس کے اور اس کی برائی کے درمیان بہت دوری ہوتی۔ اور اللہ تمہیں اپنی ذات سے ڈراتا ہے، اور اللہ بندوں پر نہایت مہربان ہے''۔

تفسیر اگر اللہ تعالیٰ دنیا میں کسی کو کچھ عرصے کے لیے ڈھیل دیتا ہے تو کسی کو یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ سے اس کے اعمال چھپ گئے ہیں۔ بلکہ قیامت کے دن ان کے اعمال آشکار کر دیے جائیں گے، اور ہر انسان اپنے نیک اعمال کو دیکھے گا۔ جب وہ اپنے گناہوں کو بھی اپنے سامنے پائے گا تو دل سے یہ چاہے گا کہ کاش ان اعمال اور گناہوں کے درمیان اتنی دوری ہوتی جو پھر کبھی ختم نہ ہو سکے۔

آیت نمبر (۳۱) قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِىْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ ؕ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۳۱﴾

ترجمہ: ''کہہ دیجئے: اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو تو میری پیروی کرو، اللہ تم سے محبت کرے گا اور تمہارے گناہ معاف کر دے گا۔ اور اللہ بہت معاف کرنے والا، نہایت مہربان ہے''۔

تفسیر حافظ ابنِ کثیرؒ لکھتے ہیں کہ یہ آیت کریمہ اُن سب لوگوں کے لیے دلیل ہے جو اللہ کی محبت کا دعویٰ کرتے ہیں لیکن طریقۂ محمدی ﷺ پر عمل نہیں کرتے۔ جب تک کوئی شخص ہر معاملے میں شریعت کی پابندی نہیں کرتا، وہ اللہ سے محبت کے دعوے میں جھوٹا ہے۔

بخاری و مسلم میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ: ''جو شخص کوئی ایسا عمل کرے جس کا ہم نے حکم نہیں دیا، وہ عمل مردود ہوگا''۔ **(بخاری رقم: ۲۶۹۷)**

آیت نمبر (۳۲) قُلْ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ ۚ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۳۲﴾

ترجمہ: ''کہہ دیجئے: اللہ اور رسول کی اطاعت کرو، پھر اگر وہ منہ موڑیں تو یقیناً اللہ کافروں کو پسند نہیں کرتا''۔

تفسیر یہ آیت دلیل ہے کہ طریقۂ محمدی کی مخالفت کفر ہے۔ اس لئے کہ اللہ نے فرمایا: ''اگر انہوں نے منہ موڑا تو اللہ تعالیٰ کافروں کو پسند نہیں کرتا'' معلوم ہوا کہ طریقۂ محمدی سے منہ موڑنے والا کافر ہوتا ہے۔

آیت نمبر (۳۳) اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰۤى اٰدَمَ وَنُوْحًا وَّاٰلَ اِبْرٰهِيْمَ وَاٰلَ عِمْرٰنَ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ﴿۳۳﴾

ترجمہ: ''بے شک اللہ نے آدم، نوح، آلِ ابراہیم اور آلِ عمران کو تمام جہانوں پر فضیلت دی''۔

تفسیر اللہ تعالیٰ نے حضرت آدمؑ اور حضرت نوحؑ کو نبوت کے لیے منتخب فرمایا اور آلِ ابراہیم و آلِ عمران کو تمام عالم میں منتخب کرلیا۔ آلِ ابراہیم سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تشریف لائے، کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اولادِ ابراہیمؑ سے ہیں۔ علماء نے لکھا ہے کہ اس مقام پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا نام صراحت کے ساتھ ذکر کرنا ضروری نہیں تھا، اور آلِ عمران سے مراد مریمؓ اور ان کے فرزند حضرت عیسیٰؑ ہیں۔

حافظ سیوطیؒ اپنی کتاب میں بیان کرتے ہیں کہ یہ آیت اس بات کی دلیل ہے کہ انبیاء ملائکہ سے بھی افضل ہیں، کیونکہ عالمین میں فرشتے بھی شامل ہیں اور اللہ نے انبیاء کو تمام عالم میں فضیلت دی۔ بعد ازاں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ یہ خیر و برکت ان کی نسلوں میں جاری رہی، مردوں میں بھی اور عورتوں میں بھی۔

آیت نمبر (۳۴) ذُرِّيَّةًۢ بَعْضُهَا مِنْۢ بَعْضٍ ؕ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۳۴﴾

ترجمہ: ''یہ ایک دوسرے کی اولاد ہیں، اور اللہ سب کچھ سننے والا، جاننے والا ہے''۔

تفسیر ان میں ایک دوسرے کی اولاد تھے اور اللہ خوب سننے والا، جاننے والا ہے۔

آیت نمبر (۳۵) اِذْ قَالَتِ امْرَاَتُ عِمْرٰنَ رَبِّ اِنِّىْ نَذَرْتُ لَكَ مَا فِىْ بَطْنِىْ مُحَرَّرًا فَتَقَبَّلْ مِنِّىْ ۚ اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴿۳۵﴾

ترجمہ: ''یاد کرو! جب عمران کی بیوی نے کہا: اے میرے رب! میں نے تیرے لیے نذر مانی ہے اُس بچے کی جو میرے پیٹ میں ہے کہ وہ تیرے لیے وقف ہوگا، سو تُو اسے قبول فرما، بے شک تُو خوب سننے والا اور جاننے والا ہے''۔

تفسیر محمد بن اسحاقؒ روایت کرتے ہیں کہ عمران کی زوجہ، یعنی مریمؑ کی ماں، ابتدا میں حاملہ نہیں ہوسکی تھیں۔ انہوں نے دعا کی: ''اے اللہ! مجھے بیٹا عطا فرما۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی دعا قبول فرمائی۔ جب حمل ٹھہر گیا تو انہوں نے نذر کی کہ پیدا ہونے والے بچے کو عبادت اور بیت المقدس کی خدمت کے لیے مکمل طور پر وقف کر دیں گی۔ جب ولادت ہوئی تو معلوم ہوا کہ بچہ لڑکی ہے، تو انہوں نے کہا: ''اے میرے رب! یہ تو بچی ہوئی، جبکہ میں بیٹے کی امید رکھتی تھی جو بیت

المقدس کی خدمت کرے گا''۔ اللہ تعالیٰ کو معلوم تھا کہ انہوں نے کیا نذر کی تھی، اور فرمایا: ''جو بچہ آپ نے چاہا تھا، اس کی طاقت، صبر و تحمل اور مسجد اقصیٰ کی خدمت میں وہ لڑکی جو پیدا ہوئی ہے، اس کی مانند نہ ہوگا''۔

امِّ مریمؓ نے بچی کا نام مریم رکھا۔ مفسرین کے مطابق مریم کے معنی اُن کی زبان میں ''عبادت کرنے والی اور رب کی خادمہ'' ہیں۔ اس کے بعد اُمِّ مریمؓ نے دعا کی: ''اے اللہ! میں اس بچی اور اس کی اولاد (یعنی حضرت عیسیٰؑ) کو تیری پناہ میں دیتی ہوں''۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی دعا قبول فرمائی۔

بخاری و مسلم میں حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ جب کوئی بچہ پیدا ہوتا ہے تو شیطان اس پر اثر ڈالنے کی کوشش کرتا ہے، جس سے بچہ چیختا ہے، مگر مریم اور حضرت عیسیٰؑ شیطان کے اثر سے محفوظ رہے۔ حضرت ابو ہریرہؓ نے فرمایا کہ اس آیت کو پڑھنا مفید ہے: وَاِنِّیْ سَمَّیْتُهَا مَرْیَمَ وَاِنِّیْٓ اُعِیْذُهَا بِكَ وَذُرِّیَّتَهَا مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ۔ (مسلم رقم:۲۳۶۶)

نوٹ: یہ آیت واضح کرتی ہے کہ ماں اپنے بچے کو کسی نیک مقصد کے لیے ارادہ کر سکتی ہے۔ اسی طرح، امِّ مریمؓ نے کہا: ''اے میرے رب! میں اپنے حمل کو تیرے لیے وقف کرتی ہوں''۔ آیت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ انسان کو اللہ سے اولاد مانگتے وقت نیک نیت اور عملِ صالح کی خواہش کے ساتھ دعا کرنی چاہیے۔

حافظ سیوطیؒ نے لکھا کہ یہ آیت اس بات کی دلیل ہے کہ پیدائش کے دن بچے کا نام رکھنا جائز ہے اور ماں بھی بچے کا نام رکھ سکتی ہے؛ یہ حق صرف باپ کے لیے مخصوص نہیں ہے۔

آیت نمبر (۳۶) فَلَمَّا وَضَعَتْهَا قَالَتْ رَبِّ اِنِّیْ وَضَعْتُهَآ اُنْثٰی ؕ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا وَضَعَتْ ؕ وَلَیْسَ الذَّكَرُ كَالْاُنْثٰی ۚ وَاِنِّیْ سَمَّیْتُهَا مَرْیَمَ وَاِنِّیْٓ اُعِیْذُهَا بِكَ وَذُرِّیَّتَهَا مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ﴿۳۶﴾

ترجمہ: ''پھر جب اس نے بچی کو جنا تو بولی: اے میرے رب! میں نے تو لڑکی کو جنا ہے، حالانکہ اللہ بہتر جانتا تھا جو کچھ اس نے جنا اور لڑکا، لڑکی جیسا نہیں ہوتا، اور میں نے اس کا نام مریم رکھا ہے، اور میں اسے اور اس کی اولاد کو شیطان مردود سے تیری پناہ میں دیتی ہوں''۔

تفسیر

حضرت مریمؓ کی پیدائش

پیدائش کے وقت جب مریمؓ پیدا ہوئیں تو اُمِّ مریمؓ نے کہا: ''اے میرے رب! میرے ہاں لڑکی پیدا ہوئی ہے''۔ اللہ تعالیٰ کو پہلے سے معلوم تھا کہ کیا پیدا ہوا ہے، اور یہ کہ لڑکا لڑکی کے برابر نہیں ہو سکتا۔ پھر اُمِّ مریمؓ نے کہا: ''میں نے اس لڑکی کا نام مریم رکھا اور میں اسے اور اس کی نسل کو شیطان مردود سے محفوظ رکھنے کے لیے تیرے پاس پناہ میں دیتی ہوں''۔

آیت نمبر(۳۷) فَتَقَبَّلَهَا رَبُّهَا بِقَبُوْلٍ حَسَنٍ وَّاَنْۢبَتَهَا نَبَاتًا حَسَنًا ۙ وَّ كَفَّلَهَا زَكَرِيَّا ؕ كُلَّمَا دَخَلَ عَلَيْهَا زَكَرِيَّا الْمِحْرَابَ ۙ وَجَدَ عِنْدَهَا رِزْقًا ۚ قَالَ يٰمَرْيَمُ اَنّٰى لَكِ هٰذَا ؕ قَالَتْ هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ ﴿۳۷﴾

ترجمہ: ''پس اُس کے رب نے مریم کو خوش دلی سے قبول کیا، اور اسے اچھے طریقے سے پروان چڑھایا، اور اس کا نگراں زکریا کو بنایا۔ جب بھی زکریا اس کے پاس حجرہ میں جاتے تو وہاں کچھ کھانے پینے کی چیزیں پاتے، تو پوچھتے: اے مریم! یہ سب کہاں سے آیا؟ وہ کہتی: یہ اللہ کی طرف سے ہے۔ بے شک اللہ جسے چاہے، بے حساب رزق دیتا ہے''۔

تفسیر

اُمِّ مریم کی منت

اُمِّ مریمؓ نے بیٹے کی نیت کی تھی تا کہ وہ بیت المقدس کی خدمت کرے، لیکن جب انہیں بچی ہوئی تو ایک طرح کی مایوسی ہوئی۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے دل کو سکون دیا اور ان کی نذر قبول فرمائی۔ یہ بچی ایسی پرہیز گار اور نیک بنی کہ دینی مقاصد کے حصول میں ہزاروں لڑکوں پر فضیلت حاصل کر گئی۔ اللہ تعالیٰ نے اس کا ذکر اس آیت میں فرمایا کہ اس کی نذر قبول ہوگئی اور اس لڑکی کی کفالت زکریا علیہ السلام کے سپرد کی گئی، جو اس کے خالو تھے۔

''جب وہ لوگ اپنے قلم (نہر میں) بطور قرعہ اندازی کر رہے تھے کہ مریم کی کفالت کون کرے''۔

(سورہ آل عمران: ۴۴)

مفسرین نے لکھا ہے کہ زکریا علیہ السلام جب ان کے پاس جاتے تو سردی میں گرمی کے پھل اور گرمی میں سردی کے پھل پاتے تھے۔ مریمؑ دن رات عبادت میں مصروف رہتی تھیں اور محراب سے صرف انسانی ضروریات کے لیے نکلتی تھیں۔

نوٹ: یہ بات حضرت خبیب بن عدی انصاریؓ کے واقعے سے بھی ثابت ہوتی ہے، جنہیں مکہ مکرمہ میں کافروں نے شہید کیا اور قید کے دوران انہیں انگور کے گچھے ملے۔ **(صحیح بخاری، کتاب الجہاد، رقم: ۳۰۴۵)**

اللہ کا ولی وہی ہوگا جو شریعت کا پابند، قرآن وسنت پر عمل کرنے والا، بدعت اور خرافات سے دور ہو اور جس کے بارے میں قرآن وسنت گواہی دیں کہ وہ دینِ خالص کے ساتھ شریعتِ اسلامیہ کی پابندی کرتا ہے۔ مشرک، بدعتی، قرآن وسنت سے دور، اور نیک کاموں میں کوتاہی کرنے والا کبھی بھی اللہ کا ولی نہیں بن سکتا۔ ایسے لوگوں سے جو کرامت دکھاتے ہیں، وہ جادو یا شیطانی عمل کے نتیجے میں ہوتے ہیں، لہٰذا ان سے دور رہنا چاہیے۔

❁❁❁

عالمی شہرت یافتہ علماء کے تائیدی کلمات سے متعلق اصل تحریریں

عالمی شہرت یافتہ علماء کے تائیدی کلمات سے متعلق تحریروں کی فہرست طویل ہے جسے تفسیر فاروقی کے آخری جلد میں شامل کیا گیا ہے ان میں سے چند اہم معروف عالمی شہرت یافتہ علماء کی تحریریں اگلے صفحات پر درج ہیں

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مقدمہ

مرشدامت حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ

(جانشین حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ، سابق صدر: آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ و ناظم ندوۃ العلماء لکھنؤ الھند)

الحمدللہ رب العالمین، و الصلاۃ و السلام علٰی سید المرسلین خاتم النبین سیدنا محمد، و علٰی آلہ و صحبہ أجمعین و من تبعھم بإحسان إلی یوم الدین و بعد۔

زبان کوئی بھی ہو، اس میں الفاظ معانی کے ساتھ کیفیات کے بھی حامل ہوتے ہیں، اسی طرح بعض وقت الفاظ موقعوں کے فرق کے ساتھ معانی میں فرق رکھتے ہیں اور یہ ہر زبان میں الفاظ کے مختلف موقعوں پر اور مختلف کیفیتوں میں استعمال ہونے کے اثر سے پیدا ہوتے ہیں، اس کی وجہ سے ایک زبان سے دوسری زبان میں ترجمہ بعینہ اسی مفہوم میں نہیں ہو سکتا، جس مفہوم میں اصل زبان میں ہوا ہے اور جب الفاظ کا استعمال کرنے والا موقع ومحل کے الفاظ کو اور موقع ومحل کے مطابق استعمال کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو تو اس کا ترجمہ اور زیادہ مشکل ہو جاتا ہے، موقع ومحل اور کیفیات سے پوری واقفیت اللہ رب العالمین سے زیادہ کون جانتا ہے۔

پھر زبان، زبان میں فرق ہوتا ہے، بعض زبانیں سادہ انداز اور شروع شروع کی ہوتی ہیں اور بعض زبانیں بہت خوبیوں سے گزری ہوئی زیادہ خصوصیات کی حامل ہوتی ہیں، اس لحاظ سے عربی زبان کو بڑا امتیاز حاصل ہے، اس میں انسانی نفسیات کی ترجمانی بہتر طریقہ سے ملتی ہے، پھر قرآن مجید جو کلام الٰہی ہے اور کلام الٰہی ہونے کے باعث انسان سے مخاطب میں اعلیٰ ترین خصوصیات کا حامل ہے اور عربی زبان میں ہے، لہٰذا اس کے معانی ومفہوم کو دوسری زبان کے الفاظ میں ادا کرنے کی صلاحیت اس میں ہو سکتی ہے۔

ایک زبان سے دوسری زبان میں ترجمہ کرنے کے لیے دونوں زبانوں کے الفاظ کے معانی کی کیفیات کا بہتر طریقہ سے جاننے کی ضرورت ہوتی ہے، جس کے بغیر معانی ومفہوم بہت کٹے پٹے طریقہ سے منتقل ہوتے ہیں، بلکہ بعض وقت بدل جاتے ہیں، قرآن مجید ایک طرف تو رب العزت کا کلام ہے، دوسری طرف وہ انسانوں کی رہنمائی اور توجہ دہانی کی خصوصیت رکھتا ہے اور اس کے مخاطب انواع واقسام کے لوگ ہیں، کہیں تو اپنے ماننے والوں کو مخاطب کیا ہے اور کہیں اپنے منکر لوگوں کو مخاطب کیا ہے اور کہیں سادہ مزاج لوگوں کو مخاطب کیا ہے، کہیں گہری بات واضح کی ہے، کہیں سادہ اور روزمرہ کی بات کہی ہے، مخاطب کی سمجھ اور مطلب سمجھنے اور سمجھانے کا خیال رکھا گیا ہے، ایسی صورت میں اس کا ترجمہ حقیقت میں تو ناممکن ہے، لیکن

ضرورت کی بنا پر ان لوگوں کے فائدہ کے لیے جنہوں نے عربی زبان کا علم حاصل نہیں کیا اور عربی زبان کے انداز بیان کو نہیں سمجھا، ان کے لیے، ان کی ضرورت پوری کرنے کے لیے صاحب صلاحیت لوگوں نے ترجمے کیے ہیں اور یہ سمجھتے ہوئے کیے ہیں کہ وہ حق تو ادا نہیں کر پا رہے ہیں لیکن بقدر ضرورت مفہوم کو مخاطب کی سمجھ کے مطابق پیش کرنے کی کوشش کر رہے ہیں، یہی بات مفتی محمد سرور فاروقی صاحب ندوی کے ترجمۂ قرآن کریم کی ہے۔

اس ترجمہ کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ اس کام کو عرصہ سے انجام دے رہے ہیں اور اپنے اساتذہ اور باصلاحیت رفقاء کے مشوروں سے فائدہ اٹھاتے رہے ہیں، انہوں نے قرآن مجید کا ہندی میں ترجمہ کیا اور کئی سال کی کوششوں کے بعد سات جلدوں میں تفسیر بھی لکھی، اب اردو میں ترجمہ کر رہے ہیں، ترجمہ کی دشواری اور خصوصیت کا احساس پوری طرح رکھتے ہیں اور اس دشواری کو سامنے رکھتے ہوئے انہوں نے اپنے تمہیدی مضمون میں وضاحت کی ہے اور اس مشکل کا اعتراف کیا ہے اور اس مشکل کا جتنا حل ان کے تجربہ اور علم میں آیا ہے اس کا انہوں نے جو لحاظ کیا ہے اس کا تذکرہ کیا ہے، ان کے اس تذکرہ سے اس سلسلہ میں ان کی صلاحیت کا اندازہ ہوتا ہے۔

ان کے ترجمے کے بعض نمونے دیکھے تو اندازہ ہوا کہ بہتر سے بہتر جو بات ان کو سمجھ میں آئی وہ اختیار کی ہے، بلکہ دوسرے بڑی صلاحیتوں کے حامل لوگوں نے جو ترجمے کیے ہیں اس پر بھی نظر ڈالی ہے اور ان سے فائدہ اٹھایا ہے، تاکہ جس قدر وہ راہ مستقیم پر چل سکیں، چلیں اور اس میں وہ ایک حد تک کامیاب ہیں، ہم اس پر اپنی قدردانی کا اظہار کرتے ہیں اور ان کے اس ترجمہ کی جو افادیت ہے اس کے اثرات کی اچھی توقع رکھتے ہیں اور اللہ تعالیٰ سے قبولیت کی دعا کرتے ہیں، **و ھو الموفق و ھو یھدی السبیل۔**

محمد رابع حسنی ندوی
(ناظم ندوۃ العلماء، لکھنؤ)
(شب جمعرات، دارالحسن، خاتون منزل، گولا گنج، لکھنؤ)

۶ صفر ۱۴۳۷ھ
۱۸ نومبر ۲۰۱۵ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تائیدی کلمات

حضرت مولانا مفتی ابوالقاسم نعمانی دامت برکاتہم

(مہتمم دارالعلوم دیوبند، الھند)

بسم سبحانہ وتعالیٰ

قرآن پاک کے ترجمہ وترجمانی اور تفسیر وتشریح کا عمل انتہائی نازک عمل ہے، صرف اس بنا پر نہیں کہ قرآن عظیم الشان جو کہ فصاحت وبلاغت کے معجزانہ معیار پر ہے اور اپنی وسعت وگہرائی کے لحاظ سے اس کی تعبیرات کا درحقیقت کوئی بدل ہو ہی نہیں سکتا بلکہ اس بنا پر بھی کہ قرآن پاک کو کسی دوسری زبان میں منتقل کرنا انتہائی حساس، نازک اور ذمہ داری کا عمل ہے کہ ترجمہ نگار گویا یہ دعویٰ کرتا ہے کہ میں اپنے الفاظ میں جو مفہوم ادا کر رہا ہوں یہی مراد خداوندی ہے۔ اور قرآن پاک میں عربی زبان میں جو بات ارشاد فرمائی گئی ہے بعینہ وہی بات میں ترجمہ کی زبان میں نقل کر رہا ہوں، اس لئے متقدمین بطور خود کسی آیت کا ترجمہ کرنے کے مقابلہ میں اس بات میں عافیت محسوس کرتے تھے کہ کسی محقق عالم کے ترجمہ کو نقل کر دیں، اور اس کی وجہ یہ ہے کہ علماء نے مفسر کے لئے ۲۵/ علوم میں مہارت کو ضروری قرار دیا ہے، جو آسان نہیں ہے۔

لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ اللہ پاک کے پیغام کو عام مسلمانوں تک انذار وتبشیر اور موعظت ونصیحت کی خاطر پہنچانے کی مخلصانہ کوششیں ہر زمانہ میں ہوتی رہی ہیں۔

جناب مولانا مفتی محمد سرور فاروقی ندوی صاحب نے اس سے قبل ہندی زبان میں قرآن پاک کی ترجمانی کی خدمت انجام دی ہے، جسے اہل علم نے سراہا ہے، اور اب ان کے اردو ترجمہ کا نمونہ سامنے آیا ہے جس میں حتی الامکان لفظی ترجمہ کی کوشش کی گئی ہے، اللہ تعالیٰ اس خدمت کو قبول فرمائے۔

لیکن صرف لفظی ترجمہ کی بنیاد پر قرآن فہمی کا دعویٰ نہیں کرنا چاہیے، بلکہ محقق علماء واکابر نے اپنے ترجمہ کے ساتھ جو تفسیری حواشی تحریر فرمائے ہیں مثلاً تفسیر بیان القرآن یا فوائد عثمانی پر ترجمہ شیخ الہند، ان کو بھی مطالعہ میں شامل رکھنا چاہئے۔

ابوالقاسم نعمانی غفرلہ

(مہتمم دارالعلوم دیوبند)

۵ جمادی الاولیٰ/ ۱۴۳۷ھ

۱۴/ فروری ۲۰۱۶ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تائیدی کلمات

حضرت مولانا محمد سالم قاسمی دامت برکاتہم
(مہتمم دارالعلوم وقف دیوبند ونائب صدر مسلم پرسنل لا بورڈ)

وحی ربانی کی مخاطب بننے والی تین صاحب عقل مخلوقات ''جنات'' ''ملائکہ'' اور ''انسان'' ہیں خالق حکیم نے عقل انسانی کو صرف تحمل وحی کی قدرت ہی نہیں دی بلکہ اس کے سرار وغوامض، اور عبارت، اشارت، دلالت، اور اقتضا میں مکنون حقائق ولطائف اور احکام وہدایات تک پہنچنے کی قوت تدبر وتعمق کی عظیم صلاحیت سے نواز کر، منصب نبوت کی اہلیت وصلاحیت کے شرف سے انسان کو مشرف فرمایا، اور ان پر وحی کا نزول فرما کر انسانیت کی رہنمائی فرمائی۔

کتاب فطرت قرآن کریم نے، اقوام وامم کی ترقی وتنزلی کے لئے بطور ضابطہ فطرت ''انّ مَعَ العُسر یُسرا'' کو پیش فرمایا ہے جو ایک اساسی اور فطری ربّانی قانون ہے۔

نئی نسل کے دینی مربّی علمائے کرام اگرچہ اپنی عظیم علمی وسعت، اور وقیع مخلصانہ جذبہ خدمت کے باوجود بالعموم نئی نسل کی جدت ذوق اسلامک میں پرداز اور محبوب انداز پر کلام سے اپنے علمی ذوق کی وجہ سے مانوس نہیں ہیں، اور طویل تجربات اس پر شاہد عدل ہیں کہ اس ناآشنائی اور ناواقفیت کے نتیجے میں ان کی خدمات کا معتد بہ حصہ بے اثر وبے نتیجہ رہ جاتا ہے، جبکہ ہمارے پاس وقت کی زندہ زبان، نئے طرز فکر، اور جدید تعبیر وبیان سے واقفیت کے ساتھ دینی ذوق ومزاق رکھنے والا، عصری تعلیم سے آراستہ وہ طبقہ بھی موجود ہے کہ جسے ہم بسہولت اس اہم ملّی اور دینی خدمت میں استعمال کر سکتے ہیں، اور نئی نسل کے سامنے آنے والے نئے سوالات، نئے شبہات، نئے اعتراضات اور نئی تلبیسات کے نہ صرف جوابات ہی سے بلکہ ان کے مانوس افکار ونظریات کو ملحوظ رکھ کر ان کی محبوب زبان واصطلاحات کے ذریعہ انہیں مطمئن بھی کر سکتے ہیں، اور نئے چیلنجوں کا کتاب وسنت کی روشنی میں تار پود بھی بکھیر سکتے ہیں، اسلام کی بنیاد پر نئی مسلم نسل کے روشن مستقبل سازی کے لئے اس کا سد باب بھی ضروری ہے۔

مفتی مولانا محمد سرور فاروقی صاحب ندوی نے قرآن کریم کا لفظی ترتیب کے اعتبار سے رواں اردو ترجمہ کر کے ایک نمایاں کام انجام دیا ہے، جس سے عوام الناس کو استفادے میں آسانی ہو جائے گی، حق تعالیٰ ان کی اس خدمت کو قبول فرمائے اور مزید دینی خدمت کی توفیق ارزانی فرمائے، آمین،

۵ جمادی الاولیٰ/ ۱۴۳۷ھ
مطابق ۱۴ فروری/ ۲۰۱۶ء

(مولانا) محمد سالم قاسمی (صاحب)
صدر مہتمم دارالعلوم وقف دیوبند

تائیدی کلمات

حضرت مولانا سید ارشد مدنی دامت برکاتہم

(استاذ حدیث دارالعلوم دیوبند وصدر جمعیت علماء ہند)

باسمہ سبحانہ وتعالیٰ

أحمدہٗ وأصلی علیٰ رسولہ الکریم

آقاء نامدار حضرت محمد صلی کی خصوصیت میں سے یہ بھی ہے کہ آپ کسی خاص قوم کے لئے نہیں بلکہ تمام عالم کے لئے رحمت بنائے گئے ہیں، جس طرح آپ ذات تمام عالم کے لئے ہے اسی طرح آپ کی لائی ہوئی شریعت اور کتاب یعنی قرآن کریم بھی تمام عالم کے لئے ہدایت ہے، کسی خاص قوم کے لئے مخصوص نہیں ہے، یہی وجہ ہے کہ دنیا کی ہر قوم سے جن افراد کے لئے عنداللہ ہدایت مقدر تھی انہوں نے قرآن کو اور اس کی ہدایت کو اپنایا اور دین ودنیا کی سعادت کے مستحق ہوئے، قرآن اور صاحب قرآن کا اس کو اعجاز ہی کہا جائے گا کہ جزیرۃ العرب کے اِردگرد ایشیا اور افریقہ کا ایک بہت بڑا طبقہ ایسا ہے کہ جس نے قرآن کو اس طرح اپنایا کہ اپنی اور اپنے آباء واجداد کی مادری زبان کو یکسر چھوڑ دیا اور قرآن کی زبان کو یکسر چھوڑ دیا اور قرآن کی زبان کو اپنی زبان بنالیا، چونکہ قرآن صرف الفاظ کا ہی نام نہیں ہے بلکہ الفاظ اور معنیٰ دونوں کے مجموعہ کا نام ہے، یعنی فرشتہ جس طرح قرآن کے الفاظ رسول اللہ کے پاس لاتا تھا اسی طرح ان الفاظ کے معنیٰ یعنی مرادِ خداوندی بھی لیکر آتا تھا، اس لئے یہ ایک اسلامی اصول بن گیا کہ ان الفاظ میں کوئی تغیر و تبدل نہیں ہوسکتا اور نہ ہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا کوئی شخص اپنی طرف سے اس کے معنیٰ کو متعین کرسکتا ہے، چنانچہ ساری دنیا کے مسلمان قرآن کو پڑھتے ہیں تو اسی طرح پڑھتے ہیں جس طرح وہ چودہ سو سال پہلے اترا تھا اور جس طرح اس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پڑھتے تھے، البتہ اس کا ترجمہ کیا جاسکتا ہے اور اس کی تفسیر کو آسان الفاظ اور اپنی زبان میں بیان کیا جاسکتا ہے، اسی وجہ سے ہمارے ہندوستان کے علماء نے ضرورت پڑنے پر قرآنی علوم کو عربی زبان سے فارسی زبان میں منتقل کرڈالا، اور جب فارسی زبان کا چلن ختم ہونے لگا تو قرآنی علوم کو اردو زبان میں منتقل کردیا گیا۔

اب جبکہ ہندی زبان ہمارے ملک کی سرکاری زبان ہے اور امت کا ایک بہت بڑا طبقہ اردو سے دور ہے اس بات کی شدید ضرورت ہے کہ اسلامی علوم کو ہندی زبان میں بھی منتقل کیا جائے۔

یہ بات قابل قدر ہے کہ مولانا مفتی محمد سرور فاروقی ندوی نے مذکورہ ضرورت کو ملحوظ رکھ کر حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے ترجمہ کو سامنے رکھتے ہوئے مادری زبان میں قرآن شریف کا ترجمہ کیا ہے، اور اب ہندی ترجمہ وتفسیر کے بعد اردو زبان میں لفظی ترتیب کا خیال رکھتے ہوئے رواں ترجمہ کیا ہے جو عوام کے لئے بہت مفید ثابت ہوگا۔ اگرچہ یہ فقیر اپنی مصروفیات کی وجہ سے اس کو بالاستیعاب نہیں دیکھ سکا، لیکن حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے ترجمہ کو بنیاد بنانا اس ترجمہ کی ثقاہت کے لئے کافی ہے۔

سید ارشد مدنی
(صدر جمعیت علماء ہند)

۱۵ فروری/ ۲۰۱۶ء
۵ / جمادی الاول/ ۱۴۳۷ھ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تائیدی کلمات

حضرت مولانا سعید الرحمٰن الاعظمی ندوی دامت برکاتہم

(مہتمم دارالعلوم ندوۃ العلماء، ومدیر البعث الاسلامی لکھنؤ)

الحمد للّٰہ رب العالمین و الصلوٰۃ والسلام علٰی سید المرسلین و امام المتقین و علی من تبعھم باحسان الی یوم الدین: امابعد!

قرآن کریم اللہ کا کلام ہے یہ رہتی دنیا تک انسانی زندگی کی بھرپور رہنمائی کرتا رہے گا اور کائنات، زندگی اور انسان سب کے لئے ہمیشہ ہمیش روشنی کا مینار بنکر قائم رہے گا اور زندگی کے تمام مسائل کا ہر زمان ومکان میں فطری حل پیش کرتا رہے گا، زمانہ چاہے جتنا بھی بدل جائے علم چاہے جتنا بھی ترقی کرلے، سائنس وٹیکنالوجی کے میدان میں انسان خواہ کتنا ہی بلند ثابت ہوجائے، طرح طرح کے حیرت انگیز دریافتوں سے علم کا سینہ کتنا ہی معمور ہوجائے مگر اللہ کے کلام کی رہنمائی پوری طاقت کے ساتھ اپنا معجزہ دکھاتی رہے گی، تاریخ اپنے حیرت انگیز صفحات میں اضافہ کرتی رہے گی، زمین کا تعلق آسمان سے گہرا ومضبوط ہوتا جائیگا، ایمان ویقین اپنے قائدانہ کردار سے تمام تاریک گوشوں کو منور کرتے رہیں گے، انسان کے اندر روشنی کی تلاش میں شدید اصرار کا جذبہ کارفرما ہوتا رہے گا اور کوئی مادّی طاقت اس کو تلاش صبح روشن سے روکنے میں کامیاب نہ ہوسکے گی۔ یہ وہ حقیقتیں ہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عملی سیرت میں پوری طرح موجزن ہیں۔

قرآن کریم اپنے بے پناہ وسعت کے لحاظ سے روشنی در روشنی کا ایک بحر متواج ہے، اسی کے رہنما دائمی اصولوں پر نوع بنی انسان کا وجود قائم ہے اس لئے ہماری سب سے پہلی ضرورت یہ ہے کہ ہم اس کتاب جاوداں سے مکمل طور پر فائدہ اٹھانے کے لئے اس کے معنٰی ومطلب کو سمجھنے اس کے حقائق اور باریکیوں پر غور کرنے اور زندگی کے ماضی حال مستقبل کو سمجھنے اور جلا بخشنے کی راہ میں اپنا علمی سفر شروع کریں اور سب سے پہلے اس کتاب عظیم کے معانی ومفاہیم کا ادراک حاصل کرنے کے لئے اس کی آیتوں کے ترجمہ پر غور کریں اور دیکھیں کہ کامیاب زندگی کے لئے یہ کس قدر ضروری اور ناگزیر ہے۔

یوں تو اس کتاب عزیز کے بہت سی زبانوں میں ترجمے ہوچکے ہیں تفسیریں لکھی جاچکی ہیں اور لوگوں نے بقدر ظرف ان سے فائدہ بھی اٹھایا ہے۔ ہمارے اس ملک میں ہندی زبان میں قرآن کریم کا ترجمہ اور اس مختصر تفسیر مختلف اداروں اور شخصیات کی طرف سے شائع ہوکر مقبول ہوچکی ہیں لیکن ابھی تک کسی ایسے عالم دین کی طرف سے جس کو ہندی زبان پر پوری طرح عبور حاصل ہو اور وہ عربی زبان کی روح کو سمجھ کر ہندی زبان میں منتقل کرنے کی بھرپور صلاحیت رکھتا ہو، کوئی کام نہ ہوسکا تھا، ہمیں اس بات کا

اعتراف کرنے میں نہایت خوشی ہورہی ہے کہ ہمارے حلقۂ ندوۃ العلماء کی طرف سے یہاں کے عالم دین عربی، اردو، ہندی کے ماہر مایہ ناز ادیب عالم اور صحابی قرآن کریم کا ہندی زبان میں ایک نہایت ہی قابل وثوق اور عربی زبان کی روح سے قریب تر ہندی ترجمہ پیش کررہے ہیں اس ترجمہ کی چند خصوصیات ذیل میں پیش کی جارہی ہیں:

۱۔اس سے قبل چند اردو کے ترجمے ہندی رسم الخط میں تبدیل کئے گئے لیکن ان میں بعض لوگوں نے خالص اردو زبان کا استعمال کیا ہے جس سے ہندی داں یا غیر مسلم بالکل ناواقف ہیں اور بعض لوگوں نے سخت ہندی کا استعمال کیا ہے جس کی وجہ سے مسلمانوں کے لئے بالکل ناقابل فہم ہوگیا ہے اس کی وجہ میرے نزدیک یہ ہے کہ اگر مترجم عربی داں یا عالم دین جو تمام اصطلاحات سے واقف ہو تاکہ ترجمہ کا صحیح فائدہ ہندی داں طبقہ کو نہایت اچھے اور عملی انداز میں پہونچتا اور اس کا بنیادی مقصد پورا ہوتا، اس لئے ضرورت تھی کہ ایسا ترجمہ جو اصل عربی سے قریب تر اور الفاظ درمیانی یعنی نہ سخت ہندی ہو اور نہ سخت اردو تو اس میں دونوں کی ہی رعایت کی گئی ہے۔

۲۔انہی الفاظ کا استعمال کیا گیا ہے جو قرآنی ہیں اور معاشرے میں ابھی استعمال ہوتے ہیں جیسے ''ظالم'' اردو کا لفظ ہے لیکن عام فہم ہے جبکہ ہندی میں اس کو ''اتیاچاری'' کہتے ہیں اس طرح سمیپ بمعنی قریب ہوتا ہے لیکن قریب سبھی لوگ سمجھتے ہیں اس لئے اسی کو استعمال کیا گیا ہے۔

۳۔اسی طرح وہ الفاظ جو مسلمانوں کے یہاں کثرت سے استعمال ہوتے ہیں جیسے رحمت، مغفرت، رحمٰن، رحیم وغیرہ لیکن ہندو بھائی بالکل ناواقف ہوتے ہیں تو ایسے الفاظ کی تشریح بریکٹ میں کردی گئی ہے۔

۴۔اسی طرح ان الفاظ سے احتیاط برتی گئی ہے جس کے معنیٰ قدیم دور میں کچھ تھے اور اب وہی الفاظ دوسرے معنیٰ میں استعمال ہونے لگے ہیں۔

۵۔اس ترجمہ میں اتباع سلف کو بنیاد بنا کر معبر تراجم سے استفادہ کیا گیا ہے۔

۶۔اس طرح بیک وقت اصطلاحی ترجمہ کے ساتھ لفظی رعایت بھی کی گئی ہے جس کی وجہ سے یہ کوشش ہر حلقے کے لئے مفید ومقبول بن گئی ہے خواہ وہ اعلیٰ تعلیم یافتہ طبقے سے تعلق رکھتا ہوں یا عام خواندہ گروہ سے متعلق ہو۔

ان تمام خصوصیات کی بناء پر جناب مولینا محمد سرور فاروقی ندوی کا یہ علمی تحفہ ان کی یہ علمی کاوش ہمارے اس ملک کے ہندی داں طبقے کے لئے خاص طور پر بے انتہا ضروری اور مفید ہے، دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مولانا کی خدمت قرآن سے متعلق جملہ مساعی کو قبولیت عام سے سرفراز فرمائیں۔اور اپنے شایان شان جزائے خیر سے نوازے۔آمین۔

سعید الرحمٰن الاعظمی ندوی
(مدیر البعث الاسلامی، ندوۃ العلماء، لکھنؤ، الھند)

۹/جون ۲۰۰۴ء
۱۹/۴/۱۴۲۵ھ

فہرست مضامین

عرض ناشر ۳
دعائیہ کلمات (عالم اسلام کی عظیم شخصیت مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ کے قلم سے) ۴
عالم اسلام کے معروف علماء دین کی تصدیقات کے منتخب جملے جیسے ۶
عالم اسلام کی معروف شخصیت مرشد امت حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ، معروف عالم دین حضرت مولانا مفتی ابوالقاسم نعمانی مدظلہ العالی، معروف عالم دین حضرت مولانا محمد سالم قاسمیؒ، معروف عالم دین حضرت مولانا سید ارشد مدنی مدظلہ العالی، معروف عالم دین اور ادیب حضرت مولانا سعید الرحمٰن اعظمی ندوی مدظلہ العالی، معروف عالم دین حضرت مولانا محمد سعید مظاہری رحمۃ اللہ علیہ، فقیہ عصر حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی مدظلہ العالی، عالمی شہرت یافتہ ادیب حضرت مولانا سید واضح رشید حسنی ندویؒ، حضرت مولانا عبدالقادر ندوی مظاہری گجراتی مدظلہ العالی، مفسر قرآن حضرت مولانا مفتی فضیل الرحمٰن ھلال عثمانیؒ، مشفق ومربی حضرت مولانا سید عبداللہ حسنی ندویؒ وغیرہ حضرات کے تائیدی کلمات۔
عرض مترجم ۱۲

تفسیر فاروقی - جلد اول

(سورہ فاتحہ سے سورہ آل عمران آیت نمبر ۷۳ تک)

مضمون	صفحہ نمبر
اَلْاِسْتِعَاذَة	۱۸
الاِسْتِعَاذَہ کی تفسیر	۱۸
اِستعاذہ یا تعوذ	۱۹
اِستعاذہ یا تعوذ پڑھنے کا فائدہ	۱۹
ابلیس کا تخت	۲۰
جنات	۲۰
ابلیس کا انکار	۲۰
مسائل	۲۱
بَسْمَلَہ کا مختصر تعارف	۲۲
بسم اللہ کس سورت کا حصہ ہے؟	۲۲
بَسْمَلَہ کی فضیلت	۲۴
تفسیر: بسم اللہ الرحمٰن الرحیم یعنی بسملہ	۲۶

مضمون	صفحہ نمبر
لفظ 'اللہ' کی تفسیر	۲۶
لفظ الرَّحْمٰن کی تفسیر	۲۷
لفظ اَلرَّحِیْمِ	۲۹
قرآن مجید اور نزول وحی کے سلسلے میں مستشرقین کے اعتراضات	۳۱
قرآن مجید اور نزول وحی پر اعتراض کی حقیقت	۳۲
نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا اُمّی ہونا	۳۲
کسی یہودی یا عیسائی استاذ کا عدم ثبوت	
قرآن اور سابقہ مذہبی روایات میں فرق	۳۳
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت اور ذاتی مفاد کا فقدان	۳۳
قرآن کا منفرد اسلوب	۳۳
داخلی ربط اور فکری یکسانی	۳۴
پیشین گوئیاں	۳۴

مضمون	صفحہ نمبر
حفاظتِ متن کا وعدہ	۳۵
ورقہ بن نوفل کی گواہی	۳۵
ہرقلِ روم کا مکالمہ	۳۶
کاتبینِ وحی اور ضبطِ متن	۳۶
امی معاشرہ اور محدود بیرونی روابط	۳۶
وفد کا حبشہ کے دربار میں اثر	۳۶
یہود یا نصاریٰ سے استفادہ کے دعوے پر عقلی نقد	۳۶
ادبی امتیازات	۳۷
لغت وبلاغت	۳۷
عقلی ومنطقی دلائل	۳۷
تنقیدی پہلو	۳۷
مفادات سے خالی	۳۸
مذہبی مآخذ سے تضاد	۳۸
خلاصہ	۳۸
بسم اللہ سے متعلق غیر مسلم بھائیوں کے اعتراضات کے جوابات	۳۹
''میں اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں''	۳۹
مصدر کا کلام اور متکلم منقول	۴۰
ہر مقام پر ''اے بندو! کہو'' لکھنا	۴۰
قرآن کے دونوں اسلوب	۴۰
ہندوستانی مذہبی لٹریچر	۴۱
برہما سوتر کی ابتدا	۴۱
معترض صاحب کی نقل	۴۲
اصل منطقی مغالطہ	۴۲
تقابل	۴۲
نتیجہ	۴۳
''اُوم'' مفہوم اور دائرہ	۴۴

مضمون	صفحہ نمبر
وید کا منتر	۴۴
''اُوم'' کی محدودیت	۴۵
تقابلی جائزہ	۴۵
بلاغت کا پہلو	۴۷
خلاصہ	۴۷
سورہ فاتحہ کا تعارف	۴۸
سورۂ فاتحہ کے نام	۴۸
سورۂ فاتحہ کی فضیلت	۴۹
سورۂ فاتحہ کے ذریعے دم (رُقیہ)	۴۹
سورۂ فاتحہ اور سورۂ بقرہ کی آخری آیات کی فضیلت	۵۰
ترجمہ سورہ فاتحہ	۵۲
تفسیر سورہ فاتحہ	۵۲
لِلّٰہ یعنی اللہ کی تفسیر	۵۴
لفظ ایشور	۵۵
لفظ بھگوان	۵۵
عٰلَمِیْنَ (سب جہانوں کا Universe)	۵۶
مختلف عالم	۵۶
دین کا مطلب	۵۸
قیامت کا دن	۵۹
قرآن کا جواب	۵۹
سڑ گل کر مٹی میں مل جانا	۶۰
اعمال کا نتیجہ	۶۰
عبادت کا مفہوم	۶۱
عبادت کی اقسام	۶۱
مدد کے لئے پکارنا	۶۲
مدد اور شرک کی حقیقت	۶۳

مضمون	صفحہ نمبر
توحید کی تین بنیادی اقسام	۶۳
توحید ربوبیت	۶۳
توحید الوہیت	۶۳
توحید صفات	۶۴
ہدایت کے معنیٰ	۶۴
ہدایت کی پہلی قسم	۶۶
ہدایت کی دوسری قسم	۶۶
ہدایت کی تیسری قسم	۶۷
الصِّرَاطَ ''راستہ''	۶۷
الْمُسْتَقِيْمَ ''سیدھا''	۶۷
آمین کا مطلب	۷۰
سورہ بقرہ کا مختصر تعارف	۷۲
اسبابِ نزول	۷۲
مدینہ کے حالات	۷۲
سورہ کا مختصر خلاصہ	۷۳
سورہ بقرہ کی فضیلت	۷۴
ترجمہ سورہ بقرہ (آیت نمبر ا سے ۱۰ تک)	۷۶
تفسیر سورہ بقرہ (آیت نمبر ا سے ۱۰ تک)	۷۷
حروف مقطعات	۷۷
حروف مقطعات کے معانی	۷۷
سورتوں کے نام	۷۷
اللہ تعالیٰ کے نام	۷۷
اللہ کی قسم	۷۷
قوموں کی مدت اور وقت	۷۸
اختصار (یعنی ''الف سے اللہ'')	۷۸
کوڈ ورڈ (Code word خفیہ الفاظ)	۷۸

مضمون	صفحہ نمبر
اللہ تعالیٰ کے خاص راز	۷۹
دعویٰ (چیلنج)	۷۹
خلاصہ	۷۹
ذٰلِكَ الْكِتَاب	۸۰
الْكِتَاب	۸۰
هُدًى (ہدایت)	۸۰
متقی	۸۱
غلط فہمی	۸۱
پرہیزگاروں کے اوصاف	۸۲
ایمان کی تعریف	۸۲
غیب کا مطلب	۸۲
ایمان اور اسلام میں فرق	۸۲
نماز قائم کرنا	۸۲
اللہ کی راہ میں خرچ کرنا	۸۳
مومنوں کی دو قسمیں	۸۳
آخری وحی	۸۴
اسلام کے بنیادی عقائد	۸۴
آخرت پر ایمان	۸۴
مرنے کے بعد زندگی	۸۵
یہودیت میں آخرت کا تصور	۸۵
خلاصہ	۸۶
عیسائی مذہب میں آخرت کا تصور	۸۶
خلاصہ	۸۷
ہندو مذہب میں آخرت کا تصور	۸۸
خلاصہ	۸۸
بدھ مت میں آخرت کا تصور	۸۹

مضمون	صفحہ نمبر
خلاصہ	۹۰
جین مذہب میں آخرت کا تصور	۹۰
خلاصہ	۹۱
سکھ مذہب میں آخرت کا تصور	۹۱
خلاصہ	۹۲
خلاصۂ بحث	۹۳
اسلام کا تصور آخرت	۹۳
کافروں کی گمراہی	۹۴
کفر کی اقسام	۹۴
کافروں کے بارے میں خاص وضاحت	۹۵
اشکال کا جواب	۹۵
اللہ تعالیٰ اور انسان کی ذمہ داری	۹۵
حق کے داخل ہونے کے راستے	۹۶
دل میں کالا نکتہ	۹۶
نفاق کی قسمیں	۹۷
منافقین کی حقیقت	۹۸
مدینہ کے یہودیوں سے صلح اور منافقین	۹۸
قرآن میں منافقین کی حقیقت	۹۸
ایمان اور منافقین	۹۹
دلوں کا مرض	۱۰۰
ترجمہ سورہ بقرہ (آیت نمبر ۱۱ سے ۲۰ تک)	۱۰۲
تفسیر سورہ بقرہ (آیت نمبر ۱۱ سے ۲۰ تک)	۱۰۳
منافقوں کا فساد	۱۰۳
منافقوں کا ایمان	۱۰۴
خلاصہ	۱۰۵
منافقوں کی دو قسمیں	۱۰۶

مضمون	صفحہ نمبر
دوسری مثال	۱۰۸
ترجمہ سورہ بقرہ (آیت نمبر ۲۱ سے ۲۹ تک)	۱۰۹
تفسیر سورہ بقرہ (آیت نمبر ۲۱ سے ۲۹ تک)	۱۱۰
توحید اور دعوت	۱۱۰
عبادت	۱۱۱
حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے رسول ہونے کی دلیل	۱۱۲
قرآن جیسا کلام لانے سے عاجز	۱۱۳
ایمان والوں کے لئے جنت کی خوشخبری	۱۱۴
جنت	۱۱۴
اہل جنت کا حال	۱۱۵
کافروں کا اعتراض	۱۱۶
اللہ سے کیا ہوا وعدہ	۱۱۷
فاسقوں کے اعمال	۱۱۷
منافق کی پہچان	۱۱۷
انسان کی پہلی پیدائش	۱۱۸
زمین و آسمان کی پیدائش	۱۱۹
ترجمہ سورہ بقرہ (آیت نمبر ۳۰ سے ۳۹ تک)	۱۲۰
تفسیر سورہ بقرہ (آیت نمبر ۳۰ سے ۳۹ تک)	۱۲۱
حضرت آدمؑ کی پیدائش	۱۲۱
حضرت آدمؑ کا ذکر	۱۲۲
حضرت آدمؑ کے لئے سجدہ	۱۲۳
سجدۂ تعظیمی کی حقیقت	۱۲۴
سجدے کی شرعی حیثیت	۱۲۴
ابلیس کے معنیٰ	۱۲۵
اللہ تعالیٰ جمال کو پسند کرتا ہے	۱۲۵
گھمنڈ یا تکبر کے نتائج	۱۲۶

مضمون	صفحہ نمبر
حضرت آدمؑ اور حضرت حوا کی تخلیق	۱۲۸
جنت میں قیام اور ممانعت	۱۲۸
حضرت آدمؑ وحوا کو بہکانا	۱۲۹
حضرت آدمؑ کی پیدائش اور نزول	۱۲۹
خلاصہ	۱۳۰
شیطان کا دھوکہ	۱۳۱
شیطان کا وسوسہ	۱۳۱
زمین پر نزول	۱۳۱
حضرت آدمؑ کی توبہ	۱۳۲
جنت سے دنیا کی طرف	۱۳۲
حضرت آدمؑ اور حضرت موسیٰؑ کا مکالمہ	۱۳۳
خلافتِ ارضی کا فیصلہ	۱۳۳
عیسائی عقیدے کا رد	۱۳۳
سورۂ اعراف میں ذکر	۱۳۳
حضرت آدمؑ کی معافی کا ذکر	۱۳۴
ہدایت قبول کرنے والوں کے لئے انعام	۱۳۵
ترجمہ سورہ بقرہ (آیت نمبر ۴۰ سے ۵۰ تک)	۱۳۶
تفسیر سورہ بقرہ (آیت نمبر ۴۰ سے ۵۰ تک)	۱۳۷
بنی اسرائیل	۱۳۷
حضرت ابراہیمؑ کی نسلیں	۱۳۷
حضرت موسیٰؑ اور فرعون	۱۳۸
بنی اسرائیل کا مصر سے خروج	۱۳۸
صحرائے تیہ میں چالیس برس	۱۳۸
مدینہ میں یہودیوں کی تاریخ	۱۳۹
یہود، اوس وخزرج	۱۳۹
اوس وخزرج کا اسلام قبول کرنا	۱۴۰

مضمون	صفحہ نمبر
یہودیوں کا انکار	۱۴۰
عہد کی حقیقت	۱۴۰
قرآن پر ایمان	۱۴۱
یہود کی عادت	۱۴۱
یہودی علماء کی تحریف	۱۴۲
نماز اور زکوٰۃ	۱۴۳
سجدہ اور رکوع	۱۴۳
رسول اللہ ﷺ کی پیشین گوئی	۱۴۴
مدینہ کے یہودی علماء کی تلقین	۱۴۴
بُرے اعمال کی سزا	۱۴۵
بے عمل کی نصیحت	۱۴۵
نصیحت کے لیے پرہیزگاری شرط نہیں	۱۴۵
بنی اسرائیل کے انعامات	۱۴۷
کوئی کسی کی مدد نہ کر سکے گا	۱۴۷
بنی اسرائیل پر اللہ تعالیٰ کی نعمتیں	۱۴۸
فرعون کا لقب اور ظلم	۱۴۹
نجات اور آزمائش	۱۴۹
بنی اسرائیل اور فرعون	۱۴۹
عاشورہ کا روزہ	۱۵۰
ترجمہ سورہ بقرہ (آیت نمبر ۵۱ سے ۶۰ تک)	۱۵۱
تفسیر سورہ بقرہ (آیت نمبر ۵۱ سے ۶۰ تک)	۱۵۲
حضرت موسیٰؑ کا کوہِ طور پر جانا	۱۵۲
سامری کا بچھڑا	۱۵۲
بچھڑے کا انجام	۱۵۳
بنی اسرائیل کی توبہ	۱۵۴
بنی اسرائیل کا سوال	۱۵۵

مضمون	صفحہ نمبر
میدان تیہ میں بنی اسرائیل کا من وسلویٰ	۱۵۷
من وسلویٰ	۱۵۸
بنی اسرائیل کی ضروریات	۱۵۸
بستی میں ادب کے ساتھ داخل ہونے کا حکم	۱۶۰
بیت المقدس میں داخلہ	۱۶۱
پتھر سے پانی کے چشمے	۱۶۲
ترجمہ سورہ بقرہ (آیت نمبر ۶۱ سے ۷۱ تک)	۱۶۳
تفسیر سورہ بقرہ (آیت نمبر ۶۱ سے ۷۱ تک)	۱۶۴
بنی اسرائیل کا پیاز اور لہسن مانگنا	۱۶۵
یہود کا مطلب	۱۶۶
اَلنَّطْرِیٰ	۱۶۷
اَلصّٰبِئِیْنَ	۱۶۷
بنی اسرائیل کا عہد	۱۶۹
سنیچر کے دن کا شکار	۱۶۹
بندر اور سور میں مسخ	۱۶۹
امت محمدیہ میں مسخ	۱۷۰
شراب کو حلال کرنے کا بہانہ	۱۷۰
بقرہ کا مفہوم	۱۷۱
واقعہ	۱۷۱
مزید روایات	۱۷۲
نتیجہ	۱۷۲
ترجمہ سورہ بقرہ (آیت نمبر ۷۲ سے ۸۲ تک)	۱۷۵
تفسیر سورہ بقرہ (آیت نمبر ۷۲ سے ۸۲ تک)	۱۷۶
یہودیوں کی سختی	۱۷۷
منافقوں اور اہل کتاب کا حال	۱۷۹
یہودی علماء اور دنیا پرستی	۱۸۱

مضمون	صفحہ نمبر
ترجمہ سورہ بقرہ (آیت نمبر ۸۳ سے ۸۷ تک)	۱۸۴
تفسیر سورہ بقرہ (آیت نمبر ۸۳ سے ۸۷ تک)	۱۸۵
والدین کے ساتھ حسنِ سلوک	۱۸۵
مسکینوں کے ساتھ سلوک	۱۸۶
سب سے بہترین عمل	۱۸۶
لوگوں کے ساتھ خوش اخلاقی	۱۸۶
بدعہدی اور انجام	۱۸۶
بنی اسرائیل کا جرم	۱۸۶
بیانات ومعجزات	۱۸۹
روح القدس	۱۸۹
یہودیوں کی ضد اور عناد	۱۸۹
ترجمہ سورہ بقرہ (آیت نمبر ۸۸ سے ۹۶ تک)	۱۹۰
تفسیر سورہ بقرہ (آیت نمبر ۸۸ سے ۹۶ تک)	۱۹۱
یہودیوں کی سرکشی	۱۹۲
آخری نبی کا انتظار	۱۹۳
حضرت زید بن سعنہ کا اسلام	۱۹۴
قرض کی ادائیگی کا مطالبہ	۱۹۴
زید بن سعنہ کا اسلام قبول کرنا	۱۹۵
اسلام کی قبولیت اور صدقہ	۱۹۵
اللہ کے کتاب کی تصدیق	۱۹۶
یہودیوں کی سرکشی اور دوزخ کا حقدار ہونا	۱۹۶
یہودیوں کا جواب اور اللہ تعالیٰ کی وضاحت	۱۹۷
یہودیوں سے عہد	۱۹۹
بچھڑے کی محبت	۱۹۹
موت کی تمنا	۲۰۰
ترجمہ سورہ بقرہ (آیت نمبر ۹۷ سے ۱۰۳ تک)	۲۰۳

مضمون	صفحہ نمبر
تفسیر سورہ بقرہ (آیت نمبر ۹۷ سے ۱۰۳ تک)	۲۰۴
یہودیوں کے سوالات کے جوابات	۲۰۵
جبرائیلؑ سے دشمنی کا مفہوم	۲۰۶
جبرئیلؑ کا دشمن	۲۰۷
آیات بَیِّنٰت کا انکار	۲۰۷
وعدے کی خلاف ورزی	۲۰۸
وعدہ شکنی اور اعتراضات	۲۱۰
رسول اللہ ﷺ سے سوالات	۲۱۰
جادو اور یہود کی گمراہی	۲۱۱
جادو کا سبب	۲۱۱
سلیمانؑ اور جادو کا فتنہ	۲۱۱
قرآن کی وضاحت	۲۱۲
بابل کا جادو اور ہاروت و ماروت	۲۱۲
جادو کا اثر	۲۱۳
ابلیس کا تخت	۲۱۳
جادو کے طریقے	۲۱۴
جادو کی قسمیں	۲۱۵
نظروں کو محسور کرنا	۲۱۵
معجزہ اور جادو میں فرق	۲۱۶
نبوت کا جھوٹا دعویٰ کرنے والے	۲۱۶
کرامات	۲۱۷
سحر یا جادو	۲۱۷
جادوگروں کی حالت	۲۱۷
تین قسم کے لوگ جنت میں داخل نہ ہوں گے	۲۱۸
ایمان اور آخرت کا بدلہ	۲۱۹
جادوگر کی سزا	۲۱۹

مضمون	صفحہ نمبر
شیطان کو راضی کرنے کی صورتیں	۲۱۹
جادوگر کا حکم	۲۱۹
سر جدا کرنے کے بعد کا واقعہ	۲۲۰
تعویذ گنڈے اور سحر	۲۲۰
ترجمہ سورہ بقرہ (آیت نمبر ۱۰۴ سے ۱۱۳ تک)	۲۲۱
تفسیر سورہ بقرہ (آیت نمبر ۱۰۴ سے ۱۱۳ تک)	۲۲۲
لفظ 'راعِنَا' اور یہود کی شرارت	۲۲۲
شرارت کی حقیقت	۲۲۳
نصیحت	۲۲۳
مذاق نہ اڑایا جائے	۲۲۴
اچھے نام رکھنا	۲۲۴
یہودیوں کا حسد	۲۲۵
احکام کی تبدیلی	۲۲۵
نسخ کا مفہوم	۲۲۶
پہلی صورت	۲۲۶
دوسری صورت	۲۲۶
تیسری صورت	۲۲۶
چوتھی صورت	۲۲۶
''نَنسہا'' یعنی بھلا دینا	۲۲۷
آیت نازل ہونے کے مختلف مواقع	۲۲۸
بلاضرورت سوالات	۲۲۹
صبر و صلوٰۃ	۲۳۱
آیت کے نازل ہونے کا سبب	۲۳۳
یہود کی دشمنی	۲۳۳
خلاصہ	۲۳۳
ترجمہ سورہ بقرہ (آیت نمبر ۱۱۴ سے ۱۲۱ تک)	۲۳۵

مضمون	صفحہ نمبر
تفسیر سورہ بقرہ (آیت نمبر ۱۱۴ سے ۱۲۱ تک)	۲۳۶
مسجد میں ذکر سے روکنا	۲۳۶
مسجد کو آباد کرنے کا مطلب	۲۳۶
یہود و نصاریٰ کی روش	۲۳۷
قرآن کا عمومی حکم	۲۳۷
عمومی اطلاق	۲۳۸
حدیث قدسی	۲۳۸
اللہ تعالیٰ کا وعدہ	۲۳۸
دنیا و آخرت کی رسوائی	۲۳۹
وہ کسی رخ میں موجود نہیں	۲۳۹
اللہ ہر جہت میں ہے	۲۴۰
اللہ کی وسعت اور علم	۲۴۰
استقبال قبلہ کے مسائل	۲۴۱
رخ کی حکمت	۲۴۲
اللہ تعالیٰ کے لئے اولاد	۲۴۲
اسلام میں زور زبردستی نہیں	۲۴۵
یہود و نصاریٰ کبھی راضی نہیں ہو سکتے	۲۴۶
مالک کو راضی کرنے کی فکر	۲۴۶
ایمان والوں کی پہچان	۲۴۷
ترجمہ سورہ بقرہ (آیت نمبر ۱۲۲ سے ۱۲۹ تک)	۲۴۹
تفسیر سورہ بقرہ (آیت نمبر ۱۲۲ سے ۱۲۹ تک)	۲۵۰
حضرت ابراہیمؑ کی امامت	۲۵۳
کعبہ، امن اور اجتماع کی جگہ	۲۵۴
مقامِ ابراہیم	۲۵۵
مقامِ ابراہیم کی تاریخ	۲۵۵
بیت اللہ کو پاک رکھنے کا حکم	۲۵۶

مضمون	صفحہ نمبر
طواف کی فضیلت	۲۵۷
مسجدِ حرام میں نماز کی فضیلت	۲۵۷
حضرت ابراہیمؑ کی دعا	۲۵۸
مکہ میں دنیا بھر کے پھل	۲۵۹
مدینہ منورہ کی لئے رسول اللہ ﷺ کی دعا	۲۶۰
کعبہ شریف کی تعمیر	۲۶۰
کعبہ کی تاریخ	۲۶۰
حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسماعیلؑ کی محنت	۲۶۰
کعبہ کے تعمیرات کی تاریخ	۲۶۱
اسلام اور مسلم کی وضاحت	۲۶۲
تلاوت کتاب	۲۶۴
کتاب اور حکمت کی تعلیم	۲۶۴
تزکیہ	۲۶۴
ترجمہ سورہ بقرہ (آیت نمبر ۱۳۰ سے ۱۳۸ تک)	۲۶۶
تفسیر سورہ بقرہ (آیت نمبر ۱۳۰ سے ۱۳۸ تک)	۲۶۷
اسلام کے معنیٰ	۲۶۸
دین کا نام	۲۶۹
حضرت ابراہیمؑ کے ذریعے نام ''مسلمین''	۲۷۰
دین کا نام ''اسلام''	۲۷۰
دین اسلام کے علاوہ کوئی دین قابلِ قبول نہیں	۲۷۱
بیٹوں کو وصیت	۲۷۲
حضرت یعقوبؑ کی وفات کے وقت نصیحت	۲۷۳
نسلی غرور	۲۷۴
عیسائی بنانے کا طریقہ	۲۷۹
قرآن کا جواب	۲۷۹
رنگ کا اثر ظاہر ہونا چاہئے	۲۷۹

مضمون	صفحہ نمبر
نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنت	۲۷۹
ترجمہ سورہ بقرہ (آیت نمبر ۱۳۹ سے ۱۴۱ تک)	۲۸۱
تفسیر سورہ بقرہ (آیت نمبر ۱۳۹ سے ۱۴۱ تک)	۲۸۱
عمل اور اخلاص کی اہمیت	۲۸۲
ترجمہ سورہ بقرہ (آیت نمبر ۱۴۲ سے ۱۴۷ تک)	۲۸۵
تفسیر سورہ بقرہ (آیت نمبر ۱۴۲ سے ۱۴۷ تک)	۲۸۶
قبلہ کی تبدیلی کی حکمت	۲۸۷
اعتراضات اور قرآن کا جواب	۲۸۷
ایک حدیث کی روشنی میں	۲۸۷
امتِ وسط کا مفہوم	۲۸۸
کفار کا اعتراض اور امت کا جواب	۲۸۸
قیامت کے دن گواہی	۲۸۹
گواہی کا مقام	۲۸۹
زمین پر اللہ کے گواہ	۲۹۰
بیت اللہ کی طرف نماز	۲۹۰
مسجد حرام کا نقشہ اور درمیان میں بیت اللہ شریف	۲۹۳
ترجمہ سورہ بقرہ (آیت نمبر ۱۴۸ سے ۱۵۷ تک)	۲۹۵
تفسیر سورہ بقرہ (آیت نمبر ۱۴۸ سے ۱۵۷ تک)	۲۹۶
نماز اور صبر کے ذریعہ مدد	۳۰۰
اللہ کی راہ میں جہاد اور شہید کا مرتبہ	۳۰۱
شہید کے گناہ اور برزخی کیفیت	۳۰۲
شہید کی چار قسمیں	۳۰۲
برزخی زندگی کی ناقابل فہم کیفیت	۳۰۳
دنیا کا امتحان اور مومن پر مصائب کی حکمت	۳۰۳
دنیاوی تکلیف اور اس کے اثرات	۳۰۴
مصیبتوں میں صبر اور اس کی حقیقت	۳۰۵

مضمون	صفحہ نمبر
صبر کی حقیقت	۳۰۶
کسی کے انتقال پر غم و نوحہ کرنا	۳۰۶
دنیاوی مصیبتوں کی حکمت	۳۰۷
ترجمہ سورہ بقرہ (آیت نمبر ۱۵۸ سے ۱۶۷ تک)	۳۰۸
تفسیر سورہ بقرہ (آیت نمبر ۱۵۸ سے ۱۶۷ تک)	۳۰۹
فرمانِ الٰہی اور سعی صفا و مروہ	۳۱۰
شانِ نزول	۳۱۱
روایتیں اور وضاحت	۳۱۱
صفا اور مروہ کے دوران سعی کی جگہ	۳۱۲
ترجمہ سورہ بقرہ (آیت نمبر ۱۶۸ سے ۱۷۶ تک)	۳۱۸
تفسیر سورہ بقرہ (آیت نمبر ۱۶۸ سے ۱۷۶ تک)	۳۱۹
حرام کھانے کے نقصانات	۳۲۱
حرام کمائی کی چند صورتیں	۳۲۲
حرام مال سے صدقہ	۳۲۳
حرام گوشت	۳۲۴
ترجمہ سورہ بقرہ (آیت نمبر ۱۷۷ سے ۱۸۲ تک)	۳۲۷
تفسیر سورہ بقرہ (آیت نمبر ۱۷۷ سے ۱۸۲ تک)	۳۲۸
قِصاص (خون کے بدلے) میں انصاف کا حکم	۳۳۰
قتل کے بدلے قتل	۳۳۰
ایک کے بدلے صرف ایک کا قتل	۳۳۰
قِصاص کا اختیار	۳۳۱
دیت (خون بہا) کا نظام	۳۳۱
قِصاص کا قانون اور اس کی اہمیت	۳۳۲
قِصاص کی رحمت اور حکمت	۳۳۲
قِصاص انصاف اور اس کی اہمیت	۳۳۳
قِصاص یا دیت میں معافی کا اصول	۳۳۳

مضمون	صفحہ نمبر
مال کی وصیت	۳۳۴
قریبی رشتہ داروں کے لیے وصیت	۳۳۴
وصیت کی فرضیت اور منسوخی	۳۳۴
میت کے مال کی تقسیم	۳۳۵
فرض کی وصیت	۳۳۶
گناہ کی وصیت	۳۳۶
وصیت کی اہمیت	۳۳۶
ترجمہ سورہ بقرہ (آیت نمبر ۱۸۳ سے ۱۸۷ تک)	۳۳۸
تفسیر سورہ بقرہ (آیت نمبر ۱۸۳ سے ۱۸۷ تک)	۳۳۹
روزہ میں رعایت	۳۴۱
فدیہ کی رعایت	۳۴۱
روزہ میں ترغیب	۳۴۱
رمضان کے روزوں میں سہولت	۳۴۲
رمضان کی فضیلت	۳۴۲
قرآن تمام انسانوں کے لیے ہدایت	۳۴۳
الفرقان	۳۴۳
رمضان کے روزے	۳۴۳
رمضان کا احترام	۳۴۳
عبادات میں آسانی	۳۴۳
تکبیر اور شکر	۳۴۴
دعا کی اہمیت اور روزہ	۳۴۵
دعا کی قبولیت کے طریقے	۳۴۶
دعا مصیبتوں کے ٹالنے کا ذریعہ	۳۴۶
دعا والا کبھی ہلاک نہیں ہوتا	۳۴۶
دعا کی قبولیت کے مشہور اوقات	۳۴۶
سونے سے پہلے کھانے اور ہمبستری کی اجازت	۳۴۷

مضمون	صفحہ نمبر
شانِ نزول کی ایک مثال	۳۴۸
سونے کے بعد کھانے کی اجازت	۳۴۸
میاں بیوی کو لباس سے تشبیہ	۳۴۸
مباشرت اور اولاد کی اجازت	۳۴۹
اعتکاف اور حدود	۳۴۹
ترجمہ سورہ بقرہ (آیت نمبر ۱۸۸ سے ۱۹۶ تک)	۳۵۰
تفسیر سورہ بقرہ (آیت نمبر ۱۸۸ سے ۱۹۶ تک)	۳۵۱
وَلَا تَأْكُلُوٓا	۳۵۲
يَسْـَٔلُونَكَ عَنِ الْأَهِلَّةِ	۳۵۲
حرام مال حلال نہیں ہوتا	۳۵۲
حرام مال کی مختلف صورتیں	۳۵۲
وَلَيْسَ الْبِرُّ	۳۵۳
چاند کے ذریعہ تاریخ	۳۵۳
اسلامی تاریخ کی شروعات	۳۵۴
اللہ کی راہ میں قتال کرنے کا حکم	۳۵۵
جہاد کا مفہوم	۳۵۶
ظلم وزیادتی کی ممانعت	۳۵۶
جہاد میں پابندی اور اصول	۳۵۶
مجاہدین کے لئے نصیحت	۳۵۷
جنگ کے اصول اور حدود	۳۵۷
فتنہ کی شدت	۳۵۷
قتال اور اس کی شرائط	۳۵۸
قتال کی ابتدائی ہدایت	۳۵۸
قتال کا مقصد اور مدت	۳۵۸
قتال اور فتنہ ختم کرنے کی ہدایت	۳۵۸
حضرت ابنِ عمرؓ کی مثال	۳۵۹

مضمون	صفحہ نمبر
ظلم کرنے والوں کو سزا	۳۵۹
جہاد کی آیات اور ان پر اعتراضات	۳۵۰
دنگے اور فساد	۳۶۰
قرآن مجید میں جنگ کا حکم	۳۶۰
مظلوم کا حق اور دفاعی ضرورت	۳۶۱
مسلمانوں کے غلبہ کا مقصد	۳۶۲
خلاصۂ بحث	۳۶۲
آپ ﷺ کی جان کے دشمن	۳۶۲
زیادتی سے مراد	۳۶۳
خون بہانا	۳۶۳
اسلام قبول کرنے پر مجبور	۳۶۴
اعتراضات اور وضاحت	۳۶۴
مشرکین کی زیادتی کا جواب	۳۶۵
اللہ تعالیٰ متقیوں کے ساتھ ہے	۳۶۵
ہلاکت میں ڈالنے کی ممانعت	۳۶۷
جہاد کی اہمیت اور ضرورت	۳۶۷
ہلاکت سے بچنے کی تعلیم	۳۶۸
صفتِ احسان کا حکم	۳۶۸
مریض یا معذور شخص کے لئے کفارہ	۳۶۹
مقامِ حدیبیہ میں نزول	۳۷۰
حج وعمرہ ادا نہ کر پانے کا کفارہ	۳۷۰
حج وعمرہ میں قربانی اور فدیہ کے احکام	۳۷۱
فدیہ کی مقدار	۳۷۱
فقہ حنفی کے مطابق کچھ اہم مسائل	۳۷۱
حج کی تین بنیادی قسمیں ہیں	۳۷۲
افراد، تمتع اور قران میں قربانی کا حکم	۳۷۲

مضمون	صفحہ نمبر
ترجمہ سورہ بقرہ (آیت نمبر ۱۹۷ سے ۲۰۷ تک)	۳۷۷
تفسیر سورہ بقرہ (آیت نمبر ۱۹۷ سے ۲۰۷ تک)	۳۷۸
حج کا مہینہ	۳۷۸
حالتِ احرام میں پرہیز	۳۷۹
تقویٰ اور اللہ کا خوف	۳۷۹
حج میں تجارت	۳۸۰
عرفات اور مزدلفہ میں قیام	۳۸۱
حج کے پانچ دن اور عبادت کے احکام	۳۸۱
عبادت کے آداب	۳۸۲
حج کے بعد ذکر کا حکم	۳۸۳
حج کا نقشہ ایک نظر میں	۳۸۳
دعا کی قبولیت	۳۸۴
دنیا وآخرت کے لئے دعا	۳۸۵
ایام تشریق میں تکبیر کا حکم	۳۸۶
فرض نمازوں کے بعد تکبیر تشریق	۳۸۶
رمی جمار کا حکم	۳۸۶
مومنوں کی صفات	۳۸۹
ترجمہ سورہ بقرہ (آیت نمبر ۲۰۸ سے ۲۱۵ تک)	۳۹۱
تفسیر سورہ بقرہ (آیت نمبر ۲۰۸ سے ۲۱۵ تک)	۳۹۲
اسلام میں پورے پورے داخل ہونے کا حکم	۳۹۲
ہر شخص اسلام کے احکام کا پابند ہے	۳۹۳
مسلم حکومتیں	۳۹۴
حق قبول نہ کرنے پر وعید	۳۹۵
کافروں کی دنیاوی زندگی	۳۹۶
یہود ونصاریٰ کا اختلاف	۳۹۷
مومنوں کی آزمائش	۳۹۸

مضمون	صفحہ نمبر
اللہ کی راہ میں خرچ	۳۹۹
ترجمہ سورہ بقرہ (آیت نمبر ۲۱۶ سے ۲۲۱ تک)	۴۰۰
تفسیر سورہ بقرہ (آیت نمبر ۲۱۶ سے ۲۲۱ تک)	۴۰۱
تمام مسلمانوں کی شرکت ضروری نہیں	۴۰۲
ماں باپ کی خدمت	۴۰۲
فرض ادا کرنے کی تاکید	۴۰۳
جہاد کو ناپسند کرنا	۴۰۳
حرمت کے چار مہینے	۴۰۵
مرتد (Apostate) کا حکم	۴۰۶
اللہ کی رحمت	۴۰۷
جہاد کے معنیٰ	۴۰۸
جہاد کی تین قسمیں	۴۰۹
شراب اور جوئے کی ممانعت	۴۱۰
پہلا حکم	۴۱۱
شراب کے نقصانات	۴۱۱
شراب کی حرمت	۴۱۲
شراب کے استعمال سے پیدا ہونے والی بیماریاں	۴۱۴
ہاضماتی نظام پر شراب کے اثرات	۴۱۵
شراب کے اثرات برخون کی گردش	۴۱۶
شراب کے اثرات براعصابی نظام	۴۱۶
شراب کے سماجی اثرات	۴۱۷
قمار یا جوا کے اخلاقی اور اقتصادی نقصانات	۴۱۷
یتیم کے متعلق حکم	۴۲۱
یتیم کے مال کو مشترک رکھنا	۴۲۱
مسلمان مرد اور کافرہ عورت کے نکاح کا حکم	۴۲۳
ممانعت کی وجہ	۴۲۳

مضمون	صفحہ نمبر
خلاصۂ حکم	۴۲۳
مسلمان مرد کا نکاح کافرہ عورت سے	۴۲۴
مسلمان عورت کا نکاح کافر مرد سے	۴۲۴
ترجمہ سورہ بقرہ (آیت نمبر ۲۲۲ سے ۲۲۹ تک)	۴۲۶
تفسیر سورہ بقرہ (آیت نمبر ۲۲۲ سے ۲۲۹ تک)	۴۲۷
حیض کسے کہتے ہیں؟	۴۲۹
مختلف اقوام کا عمل	۴۲۹
اسلامی حکم	۴۳۰
حیض کی مدت	۴۳۰
حیض کے دوران دیگر احکام	۴۳۰
حیض اور دبر سے وطی کی ممانعت	۴۳۰
عورت کو کھیت سے تشبیہ	۴۳۱
نکاح کا اصل مقصد	۴۳۱
خاندانی منصوبہ بندی	۴۳۱
حضرت عمرؓ کا واقعہ	۴۳۱
قرآن کا پیغام	۴۳۲
ایلاء اور قسم	۴۳۳
قسم کھانے کے بعد کا عمل	۴۳۳
واقعاتِ نزول	۴۳۳
قسم کے مسائل	۴۳۴
بے خیالی کی قسم	۴۳۵
ایلاء کا طریقہ	۴۳۵
ایلاء اور طلاق کے احکام	۴۳۶
ایلاء کا حکم	۴۳۷
فقہاء کی تشریح	۴۳۷
مطلقہ عورتوں کی عدت	۴۳۸

مضمون	صفحہ نمبر
طلاق کے بعد عدت	۴۳۸
خلع اور عدت کے احکام	۴۳۹
عدت کی قسمیں	۴۴۰
عورتوں کے حقوق مردوں پر	۴۴۰
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا خطبہ حجۃ الوداع	۴۴۱
طلاق کا طریقہ اور اس کی حد	۴۴۲
عرب میں طلاق کا دستور	۴۴۲
دو طلاق دینے کا صحیح طریقہ	۴۴۲
زمانۂ جاہلیت کی رسم	۴۴۳
طلاق کا اصل مفہوم	۴۴۳
یہودیوں کے یہاں طلاق کا طریقہ	۴۴۳
عیسائیوں کے یہاں طلاق کا حکم	۴۴۴
خلاصہ	۴۴۴
خلع کا طریقہ	۴۴۵
خلع سے متعلق مسائل	۴۴۶
ترجمہ سورہ بقرہ (آیت نمبر ۲۳۰ سے ۲۳۴ تک)	۴۴۷
تفسیر سورہ بقرہ (آیت نمبر ۲۳۰ سے ۲۳۴ تک)	۴۴۸
عدت میں طلاق کا حکم	۴۴۹
پہلے شوہر کے ساتھ دوبارہ نکاح کی شرتیں	۴۴۹
فقہی اتفاق	۴۵۰
طلاقِ احسن	۴۵۰
طلاق دینے کی حالت	۴۵۱
طلاقِ رجعی	۴۵۲
شرافت کے ساتھ طلاق کا حکم	۴۵۳
تین اہم احکام	۴۵۳
زمانہ جاہلیت کی رسم	۴۵۵

مضمون	صفحہ نمبر
ایمان کے مطابق عمل	۴۵۵
صفائی اور اصلاح کا ذریعہ	۴۵۵
اللہ کی مصلحت اور حکمت	۴۵۶
دودھ پلانے کا حق اور والدین کی ذمہ داریاں	۴۵۷
دودھ پلانے کی مدت	۴۵۸
معاوضہ اور حقوق	۴۵۸
دودھ پلانے سے متعلق شرعی احکام	۴۵۸
بچے کے خرچ سے متعلق شرعی احکام	۴۵۹
اللہ کے علم کا تصور	۴۶۰
عدتِ وفات کی وضاحت	۴۶۱
بیوہ عورت کی عدت اور نکاح	۴۶۱
عدت سے متعلق چند شرعی مسائل	۴۶۲
ترجمہ سورہ بقرہ (آیت نمبر ۲۳۵ سے ۲۴۲ تک)	۴۶۴
تفسیر سورہ بقرہ (آیت نمبر ۲۳۵ سے ۲۴۲ تک)	۴۶۵
نکاح کے پیغام کے بارے میں شرعی احکام	۴۶۵
عدت کے دوران نکاح کے چار احکام	۴۶۶
طلاق شدہ عورتوں کے مہر کے احکام	۴۶۷
لفظ مَتِّعُوْهُنَّ کی وضاحت	۴۶۷
مہر کی مقدار	۴۶۷
اہم مسائل	۴۶۸
مہر کے بارے میں قرآنی حکم اور رعایت	۴۶۸
خلاصہ	۴۶۸
نماز کی حفاظت	۴۶۹
نماز کی اہمیت	۴۷۰
بیوہ عورت کے نفقہ اور عدت کے احکام	۴۷۱
شریعت کے احکام کی اہمیت	۴۷۴

مضمون	صفحہ نمبر
ترجمہ سورہ بقرہ (آیت نمبر ۲۴۳ سے ۲۴۸ تک).....	۴۷۵
تفسیر سورہ بقرہ (آیت نمبر ۲۴۳ سے ۲۴۸ تک).....	۴۷۶
عمالقہ کا قبضہ.....	۴۷۸
طالوت اور جالوت.....	۴۷۸
ترجمہ سورہ بقرہ (آیت نمبر ۲۴۹ سے ۲۵۲ تک).....	۴۸۱
ترجمہ سورہ بقرہ (آیت نمبر ۲۴۹ سے ۲۵۲ تک).....	۴۸۲
ترجمہ سورہ بقرہ (آیت نمبر ۲۵۳ سے ۲۵۸ تک).....	۴۸۵
تفسیر سورہ بقرہ (آیت نمبر ۲۵۳ سے ۲۵۸ تک).....	۴۸۶
پہلا لفظ: اَللّٰہُ لَا اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ	۴۸۸
دوسرا لفظ: اَلْحَیُّ الْقَیُّوْمُ	۴۸۹
تیسرا لفظ: لَا تَاْخُذُہٗ سِنَۃٌ وَّلَا نَوْمٌ	۴۸۹
چوتھا لفظ: لَہٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ.....	۴۸۹
پانچواں لفظ: مَنْ ذَا الَّذِیْ یَشْفَعُ عِنْدَہٗٓ اِلَّا بِاِذْنِہٖ...	۴۸۹
چھٹا لفظ.....	۴۹۰
ساتواں لفظ.....	۴۹۰
آٹھواں لفظ.....	۴۹۰
نواں لفظ.....	۴۹۱
دسواں اور آخری لفظ.....	۴۹۱
آیت الکرسی کی فضیلت.....	۴۹۱
اسلام قبول کروانے میں زبردستی نہیں.....	۴۹۳
مذہب میں جبر کی گنجائش نہیں.....	۴۹۴
اعتراض اور اس کا جواب.....	۴۹۵
ترجمہ سورہ بقرہ (آیت نمبر ۲۵۹ سے ۲۶۶ تک).....	۴۹۸
تفسیر سورہ بقرہ (آیت نمبر ۲۵۹ سے ۲۶۶ تک).....	۴۹۹
مرنے کے بعد دوبارہ زندہ ہونا.....	۵۰۰
خلاصہ.....	۵۰۴

مضمون	صفحہ نمبر
ترجمہ سورہ بقرہ (آیت نمبر ۲۶۷ سے ۲۷۴ تک).....	۵۱۰
تفسیر سورہ بقرہ (آیت نمبر ۲۶۷ سے ۲۷۴ تک).....	۵۱۱
اللہ کی راہ میں خرچ کرنا.....	۵۱۳
لوگوں سے سوال کرنا.....	۵۱۵
ترجمہ سورہ بقرہ (آیت نمبر ۲۷۵ سے ۲۸۲ تک).....	۵۱۸
تفسیر سورہ بقرہ (آیت نمبر ۲۷۵ سے ۲۸۲ تک).....	۵۱۹
سود کی قسمیں.....	۵۲۰
احادیث میں سود کی دو شکلیں.....	۵۲۱
قرض کا لین دین.....	۵۲۷
ترجمہ سورہ بقرہ (آیت نمبر ۲۸۳ سے ۲۸۶ تک).....	۵۲۹
تفسیر سورہ بقرہ (آیت نمبر ۲۸۳ سے ۲۸۶ تک).....	۵۳۰
گروی یا رہن.....	۵۳۰
فضیلت.....	۵۳۵
دعائے اختتام.....	۵۳۶
سورہ آل عمران کا مختصر تعارف.....	۵۳۷
نام اور اس کے معانی.....	۵۳۷
اسباب نزول.....	۵۳۸
حضرت عیسیٰؑ سے متعلق نصاریٰ کے دلائل اور رسول اللہؐ کا جواب	۵۳۹
سورہ آل عمران کا خلاصہ.....	۵۴۱
سورہ آل عمران کی فضیلت.....	۵۴۴
ترجمہ سورہ آل عمران (آیت نمبر ۱ سے ۹ تک).....	۵۴۵
تفسیر سورہ آل عمران (آیت نمبر ۱ سے ۹ تک).....	۵۴۶
حروف مقطعات.....	۵۴۶
عیسائیوں کے تین عقائد.....	۵۴۶
محکمات اور متشابہات کا مفہوم.....	۵۴۹
راسخین فی العلم کا طریقہ.....	۵۵۰

مضمون	صفحہ نمبر
خلاصہ	۵۵۰
راسخین فی العلم کی دعا	۵۵۱
راسخین فی العلم کی دوسری دعا	۵۵۱
ترجمہ سورہ آل عمران (آیت نمبر ۱۰ سے ۱۸ تک)	۵۵۲
تفسیر سورہ آل عمران (آیت نمبر ۱۰ سے ۱۸ تک)	۵۵۳
نجران کے عیسائی گروہ کا قصہ	۵۵۴
جنگ بدر کا واقعہ	۵۵۶
کامیابی کا راز	۵۵۷
نصیحت	۵۵۸
پسندیدہ چیزیں	۵۵۹
دنیا کی محبت اور اس کے درجے	۵۵۹
زندگی کا مقصد	۵۶۰
جنت کی نعمتیں	۵۶۱
ترجمہ سورہ آل عمران (آیت نمبر ۱۹ سے ۲۷ تک)	۵۶۴
تفسیر سورہ آل عمران (آیت نمبر ۱۹ سے ۲۷ تک)	۵۶۵
اسلام کے لفظی معنیٰ	۵۶۶
اسلام کا اصطلاحی معنیٰ	۵۶۷
اللہ تعالیٰ کا پسندیدہ دین	۵۶۸
دنیا کی ہر چیز 'مسلم' ہے	۵۶۸
انسان اور دیگر مخلوقات میں فرق	۵۶۹
سب سے پہلے انسان	۵۶۹
اللہ کے آخری رسول	۵۷۰
حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پہلے	۵۷۰
اللہ کی طرف سے ایک ہی دین آیا	۵۷۱
سینکڑوں مذاہب	۵۷۱
مذہب میں زبردستی نہیں	۵۷۲

مضمون	صفحہ نمبر
اللہ کی مرضی کا راستہ	۵۷۲
دعا کا طریقہ	۵۷۵
ترجمہ سورہ آل عمران (آیت نمبر ۲۸ سے ۳۷ تک)	۵۷۷
تفسیر سورہ آل عمران (آیت نمبر ۲۸ سے ۳۷ تک)	۵۷۸
کافروں سے دوستی نہ کریں	۵۷۸
امن پسند غیر مسلموں سے تعلقات	۵۷۹
غیر مسلموں کے ساتھ انصاف کا حکم	۵۷۹
جنگ نہ کرنے والوں سے دوستی	۵۷۹
دوستی کا مقصد	۵۷۹
تمام انسانوں کے بارے میں قرآن کا حکم	۵۸۰
بھلے کاموں میں غیر مسلموں کی مدد کا حکم	۵۸۰
ایک انسان کا قتل جیسے تمام انسانوں کو قتل ہے	۵۸۰
قرآن کے اخلاقی احکام	۵۸۱
دیوتاؤں کو برے الفاظ کی ممانعت	۵۸۱
غیر مسلموں کی دو قسمیں	۵۸۲
اسلامی حکومت میں غیر مسلموں کے حقوق	۵۸۳
حضرت مریمؑ کی پیدائش	۵۸۶
اُمِّ مریم کی منت	۵۸۷
عالمی شہرت یافتہ علماء کے تائیدی کلمات	۵۸۸
فہرست مضامین	۵۹۶

❁❁❁

نوٹ:.....

.....

.....

.....

.....

.....

.....

.....

.....

.....

.....

.....

.....

.....

.....

.....

.....

.....